منظور شدہ محکمہ تعلیمات کراچی، لاہور اور پشاور
جاری شدہ: ۱۹۴۵ء ٭ فون: ۳۸۹۹۳۰

جوش نمبر

دوسرا (۲) ایڈیشن

مدیر
صہبا لکھنوی

قیمت	زر سالانہ
بارہ روپے	بارہ روپے

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ کراچی

لندن آفس
۱۸-ایکل روڈ-لندن-این-ڈبلیو-۶-انگلینڈ

ٹالکم پاؤڈر میں تبت کا جواب نہیں !

نئی نسل کے نام

نوخواستہ شاعرو ٹھٹھر جاؤ گے
تقلید یونہی رہی تو پچھتاؤ گے
جب تک مجھے گم نہیں کرو گے بچّو!
کہتا ہوں کہ اپنے کو نہیں پاؤ گے

لیلائے سخن کے گیسوؤں کو سلجھاؤ
جو میں نہیں کر سکا وہ تم کر کے دکھاؤ
اللہ کرے کہ میرے کم سن شعرا
تم مجھ سے ہزار چند آگے بڑھ جاؤ

جوش

سال: ۱۷ • شمارہ: ۱۲۲-۱۲۳

سرورق	عزیز کارٹونسٹ	مارننگ نیوز

حصہ	مصنف		صفحہ	عنوان
		نئی نسل کے نام	۶	جوش
		اشاریہ	۱۱	صہبا لکھنوی
		خطرناک اقدام	۱۳	جوش
		جوش - ایک جائزہ	۱۷	صہبا لکھنوی
تازہ و غیر مطبوعہ	جوش		۲۷	نئی رباعیاں
	〃		۲۸	خطاب بہ صدر پاکستان
	〃		۳۱	پیری و جوانی
	〃		۳۷	نوحۂ آگاہی
	〃		۳۹	آدمی
اصلاح شدہ ورق	جوش	(عکس تحریر)	۴۲	اپنے کلام پر اصلاح
نادر و نایاب	جوش		۴۳	دو یادگار نظمیں
	〃		۴۴	تلاشی
	〃		۴۵	ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے
	〃		۴۷	ایک نایاب نظم
	〃		۴۹	لکھنؤ
	〃		۵۱	اعدا سے خطاب
مکتوبات جوش	جوش	(عکس تحریر)	۵۲	پروفیسر سید احتشام حسین کے نام
	〃	〃	۶۱	میاں محمد صادق کے نام
	〃	〃	۶۶	اندر سنگھ راز منتوکھ سری کے نام

	جوش	۶۸	محمد حبیب اللہ رشدی کے نام
	"	۷۳	ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام
	"	۷۷	ساغر نظامی کے نام
	"	۸۲	محمد حسام الدین غوری کے نام
آٹوگراف	جوش (قلمی)	۸۲	عبدالحلیم انصاری آرٹسٹ کیلئے
نگار خانے میں	جوش، آب و جد افراد خاندان اور احباب کے ساتھ	۸۵	زندگی کے مختلف ادوار کا تصویری احاطہ
قلمی خاکے	عبدالحلیم انصاری (آرٹسٹ)	۱۰۳	جوش
شخصیت کے آئینے میں	پروفیسر سید احتشام حسین	۱۰۵	جوش، ایک تعارفی مطالعہ
	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۴۳	جوش شخصیت کے چند اہم پہلو
	تمکین کاظمی	۱۶۹	جوش، میری نظر میں
	محمد حبیب اللہ رشدی	۱۷۷	جوش حیدرآباد، پونے اور بمبئی میں
	اعجاز الحق قدوسی	۱۹۸	ریش اور رندی کا رشتہ
	محمود علی خاں جامعی	۲۱۰	جوش اور دنیاداری
	شاہد احمد دہلوی	۲۱۶	جوش ملیح آبادی، دیدہ و شنیدہ
	میاں محمد صادق	۲۲۵	جوش، ایک انسان
	ماہر القادری	۲۲۹	جوش کی اعلیٰ ظرفی
	پنڈت سوز ہوشیار پوری	۲۴۴	جوش، ایک عظیم شخصیت
	خواجہ حمید الدین شاہد	۲۴۸	جیسا دیکھا، جیسا پایا
	مبین الحق صدیقی	۲۵۳	جوش کی با اصول پسندی
	عبدالحلیم انصاری	۲۵۷	جوش جوان ہے
	سلام مچھلی شہری	۲۶۶	جوش حفیظ کے ساتھ
	جمیل جالبی	۲۶۸	جوش کے لطیفے
	نریش کمار شاد	۲۷۴	جوشیے
روحِ انتخاب	مجتبیٰ حسین	۲۷۹	انتخابِ کلام
	اکبر الہ آبادی	۲۸۱	پہلی رائے
	نور لکھنوی	۲۸۲	پہلا تبصرہ
	جوش	۲۸۳	روحِ ادب (۱۹۲۰ء)
		۲۹۵	نقش و نگار (۱۹۳۶ء)

عنوان	مصنف	صفحہ	تحریر
	جوش	۳۲۵	شعلہ و شبنم (۱۹۳۶ء)
	"	۳۶۰	فکر و نشاط (۱۹۳۷ء)
	"	۳۶۸	جنون و حکمت (۱۹۳۷ء)
	"	۳۷۷	حرف و حکایت (۱۹۳۸ء)
	"	۳۹۱	آیات و نغمات (۱۹۴۱ء)
	"	۴۰۳	عرش و فرش (۱۹۴۴ء)
	"	۴۱۲	رامش و رنگ (۱۹۴۵ء)
	"	۴۲۸	سنبل و سلاسل (۱۹۴۷ء)
	"	۴۳۹	سیف و سبو (۱۹۴۷ء)
	"	۴۴۴	سرود و خروش (۱۹۵۲ء)
	"	۴۶۲	سموم و صبا (۱۹۵۳ء)
	"	۴۷۷	طلوعِ فکر (۱۹۵۷ء)
نئی نظمیں	جوش	۴۸۲	گلبدنی (۱۹۵۹ء)
	"	۴۸۵	آگ (۱۹۵۹ء)
	"	۴۸۸	لافانی حروف (۱۹۶۰ء)
انتخاب مضامین	جوش	۴۹۲	پہلا دیباچہ
	"	۴۹۷	دوسرا دیباچہ
	"	۵۰۲	الفاظ و شاعر
	"	۵۰۴	اردو ادبیات میں انقلاب...
	"	۵۱۵	آہ! صاحب عالم
	"	۵۱۹	جوش، اخباری کالموں میں
تراشے فکر و فن کی کسوٹی پر	مجتبیٰ حسین	۵۲۵	شاعر اعظم
	ڈاکٹر محمد حسن	۵۳۳	جوش کی شاعری
	پروفیسر انجم اعظمی	۵۵۱	نصف صدی اور جوش
	پروفیسر حنیف فوق	۵۵۷	جوش کا آہنگِ شاعری
	مصطفیٰ زیدی	۵۷۱	شبیر حسن خاں
	فضیل جعفری	۵۸۳	جوش بحیثیت تخلیقی نثر نگار
	نریش کمار شاد	۵۸۹	جوش صاحب کی اصلاحیں
	اثر لکھنوی	۵۹۴	شاعرِ فطرت ۔ جوش

شعرا کا خراجِ تحسین

ل، احمد اکبرآبادی	۵۹۹	سخنہائے گفتنی
جمیل مظہری	۶۱۴	سالارِ کارواں سے
رئیس امروہوی	۶۱۶	جوش علیہ السلام
”	۶۱۸	جوش اور ترکِ مے
الطاف مشہدی	۶۲۱	ایک افسوسناک خبر سُن کر
قمر ہاشمی	۶۲۳	مرثیۂ جوش
سحر انصاری	۶۲۵	بنام جوش ملیح آبادی
ادیب سہیل	۶۲۶	...خندہ برلبِ اک چراغ
جلیل حشمی	۶۲۸	نذرِ جوش
تابِ اسلم	۶۳۰	جوش
تمہید الاسلام	۶۳۱	شاعرِ شعلہ و شبنم

پیغامات، تأثرات ۶۳۲

جی اے مدنی ۔ ممتاز حسن ۔ سید ہاشم رضا ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی،
ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ۔ کرشن چندر ۔ پیر حسام الدین راشدی،
احمد ندیم قاسمی ۔ مولانا رازق الخیری ۔ عبدالخالق عبدالرزاق ۔ عبدالحفیظ خاں
مہدی علی سلجوق ۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ۔ پاکستان رائٹرس گلڈ ۔

نذرانے، عذرانے ۶۴۶

سجاد انصاری ۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ۔ جگر مرادآبادی ۔ نجم آفندی
سید اختر علی تلہری ۔ امام اکبرآبادی ۔ فراق گورکھپوری ۔ سجاد ظہیر
کلیم الدین احمد ۔ آل احمد سرور ۔ ممتاز حسین ۔ لطیف الدین احمد اکبرآبادی
پروفیسر اختر انصاری دہلوی ۔ عزیز احمد ۔ سردار جعفری ۔ اختر اورینوی،
میاں بشیر احمد ۔ اسرائیل احمد خاں ۔ عصمت چغتائی ۔ ہاجرہ مسرور
صفیہ اختر ۔ شوکت تھانوی ۔ عابد رضا بیدار ۔ پروفیسر وقار عظیم ۔

صغیرہ نسیم اور صاحبزادہ علی اختر

ضمیمہ

جوش، پروفیسر وقار عظیم ۶۵۹ مجتبیٰ حسین اور دوسرے

پہلا ایڈیشن : نومبر ۱۹۶۱ء ★ دوسرا ایڈیشن : اگست ۱۹۶۲ء

اشاریہ

جوش نمبر حاضر ہے۔ یہ نمبر کم و بیش ایک سال کی لگاتار محنت، سعی و کوشش اور جدوجہد کے بعد مکمل ہو سکا ہے۔ ایک سال کی مدت کو کچھ اس طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ چھ ماہ تک صرف اعلانات، مضامین، مکتوبات اور نادر و نایاب تخلیقات کے لئے خطوط پر خطوط، پھر تین ماہ تک یاد دہانیوں پر یاد دہانیاں، اور آخری تین ماہ میں شبانہ روز نمبر کی تیاری۔ اس نمبر کی تکمیل کے سلسلے میں کہنے کے لئے بہت سی باتیں ہیں لیکن گفتنی کم ہیں ناگفتنی بے شمار۔ لیکن یہ موقع نہ ان کے اعادہ کا ہے نہ اس سے کوئی نتیجہ برآمد ہوگا۔ لہٰذا اتنا ہی کہنے پر اکتفا کروں گا کہ اس دوران میں کئی بار حوصلہ ہارا، کئی بار ہمت جواب دے گئی، اور کئی بار جی چھوٹا لیکن جب مشکلات کا اندازہ کئے بغیر میں نے تاریخ اشاعت کا اعلان کر دیا تو مرحلہ سخت سے سخت تر ہو گیا۔ پھر تو راتوں کی نیند اور دن کا چین بھی حرام ہو گیا۔ البتہ چند قابلِ احترام معاصرین نے زندہ دوستی کی جو روایت قائم کی تھی — اس روایت کو آگے بڑھانے کا پُرخلوص جذبہ ہر قدم پر سہارا دے رہا تھا۔ میرے سامنے "نیرنگِ خیال" کا "اقبال نمبر" بھی تھا، "ساقی" کا "عظیم بیگ چغتائی نمبر" بھی اور بابائے اردو یزدو تین "عبدالحق نمبر" بھی۔ ان کے علاوہ بھی میں نے زندہ شخصیتوں پر شائع ہونے والے چند اور نمبروں کو بھی سامنے رکھا، اور بالآخر جوش نمبر کو مکمل کر کے ہی دم لیا۔ اب آپ اسے شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد فیصلہ کیجئے کہ آیا یہ نمبر اس صدی کے عظیم شاعر جوش ملیح آبادی کے شایانِ شان ترتیب پا سکا ہے یا نہیں۔ مجھے اپنی ناتوانی کا احساس پہلے بھی تھا، آج بھی ہے، پھر بھی ایک میرے ایسے بے وسیلہ، بے زر اور بے سروساماں انسان نے جوش جیسے باکمال اور باعثِ صد افتخار شاعر پر اس کی زندگی میں جوش نمبر پیش کر کے جو بے پایاں مسرت حاصل کی ہے میں سمجھتا ہوں اس میں وہ تمام اہلِ قلم بھی برابر کے شریک ہیں جن کی خصوصی اور گراں مایہ تخلیقات سے جوش نمبر ایک ادبی دستاویز بن سکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مسرت میں وہ ادیب اور فن کار بھی اپنے کو شامل سمجھیں گے جو کوشش کے باوجود جوش کے شایانِ شان مضامین وقت پر نہ بھیج سکے۔ اور وہ بھی جن کی تخلیقات تاخیر سے ملنے کے باعث یا ناقابلِ اظہار دشواریوں کے نتیجے میں شاملِ اشاعت نہ ہو سکیں۔

اس نمبر کے سلسلے میں چند اشارات ضروری ہیں۔ جوش عظیم و منفرد شاعر ہوتے ہوئے بھی انسان ہیں اور کمزوریوں کا شکار بھی چنانچہ اس نمبر میں ان کی سیرت، اُن کے کردار، اور شخصی پہلوؤں پر بعض ایسے مضامین بھی شائع ہو رہے ہیں جن میں خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اظہارِ صداقت بھی ہے، تند و تیز لہجہ بھی۔ کڑی تنقید بھی ہے اور دوستانہ نصیحت بھی۔ اس نمبر میں حصہ لینے والے جوش کے قریبی احباب بھی ہیں اور بعض نظریات پر جوش سے اختلاف رکھنے والے دوست بھی۔ اس میں ہم عصر بھی شریک ہیں، نادیدہ عقیدت مند بھی۔ نقاد بھی شامل ہیں اور ملنے جلنے والے بھی نئی نسل کے نمائندہ ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی — قصیدہ خوانی کے بجائے سبھی نے کھل کر لکھا ہے۔ بلا خوف لکھا ہے۔ اور اپنی دانست میں "جوش دوستی" کا حق ادا کیا ہے۔ اس نمبر میں پہلی بار اس عہد کے ایک عظیم المرتبت شاعر کے تقریباً تمام شخصی اور فنی پہلوؤں کو رطب و یابس سے ہٹ کر پوری دیانت داری کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابتدا میں جوش کی زندگی، شخصیت اور فن کا تفصیلی جائزہ "کتابیات" سمیت شامل ہے۔ اسے کامل تحقیق اور پوری ذمہ داری کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تازہ و غیر مطبوعہ کلام، نادر و نایاب تصاویر، قلمی خاکے، مکتوبات اور منظومات، شخصیت و فن پر منفرد مضامین نظم و نثر، پیغامات، تاثرات اور انتخابِ کلام اس ایک ضخیم نمبر میں یکجا دیکھ کر یقیناً آپ

پیش ہوں گے۔ زندہ و باکمال شخصیتوں پر اردو رسالوں کی تاریخ میں اس نوع کی کسی پیش کش کا آپ کو مشکل سراغ مل سکے گا۔ بظاہر یہ ایک بے نام سی کوشش ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ حقیر سی کوشش آئندہ ادبی تاریخ کا حصہ بن جائے۔ جوش نمبر میں احترامِ روایت کے ساتھ ساتھ نئی قدروں کو جنم دینے، زندہ دوستی کی روایت کو آگے بڑھانے اور نئی سمتوں، نئے راستوں اور نئی منزلوں کو تلاش کرنے کی جد و جہد کا مقصد صرف اور صرف یہی ہے کہ مستقبل میں زندہ و باعظمت شخصیتوں پر نئی نسل زیادہ وسعت و گیرائی کے ساتھ کام کر سکے۔ "خطرناک اقدام" میں جوش صاحب نے جس مربیانہ اور شفقانہ انداز میں اظہارِ خیال فرمایا ہے اس کا انہیں حق ہے۔ لیکن مجھے یہ نمبر پیش کرتے ہوئے نہ کسی فتنے کا اندیشہ ہے نہ کسی مخالفت کا خوف۔ یہ کام میں نے سود و زیاں اور داد و ستائش سے یکسر بے نیاز ہو کر سرانجام دیا ہے۔ اور میرا یہ ایمان ہے کہ دنیا میں جو بھی کام نیک نیتی، خلوص، سچی لگن، اور مفادات سے بلند ہو کر کئے جاتے ہیں وہ کبھی نہیں مرتے۔ جوش صاحب بلاشبہ بلا کے جری ہیں۔ میں ان کی اس غیر معمولی خصوصیت کا نہ صرف مداح و معترف ہوں بلکہ پیرو بھی ہوں اور فطرتاً وہی کام کرنا پسند کرتا ہوں جو عموماً ناممکن تصور کئے جاتے ہیں۔ اسے آپ خود پسندی کا نام دیں یا ادبی جنون کہہ لیں۔ آپ کو اختیار ہے۔ بہرحال جوش نمبر کو پیش کرتے ہوئے مجھے اس بات کی اور زیادہ خوشی ہے کہ جوش نمبر کے اعلان کے بعد ایک سال کے عرصے میں دیگر معاصرین نے بھی کئی زندہ و بلند مرتبت شخصیتوں پر نمبر پیش کرنے کا اعلان کر کے زندہ دوستی کی روایت کو کچھ اور آگے بڑھانے کا حوصلہ کیا۔

آخر میں جوش صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے بعض پرانے مسودات کے استفادہ کے علاوہ بعض ایسی تصاویر بھی مجھے عنایت کر دیں جن کے بغیر ان کی زندگی کے ادوار کا تاریخی احاطہ ممکن نہ تھا۔ جوش صاحب کے علاوہ پاکستان اور بھارت کے وہ تمام ادیب، شاعر، فن کار، علم دوست میرے اور ساری اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے اس نمبر میں میرا ہاتھ بٹایا۔ تمکین کاظمی جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے دل روتا ہے آج ہم میں نہیں۔ افسوس۔ جوش نمبر کے اعلان اور خط کے جواب میں انہوں نے انتہائی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ایک ماہ کے اندر ہی بیماری کے باوجود اپنا مضمون مکمل کر کے بھیج دیا تھا۔ کاش وہ بھی اس مسرت میں شریک ہوتے۔ احتشام حسین، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر محمد حسن، حبیب اللہ رشدی، اعجاز الحق قدوسی، پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر سید محمد یوسف، مصطفیٰ زیدی..... عبدالحلیم انصاری آرٹسٹ، میاں محمد صادق، محمود علی جامعی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، مشتاق احمد یوسفی، امۃ العزیز، سید محمد علی، حکیم راغب حسن مثنیٰ ندوی اور عزیز کارٹونسٹ وغیرہ کے علاوہ جوش نمبر کی تیاری کے آخری اور انتہائی محنت طلب مرحلے میں عملاً حصہ لینے والے..... رفیقانِ افکار سحر انصاری، عابدی جعفر اور انجم اعظمی بھی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں، جن کی لگاتار اعانت کے بغیر اتنے کم وقت میں..... ساڑھے چھ سو سے زائد صفحات کے جوش نمبر کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ خصوصیت کے ساتھ سحر انصاری رات کے دو دو اور تین تین بجے تک اس نمبر میں میرے معاون و مددگار رہے۔ اور حوصلہ بڑھا۔ اور میرے اور افکار کے دیرینہ ساتھی اور رفیقِ کار منیر احمد کی ہمت پر بھی صد آفریں ہے کہ انہوں نے راتوں کو جاگ جاگ کر اس ضخیم نمبر کی اول تا آخر کتابت مکمل کی۔

ان دوستوں اور رفیقوں کے مثالی تعاون سے ہی جوش نمبر اس پیمانہ پر شائع ہو سکا ہے۔ ورنہ تنہا میری کیا بساط تھی کہ چار سو صفحات کے بجائے ساڑھے چھ سو سے زائد صفحات کا یہ نمبر اعلان کے مطابق وقت پر پیش کر سکتا۔ جوش نمبر اگر ان توقعات کو پورا کر سکا جو ساری اردو دنیا نے افکار سے وابستہ کر رکھی تھیں تو میں سمجھوں گا کہ میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری ہو گئی، اور وہ تمنا اس شعر کی رہینِ منت ہے جسے مولانا شوکت علی مرحوم نے ربع صدی پہلے زمانۂ طالب علمی میں میری آٹوگراف بک پر اپنے قلم سے تحریر فرمایا تھا۔

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

صہبا

جوش ملیح آبادی

خطرناک اقدام

یادش بخیر، میرے لڑکپن میں دادی جان نے مجھ سے ایک روز فرمایا تھا کہ بیٹا، تیرے پردادا کی سواری جب نکلتی تھی تو اس کے آگے آگے نقیب بولا کرتے تھے "ہٹو بچو، سواری آ رہی ہے نواب فقیر محمد خاں بہادر کی۔" سُنتا تھا کہ تاریخ اپنے کو دہراتی ہے، آج دیکھ رہا ہوں کہ تاریخ اپنے کو دہرا رہی ہے۔ صہبا صاحب نے مجھے "جوش نمبر" کے ہاتھی پر بٹھا کر میرا جلوس نکالا ہے اور للکار رہے ہیں کہ "ہٹو، بچو، سواری آ رہی ہے اس صدی کے عظیم شاعر کی۔" دادا جان کی سواری کے آگے تو نقیبوں کا بولنا سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اودھ کے امرائے دولت میں سے ایک جلیل القدر شخصیت کے مالک تھے۔ لیکن اُن کے خانماں برباد و کم سواد پوتے صاحب یعنی ہیچمداں شبیر حسن خاں کے جلوس مبارک کو دیکھ کر صرف حیرت ہی نہیں ہوتی، ہنسی بھی آتی ہے۔

جی ہاں، میں نے اپنی شخصیت کے ہر گوشے کو اچھی طرح ناپ تول کر اور اپنی تمام استعداد و اہلیت کو خوب ٹھونک بجا کر اپنے کو ناقص پایا اور ہیچمداں کہا ہے۔ اللہ نہ کرے کہ کوئی اللہ کا بندہ اس مغالطے میں گرفتار ہو جائے کہ میرے اس اعلانِ ہیچمدانی و اعترافِ بے کمالی کی پشت پر، معاذ اللہ، وہ ناروا چیز کام کر رہی ہے جس کو اربابِ ایشیا بالعموم اور اہلِ پاکستان و ہندوستان بالخصوص "انکسار" کا خطاب دے کر سراہتے ہیں اور اس کے ایمار پر اپنے کو "ناچیز، فدوی، ہیچ مدان، بے علم، کم بیں، کوتاہ نظر، ناکارہ، خاکسار، جاہل، روسیاہ اور ارذل الناس" کہہ کر پکارتے اور اس چکر میں آ کر رفتہ رفتہ ویسے ہو بھی جاتے ہیں۔

اہلِ نظر کے نزدیک انکسار ہو یا استکبار، یہ دونوں مرض ہیں اور ایسے کہ افراد و اقوام کی شخصیت و سیرت کو آخرکار پاش پاش کر کے رکھ دیتے ہیں۔

انکسار، میری بارگاہ میں اس بنا پر بھی بار نہیں پا سکتا کہ مجھے امکانی حد تک اپنے جوہرِ طبع کی معرفت کا شرف حاصل ہے۔ اور اپنی اس برتری پر میں فخر بھی محسوس کرتا ہوں، اور جب اس تلاطم فخر میں تموّج پیدا ہوتا ہے تو میں اس کی بے پروا موجوں سے اُبھر کر کبھی کبھی ؎

"میں شاعر آخر الزماں ہوں اے جوش"

کا نعرہ بھی لگا بیٹھتا ہوں۔ لیکن جب جب اپنی رجز خواں حبِ ذات پر میں اپنی جذبِ تحلیلِ صفات کو دھاوا بول دینے کا اشارہ کرتا ہوں، اُس وقت یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ ہر چند انسان کا جوہرِ طبع اس کے قعرِ ذات کا سنگِ بنیاد ہوتا ہے۔ لیکن جب تک اس جوہرِ گراں مایہ کو تنگی و بستگی کے فشار سے رہائی نہیں دی جاتی، اُس جوہر میں اس قدر طاقت پیدا نہیں ہوتی کہ وہ کسی شخص کی ذات کو تکمیل و اتمام کی دولت سے مالامال کر دے۔

قدرت کے بخشے ہوئے جوہرِ طبع اور کان سے نکلے ہوئے ہیرے میں بلا کی مماثلت ہوتی ہے۔ جس طرح کان سے نکلے ہوئے خاک آلودہ و بے آب ہیرے کو جس وقت تک کہ کسی ماہرِ فن جوہر نواز کی چٹکی خاک سے اٹھا کر بڑی صنعت پرور باریک بینی اور بے انتہا سبک دستی کے ساتھ اجال اور تراش کر اس کی جوت کو نہیں جگا دیتی اُس وقت تک وہ کسی کی طرفِ کلاہ اور کسی خاتمِ زریں کو دمکا دینے والی چھوٹ سے یکسر محروم رہتا ہے۔

اسی طرح انسان کے جوہرِ طبع کے دُھندلے افق پر جس وقت تک کہ عالمگیر مطالعہ، کائنات نگر مشاہدہ، حقائق شکار تفکر، کونین کش تجسس اور آفاق بدوش علم، ہزاروں نجموں اور لاکھوں رنگینیوں کے ساتھ طالع ہو کر اُسے ایک شعلۂ جوالہ میں تبدیل نہیں کر دیتا، اس وقت تک یہ پر بستہ جوہر کسی ابدی درخشندگی کو جنم نہیں دیتا، اور ایک پھلجڑی کی سی چمک دمک دکھا کر اور ؎

"خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود"

کے نوحے میں تبدیل ہو کر پل بھر میں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ سو بندہ نواز میں ابھی تک اسی منزل میں ہوں۔ جوہرِ طبع تو میرے وجود کی جیب میں ضرور ہے لیکن اس کا تمنائی ہوں کہ کاش یہ نایاب جوہر ترش بھی جاتا، اور ترشنے کی تکمیل کے ساتھ ترش جاتا

ہاں، یہ درست ہے کہ میں گرجتی ہوئی شہرت کا مالک ہوں۔ ہندوستان و پاکستان کی محراب میرے نام سے گونجی ہوئی ہے۔

میری جوانی کیا کیا اتراتی تھی اس کلبانگِ شہرت کی تانوں پر میری نوعمری کیا کیا چہکتی تھی اس نام وری کی لچکتی شاخوں پر، اور میری رگ رگ میں کتنے براتوں کے جلوس گذرا کرتے تھے اس خیال سے کہ میں گھر میں بیٹھا ہوا ہوں اور میرا نام دُور دُور سفر کرتا پھر رہا ہے۔ سفید داڑھیوں اور سیاہ گیسوؤں کی فضا پر میرا نام اُڑتا چلا جا رہا ہے۔ بوڑھے عالموں کے عماموں میں میرا نام کلغی کی طرح ابھرا ہوا ہے، اور نوخیز دوشیزاؤں کے کانوں میں میرا نام بُندے کی طرح دمک رہا ہے۔

لیکن اب، جب کہ ماہ و سال کے بہت سے کارواں میرے سر سے گذر چکے ہیں، اور ان کی گردِ راہ میرے بالوں پر سفید سفوف کی طرح جم چکی ہے تو بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کتنی بے حقیقت معلوم ہو رہی ہے اپنی یہ شہرت۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں خواب میں کسی کھنڈر سے گذر رہا ہوں۔ اُس کھنڈر کے سامنے ایک ٹوٹی سی قبر ہے۔ اور اُس قبر سے یہ دردناک آواز آ رہی ہے کہ ؎

"میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا"

میں سوچتا ہوں کہ اگر علم و نظر کے فقدان کی بنا پر نامراد ہندوستان و پاکستان پر اِس 'بلا' کا گھٹا ٹوپ اندھیرا نہ چھایا ہوتا تو میری ذات کے اس ٹمٹمانے سے دیئے کو گیس کا ایک بڑا سا ہنڈا کیوں مان لیا جاتا۔ اور اگر میرے گرد و پیش دیا سلائیوں کے سے قد رکھنے والے افراد چلتے پھرتے نظر نہ آتے تو ایک میرے سے پستہ قد انسان کو لنکا والا کیوں تسلیم کر لیا جاتا۔

صد حیف کہ شدید ظلمت نے جگنو کو آفتاب کا لقب دے دیا۔ بڑوں کے نہ ہونے نے چھوٹوں کو بڑا بنا دیا، اور اندھوں میں کانے کو "راجہ" کا تاج پہنا دیا گیا۔

صحتِ عقل کے ایما سے میں ایک اور بات بھی کہنا چاہتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ اس یقین نہ کرنے میں آپ کی کوئی خطا نہیں —— اس میں خطا ہے ان اسیرانِ تکلفات اور اُن بندگانِ انکسار کی جو اپنے کو پست دکھانے ہی میں اپنی بلندی سمجھتے تھے۔ انہیں لوگوں نے بے شمار جاروب کش الفاظ کے ذریعے اپنی تنقیص کر کر کے آپ کے چاروں طرف اتنے جھوٹ کے پہاڑ کھڑے کر دیئے ہیں کہ اگر اب آپ کے سامنے کوئی اپنے عجز و نقص کا سچے دل سے بھی اعتراف کرتا ہے تو آپ اسے "ایں ہمہ بچۂ شتر است" سمجھ لیتے ہیں، اور اُس کے انکسارِ دروغ باف پر نگاہ کر کے آپ کے لبوں پر ہیں ہیں مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے —— لیکن آپ کو یقین آئے یا نہ آئے مجھے آپ سے نہ کسی صلے کی تمنا ہے نہ اُمید ہی، مگر میں یہ بات آپ سے کہوں گا ضرور کہ جب میں اس مختصر سے کرۂ ارض کے کائنات در جیب عظیم ادب کا مطالعہ کرتا ہوں تو اس اُدھیڑ بُن میں پڑ جاتا ہوں کہ میں درحقیقت سرے سے شاعر ہوں بھی کہ نہیں؟

یہ دراصل ایک نہایت اہم اور بے حد سنجیدہ سوال ہے —— لیکن یہ سوچ کر بہت مایوسی ہوتی ہے کہ نہ میں خود، نہ شاید میرے معاصرین ہی اس سوال کا جواب دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

میں تو اس سوال کا جواب اس وجہ سے نہیں دے سکتا کہ مجھے اپنی ذات سے تا حدِ حیثیت قرب حاصل ہے، اور اس حد کا "بلا فصل" "قرب و اتصال" انسان کی قوتِ فیصلہ اور اس کی ذات کے مابین ایک ایسا بے نہایت فاصلہ ہوتا ہے کہ اپنے باب میں نپی تُلی رائے قائم کرنے کا کوئی امکان ہی پیدا نہیں ہونے پاتا۔ اپنے کو پڑھ لینے کا تو ذکر کیا، اگر آنکھوں سے معتدل فاصلے پر نہ رہے تو کتاب بھی پڑھی نہیں جا سکتی۔ کیا آپ نے تجربہ نہیں کیا ہے کہ جب معتدل فاصلے سے گذر کر کتاب آنکھوں سے پیوست ہو جاتی ہے، تو انسان کو سطروں کی سیاہی کے سوا اور کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔

اب رہے مجھ سے ملنے جلنے والے معاصرین —— سو وہ دو ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک چھوٹی سی ٹولی ہے ان احباب کی جو اشتراکِ ماحول و مزاج کی بنیاد پر مجھے پسند کرتی اور سراہتی ہے۔ اور ایک بہت بڑی ٹولی ہے اُن اصحاب کی جو اختلافِ ماحول و مزاج اور تعصباتِ گوناگوں کی بنیاد پر مجھے ناپسند کرتی اور برا کہتی ہے اور انہیں وجوہ سے یہ دونوں ٹولیاں بھی اس سوال کا معقول جواب نہیں دے سکیں، اس لئے کہ

محبت یا نفرت کے بطون سے پیدا ہونے والی رائیں ساقط الاعتبار ہوا کرتی ہیں۔

اس سوال کا باون تولے پاؤ رتی جواب دیا جائے گا اُس وقت جب کہ میری موت پر دو ڈھائی سو برس کا زمانہ گذر چکا ہوگا۔ اور نئی نسل کے عوام میں بھی یہ گھٹیا پن باقی نہیں رہے گا جو آج کل کے خواص کو بھی صوبوں، مزاجوں، قبیلوں، مذہبوں اور فرقوں کے اختلافات کی بنا پر غرغرانے اور خوخیانے پر بڑی آسانی کے ساتھ اکساتا رہتا ہے۔

چنانچہ ان تمام مندرجۂ بالا امور پر نگاہ کر کے میں نے بڑی دل سوزی کے ساتھ صہبا صاحب لکھنوی کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ "جوش نمبر" اول تو سرے سے نکالیں ہی نہیں۔ اور اگر ان کا دل اس بات پر ایسا ہی مصر ہے تو وہ میرا نمبر نکالنے کے لئے میری موت کا انتظار فرمائیں۔ اور میں نے ان سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اس سلسلے میں انہیں زیادہ زحمتِ انتظار گوارا نہیں کرنا پڑے گی۔ اس لئے کہ ماہ و سال کی گردش، معاصرینِ کرام کی پیہم نوازشوں اور خدائے بندہ پرور کی رحمت و بخشش نے میری موت کو مجھ سے بہت زیادہ قریب فرما دیا ہے۔ ع

دریائے زندگی کا وہ آ گیا کنارا

اور اسی کے دوش بدوش میں نے صہبا صاحب کو اس خطرناک صورتِ حال سے بھی آگاہ کر دیا تھا کہ میں اپنی قوم کا ایک معتوب، مبغوض اور مغضوب انسان ہوں، اور اس بنا پر مغضوب ہوں کہ میری قوم کے نزدیک مجھ میں یہ بدترین عیب پایا جاتا ہے کہ میں اقوال و اساطیر، روایات و ملفوظات، کلیات و مسلّمات اور ایقان و اعتقاد کو محکم دلائل کی کسوٹی پر کسے بغیر قبول نہیں کرتا۔ تشکک کو عرفان و حقائق کی کنجی سمجھتا، تقلید پر اجتہاد کو فوقیت دیتا، بے سمجھے بوجھے ایمان پر سمجھے بوجھے کفر کو ترجیح دیتا ہوں، اور کلمۂ حق کے اظہار و اعلان میں اس بلا کا جری واقع ہوا ہوں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے دبکنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ان حالات میں صہبا صاحب سے میں نے کہا تھا کہ اگر آپ جوش نمبر نکالیں گے تو میری بھولی بھالی قوم کے دل میں میری محبت کا بیج تو بو نہیں سکیں گے البتہ بیٹھے بٹھائے ہزاروں آدمیوں کو اپنا دشمن بنا لیں گے، اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنے بہت سے دوستوں کی رفاقت سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ آپ کے تمام پرچے تو میرے پرخچے اڑا دینے کے شوق میں جلد سے جلد خرید لئے جائیں گے لیکن میری وہ قوم جس کی ذہنی خدمت کے ذوق نے میری ہر دلعزیزی کے شیشے کو چور چور کر ڈالا ہے۔ آپ کو اس طرح آڑے ہاتھوں لے گی کہ پرچے بکنے اور بات نکل جانے کی خوشی کو بھول کر آپ اس قدر پریشان ہو جائیں گے کہ رونے کو مزدور بھی نہیں ملیں گے۔ لیکن جناب صہبا پر صد آفریں کہ انہوں نے میری نصیحت کے الفاظ کو ٹڈیوں کے مانند مار مار کر گرا دیا، اور "جوش نمبر" کی اشاعت کا آخر کار ارتکاب کر ہی بیٹھے۔ ؎

شبِ وصال یہ اندھیر کیا کیا میں نے
کہ ان کو لے کے تہِ آسماں نکل آیا

بہت خوب لیجئے۔ یہ "جوش نمبر" حاضر ہے ——— گرم دھم، گرم دھم ——— "مبارک باد مرگ تو بائستاد" کی دکان میں سے مال کا انبار لگا دیا گیا ہے۔ ع

رشکِ مقتل نہ بنے مصر کا بازار کہیں
یوسف کو جلا دیں نہ خریدار کہیں

جوش
کراچی
۱۶/۱۰/۶۱

صہبا لکھنوی

جوش ملیح آبادی

زندگی، شخصیت اور فن کا ایک جائزہ

دانائے رموزِ این و آں ہوں اے جوش — مولائے اکابرِ جہاں ہوں اے جوش
کیوں اہلِ نظر پڑھیں نہ کلمہ میرا — میں شاعرِ آخر الزماں ہوں اے جوش

خاندانی نام — شبیر احمد خاں
تبدیلیٔ نام — شبیر حسن خاں (۱۹۰۸ء)
تخلص — جوش
صحیح تاریخ و سنہ پیدائش: ۵ ردسمبر ۱۸۹۸ء
بمقام — ملیح آباد

نوٹ: اردو رسالوں اور ادبی تاریخوں میں آج تک جوش کا سنہ پیدائش ۱۸۹۶ء اور مقام پیدائش لکھنؤ شائع ہوتا رہا ہے، جو غلط ہے۔ ثبوت کے طور پر جوش کی تحریر کا عکس پیش ہے۔ یہ ان کے مسودات سے ہم نے حاصل کیا ہے:

این جانب کی تاریخ پیدائش ۵ ردسمبر ۱۸۹۸ء
(وقتِ پیدائش — صبح چار بجے)
این جانب کا قد شریف ۵ فٹ ۸ انچ
جنوری سنہ ۱۹۴۳ء جوش

اب و جد

خاندان : آفریدی علی خیل
والد : نواب بشیر احمد خاں بشیر
دادا : نواب محمد احمد خاں احمد
پردادا : حسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں گویا
سگڑدادا : محمد بلند خاں

محمد بلند خاں درۂ خیبر سے گذر کر فرخ آباد آئے۔ وہاں سے بعہد والیٔ ریاست نواب محمد امیر خاں (ٹونک) پہونچے اور ٹونک سے اودھ میں آئے۔ نواب فقیر محمد گویا نے ملیح آباد سے میل بھر دور ایک قصبہ خرید کر اُس کا نام اپنے کارکن میرزا حسو بیگ کے نام پر میرزا گنج رکھا، وہیں یہ سارا خاندان آباد ہوا۔

وراثتِ شعر و ادب

نواب بشیر احمد خاں بشیر　"کلامِ بشیر" (مجموعۂ کلام)
نواب محمد احمد خاں احمد　"مخزن الالہام" (مجموعۂ کلام)
نواب فقیر محمد خاں گویا (مجموعۂ کلام) "دیوانِ گویا"

بیگم (نواب محمد احمد خاں احمد۔ جوش کی دادی) میرزا غالب کے خاندان سے تھیں، اور شعر و ادب سے خصوصی شغف رکھتی تھیں۔ جوش کی تعلیم و تربیت میں اُن کا بڑا حصہ ہے۔

جوش کے اب و جد سُنی تھے، لیکن جوش نے دادی کے عقیدۂ شیعت کو قبول کرتے ہوئے ۱۹۰۷ء میں اپنا نام بھی تبدیل کر لیا، لیکن بقول ل۔ احمد اکبرآبادی "اب اُن کا مذہب وہی سمجھنا چاہئے جو تمام اہلِ نظر و حکمت کا ہوتا ہے یعنی انسانی ہمدردی"۔

جوش کے ننھیال اور ددھیال میں سبھی شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ جوش کے ماموں نواب رستم علی خاں سپہر اور والدہ کے ماموں میرزا خادم حسین رئیس اکبرآبادی صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔

جوش اور بھائی بہن

شفیع احمد خاں ولی ——— وفات ۱۹۵۸ء
شبیر احمد خاں جوش
رئیس احمد خاں رئیس
افسر جہاں بیگم (وفات: ۱۹۲۰ء)
انیس جہاں بیگم
حشمت آراء بیگم
شوکت آراء بیگم

پہلا شعر

سنہ ۱۹۰۷ء میں صرف ۹ برس کی عمر میں پہلا شعر کہا:

شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے
یہ مرا فنِ خاندانی ہے

ابتدائی تعلیم

عربی — مرزا محمد ہادی رسوا (صاحب "اُمراؤ جان ادا") سے پڑھی۔
فارسی اور اردو کی تعلیم مولانا قدرت اللہ بیگ ملیح آبادی (جنہوں نے ۵ ہزار اشعار کی مثنوی بے نقط لکھی) مولوی نیاز علی خاں ملیح آبادی اور مولانا طاہر سے حاصل کی۔ انگریزی ماسٹر گومتی پرشاد ملیح آبادی نے پڑھائی۔

اسکول اور کالج کی تعلیم

سیتا پور اسکول، جبین آباد ہائی اسکول، جوبلی ہائی اسکول، سینٹ پیٹرس ہائی اسکول اور چرچ مشن ہائی اسکول (لکھنؤ) میں تعلیم پانے کے بعد ۱۹۱۳ء میں علی گڈھ کے ایم۔ اے۔ او کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۴ء میں آگرہ گئے...... اور

سینٹ پیٹرس کالج میں سینیر کیمبرج تک تعلیم حاصل کی
۱۹۱۰ء میں شانتی نکیتن گئے، اور تقریباً ۶ ماہ رہے۔

شادی

نکاح ———— ۱۹۰۷ء
رخصتی ———— ۱۹۱۶ء

بیوی، بچے

اشرف جہاں بیگم
(نظمیں بعنوان: "شریک زندگی سے خطاب" اور "رفیقۂ حیات سے" انتخاب میں شامل ہیں)

لڑکی : سعیدہ خاتون
لڑکا : سجاد حیدر
(نظم "سجاد سے" انتخاب میں شامل ہے)

ملازمت

۱ - دارالترجمہ حیدرآباد دکن (۱۹۲۵ء)
ناظر ادب کے عہدے سے علیحدگی (۱۹۳۴ء)
۲ - مدیر "آج کل" دہلی (۱۹۳۸ - ۱۹۵۵ء)
۳ - مشیر ادبی، مدیر لغت، اور مدیر رسالہ "اردو نامہ" ترقی اردو بورڈ کراچی
(جون ۱۹۵۸ء)

ادارت

۱ - مدیر ماہنامہ "کلیم" دہلی
(۱۹۳۵ - ۱۹۳۹ء)
۲ - مدیر اعلیٰ ماہنامہ "نیا ادب" اور "کلیم" لکھنؤ
(۱۹۴۰ - ۱۹۴۱ء)

پہلی نظم

۱۱ - ۱۲ برس کی عمر تک غزل کہی۔ ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ وحیدالدین سلیم پانی پتی کے مشورے اور رہبری پر غزل کے ساتھ ساتھ نظم گوئی کا آغاز کیا۔ پہلی نظم کا عنوان "ہلالِ محرم" ہے۔ یہ نظم جوش کے پاس بھی محفوظ نہیں۔

خطابات و اعزازات

○ شاعرِ انقلاب :- پہلی بار مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنے اخبار "ہند" کلکتہ میں سنہ ۱۹۳۰ء میں جوش کو "شاعرِ انقلاب" لکھا۔

○ شاعرِ اعظم : منشی دیانرائن نگم مدیر رسالہ "زمانہ" کانپور نے ۱۹۳۵ء میں "شاعرِ اعظم" لکھا جسے فراق گورکھپوری نے بصورتِ انتساب دہرایا۔

○ شاعرِ انقلاب اور "شاعرِ اعظم" کے علاوہ ہندوستان کے مختلف رسالوں میں آپ کے نام کے ساتھ شاعرِ شباب، مصورِ شباب وغیرہ بھی لکھا جانے لگا۔

○ حکومت ہند نے اپنے سب سے بڑے ادبی اعزاز "پدما بھوشن" سے بھی آپ کو نوازا۔

تلمذِ سخن

۷ برس تک عزیز لکھنوی سے اصلاحِ سخن لی۔ پھر یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

نظم و نثر کا پہلا مجموعہ

"روحِ ادب" ۱۹۲۰ء

معنوی اساتذہ

• حافظ • نظیری • خیام • انیس • نظیر اکبر آبادی • غالب • اقبال • ٹیگور

علم و مُطالعہ

سنہ ۱۹۱۰ء میں شانتی نکیتن سے واپسی کے بعد جوش نے جائیداد کی دیکھ بھال کے علاوہ اپنا بیشتر وقت ادب، تاریخ، فلسفہ اور شاعری وغیرہ کے گہرے مطالعہ میں صرف کیا۔

ادبیات — میں انہوں نے شیکسپیئر، گوئٹے، دانتے، ملٹن، ٹالسٹائی، ورڈزورتھ، شیلے، کیٹس، بائرن اور برنارڈ شا سے۔

فلسفہ میں سقراط، افلاطون، ارسطو، کانٹ، ہیگل، مارکس، برگساں، نطشے، شوپنہار اور ہیوم سے۔

سائنس میں آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت سے ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اور جینس جین کی پُراسرار کائنات سے

مذہبیات میں قرآن مجید، انجیل، توریت، زبور، اوستا، وید، اپنشد اور گیتا کی حکمت سے۔

تاریخ میں — تاریخ اسلام، مہابھارت اور رامائن کے پیغام سے۔

ہندی شعراء میں کالی داس، سورداس، بھوتی، تلسی داس، کبیر داس، ملک محمد جائسی، اور رحیم خان خاناں — اور......

فارسی میں سعدی، حافظ، خیام، نظیری، فردوسی، عرفی، قاآنی، سرمد، بابا فغانی، صائب اور بیدل کی ہمہ گیر شاعری سے — نہ صرف بھرپور استفادہ کیا، بلکہ فکری طور پر متاثر بھی ہوئے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ شاعری ایک اہم منصب ہے۔ میری دانست میں ایک شاعر کو بحر العلوم ہونا چاہئے ورنہ اس کی شاعری روح عصر کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جوش کی شاعری ماضی کی عظیم و پرشکوہ روایات کی امین ہونے کے ساتھ ساتھ حال کی آئینہ دار اور مستقبل کی نقیب ہے۔

جوش کی بین الاقوامی حیثیت

۹ برس کی عمر سے ۶۳ برس کی عمر تک جوش ایک لاکھ سے زائد اشعار کہہ چکے ہیں ۷۰ ہزار اُن کے مجموعوں میں موجود ہیں، غیر مطبوعہ اشعار کی تعداد تقریباً ۴۰ ہزار ہے۔ اُن کی مشہور اور طویل ترین نظم "حرفِ آخر" جسے انہوں نے سنہ ۱۹۴۱ء میں شروع کیا تھا تقریباً ۴۰ ہزار اشعار پر مشتمل ہوگی، جسے وہ نصف کے قریب مکمل کر چکے ہیں، دنیا کی کسی زبان میں کسی زندہ یا مرحوم شاعر کا اتنا سرمایۂ ادب نہیں جتنا جوش نے تعداد اشعار، ذخیرۂ الفاظ اور متنوع موضوعات کے اعتبار سے اردو کو دیا ہے۔

جوش کا کلام دُوسری زبانوں میں

پاک و ہند کی تقریباً تمام علاقائی زبانوں کے علاوہ جوش کا کلام فارسی، انگریزی، روسی، چینی، یوگوسلاوی اور چیک زبانوں میں بھی منتقل ہو چکا ہے!

جوش فلمی دنیا میں

سنہ ۳۴ء تا اوائل سنہ ۴۸ء جوش فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ بیشتر زمانہ پونے میں گذرا۔ جہاں وہ ڈبلیو زیڈ احمد کی شالیمار پکچرز کے لئے گانے اور مکالمے لکھتے رہے۔ من کی جیت ۔ ان کی مشہور ترین فلموں میں سے ہے جس کے بیشتر گانے آج تک مقبول خاص و عام ہیں۔ کچھ دنوں انہوں نے بمبئی میں بھی گذارا۔ اور کئی فلموں کے گانے لکھے لیکن سچ تو یہ ہے کہ فلمی دنیا انہیں راس آئی نہ وہ خود کو فلمی ماحول سے وابستہ رکھ سکے۔

ایک پیش گوئی

پریم چند اور جوش ایک شب محو گفتگو تھے۔ رات گئے تک یہ بزم جمی رہی۔ رخصت ہوتے ہوئے جوش نے پریم چند کو یہ رباعی فی البدیہہ کہہ کر دی ۔

ممکن ہے کہ اب جشن خرابات نہ ہو
اس رات کے بعد پھر کوئی رات نہ ہو
ٹھہرو کہ گلے تو مل لیں جانے والو
ممکن ہے کہ اب کبھی ملاقات نہ ہو

دوسرے روز صبح پریم چند کا انتقال ہو گیا، اور یہ شاعر اعظم کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔

چند دلچسپ انتسابات

○ اے صبح صادق اے عروس فطرت! میں اس ناچیز تصنیف کو تیرے نورانی قدموں سے مس کرنے لایا ہوں .... اسے قبول کر ..... اگر تو نہ مسکراتی تو کارخانۂ قدرت میں غور کرنے والا شاعر لوح محفوظ کا مطالعہ کبھی نہ کر سکتا اور نہ مشاہدہ معنی کا رخسار ہی دیکھ سکتا۔

تیرا پرستار
جوش
(روح ادب)

○ امیر فکر و تخیل شاعر اعظم کے نام
(سنبل و سلاسل)

رباعیات

○ خیام کے مقام!
(جنون و حکمت)
(رباعیات بعنوان خمریات)

○ بنام قوت و حیات!
(شاعر کی راتیں، آیات و نغمات، عرش و فرش، سنبل و سلاسل، سرود و خروش، اور سموم و صبا)

چند مقبول ترین تخلیقات

★ — جنگل کی شہزادی
● — ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے
★ — مناظر سحر
● — نغمۂ خانقاہ
★ — کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسین
چرخ نوع بشر کے تارے ہیں حسین
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین
● نظم — ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روز حساب تیرا
★ نظم — نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی

جوش پر پہلی کتاب

پروفیسر احتشام حسین نے جوش کی زندگی، شخصیت اور فن پر پہلی کتاب مکمل کر لی ہے جو چھپ رہی ہے۔

جوش کی مطبوعہ تصانیف

شعری مجموعے: (۱) روحِ ادب — نظم و نثر کا پہلا مجموعہ — ۱۹۲۱ء — دہلی

اس میں چند رنگین تصویریں بھی تھیں۔ شروع میں رفیع احمد خاں (مرحوم) کا ایک طویل مقدمہ شامل تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۳ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں تصویریں بھی نہیں تھیں، اور پہلے مقدمے کے بجائے خود جوش نے پہلی بار دیباچہ لکھا تھا (یہ دیباچہ اس نمبر میں شامل ہے)۔ اس کے بعد کئی ایڈیشن نکلے۔

۲۔ شاعر کی راتیں — رات کے متعلق چند نظموں کا مجموعہ — ۱۹۳۳ء

اس کی زیادہ تر نظمیں نقش و نگار میں شامل ہو گئیں۔

۳۔ نقش و نگار — نظموں کا مجموعہ — ۱۹۳۶ء — دہلی

بعد میں کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

۴۔ شعلہ و شبنم — نظموں اور غزلوں کا مجموعہ — ۱۹۳۶ء — دہلی

اس کے بعد کئی ایڈیشن چھپے۔ اس مجموعے میں "جذباتِ فطرت" "آوازۂ حق" اور "پیغمبرِ اسلام" جیسی مشہور نظمیں جو علیحدہ چھپ چکی تھیں، شامل کر لی گئیں۔

۵۔ فکر و نشاط — نظموں کا مجموعہ — ۱۹۳۷ء — دہلی

۶۔ جنون و حکمت — رباعیوں کا مجموعہ — ۱۹۳۷ء — دہلی

۷۔ حرف و حکایت — نظموں کا مجموعہ — ۱۹۳۸ء — دہلی

۸۔ آیات و نغمات — نظموں کا مجموعہ — ۱۹۴۱ء — لاہور

اس میں "حسین اور انقلاب" شامل ہے جو کتابی صورت میں علیحدہ چھپی ہے۔

۹۔ عرش و فرش — نظموں کا مجموعہ — ۱۹۴۴ء — بمبئی

۱۰۔ رامش و رنگ — نظموں کا مجموعہ — ۱۹۴۵ء — بمبئی

اس میں طویل نظم "حرفِ آخر" کے کچھ حصے شامل ہیں۔

۱۱۔ سنبل و سلاسل — نظموں کا مجموعہ — ۱۹۴۷ء — بمبئی

اس میں طویل نظم "دفتر کی آواز" جو پہلے الگ سے شائع ہوئی تھی شامل ہے۔

۱۲۔ سیف و سبو — خود جوش کا کیا ہوا نظموں کا انتخاب — ۱۹۴۳ء

لاہور اور بمبئی سے ایک ساتھ شائع ہوا۔

۱۳۔ سرود و خروش — نظموں کا مجموعہ — ۱۹۵۳ء — دہلی

۱۴۔ سموم و صبا — نظموں کا مجموعہ — دہلی

۱۵۔ طلوعِ فکر — مراثی، منقبتیں — ۱۹۵۷ء — کراچی

نثری مجموعے: (۱) مقالاتِ زرّیں　　نثر میں مختصر اقوال کا مجموعہ　　۱۹۲۱ء　　لکھنؤ

۲۔ اوراقِ سحر　　نثر و نظم میں صبح کے متعلق چند شاعرانہ اقوال　　۱۹۲۱ء　　لکھنؤ

۳۔ اشارات　　نثر کے مضامین جو رسالہ "کلیم" دہلی میں شائع ہوتے تھے　　۱۹۴۲ء　　دہلی

غیر مطبوعہ اور زیرِ ترتیب مجموعے

نظم

۱۔ ۵۵ء سے ۶۱ء تک نظموں کے دو مجموعے

۲۔ رباعیات کا ایک مجموعہ　　۳۰۰ رباعیوں کا ایک مجموعہ ریڈ کراس کراچی کے مشاعرے میں گم ہوا، جس کا آج تک پتہ نہیں چل سکا۔

۳۔ طویل نظم "حرفِ آخر"　　بیس ہزار سے زائد اشعار کہہ چکے ہیں　　(نامکمل)

نثر:

۔ مسائلِ حیات　　ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ، جس کے کچھ حصے رسالہ "کلیم" میں شائع ہو چکے ہیں۔

۲۔ لغاتِ مترادفات　　انگریزی کے مترادف اور قریب المعنی الفاظ کا اردو ترجمہ　　(نامکمل)

۳۔ لغاتِ مرکبات　　مرکب اردو الفاظ کا لغت　　(نامکمل)

۴۔ لغاتِ مخففات　　(نامکمل)

۵۔ یادوں کی برات　　خود نوشت سوانح عمری　　(نامکمل)

ترقی اردو بورڈ اور جوش

پاکستان آنے کے بعد جوش نے ترقی اردو بورڈ کا لائحۂ عمل اور تدوینِ لغت کا واضح نقشہ حکومتِ پاکستان کو پیش کیا۔ چنانچہ بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ جوش نے مشیرِ ادبی و علمی حیثیت سے ۲ ۲½ سال کے مختصر عرصے میں اپنے رفقائے کار کے تعاون سے تدوینِ لغت کا جو صبر آزما کام شبانہ روز محنت کے بعد سرانجام دیا ہے۔ وہ دس سال میں بھی ممکن نہ تھا۔ ان حالات میں جبکہ نہ حوالے کی تمام کتابیں اب تک دستیاب ہو سکی ہیں نہ پورا عملہ میسر ہے نہ بورڈ کے پاس اپنی عمارت ہے۔ اس کے برعکس آکسفورڈ ڈکشنری سالہا سال کی سعی و کاوش کے بعد مکمل ہو سکی تھی، اور پوری برطانوی قوم نے اس کی تدوین میں رضاکارانہ طور پر حصہ لیا تھا۔

کتابیات

جوش ملیح آبادی پر آج تک مختلف کتب و رسائل میں جو مضامین، تذکرے اور تبصرے شائع ہوئے ہیں اُن میں سے چند اہم کی تفصیل درج ذیل ہے۔ یہ فہرست جوش پر کام کرنے والوں کے لئے ہمیشہ ممد و معاون ثابت ہوگی۔

کتابیں

موضوع	نوعیت	کتاب	مصنف
روحِ ادب	تنقید	محشرِ خیال	سجاد انصاری
شاعر کی راتیں	"	اثر کے تنقیدی مضامین	اثر لکھنوی
جوش ملیح آبادی کی بعض نظمیں		انتقادیات	نیاز فتحپوری
جوش	تذکرہ	آیاتِ وجدانی	میرزا یگانہ چنگیزی
جوش	"	ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری
جوش	"	داستانِ تاریخِ اردو	حامد حسن قادری
جوش	"	دیباچہ انتخابِ جدید	آلِ احمد سرور و عزیز احمد
جوش	"	تنقید کیا ہے؟	"
سرود و خروش	تبصرہ	ادب اور نظریہ	"
جوش کی غزلیں [1]	"	نئے اور پرانے چراغ	"
جوش ملیح آبادی	حالاتِ زندگی و انتخابِ کلام	اوراقِ گل	مرتبہ: ضمیر احمد ہاشمی
جوش	تذکرہ	ایک ادبی ڈائری	اختر انصاری (علیگ)
جوش	تنقید	ترقی پسند ادب	سردار جعفری
جوش	"	ترقی پسند ادب	عزیز احمد
جوش	"	نیا ادب	کشن پرشاد کول
جوش	تذکرہ و تبصرہ	غزل و متغزلین	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
جوش ملیح آبادی	" تنقید	جدید اردو شاعری	عبدالقادر سروری
جوش ملیح آبادی	حالاتِ زندگی و انتخابِ کلام	جدید شعرائے اردو	مرتبہ: ڈاکٹر عبدالوحید
جوش	تذکرہ و تنقید	مختصر تاریخِ ادبِ اردو	ڈاکٹر اعجاز حسین
جوش کے کلام پر نفسیاتی تنقید	"	اردو زبان و ادب	ڈاکٹر مسعود حسین
جوش	تذکرہ	روشنائی	سجاد ظہیر

[1] اصل عنوان مضمون " جدید غزل گو شعرا" ہے

جوش کی انقلابی شاعری	تنقید	انداز نظر	صفیہ اختر
جوش	تذکرہ	چھوئی موئی	عصمت چغتائی
جوش	تذکرہ	ہندوستان کی آزادی میں اردو شعراء کا حصہ	مرتبہ: چنگیزی

رسالے

جوش ملیح آبادی	جامعہ دہلی ۳۰ء	اسرائیل احمد خاں
جوش کی شاعری اور مذہبی لغزشیں	نیرنگ خیال لاہور۔ اکتوبر ۳۵ء	
حضرت جوش ملیح آبادی	زمانہ کان پور۔ ستمبر ۳۳ء	منشی دیانرائن نگم
جوش کا سیاسی مسلک	زمانہ کان پور۔ مئی ۳۴ء	گوبند پرشاد عسوی
کیا جوش منکر خدا ہیں؟	عالمگیر لاہور۔ جنوری ۴۱ء	عطاء اللہ پالوی
جوش اور دینیات (دو قسطوں میں)	تیشتان دہلی۔ اکتوبر اور نومبر ۴۱ء	ستیش چندر طالب دہلوی
اردو کا فطرت پرست شاعر	زمانہ کان پور۔ جولائی ۴۲ء	سید مظفر برنی
جوش کی شاعری پر سرسری نظر	زمانہ کان پور۔ جنوری ۴۳ء	عبادت بریلوی
جوش ملیح آبادی	آج کل دہلی۔ یکم مارچ ۴۴ء	فارسی سے ترجمہ
جوش (نظم پر تنقید)	نگار لکھنؤ۔ مئی ۴۴ء	نیاز فتحپوری
سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب (نیاز و اشہر کی نظم میں)	آج کل، دہلی۔ ۱۵ جون ۴۴ء	″ پروفیسر آغا اشہر لکھنوی
نقد الانتقاد (سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب)	آج کل دہلی۔ یکم ستمبر ۴۴ء	اثر لکھنوی
دختران حوا کا کورس (نیاز و اشہر کی نظم میں)	آج کل دہلی۔ ۱۵ ستمبر ۴۴ء	نیاز فتحپوری / پروفیسر آغا اشہر لکھنوی
انتقاد المنتقد (سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب)	آج کل، دہلی۔ ۱۵ اکتوبر ۴۴ء	″
دختران حوا کا کورس اثر کی نظر میں	آج کل، دہلی۔ یکم نومبر ۴۴ء	اثر لکھنوی
نقد الانتقاد	آج کل، دہلی۔ ۱۵ نومبر ۴۴ء	″

یک شاعر ہندی	روزگار نو لندن۔ ۱۹۴۴ء	فارسی کا سہ ماہی رسالہ

حاملان امانت کا کورس (منظوم تنقید بہ دختران حوا کا کورس)	آج کل، دہلی فروری ۴۵ء	سید نواب علی
جوش کا فلسفۂ حیات	ادبی دنیا لاہور۔ اپریل ۴۵ء	عمران یار لو
جوش کا نظریۂ شعر	کتاب لاہور۔ مئی ۴۶ء	چودھری اصغر علی

مضمون	رسالہ	مصنف
جوش شاعر انقلاب کی حیثیت سے	آج کل، دہلی۔ جون ۴۶ء	فیض احمد فیض
جوش کی شاعری کا ارتقا	کتاب لاہور، جون ۴۶ء	چودھری اصغر علی
رامش و رنگ	کتاب لاہور۔ فروری ۴۷ء	محمد عثمان
جوش کی رباعیات	فنکار، دہلی	ظ۔ انصاری
جوش ملیح آبادی	علیگڑھ میگزین علیگڑھ۔ ۵۱ء	ڈاکٹر محمد عزیز
جوش	معاصر پٹنہ۔ جلد ۲ حصہ	کلیم الدین احمد
جوش بحیثیت صناع	معاصر پٹنہ۔ جلد ۲ حصہ ۵	اختر اورینوی
جوش کا نظریۂ شعر	شاہراہ۔ سالنامہ ۵۴ء	احتشام حسین
جوش ملیح آبادی	فکر و نظر علیگڑھ ستمبر ۵۲ء	خلیل الرحمٰن اعظمی

مضمون	رسالہ	مصنف
جوش ملیح آبادی	نقوش شخصیات نمبر۔ جنوری ۵۵ء	احتشام حسین
کلام جوش پر تنقید و تبصرہ	درس علیگڑھ۔ اپریل مئی ۵۶ء	
جوش کی ایک نظم "ناخدا کی آواز"	افکار، اگست ۵۸ء	ڈاکٹر عبادت بریلوی
جوش ملیح آبادی	ادیب علیگڑھ۔ مارچ ۵۹ء	
جوش ملیح آبادی (تذکرہ و حالات)	افکار کراچی، اپریل مئی ۵۹ء	صہبا لکھنوی
جوش کی شخصیت کے چند پہلو	سویرا ۵۹ء	ڈاکٹر عبادت بریلوی
جوش ملیح آبادی کی اہمیت	افکار کراچی۔ دسمبر ۵۹ء	ڈاکٹر عبادت بریلوی
جوش کی شاعری	ادیب علیگڑھ۔ اگست ۶۰ء	

جوش ملیح آبادی

خطاب بہ صدرِ پاکستان

گذشتہ سال ۲۸ اکتوبر ۶۰ء کو صدرِ پاکستان نے ولیکا سیمنٹ فیکٹری کا سنگِ بنیاد رکھا تھا۔ ولیکا والوں کے ارباب بست و کشاد نے اس موقع پر پڑھوانے کے لئے جوش کے ایک دوست روشن علی بھیم جی کے توسط سے نظم کی درخواست کی — جوش نے یہ نظم لکھ کر بھیج دی لیکن انہیں جلسہ میں اس نظم کو پڑھوانے کی جرأت نہ ہوئی — یہ نظم اب تک غیر مطبوعہ تھی۔ (ص)

(۱)

اس زمیں پر موتیوں اور آنسوؤں کے درمیاں
مدتوں سے چل رہا ہے زندگی کا کارواں

کتنی صبحیں کھل چکی ہیں گلشنِ آفاق میں
کتنی شامیں ڈھل چکی ہیں روز و شب کے طاق میں

کھل چکے ہیں اس فضا پر آج تک کتنے علَم
گڑ چکے ہیں جادۂ اورنگ پر کتنے قدم

قیصر و اسفندیار و خسرو و بہرام و زار
کتنے تاجوں کی چمک دیکھے ہوئے ہے روزگار

ہم غریبوں کی زمینوں پر بصد ناز و غرور
چل چکا ہے بارہا کتنے امیروں کا غرور

کتنے ایوانوں کے آگے جھک چکی ہے زندگی
کتنے تخت اپنے سروں پر رکھ چکا ہے آدمی

کھا چکا ہے علم کو کیا کیا جہالت کا جنوں
پی چکے ہیں بے ہنر کتنے ہی فن کاروں کا خوں

ڈس چکا ہے کتنے داناؤں کو نادانوں کا تاؤ
پھونک کر بیٹھے ہیں کتنی سرخ آنکھوں کے الاؤ

عین مفتوحوں کی لاشوں پر برائے جشنِ عام
ہو چکے ہیں نصب کتنے فتح مندوں کے خیام

اور اس کے ساتھ کتنے ہی سلاطینِ کبار
پرزے روحوں میں پریشاں ہیں آج مانندِ غبار

کل تھی جن زرتار پوشاکوں میں تابِ کہکشاں
آج ویرانوں میں اُن کی اُڑ رہی ہیں دھجیاں

ہم تو کیا تاریخِ انساں بھی گِنا سکتی نہیں — کھا چکی ہے کتنے قاہر تاجداروں کو زمیں
جن میں تھی بادِ غرور و تابِ دُرہائے کلاہ — پھر رہے ہیں پوپلے منہ سے وہ گنبد آج آہ

کتنے ایوانوں کو ویراں کر چکا ہے انقلاب
چغد نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

(۲)

دیکھ کر تاریخِ انسانی کی راہوں کے یہ خم — آپ سے میری گزارش ہے یہ صدرِ محترم
آپ کی بابت میں کہہ سکتا نہیں کچھ بالیقیں — آپ کو میں نے کبھی نزدیک سے دیکھا نہیں
سن رہا ہوں اہلِ دنیا سے مگر یہ غلغلہ — آپ کے سینے میں دل ہے اور دل پگھلا ہوا
آپ اٹھے ہیں کشتِ جاں کی آبیاری کے لئے — آئے ہیں میدان میں خدمت گزاری کے لئے
صنعت و سائنس کو آگے بڑھانے کے لئے — نیند کی ماتی زمینوں کو جگانے کے لئے
فکرِ نو کے موتیوں کو رولنے کے واسطے — ذہن کے ایوان میں عزت کو دینے کے واسطے
ہاں میں واقف ہوں کہ جو افغانیت میری جان ہے — آپ بھی افغان ہیں اور بندہ بھی افغان ہے

سو کبھی اپنے قدم کو ڈگمگا سکتا نہیں
ہم پٹھانوں کو کوئی نیچا دکھا سکتا نہیں

(۳)

اس لئے میں نے یہ چاہا ہے کہ اے میرِ وطن — خدمت و ایثار کی ہے آپ کے دل میں لگن
آپ کی نیت ہے خالص اور ہمت استوار — صرف ان دو پر نہیں لیکن قیادت کا مدار
اس کہن تاریخ میں غلطاں ہیں افسانے کئی — اور بیاباں میں کئی کعبے ہیں بت خانے کئی
سب سے پہلے آپ سن لیں غور سے میری یہ بات — دن پہ جھپٹنے کے لئے دبکی ہوئی بیٹھی ہے رات
آپ کو آگاہ کرتا ہے یہ رندِ بادہ خوار — قلبِ انساں کو سڑا دیتا ہے لمسِ اقتدار
پختہ کاروں کو بھی پچتا نہیں یہ آبِ خام — اس شرابِ تند کو درکار ہے پتھر کا جام
کاروبارِ اقتدار کو مردِ کامل چاہئے — اہلِ حکمت کا دماغ اور شیر کا دل چاہئے

یہ جنوں پرور حکومت ہے وہ آبِ آتشیں   آدمی جس کو چڑھا کر ہوش میں رہتا نہیں
یہ وہ صہبا ہے جو پی لیتی ہے خود انسان کو   صرف دیوتا ہضم کر سکتے ہیں اس طوفان کو!
اور اس کے ساتھ یہ بھی دھیان ہوتا ہے جناب   حاکموں کو گھیر لیتے ہیں ریاکاروں کے خواب
ہاتھ میں آتی ہے جس کے حکمرانی کی عناں   رینگتی ہے اس کی جانب چاپلوسوں کی زباں
ذہن کو ڈستے ہیں جن کے لہجہ ہائے آبدار   ان گھنی میٹھی زبانوں سے خدارا ہوشیار
آپ کا وہ دشمنِ جانی ہے صدرِ نکتہ بیں   بے محابا آپ پر جو معترض ہوتا نہیں
اور جو افراد ایسے دائروں میں صبح و شام   چھاپتے رہتے ہیں خواب آور خوشامد کے پیام
اُن کو کیا دل بیٹھ جائیں یا الٹ جائے زمیں   دام وہ اپنے کھرے کرتے ہیں اور کچھ بھی نہیں
آپ اس جرگے سے کہہ دیجئے کہ اے قوم لعیں   میں فقط خادم ہوں اپنی قوم کا حاکم نہیں
چھین لیتے ہیں حوادث حاکموں سے کرسیاں   خادموں کی مسندیں رہتی ہیں مثلِ کہکشاں
حاکموں کے در گرا دیتی ہے اٹھلا کر زمیں   خادموں کے جھونپڑوں کو زلزلے چھوتے نہیں
حاکموں کے سر سے ٹکراتے ہیں پتھر بالعموم   خادموں پر آسمانوں سے برستے ہیں نجوم
حاکمانِ وقت کی صبحوں کو چگ لیتی ہے شام   خادمانِ خلق کا دنیا میں رہ جاتا ہے نام
حاکموں کی شمع بن جاتی ہے چل پھر کر دھواں   خادموں کی مشعلوں سے کانپتی ہیں آندھیاں
حاکموں کی گورِ بے چادر پہ منڈلاتے ہیں زاغ   خادموں کی قبر پر جلتے ہیں یادوں کے چراغ
نوح کا طوفان بھی اس کو غرق کر سکتا نہیں   جو برائے خلق جیتا ہے وہ مر سکتا نہیں

یہ گرہ میں باندھ رکھیے بات صدرِ ارجمند
آپ اگر میری نصیحت پر رہیں گے کاربند
پھر تو اس دنیائے گوناگوں میں تا یومِ حساب
کارنامے آپ کے دمکیں گے مثلِ آفتاب

وقت کے ماتھے پہ چمکے گی یہ سطرِ جاوداں
میرِ دوراں خادمِ اہلِ جہاں، ایوبؔ خاں

(۱۹۶۰ء)

جوش ملیح آبادی

جوانی و پیری

۱- جوانی

یہ پیرِ جہاں باختہ، اے خیلِ جواناں — کیا تجھ سے کہے قصۂ لمحاتِ خروشاں
اللہ ری گرجتی ہوئی گھنگھور جوانی — رقاصہ و قتالہ و جوالہ و گرداں
سرمست و سمن چہرہ و نے پرور و مے خوار — جنباں و خروشاں و فروزاں و درخشاں
رشکِ چمن، آشوبِ وطن، فتنۂ سوسن — آہوئے ختن، دُرِ عدن، لعلِ بدخشاں
پُرکار و دغا پیشہ و عیار و فسوں کار — نومشق و نہ آموختہ و نورس و ناداں
تسکینِ زلیخا و تپِ سینۂ یعقوب — عشرت کدۂ مصر و سیہ خانۂ زنداں
دیوانہ و فرزانہ، پروانہ و قندیل — مے خانۂ رقصندہ و بت خانۂ جولاں
گل بانگِ صنم خانہ و طاؤسِ خرابات — شوریدہ سر و زمزمہ پرداز و رجز خواں
طوفاں بہ تہِ چہرہ و گرداب بہ گیسو — نے برلب و مے در سر و فردوس بداماں
خود رفتہ و خود بیں و خود افروز و خود آزار — ژولیدہ گماں، زود غضب، دیر پشیماں
سرگوشیٔ حوا و خود آگاہیٔ آدم — فرماں شکن و باغی و پیغمبرِ عصیاں
گہوارہ سخن[1]، قوس جبیں[2]، زمزمہ رفتار[3] — کج فیصلہ و راست قد و آسیا پیماں[4]

---

[1] وہ جس کے لہجے میں گہوارے کی سی کیفیت ہو۔ [2] وہ جس کی جبیں قوس کی مانند ہو۔ [3] وہ جس کی رفتار سے زمزمہ پیدا ہو۔ [4] وہ جس کے وعدے آسیا کے مانند گھوم گھوم کر عاشق کو پیس ڈالیں (کبھی ایفا نہ ہوں اور ہر روز ان کی تجدید ہوتی رہے)

گیتی کو مروڑے ہوئے گردوں کو لپیٹے — غلطیدہ و آوارہ و جولان و گریزاں
مکھڑے پہ گہر تابی صبح سر کہسار — سینے میں خروشندگی موسم باراں
اک جست خطرناک، بھر جنبش ابرو — اک جملۂ پرہول بھر لرزش مژگاں
جوالہ ترنگوں کے تھپیڑوں سے دمادم — ہر سانس میں سینے ہی سے غلطیدہ و پیچاں
اک گام پہ آسودہ تو اک موڑ پہ بے چین — اک بات میں افسردہ تو اک بول میں شاداں
ناموس کے جویا کبھی پرزے تو کسی روز — تحریر حسیناں مع تصویر حسیناں
جھولوں کی قطاروں میں کبھی نغمۂ کوکو — برکھا کی پھواروں میں کبھی خندۂ یاراں
دھنکی ہوئی گھڑیوں میں کبھی اشک جدائی — بھیگے ہوئے لمحوں میں کبھی قطرۂ نیساں
بپھرے ہوئے دریا پہ کبھی چادر شب رنگ — بکھرے ہوئے ساحل پہ کبھی موج چراغاں
انوار چراغاں میں کبھی ظلمت پرہول — طغیانی ظلمت میں کبھی نور شبستاں
بربط میں کبھی آہ، کبھی آہ میں بربط — درماں میں کبھی درد، کبھی درد میں درماں
شعلوں کے تلاطم میں کبھی سلک جواہر — بوندوں کے ترنم میں کبھی رشتۂ سوزاں
آنکھوں میں کبھی صولت شاہان سرافراز — چہرے پہ کبھی مسکنت خاک نشیناں
شوخی میں کبھی معجزۂ عیسی مریم — تمکین میں کبھی دبدبۂ موسی عمراں
امواج ترنم میں کبھی جوشش شب ماہ — آغوش تبسم میں کبھی صبح بہاراں
انگڑائی کے عالم میں کبھی قوس نگاریں — نشے کے خم و پیچ میں کبھی ابر خمستاں
کانوں میں کبھی زمزمۂ مختصر وصل — گردن پہ کبھی خنجر طول شب ہجراں
سینے میں کبھی کش مکش حرف تمنا — شانوں پہ کبھی پیچ و خم زلف پریشاں
خلوت میں جگر سوختۂ شعلۂ "آیت"[1] — جلوت میں سراپا تہ "چاک داماں"
میدان طلب میں کبھی صیاد، کبھی صید — میدان غضب میں کبھی افتاں کبھی خیزاں

---

[1] قصۂ حضرت یوسف

پہلو میں کبھی ارض و سماوات، سیہ پوش
زانو پہ کبھی ثابت و سیار غزل خواں

محراب تبسم میں کبھی مومن کامل
گرداب تصادم میں کبھی منکر یزداں

خوش ہو تو مسلمان، جو ناخوش ہو تو کافر
اور موج میں آئے تو نہ کافر نہ مسلماں

ہر شام و سحر، مضحکۂ حضرت ناصح
ہر صبح و مسا، خدمت خدام نگاراں

آنکھوں میں سیہ مستئ انجام شب ماہ
آہنگ میں سرشارئ آغاز بہاراں

نوحوں کے سروں پر کبھی تابوت شب و روز
نغموں کی شعاعوں پہ کبھی تخت سلیماں

گھونگھٹ کے دھندلکے میں رخ تازہ کی سرخی
جس طرح کہ ہو صبح شب آلودۂ باراں

گل گشت میں یوں ناز سے مڑتی ہوئی جیسے
افسون خم ساحل و افسانۂ طوفاں

وحشت کدۂ کوہ و بیاباں کی ہوا میں
کانٹوں پہ جو دامن تو بگولوں میں گریباں

بڑھتی ہوئی اک لحظہ، ٹھٹکتی ہوئی اک آن
کچھ سن کے پریشان تو کچھ کر کے پشیماں

آنکھوں کے شبستاں میں تب و تاب شب قدر
پلکوں کے دھندلکے میں جلوس مہ کنعاں

ٹوٹے ہوئے بالوں میں روایات شبینہ
الجھے ہوئے بالوں میں حکایات شبستاں

پھیلے ہوئے قرنوں کو بناتی ہوئی اک آن
سمٹے ہوئے لمحوں میں لپیٹے ہوئے صدیاں

روٹھو تو بہت پاس، مناؤ تو بہت دور
منڈلاؤ تو بشاش، قریب آؤ تو نالاں

باہوں کے چمن میں کبھی ایفا شدہ وعدے
بستر کی شکن پر کبھی ٹوٹے ہوئے پیماں

القصہ دل و جاں میں خروشندہ تھے ہر آن
بدمستئ جوانی کے یہ بپھرے ہوئے طوفاں

یاروں سے بتائیں بھی تو کس طرح بتائیں
ٹوٹے تھے کس انداز میں گلہائے بہاراں

کس طرح جھانکتی تھیں سحر ہائے سر کوہ
کس درجہ شرربار تھیں شب ہائے زمستاں

ہر پھول میں کتنے تھے خس و خار کے جنگل
ہر قوس میں کتنے تھے شراروں کے بیاباں

کل زعم یہ تھا ہم سر مزدک ہوں کم از کم
اپنے کو سمجھتا ہوں اب اک طفلک ناداں

ساحل کے تراقوں کو جو کل روند رہا تھا
خاموش ہے وہ غلغلۂ بحر خروشاں

سرمایۂ اعزاز تھی کل بزم سلاطیں
دنیا لئے توہین ہے اب قربت شاہاں

کل تمکنتِ عقل پہ ہنستی تھی جوانی — پیری ہے اب آوارگیٔ عشق پہ خنداں
کل سیج پہ حوروں کو سُلانے کی ہوس تھی — اب خاک پہ ان کو جگانے کا ہے ارماں
کل دودِ گُریزندہ پہ تھے بکھرے خیمے — اب شعلۂ پائندہ پہ ہے فکر کا ایواں
کل خال و خدِ یار پہ تھی چشمِ طرب کار — اب ثابت و سیار پہ ہے دیدۂ حیراں
کل رشتۂ مقیش[1] پہ غلطیدہ تھے جذبات[2] — اب جوہرِ شمشیر پہ اندیشہ ہے جولاں
کل شور تھا "دستِ من و دامانِ جوانی" — اب غلغلہ ہے "دوشِ من و گیسوئے دوراں"
کل عشق بہاتا تھا مہ و سال کی دولت — اب عقل ہے ایک ایک دقیقے کی نگہباں
اب زینتِ آغوش ہے پہنائی دارین — کل زیرِ تصرف تھا فقط شہرِ نگاراں
کل فرق پہ چترِ شبِ مہ گھوم رہا تھا — اب ذہن میں گہوارۂ کونین ہے جنباں
اب مصحفِ خوباں کے عوض بہرِ تامل — زانو پہ جو انجیل تو ہے رحل پہ قرآں
کل تا طرۂ نعلین تھا اب تا قدِ قوسین — کل عشوۂ آناں تھا اب آئینۂ ایناں
عشرت کے سن و سال پہ لذت تھی گہربار — بعثت کے زمانے پہ نبوت ہے گل افشاں
وہ دل جو پئے نقدِ بتاں گرمِ سفر تھا — اب جادۂ تحقیقِ خدا پر ہے خراماں
کل دوش پہ تھیں گیسوئے شب رنگ کی پریاں — اب علت و معلول کی زنجیر ہے جنباں
کس کو یہ بتائیں کہ ہر اک پور میں ہر آن — طوفان تھے کس دھوم سے جولاں و خروشاں
کس طرح شگوفوں کی گرہ کھلتی تھیں کمانیں — کس طرح کلیجے میں کھٹکتے تھے گلستاں

کس طرح کہیں جوشِ ستم پیشہ کے ہاتھوں
رہتے تھے کن آفات میں شبیر حسن خاں

---

[1] فارسی میں اسکا تلفظ "مقیش" بوزن "مشوش" ہے۔ اس کی اصل غالباً سنسکرت ہے۔ لیکن فارسی ادب میں داخل ہو چکا ہے۔ [2] عربی قاعدے سے یہ جمع صحیح نہیں مگر یہ لفظ "تنقید" وغیرہ کی طرح اب جزوِ زبان بن چکا ہے۔

۲ - پیری

اور اب کہ ہے سینے میں بفیضانِ مہ و سال
آسودگیِ خاطر، صبحِ شبِ طوفاں

بیٹھا ہوں سرِ مسندِ اندیشہ و ادراک
زانو سے دبائے ہوئے آفاق کا داماں

آنکھوں پہ بٹھائے ہوئے اقوالِ اکابر
سینے سے لگائے ہوئے آیاتِ حکیماں

پرکھے ہوئے ہر روشِ نشترِ سکندر
جانچے ہوئے ہر سلسلۂ خیر فراواں

ادراک میں پھینکے ہوئے کیف و کمِ آفاق
مژگاں پہ اٹھائے ہوئے پیچ و خمِ دوراں

کھولے ہوئے ہر پردۂ طنبورۂ الحاد
تولے ہوئے ہر زمزمۂ بربطِ ایماں

زانو پہ لیے نغمۂ خوردانِ جواں فکر
کاندھے پہ اٹھائے ہوئے آوازِ بزرگاں

پیمانۂ افکارِ محبت دیں سموئے
افسردۂ صبحِ وطن و شامِ غریباں

ترکانِ طرب پیشہ و طرار کے بدلے
پہلو میں ہے اب حیرتِ انگشت بدنداں

اب سر میں ہے اس طرفہ خموشی کی صدائیں
اٹھتی ہے جو شانوں پہ بٹھائے ہوئے طوفاں

آہنگ کی [illegible] سے نقادیوں کو اٹھنے
اب ذہن میں مقصدہ ہیں اسرارِ خوش الحاں

یوں سر کی سفیدی سے کرن پھوٹ رہی ہے
قندیل ہے گویا شبِ یلدا میں فروزاں

اترا ہے مرے جہلِ مرکب کے دھوئیں میں
فانوس بکف قافلۂ علم فراواں

اصنام تھے کل خیمۂ صہبا میں اداکار
آفاق ہے اب مسندِ قرطاس پہ رقصاں

کل سازِ بزم پر صفِ خوباں تھی مغنی
اب نوکِ قلم پر مہ و اختر ہیں غزل خواں

کل منزلِ تفتیش میں تھی نسلِ مئے ناب
اب معرضِ تحقیق میں ہے خونِ رگِ جاں

پیری کی جلو میں ہے فطانت کی جوانی
ناہید ہے چھٹکے ہوئے بادل سے نمایاں

زریں افقِ ذہن پہ رخشاں ہے بتدریج
ہر آن ابھرتی ہوئی پیشانیِ دوراں

تخئیل میں جھنکار ہے گردندہ جہاں کی
جھنکار میں ہے زمزمۂ ذرہ و کیواں

ذرے کے دلِ پختہ کی ٹھوکر پہ ہے صحرا
قطرے کے سنِ رشد کی مٹھی میں ہے طوفاں

اب دانشِ پالیدہ کے سائے میں ہے طوبیٰ
اب جودتِ بالغ کے نشانے پہ ہے ہمایاں

ایوانِ درایت میں روایت کی ہے پیشی
تنقید کے دھارے پہ ہے تقویمِ نیاگاں

دیوانِ عقائد کی عدالت میں اٹھا ہے
حاضر ہیں وکالت کو فقیہانِ دبستاں

اب عقل سے معمورۂ تنقیح میں گُل پوش
اب عشق ہے منطق کدۂ جرح میں عریاں

اب "ممکن" و "واجب" کے مباحث ہیں گُہرپاش
اب "علّتِ اولیٰ" کے مسائل ہیں گل افشاں

لائے ہیں مُحسترِ عمل ذہن کی مسلیں
وجدان ہے برہان کے اجلاس میں حیراں

کس نہج سے "منقول" کو "معقول" بنائیں
اقطاب ہیں ششدر، متکلّم ہیں پریشاں

اوراد و عبادات ہیں شرمندہ و مبہوت
اوہام و اساطیر ہیں لرزاں و ہراساں

پیرانِ صنم خانہ و پاکانِ کلیسا
انکار کی سرکار میں ہیں سربگریباں

۳- سنِ رُشد کا نعرۂ جنگ

غلطاں ہے فضا پر وہ گریبانِ بتاں دیکھ
جاتا ہے کدھر کو گر اب اے عالمِ امکاں

مجھ کو لب و رخسار میں الجھائے ہوئے تھا
اب آ یہ مرا دام ہے اے کشورِ پیچاں

اب جسم کے قبضے میں کبھی دل نہیں دوں گا
پریوں سے ملا اور پرے کر شانِ حکیماں

وہ زمزمہ پرداز ہوئی فکرِ معلّیٰ
اب گونج اگر مرد ہے دلّالِ نگاراں

جس راگ پہ تگنی کا نچاتا تھا مجھے ناچ
لا اب وہ "تنا ریم، تنا ریم، تناراں"

وہ دھوم سے رقصندہ ہوئی لیلیٰ آفاق
اب بھاؤ بتا زہرہ جبینوں کے ثنا خواں

فکر کی تمنا ہے تو خم ٹھونک کر آجا
یہ رن ہے یہ جنگاہ یہ دنگل ہے یہ میداں

رخشندہ خیالات کے چھٹکے وہ ستارے
ہمت ہو تو اب سامنے آ دودِ چراغاں

کیوں خوب کھلایا تھا مجھے کوئے بتاں میں
جرأت ہو تو اب آنکھ ملا گردشِ دوراں

کل تیغ کے مارے سے مرے دل پہ کھلونے
ہاں روک مرا وار اب اے وقتِ گریزاں

(۱۹۶۰ء)

جوش ملیح آبادی

نوحۂ آگہی

زندگی و رشتۂ سوزاں ہے یہ معلوم نہ تھا
موت کی لرزشِ مژگاں ہے یہ معلوم نہ تھا

سرخیِ شفقِ شاداب و فروغِ افشاں
شعلۂ کسوتِ انساں ہے یہ معلوم نہ تھا

جادوئے لعلِ لب و شعبدۂ گوشۂ چشم
فتنۂ شہرِ ظریفاں ہے یہ معلوم نہ تھا

رقصِ آفاق کی بنیاد ہے جس پردۂ ستار
زخمۂ مرگ سے لرزاں ہے یہ معلوم نہ تھا

وائے بر جہل کہ ہر زمزمۂ صبحِ وطن
نوحۂ شامِ غریباں ہے یہ معلوم نہ تھا

بوئے گل، نوکِ سناں ہے، یہ خبر تھی کس کو
برگِ گل خنجرِ براں ہے یہ معلوم نہ تھا

غنچہ خمیازۂ حسن ہے یہ گماں تھا کس کو
نغمۂ گل بانگِ پریشاں ہے یہ معلوم نہ تھا

ہر گہر اشکِ پشیماں ہے، کسے تھا یہ خیال
ہر ہنر شاخِ غزالاں ہے یہ معلوم نہ تھا

گوشۂ فقر میں ہر دیدۂ فن کار بزرگ
کاسۂ دستِ گدایاں ہے یہ معلوم نہ تھا

بے حسی شاہِ زماں ہے یہ نظر تھی کس میں
بے دلی فاتحِ دوراں ہے یہ معلوم نہ تھا

گلِ شاداب ہے اک گریۂ خندانِ بہار
ساز اک خندۂ گریاں ہے یہ معلوم نہ تھا

شعر کا رنگ جوانی کی چمن سازِ ترنگ
تشنۂ خونِ رگِ جاں ہے یہ معلوم نہ تھا

جس نفس پر ہے رواں کشتیٔ عمرِ انساں
وہ نفس نوح کا طوفاں ہے یہ معلوم نہ تھا

شبنمِ صبحِ بہاراں ہے شعاعِ بے مہر
ہر نفس دست و گریباں ہے یہ معلوم نہ تھا

نازشِ تمکنتِ قطب و ثباتِ کہسار
لرزشِ کاہِ سبک جاں ہے یہ معلوم نہ تھا

سیلِ آفات کے دھارے پہ حیاتِ انساں
مرگِ انفاسِ بہاراں ہے یہ معلوم نہ تھا

خیمۂ نشۂ بادہ و محرابِ سرود
سایۂ ابرِ گریزاں ہے یہ معلوم نہ تھا

دوستو! فصلِ بہاراں کی ہوائے جولاں
دشمنِ جیب و گریباں ہے یہ معلوم نہ تھا

فرصتِ مختصرِ صحبتِ یارانِ شباب
تا ابد ماتمِ یاراں ہے یہ معلوم نہ تھا!

فرصتِ شیب میں ہر نغمۂ جشنِ دوشیں
گریۂ گوشہ نشیناں ہے یہ معلوم نہ تھا

لمسِ مضراب و دمادم سے کھنکتا ہر تار
جادۂ سینہ خراشاں ہے یہ معلوم نہ تھا

وصل کی چند بہاروں کے علاوہ یہ حیات
اک مسلسل شبِ ہجراں ہے یہ معلوم نہ تھا

جس کو بخشا ہے دلِ سادہ نے ترنگ کا خطاب
وہ بھی اک قہر کا عنواں ہے یہ معلوم نہ تھا

اب کہاں مشعلِ وجدان و چراغِ آیات
فکرِ غارت گرِ ایماں ہے یہ معلوم نہ تھا

عرشِ اعظم پہ فرشتوں کی متاعِ طاعت
ظلمِ آدم سے پشیماں ہے یہ معلوم نہ تھا

خاک پر حضرتِ انساں کی خلافت کا علم
جنبشِ دامنِ عصیاں ہے یہ معلوم نہ تھا

درسِ تہذیبِ اطاعت ہے بغاوت کا [illegible]
"اہرمن" "حکمتِ یزداں" ہے یہ معلوم نہ تھا

آبِ خمخانۂ مستی و شرابِ ہستی
شبنمِ گورِ غریباں ہے یہ معلوم نہ تھا

برگِ سبز و ورقِ نسترن و غنچۂ گل
چادرِ قبرِ بہاراں ہے یہ معلوم نہ تھا

دہر گویا نگہِ چشمِ عزازیل کے حضور
خفتۂ سرمہ فروشاں ہے یہ معلوم نہ تھا

جوش سا کافر و کافر گر و کافر گفتار
فطرۃً صاحبِ ایماں ہے یہ معلوم نہ تھا!

(۱۹۶۰ء)

جوش ملیح آبادی

آدمی

اے نگاہِ مولویٔ معنوی
دیکھ، سوئے طمطراقِ آدمی

آج کھل کر یہ کہہ اے محترم
عہدِ انساں میں اُٹھاتا ہے قلم

آدمی میزان و مقیاسِ جلال
آدمی خلاق و مولائے جمال

آدمی مطلوبِ ماہ و فرقداں
آدمی محبوبِ قوس و کہکشاں

آدمی بوئے سمن، رنگِ حنا
مطرب و مضراب و طاؤس و غنا

آدمی ہے کلک و قرطاس و کتاب
آدمی ہے بربط و چنگ و رباب

سیرِ وقت خضرِ دوراں آدمی
تشنگیِ آبِ حیواں آدمی

پائے انساں پر عناصر کا غرور
آدمی آئینۂ سحرِ کوہِ طور

آدمی کی طرفہ کاری کی دلیل
آتشِ نمرود و گلزارِ خلیل

آدمی اندیشۂ کار و دوربیں
آدمی سررشتۂ حبلِ متیں

آدمی ہر آن بہرِ کسبِ فن
سوئے تحقیقِ دو عالم گام زن

آدمی رہنِ سفر، گرمِ خرام
اہرمن در جیب یزداں زیرِ دام

آدمی منظور و ناظرِ کلِ حیات
آدمی لیلیٰ و محمل کائنات

ڈھونڈ لے گی دیکھنا چشمِ حواس
اسم و قسم و جسم و اجزا و خواص

ذوقِ کشف آدمی کی زد پہ ہے
علمِ شے، ترکیبِ شے، تحلیلِ شے

مدعائے شوق یا فکرِ ادق
قربِ حق، دیدارِ حق، عرفانِ حق

آدمی آہنگِ یار و نغمہ خواں
آدمی ہے خاک کے منہ میں زباں

دہر کو جن قوتوں پر ناز ہے
ان میں گونجی آدمی آواز ہے

سامع و بینا و گویا آدمی　　جانِ حرف و دینِ معنیٰ آدمی
آدمی کی موجِ فکر نکتہ یاب　　چشمۂ صد وحی و الہام و خطاب
آدمی ہے راستِ بین و کج کلاہ　　آدمی مخدوم و خادم مہر و ماہ
درمیانِ نوق و تحت و بحر و بر　　صرف اک انسان جنسِ معتبر
آدمی گل دستۂ گل چین و گل　　آدمی دولت سرائے جزو و کل
جنبشِ لب ہائے انساں سلسبیل　　موجۂ تخییل انساں جبرئیل
آدمی کہسارِ ظن ، قطبِ یقیں　　آدمی پروردگارِ کفر و دیں
حرف راز و نطق پرور آدمی　　زینتِ محراب و منبر آدمی
آدمی طاق کلیم و شمع طور　　آدمی تورات و انجیل و زبور
آدمی ظلمت بپا و ضو بہ دل　　آدمی قرآن رحلِ آب و گل
جام و سنداں کا توازن آدمی　　رستم و گشتاسپ و ارجن آدمی
آدمی "ذکر" جنید خستہ جاں　　آدمی فکر بیہقی و برگساں
ابن رشد و شیخ اکبر آدمی　　لینن و مقداد و بوذر آدمی
مانی و بہزاد و چغتئی آدمی　　حافظ و تلسی و گوئٹے آدمی
آدمی سرِ جہاں کا پردہ دار　　آدمی ہے شاعر و پیغامبر
غالب و فردوسی و میر آدمی　　لچھمن و رام و مہاویر آدمی
آدمی کنعاں کا حسن جاں گداز　　آدمی گوکل کا بانکا نے نواز

مزدک و سقراط و گوتم آدمی
بوتراب و ابنِ مریم آدمی

آدمی قندیل باب مشرقین　　آدمی داؤد و ہارون و حسین
آدمی ہے ابتدا و انتہا　　آدمی نورِ محمد مصطفیٰ
تکیہ گاہ کافران و مومنین　　آدمی ہے رحمۃ للعالمین
آدمی مستقبل و ماضی و حال　　آدمی عود و جوہر رب ذوالجلال
آدمی کی سانس کعبے کا غلاف　　گرد انسان ، نور حق گرم طواف

یہ جو لحنِ ثابت و سیارہ ہے — آدمی کے ساز کی جھنکار ہے
آدمی قاموسِ ذرّات و نجوم — آدمی ناموسِ آیات و علوم
دستِ انساں بت تراش و بت شکن — ذہنِ انساں موجدِ حرفِ خدا
وہمِ انساں بانیِ لات و منات — فہمِ انساں خالقِ ذات و صفات
رشتۂ انساں پابجولاں سوئے ذات — عقلِ انساں ہادمِ قصرِ صفات

آدمی آمیزشِ لیل و نہار
آدمی ربطِ توامِ نور و نار

باوجود بُعد ہائے بے کراں — آدمی کی جیب میں کون و مکاں
عقدۂ کُل آفاق و ناخنِ آدمی — آبروئے نغمۂ کُن آدمی
آدمی قندیلِ محرابِ شعور — آدمی شادابیِ نخلِ ظہور
آدمی فرماں روائے این و آں — آدمی مسجودِ خیلِ قدسیاں
آدمی فاتحِ بابِ خشک و تر — آدمی شاہِ قوائے بحر و بر
آدمی ذرّات دوز و نجم باف — آدمی گیتی شکن گردوں شگاف
آدمی مقصودِ کُل ہائے وجود — آدمی تفسیرِ قرآنِ وجود
ہاں، کلیدِ قفلِ عالم آدمی — مایہ دارِ اسمِ اعظم آدمی
آدمی نورِ خضا، برقِ نمود — آدمی خمیازۂ غیب و شہود
آدمی صورت گرِ لوح و قلم — مشعلِ پروانۂ دیر و حرم
آدمی سرکارِ ملکِ خیر و شر — آدمی شاہِ قضا، میرِ قدر
آدمی دانائے اسباب و علل — فاتحِ مستقبل و لوحِ اجل
مدعی و قاضی و جرح و ثبوت — مسندِ فردا کا حَیُّ لایموت
روشنی، رخشندگی، تابندگی — آدمی، ہاں آدمی، ہاں آدمی
آدمی کی خاک میں پیغمبری — اک فقط پیغمبری کیا داوری

اور شرحِ صدر کر اے آدمی
آدمی کی قدر کر اے آدمی

(دسمبر ۱۹۶۱ء)

اصلاح شدہ ورق

دو یادگار نظمیں

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے پر جوش نے مشہور انقلابی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" لکھی تھی جو ماہنامہ "نیا ادب اور تنظیم" (حلقۂ ادب لکھنؤ) کے شمارہ ستمبر ۱۹۴۳ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اسی سنہ میں سبط حسن نے "آزادی کی نظمیں" کتابی صورت میں شائع کیں جنہیں برطانوی حکومت نے فوراً ضبط کر لیا۔ "نیا ادب اور تنظیم" کے شمارہ نومبر ۱۹۴۳ء میں جو اداریہ لکھا گیا اس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

"آزادی کی نظمیں" خلاف قانون قرار دی جا چکی ہیں، اور جوش کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" جو ان دنوں بچے بچے کی زبان پر ہے اور بہار اور بنگال میں لاکھوں کی تعداد میں تقسیم ہوئی ہے ضبط کر لی گئی ہے۔"

اسی شمارے میں نظم "تلاشی" کے بارے میں صفحہ ۲۶-۲۷ پر دو مختصر نوٹ لکھے گئے ہیں۔

"۴ ستمبر۔ لکھنؤ پولیس نے جوش ملیح آبادی کے مکان کی تلاشی لی۔ تلاشی "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ یہ نظم ستمبر ۱۹۴۳ء کے "نیا ادب اور تنظیم" میں پہلی بار چھپی تھی۔"

— صفحہ ۲۵-۲۶ پر جوش صاحب کی نظم "تلاشی" شائع ہو رہی تھی، جس کو پریس نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔"

"نیا ادب اور تنظیم" کے مدیر اعلیٰ جوش ملیح آبادی تھے۔ مجلس ادارت میں سبط حسن، سردار جعفری، مجاز اور محمد رضا انصاری شامل تھے۔

جوش کی یہ دونوں نظمیں "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" اور "تلاشی" ان کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں — "تلاشی" تو آج تک کسی رسالے میں بھی نہیں چھپی۔ یہ نظم عرصۂ دراز سے نایاب تھی۔ حتیٰ کہ خود جوش کے پاس اس کی نقل نہیں تھی۔ چنانچہ اس کی ایک نقل ہمیں رام پور سے اکبر علی خاں نے دی، اور دوسری نقل جو مکمل ہے ڈاکٹر عبادت بریلوی سے دستیاب ہوئی۔ ہم ان دونوں حضرات کے شکر گزار ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران "تلاشی" ریڈیو رپلز سے بھی نشر ہوئی تھی، اور کلکتہ میں اس کی کاپیاں لاکھوں کی تعداد میں تقسیم ہوئیں — بالآخر پولیس نے اسے ضبط کر لیا — یہ نظم ۲۱ سال کے بعد پہلی بار "جوش نمبر" میں چھپ رہی ہے۔

ان دو تاریخی اور انقلابی نظموں کے علاوہ بھی جوش نے کئی انقلابی نظمیں جنگ کے دوران لکھی تھیں، جن سے حکومت برطانیہ کافی خوف زدہ ہو گئی تھی اور جوش کو کئی بار گرفتار کرنے کے منصوبے بنا رہی تھی۔ لیکن سر تیج بہادر سپرو کی بروقت مداخلت نے جوش کو گرفتار ہونے سے بچا لیا۔ وہ جوش کے بے حد مداح اور قدردان تھے۔ انہوں نے گورنر یوپی کو جا کر سمجھایا کہ جوش کی گرفتاری خطرناک نتائج کا باعث ہوگی۔ چنانچہ گورنر نے جوش کی گرفتاری کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ (ص)

جوش ملیح آبادی

تلاشی

جس سے امیدوں میں بجلی آگ ارمانوں میں ہے
اے حکومت! کیا وہ شے تیرے خزانوں میں ہے

بند پانی میں سفینہ کھے رہی ہے کس لئے
تو مرے گھر کی تلاشی لے رہی ہے کس لئے

گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے بدنہاد!
آ مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مراد

جس کے اندر دہشتیں پر ہول طوفانوں کی ہیں
لرزہ افگن آندھیاں تیرہ بیابانوں کی ہیں

جس کے اندر ناگ ہیں اے دشمنِ ہندوستاں!
شیر جس میں ہونکتے ہیں کوندتی ہیں بجلیاں

پھوٹتی ہیں جس سے نبضیں افسر و اورنگ کی
جس میں ہے گونجی ہوئی آوازِ طبلِ جنگ کی

جس کے اندر آگ ہے دنیا پہ چھا جائے وہ آگ
نارِ دوزخ کو پسینہ جس سے آ جائے وہ آگ

موت جس میں دیکھتی ہے منہ اس آئینے کو دیکھ
میرے گھر کو دیکھتی کیا ہے میرے سینے کو دیکھ!

جوش ملیح آبادی

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے

کس زبان سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو؟
"جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے" "بھیڑیا"
"باغِ انسانی میں چلتے ہی پہ ہے بادِ خزاں"
"ہاتھ ہے ہٹلر کا رخشِ خود سری کی باگ پر"

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی؟
اپنے ظلم بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں!
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا؟

دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
"بھیڑیے کو مار دو گولی پئے امن و ثبات"
"آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں"
"تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر"

نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟
کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے؟
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں
سر دلاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
موت بھی کیسی تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی
میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج؟
یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونی داستاں بھی یاد ہے؟
کس کے تم لائے تھے سر شاہ ظفر کے سامنے؟
اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا

سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلمِ بے پناہ
ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی؟
پوچھ لو اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے؟
وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اہلِ آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے؟
اب بھی ہے محفوظ جن میں طنطنہ سرکار کا
آج کشتی امن کے امواج پر کھیتے ہو کیوں
اہلِ قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں
لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
اہلِ حق روشن نظر ہیں، اہلِ باطل کور ہیں
آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں
کیا کہا - انصاف ہے انساں کا فرضِ اولیں
دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
گونج ٹاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
ظلم بھولے راگنی انصاف کی گانے لگے
مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین

آج تک رنگوں میں اک قبر ہے جس کی گواہ
یاد تو ہوگا تمہیں جلیان والا باغ بھی؟
"ڈائر" گرگِ دہن آلود اب بھی زندہ ہے!
اُس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے؟
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے
آج بھی گونجی ہوئی ہے جس کے کوڑوں کی صدا
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درسِ حق دیتے ہو کیوں؟
مذہبی، اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کمزور ہیں
جس کی لاٹھی اُس کی بھینس اب کس لئے کہتے نہیں؟
کیا فساد و ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں؟
کیا خدانخواستہ کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں؟
پھر تو ہے اسپِ تازی کیا شفا خانے میں ہے؟
کچھ طبیعت کیا نصیبِ دشمناں ناساز ہے؟
نزعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلّانے لگے؟
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسین

خیر، اے سوداگرو! اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں!

(سنہ ۱۹۳۹ء)

ایک نایاب نظم

محبی صہبا صاحب، سلام شوق

کاغذات اُلٹ پلٹ رہا تھا کہ جوش صاحب کی ایک نظم مل گئی اور بیس اکیس سال پہلے کے بعض واقعات یاد آ گئے۔ جوش صاحب "کلیم" بند کر کے ملیح آباد میں رہنے لگے تھے۔ وہاں سے کبھی کبھی ایک آدھ دن کے لئے لکھنؤ آتے، کسی ہوٹل میں قیام کرتے اور چاہتے تھے کہ ان کے دوست اور قدردان شام کو وہیں اکٹھے ہو جایا کریں۔ پینے والے پئیں اور شاعری سے دلچسپی لینے والے اُن کا تازہ کلام سنیں۔ میں شام کی صحبت میں بیٹھنے کے بجائے دوپہر میں ان سے ملنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ کیوں کہ تنہائی میں کچھ علمی ادبی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ صہبا صاحب! جن لوگوں کو یہ موقع نہیں ملا ہے انہیں آسانی سے جوش کی ذہانت اور علم کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس وقت حرف

رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ کسی علمی یا ادبی موضوع پر بحث کر سکتے ہیں۔ ایسی ہی ایک تنہائی کی صحبت میں — حرفِ آخر کی بنیاد پڑی تھی، جو بدقسمتی سے ابھی تک نامکمل ہے۔ یہ صورت تھی، میں شام کو بھی جایا کرتا تھا کیوں کہ وہ اسی وقت کے ملنے کو ملنا سمجھتے تھے۔

ایک دن وہ ملیح آباد سے آئے اور میرے یہاں اطلاع کرائی کہ شام کو "نشست" ہوگی۔ میں نے وعدہ کیا کہ ضرور آؤں گا۔ شام کو یہ حادثہ پیش آیا کہ اچانک میری بیوی بیمار ہو گئیں، اور مجھے ڈاکٹروں کے یہاں دوڑنا پڑا۔ شادی کو دو مہینے سے بھی کم ہوئے تھے۔ اور جوش صاحب کو یہ خیال پہلے ہی دن سے پیدا ہو گیا تھا کہ میں اب اُن سے کم ملتا ہوں۔ میں صفائی دیتے دیتے عاجز تھا، اور وہ لوگوں سے یہ کہتے نہ تھکتے تھے۔ یہ چھیڑ چھاڑ جاری ہی رہتی تھی کہ اس میں یہ افتاد پڑی۔ میں شب کی نشست میں نہ پہنچ سکا، اور انہیں کسی نے بتا دیا کہ بیوی آ گئیں اس لئے نہیں آئے۔

میں صبح کو سو کر اٹھا بھی نہیں تھا کہ محترمی رئیس احمد خاں صاحب (جوش کے چھوٹے بھائی) ایک رقعہ دے کر چلے گئے۔ اس میں یہ چند اشعار تھے۔ میں معذرت کے لئے گیا تو حالات میں معمولی سی تبدیلی ہوئی۔ لیکن اُن کی یہ رائے نہیں بدلی کہ میں بیوی کی وجہ سے انہیں کچھ کم "چاہنے" لگا ہوں۔

نظم پنسل سے بہت ہی شکستہ خط میں لکھی ہوئی ہے۔ ممکن ہے میں نے ایک آدھ لفظ بالکل صحیح نقل نہ کیا ہو۔ جی چاہے تو یہ نظم شائع کر کے مجھے اور انہیں دونوں کو رسوا کیجئے۔

آپ کا

احتشام حسین

کل نہ آئے جو احتشام حسین　　　دل میں غصّے کی بدلیاں گرجیں

اُن کے اس اوّلیں تمرّد پر　　　ہوگئی رُوحِ شعر چیں بہ جبیں

میرے فرمان پر نہ حاضر ہو　　　رُوحِ عالم کی یہ مجال نہیں

لیکن انسان، "نا سزا انساں　　　کتنی شدت سے ہے شریر و لعیں

یہ خیال آتے ہی مرے سر میں　　　زلزلے آئے، بجلیاں کڑکیں

بسترِ غیظ و فرشِ حسرت پر　　　دل نے رہ رہ کے کروٹیں بدلیں

سازِ شیریں میں آ گئی تلخی　　　بادۂ تلخ بن گیا شیریں

اُڑ گیا رنگِ ساغر و مینا　　　بجھ گئی آتشِ مہ و پروین

تھا یہ عالم کہ دفعتاً اے جوشؔ　　　آئی ہاتف کی یہ صدائے حزیں

کہ نہ ہو احتشام سے ناخوش　　　اس میں اُن کا کوئی قصور نہیں

ہو نہ ہو لکھنؤ شریف میں آج

زوجۂ احتشام آ پہونچیں!

جوشؔ

۱۰ مارچ ۱۹۴۰ء ۶ بجے صبح

جوش ملیح آبادی

لکھنؤ

اس تنزّل پر بھی ہے وہ عزّ و شانِ لکھنؤ
سجدہ گاہِ اہلِ دل ہے آستانِ لکھنؤ

توبہ توبہ من و سلویٰ کی تمنّا اور ہمیں
من و سلویٰ سے ہے بہتر آب و نانِ لکھنؤ

آج بھی اس انقلابِ خوں چکاں کے باوجود
جانِ بازارِ تمدّن ہے دکانِ لکھنؤ

ذرّہ تیرا مہرِ تاباں، گرد تیری کہکشاں
اے زمینِ لکھنؤ! اے آسمانِ لکھنؤ!

اپنے اپنے دور میں ساقی رہا آفاق کا
ہر غلام حضرتِ پیرِ مغانِ لکھنؤ

صرف نازِ موجۂ تسنیم و کوثر ہی نہیں
آبروئے نطقِ انساں ہے زبانِ لکھنؤ

آج جتنے کارواں ہیں معرضِ رفتار میں
خوش تر اُن سب سے ہے گردِ کاروانِ لکھنؤ

حرفِ "کن" کی جس طرح خالق کے سینے میں ترنگ
صبح یوں انگڑائی لیتے ہیں بُتانِ لکھنؤ

وہ بصیرت دوسرے شہروں کے رندوں میں نہیں
جس بصیرت کے ہیں مولیٰ زاہدانِ لکھنؤ

کتنی لاتعداد رقص و رنگ کی بیداریاں
تجھ میں پوشیدہ ہیں اے خوابِ گرانِ لکھنؤ

آہ راتوں کو جو میرا دل سُناتا ہے مجھے
میں سُنا سکتا نہیں وہ داستانِ لکھنؤ

پھول چُننا ہیں تو جنت کی بہاریں جلد آئیں
پھر نہیں ملنے کا یہ دورِ خزانِ لکھنؤ

مجھ کو تجھ پر فخر، تجھ کو لکھنؤ پر فخر ہے
اے مرے ہندوستاں، ہندوستانِ لکھنؤ

تاجدارِ کشورِ فن جانِ[1] عالم کی قسم
جوشؔ میرا صاحبِ[2] عالم ہے جانِ لکھنؤ

[1] پیرومرشد حضرت جانِ عالم واجد علی شاہ' [2] بپست قامت، بلند حوصلہ، گراں گوش، حقیقت نیوش، بہ قامت کہتر، بہ قیمت بہتر، رند بہ افکار، معدشہ بہ کردار، کوثر بہ گفتار، نسیم بہ رفتار، طوطی بہ اشدار، بہ تبسم طلوعِ سحر، بہ چہرہ تابِ قمر، بہ اعمال خشک، بہ اقوال تر، باوصف عبادت پاک نفس، باوجود ایمان حلیم، ممدوحِ اہلِ صفا مداحِ آلِ عبا۔ بہ ذطیفہ دیدۂ پرنم و بہ قصیدہ چشمۂ زمزم یعنی حکیم صاحب عالم

جوش ملیح آبادی

احمد[1] سے خطاب

رُخِ روشن پہ دُھواں دیکھ کے بیداری کا
میں نے کل صبح کو احمد سے بہ شفقت یہ کہا

کہ میاں نیند سے ہر رات کو کھیلا نہ کرو
غارِ امراض میں یُوں خود کو دھکیلا نہ کرو

تخمِ عشرت چمنِ زیست میں بونے کے لئے
نوجوانی تو ہے اینڈا اینڈ کے سونے کے لئے

کیا جوانی ہے یہ آئندہ زمانے کے لئے
فرشِ مخمل پہ بڑھاپے کو سُلانے کے لئے

دَولتِ عمر لُٹی جاتی ہے بے حد و حساب
کیا بڑھاپے میں مع سُود ملے گا یہ شباب؟

روز جاگو گے تو اُمید کدھر جائے گی
یہ کہاں فرصتِ عصیاں کی اُتر جائے گی

حیف ہر لمحہ کہانی ہے تو ہر آن "پلاٹ"
"کٹ" کا ہنگامہ کبھی اور کبھی شورِ "اسٹارٹ"

کیمرہ کوئی دکھاتا ہے تو کوئی "راپی"
اور "شنر" کی بھی رہا کرتی ہے آپا دھاپی

مجھ سے یہ حرفِ بزرگانہ جب احمد نے سُنا
پہلے تو نرم تبسّم سا لبوں پر کھیلا

مُسکرانے میں کھِلے گلشنِ ادراک کے پھول
جیسے نادان نے دانا کو دیا درسِ فضول

اور پھر کہنے لگے "ایش ٹرے" کو چھُو کر
آپ کا حرفِ نصیحت مرے سر آنکھوں پر

یہ مسلّم ہے کہ آئے گی قیامت کی نویں
بہ سرِ کرسی و بالائے سرِ عرشِ بریں

بخت بیدار ہو تو نیند سے رونا کیسا
سامنے ڈھیر ہو چاندی کا تو سونا کیسا

(سنہ ۱۹۴۵ء)

---

[1] یہ نظم جوش نے ڈبلیو زیڈ احمد مالک شالیمار فلم کمپنی پونا و بمبئی سے باتیں کرتے ہوئے فی البدیہہ کہی۔

جوش

مکتوباتِ جوش

پروفیسر سید احتشام حسین کے نام

(۱)

لشکر سیٹھ روڈ، پونہ ۲

احتشام صاحب، آپ خود واقف ہیں کہ اپنی شادی کے بعد سے آپ کے احباب دیرینہ سے جو روگردانی کی روش اختیار کی ہے، اُس پر لحاظ کرتے ہوئے میں آپ سے کس قدر ناخوش و کبیدہ ہوں، لیکن اِس اثنا میں آپ کے ادبی و انتقادی مضامین پڑھ کر دل اِس قدر خوش ہوا کہ میں آپ کو خط لکھنے پر مجبور ہو گیا۔

بات یہ ہے کہ آدمی کا دل جس طرح اپنے محاسن کر خوش ہوتا ہے (بشرطیکہ وہ حدود کے اندر اور مختصر ہوں) اُسی طرح ایک قابلِ تحسین انسان کو اُس کی قابلیت کی داد دے کر بھی قلب میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے، اور در اصل، آپ کو آپ کے محاسنِ علمی کی داد دے کر، اپنے قلب میں شگفتگی پیدا کرنے کا یہ جذبہ ہی ہے، جو اِس وقت مجھ سے یہ خط لکھا رہا ہے۔ ورنہ قیامت تک آپ کو ایک سطر بھی نہ لکھتا۔

وہ کمر ہے کہ ان خوش نصیب غیر معمولی ذہانت کے افراد میں سے ایک آپ بھی

ہیں۔

میں کے دوش بدوش ایک دوسری حیثیت سے بھی میں آپ کو جوان بخت سمجھ

ہوں، اور وہ حیثیت ہے آپ کی غیر معمولی ذہانت۔

ذہانت کے سلسلے میں شاید میں آپ سے کبھی یہ کہہ چکا ہوں کہ ذہانت کی

ایک ایسی قسم بھی ہے جو لطفِ عبادت سے پیدا ہوتی ہے، جس کے ذکر کی یہاں ضرورت

نہیں — البتہ وہ ذہانت جو اصیل و نجیب الطرفین ہوتی ہے، وہ ایک ایسی

دولت بیدار ہے، کرۂ ارض پر جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ لیکن اس کی بھی تین

قسمیں ہوتی ہیں۔ جن کو میں الٹی ترتیب یعنی قسم سوم، دوم اور اول سے

بیان کروں گا۔ قسم سوم کی ذہانت کا آلۂ کار "ناخن" ہوتا ہے، جو صرف موٹے

موٹے رموز و نکات کو اٹھا سکتی ہے۔

قسم دوم کی ذہانت کا آلۂ کار "چٹکی" ہوتی ہے، جو باریک نکات کو

بھی اٹھا لیتی ہے۔

اور قسم اول کی ذہانت کا آلۂ کار "ناخن" ہوتا ہے، جو سبک سے

اور باریک سے باریک، بلکہ باریک ترین رموز و نکات تک کو بہ آسانی چن

رہی تو نہ جانے غم کے کتنے پہاڑ اور ٹوٹیں گے۔

ہستی نہ سنے گی، نہ سکے گی اک دن
چپ چاپ ہر اک ظلم سہے گی اک دن
ہنسنے کا تو کیا ذکر، جو کچھ اور جیے
رونے کی بھی طاقت نہ رہے گی اک دن

میرزا صاحب اور مصطفیٰ علی سے کہہ دیجیے میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیتے۔

نیاز مند
جوش

میاں محمد صادق کے نام

(۱)

طاہر پیلس
شنکر سیٹھ روڈ
پونا — غالباً ۲۸ ۴/۴۶

میرے، یعنی مجھ بے دین کے دیندار محبوب دوست میاں صاحب،

آپ دراصل "میاں" ہی ہیں اور "صادق" ہیں۔ لعنت ہو اُس شخص پر جو آپ کو برسوں خط نہیں لکھتا، لیکن رحمت ہو اُس پر کہ خط لکھے یا نہ لکھے، آپ کو ہمیشہ یاد کرتا رہتا ہے — اب تو زندہ احباب میں، زیادہ سے زیادہ دو چار ہی ایسے پاؤں

سمجھ کر دو ایک ہی ایسے دوست رہ گئے ہیں، جن کی یاد کانٹے کی طرح دل میں چبھا کرتی ہے۔ اور ان قیدیوں، اور ظالموں میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ ایسے دوست کس قدر موذی ہوتے ہیں، آپ کے دل کو بھی اس کا اندازہ ہو گا۔

لوگ کہتے ہیں خدا دشمن کے شر سے بچائے، لیکن میں کہتا ہوں "خدا" دوستوں کی "خیر" سے بچائے، اس لیے کہ دشمن کی عداوت کبھی اتنی موذی ہو ہی نہیں سکتی، جس قدر کہ دوستوں کی محبت ہوتی ہے۔

ذرا سوچیے تو، جب ہم وطن میں یکجا تھے، وہ چند روز کی مسرت اب کس قدر بے پایاں غم کا باعث بنی ہوئی ہے۔ کاش ہم کبھی نہ ملے ہوتے۔ کاش ہم کبھی خوش نہ ہوئے ہوتے۔

گاہ گاہ آراستہ ہوتے ہیں جلسے عیش کے
آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آنے کے لیے!

میاں صاحب آپ اپنے کو "مقید" اور مجھے "آزاد" سمجھے ہیں، اس میں کچھ حقیقت تو ضرور ہے، مگر میاں صاحب غم کی زنجیر سے کسے رستگاری ہے — آپ کو کیا معلوم کہ ایک تولہ مسرت حاصل کرنے کی خاطر ایک من خون صرف کر دینا پڑتا ہے۔

طالبانِ عیش سے کہہ دو تو اڑ جائیں حواس
کس قدر رویا ہوں میں اک مسکرانے کے لیے

میاں صاحب، یہ ہے دنیا، اور یہ ہے اس دنیا کا نظام!

مانیگا اسے کون کہ ہوتا ہے طلوع
آنسو کے افق سے ہر تبسم میرا

ذرا غور تو فرمایئے اُس خلّاقِ عالم کی بے پایاں "شفقت" پر جس نے ہر پھول میں کانٹے کو اس طرح رکھا ہے کہ پھول مرجھا جائے، اور کانٹا باقی رہے ــ اور اس "رحمتِ عام" کے باوصف اپنے کو بڑی بے باکی کے ساتھ رحمٰن و رحیم کہتا رہتا ہے ــ

میں اس بار پوری سعی کرونگا کہ جاڑوں میں آپ سے ملنے کی خاطر لاہور آؤں، اور آپ سے بھی درخواست ہے کہ برسات میں یہاں تشریف لانے کی پوری کوشش کیجیے۔ کہیں فسانۂ عزائم کو اس کی خبر نہ ہو جائے۔ ورنہ وہ یا تو ہمارے تمہارے پاؤں یا ریلوں کے تمام پل توڑ کر رکھ دیگا۔ اور ہمارے تمہارا حقہ پی پی کر مسکرا دیگا۔

آپ کے صاحب زادے کہاں اور کیا کر رہے ہیں، آپ کی بیگم
صاحب اور بچوں کا مزاج کیسا ہے اور آپ خود کس حال میں ہیں۔ جلد
مطلع فرمایئے۔ قلم کمبخت اس قدر خراب، اور ہاتھ کا رعشہ اس قدر
تکلیف دہ ہے کہ لکھا ہی نہیں جاتا۔

کھڑکی کھلی ہوئی ہے، ہوا کے گرم جھونکے پھولوں کی خوشبو لیے
اس طرح آرہے ہیں گویا کوئی حبشی، محبوب کا پیام سُنا رہا ہے۔

اے عمرِ رواں کی رات، آہستہ گزر
اے ناظرِ کائنات، آہستہ گزر
اک شئے پہ بھی جمنے نہیں پاتی ہے نگاہ
اے قافلۂ حیات، آہستہ گزر!

میری اہلیۂ محترمہ اور بچے آپ کو سلام کہتے ہیں۔

آپ کا شیدائی
جوش

(۲)

اولڈ سکریٹریٹ دہلی

۲۳-۱۲-۴۸ء

بنام قوّت وجاہت

نحمدہٗ ونصلی علی الانسان العظیم

میرے محبوب میاں صاحب، آج پھر لہر آئی آپ کو خط لکھنے کی، سجنی رُت آ گئی ساجن کی۔ آپ کے بغیر دلی کسی اُجڑی اُجڑی نظر آتی ہے، قیامت تو یہ ہے کہ اب یہاں آپ بھی نہ "وہ" زباں پہ بار خدایا . . . . . ہائے کیا ویرانی ہے۔

آپ تو وہاں مزے کر رہے ہیں، رات دن نمازیں پڑھتے، ہر آن وضو کرتے اور ہر وقت لانبی لانبی داڑھیوں کی چھاؤں میں چہکتے ہونگے۔ ادھر ہم ہیں کہ نہ کوئی حبیب ہے، نہ محبوب۔ شراب کے ساتھ جو شخص آنسو پیتا ہو، وہ کیونکر جی رہا ہے، ذرا تصوّر تو فرمایئے۔

بہت جی چاہتا ہے لاہور آؤں، آپ کی صورت دیکھوں، آپ کو سینے سے لگاؤں، مگر مور کی طرح پاؤں دیکھ کر شرما جاتا ہوں۔ دیکھئے کب ملاقات ہوتی ہے، کبھی ہوتی بھی ہے کہ نہیں، کوئی یہ کون کہہ سکتا ہے۔

کم سے کم اپنی کوئی تازہ تصویر ہی بھیج دیجئے، اسی سے تسکین حاصل کرونگا۔

آج کل کیا مشاغل ہیں؟ لیکن آپ سے یہ پوچھنا ہی بیکار ہے، وہی مصلیٰ ہوگا، وہی وضو کا لوٹا، اور وہی زاہدانِ خشک کا مجمع — ہائے آپ کا سا پیارا انسان اور یہ ساز و سامان!

تو اہلِ حرم میں، نہ گُم آیات میں ہوتا
یہ مردِ حسیں کاش خرابات میں ہوتا

آپ کا نیاز مند
جوش

اندر سنگھ "راز" سنتو کھ سری کے نام

(۱)

آجکل
۱۵- راجپت روڈ- دہلی

۔۔ - ۲۲ - ۵۱

محترمی، محبت نامے کا شکریہ قبول فرمایئے ——

آپ نے، فرطِ محبت کی بنا پر، میری شاعری سے جن بلندیوں
کو وابستہ کیا ہے، وہ حقیقت میں ہیں نہیں — یہ میں نہیں کہتا کہ میں کچھ
بھی نہیں ہوں۔ اس لیے کہ یہ ایک بے جا، ہندوستانی مزاج کا انکسار ہوگا،
جسے میں پسند نہیں کرتا۔ لیکن آپ کو محبت و عقیدت کی بنا پر میں جس
قدر ارفع معلوم ہو رہا ہوں، ایمان داری کے ساتھ میری رائے ہے کہ
میں اُس قدر رفیع نہیں ہوں ——

ممکن ہے آپ کی عقیدت کو میری اس حق گوئی سے ٹھیس
لگے، مگر صداقت کے اظہار میں میرے واسطے یہ ناروا ہے کہ میں
مصلحت اندیشی یا دوستوں اور قدر دانوں کی دل جوئی کی خاطر امرِ
حق پر پردہ ڈال دوں ——

بہرحال آپ کی محبت اپنی جگہ ایک انمول تحفہ ہے، جس
سے، اگر میں نفی بھی کر دوں، پھر بھی متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔

اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا ———

نیازمند و سپاس گزار

———

جوش

محمد حبیب اللہ رشدی کے نام

(۱)

کلیم، دہلی

۱۵-۱۱-۳۵

میاں رشدی، کلیم کی خریداری کا آرڈر بھی ملا۔ اور آپ کا خط بھی، خط کیوں لکھوں، وہ تو ایک معانقہ ہے، اور وہ بھی بھرپور۔ اس وقت آپ کی دلکش صورت آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے، ہائے ہم کیسے بچھڑ گئے۔ کیا اب کبھی یکجا ہوں گے؟ مگر معاش بھی کتنی بے حیائی ہے جو صحبتوں کو درہم برہم کر دیتی ہے!

رسالوں کی طباعت کے سلسلے میں اس بری طرح مصروف ہوں کہ سونے تک کی فرصت نہیں ملتی۔ بڑی مشکل سے کچھ لمحے نقب لگا کر چرائے ہیں اور خط لکھ رہا ہوں۔

میرے تفصیلی خط کا انتظار کیجئے۔ اسے خط نہ سمجھئے، یہ محض رسید ہے۔

آپ جیسی بڑی بڑی صورتوں کے کاتب وہ نظر آئے، جھلسے ہوئے مکروہ چہرے۔ اب ان دروغ بافوں سے کام لینا ہے۔ واہ ری تقدیر، اور واہ رے صانع تقدیر۔ دوسرے نمبر کے لئے اپنا کوئی مقالہ یا نظم جلد روانہ کیجئے۔ آپ کا، جوش

(۲)

طاہر پیلس، شناسیٹھ روڈ

پونا۔ ۲-۱۱-۴۴

ہوا ہرگز نہ خطِ شوق کا ساماں بہم آتش

سیاہی ہوگئی نایاب اگر ہم نے قلم پایا

تم آئے تو عارف و قریشی غائب تھے، وہ دونوں آئے تو تم غائب ہو۔ زمانے کی یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ کورم کبھی پورا ہوا نہیں ہوتا۔

اب یہ دونوں لڑکے دسمبر میں آئیں گے۔ اس موقع کو ہاتھ سے ہرگز نہ جانے دینا، اور ان کے ساتھ ضرور پہلے آنا۔ اگر فرق

ہوا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ اپنا افسانہ بھی ساتھ لانا۔

اس وقت ہم لوگ "سوبر موڈ" میں ہیں۔ قریشی و عارف دونوں موجود ہیں۔ ہم سب اسٹوڈیو میں بیٹھے ہیں۔

عارف و قریشی کے ساتھ ایک تیسرے صاحب "ایاس۔ بھی ہیں، جنہیں پہلی بار میں نے دیکھا ہے۔ یہ دونوں اُن کے خلوص کے نہایت معترف و مداح ہیں۔ مجھے بھی اُن کی باتوں اور ان کے تیوروں سے پتا چلتا ہے کہ وہ ضرور مخلص ہوں گے۔ لیکن رشدی میری جان، میں کیا کروں، اُن کی صورت دیکھتا ہوں تو میرا معدہ فعل کرنا چھوڑنے لگتا ہے۔ اور میری پیشانی میں بخشباری ہونے لگتی ہے۔

جوش

(۳)

طاہر پیلس، شنکر سیٹھ روڈ

پونا (۲) ۴۴-۱-۲۶

عزیزم - بڑا غصہ آیا یہ معلوم کر کے کہ آپ ادھر سے گزرے لیکن پونے نہیں ٹھہرے۔ یہ بیسویں صدی کی بے پایاں سرد مہری کا ایک نہایت شاندار مظاہرہ تھا۔ اس کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

جی ہاں، میں پندرہ بیس دن تک کہیں باہر نہیں جا رہا ہوں۔ اس کے بعد شاید دھول پور جاؤں گا۔

اگر اس بار بھی بالا بالا اُڑ جانے کی حرکت کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ چلتے وقت تار دے دینا۔ میں اسٹیشن پہونچ جاؤں گا۔

عارف و قریشی کو بھی بغل میں دبا لاؤ تو اور بھی لطف رہے۔

غلام محمد صاحب کو انتقامی فرمان کے باب میں استفساری خط لکھ رہا ہوں۔ مہدی یار کو ہرگز نہیں لکھوں گا، اُس اُدگھتے خرگوش نے میرے خط کا جواب ہضم کر لیا ہے۔ اب یہی اُسے "سر" کے خطاب کی مبارک باد۔ سو اس بیہودگی کی تم سے مجھ سے کیوں کر توقع ہوئی! انگریزی حکومت کا خطاب اردو میں ماں کی گالی کے برابر ہے۔ اُسے ماں کی گالی دی گئی ہے اور میں اُس کی مبارک باد دوں۔ گھانس تو نہیں کھا گئے ہو تم؟

جوش

(۴)

طاہر پیلس شنکر سیٹھ روڈ

پونا (۲) ۴۴-۱۰-۲۵

ارے بھائی میں تو مسلسل بیمار رہا۔ اب پھر پاؤں کے دانے بے حد ستا رہے ہیں۔ وہاں جا کر مر رہے ہو کیا کہ آنے کا نام تک نہیں لیتے۔ احمد صاحب مجھے معنی خیز تبسم سے دیکھ کر پوچھتے ہیں، آپ کے رشدی صاحب نہیں آئے۔ خود بھی رسوا ہو رہے ہو اور مجھے بھی ذلیل کر رہے ہو۔ بات نبھا دو سکی۔ بھلے آدمی کی طرح آ کر کام شروع کر دو۔ ورنہ کیا ناک کٹواؤ گے۔ تمہاری ناک تو اتنی ہار چکی ہے کہ کٹنے پر بھی پروا نہیں معلوم ہوگی۔ لیکن میں کیا کروں گا۔

اختلاج قلب کے عالم میں یہ خط لکھا گیا ہے۔ پڑھا جائے تو پڑھا جائے نہیں تو جائے ....

جوش

(۵)

طاہر پیلس شنکر سیٹھ روڈ

پونا (۲) ۴۵-۲-۱۵

رشدی بمبئی سے ایک خط میں نے لکھا تھا، اچھا ہوا تمہیں نہیں ملا۔ پڑھ کر رنج ہوتا۔ کیوں کہ جس عالم میں وہ خط میں نے تمہیں لکھا تھا میرے قلب کی حرکت بند ہونے کے قریب تھی

احمد صاحب نے کہا ہے کہ طویل رخصت لے کر آپ یہاں چلے آئیں۔

عارف۔ وقریشی مردود کو بھی ساتھ لانا۔ لکھو تو شاید چلیں آئیں۔

(ایک گھنٹے کے بعد)

خط لکھنا شروع کیا تھا کہ دو صاحب نازل ہو گئے۔ ایک گھنٹے کے بعد ابھی ابھی گئے ہیں۔ جانتے ہو پورے ایک گھنٹے تک وہ کیا کرتے رہے؟ ایک آدمی کی غیبت!!

اس تُوندبھر زندگی کا پورا ایک گھنٹہ برباد ہوا غیبت سنتے ہیں، کیا تم مجھ پر ترس نہیں کھا رہے ہو؟

ذرا سوچو تو میاں رشدی، جن کی ناک بہت اونچی واقع ہوئی ہے، کہ ہم ہندوستانی کس قدر پست، کس قدر گھٹیا، اور کس قدر دشمن عقل و محروم شرافت واقع ہوئے ہیں، کہ ایک دوسرے کی غیبت کرنے سے یہی نہیں کہ شرماتے نہیں بلکہ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں ——— ہائے کیسی ذلیل قوم میں پیدا ہوئے میاں جوش سلمہ اللہ تعالٰی۔

ہمارے پاس تمام وقت کی کتنی بڑی مقدار ہے صرف کرنے کے لئے۔ اور ہم میں کتنی بے پایاں کمینگی ہے کہ ہم اتنے دھڑلے کے ساتھ اسے صرف کرتے ہیں اور وہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔

لے کھائی میں بھی غیبت پر اُتر آیا۔ آخر ہوں نہ ہندوستانی کمینہ۔

رشدی میں تم سے پوچھتا ہوں، ان لوگوں نے غیبت سنانے کے لئے مجھے کیوں منتخب کیا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ کیا تمہیں میری چال ڈھال، نشست و برخاست اور چہرے مہرے میں کچھ گھٹیا پن نظر آتا ہے! صاف صاف اور دلیری کے ساتھ مجھے اس کا جواب دینا ——— غیبت کرنے والوں کو ضرور مجھ میں کچھ گھٹیا پن نظر آیا ہوگا، ورنہ وہ مجھے منتخب کیوں کرتے۔

موذی خراب کر گئے یہ دونوں۔ ٹھک۔ ٹھک۔ ٹھک۔ آواز آ رہی ہے میری کھوپڑی سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرے کالے سر کے اندر ٹین کے لوٹے بنانے کا کارخانہ کھول دیا گیا ہے۔

ذرا غور تو کرو میری بے بسی پر دو آدمی گلے کی رگیں پھلا پھلا کر ایک آدمی کی برائیاں سناتے رہے پورے ایک گھنٹے تک اور میں اُن کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ درمیان میں لقمہ دیا میں نے کہ آپ حضرات اس شخص کی اصلاح میں کیوں وقت صرف نہیں کرتے، کہنے لگے وہ ناقابل اصلاح ہے۔ میں نے کہا پھر بھول جایئے اسے۔ انہوں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے مجھے اس نظر سے دیکھا جیسے گھٹنے سے اتارتے ہوئے اس بچے کو دیکھتے ہیں جس نے پیشاب کر دیا ہو۔

ہائے رشدی اس عمر گریز پا و گراں مایہ کا پورا ایک گھنٹہ غیبت سننے میں صرف ہو گیا۔

تف ہے تجھ پہ اے ہندوستانی قدم!

جوش

(۶)

طاہر منیلس شنکر سیٹھ روڈ

پونا ۱۲ ، ۱ - ۸ - ۴۶

بھائی جب سے آپ گئے ہیں دن گن رہا ہوں کہ کب واپس ہوں گے ——— اس بار آپ کے خط کا بھی شدید انتظار

۱۳۔ احمد صاحب بھی آپ کو دو بار یاد کر چکے ہیں، کہتے تھے رشدی صاحب کا خط آئے تو مجھ سے ضرور کہئے گا۔

دلیکا بھی ہوٹل اور قریشی کا نام لے کر آپ نے دل پر تیر مار دیا۔ وہ دن اب کہاں ہے کہ آنے لگے اور آ بھی گئے تو وہ کمبن کیوں پلٹنے لگا۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا......

اپنی محترمہ ماطلب بچوں کو اپنے سمیت میری دعا کہو۔ ہنسی آتی ہے لفظ "دعا" پر۔

دل کانپ رہا ہے التجاؤں میں ہنوز
اک کیف ہے بھگتی کی صداؤں میں ہنوز
دم توڑ چکا ہے آسماں پر بھگوان
گاندھی مصروف ہیں دعاؤں میں ہنوز

سمندر سے بھی زیادہ لانبا، چوڑا اور گہرا...... پن۔

آپ جس قدر جلد بن پڑے، آئیے۔ آپ کے بغیر ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کسی ٹوٹی کشتی پر بہتا ہوا کسی جنگل میں آ نکلا ہوں، جہاں انسانی شکل و صورت کے جانور ٹہل رہے ہیں۔

رات کو خلاف معمول و مزاج، زیادہ پی گیا۔ اندر سے کوئی کلیجہ کھرچ رہا ہے۔ یہ حالت بھی کس قدر موذی و ملعون ہوتی ہے ...... اے اقدس آج سے نہیں پیوں گا ...... اب بے مروت پیئے گا، اور روز پیئے گا۔ چھوڑا کیسا کا۔

اے میاں رشدی، خدا کے واسطے آؤ، اور جلد آؤ۔ میں گھڑیاں گن رہا ہوں گھڑیاں۔

تین کروڑ ریا میاں لکھی ہیں تمہاری قسمت میں۔ سنتے سنتے ...... جائے گی ٹاپ بلنے والے کی۔

جوشؔ مرحوم

اے میاں ٹپے والے، پہنچا دیجیے اس خط کو فوراً شتر سے:

مولانا و مرشدنا سیدنا حضرت حبیب اللہ رشدیؔ مدظلہ

C. Hostel
Govt College
Gulbarga
Dn

(۷)

۸۔ اولڈ آغا خان بلڈنگ
جیکب سرکل بمبئی (۱۱) ۔ ۱-۲-۴۸ء

بھائی رشیدی، دہلی سے یہاں آتے ہوئے ریل میں بیمار ہو گیا۔ بیمار نہ ہوتا تو تعجب تھا۔ رات کے تین بجے ریل کے غسل خانے میں ٹھنڈے پانی سے نہایا۔ نہاتے ہی ایک اسٹیشن آ گیا، اور میں جناب فوراً باہر نکل کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے۔ ابھی تک جوانی کی گھٹائیں دماغ پر چھائی ہوئی ہیں — چنانچہ اب شدید نزلے، کھانسی، اعضا شکنی اور گلے کی خبیث ترین خراش میں گرفتار ہوں — بات کام نہیں دے رہا ہے، انگلیوں کو اڑیل گدھے کی طرح مار مار کر لکھنے پر مجبور کر رہا ہوں۔ لیکن انگلیاں بھی پورا پورا انتقام لے رہی ہیں۔ اور حروف کی شکلیں تبدیل کرتی چلی جا رہی ہیں۔

بھائی تمہارے جدا ہونے کے بعد سے اب تک یہ دن ہم پر جیسے گذرے، اور اب تک کیسے گذر رہے ہیں۔ بس اس کی شرح نہ پوچھو۔ نہ میں لکھ سکتا ہوں، نہ تم پڑھ سکتے ہو۔ "خدا" احمد صاحب کا بھلا کرے جنہوں نے یہ برے دن ہم سب کو دکھائے — دہلی گیا تھا: وہاں میری ملازمت طے ہو گئی ہے۔ تحریری حکم نامے کا انتظار ہے، جس کے آتے ہی یہاں سے منہ کالا کر جاؤں گا۔

(دس منٹ کھانسنے کے بعد)

دہلی جا کر خط لکھوں گا۔ آپ اپنے ٹائپ کے تفصیلی حالات وغیرہ لکھ کر مجھے وہاں روانہ کر دیجئے گا۔ مولانا آزاد سے گفتگو کر کے آپ کو مطلع کر دوں گا۔ اور پاکستان کے صیغۂ تعلیمات کو بھی لکھوں گا۔

اپنے حالات سے مطلع کیجئے۔ کیسی گذر رہی ہے، اور مستقبل کے بارے میں کیا سوچا۔

گاندھی جی کے قتل نے اور بھی دل کو توڑ دیا ہے بھائی اب تو سناٹا ہی سناٹا ہے۔ امیدوں کے تمام چراغ گل ہو چکے ہیں لعنت اس نمک حرام، بے وفا، اور احسان فراموش کمینے ہندوستان پر۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

بس بھائی اب لکھا نہیں جاتا۔ قتل نہ ہو گئے، اور بے زری کے ہاتھوں مر نہ گئے تو پھر لکھیں گے۔ اور شاید پھر ملیں گے بھی، ورنہ "خدا" حافظ، کسے معلوم موت کس سمت سے اور کب آ رہی ہے۔ عجیب ہولناک جنگل ہے بھیانک اور سوگوار۔

بیگم اور بچوں کو دعا۔

ابھی دس پندرہ روز بمبئی ہی میں قیام رہے گا۔   جوش

(۸)

۸۔ اولڈ آغا خان بلڈنگ۔ ہانس روڈ
بمبئی (۱۱) ۲۹-۳-۴۸ء

حضرت، اب میں ارادہ کر رہا ہوں کہ جلد سے جلد کراچی چلا جاؤں۔ پٹیالے سے پنشن آئی اور میں چلا۔ لیکن پنشن آنے میں ابھی غالباً دس پندرہ روز صرف ہوں گے۔ اگر آپ تیار ہو سکیں تو میرے ساتھ ہی چلیں۔

آپ کے ٹائپ کے بارے میں غلام محمد صاحب اور اختر حسین رائے پوری کے جو خطوط میرے پاس آئے ہیں، روانہ

کر رہا ہوں۔ مژدہ باد کہ دہلی میں میری جگہ کسی اور کا تقرر ہو گیا۔ ہندوستان نے میری کس قدر عزت افزائی فرمائی ہے۔ یہی وہ ہندوستان ہے جس کی آزادی کی بیس برس تک خدمت کی ہے — اور آج آزاد ہو کر اس نے یوں نوازا ہے — مجھے اس وقت ایک جلسے میں جانا ہے اس لئے زیادہ لکھ نہیں سکتا۔

میرے حالات کی نوعیت آپ سے کچھ کم بدتر نہیں ہے۔ کیونکر جی رہا ہوں اور کیوں کر جیوں گا کچھ نہیں معلوم۔ جوش

(۹)

"آج کل"

اولڈ سکریٹریٹ۔ دہلی

پیارے دوست، آپ اردو ڈائجسٹ، اردو۔ ادب یا اردو زبان کے محاسن پر مضمون لکھیں یا مولوی وحید الدین سلیم پر خامہ فرسائی کریں۔ مضمون ہمارے تین، چار یا پانچ صفحوں کے اندر رہے۔ اور ہاں — بساطِ عالم — کے واسطے، جس میں صرف بیرونی سیاست پر مضامین شائع ہوتے ہیں، کوئی سیاسی مقالہ مرحمت فرمائیں۔ لیکن اس کا لہجہ نہ دوستانہ ہو نہ دشمنانہ۔ صرف معلوماتی ہو۔ لسانیات اور نفسیات کے موضوع پر کیا آپ لکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے بچوں کے پرچے "نونہال" کے لئے آپ ہلکے پھلکے قصے اور چٹکلے روانہ کیجئے۔ جو دلچسپ بھی ہوں اور سبق آموز بھی — کاروبار کی باتیں ختم۔

قوت و حیات کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بارش کا آغاز ہو چکا ہے۔ پانی لو کے منہ کو توکا لگا چکا ہے۔ ٹھنڈی ہوائیں چل' اور کالی گھٹائیں جھوم رہی ہیں۔ ساجن رُت آگئی بھیگن کی —— ارے مجالے لے رسیانی' دلھنی کا دیجالے سے رسیا...... ہر چند دفتر کی سی خشک جگہ بیٹھا ہوا ہوں۔ مگر وہ ذہنی نمو ہے کہ معاذ اللہ!

حبیب احمد صاحب کس رنگ میں ہیں۔ آدمی بڑا کھرا ہے بھائی، افسوس اس کی کوئی قدر نہیں۔ میں تو اس کی مونچھوں پر سیکڑوں زلفیں قربان کر سکتا ہوں۔ یہ شخص کس مزے سے بات کرتا ہے۔ لہجے میں وہ کھٹکا اور وہ کھنک ہے کہ ٹن سے بولتی ہے آواز...... مگر اس شخص تک میرا سلام نہ پہنچا نا۔ تمہارے خط میں اس نے مجھے سلام نہیں لکھوایا۔ حالانکہ پرائیویٹ طور پر میں اسے سلام کر رہا ہوں۔

سُنا ہے وہ تھانوی شوکت اب لاہور میں بنیں ہے۔

یا بدھو بدھو۔ یا بدھو بدھو! سمجھے، یہ آواز یکا یک میرے دل سے کیوں آنے لگی۔ ابھی ابھی کمرے میں ایک کمل...... داخل ہوا ہے — اب دیکھئے کیا کیا بکواس کرے گا؟ بہت بڑا بور ہے۔ بلکہ "بورِ اعظم" ہے سالا۔ اب کیا...... خط لکھ سکیں گے۔ میں قلم روکتا ہوں ما ورنہ وہ زبان کھولنے پر ہے۔ بول حرامی بول!

راقم: جوش

(۱۰)

آج کل۔ اولڈ سکریٹریٹ

دہلی۔ ۱۲-۳-۵۱ء

بھائی بشنکر لال سے یہ وجوہ، میرا کہنا مناسب نہیں۔ ورنہ آپ کا کام اور میں نہ کرتا۔ طوالت سے بچنے کی

خاطر تفصیل سے گریز کر رہا ہوں۔

آپ کی تصویر دیکھ کر نقش بہ دیوار ہو گیا۔

احمد صاحب کس رنگ میں ہیں، انہیں ان کی تنیل کی وسعت تنگ کئے ہوئے ہے — اور ملک حبیب احمد صاحب سے ملنا جلنا کیوں ترک کر دیا۔ یہ تو وضع داری کے خلاف کیا آپ نے۔

اہل و عیال کہاں ہیں معمورہ الاسکہ۔ آخر یہ گردش روزگار ختم ہو گی کب اور کیوں کر۔ اور ٹائپ رائٹر بھول گئے! عجیب آدمی ہیں آپ۔ بھگا بھگا مارے ہوئے ہے سرکار کو۔

فیض صاحب سے کبھی ملے تھے، کیا خیال ہے ان کی گرفتاری کے متعلق؟

"آج کل" کے واسطے کوئی فکری یا معلوماتی مقالہ عنایت فرمائیے۔

ہاں، احمد صاحب سے معین الدین صاحب کی خیریت معلوم کر کے لکھ بھیجئے۔ تشویش ہے

پاکستان کی عام فضا کیسی ہے؟

مودودی کہاں اور کیا کر رہے ہیں۔ حبیب اشعر صاحب سے ملاقات ہے؟

نیاز مند: جوش

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام

(۱)

"آج کل"۔ اولڈ سکریٹریٹ

دہلی۔ ۵۔ ۲۔ ۵۲

حضرت، آپ تو یہاں سے اس طرح دبے پاؤں اور چپ چپاتے چلے گئے کہ ایک استعجابی شعر ہجرت کا آسانی سے آغاز کیا جا سکتا ہے — اور پھر وہاں پہنچ کر ایسی چپ سادھ لی کہ ہزاروں چپ شاہ اس پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔

آگرے کے پاگل خانے کے ایک نیم برہنہ دیوانے نے اپنے عریاں جسم پر بہت گہری نظر ڈال کر انتہائی افسوسناک متانت کے ساتھ مجھ سے کہا تھا، "آگرے کی ریت نرالی ہے" پر بابو جی ہمارے دیس میں اتنے آدمی ننگے نہیں پیدا کرتے۔ چنانچہ آپ کے باب میں بھی اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ بابو جی ہمارے دیس میں اتنے بڑے آدمی یوں مغرور نہیں ہوا کرتے۔

آپ کی کتاب جستہ جستہ پڑھی اور بہت پسند آئی۔ آپ کی نظر انتقاد بہت اچھی اور صاف ہے۔ جلد کچھ لکھوں گا

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہو گا۔

نیاز مند: جوش

(۲)

"آج کل"۔ اولڈ سکریٹریٹ

دہلی۔ ۲۱۔ ۱۔ ۵۳

حضرت، یاد آوری کا شکریہ قبول فرمائیے۔

میں خود چاہتا ہوں، بلکہ تمنائی ہوں کہ لاہور آؤں، اور آپ کے دیدار سے لطف اٹھاؤں، لیکن

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات

سے مجبور ہوں —— یا تو آدمی اصول ہی نہ بنائے، اور بنائے تو پھر سختی کے ساتھ اُس کا پابند ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ میری مجبوری پہ نگاہ کر کے مجھے معاف فرما دیں گے۔

اکثر آپ یاد آتے ہیں۔ اب تو یادوں کا موسم ہی ہے۔ مستقبل سے کوئی توقع نہیں۔ حال زبوں حال ہے۔ اس لئے جو کچھ ہے وہ ماضی ہے —— بری ہوئی گھائیں کیونکر گزرتی۔ برستی میں یہ مجھ سے پوچھئے۔ اور بھولی بسری صحبتیں کیوں کر گزرتی ہیں۔ یہ بس میرا ہی دل جانتا ہے۔

کبھی کبھی یاد کرتے رہئے۔ عمر کا پیمانہ چھلکا ہی چاہتا ہے ——

بیار بادہ کہ میثاقِ عمر لبریز است
مریض را دمِ آخر چہ جائے پرہیز است

کچھ آج کل کے واسطے ضرور عنایت فرمایئے۔　　　　نیاز شعار

وہی جوش بادہ گسار

(۳)

کراچی

۳۱-۱-۵۹

بندہ نواز، متعدد خطوط بالقوۃ آپ کو لکھے اور آج بالفعل لکھنے کی توفیق ارزانی ہوئی ہے۔

آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ میں نے اپنی زندگی کے حالات، "یادوں کی برات" کے نام سے لکھنا شروع کر دیئے ہیں، اور بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔

جب لاہور آؤں گا، یا آپ کراچی آئیں گے تو اُس کی سُرخیاں دکھاؤں گا اور مشورہ لوں گا۔

اپنی صحت و عافیت سے جلد جلد نہ سہی گاہ گاہ تو مطلع کرتے رہئے۔ اس لئے کہ اب میری زندگی کا سفینہ کنارے پر آ لگنے ہی والا ہے۔

السلام اے ہمدما، آئندگانِ رفتنی
بر شما خوش باد نا خوش ہائے دنیائے دنی

نیازمند: جوش

(۴)

ترقی اردو بورڈ کراچی

۲۴-۱۰-۶۰

عزیزی، آپ کا وہ خط مجھے نہیں ملا ورنہ جواب ضرور دیتا۔

جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ لاہور آؤں، اور آپ سے ملوں۔ لیکن "جامہ نہ دارم و سودا دارم" ہے۔

بہرحال اگر کوئی سبیل جس کی مستقبل قریب میں بہت ہی لاغر سی امید ہے، نکل آئی تو آؤں گا اور پڑ لنگا کر آؤں گا۔

جی ہاں میں آج کل خوب کام کر رہا ہوں۔ آج کل ہی پر موقوف نہیں۔ زندگی کے ہر دور، یہاں تک کہ زندگی کی بھری برسات، یعنی عنفوانِ شباب میں بھی کبھی کام سے غافل نہیں رہا۔

صبح کے چار بجے سے لے کر شام تک تو کتابوں، علمائے علم و ادب کی صحبتوں، اور شعر و سخن کی کاوشوں میں سرگرم رہتا تھا، اور راتوں کو یادش بخیر، مہکتے گیسوؤں اور دہکتے مکھڑوں، کھنکتے ساغروں اور تھرتھراتی سارنگیوں میں غرق ہو جایا کرتا تھا۔

عبادت میاں! میری راتیں خالی خولی اور کھلی عیاشیاں نہیں ہوتی تھیں، بلکہ میں اُن راتوں کے بینکوں میں جس قدر وقت اور روپیہ جمع کیا کرتا تھا، صبح چار بجے بیدار ہوتے ہی، گزری ہوئی راتوں کے بینکوں سے وہ تمام و کمال وقت، اور روپیہ مع سود وصول فرما کر، اس روپے کو تعمیراتِ ادب کی تزئین و توسیع میں لگا دیا کرتا تھا۔

حرفِ آخر، پر طبیعت میں کچھ دنوں سے رُک رُکاہٹ پیدا ہو رہی ہے۔ اپنی غیر مطبوعہ نظموں اور سوانح سے فارغ ہو کر اس کام کو شروع کر دوں گا۔

حبیب اشعر کا، آپ کے خط کے ساتھ، ابھی خط ملا ہے اور اُن کو بھی جواب لکھ رہا ہوں۔

میرے مکان کا پتہ ہے۔ عامل کالونی (۲) سید محمود روڈ (نیو ٹاؤن کی مسجد کے سامنے والی گلی میں)

نیاز مند: جوشؔ مرحوم

آج میں اپنے دست پیالہ گیر سے اپنے کو "مرحوم" لکھ رہا ہوں

انشاء اللہ بہت جلد آپ اپنے دست کتاب گیر سے "مرحوم" لکھیں گے

(۵)

ترقی اردو بورڈ، شاہراہ قائدین

کراچی۔ ۳-۷-۶۱ء

عزیزی، مشاغل و فرائض کے ہجوم، اور مزاج کی پیہم ناسازگاری کی بنا پر آپ کے خط کا جواب افسوسناک تاخیر سے روانہ کر رہا ہوں۔ اور زیادہ شرمندگی آمیز افسوس اس بات کا ہے کہ میری رائے تحریر کرنے کے لئے جو نمونہ (پرچہ) آپ نے بھیجا تھا وہ کہیں گم ہو گیا ہے۔

دوبارہ تکلیف کر کے وہ کاغذ بھیج دیجئے، تاکہ میں اپنی رائے جلد تر لکھ کر بھیج دوں۔

کھانسی برابر آ رہی ہے۔ اور اعصاب کچھ ایسے تھکے ہیں کہ بہت رک رک کر یہ خط لکھ رہا ہوں۔

سب کچھ طاہرہ یا ہیضہ ہو جائے، لیکن کبھی خدا نہ کرے زکام نہ ہو۔ اس کم بخت کی زد میں تو رگ رگ کا ست نکل جاتا ہے اور دوسری بلا یہ نامراد گرمی۔ میں ولایتی کتوں سے ہزار گنا بڑھ کر گرمی کھاتا ہوں، اور اس نامراد و خبیث موسم میں صبح سے شام تک، بوکھلایا سا رہتا ہوں۔

خیال تھا اس بار مری آباد جا کر آم کھا آؤں گا۔ مگر جیب میں دام کہاں کہ آم کھا آؤں ——— اس لئے کراچی میں بیٹھا غم کھا رہا ہوں۔

آپ کی یاد اکثر اوقات دماغ پر جگمگاتی رہتی ہے، اور بار بار جی چاہتا ہے کہ لاہور جا کر آپ کو دیکھ آؤں۔ مگر لاہور جاؤں،

تو کیوں کر جاؤں ـــــ ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ جیسے ہی کہیں جانے کا خیال پیدا ہوتا تھا، کھٹ سے وہاں پہونچ جایا کرتا تھا، اور اب یہ عالم ہے کہ "اے بسا آرزو ـــــ"

آپ کا قدر شناس : جوش مرحوم

ساغر نظامی کے نام

(۱)

ملیح آباد۔ لکھنو

۱ - ۱۱ - ۲۳

مشفقی بتسلیم

صبح آپ کا پوسٹ کارڈ ملا۔ دن بھر فرصت نہ ملی۔ ہر چند بہت الجھن رہی۔ گو معذور تھا۔ اس وقت آفتاب غروب ہو چلا ہے اور میں یہ عریضہ آپ کو لکھ رہا ہوں،

ملیح آباد سے وی پی واپس آئے اور میرا وی پی بھی انکاری واپس آیا ..... کاش اپنا سینہ کھول کر آپ کو دکھا سکتا...... خیالات کا اس درجہ ہجوم ہے کہ لکھا نہیں جاتا......"

دوسرے وی پی (میرے وی پی کے علاوہ) جو واپس آئے ہیں، اُن میں دراصل میری غلطی ہے۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد میں بھول گیا۔ اور جن صاحبوں کے نام آپ کو لکھائے گئے تھے اُن سے ذکر ہی کی نوبت نہیں آئی۔ وی پی واپس آنے میں اُن کی غلطی نہیں تھی۔ میں خطاوار ہوں۔ چونکہ یہ ایک تاجرانہ حیثیت کی بات ہے اس لئے محصول کا جس قدر نقصان ہوا جلد سے جلد مجھے لکھئے تاکہ میں روانہ کروں۔

اب رہا میرے وی پی کا معاملہ، اس میں میری قطعی غلطی نہیں ہے۔ یہ پوسٹ ماسٹر صاحب ملیح آباد کی جلد بازی کا نتیجہ ہے۔ واقعہ یہ ہے: میں حق بات کہنے میں کیوں حجاب کروں۔ کہ جس روز آپ کا وی پی آیا تھا میرے پاس خرچ نہیں تھا۔ میں نے پوسٹ مین سے کہا کہ وی پی بطور امانت رکھ لے۔

دو چار روز کے بعد روپیہ بھیجا۔ معلوم ہوا کہ پوسٹ ماسٹر نے وی پی واپس کر دیا۔

آپ تعجب نہ کریں، میری یہی حالت ہے۔ کبھی تو سب کچھ ہے اور کبھی دو روپے بھی نہیں۔ بعض لوگ اپنی ان کیفیتوں کو لکھتے ہوئے شرماتے ہیں، مگر مجھے ان باتوں کی چنداں پروا نہیں ہوتی۔ آپ اس کا یقین کریں کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں حرف بہ حرف صحیح ہے۔ تصنع اور زمانہ سازی کو کفر بلکہ بدتر از کفر سمجھتا ہوں۔

میرے مذہب میں کوئی شے حرام نہیں مگر زمانہ سازی اور دل آزاری۔

آپ جلد سے جلد وی پی میرے نام روانہ فرمائیں، اس وی پی میں اس نقصان کو بھی شامل کر لیجئے گا جو وی پی واپس آنے سے ظہور میں آیا۔ شرمایئے گا نہیں یہ معاملت ہے۔

اب رہا خط کے جواب کا معاملہ، بے شک خطاوار ہوں، قصور ہوا، معاف کیجئے۔ روز ارادہ کرتا تھا کہ خط لکھوں اور بھول جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی بات نہیں۔

میں چھاپا تھا۔ اب میں اسے تمام کر کے "ایشیا" کے لئے روانہ کر رہا ہوں۔ آپ کی ناسازیٔ طبع سے مجھے سخت تشویش تھی۔ فیصلے سے فرید صاحب[1] نے میری اور اپنی طرف سے بغرض استفسارِ حال آپ کی خدمت میں تار بھی بھیجا تھا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب آپ تندرست ہو گئے۔ ہندوستان کو آپ کی بہت سخت ضرورت ہے۔ آپ کا پرچہ ماشاء اللہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔ کیوں نہ ہو جس چیز کو "ساغر" اختیار کرے وہ لطیف و رنگین نہ ہو ممکن ہی نہیں —
میرے اندازِ تحریر سے آپ میری پریشان خاطری کا اندازہ فرما سکتے ہیں۔ آج کل اس قدر پریشان اور اس کے ساتھ ساتھ "کلیم"[2] کی اشاعت کے سلسلے میں عدیم الفرصت اور مشغول ہوں۔ سونے کی فرصت نہیں ملتی۔ براہِ کرم "کلیم" کا اعلان "ایشیا" میں طبع کر دیجئے۔ اور اپنی کوئی غیر مطبوعہ نظم آج ہی روانہ کر دیجئے۔ میں پرسوں دہلی چلا جاؤں گا۔ نظم "ہیچ" کے پتے پر بھیج دیجئے۔

ممکن ہے میں چند گھنٹوں کے لئے "کلیم" کے باب میں مشورے کی خاطر میرٹھ بھی آؤں۔
مجھے آپ کے مشوروں کی سخت ضرورت ہے۔ میں تو گرفتاروں میں ہوں۔ مجھے ہر قدم پر تجربہ کاروں کے مشورے درکار ہیں۔
خدا جانے آپ میری خط اور تحریر پڑھ بھی سکیں گے۔ مگر کیا کروں، کام اس قدر ہے کہ ہاتھ روک کر لکھ نہیں سکتا۔
خدا کرے اب آپ چاق و چوبند ہو گئے ہوں۔

آپ کا　جوش مرحوم

نظم کو غور سے پڑھ لیں۔ ممکن ہے نقل کرنے میں مجھ سے غلطی ہو گئی ہو۔
ذیل کا اعلان ایشیا میں دے دیجئے:

نام کی تبدیلی
بعض احباب کے اصرار سے "کاخِ بلند"[2] کا نام اب
"کلیم"
کر دیا گیا ہے:
ایجنٹ اور خریدار براہِ کرم نوٹ فرمالیں
جوش ملیح آبادی

(۳)

دہلی

۲۲-۱۲-۳۷

میرے ساغر، جگر، جگر جیو۔ پرسوں ۔۔ ہوں کل حضرت سیماب، ماہر صاحب کے وہاں مل گئے تھے۔ گرامی

---

[1] فرید جعفری
[2] پہلے جوش صاحب نے اپنے رسالے کا نام "کاخِ بلند" تجویز کیا تھا۔

گیا ہے تھے۔ میں نے کہا، واپسی کے موقع پہ ایک روز دہلی میں ٹھہریں تاکہ تمہیں (پیار سے لکھ رہا ہوں) میں مجاز سے ملا کر مصالحت کرا دوں۔ وہ وعدہ کر گئے ہیں۔

خدا مارے اس سردی کو۔ ابھی قلم ہی قابو میں نہیں آتا۔ انگلیاں پاجی پن کی رگ کی طرح اینٹھی جا رہی ہیں۔

لاہور کے متعلق تمہارا سفارشی نامہ پہونچا ...... اور ..... روپے پہ لعنت بھیجو۔ تم کہو تو میں قرض لے کر مشاعرے میں شریک ہوں، لیکن جب کہ بشیر احمد صاحب جن کا خط بھی ابھی ابھی ملا ہے ..... دینے پر تیار ہیں، تو پھر مجھے میرے اصول سے کیوں منحرف کرو۔

اگر پہلی ہی مرتبہ ہم اپنے اصول سے ہٹ گئے تو پھر مثال قائم ہو جائے گی۔ اور ہر مشاعرہ ہمیں دبائے گا۔

میں ۲۹ دسمبر کو تمہارا منتظر رہوں گا۔ ذرا سویرے ہی سے آ جانا۔ اگر تم نہ آئے تو جلانے والے پر لعنت۔ منظر خاں[1] چلے گئے ہوں گے، اس لئے ان کے سلام کا جواب روانہ نہیں کر رہا ہوں۔

اف کیسی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ دم نکلا جاتا ہے دم۔ شام ہوتی تو اس بدمعاش سردی سے بذریعہ آتش انتقام لے لیتا۔ لیکن اس وقت کر ہی کیا سکتا ہوں۔ مجھے غیر مسلح پا کر بزدل سردی حملہ آور ہو رہی ہے۔ اچھا مردار کو شام کے وقت دیکھ لیا جائے گا۔

تمہارا جوش

(۴)

ملیح آباد شریف لکھنؤ
۲۵-۶-۴۰ء

حضرت، خط کاغذ اور دوات قلم اس کمرے میں موجود نہیں، اس لئے اس ردی کاغذ پہ پنسل سے لکھ رہا ہوں... معاف کیجئے گا۔

خط آیا، دل کی پھانس نکل گئی، اور سینے کا شعلہ فرو ہو گیا۔ مجھے آپ پر سخت غصہ تھا کہ الہ آباد میں میری اتنی بری حالت دیکھنے کے باوجود آپ نے خبر نہ لی۔ حالانکہ آپ کو خیریت دریافت کرنے کی خاطر ہر ہفتے خط لکھنا لازم تھا۔ آپ الٹے مجھ سے شکایت کرتے ہیں۔ اس شکایت کا کسی پہ کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ یہ شکایت خود شناسی کے ذہن میں محض ایک فرضی بات ہو۔

بہرحال شکر گذار ہوں کہ آپ نے خط تو لکھا ــــ میں الہ آباد سے آ کر پورے چار مہینے بیمار رہا۔ اور مجھ پر کیا کیا گذر گئی۔ اس سے صرف میں ہی واقف ہوں ــــ اب ہر چند اچھا ہوں لیکن چند روز کے لئے۔ مرض کے عود کرنے کا احتمال ہے ــــ میرے دل کی ساخت میں کچھ فتور آ گیا ہے لہٰذا اب میں اس منزل میں ہوں کہ ہر لمحے دل بند ہو سکتا ہے۔

میری آرزو ہے کہ جولائی کے دوسرے ہفتے میں آپ یہاں آئیں، آم کھائیں اور نظمیں سنائیں۔

غالباً ۸ جولائی کو مسوری جاؤں گا۔ واپس آہستہ ہی نکلوں گا۔ چلے آیئے گا۔ بارش ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ جب تک ہو جائے گی۔

---

[1] منظر فریدپوری

جواب آج ہی لکھئے گا مدت سے "ایشیا" نظر سے نہیں گزرا۔ ہاں وہ پرچہ بھیج دیجئے جس میں "تجھ سے رخصت کی یہ شام اشک افشاں ہلسے ہائے" نکلی ہے۔ مجھ سے لگا نہیں۔ یا صرف وہی نظم روانہ کر دیجئے گا۔

مزاج گرامی ؟ وعلیک ! جوش خاں

(۵)

بیتے[1] کی ضرورت نہیں، جواب دے کر کیا کیجئے گا۔

۸-۱۲-۴۰ء

(........) ساغر صاحب

↓

مرتب دانِ حضرت ساغر — کارسازانِ حضرت ساغر

جان وایمانِ حضرت ساغر — بازدارانِ حضرت ساغر

اور شیطانِ حضرت ساغر

لکھنؤ سے میرے چلتے وقت آپ نے خط لکھا۔ اس کرم فرمائی کا شکریہ کیونکر ادا کروں۔ شکایت اب بیکار معلوم ہوتی ہے۔ معاملہ شکایت کی حدود سے متجاوز ہو چکا ہے۔ آپ کا case قطعی طور پر Hopeless ثابت ہو چکا ہے۔ اب تہ موشی اور مصنوعی میل جول ہی دانش مندی ہے۔ میں آپ پر اس پردے میں اعتراض نہیں کر رہا ہوں۔ اس انسانی آبادی میں کس کی مجال ہے کہ کسی پر اعتراض کر سکے۔ البتہ حقیقت سے آگاہ ہو جانے کے بعد

---

[1] یوں تو انسان کی اپنی نفسیات کی جھلک اس کے تمام کردار اور گفتار میں ہوتی ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ ان خطوط میں جو انسان اپنے کسی قریبی اور معتمد دوست کو تحریر کرتا ہے، دل کی باتیں لکھنے کو جی چاہتا ہی ہے۔ خطوط اور تمام کردار انسانی فطرت اور تحریر و تقریر یا اس کے انعکاسات، ان تمام باتوں کا بہترین مظاہرہ جوش کے خطوط ہیں۔ وہ خطوط میں بھی اسی طرح (Satirist) طنز نگار ہے جس طرح اپنی شاعری میں۔

جوش خلقی طور پر ایک مخلص انسان ہے (اور انسان ہی) لیکن انسان کا اخلاص بھی اس کی دوسری کیفیات کی طرح "خوف ناک" ہوتا ہے۔

جوش کا قدرتی اخلاص افراد سے توقعات قائم کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ مگر وہ خود اس حقیقت پر کبھی دھیان نہیں دیتا کہ سوسائٹی اور "دوسرے" بہ حیثیت "جوش" سے بھی کچھ توقعات رکھتے ہیں

دوسروں کی توقعات پوری نہ ہوں ——— تو محض ایک سرشار تخیل اور طفلانہ توقع کی مجروح ہو جانے کو لگاتار دشنام، مگر یہ دشنام طرازیاں بھی بڑی قیمت رکھتی ہیں اس لئے من و عن اس خط کو شائع کیا گیا۔

[2] یہ عبارت شر انگیز تھی۔ اس لئے جوش کے حق میں اس کا نہ لکھنا بہتر نہیں "کا نامہ خیر" سمجھتا ہوں۔

ساغر

سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ سو اب میں ساکت ہی رہوں گا۔
کہیے، مزاج گرامی کیسا ہے! جی ہاں میں خیریت سے ہوں۔ آپ کی پرسش کا شکریہ۔ تشریف رکھیے۔ ما حضر
تناول فرما کر جائیے گا۔ سردست پان حاضر ہے۔ تخت پر تکلیف ہو رہی ہو تو کوچ پر تشریف لے آئیے۔ میں تو آپ کا
بے حد مشتاق رہتا ہوں ——— لیکن دل میں کراہت آمیز قہقہے اور جلد تر تشریف لے جانے کی تمنا۔

جوش صاحب

محمد حسام الدین خاں غوری کے نام

کلیم دہلی

۲۸-۱-۳۹

کرمی، افسانے کا شکریہ اور تاخیر جواب و رسید کی معذرت قبول فرمایئے۔
آپ کا افسانہ حسب ترتیب شائع کر دیا جائے گا۔
مجھے آپ سے بڑی شکایت ہے کہ آپ نے اپنے خیال کے کاغذ وغیرہ کو انگریزی میں چھپوایا ہے۔ یہ بات ہم ہندوستانیوں کے واسطے ہرگز زیبا نہیں کہ ہم اغیار کی زبان اختیار کریں۔ امید کہ آپ ضرور غور فرمائیں گے۔

نیازمند: جوش

جوش کے آٹوگراف

عبدالعلیم انصاری (آرٹسٹ) کے لیے

انصاری صاحب، ہندوستان کے مایۂ ناز آرٹسٹ
اور صاحبِ فکر ادیب ہیں۔

جوش

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

جوش

اُٹھ، اور زمیں پہ دُنیا ہزار پیدا کر
نہ آئی ہو جو کبھی وہ بہار پیدا کر
مذاقِ بندگیٔ عصرِ نو کی تجھ کو قسم
نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر

جوش

حضورِ اہلِ ہمت آبرو کھونا نہیں آتا
غمِ دُنیا پہ ہنسنے کے سوا رونا نہیں آتا

جوش

اُٹھ اے ندیم کہ رنگِ جہاں بدل ڈالیں
زمیں کو تازہ کریں آسماں بدل ڈالیں

جوش

اے چشمِ ہوش خیرہ کر نیلے رنگ دیکھ
چمکی ہیں ہے نقاب کا گوشہ لیے ہوئے

جوش

★ جوش اور بیگم جوش ★

جہ صاحب محمود آباد کی صدارت میں جشن جوش کا
غاز رسم تاجپوشی سے ہوا۔ جوش کو ان کے دوستوں اور
عقیدتمندوں نے رنگا رنگ پھولوں کے ہار پہنائے، تحفے نذر
کئے اور اسی موقع پر مدیر افکار نے ان کی خدمت میں
عظیم و ضخیم 'جوش نمبر' پیش کیا۔

جشن گاہ کا گوشۂ نمائش

جشن کے سلسلے میں جوش کی نادر تصاویر، تاریخی خطوط،
تصانیف، قلمی مسودات اور عزیز کارٹونسٹ کے خاکوں کی
نمائش بھی قابل دید تھی جسے رفیقان افکار نے ترتیب
دیا تھا۔ (دائیں طرف سے): عابدی جعفر - صہبا لکھنوی -
منیر احمد - سید احمد علی -
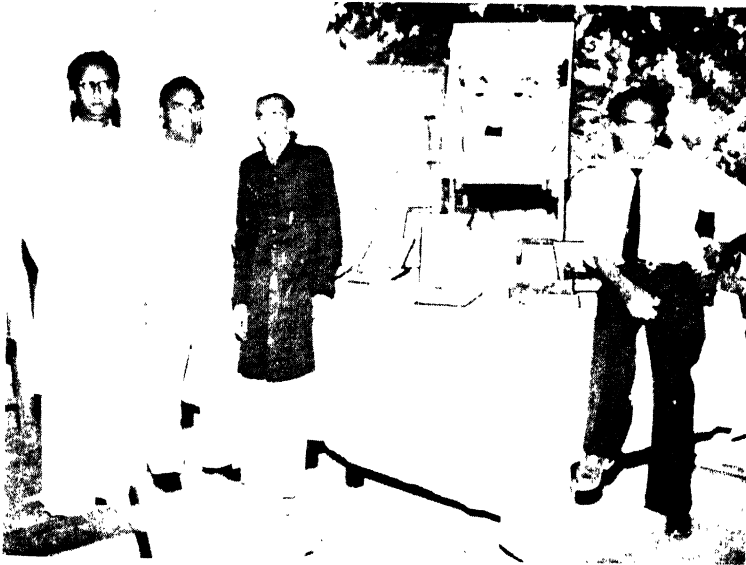
''کچھ اپنے بارے میں''
جوش اظہار خیال فرما رہے ہیں
اور
شرکت کرنے والے ادیب اور
دانشور ہمہ تن گوش ہیں -
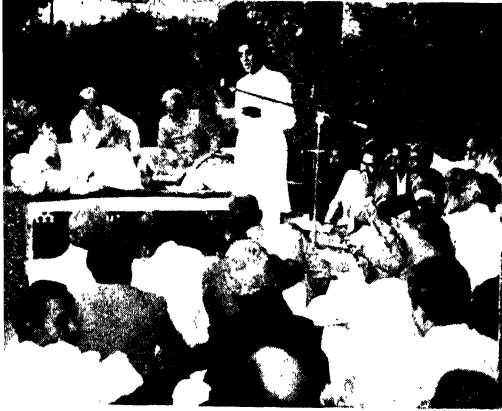
جشن جوش کے دو منظر

* (دائیں جانب) — تنزیل الرحمان معتمد انجمن دانشوران ادب جشن کے سلسلے میں ملک اور بیرون ملک سے موصول ہونے والے پیغامات سنا رہے ہیں -

* (بائیں جانب) شیخ عبدالخالق صدر مجلس استقبالیہ خطبہ پیش کر رہے ہیں -

* جشن جوش کا عام منظر — اس جشن میں ایک ہزار سے زائد ادیبوں شاعروں اور فن کاروں نے شرکت کی -

عجب سلطانی سے [illegible] ہیں
جو خدائی سے لڑے، بندگی سے ڈر سکتا نہیں

* جوش کے دادا نواب محمد احمد خاں احمد

* جوش کے والد نواب بشیر احمد خاں بشیر

* جوش — صاحب [illegible]

سینٹ پیٹرز کالج آگرہ کا ایک نادر گروپ - ۱۹۱۶ء
دائیں سے بائیں :- جوشؔ ، ابرار حسن خاں اثر اور رئیس احمد خاں رئیس

جوش - افراد خاندان کے ساتھ - حیدرآباد دکن - ۱۹۲۷ء

دائیں سے بائیں :— سعیدہ خاتون   اشرف جہاں بیگم   جوش   سفی   سجاد حیدر   نورالحسن خاں

جوش محمد حبیب اللہ رشدی ، جلالہ راغب

جوش چند دوستوں کے ساتھ — ۱۹۳۵ء کا ایک یادگار گروپ - ۱۹۳۵ء
جوش کے دائیں طرف احسان دانش اور بائیں طرف شوکت تھانوی بیٹھے ہیں — پیچھے دوسرے نمبر پر
مجاز اور ان کے بعد فرید جعفری کھڑے ہیں

مشاعرۂ بھوپال کا تاریخی گروپ (۱۹۳۱)
(دائیں طرف سے)
جگر مرادآبادی ، فانی بدایونی
اور جوش
دست راست محمود علی خان جامعی

آزاد ہند ہوٹل دہلی کا
یادگار اجتماع (۱۴-۹-۵۶ء)
جوش— حفیظ جالندھری
سلام مچھلی شہری ،
بسمل سعیدی ٹونکی
ساحر ہوشیارپوری
اور افضل پشاوری کے ساتھ

* کل ہند مشاعرہ ملکہ میں جوش۔ مجاز، یونس احمر، رؤف اور پروفیسر شاہدی کے ساتھ

* جوش کراچی میں علی احمد حیدر آبادی اور صحافی مدراسی کے ساتھ

* جوش [illegible] میں پھوپروڈا کے ساتھ

گورنمنٹ ہاؤس ڈھاکے کے مشاعرے کی یادگار [illegible]
(دائیں طرف سے) گورنر مغربی پاکستان جنرل اعظم خان ، جوش ،
حسیب انصاری [illegible] سرور بارہ بنکوی ، سید ہاشم رضا
اور [illegible]

جوش کراچی میں چند احباب کے ساتھ
(دائیں طرف سے) اعجازالحق قدوسی ، جمیل جالبی ، جوش ، مبین الحق
صدیقی ، اور مرزا عالمگیر قادر

عبدالحلیم انصاری (آرٹسٹ)

قلمی خاکے

پروفیسر سید احتشام حسین

جوش

ایک تقابلی مطالعہ

(۱)

انسان کے ذہنی ارتقاء اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں جو انفرادی یا اجتماعی قوتیں کام کرتی ہیں، اُن کے شعور پر جو خارجی اور داخلی اثرات اپنا عکس ڈالتے ہیں، اور جو جسمانی اور نفسیاتی عناصر اثر انداز ہوتے ہیں، ان سب کا شمار کرنا ممکن نہیں ہے، کیونکہ ان کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے قدم قدم پر نئی گتھیاں پڑتی جاتی ہیں، اور انسانی عمل اور ردِ عمل اس وجہ سے عامل اور معمول کے مدارج سے اس طرح گذر جاتا ہے کہ اس کے شعور کی گہرائی میں اتر کر اس کے اصلی جذبات کا پتہ لگانا تقریباً محال ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک فرد کو لے کر اس کے پورے ماحول میں اس کا مطالعہ کرنے سے بہت سے صحیح نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اس کے افعال و اقوال، حرکات و سکنات، اثر پذیری اور اثر اندازی وغیرہ میں ایک ایسی انسانی عمومیت پائی جاتی ہے، جسے اس کے دوسرے ابنائے جنس کچھ تو اپنے تجربے کی بنا پر اور کچھ علم کی مدد سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے محرکات کے سوتے ڈھونڈھ اور اس کے خیالات کے ذخیرے تلاش کر سکتے ہیں۔

انسانی زندگی کے مطالعے میں سب سے بڑی دشواری اس لئے پیش آتی ہے کہ انسان کی انفرادیت ایک فرد کی خواہشات اور خیالات کا مظہر ہوتے ہوئے بھی مختلف حقائق کی سرزمین میں بیخ و بن اور نشوونما پاتی ہے۔ وہ مشین نہیں ہے بلکہ زندگی بخش معمولی قوتیں، انتخاب و اجتناب کی بڑی قوتیں رکھتا ہے، ایک ایسی قوت ارادی کا مالک ہوتا ہے جو جبر و اختیار کی کشاکش میں پرورش پا کر کبھی جذبات کے معمولی سے جھٹکے میں پاش پاش ہو جاتی ہے اور کبھی بڑے سے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرتی اور کامیاب ہوتی ہے۔ اس کی فطرت واقعات اور حالات سے اثر لے کر بدلتی رہتی ہے۔ اکثر تو ماد ی حالات اسے بناتے اور بگاڑتے ہیں، لیکن کبھی کبھی صرف خیال و احساس بھی اس کی دنیا بدل دیتے ہیں۔ جوش کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ کرنے میں ان تمام باتوں کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ یہ نہیں بلکہ شاعر اور فن کار ہونے کی وجہ سے ان کے احساس اور انداز نظر میں جو خصوصیتیں عام انسانوں سے مختلف ہیں، جا ہے وہ کیفیت ہو یا ماحول یا کیفیت ہیں۔ ان کو بھی نگاہ سے

اور عمل نہ ہونے دینا چاہئے۔

شخصیت کی تعمیر میں داخلی اور خارجی، شعوری اور غیر شعوری عناصر کی کارفرمائی، جسمانی، نفسیاتی، ذہنی اور مادی محرکات کی اثر انگیزی یقینی بات ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں کسی تناسب کا اندازہ لگانا تقریباً محال ہے۔ تمام چیزیں ایک دوسرے میں اس طرح گتھی ہوئی ہیں کہ ان کی قوت کا الگ الگ پتہ لگانا دشوار ہے۔ انسانی شخصیت کی تعمیر کے لئے کچھ مواد تو پہلے سے موجود ہوتا ہے کچھ وقت اور ماحول فراہم کرتے جاتے ہیں۔ کچھ چیزیں ساتھ چھوڑتی جاتی ہیں۔ کچھ نئی داخل ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ فرد کا شعور تعمیر و تخریب میں شریک ہو جاتا ہے۔ زمانے سے اثر قبول بھی کرتا ہے، اور زمانہ پر اپنے نقش بھی چھوڑتا ہے۔ اگر اس کا ذہن متجسس ہے تو دنیا جہاں تک پہونچ چکی ہے وہ اس کا وارث بن جاتا ہے۔ اپنے علم اور شعور کی مدد سے اپنی قوت انتخاب سے وہ اپنے لئے پسندیدہ راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ جہاں تک اس وقت کی دنیا، اس وقت کے عقائد اور خیالات اس کو آسودگی بخشتے ہیں وہ قانع رہتا ہے اور جہاں سے حالات اس کی خواہشوں اور خوابوں کا ساتھ نہیں دے سکتے وہ خیالی طور پر یا عملاً دنیا کو بدل دینا چاہتا ہے۔ یہیں اس کے شعور، اس کے رجحان اور اس کے فلسفۂ حیات کی پرکھ ہو سکتی ہے۔

بہت سے شعراء روایتی شاعری کرتے ہیں۔ دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں پر چلتے ہیں۔ دوسروں کے دماغ سے سوچتے ہیں، اور ذہنی طور پر اسی نظام زندگی سے وابستہ ہوتے ہیں جنہیں ان کے بیدار مغز اور مفکر پیش رووں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قائم کیا تھا۔ ان پر غور کرنے کے لئے پس منظر، ماحول، فلسفہ تغیر وغیرہ پر اتنا زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جوش کی شاعری رسمی نہیں ہے۔ وہ ان کی زندگی کا آئینہ ہے، ان کی شخصیت کا عکس۔ ان کے شعور کا لفظی جسم ہے۔ ان کے مطالعے کے لئے ان خارجی اور داخلی محرکات کا سراغ لگانا ضروری ہے جو سوچنے والے دماغ پر ضرور اثر ڈالتے ہیں۔

کسی شاعر کا مطالعہ کرتے ہوئے اصل توجہ کا مرکز شاعر کی ذات کو بنانا چاہئے یا اس کی شاعری کو؟ یہ سوال مختلف شکلوں میں ہمیشہ نقادوں کے سامنے رہا ہے۔ پھر شاعری میں بھی کسی نے مواد کو اہمیت دی ہے کسی نے ہیئت اور انداز بیان کو۔ یہاں اس بحث کو اصولی حیثیت سے پیش کرنا ضروری نہیں۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ جوش کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ان تینوں باتوں کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ شاعر اور اس کی شاعری میں جو تعلق ہے اس کا اعتراف خود جوش نے کیا ہے حقیقی شاعر کی پہچان سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:-

> "...... تمام مشہور شعراء کی زندگی، فطرت، سیرت اور عادات و اطوار کا غائر مطالعہ کیا جائے، اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ ان کی ابتدائی زندگی کن مشاغل میں گذری ہے، اس عہد کے اہم واقعات کیا ہیں، نیز ہمعصر اہل وطن، ہمسایوں کی ان کے کردار کے متعلق کیا رائے ہے، اور جب یہ تحقیقات مکمل ہو جائے تو علانیہ اپنا فیصلہ سنا دے کہ فلاں سچا شاعر ہے اور فلاں جھوٹا۔"
>
> اشارات صفحہ ۱۲

بد قسمتی سے ہمارے اکثر شعراء کے حالات اس طرح پردہ میں ہیں کہ ان سے نتائج اخذ کرنا کئی حیثیتوں سے دشوار ہے۔ خود جوش کی زندگی تفصیل سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ لیکن وہ اہم واقعات جو ان کے کردار کی تشکیل اور تعمیر میں نمایاں حصہ

لے چکے ہیں، یا لیتے رہے ہیں، بیان کئے جا سکتے ہیں۔

(۲)

جوش افغانی النسل ہیں۔ خاندان کی نسلی اور قومی خصوصیات آنے والی نسلوں پر ضرور تھوڑا بہت اثر ڈالتی ہیں لیکن اتنا نہیں کہ فرد کا مطالعہ اسی کی روشنی میں مکمل ہو سکے۔ یہ اثر خون کی راہ سے بھی داخل ہوتا ہے، اور احساس کے پردوں کو چیر کر بھی ذہن پر اپنے نقش بناتا ہے۔ اس بات کو بار بار یاد کرنے، دہرانے، اس پر فخر کرنے اور اس کی خصوصیات کو عزیز رکھنے سے صرف فردہی کی نہیں کبھی کبھی قوموں کی نفسیات میں خاموش تغیر پیدا ہوتا ہے۔ ایک اَن جانا احساس دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے جو دوسرے خیالات اور تصورات کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ خاندانی خامیوں اور خوبیوں کا احساس نفس پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے میں شدید ذہنی کشمکش پیش آتی ہے۔ جوش کو اپنے افغانی ہونے کا خیال برابر آتا ہے۔ وہ اپنے آبا و اجداد کا صاحب سیف و قلم ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کی امارت، ثروت، دولت، عیش پرستانہ زندگی، ان کی سخاوت، غربا پروری، شرافت اور شان سے متاثر ہیں۔ جس کی جھلک ان کی سیرت اور شاعری دونوں میں نظر آتی ہے۔

کابل سے ملا ہوا خیبر کا علاقہ ہے وہاں کے ایک مہم جو آفریدی یار بیگ نے اٹھارویں صدی عیسوی میں ہندوستان کا رخ کیا۔ صفدر جنگ نے اپنی فوج میں ایک معزز جگہ دی یار بیگ نے تلوار کی دھار پر چل کر عزت اور ثروت حاصل کی۔ ان کے پوتے فقیر محمد خاں گویا مختلف جگہوں پر فوجی خدمتیں انجام دینے کے بعد غازی الدین حیدر تاجدار اودھ کے یہاں ملازم ہو گئے۔ ان کے خاندان نے کنول ہار ملیح آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ گویا تلوار اور قلم دونوں کے دھنی تھے۔ بہت جلد حکومت اودھ کے دست و بازو بن گئے۔ اودھ کی حکومت نے اپنے حدود کے اندر علم و ادب کی جو خدمت کی ہے اس میں گویا کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ خود ناسخ کے شاگرد تھے۔ لیکن دوسرے شعراء سے بھی محبت اور عزت سے پیش آتے تھے۔ عربی، فارسی کا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ عربی عربوں کی طرح بولتے تھے۔ اس عہد کی شاعری کی جو خصوصیات ہیں وہ سب ان کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ گویا کو اس لحاظ سے بھی تاریخ ادب میں اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے انوار سہیلی کا ایک ملخص ترجمہ اردو نثر میں 'بستانِ حکمت' کے نام سے پیش کیا ہے۔ مجموعۂ کلام 'دیوانِ گویا' کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہ دونوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

فقیر محمد خاں گویا کے بیٹے محمد احمد خاں احمد (جوش کے دادا) بھی شاعر تھے۔ ان کا ضخیم دیوان 'مخزن آلکلام' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ بہت سی خصوصیات میں وہ بھی گویا سے ملتے جلتے تھے۔ لیکن نظام معاشرت بدل جانے اور اودھ کی سلطنت کی جگہ انگریزی حکومت کے قائم ہو جانے کی وجہ سے ان کی زندگی کا رخ بدلا ہوا تھا۔ ان کا جنسی جذبہ بہت قوی تھا اس لئے اہل و عیال کی تعداد بھی کافی تھی۔ جوش کے بڑے بھائی شفیع احمد خاں ولی نے لکھا ہے کہ ان کے انتقال کے وقت ان کی اولاد میں چھتیس نفوس موجود تھے۔ اور جوش نے 'روحِ ادب' (جدید ایڈیشن) کے دیباچے میں اپنے والد کا قول نقل کرتے ہوئے ان کی اولاد کی مجموعی تعداد سو سے اوپر بتائی ہے۔ صنفِ نفسیات پر غور کرنے والے یہی کہیں گے کہ جسمانی طاقت کے اظہار کا موقع میدانِ جنگ میں نہ ملا، اس لئے انہوں نے شہوانی خواہشات کا بھیس بدل لیا۔ جوش بھی

اپنے قوی میلان جنس میں اپنے بزرگوں کے خون کی گرمی دیکھتے ہیں۔ اور کسی نہ کسی شکل میں اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔

جوش کے والد بشیر احمد خاں بشیر بھی جن کا انتقال سنہ ۱۹۰۶ء میں ہوا شعر و ادب کے دلدادہ تھے انہوں نے بہت کم اشعار کہے ہیں، لیکن ان میں گویا اور احمد کے کلام سے زیادہ شگفتگی، بے ساختگی، کیف اور اثر پائے جاتے ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے شفیع احمد خاں ولی نے ان کے مختصر کلام کو ترتیب دے کر سنہ ۱۹۱۲ء میں کلام بشیر کے نام سے شائع کیا مجموعے کے شروع میں جو حالات لکھے ہیں۔ ان سے بشیر احمد خاں کی علم دوستی، سخاوت، مہمان نوازی، بے نفسی، وسیع النظری، مروت اور خوش اخلاقی کا پتہ چلتا ہے۔ زندگی اور معاشرت کی یہ وہ قدریں ہیں جو اس وقت اور کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں اس وقت بھی شرافت اور انسانیت کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔ اور جن کا نام لے کر متوسط طبقہ اپنے لئے ایک نئی دنیا کی تخلیق کر لیتا ہے۔ ایک روایت بنا لیتا ہے۔ جس سے آنے والی نسلوں کا ذہن بدلنے کی صورت میں بھی بہت کچھ متاثر ہوتا رہتا ہے۔

یہ تھا ایک خوش حال، ذی عزت، علم دوست خاندان جس میں جوش سنہ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ گھر میں مال و دولت نوکر چاکر عشرت و فراغت، کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ بشیر احمد خاں اپنے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس لئے ناز و نعم میں پلے۔ بچپن ہی سے زیادہ وقت لکھنؤ میں بسر ہوتا تھا۔ جہاں دوست احباب اکٹھا ہو کر جوش کو ان کی ریاست اور امارت کا خیال ہر وقت دلایا کرتے تھے۔ نام شبیر حسن خاں رکھا گیا تھا، اور ابتداءً تخلص بھی شبیر ہی تھا۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد شبیر سے جوش ہو گئے[1] عربی فارسی گھر پر پڑھی۔ فارسی سے طبیعت کو خاص لگاؤ تھا۔ پھر مرزا محمد ہادی رسوا (صاحب امراؤ جان ادا) کی صحبت نے اس میں اور جلا کر دی۔ مرزا رسوا جوش کے پرائیویٹ ٹیوٹر تھے جن سے متاثر ہونے کا اعتراف جوش خود کرتے ہیں۔

جہاں تک باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا تعلق ہے جوش نے اس کی طرف تمام توجہ نہ کی۔ سیتاپور، لکھنؤ، علی گڑھ اور آگرہ کے مختلف اسکولوں اور کالجوں میں داخل ہوتے رہے۔ لیکن کہیں قدم نہ جما سکے۔ اس کی وجہیں زیادہ تر جوش کے انفرادی رجحان طبیعت اور ماحول میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ لکھنؤ کی تباہ حالی نے امراء و رؤسا کے ذہنوں پر ایک خاص قسم کا مجہول اثر ڈالا تھا۔ ان کے دماغ میں امارت اور ریاست، شرافت خاندانی اور آبا و اجداد کی عظمت کا احساس اس قدر رچ اور بس گیا تھا کہ وہ نئے حالات میں اپنی شخصیت کو ترقی دینے یا نمایاں کرنے کے ذرائع زیادہ نہ سوچ سکتے تھے وہ بزرگوں کی عظمت سے اپنے تعلق کو کافی سمجھتے تھے، اور اپنی ذات کی نمائش کے لئے ایسے مشغلے تلاش کرتے تھے جن تک عوام کی رسائی نہ تھی۔

۱ھ تخلص کی تبدیلی کے سلسلہ میں ایک دفعہ جوش نے مجھے بتایا کہ ابتدائے شباب بلکہ نہیں بچپن کے ختم ہونے کا زمانہ تھا شہر میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی تھی۔ چند احباب کے ساتھ رات گئے کھیل دیکھ کر سب واپس آ رہے تھے۔ کچھ اس ایکٹرس کا تذکرہ تھا جس کے حسن سے سب متاثر تھے۔ کچھ شعر و شاعری کا چرچا تھا کہ دوران گفتگو میں کسی نے کہا، ہم لوگ بڑے جوش میں ہیں بس اس وقت بس نہ جانے کیسے اسی وقت یہ طے ہو گیا کہ میرا تخلص اب شبیر کے بجائے جوش ہو جانا چاہئے اسی دن سے یہی تخلص ہو گیا۔

جہاں تک تعلیم کے ذریعے شہرت اور عزت حاصل کرنے کا سوال ہے، اس میں نچلے متوسط طبقے کے لوگ اور عوام سب ہی آگے بڑھتے دکھائی دیتے تھے۔ امرا شاذ و نادر ہی اس کی طرف متوجہ تھے۔ یہ تو یہاں کی عام فضا تھی جو غیر شعوری طور پر رئیسوں اور رئیس زادوں پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ لیکن اگر ہم جوش کے افتاد مزاج اور ذہنی ساخت کو کریدیں تو اور اسباب بھی ملیں گے۔ ان اسباب کا تجزیہ جستہ جستہ آئے گا۔

مختصر یہ ہے کہ جوش کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ سینیر کیمبرج کا امتحان دینے کے لئے سینٹ پیٹرس کالج آگرہ میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن والد کے انتقال نے یہ مہم بھی سر نہ ہونے دی۔ رسمی تعلیم کا یہ حال تھا۔ لیکن جہاں تک علم حاصل کرنے کا تعلق ہے، جوش نے مطالعۂ کتب کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ بلکہ اس سے بھی بڑی بات یہ کی کہ بالکل ابتدا ہی سے زندگی کے رموز اور فطرت کے اسرار سمجھنے کی کوشش شروع کر دی۔ انسانی فکر سب سے بڑی معلم اور مشاہدہ سب سے بڑی تعلیم ہے۔ کبھی کبھی رسمی اور درسی تعلیم قوت مشاہدہ کی باڑھ بالکل کند کر دیتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس سے ذہن میں ہمواری، گیرائی اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ جوش نے بھی بچپن میں اپنی فکر اور خیال کو اپنا رہنما بنایا، اور خود اپنا راستہ ٹٹول ٹٹول کر چلنے لگے۔ انہیں ابتدائی کوششوں میں اس جوش کا سراغ بھی ملتا ہے جو اب بھی مشاہدہ اور فکر کو اپنا رہنما قرار دیتا ہے۔

جوش نے نو سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ یہ کوئی بڑی تعجب خیز بات نہیں۔ جوش کے گھر پر برابر مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ لکھنؤ کے بڑے بڑے شعرا جمع رہتے تھے۔ مہمان نوازی اور خوش اخلاقی کا امتحان ہوتا تھا۔ شاعرانہ چشمکیں ہوتی تھیں دلی مباحثے ہوتے تھے اور جوش کا متجسس ذہن ان سے غذا پاتا تھا۔ جوش بہت سی دلچسپیوں کے آدمی آج بھی نہیں ہیں۔ یہی حال بچپن میں بھی تھا۔ تفکر پسند ذہن کی یہ خصوصیت بچپن ہی میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ اور اکثر و بیشتر شدید ذہنی انقلابات کے باوجود باقی رہتی ہے۔ جوش کے پسندیدہ مشاغل کی فہرست نہ اس وقت لمبی چوڑی تھی نہ آج ہے۔ کتابوں کا مطالعہ، مناظر قطرت کا مطالعہ، نفس انسانی کا مطالعہ، دوستوں، شاعروں اور ادیبوں کی صحبتیں، شاعری، بس یہ تھے جوش کے مشاغل۔ عمر کے تقاضوں اور زندگی کی ضروریات کی وجہ سے ان میں ایسے میلانات کا اضافہ بھی ہوتا رہا ہے جن کا ذکر مناسب مواقع پر آئے گا۔ انہوں نے خود اسے بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے —

> "میں نے نو برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا" "شعر کہنا شروع کر دیا تھا"
> یہ بات میں نے خلاف واقعہ اور غلط لکھی۔ کیوں کہ یہ کسی انسان کی مجال نہیں کہ وہ خود سے شعر کہے۔ شعر اصل میں کہا نہیں جاتا، وہ تو اپنے کو کہلواتا ہے — اس لئے صحیح طرز بیان اختیار کر کے مجھے یہ لکھنا چاہئے کہ نو برس کی عمر سے شعر نے اپنے کو مجھ سے کہلوانا شروع کر دیا تھا۔ جب میرے دوسرے ہم سن بچے پتنگ اڑاتے اور گولیاں کھیلتے تھے اس وقت کسی علیحدہ گوشے میں شعر مجھ سے اپنے کو کہلوایا کرتا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ پتنگ اڑانے اور گولیاں وغیرہ کھیلنے کے فن سے میں اب تک ناواقف ہوں"
>
> (روح ادب صفحہ ۹)

یہ بحث تو بعد میں آئے گی کہ شعر اپنے کو کہلواتا ہے یا انسان شعر کہتا ہے۔ یہاں اتنی بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ جوش بچپن میں عام بچوں سے مختلف تھے۔ اور یہ نتیجہ تھا ان کے فکری اور شاعرانہ میلان کا جس کو سنجیدگی سے زیادہ لگاؤ ہوتا ہے —

ابتدائے شباب میں یہ سنجیدگی محبت کے تجربے سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جوش تعلیم نہ حاصل کرنے کا اصل سبب عشق و محبت ہی کو قرار دیتے ہیں۔

میں لڑکپن میں جسے عشق کی عادت رہا
علم حاصل ہوا سی فکر میں دن رات رہا
بھائی سے کام تھا مجھ کو نہ کسی ہم سن سے
لڑکے کہتے تھے کبھی ہم نہیں کھیلے اِن سے
اور اب میں وہی کم بخت کہ پڑھتا ہی نہیں
سامنے علم کا میدان ہے بڑھتا ہی نہیں
(روح ادب صفحہ ۴۰)

وہ اس لئے نہیں پڑھ سکے کہ آنکھوں میں کسی کی آنکھیں سما گئی ہیں۔ ایسی حالت میں۔

جوشش تعلیم کجا، عشق جگر دوز کجا!
حفل علم کجا، جلوہ گہِ سوز کجا!

اسباب جو بھی ہوں یہ حقیقت ہے کہ جوش اپنے رسمی مفہوم میں تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے۔ تجزیہ نفس سے دلچسپی لینے والے اس سلسلے میں موشگافیاں کریں گے، اور غالباً یہ کہیں گے کہ چونکہ جوش نے باقاعدہ تعلیم مکمل نہ کی، اس لئے اس احساس کمتری کو مٹانے کے لئے اپنی پوری توجہ شاعری کے فن میں کمال حاصل کرنے پر لگا دی۔ احساس کمتری کا یہ تصور اپنی جگہ پر خود بحث کا محتاج ہے کیوں کہ یہ ساری انسانی جدوجہد کو، ساری کوششوں کو ایک غیر شعوری احساس کا نتیجہ قرار دے دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سماجی زندگی کی ایک منطق ہوتی ہے اسی طرح خاندانی زندگی کی بھی۔ جس کی گرفت سے نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر اگر اور اسباب بھی مہیا ہو جائیں تو فرد کے افکار و اعمال کو سمجھنا آسان نہیں رہ جاتا۔ اس لئے یہاں اُن تمام پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت نہیں کہ انہوں نے باقاعدہ تعلیم کیوں نہیں حاصل کی۔ جوش کی سوانح عمری میں ان باتوں پر مفصل گفتگو ہو سکتی ہے یہاں تو ان کی زندگی کے انہیں پہلوؤں کو لینا ہے جن سے ان کے ذہنی ارتقا اور ان کی شاعری کے سمجھنے میں مدد ملے۔

جوش نے اپنے بچپن کے واقعات میں ایک ایسے رجحان کا ذکر کیا ہے جس سے ان کے کردار اور شاعری پر کافی تیز روشنی پڑ سکتی ہے کہ۔

"شاعری سے جب فرصت پاتا تھا تو یہ میرا محبوب ترین مشغلہ تھا کہ ایک اونچی سی میز پر بیٹھ کر اپنے ہم عمر بچوں کو اپنے جی میں آتا تھا، اناپ شناپ درس دیا کرتا تھا۔ درس دیتے وقت میری میز پر ایک پتلا سا بید رکھا رہتا تھا۔ اور جو بچہ توجہ کے ساتھ میرا درس نہیں سنتا تھا، اُسے میں بید سے اس بری طرح مارتا تھا کہ بے چارہ چیخیں مار مار کر رونے لگتا تھا۔ اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ میں کسی کند ذہن بچے کے کاندھوں پر سوار ہو کر اسے اس طرح بید مار مار کر دوڑاتا کہ وہ غریب بے دم ہو کر گرنے لگتا۔ اور میرے مزاج کی یہ وہی بنیاد تھی ہے جو میری سیاسی خطیبانہ شاعری میں تلخ و ترش بن کر آج

بھی نمودار ہوتی رہتی ہے، اور میری شاعری کا نقاد میرے سب سے بچے کی ندرستی پر چیخ چیخ اٹھتا ہے"
(روح ادب صفحہ ۹)

صرف اتنی ہی بات نہیں ہے۔ یہ بچپن میں درس دینے کا مشغلہ بڑی عمر میں پیمبری اور رہبری کی خواہش کا غماز ہے۔ بچپن میں جو بچے درس کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے وہ سزا پاتے تھے۔ آج جو لوگ جوش کی شاعری پر دھیان نہیں دیتے انہیں جوش اپنے مخصوص لمحات میں بہرا، گونگا، اندھا اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے ماریں ہیں بھی گہرے نفسیاتی رمز ہیں جن میں سے بعض طنز، صاف گوئی، نازک مزاجی اور کسی حد تک آمریت، ایذا دہی میں لذت اندوزی کے جذبات کی شکل میں آج بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ تہذیبی تصورات اور فکری رجحان نے ان کی صورتیں بدل دی ہیں۔ مگر نفسیاتی مطالعہ کی مدد سے انہیں پہچان لینا کچھ ایسا مشکل نہیں ہے۔ سماجی برتری کا احساس مختلف اوقات میں مختلف قسم کے بھیس بدلتا ہے اور جوش کے یہاں ان کی فراوانی ہے۔

(۴)

جوش کی شاعری کی ابتداء غزلوں سے ہوئی۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں گو نظموں کو اچھا خاصا فروغ حاصل ہو چکا تھا لیکن جوش نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں وہاں غزل گوئی ہی کو اہمیت حاصل تھی۔ لکھنؤ میں غزل گوئی کئی ادوار سے گذری تھی۔ بیسویں صدی کی ابتداء میں کبھی سطحی اور کبھی گہری جذباتیت اور وقت پسندی کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ جوش کی ابتدائی غزلوں میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔

شروع میں جوش کے والد نے انہیں شاعری سے روکا، سمجھایا، بجھایا[2]، ناخوش ہوئے۔ لیکن شاعری جوش کے لئے مشغلہ یا وقت گذاری نہ تھی، بلکہ شخصیت کا اظہار اور روح کی آواز تھی۔ اس لئے کمی ہونے کے بجائے اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جب باپ نے یہ دیکھا کہ اب اس آواز کو دبانا محال ہے تو نہ صرف شاعری کی اجازت دے دی بلکہ لکھنؤ کے مشہور شاعر مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کے سپرد کر دیا۔

عزیز صرف فن شاعری اور زبان کے ماہر نہ تھے بلکہ اچھے جذبات نگار غزل گو تھے۔ اس تعلق سے جوش کو زبان و عروض

---

[1] مثلاً:

صد حیف کہ قدرت سے ملا ہے یہ حشم
بہروں کو سنائے جا ترانے اپنا!
اندھوں سے جب پڑا ہے زمانے میں سابقہ
اے جوش آپ یوسف کنعاں ہوئے تو کیا

—— اور بہت سی رباعیاں اور نظمیں۔

[2] جوش نے ایک دفعہ بتایا کہ " والد نے جاسوس مقرر کر دیئے کہ میری شاعری کی خبریں انہیں پہونچائی جائیں۔ چنانچہ داروغہ حامد علی (غالباً یہی نام تھا) کے سپرد یہ کام ہوا۔ اور اس خبر رسانی کا صلہ فی خبر پانچ روپے مقرر ہوا۔ داروغہ حامد علی نے اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے جھوٹی سچی خبریں پہونچانا شروع کر دیں۔ جہاں مجھے تنہا بیٹھا ہوا دیکھتے، فوراً والد کو جا کر اطلاع دیتے کہ شبیر حسن خاں شعر کہہ رہے ہیں، انہیں پانچ روپے مل جاتے اور مجھے تنبیہہ"

پروفیسر سید احتشام حسین

کے نکات معلوم ہوئے ہوں تو معلوم ہوئے ہوں، فکر و خیال کا کوئی مخصوص رخ ہاتھ نہ آیا۔ مجموعی طور پر ماحول اور زندگی کا دائرہ محدود ہی تھا۔ بقول جوش یہ رشتۂ تلمذ غالباً سنہ ۱۳-۱۹۱۲ء میں قائم ہوا۔ اور چار پانچ سال قائم رہ کر منقطع ہو گیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جوش نئی زندگی کے اثرات آہستہ آہستہ قبول کر رہے تھے۔ اور عزیز اپنی ذہانت اور جودتِ طبع کے باوجود بدلتی ہوئی دنیا کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں ملیح آباد میں سلیم پانی پتی کا قیام تھا، وہ حالی کے پیرو اور جدید ادب کے معماروں میں سے تھے انہوں نے جوش کو غزل گوئی کی تنگنائے سے نکل کر نظم کے وسیع سمندر میں کود پڑنے کی تلقین کی۔ جوش نے ایک خط میں مجھے لکھا ہے کہ:

> "سلیم صاحب نے غالباً سنہ ۱۹۱۴ء یا اس سے کچھ پیشتر غزل گوئی پر فلک شگاف قہقہوں کے ساتھ مجھے نظم گوئی پر آمادہ کیا۔ اور انہیں کی فرمائش سے، چونکہ وہ محرم کا زمانہ تھا، میں نے سب سے پہلی نظم "ہلالِ محرم" کے نام سے لکھی تھی جو تلف ہو چکی ہے۔"

اس وقت تک جوش کے مطالعے میں بعض فارسی کے اساتذہ مثلاً خیام، عرفی، نظیری، سعدی، اور حافظ تھے۔ اور اردو نظم و نثر میں داغ۔ انیس، سرشار، اور شرر کا جادو کام کر رہا تھا۔ اور یہ جوش ہی نہ تھے جو ان اساتذہ سے متاثر تھے، بلکہ اس عہد کے تمام پڑھے لکھے لوگ ان ادیبوں اور شاعروں کی قدر کرتے تھے۔ ابھی تک نہ تو جوش کا مزاج معین تھا نہ طرزِ فکر، لیکن طبیعت کا زور ایک طوفانی سیال مادے کی طرح آگے کی طرف ہی بہتا چلا جا رہا تھا۔ اور تفکر پسند مزاج کا ہیجان کسی ایک مقام پہ ٹھہرنے نہ دیتا تھا۔ زندگی کے تجربے محدود تھے۔ نگاہ کی وسعت محدود تھی، پرواز کی طاقت محدود تھی، بس تصورات کی جولانیاں مہمیز کرتی رہتی تھیں۔ اور وہ کانٹا دل میں کھٹکتا رہتا تھا جو ہر ذہین انسان کے دل میں کھٹکا کرتا ہے خلش کے دور کرنے پر اکسا تا رہتا ہے۔

ایک طرف خاندانی خصوصیات کا احساس دوسری طرف فکر کے تقاضے، ان دونوں نے مل کر وہ کشمکش پیدا کر دی جس سے جوش پوری طرح کبھی باہر نہ نکل سکے۔

جب کہ مدت سے یہی پیشۂ آبا ہے تو ہم
صاحبِ سیف و قلم ہوں تو کوئی دور نہیں

شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے
یہ مرا فنِ خاندانی ہے

بڑی نمود سے دنیا میں وہ ابھرتا ہے
جو کارخانۂ قدرت میں فکر کرتا ہے!

اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے جوش لکھتے ہیں کہ

> "مادی حیثیت سے وہ میری انتہائی فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ گھر میں دولت پانی کی طرح بہتی پھرتی تھی، اور اس کے دوش بدوش اقتدار و حکومت کا طنطنہ بھی

شامل حال تھا۔ زندگی اور زندگی کی تلخیوں سے قطعی ناواقفیت اور دردمندانسانیت
کے مشاہدے، نیز حیات کے تلخ تجربات سے کلیتاً بیگانگی تھی۔ البتہ ان تمام
فارغ البالیوں کے باوجود مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کوئی شے رہ رہ کر میرے دل
میں چبھا کرتی تھی۔ وہ "کوئی شے" تھی کیا؟ مجھے اس کا مطلق کوئی علم نہیں تھا'
اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے حسین مناظر سے خوشی اور حسن انسانی سے دکھ محسوس ہوا
کرتا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ بات میرے دائرۂ علم سے خارج تھی۔
(روح ادب صفحہ ۱۱)

جب دل ہر سوال کا جواب مانگے، جب چیزوں کی حقیقت جان لینے کی پیاس بے چین کرے۔ اس وقت اگر خارجی دنیا کے حقائق، اس کی کش مکش، اور اس کی پیچیدگیاں، نظام حیات کی سماجی گتھیاں اور معاشی عدم توازن نگاہ کے سامنے نہ ہوں تو انسان داخلی کیفیتوں میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ وہ خیال کی مدد سے حیات و کائنات کے راز سمجھ لینے کا آرزومند ہوتا ہے۔ اور ذہنی تسلی کے لئے کبھی واہمہ کے اور کبھی روایتی حقائق کے بت تراش کر انہیں کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ بڑی بڑی باتوں کو چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھتا اور انہیں کی نوک و پلک درست کرکے ان سے اپنے ذہن کو آسودہ کرنے کی کوشش کرتا ہے' کبھی وہ جانی پہچانی چیزوں میں ذہنی اطمینان کے پہلو تلاش کرتا ہے اور کبھی خیالی دنیا تعمیر کر لیتا ہے۔ جو وقتی تسکین بخشتی ہے۔ چنانچہ جوش نے بھی اپنی فکر کی باگ مذہب کی طرف موڑ دی۔ جوش کے والد بشیر احمد خاں مرحوم کو خود مذہبی ادب اور مذہبی تاریخ سے گہری دلچسپی تھی، اس لئے جوش کے اس رجحان کے لئے ایک سے زیادہ اسباب موجود تھے۔ جوش خود اس کیفیت کو کسی قدر وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ اور چونکہ غور و فکر کے ذریعے تغیر پسندی کا یہ جذبہ داخلیت کے حصار سے انہیں باہر کھینچ لایا' اس لئے اس کا مطالعہ جوش کے مطالعے کے لئے ضروری ہے۔ لکھتے ہیں:۔

• نیز اس زمانے میں یاد حق بخیر' ایک کافی مدت تک میں نماز کا بھی نہایت ہی سختی کے ساتھ پابند ہو گیا تھا۔ نماز کے وقت خوشبوئیں جلاتا اور کمرہ بند کر لیتا تھا' اور گھنٹوں رکوع و سجود میں کھویا ہوا رہتا تھا۔ اس دور میں میں نے داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ چارپائی پر لیٹنا اور گوشت کھانا ترک کر دیا تھا۔ ایک مشہور خانقاہ کے سجادہ نشین کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی تھی۔ اور وہ چیز جسے صوفیائے کرام "تجلیات" کہتے ہیں، میرے قلب کو حاصل ہو گئی تھی۔ ذرا ذرا سی بات میں میرے آنسو نکل آتے تھے، اور بالخصوص گریۂ نیم شبی اور آہ سحری کے وقت تو ایسا محسوس ہوتا تھا۔ گویا میرا دل بہہ رہا اور میرا تمام وجود فضائے نیلگوں میں اڑ رہا ہے ....

......

• لیکن ان تمام باتوں کے باوجود' دہشت و اضطراب کے ساتھ کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوتا تھا جیسے میرے دماغ کے اندر کوئی خطرناک کمانی کھل رہی ہے، جو آخر کار مجھ سے میری اس دنیائے لطافت کو چھین لے گی۔ چنانچہ وقت گذرتا گیا'

کمائی کھلتی چلی گئی، اور کچھ مدت کے بعد مجھ میں ایک قسم کا ہلکا باغیانہ میلان پیدا ہو گیا اور ترقی کرنے لگا۔ اور آخر کار نوبت یہ پہونچی کہ میری نمازیں ترک ہو گئیں۔ داڑھی منڈ گئی، گریۂ نیم شبی اور آہ سحری کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اور اب میں اس منزل میں آ گیا جہاں ہر قدیم اعتقاد اور ہر پارینہ روایت پر اعتراض کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور اعتراضات بھی تمسخر انگیز و اہانت آمیز۔

جب میرے خیالات و اقوال کا کارواں اس راستے پر آہستہ آہستہ گامزن ہونے لگا تو میرے مرحوم باپ کو سخت اندیشہ ہوا کہ میں گمراہ ہو جاؤں گا۔ انہوں نے مجھے بڑی نرمی اور احتیاط کے ساتھ سمجھایا، اور ایک مدت تک سمجھانے سے تنگ آ کر آخر دھمکانا شروع کر دیا۔ مگر مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور آبائی عقائد و روایات سے میری بغاوت بڑھتی ہی چلی گئی۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ میرے باپ نے وصیت نامہ تحریر فرما کر میرے پاس بھیج دیا کہ اگر اب بھی میں اپنی "ضد" پر قائم رہوں گا تو وہ اس وصیت نامے کو جس میں انہوں نے مجھے جائداد سے محروم کر کے، میرے نام صرف سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر فرمایا تھا، جج کے آہنی صندوق میں داخل کر کے میرے مستقبل کو زندانِ محرومی میں ہمیشہ کے واسطے مقفل فرما دیں گے۔

لیکن مجھ پر اس کا بھی مطلق اثر نہیں ہوا، اور وصیت نامہ، اس کے دوسرے ہی دن لکھنؤ کے ڈسٹرکٹ جج کے صندوق میں بند کر دیا گیا۔ لیکن چھ ماہ کے بعد جس وقت کہ میں اپنے کمرے میں دوپہر کے وقت ایک عجیب خواب دیکھ رہا تھا ماماؤں نے مجھے جگایا اور کہا "میاں بلا رہے ہیں"۔ چنانچہ میں اپنے باپ کے پاس پہونچا، سر جھکائے ہوئے اور ادب کے ساتھ۔ میرے شفیق باپ نے مجھ سے کہا "شبیر!" اور میں نے آنکھیں اٹھائیں تو دیکھا کہ میرے باپ کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہیں "یہ دیکھو دوسرا وصیت نامہ، میں نے جائداد میں تمہارا حصہ تمہارے دونوں بھائیوں کے برابر کر دیا ہے" میرے باپ نے بھرّائی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔ مجھ پر باپ کی شفقت اور اس وقت کی حالت کا یہ اثر پڑا کہ میری ہچکیاں بندھ گئیں کہ اتنے میں میرے باپ کی آواز پھر گونجی "شبیر! اس دولت اور جائداد کی خاطر لوگ ماں باپ اور بھائی بہن تک کو مار ڈالتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایمان بھی گنوا دیتے ہیں مگر تم نے اس دولت اور جائداد کی اپنے اصول کے سامنے ذرہ برابر بھی پروا نہیں کی۔ مجھے تمہاری یہ استواری و استقامت بہت پسند آئی۔ اگر تمہارا سا آدمی مجوسی بھی ہو جائے تو بھی اس کی عزت کرنا چاہئے۔

(روحِ ادب صفحہ ۱۲ - ۱۱)

یہ طویل اقتباس ضروری تھا۔ کیوں کہ جوش کا فکری اضطراب جس سانچے میں ڈھل رہا تھا اُس کی اس سے واضح تصویر پیش نہیں کی جا سکتی۔ جوش اس زمانے میں دنیا کی رہنمائی اور رہبری کرنے کے بجائے اپنے ہی لئے "تنگ" تلاش کر رہے تھے۔ جس کی مدد سے خیالوں کے طوفان میں گھر جائیں۔ "درس" دینے کا جذبہ دبا ہوا پڑا تھا۔ اپنے لئے راہ ڈھونڈھ رہے تھے چونکہ مادّی کشاکش کی طرف سے فارغ البال تھے، اس لئے داخلی اور وجدانی تصورات کی جانچ پڑتال کر کے یکسوئی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مذہبی ادب کے مطالعہ کے سلسلے میں آبائی عقائد (طریقۂ حنفیہ اہل سنّت) کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن جب تک وہ شکوک رفع نہ ہوں یا اُن کی جگہ کوئی دوسرا عقیدہ پیدا ہو کر آسودگی نہ بخشے اس وقت تک ان کا ذہن کس طرح یکسوئی حاصل کر سکتا تھا!

اس عہد کی ذہنی کش مکش کا مطالعہ کرنے سے جوش کے خلوص اور "باغیانہ میلان" کا پتہ آسانی سے چل جاتا ہے۔ خیالات میں اختلاف ہونے کی وجہ سے استاد سے بغاوت کی۔ غزل کی تنگ دامانی سے الجھ کر غزل گوئی سے بغاوت کی، آبائی عقائد اور پارینہ روایات کے طلسم سے غیر آسودہ ہو کر ان عقائد و روایات سے بغاوت کی — ایسا کرنا درست تھا، یا نہیں تھا۔ اس سے بحث نہیں۔ جو نتائج نکلتے ہیں وہ اہم ہیں۔ اور وہ نتائج ہیں ایک قسم کی متفکرانہ آزاد خیالی، جذباتی آسودگی کی تلاش، نئی باتوں کا خیر مقدم کرنے میں بے جھجک ہونا، بت پرستی سے زیادہ بت شکنی کے جذبے کا نمایاں ہونا —

(۴)

سنہ ۱۹۱۶ء میں جوش کے والد کا انتقال ہو گیا۔ جوش کی زندگی اچانک ایک غیر متوقع موڑ پر آ گئی۔ اُن کی لااُبالی طبیعت اور شاعرانہ افتاد مزاج زمینداری کے خرخشوں سے کسی طرح میل نہ کھا سکتے تھے۔ اعزاء و احباب کی نگاہیں بدل گئیں، نوکروں چاکروں کا انداز وفاداری بدل گیا۔ اور جب جوانی کی پاداش میں شادی ہو گئی تو خانگی زندگی کے جھگڑے بھی سر پر آ پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی حساس طبیعت کو تفکر کے لئے نئی غذا ہاتھ آ گئی۔ گو اب بھی زندگی کی مادی کش مکش کی بھرپور چوٹ نہیں پڑی تھی لیکن گرد و پیش جو تغیر ہو رہا تھا وہ بہت سبق آموز تھا۔ اعزا کے سلوک انسانوں سے دل پھیر رہے تھے۔ بچپن کی تنہائی پسندی میں شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ اور رہبانیت کا جذبہ اس کی جگہ لے رہا تھا۔ کبیر داس اور ٹیگور، حافظ اور خیام مطالعہ میں تھے۔ دنیا بے ثبات معلوم ہو رہی تھی، اور زندگی مادی آلائشوں کو ٹھکرا کر آگے بڑھ جانا چاہتی تھی۔ رہبانیت کا جذبہ شدت احساس میں داخلی عناصر کے ترتیب دینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر انسان خارجی حالات کا مقابلہ نہ کر سکے تو قوتِ مقاومت مفقود ہو جاتی ہے اور انفرادیت روحانیت کا خول اوڑھ کر آسودگی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ روحِ ادب کی پہلی ہی نظم ترانۂ بیگانگی اس کیفیت کی ترجمان ہے۔

مجھ کو ایذا دے، کسی ہستی میں یہ قوت نہیں
دوست یا دشمن، کوئی ہو، اس قدر طاقت نہیں
جز خدا، اب آدمی کی جوش یہ قدرت نہیں
کیوں کہ مجھ کو اہل دنیا سے کوئی حاجت نہیں

دوسرے عالم میں ہوں "دنیا" سے میری جنگ ہے
تاجِ شاہی سے قدم بھی مس کروں تو ننگ ہے

زہر لگتی ہے زمانے کی مجھے آب و ہوا
ظاہری اسباب کو چھوڑے زمانہ ہو گیا
مال و دولت، اقربا، احباب، یار و آشنا
چوٹ کھائی جب سے دل پر میں نے یہ سب تج دیا
شمع وہ پردے میں ہے جس شمع کا پروانہ ہوں
انتہا یہ ہے کہ اپنے سے بھی میں بیگانہ ہوں

لوحِ دل پر نقش تھا جب تک کہ مہمل یہ خیال
دوستوں کو واقعی مجھ سے محبت ہے کمال
اقربا جذبات کو ہونے نہ دیں گے پائمال
خواب میں بھی مجھ کو پہنچے گا نہ ان سے کچھ ملال
ان پہ میرا حق ہے میرا زور ہے مہرے ہیں یہ
ہوں برے لیکن مرے حق میں بہت اچھے ہیں یہ

اس خیالِ خام نے کیا کیا نہ کی مجھ پر جفا
میں سمجھتا تھا جنھیں سر حلقۂ اہلِ صفا
جانتا تھا جن کو میں جانِ کرم روحِ وفا
کہہ نہیں سکتا زباں سے کچھ انہوں نے کیا کیا
کیا بتاؤں سختیاں کیں یا ذرا شفقت نہ کی
مختصر یہ ہے صفائے نفس کی عزت نہ کی

اسی نظم میں یہ مصرعے بھی آتے ہیں۔ ط

"آدمی کی دوستی کا کچھ نہیں ہے اعتبار"

ط "کہتے ہیں جس کو قرابت دشمنی کا نام ہے!"

ع "تا بہ کے یہ رسم الفت، یہ محبت تا کجا؟"

دنیا سے بیزاری اور بے ثباتیٔ عالم کا احساس کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ حساس دل عموماً ٹھوکریں کھا کر بیرونی، ماورائی، اور اَن دیکھی قوتوں کی امداد چاہتا ہے۔ انسانوں سے بھاگ کر فطرت میں پناہ لیتا ہے، اور اس کے بے ضرر پہلوؤں کو سراہتا ہے۔ وقتی طور پر سکون حاصل ہو جاتا ہے، لیکن جیسے ہی حقائق اور واقعات کی دنیا نئے سوالات پیدا کر دیتی ہے احساس پھر کروٹ بدلتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں جوش نے بھی دنیا سے منہ موڑ کر دنیا سے انتقام لینے کا تہیہ کر لیا۔ طے کیا کہ ع "سبزۂ بیگانہ کے مانند رہنا چاہئے" اور جیسے ہی یہ فیصلہ کیا دل کی دنیا بدل گئی۔

سانس لی یہ فیصلہ کرتے ہی اطمینان سے
ختم گویا ہو گئے دنیا کے سارے مرحلے

دفعتاً پیدا ہوئے سینے میں تازہ ولولے
مسکرایا میں زمین و آسماں کو دیکھ کے
آئی بوئے دوستی فطرت کے ساماں سے مجھے
لینے آئی اک مہک صحنِ گلستاں سے مجھے
کھل گیا دروازہ، آنے لگی ٹھنڈی ہوا
سازِ غنچوں نے لئے گانے لگی ٹھنڈی ہوا
دوست کی خوشبو سے تڑپانے لگی ٹھنڈی ہوا
گیسوؤں میں مجھ کو الجھانے لگی ٹھنڈی ہوا
غنچۂ خاطر کہ مرجھایا ہوا تھا کھل گیا
دل مرا نیچر کے اس پیغام بر سے مل گیا
چھوڑ کر انساں کو میں فطرت کا شیدا ہوگیا
خوبیٔ قسمت کہ فوراً ربط پیدا ہوگیا
میرا ہمدم سبزہ زار و کوہ و صحرا ہوگیا
دوست میرا چشمۂ و گلزار و دریا ہوگیا
مجھ کو ملتے ہیں تبسم نے لیا خورشید کے
شامِ غم رخصت ہوئی جلوؤں میں صبحِ عید کے
دوست یہ ایسے ہیں جو دھوکا نہیں دیتے کبھی
جھوٹ سے واقف نہیں ہے ان رفیقوں میں کوئی

اس دور کی ساری شاعری انہیں خیالات سے بھری ہوئی ہے۔ ایک خاص قسم کا غم ہر وقت احاطہ کئے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ خدا سے لو لگی ہے۔ اس کے دل میں اس کے آنے کا انتظار ہے۔ فطرت بہترین مونس معلوم ہوتی ہے اور زندگی کی لذتوں سے بھی اُچاٹ ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء ہی نہیں بلکہ سنہ ۱۹۱۶ء اور سنہ ۱۹۲۰ء کے درمیان جوش نے جو نظمیں لکھیں، ان میں سے بعض کے عنوانات یہ ہیں "گریۂ مسرت" "طوفانِ بے ثباتی" "انتظار کے آخری لمحے" "دنیا میں آگ لگی ہے" "میرا دل بہترین خلوت ہے" "مناسب ہو تو میرے دل ہی میں چلے آؤ" "وہ اس لو یا خوش رہو" "مجھے تیری نعمتوں کی خواہش نہیں" "دنیا" "سبقِ عرفاں" "بارغ لغمے" "فلسفۂ مسرت" یہ ساری نظمیں صوفیانہ اخلاقی عقائد سے مملو ہیں۔ ان سے شاعر کے گداز دل اور پرستاریٔ غم کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی اس وقت کی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ خیالات بالکل رسمی نہیں معلوم ہوتے، گو جذباتی ضرور ہیں۔ مثال کے طور پر کہیں کہیں سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

تا مرگ اعتدال، بتلائے گی وہ، دنیا میں خوشی کا نام نہیں
جس دل پہ ہوس کا سکہ ہے اس دل کے لئے آرام نہیں
اس شے سے تعلق ہی کیسا، جو چیز کہ جانے والی ہے
سامانِ تعیش جمع کئے جا موت بھی آنے والی ہے

بندے جو ذرا بھی عقل ہو تجھ میں تو عالم جہاں میں کر جانا
اللہ اگر توفیق سجھے دے موت سے پہلے مر جانا

عکس آئینہ کے اندر اگر آہی چکا ہے
تو عنقریب دل میں آنا ہی چاہتا ہے

قسم اس درد کی جو ہجر کی راتوں میں اٹھتا ہے
قسم اس کرب کی جب روح کھنچ کر لب پہ آتی ہے
کہ یہ دنیا سراسر خواب اور خواب پریشاں ہے
خوشی آتی نہیں سینے میں جب تک سانس آتی ہے

تیرے انعام کی نہیں خواہش
بلکہ مجھ کو تری ضرورت ہے

کس دوست گم شدہ کو جنگل میں ڈھونڈتا ہے
کس نیند میں ہے بندے! ہر سانس میں خدا ہے

جب لیتا ہے اکثر معرفت کا فلسفہ ہم سے
کہ ہم ڈوبے ہوئے ہیں جوش روحانی مسائل میں

انداز و ادا سے آئے دنیا تو لاکھ سنور کر سامنے آئے
یہ جوش فقیر آمادہ عشق کب دھیان میں کچھ کو لاتا ہے

اس طرح کی شاعری بعض وقت رسمی خیال آرائی سے زیادہ نہیں ہوتی، لیکن ہم نے دیکھا کہ اس مخصوص زمانے میں ایسی صورتیں فراہم ہو گئی تھیں کہ جوش اسی میں پناہ لیں۔ ابھی تک دنیا اور دنیا کے مسائل نے انہیں اس طرف زیادہ متوجہ نہیں کیا تھا، بلکہ وہ خیالی دنیا میں بستے تھے اور صوفی بن جانے کے متمنی تھے۔ صوفیانہ انداز نظر کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک تو دنیا سے کنارہ کشی اور بے تعلقی کے جذبے کا اظہار، دوسرے کائنات اور حیات کے راز جان لینے کی بے چین خواہش کا اظہار۔ جو لوگ عملاً صوفی ہو جاتے ہیں اُن میں دوسرا جذبہ یا تو ختم ہو جاتا ہے یا سمٹ کر اپنی ہی ذات میں سما جاتا ہے۔ جوش گریۂ سحری اور آہ نیم شبی کے باوجود عملاً صوفی نہ بن سکے۔ خود شناسی کی کوشش میں انہوں نے ماحول کو بھی تھوڑا بہت سمجھا۔ حالات ایسے تھے کہ وہ تنہا اپنی ذات کو مرکز بنا کر آسودہ نہیں رہ سکتے تھے۔ خاندانی زندگی میں انتشار تھا، پہلی جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی، جو لوگ اس کے اسباب اور حالات سے پوری واقفیت بھی نہ رکھتے تھے اس کے اثر سے محفوظ نہ تھے۔ دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ کسی نہ کسی شکل میں جنگ کے دیوتا کو خراج دے رہا تھا۔ جوش نے نگاہ اٹھائی تو اپنے علاوہ اور لوگ بھی غمگین نظر آئے۔ کچھ جنگ کی تباہ کاری سے، کچھ قحط اور وبا کی تکالیف سے۔ ان کے شاعرانہ احساس نے غالباً پہلی دفعہ اپنی نظم 'حالاتِ حاضرہ' (یہ زمانۂ جنگ) میں واقعات سے آنکھیں چار کیں، اور محسوس کیا کہ یہ غم اُن کے

ذاتی اور انفرادی غم سے بڑا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہر چیز پر سکوت ہے، ہر شے پہ یاس ہے
غم حکمراں ہے دہر میں، دنیا اداس ہے
کشتی رواں ہے زیست کی دریائے زہر میں
بجلی تڑپ رہی ہے مسرت کی لہر میں
سلطاں بڑھے ہیں دہر میں لشکر لئے ہوئے
اور ان کے ساتھ قحط بھی خنجر لئے ہوئے
اب عدل کے اختیار میں قیمت نہیں رہی
ڈاکہ رہا ہے رسم تجارت نہیں رہی
خنجر سے غم کے رشتۂ آرام کٹ گیا
شعلے سے آشتی کے اندھیرا لپٹ گیا
ہستی کی مملکت میں تباہی کا راج ہے
ہشیار ہو کہ فرق مصیبت پہ تاج ہے
محویت جنوں میں مری یاس مٹ گئی
دل یوں لٹا کہ قوت احساس مٹ گئی

(روح ادب صفحہ ۳۶)

اس نظم میں کسی قسم کی سیاسی سوجھ بوجھ نظر نہیں آتی لیکن ایک دردمند دل کی دھڑکنیں ضرور سنائی دیتی ہیں۔ ابتدائی دَور شاعری میں ایسی نظمیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کی وجہیں کچھ ایسی پیچیدہ نہیں ہیں کہ آسانی سے سمجھ میں نہ آئیں۔ جوشؔ نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس وقت وہ مسائل حیات سے بیگانہ محض تھے۔ اور یہ جو تھوڑا سا بھی زندگی کا تذکرہ آ گیا ہے اس کا سبب وہی تجسس پسند اور مائل تفکر انداز نظر ہے جس کا تجزیہ اوپر کیا گیا ہے۔

(۵)

اب تک جوشؔ کی شاعری کے ایک بہت ہی اہم اور بنیادی محرک کا تذکرہ نہیں آیا ہے اور وہ محبت ہے۔ یہ کچھ اس لئے نہیں کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ اس لئے کہ ان کی ابتدائی شاعری میں اس کے خدوخال بہت واضح نہیں ہیں۔ کم سے کم اُن کے پہلے مجموعہ "روح ادب" میں جو عاشقانہ شاعری ہے اس کا انداز یا تو رسمی ہے یا طفلانہ اور غیر جنسی۔ جوشؔ لکھتے ہیں کہ "یہی وہ زمانہ تھا کہ محبت کی تیز دھار میری رگ دل کو چھو کر رنگین ہو چکی تھی۔" لیکن اس وقت محبت کے متعلق جوشؔ کے خیالات قدیم صوفیانہ اور اخلاقی تسلیمات سے متاثر تھے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں کہ

"میں محبت کو جنسیات سے برتر ایک مقدس آسمانی چیز سمجھتا اور محبت کی تلخ شیرینیوں میں گم ہو جانے کو حیات انسانی کا سب سے بڑا کارنامہ خیال کرتا تھا۔" (روح ادب صفحہ ۱۱)

محبت کا یہ تصور ان کی غزلوں میں جاری و ساری ہے۔ اس میں جوانی کا اضطراب کم بچپن کی معصومیت زیادہ ہے۔ اُن کی نظم "حقیقتِ دل" (روحِ ادب صفحہ ۴۰) میں محبت کا سادہ اور پرخلوص اعتراف ملتا ہے۔ غزلوں کے اشعار میں کہیں کہیں سچی محبت بجلی کی طرح چمک اٹھتی ہے۔ اور جوانی کے رومان کی پرخلوص مہک دکھاتی ہے جس میں ایک نیازمند نہیں۔ نازبرداری کے متمنی عاشق کی تصویر نظر آتی ہے۔ ابتدائی محبت کی یہ کامیابی جوش کی ساری زندگی پر اثرانداز ہوتی ہے۔ ان کے تصورِ عشق و محبت کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ ان کے یہاں احساسِ حسن، کیفِ نظر اور رسمِ محبت کی کہانی بالکل دوسری طرح کہی گئی ہے۔
ابتدائی محبت کی کامیابی کا تصور کرتے ہوئے جوش لکھتے ہیں:

"جی تو بے ساختہ چاہتا ہے کہ میں اس اولین وارداتِ محبت کو اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنے تمام دیگر واقعاتِ رنگیں کو اس دیباچے میں درج کردوں، اور دنیا کو یہ بتا دوں کہ حسن کی زلفوں کی کمندوں سے کتنی بے پایاں نیازمندیوں کے بعد میرے نازکو گرفتار کرنے کی سعادت حاصل کی، لیکن ڈرتا ہوں — بیان کرنے سے ڈرتا ہوں — اپنی رسوائی سے نہیں۔ اپنے صیادوں کی رسوائی سے ڈرتا ہوں کہ کہیں ان کی جبینِ ناز پر شکنیں نہ پڑ جائیں — بہرحال مجموعی حیثیت سے اس موقع پر میں صرف اس قدر کہہ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں محبت کے معاملے میں ہمیشہ خوش قسمت اور عرفی کے اس شعر کا مصداق رہا۔

آنہا کہ آہوانِ حرم را کنند صید
در آرزوئے ناوکِ صید افگنِ من اند [۵]

اور یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں آنسو، آہیں، اور سینہ کوبیاں بہت ہی کم ہیں، کیوں کہ یہ چیزیں ناکامی اور انفعالیت سے پیدا ہوتی ہیں اور میں ان چیزوں سے شاذ ہی دوچار ہوا ہوں۔"

(روحِ ادب صفحہ ۱۳)

پھر مجھے ایک خط میں لکھا ہے:

"میری بیشتر عاشقانہ نظموں میں اس چیز کی، لوگ کہتے ہیں کمی ہے جسے آہ و فغاں اور سوز و گداز کہا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کی ذمہ داری ہے میرے عشق ہائے کامراں پر۔ میرے اٹھارہ بڑے بڑے عشقوں میں سے سترہ عشق ایسے ہیں جن

---

[۵] عرفی کے اس شعر کا جو مطلب جوش لیتے ہیں، اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ عرفی نے اپنے "ناوکِ صید افگن" کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اپنے "صید افگن" (محبوب) کے ناوک کا ذکر کیا ہے جو بڑے بڑے معشوقوں کے سینوں سے پار ہو جاتا ہے۔ اس طرح تعریف عاشق کی نہیں محبوب کی ہوتی ہے جو محبوبوں کا محبوب ہے۔ جو مفہوم جوش کے پیشِ نظر ہے وہ ان کی خواہش پرستی کا نتیجہ ہے۔

کا محبوبوں کی طرف سے بھرپور جواب دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ عاشق کامیاب ہو کر آنسو
نہیں بہایا کرتا۔ اور جس کا یہ دعویٰ رہا کہ ؎

آنہا کہ آہوانِ حرم را کنند صید
در آرزوئے ناوکِ صید افگنِ من اند

اُس کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ ناکامی کے آنسو بہائے رہیں "ناکامی" کے آنسو
لکھ رہا ہوں، اس کا خیال رہے۔ ورنہ اشک و عشق کا چولی دامن کا ساتھ ہے ..."

ان عشق ہائے کامراں اور ان کے اثرات پر کہیں اور تبصرہ ہوگا۔ کیوں کہ پہلی محبت کے علاوہ اور محبتوں کا تعلق اس دور کی شاعری سے نہیں معلوم ہوتا۔ اور اگر ہے تو بہت ہلکا۔ پہلی محبت ایک اَن چلے مہمان کی طرح، ایک تیز اور تند طوفان کی طرح آئی، چونکہ محبت کی کامیابی یا ناکامی کا کوئی تجربہ نہ تھا، اس لئے ابتدائی شاعری میں اس کا بیان رسمی انداز اختیار کر لیتا ہے۔ وہی آہ کا بے اثر ہونا، وہی نالہ و فریاد، وہی گھٹی گھٹی سانسیں، وہی موت کی خواہش، وہی کوئے قاتل کے پھیرے، وہی غم ہجر کی لذتیں، وہی محبوبہ کے جھوٹے وعدے۔ ــــ ہاں کبھی کبھی اس رسمی انداز بیان میں ذاتی تجربوں کا بیان بھی ملتا ہے۔ لیکن انہیں پوری قوت سے پیش کرنے کی صلاحیت سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد پیدا ہوئی۔ "روح ادب" کی اشاعت تک (یعنی سنہ ۱۹۲۱ء) جوش کی شخصیت اور شاعری میں ایک حد تک مضبوط لگاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ اور وہ اس احساس کے باوجود کہ ؎

اک زمانے سے جدا جذبات کی ترتیب ہے
غیر معمولی عناصر سے مری ترکیب ہے

کسی غیر معمولی قوت کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ قوت کا خزانہ اندر چھپا بیٹھا تھا۔ اور اس معدن کو جوش کھود نہ سکے تھے۔ لیکن جن باتوں کا اظہار "روح ادب" کے سرسری مطالعے سے بھی ہو جاتا ہے اُن پر ایک نگاہ ڈال لینا آئندہ مطالعے کے لئے مفید ہوگا۔ جوش رموز حیات و کائنات کو سمجھنے کی صحیح یا غلط کوشش کر رہے تھے۔ تفکر اور تدبر نے انہیں چھو لیا تھا۔ اور وہ اپنی عقل یا اپنے وجدان کی مدد سے زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنا چاہتے تھے ؎

غیرت دشت سے دل کو کنارے کے لئے
روز اک صورت نئی ہے غور کرنے کے لئے
غور سے دیکھا نظام دہر تو ثابت ہوا
آدمی پیدا ہوا ہے کام کرنے کے لئے

ممنون ہوں طبیعت محنت شعار کا
ڈالا وہ آفتوں میں کہ انساں بنا دیا

ہم جن تصورات میں رہتے ہیں رات دن
کتنوں کو اس جنون نے بیکار کر دیا

دنیا کو سمجھنا، سمجھ کر عبرت حاصل کرنا، روحانی مسرت کی جستجو، اسے پاکر یا اس کا احساس کر کے لوگوں کو اس سے روشناس کرانا، بزرگوں کے اقوال اور مذہبی صحیفوں کے کلمات کی گہرائیوں میں ڈوبنا، ان تمام باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ انہیں تصورات کی بنیاد ہے جن پر نظر رکھ کر اکبر الٰہ آبادی نے جوش کے متعلق یہ جملے لکھے:

> "حقائق عالم اور معرفتِ باری تعالیٰ میں آپ کے اشعار نہایت بلیغ اور دل آویز ہوتے ہیں...... آپ اہلِ دل بھی ہیں اور اہلِ زبان بھی ـــــ میری خوش قسمتی ہوگی کہ میرے بعد آپ ایسے یاد کرنے والے باقی رہیں...... اس وقت آپ کی طبیعت کا جو رنگ ہے، اُس پر ایک ازلی پرتو پڑ رہا ہے۔ جس کے لئے صرف شعر ہی کافی نہیں۔ آپ کو اپنی قدر کرنا چاہئے۔ آپ بہت کچھ ہوسکتے ہیں۔ کوشش کیجئے کہ نماز میں لذت ملے اور علم باطن حاصل کیجئے...... کاش کسی وقت میں، آپ، اور اقبال یکجا ہوتے۔ آپ کی صحبت روحانی غذا ہے۔ عبرت، معرفت، بیخودی، جوش روحانی سے آپ کے اشعار لبریز ہوتے ہیں۔"

جوش سنہ ۱۹۲۰ء میں شانتی نکیتن جا کر ٹیگور سے بھی مل چکے تھے[1]۔ قرآن مجید اور دوسری مذہبی کتابوں کا مطالعہ بھی کر رہے تھے۔ اس لئے اگر ان کی شخصیت اور شاعری میں یہ پہلو نمایاں ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ـــــ یلیح آبادی دنیا اور زمین دار خاندان کی فضا میں اس سے زیادہ کیا ممکن تھا۔ تاہم جوش نے مطالعہ اور مشاہدہ کی مدد سے ایک اور دنیا بنا لی تھی۔ اسی فکری اور فلسفیانہ رجحان کا اندازہ "روحِ ادب" کے نثری ٹکڑوں اور اقوال و کلمات کے مختصر سے مجموعے "مقالاتِ زریں" سے ہوتا ہے جو اسی زمانے میں شائع ہوا تھا۔

اس کے علاوہ حسنِ فطرت اور مناظرِ قدرت سے بھی گہری وابستگی معلوم ہوتی ہے۔ جوش کی فطرت پرستی پر دوسرے ابواب میں نظر ڈالی جائے گی۔ یہاں اس قدر بیان کرنا کافی ہوگا کہ جوش مناظر کے حسن، فطرت کی معصومیت اور رم آزادی سے متاثر تھے۔ فطرت کو زندہ اور متحرک سمجھتے تھے، اور اس کے مطالعے کے ذریعے حقیقت تک پہونچنے کے خواہاں تھے۔ بالکل ابتداء میں صرف حسنِ فطرت کا تذکرہ ملتا ہے۔ آگے بڑھ کر حسنِ انسانی بھی دل پرور کرتا ہے، اور روحانی محبت کا احساس ہوتا ہے جسے وہ غیر جنسی اور مقدس بنائے رکھنا چاہتے تھے۔

جوش کی شاعری کا تاریخی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۲۴ء تک کا زمانہ محبت کی کامیابی کا زمانہ نظر آتا ہے۔ اس زمانے میں روحانی اور عاشقانہ نظموں کی بھرمار ہے۔ محبوب وفا شعار ہے۔ خود راز و نیاز کی سلسلہ جنبانی کرتی ہے محبت کی آگ میں جلتی ہے اور اپنے عاشق سے ملنے کے لئے نمازیں پڑھتی اور دعائیں مانگتی ہے ؎

میری پرستش اور تیری بزمِ ناز
آفریں اے شاہدِ عاشق نواز

---

[1] جوش نے مجھے خط میں لکھا ہے۔ لیکن یہ سنہ ۱۹۲۱ء بھی ہوسکتا ہے۔

میں سراپا خاک اور میرے لئے
سلسلہ جنبانیٔ راز و نیاز
اک مرے دل کی تسلی کے لئے
زلزلے میں آئے اور تمکین ناز
یہ ترا رُخ اور رنگِ خستگی!
یہ ترے لب اور حدیثِ سوز و ساز
تیرا دامن اور وقفِ اشکِ غم
تیرا سینہ اور بارِ حرفِ راز
جس کے قدموں پر ہو خود فطرت کا سر
وہ بڑھے اور مجھ سے ملنے کو نماز

"عاشق نواز" (نقش و نگار صفحہ ۱۳۵)

محبوب کے انتظار کی تکلیف گو شدید ہے، لیکن جب رات بھیگتی ہے تو وہ وعدہ وفا کرتی ہے ـــ

کس سے وعدہ کیا ہے آنے کا
حُسن دیکھو غریب خانے کا
آج گھر، گھر بنا ہے پہلی بار
دل میں ہے خوش سلیقگی بیدار
جمع ساماں ہے عیش و عشرت کا
خوف دل میں فریبِ قسمت کا
چشم بر راہ شوق کے مارے
چاند کے انتظار میں تارے
دفعتاً اک چمک سی دوڑ گئی
بام و در پر جھلک سی دوڑ گئی
چھا گئی بام و در پہ رعنائی
دل میں لی ولولوں نے انگڑائی
تار نظروں کے دم بدم کانپے
لڑکھڑائی زباں، قدم کانپے
نہ رہا سلسلہ وہ آہوں کا
رشتہ سمٹا مری نگاہوں کا
آئے وہ اشک تھم گئے بارے

چاند نکلا سُبک ہوئے تارے

"چاند کے انتظار میں تارے" (نقش و نگار صفحہ ۱۳۷)

"نامہ و پیغام" سے محبت کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ شوق کی آگ بھڑکتی جاتی ہے۔ رُوح گھبرانی ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ ؎

دل کی بستی میں کیوں نہ ہو کہرام
آہ یہ نامہ، ہائے یہ پیغام
کاش اسی وقت مجھ کو موت آجائے
آگ میں پھول کس سے دیکھا جائے
کاش، وہ یوں نہ باوفا ہوتی
بانیٔ ظلم ناروا ہوتی!

"جفائے وفا" (نقش و نگار صفحہ ۱۳۹)

سنہ ۱۹۲۳ء کی کئی نظمیں کامیاب محبت کی "ایذا دہی" اور "لذت کرب و بے قراری" کی آئینہ دار ہیں۔ "پھول" اسے کیا کہتے ہیں" "تجاہلِ عارفانہ" سب میں یہی سا زیج رہے ہیں۔ اور جب کچھ دلوں کے لئے جوش کلکتے چلے جاتے ہیں، تو پہلی مفارقت دونوں دلوں میں کہرام مچا دیتی ہے۔ جوش "بنگال" میں کہتے ہیں ؎

اے اودھ کی نسیم عقدہ کشا
وہ ملیں تو پیام یہ کہنا
یاد لوں کی طرح برستی ہیں
آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں
ایک مدت ہوئی نہیں دیکھا
ہائے تیرا وہ چاند سا مکھڑا
کھائے جاتا ہے کوئی سینے کو
آگ لگ جائے ایسے جینے کو
تنگ ہے سانس آنے جانے سے
اب بُلالے کسی بہانے سے

"پہلی مفارقت" (نقش و نگار صفحہ ۱۴۳)

اور محبوبہ لکھا بھیجتی ہے ؎

مجھ کو تری یاد نے ڈبویا
مرجھائی ہوئی کلی ہوں گویا
بھرتی ہوں پچھلے شب کو آہیں

ہٹتی نہیں چاند سے نگاہیں
چہرے سے عیاں ہے دل کی الجھن
ڈھیلے ہیں کلائیوں کے کنگن
آنا ہو تو آ کہ دل ہے بے تاب
ایسے میں ابھی چمن ہے شاداب
جلد آ کہ فروغِ رنگ و بو ہو
قبل اس کے کہ خونِ آرزو ہو

" زرد کلیاں " (نقش و نگار صفحہ ۱۴۵)

یوُں ہی محبت جوانی سے خراج لیتی رہی۔ کامیاب ہوکر بھی کش مکش میں مبتلا کرتی رہی۔ ہنسانی رلاتی رہی۔ خوشی اور غم کے طوفان اٹھتے رہے۔ محبت کی ناؤ ساحل اور منجدھار کے درمیان ہچکولے کھاتی رہی۔ یہاں تک کہ محبت عقدۂ لاینحل بن گئی، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جوش جس سماجی طبقے سے وابستہ تھے اس کی شریعتِ اخلاق کھلے بندوں محبت کی اجازت نہ دیتی تھی "ملیح آباد کا رئیس ابن رئیس"، جس کی شادی بھی ہو چکی تھی، اپنے قصبے کی گلیوں میں محبت کے گیت کا نا نہیں پھر سکتا تھا لیکن ایک شاعر جس کی شخصیت تھوڑے دنوں کے لئے محبت ہی میں مرکوز ہو گئی ہو چپ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ جوش نے اپنے دل کی آواز شعروں میں بند کی۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں عشق کامراں تھا۔ ان کے ہر قطرۂ خوں سے یہ نغمہ ابل رہا تھا ؎

محبت کامران و شادماں ہے
بھلا دو قصۂ فرہاد و شیریں

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی سال محبوبہ کی شادی ہو گئی، اور آہ چیخ میں بدل گئی۔ "فریبِ قسمت" کا خوف پورا ہو گیا۔ جوش نے لکھا ؎

کدھر ہے اے موت آ کہ غم سے لبوں پہ اب جان آ رہی ہے
وہ شمع جو یادگارِ شب تھی اُسے بھی آندھی بجھا رہی ہے
دہائی حُسنِ خجستہ خُو کی، کہ رسمِ عالم کی فتنہ خیزی
بچھڑے ہوؤں کو ملا رہی ہے ملے ہوؤں کو چھڑا رہی ہے
اُدھر نفیری کی مست لہریں لئے ہوئے ہیں پیامِ شادی
اِدھر نسیمِ سحر کی جنبش ترانۂ غم سنا رہی ہے
اُدھر عروسی لباس زر میں دمک رہا ہے کسی کا مکھڑا
اِدھر کسی کی خوشی کو دنیا سیاہ کفنی پہنا رہی ہے
اِدھر کلیجے میں تھرتھراتا ہے شعلۂ مرگ ناگہانی
اُدھر شبستانِ رنگ و بو میں حیاتِ نو مسکرا رہی ہے
اِدھر عرق ہے مری جبیں پر اُدھر جھلکتی ہے جوشِ افشاں

اِدھر لبوں پر ہیں سرد آہیں، اُدھر صبا گنگنا رہی ہے!

"شادی و مرگ" (نقش و نگار صفحہ ۱۵۴)

محبت کامیاب ہو کر بھی عجیب پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے۔ ایسی پیچیدگیاں جنہیں حل کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ نفسیات کے اعلیٰ ترین ماہر بھی خوشی اور غم کی اس عجیب و غریب آمیزش کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ ان کا بیان کرنا بھی آسان نہیں، لیکن جوش کم سے کم اس کیفیت کے اظہار کی کوشش کرتے ہیں ؎

درسِ عبرت ہے یا اولی الابصار
میرا افسانۂ دلِ بیمار
یہ فسانہ نہیں، حقیقت ہے
"شاعری سے نہیں مجھے سروکار"
دل میں ہیں جذبہ ہائے گوناگوں
اُلجھی جاتی ہے کاکلِ گفتار

مجھ کو وصل و فراق دونوں رسن
مجھ کو تریاق و زہر دونوں دار
عہدِ اخلاص توڑتے ہیں بھی ننگ
رشتۂ شوق جوڑنے میں بھی عار
اُن سے ملئے تو عافیت برباد
اُن سے کھنچئے تو زندگی بےکار
اُن کے کھونے پہ بھی نہیں راضی
اُن کے پانے پہ بھی نہیں تیار
کون سمجھے گا ان معموں کو
عشق ہی مست عشق ہی سرشار
عشق ہی ہجر کے لئے بےچین
عشق ہی وصل کے لئے بیمار
عشق ہی راہِ سعی میں خفتہ
عشق ہی بزمِ فکر میں بیدار

اک طرف زاہدوں کی مجلس میں
میری غیبت کا گرم ہے بازار

اک طرف عاقلوں کی محفل سے
طعنِ ناروا کی ہے بوچھار
دشمنِ اہلِ وطن، معاذ اللہ
تہمتوں کے لگا دیئے انبار
سخت ہیں مجھ پہ کفر کے آئین
تیز ہے مجھ پہ شرع کی تلوار
اک طرف موت ایک جانب زیست
وہ بہت سہل، یہ بہت دشوار

"عقدۂ لاینحل" (نقش و نگار صفحہ ۱۴۷)

محبت کی ڈور ہر قدم پر الجھتی جاتی ہے۔ شادی کے بعد محبوبہ وطن سے باہر چلی گئی۔ جوش دعا کرتے نظر آتے ہیں:

نگارِ رفتہ کو یارب! وطن میں پہنچا دے
دوبارہ دُرِّ عدن کو عدن میں پہنچا دے
وطن کی روح کو جسمِ وطن میں واپس کر
غزالِ دشتِ ختن کو ختن میں پہنچا دے
وہ اپنے حسن سے محفل میں اپنے عشق کے بزم
اس انجمن کو پھر اس انجمن میں پہنچا دے

"نگارِ رفتہ" (نقش و نگار صفحہ ۱۵۱)

جوش کی زندگی میں سنہ ۱۹۲۴ء ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب تک جوش سیر و سفر کے لئے بارہا گھر سے باہر نکلے تھے لیکن اب دوسری حیثیت سے نکلنا پڑا۔ محبت کا جو پھندا گلے میں پڑا تھا، وہ کھینچ رہا تھا۔ وہی کشاں کشاں انہیں حیدرآباد (دکن) لے گیا۔ پہلے یہ خیال ہوتا تھا کہ اعزا کی بیگانہ وشی، زمینداری کے کاموں کی الجھن اور محبوبہ کی شادی کا زخم ملیح آباد چھوڑنے کے اسباب ہیں۔ لیکن سنہ ۱۹۲۵ء کی ایک نظم "تیرے لئے" اس راز کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ گھر چھوڑنے کے اور اسباب بھی ہیں لیکن اصل سبب محبت ہے:

ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اپنے کو تیری راہ میں
پوچھتا پھرتا ہوں میں اپنا پتا تیرے لئے
آہ گو اک عمر سے ہوں میں رئیس ابن رئیس
بن کے نکلا ہوں گدائے بے نوا تیرے لئے
مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے تیرے قرب کی
شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لئے
چاک کر کے میں نے آبائی امارت کا لباس

زیبِ تن کی ہے غلامی کی قبا تیرے لئے[1]
پھیر لیں آنکھیں مناظر سے یلیح آباد کے
ٹھکرا دی کی چھوڑ دی آب و ہوا تیرے لئے

اب محبوبہ کا سامنا بھی نہیں ہوتا، اس کی پرچھائیاں خواب میں نظر آتی ہیں۔ اور "جفائے التفات" کا مارا ہوا عاشق "آرزوئے محروم" کو اپنے سینے سے چپٹائے ہجر کی تکلیفیں برداشت کر رہا ہے:

فریاد ہے اے خلوتیٔ پردۂ ناموس
کب سے ہوں تری دھن میں گریباں دریدہ
واقف ہے کہ کس طرح سر بستر و بالش
راتوں کو تڑپتا ہے ترا زلف گزیدہ
دم بھر کے لئے تو کبھی آغوش میں آجا
اے عمرِ رواں! سایۂ آہوئے رمیدہ
آتا ہوں ترے شہر میں پامالِ ملامت
جاتا ہوں تری راہ سے دشنام شنیدہ

"آرزوئے محروم" (نقش و نگار صفحہ ۱۵۹)

اگر یہیں تک ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ تھوڑے ہی دنوں کے اندر جوش کو یہ احساس ہو گیا کہ محبوبہ کو اب ان سے محبت ہی نہیں رہی۔ "ناقابلِ تسخیر"، "کون لے گیا!"، "آتے نہیں ہو تم"، "اداس صبح"، "خبر ہے کہ نہیں!"، یہ تمام نظمیں سنہ ۱۹۲۶ء میں لکھی گئی ہیں، اور ان تمام نظموں میں یہی خیال مرکزی جگہ رکھتا ہے۔ مثلاً:

ہم نشیں ترکِ وفا پر اسے توبیخ نہ کر
قید ہوتی ہے کہیں بوئے چمن موجِ گہر؟
پوچھ اس دل کو مرے جس نے اسے رام کیا
اس نے دو دن بھی جو چاہا تو بڑا کام کیا!

اے یارِ دل نشیں وہ ادا کون لے گیا؟
تیرے نگیں سے نقشِ وفا کون لے گیا؟
اے شاہِ بندہ پرور و سلطانِ نرم دل

---

[1] میں نے پوچھا تھا کہ زمینداری کے ہوتے ہوئے آپ نے اتنی دور جا کر ملازمت کیوں کی؟" اس کے جواب میں لکھا ہے کہ "عاشقی کا معاملہ تھا! صاحب! سیکڑوں جائیدادوں اور جاگیروں کے ہوتے ہوئے بھی عاشق صاحب نوکری کر سکتے ہیں۔ نوکری کے بغیر بھی حیدرآباد میں قیام کیا جا سکتا تھا۔"

دل سے ترے خیال گدا کون لے گیا؟
راتوں کو جاگتا تھا دعا تیری دید کی
وہ منتیں، وہ ذوقِ دعا کون لے گیا؟

میرے پیام بر کے اٹھاتے تھے پہلے ناز
اب میرے دل کے ناز اٹھاتے نہیں ہو تم
آتی ہیں حسبِ قاعدہ راتیں اسی طرح
لیکن نظر بچا کے اب آتے نہیں ہو تم
یک لخت تم نے جوش کو دل سے بھلا دیا
اور اس میں بھید کیا ہے؟ بتاتے نہیں ہو تم

اے صبا کوچۂ جاناں میں گذر ہے کہ نہیں؟
تجھ کو اس فتنۂ عالم کی خبر ہے کہ نہیں؟
اب مرے نام کا پڑھتا ہے وظیفہ کوئی؟
اب مرا ذکرِ وفا وردِ سحر ہے کہ نہیں؟

اور یہ چیز بڑھتے بڑھتے مکمل یاس اور آرزوئے مرگ میں تبدیل ہو گئی۔ ایسی بے دلی پیدا ہوئی کہ جب محبوبہ نے "اعادۂ پیماں" کرنا چاہا تو جوش کی زبان سے یہاں تک نکل گیا:

دم ہی نہیں ہے جوش میں تجدیدِ شوق کا
احسان اب یہی ہے کہ احساں نہ کیجیے

یہ ساری منزلیں کئی سال کے وقفے میں آئیں۔ اس درمیان میں جوش کا ماحول اچھا خاصا بدل گیا تھا۔ ملیح آباد اور لکھنؤ چھوڑنے کا انہیں جو غم تھا وہ ان کی نظم "الوداع" سے ظاہر ہے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز دامن تھام رہی تھی۔ رنگین گلستاں، سرزمینِ صبحِ خنداں، "قصرِ سحر" (جوش کے مکان کا نام ہے)، خموشی، کھلے میدان، آم کے باغ، مست کوئل کی آواز، ببولوں کی چھاؤں، چاندنی راتیں، سب سے رخصت ہونا چاہتے ہیں۔ اس نظم میں یا تو جوش نے ملیح آباد چھوڑنے کا اصل سبب چھپایا ہے یا پھر "فکرِ روزگار" بھی ایک بڑی وجہ تھی، کیوں کہ "فکرِ دنیا" اور "فکرِ روزگار" کا ذکر بار بار آتا ہے۔

گھر سے بے گھر کر رہی ہے آہ فکرِ روزگار
سرنگوں ہے فرطِ غیرت سے اب دبدبہ تھا
خلعتِ ماضی ہے جسمِ زندگی پر تار تار
پھر بھی آنکھوں میں ہے آبائی امارت کا خمار

شمع خلوت ہے سے روشن تیرگی محفل میں ہے
رُخ پہ گردِ بیکسی، شانِ ریاست دل میں ہے

آہ اے دورِ فلک تیرا نہیں کچھ اعتبار
مٹ کے رہتی ہے ترے جورِ خزاں سے ہر بہار
نوعِ انساں کو نہیں تیری ہوائیں سازگار
فکرِ دنیا اور شاعر تف ہے اے لیل و نہار

موج کوثر وقف ہو اور تشنہ کامی کے لئے!
خواجگی رختِ سفر باندھے غلامی کے لئے!

"الوداع" (نقش و نگار صفحہ ۱۰۰)

(۶)

لیکن باہر نکلنا جوش کے لئے مفید ہوا۔ حیدرآباد میں وہ دارالترجمہ میں "ناظر ادب" ہو گئے۔ زندگی کی کش مکش نے نئی صورتیں دکھائیں۔ گھر سے دور ہونے کی وجہ سے دل میں نئے انداز کا گداز پیدا ہوا، صحبتیں بدلیں، ہجر اور ناکامی کے نشتر چبھے، نئے تجربوں کے مواقع ہاتھ آئے، آقائی سے غلامی کی منزل میں قدم رکھنا پڑا، شعور کی دنیا بدلی۔ سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک ہندوستان میں انقلاب کی زبردست آندھیاں چلی تھیں، جنھوں نے اکثر نوجوانوں کو ان کے رنگ محل اور بستر عشرت سے اٹھا کر جد وجہد کے خارزار میں لا کھڑا کیا تھا۔ لیکن ایک رئیس خاندان کے چشم و چراغ، حساس شاعر کی آنکھیں اپنی ہی ذات پر اسی طرح جمی ہوئی تھیں کہ اس نے ان طوفانوں کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ لیکن حیدرآباد کی ریاستی فضا میں آزادی اور غلامی کی کش مکش کے نئے تجربے ہوئے۔ جس کی ناز برداری محبوبہ نے کی تھی، جس کے گرد و پیش ہوا خواہوں اور مصاحبت کا فرض انجام دینے والے دوستوں کا ہجوم رہتا تھا، وہ وطن سے دور مزدوری کرنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ اس انقلاب کے داخلی احساس کی شہادتیں جوش کے کلام میں ملتی ہیں۔ اور یہی احساس ہے جو نئے حالات کا عطیہ تھا۔ یہی احساس تھا جس نے ان کی فکر و نظر کی دنیا وسیع کی۔ ملیح آباد، لکھنؤ، اپنی ذات، خاندانی وقار، اعزا کی بے اعتنائی اور محبوبہ کے جور التفات سے ہٹ کر نگاہیں "درد انگیز کھلونے" اور "ٹھنڈی انگلیوں" پر بھی پڑیں۔

یہ زمانہ جوش کے ارتقائے ذہن کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کچھ اپنے کام کے سلسلے میں اور کچھ اپنے ذوقِ تجسس کی تسکین کے لئے جوش کے مطالعۂ کتب کی رفتار بڑھ گئی۔ اب تک جوش نے عام طور سے شعر و ادب کے مطالعے میں وقت صرف کیا تھا، مذہبی کتابیں پڑھی تھیں، رومانی قصے کہانی اور افسانے دیکھے تھے، اب تاریخ، فلسفہ، اخلاقیات، اور دوسرے علوم و فنون کی کتابیں دیکھنے کے مواقع ہاتھ آئے۔ دارالترجمہ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مترجمین سے تبادلۂ خیال کا سلسلہ شروع ہوا۔ حافظ، خیام، کبیر داس، شرر، سرشار، داغ اور انیس کا اثر تھا اب اس میں مومن، غالب اور نظیر اکبرآبادی بھی شامل ہو گئے۔ ٹیگور اور اقبال نے متاثر کیا۔ جوش اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ،

"ابتدا میں شررؔ اور سرشارؔ کی نثر اور داغؔ اور انیسؔ کی شاعری سے متاثر ہوا۔ آگے بڑھا تو مومنؔ، میرؔ، غالبؔ، اور نظیرؔ اکبرآبادی نے متاثر کیا۔ پھر ٹیگوریت نے دل میں گھر کیا۔ اس کے بعد اقبالؔ آئے۔ لیکن چھا نہیں سکے۔ پھر ورڈسورتھ کو پڑھا اور اثر قبول کیا۔ پھر گوئٹے، نطشے، میکسم گورکی، شیلی، وکٹر ہیوگو، برگساں، شوپنہار اور کارل مارکس نے متاثر کیا۔ فارسی میں سعدیؔ، خیامؔ، نظیریؔ، عرفیؔ، اور سب سے زیادہ حافظؔ نے دل پر اثر کیا۔ جواب تک ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ہندی میں تلسی اور کبیر سے متاثر ہوا۔"

ظاہر ہے کہ اس میں آج تک کے اثرات شامل ہیں، اور ہر طرح کے، بعض صورتوں میں تو یہ اثرات ایک دوسرے کی ضد پیش کرتے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر انسان یونہی متضاد خیالات اور اثرات کو قبول کرتا، چھنتا، الگ کرتا، پسند کرتا، اور چھوڑتا آگے بڑھ جاتا ہے۔ زندگی کے بہاؤ میں بہت سی چیزیں ساتھ ہو جاتی ہیں۔ کچھ دور تک چلتی رہتی ہیں کچھ ہلکا سا اثر ڈال کر الگ ہو جاتی ہیں۔ انسان کمزور جذباتی لمحوں میں بعض باتوں کا اثر قبول کر لیتا ہے۔ جب غور کرتا ہے تو انہیں ترک کر دیتا ہے۔ کبھی ترک کرتے ہوئے اسے دکھ ہوتا ہے اور خامیوں کو جانتے ہوئے بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ ہر انسان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہر لمحے وہ مخصوص اصولوں ہی کے ماتحت سوچے اور عمل کرے۔ زندگی بہت سے ایسے مواقع فراہم کرتی ہے جہاں اپنے پسندیدہ نظریات کے خلاف بھی کہنا اور کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود فرد کی شخصیت میں یکسر پراگندگی نہیں ہوتی۔ حیات و کائنات پر غور کرنے والے زندگی کے موٹے موٹے اصول تلاش کر لیتے ہیں جن کی مدد سے وہ ہر راستے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے انداز فکر اور طریق کار کا ایک راستہ بن جاتا ہے جو ان کے کردار اور ذہن کا مظہر ہوتا ہے۔ خیالات و افکار کے طوفان، واقعات اور حادثات کے عمل اور ردعمل سے ایک ایسی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے جس میں تضاد کی رنگارنگی ماند ہو جاتی ہے۔ اور ایک مخصوص قسم کی یکرنگی کا ظہور ہوتا ہے۔ غور سے دیکھئے اور کریدنے سے دبے ہوئے رنگ بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جوشؔ کی شخصیت میں ان متضاد عناصر کا ڈھونڈھ نکالنا مشکل نہ ہوگا جو مختلف الخیال ادیبوں اور مفکروں کے مطالعے کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن جس وقت ہم ان کے ذہنی ارتقاء کے متعلق فیصلہ کرنے لگیں گے، اس وقت یہ پتہ آسانی سے چل جائے گا کہ کس قسم کے اثرات نے ان کی شخصیت اور کردار کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔

مطالعے کے ساتھ ساتھ مشاہدے کی قوت بھی بڑھی اور فکر میں گہرائی آئی۔ انفرادیت پر سماجی حقیقت کا ہلکا سا رنگ چڑھا۔ حیدرآباد کے ریاستی اور امارت ماحول میں زندگی کے نشیب و فراز زیادہ دکھائی دیئے۔ ناظر فطرت سے وابستگی جاری رہی۔ ملیح آباد کی ابتدائی زندگی میں شراب کا ذکر نہ تھا، اور اگر تھا تو حافظ و خیامؔ کے اثر سے، لیکن اب شراب کا ذکر ایک مستقل موضوع بن گیا۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں کہا تھا:

ترک کر دوں گا مشغلِ مے ناصح
ہاں سر آنکھوں پر آپ کا ارشاد!

سنہ ۱۹۲۴ء میں:

کشتیٔ مے کو اے خدائے صبوح
بخش دے قسمتِ سفینۂ نوح
چشمۂ زندگی ہو مدح سرا
ارغوانی شراب ہو ممدوح
بادہ ہے اِس طرف اُدھر کوثر
اِس کو فاتح بنا اُسے مفتوح
آج آئے نہ مے پہ اے معبود
تیرے بندے ہیں خستہ و مجروح

اور حیدرآباد کے قیام میں "چند جرعے" اور "پیامِ کیف" کی سی مدہوش کن نظمیں لکھیں۔ اسی زمانے میں جوش نے شعر و ادب کے متعلق بھی اپنے خیالات ظاہر کئے جس میں تصور پرست اور عینیت پسند مفکروں کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر ملہم غیب اور تلمیذ رحمانی تھا، جس کے سرحدِ ادراک تک دوسروں کی رسائی نہ تھی۔ اس کا تجزیہ کسی اور مقام پر کیا جائے گا۔

حساس انسان بہت جلد اثر قبول کرتا ہے۔ بہت جلد خوش ہوتا ہے، بہت جلد رنجیدہ۔ لیکن جو احساس شدید ہوتا ہے وہ دیر تک قائم رہتا ہے۔ کبھی کبھی اس سے بھی تضاد کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ تضاد خیال اور عمل کے افتراق کی شکل میں زیادہ موثر طریقے پر ظاہر ہوتا ہے۔ جوش کے یہاں جنوں و خرد کی جو کشمکش ہے وہ بھی اس کی مظہر ہے۔ وہ پہلے ہی سے تقدیر اور مشیت کے کسی قدر قائل تھے، لیکن انسان کو مجبور محض نہ سمجھ سکے۔

"روحِ ادب" میں یہ اشعار ملتے ہیں:

تم سے چھڑا رہا ہے زمانہ بہار میں
کیا دخل ہے مشیتِ پروردگار میں

جو مقدر میں ہے وہ ہو کے رہے گا اے جوش
آپ کیوں دل کو پریشان کئے بیٹھے ہیں!

لیکن یہ خیال اتنا عام ہے کہ اس کو جوش ہی سے مخصوص کرنا یا ان کے کردار پر اس کے عمل کی جستجو کرنا بے سود ہوگا۔ بعد کی شاعری میں جبر کا تذکرہ اتنا آتا ہے کہ اس کی ابتدا کے متعلق کچھ جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ جوش نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ: انسان کی مجبوریوں کی طرف انہیں سب سے پہلے فانی بدایونی نے متوجہ کیا، اور یہ بات ان کی سمجھ میں بھی آ گئی۔ لیکن بات اتنی ہی نہیں ہو سکتی۔ جوش کے داخلی اندازِ فکر میں اس کے لئے پہلے سے وجہ جواز موجود تھی۔ ان کے یہاں اس کی بنیادیں پہلے سے موجود تھیں کہ وہ جبر کو تسلیم کر کے آزاد ہو جائیں۔ ہر شخص اس بات کو جلد تسلیم کرتا ہے جو اس کے اعمال و افعال کو حق بجانب ثابت کرے۔ جس سے اسے ضمیر کی سرزنش سے چھٹکارا مل جائے۔ جوش کسی آزاد خیالی کی طرف ضرور مائل تھے۔ لیکن اس وقت تک مذہبی نظامِ اخلاق کو ٹھکرانے کی جرأت نہ رکھتے تھے۔ ذہنا

کی اس دوئی کے لئے جبریت میں جائے فرار تھی۔ اگر گناہ کو گناہ، برائی کو برائی نہ سمجھتے ہوتے تو بدی کو "بھٹکی ہوئی نیکی" اور گناہ کو "معصوم ترین انسان" ثابت کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ یہی کوشش اس چور کی غماز ہے جو ان کی رُوح میں چھپا بیٹھا تھا۔ آزاد خیال انسان کو اس کی فکر باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ شراب نوشی کے جواز میں مذہبی کتابوں سے حوالے پیش کرے، لیکن جوش ایسا کرتے ہیں۔ خیر یہ بحث یہاں طوالت پیدا کرے گی۔ ذہن نشین صرف یہ کرانا ہے کہ خیال اور عمل کی دوئی یہ جبلیں بھی بدلتی ہے۔ اور فلسفہ کی حیثیت سے اسے تسلیم کر لیا جاتا ہے تو فکر و نظر کا سارا انداز اس سے متاثر ہوتا ہے۔ جوش نے بھی صرف فانی کے متوجہ کرنے سے نہیں بلکہ اپنے فکر کو ایک فلسفیانہ بنیاد دینے کے لئے جبر کے عقیدے کو تسلیم کر لیا۔

حیدرآباد کے دوران قیام میں جوش نے ہیکل (Haeckel) کی مشہور کتاب "The Riddle of Universe" پڑھی جو خدا اور مذہب کی طرف سے مشکوک بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ بعد میں انہوں نے "Rationalist Press" کی اور کتابیں بھی پڑھیں۔ جن میں والٹیر کے مضامین اور Joseph Mac Cabe کی The Existence of God اور Grant Allen کی The Evolution of the idea of God کو خاص طور سے پسند کیا۔

یہ کتابیں کسی مخصوص فلسفۂ حیات تک نہیں پہونچاتیں، لیکن آزاد خیال ضرور بناتی ہیں۔ جوش کے یہاں بھی یہی ہوا۔ انہیں مذہب کے دعووں اور حد بندیوں کا مذاق اڑانے میں مزہ آنے لگا۔ ایسے مواقع پر طنز کا حربہ بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے، جوش نے بھی اس سے کام لینا شروع کیا۔ مولویوں، ریاکار زاہدوں، جھوٹے مدعیان مذہب کی دھجیاں اڑائیں۔ اس خدا کو خدا ماننے سے انکار کیا جو انسانی تخیل کا تراشا ہوا تھا۔ اس خیال میں جبر کی آمیزش بھی ہوگئی تو ایک راستا در نکلا۔ اگر ایسا خدا ہے جیسا کہ ارباب مذہب پیش کرتے ہیں ــــ ذاتی اور شخصی خدا، جس میں بوے انسانی پائی جاتی ہے، تو پھر وہ بڑا ظالم اور قہار ہے۔ اس طرح وہ "باغیانہ میلان" جو باپ کی زندگی میں آبائی مذہب کی طرف سے پیدا ہوا تھا خود مذہب کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ تجسس پسند اور رومانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ وہ ناآسودہ رہتی ہے۔

کسی مقام پہ حاصل نہیں قرار ہمیں
مثالِ جوشِ رواں بے قرار ہیں ہم لوگ

روز اک نئی زمیں سے گزرتے ہیں ہر نفس
ملتے ہوئے ہیں موجۂ آب رواں سے ہم

اس باغیانہ میلان کا ایک سماجی اور سیاسی پس منظر بھی ہے۔ ہندوستانی سیاست اور سماج میں اصلاح پسندوں کے اٹھائے ہوئے خمیر نے ایک طویل مدت میں نئی انقلابی قدریں پیدا کر دی تھیں، جن کا ظہور پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوا تھا۔ برطانوی استحصال نے ہندوستانی افلاس کو اس نقطے پر پہونچا دیا تھا جس کے آگے جبر و قناعت کی راہ مسدود

تھی۔ بین الاقوامی حالات بھی آزادی کی راہ دکھا رہے تھے۔ اصلاحات اور دستوری تغیرات نے کسی کو بھی آسودہ نہیں کیا تھا۔ متوسط طبقہ خصوصیت کے ساتھ غیر مطمئن نظر آتا تھا، اس لئے بہت سے عناصر نے مل کر ہندوستان کو انقلاب کی راہ پر ڈال دیا۔ رومانی اور تصوراتی تغیر پرستی کی ایک ایسی لہر اٹھی جس نے ادیبوں اور شاعروں کو بھی اپنے آغوش میں لے لیا۔ شروع میں جوش اس سے بہت کم متاثر نظر آتے ہیں۔ گو بعض نظمیں سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۲۲ء کے درمیان میں ایسی بھی لکھی گئی ہیں جن سے ان کی سیاسی سوجھ بوجھ یا کم سے کم سیاست سے دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ "شکستِ زنداں کا خواب" (شعلہ و شبنم) پر سنہ ۱۹۲۱ء اور "خدا سے ایک سوال" (نقش و نگار) پر سنہ ۱۹۲۲ء درج ہے۔ لیکن یہ تاریخیں صحیح نہیں معلوم ہوتیں[1]۔ کیوں کہ اس زمانے تک ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور انگریزی سرمایہ دارانہ نظام جوش کے شعور کا جزو نہیں بنے تھے۔ لیکن انگریزوں کی غلامی ایسی اٹل حقیقت تھی، جس سے کوئی ہندوستانی آنکھیں چرا نہیں سکتا تھا۔ ہر قدم پر افلاس، جہالت، بیماری، غلاظت، گھٹی گھٹی سانسیں، رکی رکی آہیں، ہر موڑ پر ویرانی، بربادی اور تباہی — پھر تقابل اسے اور نمایاں کرتا تھا۔ انسانوں کی خود غرضیاں اور بے لوث قربانیاں، وطن پرستی اور جماعت بندیاں، وفاداریاں اور بے وفائیاں، اتحاد اور انتراق، مرض کے احساس میں اضافہ کرتے تھے۔

انگریزی سامراج کے خلاف جس متحدہ قومیت کا ظہور ہو رہا تھا اس سے مستقبل کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، اور وہ تمام لوگ جو آزادی کے خواہاں تھے، مذہبی تنگ نظری اور فرقہ وارانہ ذہنیت کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن سامراجی سازشوں، طبقاتی خود غرضیوں اور قدیم تہذیبوں کو رائج کرنے کی تمناؤں نے متحدہ قومیت کے تصور کو کاری ضرب لگائی، اور وہ اتحاد پیدا نہ ہو سکا جو غلامی کی رسی کو توڑ دیتا۔ جوش اب ان باتوں سے بالکل بیگانہ نہ تھے انہوں نے اپنی انسان دوستی کا ثبوت پہلی جنگِ عظیم اور سنہ ۱۹۱۸ء کی خشک سالی پر نظم لکھ کر دیا تھا۔ انہوں نے وطن سے وعدہ کیا تھا کہ: "تیری خدمت میں جان دے دوں گا" ("وطن" شعلہ و شبنم) اب جو دنیا بدلی، اور آزاد خیالی پیدا ہوئی تو ایک غلام ملک کی فریاد بھی سنائی دی، اور شاعر کی حیثیت سے انہیں اپنے فرض کا احساس ہوا:

---

[1] جوش کی کتابوں کے جو ایڈیشن تاج کمپنی (بمبئی) سے شائع ہوئے ہیں ان میں اکثر و بیشتر نظموں پر تاریخیں دی ہوئی ہیں ان سے مدد لی گئی ہے۔ لیکن یہ تاریخیں بعض جگہ غلط ہیں۔ مندرجہ بالا دو نظموں کی تاریخیں بھی صحیح نہیں معلوم ہوتیں، کیوں کہ ان کے انداز بیان اور موضوع دونوں میں ایسی پختگی اور شدت پائی جاتی ہے جو سنہ ۱۹۲۵ء کے پہلے نظر نہیں آتی۔ "شکستِ زنداں کا خواب" تو سنہ ۱۹۳۱ء کی معلوم ہوتی ہے۔ "شعلہ و شبنم" میں جو حصہ "اسلامیات" کے عنوان سے ہے اس پر لکھا ہے کہ یہ تمام نظمیں سنہ ۱۹۲۷ء کے پہلے لکھی گئیں۔ (تاج کمپنی بمبئی ایڈیشن) لیکن یہ صحیح نہیں کیوں کہ اس میں مولانا محمد علی مرحوم پر بھی ایک نظم ہے اور مولانا محمد علی کا انتقال سنہ ۱۹۳۱ء میں ہوا۔ اسی طرح "ذاکر سے خطاب" سنہ ۱۹۳۱ء کے قریب لکھی گئی۔ "پیغمبرِ اسلام" حیدرآباد کے قیام کے بالکل آخری زمانے یعنی سنہ ۱۹۳۴ء یا سنہ ۱۹۳۵ء میں لکھی گئی۔ یا تو جوش کو سہو ہوا، یا پھر کتابت کی غلطیاں ہیں۔ اس طرح کی بھی غلطیاں ملتی ہیں جن سے کتابت ہی کا شک ہوتا ہے۔ ایک ہی نظم "شعلہ و شبنم" اور "حرف و حکایت" دونوں میں ملتی ہے۔ "پیدا کر" کے عنوان سے "شعلہ و شبنم" میں سنہ ۱۹۲۵ء کے ساتھ درج ہے۔ "نوجوان سے خطاب" کے عنوان سے "حرف و حکایت" میں سنہ ۱۹۲۷ء کے ساتھ ہے۔

تڑپ کے تجھ کو پکارا ہے ملک و ملت نے
اب آج سے مجھے پروائے ننگ و نام کہاں
ہوا ہے حکم کہ لے کام موجِ صرصر سے
اب اختلاطِ نسیمِ سبک خرام کہاں
ہوا ہے حکم کہ بن رازدانِ آتش و برق
اب آب چہرۂ خوبانِ لالہ فام کہاں
نظر ہے اوج پہ جنبش میں ہیں پرِ پرواز
بساطِ خاک پہ اب آ سکے وہ تیر کہاں
تغیرات کی زد سے گذر رہی ہے نگاہ
اب اہتمام تماشائے حسنِ بام کہاں
لبِ حیات نے چھیڑا ہے قصۂ خونیں
مری زبان کو اب رخصتِ کلام کہاں
چلا ہوں سر بکف اُس سمت آج خود ہی جوش
اب آرزو کو سر نامہ و پیام کہاں؟

("ترک جمود" شعلہ و شبنم صفحہ ۴)

یہ ایک رومانی خیال پرست کا عزمِ عمل ہے، وہ چہرۂ خوباں اور تماشائے حسنِ بام کو ترک کر کے ملک و ملت کی آواز پر لبیک کہنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن خیال میں تو وہ لبِ حیات کے قصۂ خونیں سنتا رہا، عمل میں چہرۂ خوباں اور تماشائے لبِ بام میں الجھا رہا۔ انقلاب لانے کے لئے چہرۂ خوباں سے منہ موڑ لینا ضروری بھی نہیں ہے۔ لیکن جوش کے یہاں ہر جذبے کا ردِّ عمل شدید ہوتا تھا۔ اُسی ایک لمحہ میں جب ان پر ترکِ جمود کا جذبہ طاری ہوا، محبوبہ کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ بہر حال سنہ ۱۹۲۵ء سے ان کے کلام میں ملکی اور قومی مسائل نے بھی جگہ پانا شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ ایک انقلابی مجنون اور انتہا پسند بت شکن کی طرح اپنی نظموں کے تیز اور زہریلے نشتر لئے ہوئے میدان میں اتر آئے۔ اس طرح چیختے چلاتے، توڑتے پھوڑتے آگے بڑھنے لگے کہ انقلاب ایک خیالی ارادہ معلوم ہونے لگا۔

جوش اس پرخلوص سپاہی کی طرح گولیاں چلاتے رہے جو جنگ فتح کرنے کی دھن میں اتنا دیوانہ ہو چکا ہے کہ نہ اپنے ساتھیوں پر نگاہ رکھتا ہے، نہ میدانِ جنگ کی شاطرانہ چالوں سے کام لیتا ہے اور نہ جنگ کے دوسرے محاذوں کی حالت سے واقف ہے۔ سیلاب و صرصر کی طرح ہر وادی و کہسار پر چھاتے چلے گئے۔
بوڑھوں کی انجمن میں یہ نعرہ لگایا:

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب!

غلاموں سے یہ کہا ہے

اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ
شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لئے نگاہ

شریکِ زندگی سے یوں مخاطب ہوئے:

اے شریکِ زندگی! اس بات پر روتی ہے تو
کیوں مرا ذوقِ ادب ہے مائل جام و سبو
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ ہے گرم فغاں
سبحہ و زنار میں جکڑا ہوا ہندوستاں

ممتاز کے ناز امانِ کالج کو اس طرح آواز دی:

دیر سے توپوں کے منہ کھولے ہوئے ہے روزگار
سینۂ گیتی میں ہے جس کی دھمک سے خلفشار
شغلِ زینت سے اگر فرصت تمہیں ملتی نہیں
کیا تمہارے پاؤں کے نیچے زمیں ہلتی نہیں

مسلمانوں سے کہا

ہاں خود و زرہ بھی تو ہے اسلام کا زیور
باندھے گا تو کب جامۂ احرام کہاں تک

ہندوؤں کو یوں پکارا:

بازوئے زر! ناخدائی کے لئے تیار ہو
ڈوبنے والی ہے کشتی قوم کی ہشیار ہو

اور دونوں کو یوں مخاطب کیا:

توڑ اس جال کو جکڑے ہے جو بازو تیرے
بستۂ کشمکشِ سبحہ و زنار نہ بن
پست سے پست ہو جو چیز وہ بن جا لیکن
مر کے بھی جنسِ غلامی کا خریدار نہ بن

یوں تو جوش کے سینے میں وطن پرستی اور قوم پرستی کا طوفان اُبل پڑا، غلامی سے نجات، ہندو مسلم اتحاد، عمل، انقلاب، انہیں کے گیت ان گنت راگوں میں گانے لگے، اور جب سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۱ء میں کان پور میں زبردست فرقہ وارانہ ہنگامہ ہوا، تو جوش کے انقلابی نعرے سرسامی چیخوں میں تبدیل ہو گئے۔

اے سیہ رو، بے حیا، وحشی، کمینے، بدگماں
اے جبینِ ارض کے داغ اے دنیٔ ہندوستاں
تجھ پہ لعنت، اے فرنگی کے غلامِ بے شعور!

یہ فضائے صلح پرور، یہ قتالِ کان پور
تجھ کو عورت نے جنا ہے جھوٹ ہے یہ اے لعین
آدمی کی نسل سے اور تو ! نہیں ہرگز نہیں
تیری جانب اٹھ رہی ہے دیکھ دوزخ کی نگاہ
سبحہ و زنّار میں جکڑے ہوئے دیوِ سیاہ
تو ابھرتے ہی زمانے کی نظر سے گر گیا
یوں بہایا خون امید دل پہ پانی پھر گیا
رکنے ہی والا ہے آزادی کا جاں پرور جہاد
اے فرنگی شادماں باش و غلامی زندہ باد

(مقتلِ کان پور۔ شعلہ و شبنم صفحہ ۵۶)

یہ عجیب و غریب زمانہ ہے جوش کے لئے! رندی اور سرمستی عروج پر ہے۔ وطن پرستی ترقی کر رہی ہے، مذہب کی حد بندیوں سے زندگی گھٹتی معلوم ہوتی ہے، خدا کی حقیقت واضح نہیں، انسان مجبورِ فطرت نظر آ رہا ہے، آزادی اور حب وطن کا جو جذبہ وہ پیدا کرانا چاہتے ہیں، لوگوں میں پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ صبحیں اسی طرح دل آویز ہیں، شامیں اسی طرح سلونی۔ برسات میں کوئل اور پپیہے کوکتے اور مور جھنکارتے ہیں، نشاط اور لذت پرستی کا ٹھکانا نہیں ہے۔ آباؤ اجداد کی عزت اور عظمت کا خیال بھی آتا ہے، ملک کے افلاس پر دل بھی روتا ہے۔ بھرپور جوانی بھرپور محبت کی تلاش میں ہے۔ مسائلِ حیات ادھر سے نگاہیں بھی ہٹا دیتے ہیں۔ ہندوستان ایک کوہِ آتش فشاں کی طرح سلگ رہا ہے۔ کبھی کوئی سیاسی تحریک امنڈ کر منزل پر روشنی ڈال دیتی ہے، کبھی فرقہ وارانہ فساد آزادی کے جہاد کو آگے بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔

جوش ان شاعروں میں سے نہیں ہیں جو آنکھیں بند کر کے سوچیں، ان کی نگاہ ہر چیز پر جاتی ہے۔ وہ ہر معاملے میں رائے دینا چاہتے ہیں۔ ان کی شہرت بڑھ رہی ہے، اقبال کے نام کے بعد انہیں کا نام لیا جا رہا ہے۔ قوم پرست انہیں اپنی آنکھوں کا تارا بنانا چاہتے ہیں، رند انہیں مسندِ صدارت پیش کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں کا احساس جوش کو بھی ہے۔ بعض مسئلوں پر وہ واضح خیالات رکھتے ہیں، بعض سیالی حالت میں ہیں۔ ہر خیال نیا خیال پیدا کرتا ہے۔ ہر خیال کی مادی اور سماجی بنیادیں ہیں، مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس دور میں جوش کی نگاہ ان مادی اور سماجی بنیادوں تک نہ جاتی تھی اور اگر جاتی بھی تھی تو انسان دوستی اور وجدان کی راہ سے۔

اس ماحول اور زندگی میں جوش کی ذہنی کیفیات اور نفسیات کا مطالعہ کافی پیچیدہ نظر آتا ہے۔ غم میں خوشی اور خوشی میں غم کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ مستقبل کے متعلق کبھی امید ہے کبھی نا امیدی۔ ایسی آویزشوں سے جوش کی اس دور کی شاعری بھری پڑی ہے۔ جذبات اور احساسات کی تند و تیز رو کو سماجی حقائق کی راہ پر لانے کی کوشش نظر آتی ہے۔ کیونکہ فلسفہ اور سائنس کے مطالعہ نے خیال اور احساس کی مادی اور سماجی بنیادوں کی جانب بھی کسی قدر ذہن کو منتقل کیا تھا۔ اب تک جوانی کا مصرف صرف یہ نظر آتا تھا کہ اسے محبت کی نذر کر دیا جائے۔ اب میدانِ عمل میں سر بکف آنے کا دھیان بھی پیدا ہوتا ہے۔ اب تک رندی صرف بزمِ ناؤ نوش تک پرواز کرتی تھی، اب انہیں رندِ ہزار شیوہ بننے کا خیال بھی آتا ہے۔ عورت اب تک صرف محبوبہ تھی

اب اس کی ضعیفی اور جفاکشی بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

مختصر یہ کہ مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور خواہش نے ان کی دنیا اتنی وسیع کردی کہ ہر چیز ان کے لئے شاعری کا موضوع بن گئی۔ یہاں تک کہ گو رسمی مذہب سے جوش دور ہٹتے جا رہے تھے لیکن اسلام کی بعض مقتدر ہستیوں کی زندگی کے وہ رُخ جو اُن کے نقطۂ نظر کے واضح کرنے میں معین تھے، وہ خاص طور سے پیش کر رہے تھے، آزادی سے محبت، غلامی سے نفرت، ریا کی ظاہر پرستیوں سے اختلاف، ہمت، جرأت اور شرافت کی تلقین، مذہبی رہنماؤں کی زندگی میں جہاں یہ پہلو دکھائی دیتے تھے، جوش انہیں پیش کر کے تمام لوگوں اور خاص کر مسلمانوں کو جنگ آزادی کے قریب لانا چاہتے تھے۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کا جہاد آزادی ایک خاص منزل پر پہونچ گیا تھا۔ قوم پرستوں نے "آزادیٔ کامل" کا اعلان کیا تھا۔ جوش نے بھی اسی سال اپنی نظم "خریدار تو بن" کا پہلا شعر یوں لکھا۔

اے دل! آزادیٔ کامل کا خریدار تو بن
پہلے اس کاکل پیچاں کا گرفتار تو بن

سائمن کمیشن اور گول میز کانفرنس کے بہت سے کھیل کھیلے گئے۔ لیکن آزادی کے دیوانے ہر سامراجی چال اور ہر جال سے بچتے رہے۔ جوش بھی ان چالوں سے واقف تھے۔ "زوالِ جہاں بانی" (سنہ ۱۹۲۸ء) میں لکھا ہے:

اُٹھائے گا کہاں تک جوتیاں سرمایہ داری کی
جو غیرت ہو تو بنیادیں ہلا دے شہریاری کی
ہنوز مغرور اگر مائل بہ نرمی بھی ہو سلطانی
کہ یہ بھی ایک صورت ہے تجھے بزدل بنانے کی
گئے وہ دن کہ تو زنداں میں جب آنسو بہاتا تھا
ضرورت ہے قفس پر اب تجھے بجلی گرانے کی
تڑپ بیہم تڑپ اتنا تڑپ برق تپاں ہو جا
خدارا اے زمیں بے حقیقت آسماں ہو جا

سائمن کمیشن کے آنے کے وقت لکھا:

لگی ہے گھات میں مدت سے تیری
فرنگی کی نگاہ جادوانہ
عدو تیری گرفتاری کی خاطر
مہیا کر رہے ہیں آب و دانہ
اگر جینا ہے آزادی سے تجھ کو
سُنا دشمن کو پڑھ کر یہ ترانہ
"برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقارا بلند است آشیانہ" (حافظ) "دام فریب" (شعلہ و شبنم)

بہرحال ہندوستان کے رہنما سامراجی دام فریب میں نہ آئے، اور سول نافرمانی اور قانون شکنی کی وہ تحریک شروع ہوئی جو تاریخ انقلاب میں یادگار رہے گی۔ قید، قتل، خون اور ضبط املاک کا بازار گرم ہوا جیل خانے بھرے جانے لگے بڑے بڑے ہمت والے خاموش ہو گئے لیکن جوش نے سنہ ۱۹۳۱ء میں لکھا:

نکلا فضا پہ صبح کا وہ نقرئی جلوس
گلبانگ طائران خوش الحاں لئے ہوئے
یہ رنگ کیا ہے کشور ہندوستاں کا آج
ہر ذرۂ حقیر ہے طوفاں لئے ہوئے
ان جالیوں پہ حبس تاریک کی نہ جا
یہ جالیاں ہیں جنبش مژگاں لئے ہوئے
ان کروٹوں کو اہل قفس کی نہ سبک جان
یہ کروٹیں ہیں سوئے طوفاں لئے ہوئے
ظاہر میں بزدلی ہے یہ درماندگی مگر
یہ بزدلی ہے جنگ کا ساماں لئے ہوئے
آزادیوں کے دیکھ رہا ہے لطیف خواب
زندانیان عشق کو زنداں لئے ہوئے

"زنداں کا گیت" (شعلہ و شبنم صفحہ ۳)

آزادی کا تصور واضح ہوا تو طبقاتی تضاد بھی نمایاں ہو گیا۔ یوں تو کچھ دنوں سے ہندوستان میں علمی حیثیت سے اشتراکیت کا چرچا تھا۔ سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کسان کا مقابلہ کیا جا رہا تھا۔ لیکن عملی سیاسیات میں ان خیالات کا اظہار برائے نام ہوا تھا، اصلاحی مطمح نظر انقلابی ہوتا جا رہا تھا۔ جوش نے بھی اس زمانے میں جو نظمیں لکھیں ان میں اشتراکی رجحان پایا جاتا ہے۔ جوش کی ذہنی ساخت اور انسان دوستی کا یہ منطقی نتیجہ تھا کہ وہ خوب سے خوب تر کی طرف بڑھیں۔ جو چیز انسانی ترقی کی سست رفتار کو بڑھائے اس کا ساتھ دیں۔ تحریک آزادی کی رفتار جن عملی دشواریوں سے دوچار ہو رہی تھی جوش کا ذہن ان سے آزاد تھا، اس لئے وہ ہر قدم پر قوم پرستوں کے ساتھ ہی نہیں چل رہے تھے، بلکہ کبھی کبھی ان کے آگے بھی نکل جاتے تھے۔ شاعری کو پیمبری سمجھ رہے تھے۔ اس لئے صرف عوام ہی نہیں، سیاسی رہنماؤں کی رہبری بھی کرنا چاہتے تھے۔

ریاست حیدرآباد کی تنگ و تاریک فضا　اس شعلے کو بہت دنوں تک اپنے دامن میں جگہ نہیں دے سکتی تھی، جوش کی آتش نوائی ایک طرف شہریاری اور سرمایہ داری، حکومت اور اقتدار پر آگ برسا رہی تھی تو دوسری طرف ارباب مذہب بدظن ہو رہے تھے۔ ریاستوں میں سازشوں کا جال بچھا لینا، مطلق العنان امیر ریاست کو کسی ایک وظیفہ خوار سے برگشتہ کر دینا بہت آسان ہوتا ہے۔ یہ کھیل وہاں ہر وقت کھیلے جاتے ہیں۔ چنانچہ جوش کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ حیدرآباد میں دس سال قیام کرنے کے بعد جوش کو وہاں سے علیحدہ ہونا پڑا۔ وہی نظام، امراء، جاگیردار اور حکام جو جوش کی

شاعری کے دلدادہ اور ان کی صحبت کے خواہاں تھے ان سے آنکھیں چرا کر علیحدہ ہوگئے اور "عتاب شاہی" نے جوش کو چند گھنٹوں کے اندر ریاست کے حدود سے باہر نکل جانے پر مجبور کیا۔ لامذہبیت، دہریت اور آزاد خیالی کے ساتھ ساتھ ان پر اپنے اشعار میں نظام حیدر آباد کی توہین کرنے کا الزام لگایا گیا، اور جوش موردِ عتاب ہوگئے۔ حیدر آباد چھوڑتے وقت جوش کی سب سے بڑی آزمائش محبوبہ سے رخصت تھی۔ یہ غالباً جوش کا اٹھارواں اور آخری عشق تھا۔ لیکن پہلے ہی عشق کی طرح شدید اور طوفانی، اسی طرح کامیاب مگر آنسوؤں اور آہوں میں ڈوبا ہوا۔ شاہی حکم ہے کہ کوئی رخصت کرنے اسٹیشن پر نہ جائے مگر محبوبہ آتی ہے۔ اس کی یادگار جوش کی خوب صورت نظم "شامِ رخصت" (آیات و نغمات) ہے۔

تجھ سے رخصت کی وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے
وہ اداسی وہ فضائے گریہ ساماں ہائے ہائے
وہ مرے سینے میں سیلِ آب و آتش الاماں
وہ ترے چہرے پہ موجِ برق و باراں ہائے ہائے
وہ جدائی کی ہوا کے تند جھونکے وائے غم
وہ جوانی کا چراغ زیرِ داماں ہائے ہائے
حسرتِ دیداریاں ہر آن بے تاب و شدید
فرصتِ نظارہ واں پیہم پر افشاں ہائے ہائے
یاں لرزتا ساغرِ عزم و ہمت الحذر
واں جھکتی سی نگاہ فتنہ ساماں ہائے ہائے
یاں کفِ پا چوم لینے کی دبی سی آرزو
واں بغل گیری کا شرمایا سا ارماں ہائے ہائے
تمتمانے ولولوں کی آگ اور تیری جبیں
سنسناتی آنچ اور سیرِ گلستاں ہائے ہائے
میں سراپا سازِ عشرت اور بہ بین درد و غم
تو مجسم نازکی اور بار حرماں ہائے ہائے
وہ مری نظروں میں کچھ کہنے کی حسرت وائے شوق
وہ تری آنکھوں میں کچھ سننے کا ارماں ہائے ہائے
اللہ اللہ آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کہنا ترا
"جوش! میرا دل ہرا جاتا ہے ویراں ہائے ہائے
اے فغاں بر لب ترنم اے خزاں بر کف بہار
جوش تیرے دل کی ویرانی کے قرباں ہائے ہائے"

حیدر آباد چھوڑتے وقت اپنے اور محبوبہ کے دل کی ویرانی کے سوا اور کوئی غم نہیں،

جس دن ہوا تھا کوچ دیارِ حبیب سے
میں کس قدر تھا بے سروساماں نہ پوچھئے
ہنگامِ الوداع کسی دوشِ ناز پر
کیوں کھل پڑی تھی زلفِ پریشاں نہ پوچھئے
وقتِ فراق، کاکلِ برہم کی چھاؤں میں
افسردگیٔ چہرۂ تاباں نہ پوچھئے
وقتِ سفر چھڑی تھی جو اک لمحہ پیشتر
وہ داستانِ دیدۂ جاناں نہ پوچھئے
شرمندہ ہو نہ جائے کہیں رحمتِ خدا
اس بندہ کا التفاتِ فراواں نہ پوچھئے
ہیں اب بھی جوش کو جو سہارے دیئے ہوئے
اس شوخ کے وہ عہد و پیماں نہ پوچھئے

("نوحۂ فراق" — حرف و حکایت صفحہ ۱۰۰)

موت کے آغوش میں جینے کا ساماں کیا کروں
کیا کروں اے پیچ و تابِ شامِ ہجراں کیا کروں

اب نہ نقدِ عافیت باقی، نہ توقیرِ حیات
اب خیالِ دزد و خوفِ دشمنِ جاں کیا کروں
کھا گئی ہیں راحتیں مجھ سے جدھر جاتا ہوں میں
اے مذاقِ خدمتِ عمرِ گریزاں کیا کروں
دل سے تا ذراتِ انجم کوئی شے ساکن نہیں
کیا کروں اے گردشِ گردونِ گرداں کیا کروں
سر میں اک سودا سا ہے اور وہ بھی سودا عشق کا
دل میں اک خنجر سا ہے اور وہ بھی عریاں کیا کروں
ہو چکا ہے فکرِ ننگ و نام سے فارغ دماغ
اب یہ دامن کیا کروں اب یہ گریباں کیا کروں

("دامِ زر سے پہلے خودداری" حرف و حکایت صفحہ ۸۹)

(۷)

ملیح آباد چھوڑ کر حیدر آباد میں وطن کی طرح مستقل رہ سکتے، اب حیدر آباد چھوٹا تو نئے سر سے گھر بنانا پڑا۔ جو باتیں

ملیح آباد سے وابستہ تھیں اُن سے دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ "نقشِ سحر" کا نشہ اتر چکا تھا۔ خود اپنی زندگی نئے محور کے گرد چکر کھا رہی تھی۔ بچوں کو دیہات کی زندگی پسند نہ تھی۔ زمینداری کی حالت ایسی نہ تھی کہ اس سے پیٹ بھر سکے۔ اس لئے دہلی میں قیام کر کے جنوری سنہ ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ "کلیم" جاری کیا، اور دو مجموعے "نقش و نگار" اور "شعلہ و شبنم" شائع کئے۔ پہلے نظموں کو موضوع کے اعتبار سے ترتیب دے کر مختلف جلدوں میں شائع کرانے کا خیال تھا، چنانچہ اشتہار اسی طرح دیئے گئے تھے لیکن بعد میں وہ ترتیب قائم نہ رہی۔

کلیم نے تھوڑے ہی دنوں میں اچھی خاصی مقبولیت حاصل کر لی۔ اس میں جوش نے نثر کے مضامین بھی لکھے[1]۔ نثر "روحِ ادب" کے دور میں بھی لکھی گئی تھی، لیکن اس دور کی نثر میں صرف شاعری تھی، ادبِ لطیف لکھنے کی کوشش تھی، اور اب ملکی اور ادبی مسائل، فلسفیانہ مباحث، اور سماجی حقائق پر بھی نگاہ پڑ رہی تھی۔ فطری جوش اور شدتِ احساس ان مضامین میں بھی نمایاں ہے۔ رنگینی ضرورت سے زیادہ ہے۔ استدلال پر جذباتی اندازِ نظر حاوی ہے۔ لیکن اس میں زندگی کو سمجھنے سمجھانے اور بہتری کی جانب اشارہ کرنے کی کوشش کارفرما ہے۔

دہلی کے قیام میں جوش کو ہندوستان کے متعدد سیاسی رہنماؤں سے ملنے کے مواقع ملے۔ دفتر شاہی نظام کو قریب سے دیکھنے اور آزمانے کا موقع نصیب ہوا۔ آزادی کی جدوجہد شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ نیا دستور ہندوستان پر عائد کیا جا رہا تھا۔ انتہا پسند جماعتیں ابھر رہی تھیں، انجمن ترقی پسند مصنفین وجود میں آ چکی تھی، اور ادبی افق پر نئے تارے طلوع ہو رہے تھے۔ جوش سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی شاعری کو ملک کی ترقی پذیر قوتوں سے ہم آہنگ کر دینا چاہتے تھے۔ فرض اور محبت کی جنگ میں کبھی فرض کی جیت ہوتی تھی کبھی محبت کی، اور یوں جوش کی شاعری کا کارواں طوفانوں سے کھیلتا، گلستانوں میں گلگشت کرتا، آندھیوں سے لڑتا، نسیمِ سحر کے جھونکوں میں ٹھہرتا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ نئی پود کے اکثر شعراء ان سے متاثر تھے۔ انہیں "شاعرِ انقلاب" اور "شاعرِ اعظم" کہہ کر خطاب کیا جا رہا تھا۔ عمر بھی پختہ کاری کی منزل میں تھی اس لئے خیالات میں زیادہ گہرائی نظر آتی ہے۔ عقل اور جنوں کی کش مکش بڑھتی جا رہی ہے۔ حقیقت افسانے سے دست و گریباں ہے۔ محبوبہ چونکہ دہلی ہی میں تھی، اس لئے ترانۂ بہار چھیڑتے ہیں تو یہ گیت گاتے ہیں

پھر دامنِ صبا میں ہے مے خانہ آج کل
پھر ہر نفس ہے گردشِ پیمانہ آج کل
پھر عقل میں ہے عنصرِ وحشت کی خواجگی
پھر فقر میں ہے شوکتِ شاہانہ آج کل
پھر جوش پر ہے موسمِ برنائی جمال
پھر بادہ پر ہے عشوۂ ترکانہ آج کل
پھر فرش پر ہے جلوۂ افلاک ان دنوں
پھر عرش پر ہے نعرۂ مستانہ آج کل

---

[1] ان مضامین میں سے اکثر کو یک جا کر کے "نگارستان ایجنسی، دہلی" نے "اشارات" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

پھر ہر غلام دہر ہے آقائے بحر و بر
پھر ہر کنیز شہر ہے سلطانہ آج کل
جس پر نثار کون و مکاں کی حقیقتیں
پھر کہہ رہا ہے جوش وہ افسانہ آج کل

لیکن جب انہیں دنوں "آل تیمور" کو گداگری کرتے دیکھتے تھے تو "بھکاری شہزادی" کی سی نظم لکھتے تھے۔ لوگوں کو سرگرم عمل دیکھ کر اپنے فرض کا خیال بھی آتا تھا:

جب بلاتے ہیں فرائض دردناک آواز سے
شور یا منہ پھیر لیتے ہیں حریم ناز سے
زندگی منہ دیکھنے لگتی ہے جب تلوار میں
روشنی رہتی نہیں محبوب کے رخسار میں[1]

لیکن جب عیش کی ترنگ بڑھتی تھی تو کہتے تھے:

میں نے اک دنیائے معلوم کی ہے رخ میں
دل فریب و دل نواز و دل فروز و دل نشیں
اس تڑپتے تملاتے خاکدانِ غم سے دور
اک دمکتے، جگمگاتے بزم پنہاں کے قریب
علتِ ایجادِ مرگ و زیست، جبر و اختیار
عقل کی اس بیوگی سے جس کو کچھ نسبت نہیں
خون کی گردش میں مضمر ہے جہاں ذکرِ حبیب
نبض کی جنبش میں غلطاں ہے جہاں "حبل المتیں"
کون یہ در کھٹکھٹاتا ہے مرا! پوچھو کوئی!
خیر ہو گیا اس طرف بھی آ گئے اہلِ زمیں
"آئے ہیں دنیا سے کچھ اذنِ رجوع کو حضور"
"کہہ دو واپس جائیں ملنے کی مجھے فرصت نہیں"

"دل کی دنیا" (حرف و حکایت صفحہ ۱۴۴)

جوش کی ذہنی کیفیات کی تصویر کسی ایک نظم سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ ان پر ایک وقت میں ایک جذبہ اس شدت سے طاری ہوتا ہے کہ جب تک وہ شعوری طور پر کوشش نہ کریں اُس جذبے کی پیچیدگی یا زندگی کی مجموعی کیفیت کو اس لمحے

---

[1] یہ دو شعر کسی مجموعے میں نہیں ہیں۔ میں نے انہیں دنوں (مئی سنہ ۱۹۲۷ء یا سنہ ۱۹۲۸ء میں) "تیغ دہلی" میں تین شعر "فرض اور محبت" کے عنوان سے پڑھے تھے وہ یاد رہ گئے۔

میں نہیں دیکھتے۔ اس زمانے میں دل کے پاس پاسبان عقل کو وہ نہیں آنے دینا چاہتے۔ شاعر کی ہمہ گیر شخصیت ہر چیز کا جائزہ لیتی ہے۔ لیکن ہر واقعہ اور ہر خیال کو اس کے تمام روابط اور تعلقات کی روشنی میں دیکھے بغیر صحیح فلسفیانہ نقطۂ نظر پیدا نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہ بھی حقیقت کا ایک تصور ہے کہ جو چیز جس وقت جیسی معلوم ہوتی ہے اسی طرح پیش کر دی جائے۔ لیکن حقیقت کا حکیمانہ تصور یہ ہے کہ اس کی مجموعی حیثیت کو سامنے رکھ کر نتیجہ نکالا جائے۔ اس زمانے میں جوش اپنے مشاہدہ اور مطالعہ کے بھروسے پر باریک سے باریک نقوش بنا سکتے تھے اور اس کو فخر کے ساتھ محسوس کرتے تھے:

کبھی دل فخر سے دیتا ہے آواز
کہ اک تنکے سے ہلکا آسماں ہے
کبھی فریاد کرتا ہے کہ مجھ پر
نفس کا ثقل بھی کوہ گراں ہے
کبھی ہر ذرۂ خاکی کا محکوم
کبھی شمس و قمر پر حکمراں ہے
کبھی ہے کامراں ہو کر بھی ناکام
کبھی ناکام ہو کر کامراں ہے
کبھی لطفِ خداوندی سے مغموم
کبھی جورِ بتاں سے شادماں ہے
کبھی مژگاں کی جنبش سے کہن سال
کبھی صدیوں کی کاوش سے جواں ہے
سُن اے غافل! کہ جس دل کے ہے یہ حال
وہ دل، ہم شاعروں کا آشیاں ہے
دماغوں پر کھلیں ہم کیا کہ ہم کو
وہ سمجھے گا جو دل کا رازداں ہے

"شاعر کا دل" (فکر و نشاط صفحہ ۴۲)

لیکن ضرورت اور وقت، کا احساس کچھ اور مطالبہ کرتے ہیں۔ ہر صاحب شعور کو اپنے تصورات میں یک رنگی، ہم آہنگی اور منطقی تسلسل پیدا کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ تاکہ وہ اپنے خیالات سے دوسروں کو متاثر کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جوش اپنی مزاجی انفرادیت کے باوجود سماجی یک جہتی کا ساتھ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۷ء میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کے ہندوستانی شعبے کی ایک کانفرنس الٰہ آباد میں منعقد ہوئی مجلس صدارت میں جوش بھی تھے۔ خطبۂ صدارت میں انہوں نے تفکر اور تخریب کی اہمیت پر زور دیا۔ اگرچہ اس خطبے میں ان کے عقیدۂ جبر نے انہیں بہت سی ایسی باتیں کہنے پر مجبور کیا جو یکسر متضاد اور رکیک ہیں۔ اس کا تجزیہ کہیں اور ہوگا یہاں صرف اتنا ہی بتانا مقصود ہے جس سے ان کے ذہنی ارتقا کا کوئی پیچ کھلے۔ اس خطبے میں وہ مکمل انقلاب کے ہوا

اور کچھ نہیں چاہتے۔ اُن کا خیال ہے کہ ہر طرف انقلاب کے آثار ہیں، مگر ہندوستانی انہیں دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے:

"خدارا بتاؤ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ سینۂ ہندوستان میں انقلاب کا جو سرخ شعلہ آہستہ آہستہ تھرتھرا رہا ہے، اسے ہوا دینا شروع کر دیا جائے؟ انقلاب! انقلاب! ہر شے میں انقلاب، زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب، آداب و رسوم میں انقلاب، نظریات و معتقدات میں انقلاب، مسلمات و کلیات میں انقلاب، سیاسیات، مذہبیات میں انقلاب، یکسر انقلاب، تمام تر انقلاب، اور مکمل انقلاب!"

"اشارات" (صفحہ ۶۳)

انہیں احساس ہو رہا تھا کہ "اس وقت ہندوستانی زندگی کی ضرورتیں جان و دل کی قربانی کے لئے مچلی ہوئی ہیں"۔ وہ کہہ رہے تھے "میں سردست اپنی قوم میں یہ دیکھنا نہیں چاہتا کہ دل دماغ پر غلبہ حاصل کئے رہے" کیوں کہ بھوک، بے زری، بے روزگاری، بیماری اور جہالت ایسی حقیقتیں ہیں جن سے آنکھیں نہیں چرائی جا سکتیں۔ اسی خطبۂ صدارت میں لکھتے ہیں:

"میں ایک مدت سے سنتا چلا آ رہا ہوں کہ ہر قوم کے ادیب اور شاعر انتہا درجے کے حساس، خوددار اور غیور ہوا کرتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے ہندوستان میں بھی یہی ہے تو میں اپنے شاعروں اور ادیبوں کے سامنے دو زانو ہو کر گڑگڑا اوں گا کہ خدارا اپنے ادب میں عظیم انقلاب پیدا کیجئے ہند کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو خونی گرداب کے خون آشام ہاتھوں سے چھڑا لیجئے۔ ورنہ کشتی ڈوب جائے گی اور شباب و محبت کا واسطہ اپنے ادبیات میں حیات و بیداری کا خون دوڑائیے اور وطن عزیز کے لئے دلوں کی طرح دھڑکتے ہوئے زندہ الفاظ کو جوڑ کر ایک نیا "باب البند" تیار کیجئے، جس کے سنہری اور بلند محراب کے نیچے سے زندہ کر دینے والے انقلابات کے نقرئی جلوس فوج در فوج اور قطار اندر قطار ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔ یاد رکھئے! ایک جنبش قلم ستر ہزار برہنہ تلواروں کے مقابلے میں زیادہ کارآمد آلۂ جنگ ہے"

"اشارات" (صفحہ ۶۸)

یوں انفرادی خواہشوں اور حقیقتوں میں جنگ جاری رہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوش اسے ٹھیک سے حل کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اسی کش مکش میں لذت لیتے ہوئے، کبھی احساس کی شدت اور کبھی بے حسی کی دعا کرتے۔ کبھی علم کی پیاس اور کبھی معصوم جہالتوں کی تمنا کرتے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اس دور میں جوش نے رباعیاں بھی بڑی تعداد میں لکھی ہیں، بڑی نادر اور خوب صورت، بڑی رنگین اور بصیرت افروز۔ ان میں شاعر کی ذہنی کش مکش نمایاں ہے۔

حقائق کی جستجو کا سلسلہ جاری ہے۔ جبر کی حکومت ہے اور آزادی اور عمل کی خواہش۔ "شراب" "مایۂ تربیت روح رواں" بن چکی ہے۔ اس زمانے میں جوش کے دو اور مجموعے "فکر و نشاط" اور "جنون و حکمت" شائع ہوئے۔ آخر الذکر میں صرف رباعیاں ہیں۔

جوش، دہلی، بمبئی، دھول پور، لکھنؤ اور ملیح آباد میں رہتے تھے۔ دہلی میں مرکز اور مستقر تھا۔ "کلیم" کا خیر مقدم ملک میں بہت شاندار ہوا تھا، لیکن جوش اسے تاجرانہ حیثیت سے چلانے میں ناکام رہے۔ خرچ آمدنی سے زیادہ تھا اور دہلی میں قیام ناممکن تھا۔ اس لئے پھر ملیح آباد کا رخ کیا۔ چنانچہ کلیم کو لئے ہوئے سنہ ۱۹۳۹ء میں ملیح آباد چلے آئے۔

جون سنہ ۱۹۳۸ء میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا، جس کا تذکرہ کئی حیثیتوں سے ضروری ہے۔ جوش بمبئی میں تھے۔ کئی دوست اور عزیز ساتھ تھے۔ محبوبہ بھی ہمراہ تھی۔ اندھیرا چھایا چلا تھا۔ اپالو کی سیر ہو رہی تھی، تند و تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ سمندر کی لہریں ساحل پر بڑھتی چلی آ رہی تھیں اور تماشائیوں کا ہجوم ابر و باد کی وجہ سے چھٹ رہا تھا۔ جوش اور ان کے ساتھی بھی واپس آنے کے لئے مڑے۔ محبوبہ کی زندگی شدید کش مکش کی زندگی تھی۔ وہ سب سے پیچھے رہ گئی۔ اور جیسے ہی لوگوں کی پیٹھ اُدھر سے پھری، اس نے خودکشی کی نیت سے اپنے کو سمندر میں گرا دیا۔ جوش نے مڑ کر دیکھا تو وہ موجوں کی پیچ و تاب میں آخری دفعہ ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ وہ تیرنا نہیں جانتے لیکن ایک لمحہ کے اندر وہ بھی سمندر میں کود پڑے، اور انہیں خود خبر نہیں کہ کس طرح انہوں نے محبوبہ کو بچا لیا۔ اس حادثے کو یاد رکھنے کے لئے جوش نے کئی نظمیں لکھیں۔ جن میں سے تین نظمیں "تو اگر واپس نہ آتی" "نیا امرت" "مخاطبۂ بحر کی خدمت میں" ان کے مجموعے "آیات و نغمات" میں شامل ہیں۔ تینوں نظمیں غیر معمولی شدتِ احساس اور رنگینی کی حامل ہیں۔ ان نظموں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جوش سمندر میں اس لئے کود پڑے تھے کہ یا تو محبوبہ کو بچا لیں گے یا پھر خود بھی دامن آب میں سو رہیں گے :

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک وہ واں اٹھتا بطون خاک سے
ہاتھ آ جاتا اگر تیرا نہ میرے ہات میں
دل پہ کیا کچھ بیت جاتی اس اندھیری رات میں
اف وہ طوفاں وہ بھیانک تیرگی، وہ ابر و باد
وہ ہوائے تند باراں وہ خروش برق و رعد
دفعتاً وہ روشنی کے سلسلے کا ٹوٹنا
وہ گھٹاؤں کی گرج سے نبض ساحل چھوٹنا
وہ اپالو کے کلیجے کی مچلتی ۔۔ مان سون
وہ سمندر کے تھپیڑے وہ ہواؤں کا جنون
اور اس طوفان میں اے زندگی کی روشنی!
کود پڑنا وہ سمندر میں ترا یک بارگی

۔۔۔۔۔۔

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بلوچ خاک سے
اس دلِ سوزاں میں آتے اس بلا کے زلزلے
آسماں روتا، زمیں ہلتی، ستارے کانپتے
موت اور پھر موت تیری، الحفیظ و الاماں
ہڈیوں سے آنچ اٹھتی اور بالوں سے دھواں
لیکن اک لمحے کے بعد اے پیکرِ حسن و حیات
جوش کو بھی کاوشِ ہستی سے مل جاتی نجات
پہلے ہوتا اک تلاطم، ایک طوفاں، ایک جوش
مبداؤں تو اور میں اور بحرِ بے پایاں کا خروش
اتصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں
آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب میں

......

بحر کے سینے کو جب طوفان میں لاتی ہوا
پے بہ پے آتی ہمارے گنگنانے کی صدا
جب گھٹائیں رقص کرتیں اور پپیہے کوکتے
نور میں لپٹے ہوئے دونوں ابھرتے بحر سے
رات جب بھیگ جاتی اور جھک جاتا قمر
سیر کرتے روز ہم باہیں گلے میں ڈال کر
چھیڑتا جب کوئی ساحل پر ہماری داستاں
پڑنے لگتیں بحر پر دھندلی سی دو پرچھائیاں
زندہ رہتے حشر تک عشق کے پرستاروں میں ہم
سانس لیتے سازِ حسن و عشق کے تاروں میں ہم
وقف ہو جاتے محبت کے فسانے کے لئے
سرد ہو کر آگ بن جاتے زمانے کے لئے

"تو اگر واپس نہ آتی" (آیات و نغمات صفحہ ۵۹)

کامیاب محبت کے انتہائی نقطۂ عروج پر پہنچ کر موت کی خواہش احساسِ محبت کا گراں قدر عطیہ ہے۔ یہ محض تخیل پرستی یا رومانیت نہیں ہے بلکہ عالمِ وصال میں ابدی زندگی پا لینے، زندۂ جاوید بن جانے کی آرزو کی مظہر ہے۔ یہ نظم جوش کے کردار کے جذباتی پہلو پر اتنی تیز روشنی ڈالتی ہے جس کو واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۸)

جوش ملیح آباد میں رہنے لگے۔ قدیم صحبتیں برہم ہو چکی تھیں، پرانی زندگی الوداع کہہ چکی تھی۔ شعر و شاعری اور مطالعہ میں وقت صرف ہوتا تھا۔ چند قدموں کے فاصلے پر لکھنؤ تھا جس کی گلیاں دل میں بسی ہوئی تھیں۔ "کلیم" بند کر چکے تھے۔ نظموں کا ایک اور مجموعہ "حرف و حکایت" شائع کیا تھا۔ حیدرآباد کی پنشن، پٹیالے سے ایک وظیفہ، کتابوں کی آمدنی، اور تھوڑی بہت زمینداری جس کی حالت ابتر تھی، یہ آمدنی کے ذرائع تھے۔ زندگی کچھ خاموش سی تھی کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جوش کی سیاسی شاعری سامراج دشمنی اور انگریز دشمنی کے جذبات سے مملو تھی۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں وہ ایک طنزیہ نظم "وفاداران ازل کا پیام شہنشاہِ ہند کے نام" لکھ چکے تھے۔

اس درمیان میں انگریزوں نے ہندوستانیوں کی آزادی کے مطالبات کو بار بار ٹھکرایا تھا، ایک ایسا دستور اساسی ان پر مسلط کیا تھا جسے ملک کی ہر سیاسی جماعت نے ناپسند کیا تھا۔ اب جو جنگ شروع ہوئی تو جذباتی ہندوستانیوں کو فطری طور پر خوشی ہوئی کہ انگریز مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ شہنشاہیتیں خوفناک اژدہوں کی طرح گتھ گئیں۔ انگریز نے اپنے غلام ہندوستان سے بھی میدان میں اترنے کو کہا۔

جوش نے یوپی کے گورنر سر ہارس ہیلٹ کی وہ اپیل پڑھی جس میں یوپی کے باشندوں سے جنگ میں جان و مال سے مدد کرنے کی خواہش ظاہر کی گئی تھی، اور یہ کہا گیا تھا کہ ہٹلر نے اپنے درندوں کو ابھار دیا ہے کہ وہ دنیا سے تہذیب اور نظام عدل کا خاتمہ کر دیں۔ ان خوں خوار درندوں کو روکنے کی کوشش ہر شخص کا انسانی فریضہ ہے۔ جوش کی سامراج دشمنی اور قومی جذبات کو ایسی چوٹ لگی کہ انہوں نے چند لمحوں کے اندر اپنی مشہور نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے"[1] لکھ ڈالی، جو شائع ہو کر ضبط ہو گئی۔

کچھ دنوں کے بعد جوش نے لکھنؤ میں مستقل قیام اختیار کیا۔ اپنی طویل نظم "حرفِ آخر" کا خاکہ ملیح آباد ہی میں بنا چکے تھے۔ کچھ اشعار لکھ بھی لئے تھے، اور اس کے مکمل کرنے میں اب انہماک تھا۔ گویا پانچ چھ ہزار اشعار کی نظم تھوڑے ہی دنوں میں ختم کر لیں گے۔ کبھی کبھی رومانی نظمیں اور رباعیاں بھی لکھتے تھے۔ اپنے پروگرام ("پروگرام" نقش و نگار) کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے۔ ادبی جلسوں اور صحبتوں میں بھی شریک ہوتے۔ رندانہ محفلوں میں بھی

---

[1] جوش نے یہ نظم ملیح آباد میں لکھی، اور دو تین روز بعد لکھنؤ آئے۔ سب سے پہلے راقم الحروف کے غریب خانے پر تشریف لائے، اور کہا "کل دس منٹ میں ایک نظم لکھی ہے، سن لو۔" میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ پوری نظم سنائی۔ کچھ جنگ کے متعلق باتیں کیں۔ چلنے لگے تو میں نے کہا "یہ بھلا شائع کہاں ہو سکے گی۔ ایک نقل میں رکھ لوں؟" کاغذ مجھے دے دیا۔ اس طرح لکھی ہوئی تھی کہ میں نے جوش ہی کی مدد سے اسے نقل کیا۔ میرے یہاں سے "نیا ادب" کے دفتر پہنچے۔ سردار جعفری نے وہ نظم لے کر "نیا ادب" میں چھاپ دی۔ بعد میں وہ نمبر ضبط ہو گیا۔ پھر اسے "آزادی کی نظمیں" نامی مجموعے میں نقل کیا گیا، وہ کتاب بھی ضبط ہو گئی۔ یہ نظم جوش کے کسی مجموعے میں بھی نہیں ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد جوش کے یہاں تلاشی ہوئی۔ "تلاشی" پر ایک نظم لکھی، وہ بھی کسی مجموعے میں نہیں ہے۔ انہیں دنوں کسی نے "ہٹلر اعظم سے خطاب" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو جوش سے منسوب کی گئی، وہ نظم جوش کی نہیں ہے۔

عزیزوں اور دوستوں کے یہاں بھی جاتے اور شہر سے باہر بھی۔ شام ہوتے ہی پیمانہ بکف طلوع ہو جاتے۔ مختلف مقامات پر نشستیں ہوتیں، وہاں مخصوص احباب ہوتے۔ اور کبھی شعر شاعری ہوتی، کبھی باتوں میں وقت کٹتا، ان صحبتوں میں زیادہ تر جوش سکہ بردار ہوتے تھے، جو کبھی کبھی امراء کے دربار کی کیفیت پیدا کر دیتے تھے۔ گفتگو، اندازِ گفتگو، لطائف و ظرائف، نشست و برخاست کی یکسانیت کبھی کبھی ان لوگوں کو اکتا بھی دیتی تھی جو محفل میں شریک ہو کر باہوش تماشائی بھی بن سکتے تھے۔

"حرف آخر" کے لئے جوش نے مطالعہ کی رفتار اور نوعیت تبدیل کر دی تھی۔ مذہب، فلسفہ اور سائنس کی کتابیں خاص طور پر پڑھ رہے تھے۔ عقیدۂ جبر کی روشنی میں نظمیں ہی نہیں لکھ رہے تھے، بلکہ اس کی تبلیغ بھی کر رہے تھے۔ جنگ نے ایک نئی کروٹ لی، جرمنی نے روس پر حملہ کر کے لڑائی کی شکل بدل دی تھی۔ دنیا کے ترقی پسندوں، جمہوریت پرستوں، اور آزادی کے ہوا خواہوں میں ایک بڑا طبقہ ایسا تھا جس کے خیال میں اب جنگ سامراجی طاقتوں کے درمیان نہ تھی، بلکہ ترقی اور رجعت کی قدریں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں۔ ایک طرف سوویت روس، انگلستان، چین، امریکہ اور ان تمام مفتوحہ قوموں کی روحیں تھیں جنہیں ہٹلر اپنے قدموں کے نیچے دباتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف جرمنی، اٹلی، جاپان اور مفتوحہ ممالک کے زر خرید غلام تھے۔ یہ ایسی خونریز کش مکش تھی جس میں تخیل پرست اور جذباتی انسان کے لئے فیصلہ کرنا آسان نہ تھا۔ جوش کی انگریز دشمنی اتنی شدید تھی کہ وہ کسی نتیجے پر نہ پہونچ سکے۔

جاپان نے بھی اپنا خونی کھیل شروع کر دیا تھا۔ ملایا، برما، انڈوچائنا، انڈونیشیا، سب فتح ہو چکے تھے۔ اب جاپانی فوجیں ہندوستان میں داخل ہونا چاہتی تھیں۔ جوش جاپان کی اس فوجی فاشزم سے متنفر تھے۔ لیکن چونکہ جاپان انگریزوں کا دشمن تھا، اس لئے جوش پھر خاموش رہے۔ یہاں تک کہ اگست سنہ ۱۹۴۲ء میں انگریزی سامراج نے ہندوستان پر بھرپور وار کر دیا۔ جب ہندوستان کے سیاسی رہنما اختلافات کے باوجود حالات کی رفتار، اور واقعات کے دباؤ کو پیش نظر رکھ کر انگریزوں سے قومی حکومت کا مطالبہ کر رہے تھے، اور آزادی کا اعلان چاہتے تھے۔ تاکہ وہ ہندوستانیوں کو من حیث القوم جنگ میں شریک کر کے جاپان کا مقابلہ کر سکیں۔ انگریزی حکومت نے انہیں خوف زدہ کرنے کے لئے جیلوں میں بند کر دیا۔ عوام غصے سے اندھے ہو گئے، ان میں فاشزم سے نفرت کا جو جذبہ ہوا تھا وہ پھر پیچھے ہٹ گیا۔ اور انہوں نے اپنے خالی ہاتھوں سے انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہا۔ انگریزی حکومت نے انقلابیوں پر وہ مظالم کئے جن کو تاریخ کبھی نہ بھولے گی۔ سماجی، تاریخی اور سیاسی مسائل میں قوتِ فیصلہ کے لئے اس سے اہم آزمائش کے مواقع کم آئے ہوں گے۔ ایک شاعر کی روح جو ہر چیز سے روشنی حاصل کرنے کی متمنی تھی، اس پیچیدگی میں راستہ تلاش نہ کر سکی۔ جوش بھی گونگے بن گئے اور فنون و حکمت کی پرانی آویزش جو ہزار ہا بار دل کے تاروں کو چھیڑ چکی تھی پھر دل میں جاگزیں ہوئی۔ اس زمانے میں جوش نے کئی نظمیں ایسی لکھی ہیں جو تذبذب کا پتہ دیتی ہیں۔ کبھی مایوسی ہے کبھی امید۔ کبھی تاریکی ہے کبھی روشنی۔ کبھی فلسفی بن کر درسِ حکمت دینے کا شوق ہے کبھی رند بن کر سب کچھ جام و سبو میں غرق کر دینے کا حوصلہ۔ کبھی انسان ظالم اور جاہل نظر آتا ہے کبھی فاتح کائنات دکھائی دیتا ہے۔

پروفیسر سید احتشام حسین

اس زمانے کی اہم نظمیں "نظامِ نو"، "آدمی نامہ"، "لاعلاج تاخیر"، "شش و پنج" ہیں۔ ان نظموں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاعر غیر معمولی ذہنی کرب میں مبتلا ہے لیکن اسے ناقابلِ شکست یقین ہے کہ زندگی رُو بہ ترقی ہے ایک بہتر دور آئے گا، اور انسان فطرت کا غلام نہ رہے گا، بلکہ آقا بن جائے گا۔ جبر کے ساتھ ساتھ یہ اُمید میل نہیں کھاتی، لیکن اس کا تجزیہ کہیں اور ہوگا۔ بہتر زندگی، بہتر مادی زندگی کا تصورِ ارتقاء کے جس عقیدے پر مبنی ہے، جوش نے اس زمانے میں اس کا مطالعہ خاص طور پر کیا تھا۔

انسان وہ کلی ہے جو اب تک کھلی نہیں
وہ شاخ ہے صبا سے جو اب تک ہلی نہیں
پوشاک ہے یہ وہ جو ابھی تک سِلی نہیں
کنجی ہنوز عقل کی اس کو ملی نہیں
جو آج تک ہے بند وہ تالا ہے آدمی

اب تک ہے بزمِ جہل میں ناداں ڈٹا ہوا
اب تک ہے علم و عقل و ہنر میں گھٹا ہوا
اب تک لباسِ ذہن و ذکا ہے پھٹا ہوا
اب تک ہے خاکِ تیرہ میں انساں اَٹا ہوا
ہر چند خاکِ تیرہ سے مالا ہے آدمی!

پردل کے جو آج بھی دن ہے سیاہ رات
کیا غم اگر زمیں پہ روا ہے درِ ممات
یعنی بہ حکمِ دہر و بہ فرمانِ کائنات
انساں کو آج روند رہے ہیں جو حادثات
کل اُن کو جوش روندنے والا ہے آدمی

"آدمی نامہ" (عرش و فرش صفحہ ۱۵)

کھیل ہاں اے نوعِ انساں ان بلاؤں سے کھیل
آج اگر تو ظلمتوں میں پا بجولاں ہے تو کیا
مسکرانے کے لئے بے چین ہے صبحِ وطن
اور چند ے ظلمتِ شامِ غریباں ہے تو کیا
مٹھیوں میں بھر کے افشاں چل چکا ہے انقلاب

ابر غم زلفِ جہاں پر بال جنباں ہے تو کیا

"نظام نو" (عرش و فرش صفحہ ۵)

انہیں دنوں میں جوش "شالیمار پکچرس" پونا میں شامل ہو گئے۔ پونا اور بمبئی کے قیام میں جوش کو ہندوستانی سیاسیات پر نئے سرے سے غور کرنے کا موقع ملا۔

ہندوستان کے زیادہ تر رہنما جیلوں میں بند تھے۔ جو باہر تھے وہ پہلے دل سے فاشزم کو رجعت پسند تحریک بتا رہے تھے۔ کچھ ترقی پسند البتہ فاشزم اور سامراج دونوں کے گلے گھونٹ دینے کی تدبیریں بتا رہے تھے۔ اور ہندوستانی سیاست کی گتھیوں کو بین الاقوامی حالات کے پس منظر میں حل کرنے میں کوشاں تھے۔ جوش نے بھی اس نقطۂ خیال کو تسلیم کیا، اور جب مئی سنہ ۱۹۴۳ء میں بمبئی کی "انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس" میں شریک ہوئے تو تذبذب قریب قریب دور ہو چکا تھا۔ انہوں نے (ساغر نظامی کے ساتھ) جو بیان دیا۔ وہ ان کے خیالات کی واضح تصویر ہے۔ اس بیان میں جوش نے واضح طور پر ہندوستان کے لئے ایک اشتراکی نظام کا خیال ظاہر کیا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد، قومی حکومت، آزادی، فاشزم کا استیصال، اور نئے ہندوستان کی تعمیر اس بیان کے مرکزی خیالات ہیں۔

کہتے ہیں:-

> "ہمارے نزدیک ان حالات میں ملک کے تمام ادیبوں کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام ہندوستانی قوم کو موجودہ خطرات سے آگاہ کریں۔ انہیں اتحاد کے لئے اکسائیں۔ اگر ہم متحد ہو سکتے ہیں تو کامیابی کا سہرا ہمارے سر رہے گا: اور وہ عروسِ آزادی جس کا ہم صدیوں سے خواب دیکھ رہے ہیں ہمیں حاصل ہو جائے گی اور ہم دنیا کی متحدہ اقوام کے ساتھ ایک آزاد حیثیت سے اس نئی دنیا کی تعمیر میں حصہ لے سکیں گے جو فسطائی بربریت کی شکست اور سامراج کی بیخ کنی کے بعد معرضِ وجود میں آئے گی۔"

"ایشیا" (پونا) مئی جون سنہ ۱۹۴۳ء

اشتراکی فلسفہ ہندوستان کی سرزمین میں جڑ پکڑتا جاتا تھا۔ اس لئے سارے رجعت پسند شعوری یا غیر شعوری طور پر اس طوفان کو روکنے کی تدبیروں میں لگ گئے۔ یہ روشنی بمبئی میں پھوٹ رہی تھی اس لئے وہیں اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔

کچھ لوگوں نے "انجمن اصلاح ادب" قائم کر کے ترقی پسندی کی مخالفت میں ۶ راگست سنہ ۱۹۴۳ء کو ایک جلسہ کیا جس میں بزعم خود ترقی پسندوں کے گمراہ کن ادبی رجحانات سے بیزاری کا اعلان کیا گیا۔ جوش ادبی تحریکات کی بنیادوں سے اس قدر واقف ہو چکے تھے کہ انہوں نے فوراً اس کانفرنس کی تجاویز کا تجزیہ کیا، اور ایک دلچسپ طویل مضمون "ادب اور احتساب" کے عنوان سے لکھا جو مختلف رسائل میں شائع ہوا۔

یہ مضمون جوش کے ذہنی ارتقاء کی ایک خاص منزل کا نشان بنا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے ایک وکیل کی طرح ترقی پسند ادب کی حمایت کی۔ رجعت پسندی کسی لباس میں بھی ہو، جوش اس زمانے میں اس کی مخالفت

ضرور کرتے تھے، ہاں جہاں ان کا شعور ان کی خیال پرستی کا پورا ساتھ نہیں دیتا تھا، وہاں وہ عقیدے کی گود میں گر جاتے تھے۔

اس زمانے میں جوش اچھے برے فلمی گیت لکھ رہے تھے۔ نظمیں کم اور رباعیاں زیادہ لکھتے تھے۔ ایک نئی الجھن یہ پیدا ہو گئی تھی کہ جوش کی ننہالی جاگیر، اُن کے ماموں کے لاولد انتقال کر جانے کی وجہ سے لاوارث پڑی تھی۔ جوش کے مشیروں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہی اس کے وارث ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جوش کچھ دنوں تک دھول پور بھی آتے جاتے رہے۔ لیکن اس مہم میں انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے اثرات ان کی بعض رباعیوں (سنبل و سلاسل صفحہ ۲۵۶) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اشتراکی اثرات ویسے تو جوش کی نہ جانے کتنی نظموں میں نمایاں ہیں۔ لیکن اسی سال یعنی سنہ ۱۹۴۴ء میں جوش نے کارل مارکس کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ؎

السلام اے مارکس اے دانندۂ راز
اے مریضِ انسانیت کے چارہ ساز
نخلِ خوش حالی کی بیخ و بن ہے تو
عقدہ ہائے زیست کا ناخن ہے تو
مانتیں تو میں اگر تیرا نظام
آج تلواریں نہ ہوتیں بے نیام
دشمنِ پیمانۂ پست و بلند
حامیِ بے چارگانِ دردمند
منکرِ دارائیِ عرشِ بریں
اولیں پیغمبرِ فرشِ زمیں
ہند را آتش بہ جامے وادۂ
پائے شل را ہم خرامے دادۂ

(کارل مارکس، سنبل و سلاسل صفحہ ۱۵۰)

سنہ ۱۹۴۵ء کے وسط میں دوسری جنگِ عظیم ختم ہوئی، اور ان مصیبتوں کا آغاز ہوا جو جنگ کے جلو میں آتی ہیں یعنی اقتصادی اور معاشی بحران اور مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ۔ لیکن بہرحال جنگ کے خاتمے نے یہ تو سوچنے کا موقع دیا کہ آئندہ انسانی مفاد کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے!

سان فرانسسکو کانفرنس میں اقوامِ متحدہ نے آنے والی دنیا کا خاکہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ غلام ہندوستان کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ لیکن یہ ہندوستان کے نمائندے نہیں حکومتِ برطانیہ کے نمائندے تھے۔ جوش نے بھی اسے محسوس کیا اور چھوٹی سی طنزیہ نظم لکھی۔

ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ بین الاقوامی مسئلہ بن چکا تھا۔ اس لئے انگلستان میں جیسے ہی لیبر حکومت برسرِ اقتدار

آئی، اسے اس مسئلے کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

انگریزی سامراج نے سنہ ۱۸۵۷ء سے دوسری جنگ عظیم تک کی مدت میں ہندوستان کی آزادی اور اصلاحات کے متعلق بہت سے وعدے کئے تھے، اس لئے عام طور پر اس کی کسی پیشکش کو سنجیدہ حلقوں میں اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ ہر وعدے میں کوئی سیاسی پیچ مضمر ہوتا تھا۔ کوئی ایسا پہلو ہوتا تھا جس سے فرقہ وارانہ تعلقات خراب ہوں اور ترقی کی قوتوں پر چوٹ پڑے۔ لیکن لڑائی نے بین الاقوامی حالات بدل دیئے تھے۔ اور لیبر گورنمنٹ کو اپنی کیبنٹ کے تین ممبر ہندوستان بھیجنے پڑے۔ ان کی طویل گفت و شنید اور پرانے تجربات کی بنا پر لوگوں نے یہی فیصلہ کیا کہ یہ وقت گذاری ہے۔ چنانچہ جوش نے بھی ان کے جال سے بچنے کی تلقین کی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کی کشیدگی انتہا کو پہونچ چکی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دونوں جماعتیں کسی بات پر متحد نہ ہوں گی۔ ہر سوال ہندو مسلم مناقشہ کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ یہ تو معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ہو کر رہے گا لیکن مستقبل کا خاکہ واضح نہ تھا۔ زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوششیں ہو رہی تھیں، لیکن سانچہ تیار نہیں ہو رہا تھا۔ تہذیبی، مذہبی، لسانی، سیاسی، اقتصادی، کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو عقل، سیاسی سوجھ بوجھ۔ رواداری کا مطالبہ کرتا ہو اور ان میں سے کسی پہلو کو جذبات سے الگ ہو کر حل کرنے کی کوشش نہ ہندو رہنما کر رہے تھے نہ مسلمان۔ لیکن جوش ایک شاعر رہنما کی حیثیت سے اتحاد، یکجہتی، رواداری کی تلقین کر رہے تھے:-

اُٹھو اے ندیم کہ رنگِ جہاں بدل ڈالیں
زمیں کو تازہ کریں، آسماں بدل ڈالیں
نظامِ وحدتِ اقوام کا ہے یہ منشور
کہ یہ تصورِ سود و زیاں بدل ڈالیں
یہ ولولہ ہے تو آ سب سے پیشتر اے دوست
مزاجِ مملکتِ ہندوستاں بدل ڈالیں

"اٹھو اے ندیم" (رامش و رنگ صفحہ ۸)

نوخیزانِ کمیونسٹ پارٹی سے کہہ رہے تھے:-

غرق ہو جائے گی شیخ و برہمن کی برہمی
جوش میں امواجِ اخوت کو رواں ہونے تو دو
تم نے کاوش سے بنایا ہے جو یہ کوہِ گراں
اک نفس ٹھہرو ذرا آتش فشاں ہونے تو دو

"لیلائے آزادی" کو دلہن بنا کر یوں پیش کیا تھا:

گوش بر آواز ہیں تو دار دانِ انجمن
زحمتِ یک حرفِ تازہ ولے بہتِ شیریں سخن
اذنِ تبلیغِ محبت دے نگاہِ ناز کو

گامزن ہیں جادۂ نفرت پہ شیخ و برہمن
دستخط کر دے جدید آئین کے فرمان پر
یہ ہے قرطاس و قلم اے ناسخِ شرعِ کہن
ٹوٹ جائے سبحہ و زنّار کا بندِ گراں
کھول دے ہاں دوش پر زلفِ شکن اندر شکن

لیلائے آزادی سے" (سنبل و سلاسل صفحہ ۱۲۶)

سنہ ۱۹۴۵ء کے آخر میں جوش نے ایک اہم نظم "وقت کی آواز" لکھی جو اُن کے اس وقت کے خیالات کا پتہ دیتی ہے۔ بہت سے محبانِ وطن کا خیال تھا کہ ہندو مسلمان مل کر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کریں گے۔ لیکن بدقسمتی سے کانگریس اور لیگ کے رہنما "کیبنٹ مشن" ہی سے آس لگائے بیٹھے تھے۔ اپنی نظم "تشکیکی فریب" میں جوش نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس زمانے میں جوش نے زیادہ تر رباعیاں لکھی ہیں جن میں اپنے خیال میں وہ حیات کی عقدہ کشائی کر رہے تھے لیکن ان میں صرف فلسفیانہ اشارے ہیں، جن میں کوئی مخصوص ترتیب اور نظم نہیں ہے۔ بس جہاں آزادی اور مستقبل کا سوال آتا ہے وہاں جوش کے خیالات میں وہی ابتدائی گرمی اور امید نظر آجاتی ہے۔
مارچ سنہ ۱۹۴۶ء میں "مستقبلِ ہندوستان" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں جوش کی فکری روایت اور تسلسل کا پتہ چلتا ہے ؎

کچھ ایسا آج گردوں کا سماں معلوم ہوتا ہے
کہ عکسِ آتشِ رطلِ گراں معلوم ہوتا ہے
یہ کس نے چونک کر انگڑائی لی ہے آسمانوں پر
زمیں کا ذرہ ذرہ پرفشاں معلوم ہوتا ہے
اٹھایا ہے یہ کس نے جھٹ پٹے کا طرفہ آئینہ
تبسم کاروانِ در کاروان معلوم ہوتا ہے
بحمد اللہ کہ جوش اس صبحِ نو کی تازہ کاری میں
مجھے مستقبلِ ہندوستاں معلوم ہوتا ہے

"مستقبلِ ہندوستان" (سنبل و سلاسل صفحہ ۱۳۲)

یوں جوش کبھی ہندوستان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوئے۔ لیکن وہ ہندوستانی رہنماؤں کے رویہ کی برابر تنقید کرتے اور انہیں گویا یہ بتلاتے رہے کہ ہندوستان کا مستقبل انہی کے ہاتھوں سنور سکتا ہے۔ بخشی ہوئی نہیں چھینی ہوئی آزادی حقیقی آزادی کہی جا سکتی ہے۔ اسی لئے جب انگریزی سامراج کی بخشی ہوئی عارضی "قومی حکومت" نے حلف وفاداری اٹھایا تو جوش کی روح زخمی ہو گئی۔ جن لوگوں نے انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دینے کی قسم کھائی تھی، وہی انگریزی حکومت سے وفادار رہنے کی قسم کھا رہے تھے۔ اس کی سیاسی نوعیت کیا تھی، اس مفاہمت کا

کیا مقصد تھا، جوش کو اس سے سروکار نہیں، وہ تو یہ دیکھ رہے تھے کہ رہنماؤں کا کردار بدل گیا ہے۔ باغی وفادار بن رہے ہیں۔ تاج و تخت کو ٹھکرانے والے تاج و تخت کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ "سنبل و سلاسل" میں اُن کی نظم "عارضی حکومت کے حلفِ وفاداری پر دو نعرے" میں نہ صرف حیرت بلکہ غم و غصہ کا وہی جذباتی طوفان بہہ رہا ہے، جو جوش کی خصوصیت ہے۔

(۹)

پھر ہندوستان تقسیم ہوکر آزاد ہوا۔ خون کا جو خراج برطانوی طاقت سے جنگ کر کے دیا جاتا، وہ آخرکار اپنوں ہی کو دینا پڑا۔ لیکن خون کا اس طرح بہنا عزت اور بہادری کی نہیں، بزدلی، وحشت اور انسان دشمنی کی نشانی تھا، چنانچہ جوش نے جی کھول کر مذہب کے نام پر دکھائی ہوئی دلیری اور جواں مردی کو اپنے تیروں کا نشانہ بنایا ہے۔ آزادی کو انہوں نے دیوی بنا کر پوجا تھا، جب وہ آئی تو جوش نے بھی خوشی میں اپنائے وطن کا ساتھ دیا۔ لیکن جہاں آزادی کی خوشی میں یہ نعرہ لگایا:

وطن کے روئے پاک پر ہے آب و رنگِ سروری
قلندروں کے جام میں ہے بادۂ تونگری
شکوہ بحرِ ہند کا، ہمالیہ کی برتری
وطن کے طول و عرض کی پیمبری و داوری

ہجوم در ہجوم ہے، قطار در قطار ہے
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے اٹھو کہ نو بہار ہے

وہیں آزادی کے پردے میں چھپی ہوئی قیصریت کو بھی دیکھا:

قتالِ خون و جنگ ہے، جنونِ جبر و قہر ہے
گرج ہے بات بات میں فسادِ شہر شہر ہے
فضا پہ رقصِ مرگ ہے زمیں پہ موجِ زہر ہے
سیاہیوں کا زور ہے تباہیوں کی لہر ہے

کماں میں تیر حرب ہے کمیں میں شہریار ہے
خزاں کہیں گئے پھر گئے، اگر یہی بہار ہے

یہ لغزشیں یہ رشوتیں یہ بگڑیاں یہ چوریاں
یہ شرمناک چوریاں اور ان پہ سینہ زوریاں
سبک گراں فروشیاں، ذلیل نفع خوریاں

ادھر خلا ہے بھوک کا، اُدھر بھری ہیں بوریاں

نہ پیٹ میں نوالہ ہے، نہ تن پہ ایک تار ہے
خزاں کہیں گے پھر اسے، اگرچہ یہ بہار ہے

حقیقت کی اس تصویر نے انہیں بسمل نہیں کیا، بلکہ آزادی اور بدحالی کے تضاد میں انھوں نے وہ راستہ دیکھا۔ جو محض ایک رومانیت پسند نہیں، باعمل حقیقت پرست بھی دیکھتا ہے۔ سیاسی آزادی مل گئی ہے اب اسے حقیقی، معاشی اور عوامی آزادی بنانا خود ہندوستان کے بسنے والوں کے ہاتھ میں ہے۔

اٹھو وہ پردہ کھل گیا، وہ منزلِ فراز کا
وہ غزنوی کے مقبرے میں دیا جلا ایاز کا
مزا ملا وہ عقدہائے گیسوئے دراز کا
چمن پہ رنگ چھا گیا وہ چشمِ نیم باز کا

رقیب غم نصیب ہے، حبیب غم گسار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے

اٹھو کہ اس زمین کو ہم آسماں بنائیں گے
عمارتوں کو پھونک کر، امارتوں کو ڈھائیں گے
نشیب کو ابھار کر، فراز کو جھکائیں گے
سفینۂ بشر کو رہِ غرور سے چلائیں گے

اگرچہ اپنے گرد و پیش آج بھی غبار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے

"ترانۂ آزادیِ وطن" (سرود و خروش صفحہ ۲۳۱)

جوش کو یہ آزادی مکمل نہیں معلوم ہوتی کیونکہ بھوک اور فاقے میں بہت کچھ رنگ بکھرا تھا۔ ایک اشتراکی سماج کی آرزو اُن کے دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ آزادی بتدریج ہندوستان ہی کو ایک ترقی پسند جمہوریت میں تبدیل نہ کردے بلکہ اس انسانی قوم کی تعمیر کرے جس کا کوئی دین اور مذہب سوا انسان ہونے کے نہ ہو۔
آزادی کے بعد نہ صرف آزادی کا احساس، یہ احساس یا تو ذہنی حیثیت سے پریشان حال عوام کرسکتے ہیں یا ایسے خوابوں کو چکنا چور ہوتے ہوئے دیکھنے والے ادیب اور شاعر۔ چنانچہ جوش نے اپنی اس دور کی نظموں میں اس کی طرف بار بار اشارے کئے ہیں۔ ہندو مسلم فسادات پر جوش نے ہمیشہ زہر اگلا ہے۔ تازہ لہو اگلن اور طنز آمیز نظمیں لکھی ہیں، اور تقسیم ہند کے بعد کے خونیں فسادات پر تو ان کا خون کھول اٹھا ہے۔ مہاتما گاندھی کا قتل، آزادی کے بعد کا سب سے

اہم واقعہ ہے۔ جس نے نہ صرف ہندوستانی قوم کا سر نیچا کر دیا، بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ قومی زندگی کس منزل میں ہے۔ جوش نے انہیں ہند کے شاہ غیباں "کہہ کر مخاطب کیا اور ایک اچھی خاصی طویل نظم میں انہیں وہ خراج عقیدت پیش کیا جو ان کے قومی جذبات سے ہم آہنگ تھا۔ ان کے شاہدے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کا کوئی اہم پہلو جس سے عام انسانی جذبات میں ہیجان پیدا ہو، ان کی کمند نظر سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ چنانچہ گرانی کی ہولناکی، رشوت کی گرم بازاری، نشہ بندی کی سرکاری مہم، رجعت پرستوں کی اردو دشمنی، آزادی خیال پر پابندی، کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس نے جوش کے احساس شاعرانہ کو بیدار نہ کیا ہو۔ اور جس کے اظہار میں انہوں نے بے باکی اور آزادی خیال سے کام نہ لیا ہو۔

اسی زمانے میں جوش ہندوستان کی مرکزی حکومت کی طرف سے نکلنے والے اردو رسالہ "آج کل" (دہلی) کے مدیر اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ اور ایک حیثیت سے سرکاری ملازمت کی زنجیر پاؤں میں پڑ گئی۔ اس نے ان کے افکار و خیالات کو کسی حد تک مصالح کا پابند ضرور بنا دیا۔ لیکن اس کے باوجود اسی عہد میں انہوں نے کچھ ایسی نظمیں بھی لکھیں جن میں ان کی پختہ کار شاعری کے آب و رنگ اور ان کی شخصیت کے خط و خال کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ کچھ نظمیں ایسی ہیں جن میں بار ہا کی کہی ہوئی عقل آمیز باتیں دہرائی گئی ہیں۔ لیکن چند ایسی بھی ہیں جن میں بھی کھول کر ملکی حکومت کی استعمارانہ ذہنیت اور اس کی غیر جمہوری سیاست کا پردہ چاک کیا ہے۔ ترقی پسند قوتوں کو مجتمع ہو کر ایک ایسا زبردست اور آخری طوفان اٹھانے کی دعوت دی ہے جو ہمیشہ کے لئے نا انصافی، جبر، استحصال اور رجعت پرستی کا خاتمہ کر دے۔ "ماتم آزادی" جو سنہ ۱۹۴۷ء میں لکھی گئی تھی لیکن جسے انہوں نے بہت زمانے احتیاطاً کئی سال تک شائع نہیں کیا، ایسے ہی خیالات کی مظہر ہے

خاموش ہیں طیور، چمن سر بسر درگلو
شاخیں فسردہ، خوشۂ انگور زرد رو
پھولوں کو اب نہیں ہے تمنائے رنگ و بو
اب تو آشیاں میں قفس کی ہے آرزو

اب رسنے گر بہار کا منہ چومنے لگے
آئیں بہار آندھیاں تو جھوم جھومنے لگے

سرو سہی، نہ ساز، نہ بلبل، نہ سبزہ زار
بلبل، نہ باغباں، نہ بہاراں نہ برگ و بار
جھولا، نہ جام جم، نہ جوانی، نہ جوئے یار
گلشن، نہ گل بدن، نہ گلابی، نہ گل عذار

اب بوئے گل نہ باد صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

منہ پاٹ گا رہا ہے، نہیں کھیت بستیاں

گرتے ہوئے درخت، اُلٹتے ہوئے مکاں
بجھتے ہوئے یقین، بھڑکتے ہوئے گماں
ان سب سے اُٹھ رہا ہے بغاوت کا پھر دھواں

شعلوں کے پیکروں میں پلٹنے کی دیر ہے
آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے کی دیر ہے

وہ تازہ انقلاب ہوا آگ پر سوار
وہ سنسنائی آگ، وہ اُڑنے لگے شرار
وہ گم ہوئے پہاڑ، وہ غلطاں ہوا غبار
اے بے خبر! وہ آگ لگی آگ ہوشیار

بڑھتا ہوا فضا پہ قدم مارتا ہوا
بھونچال آ رہا ہے وہ پھنکارتا ہوا

اس زمانے کی بعض نظموں میں ان کے تصور آزادی کے ساز پورے شعور کے ساتھ بج اٹھے ہیں۔ اور وہ روحانی نا آسودگی جو اُن کے خیالات کی خصوصیت رہی ہے۔ برابر اپنی جھلک دکھاتی رہی ہے۔ دبے پاؤں بڑھاپے کے آگے بڑھتے آنے کا احساس ناقدری پر جھنجھلاہٹ، اپنے شاعرانہ اور فکری عقائد کا اظہار، آزادی کی خامیوں پر طنز، یہی موضوعات مختلف نظموں میں جگہ پاتے رہے۔ "ترانۂ آزادیٔ وطن"۔ "استقلال سے گوہ"۔ "پند نامہ"۔ "درسِ آدمیت"۔ "مناجات"۔ "رشوت"۔ "سارے فرائض"۔ "اعترافِ عجز"۔ "تین فریادیں"۔ "بے چارگی"۔ وہ نظمیں ہیں جو اس عہد کے جوش کی نمائندگی کرتی ہیں۔ لیکن ان میں کسی خاص قسم کے ذہنی ارتقاء کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ہاں کہیں کہیں پختگیٔ خیال کی سنجیدگی ضرور نظر آتی ہے۔ سنہ ۱۹۵۲ء اور سنہ ۱۹۵۳ء میں ان کے دو مجموعے "سرود و خروش"، اور "سموم و صبا"، دہلی سے شائع ہوئے۔ ان میں جوش کی ادبی اور شاعرانہ عظمت میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوا۔ شاید اس لئے کہ ان کے خیالوں کی یکسانیت اپنی دلکشی بہت حد تک کھو چکی تھی۔

ہندوستان کی سیاست میں پاکستان کا تذکرہ کئی سال سے آ رہا تھا۔ جوش نے مسلم لیگ کے سیاسی مسلک کی ہمیشہ نکتہ چینی کی تھی، اس لئے ان کے یہاں کبھی دو قوموں والے نظریہ کا ذکر نہیں آیا۔ صرف ایک نظم۔ "وقت کی آواز" میں انہوں نے ایک خاص انداز سے تقسیم ہند کی حمایت کی تھی۔ لیکن جب ہندوستان تقسیم ہو گیا تو جوش نے اس پر واضح الفاظ میں کوئی اظہارِ خیال نہیں کیا۔ معلوم نہیں ان کے دل و دماغ میں کیا باتیں گذر رہی تھیں۔ لیکن ان کی نظموں میں ابھی خاصی احتیاط کے ساتھ اس مسئلہ کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ حالانکہ جوش عام طور سے ہر اہم مسئلہ کے متعلق اپنے فوری تاثرات کا اظہار نظموں کی شکل میں کرتے ہیں اور اس کا انتظار نہیں کرتے کہ واقعہ کی نوعیت اچھی طرح واضح ہو لے۔

بہرحال تقریباً سنہ ۱۹۵۲ء تک وہ بالکل خاموش رہے۔ پھر مشاعروں کے سلسلے میں پاکستان جانے لگے۔ اور کچھ ایسا

محسوس ہونے لگا کہ وہ وہاں زیادہ وقت گذارنا چاہتے ہیں۔

چونکہ اردو کے شاعر اور قوم پرست شاعر کی حیثیت سے ان کی سب سے زیادہ شہرت اور عزت تھی، اس لئے اس درمیان میں حکومت نے انہیں وہ اعزاز بھی بخشا جو ہندوستان کے صرف چند سپوتوں کو نصیب ہوا تھا — یعنی انہیں "پدم بھوشن" کے خطاب یا اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ ہندوستان کی سب سے اہم علمی انجمن "ساہتیہ اکیڈمی" کے رکن مقرر کئے گئے۔ اور بظاہر وہ ان باتوں سے خوش تھے لیکن خوش باشی، تعیش، خواہش زر اور امید قدر دانی کے جذبات انہیں کہیں اور کھینچ رہے تھے۔

چنانچہ انہوں نے آخر کار یہ طے کیا کہ وہ پاکستان میں جینا اور مرنا پسند کریں گے۔

جوش نے ہندوستان کو کیوں اور کس طرح چھوڑا؟ اس کی تاویل انہوں نے اپنے ایک مضمون "ہجرت" (نئی قدریں حیدرآباد سندھ نومبر سنہ ۱۹۵۷ء) میں کی ہے۔ لیکن اس کی اصل حقیقت سے ان کا سوانح نگار بحث کرے گا۔ یہاں صرف اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے۔

پاکستان کے دوران قیام میں جوش نے کچھ مختصر نظمیں، کچھ رباعیاں اور چند طویل مذہبی نظمیں لکھی ہیں جن میں سے ایک طلوع فکر کے نام سے سنہ ۱۹۵۷ء میں شائع ہو گئی ہے۔ کچھ مضامین بھی شائع کئے ہیں۔ لیکن ابھی یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان کی یہ "ہجرت" ان کی شاعرانہ اور ادبی زندگی کے لئے کس حد تک سازگار ثابت ہوگی، اور انہوں نے جو وقار بحیثیت ایک انسان کے کھویا وہ بحیثیت شاعر کے حاصل کر سکیں گے یا نہیں۔

(۱۰)

ذہنی ارتقاء کی اس نقشہ کشی میں جوش کی شخصیت کے خط و خال کسی نہ کسی حد تک ابھرے ہیں۔ لیکن چند سطروں میں انہیں اور نمایاں کر دینا اس باب کی تکمیل کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے[1]۔

جوش کی شخصیت ان کے شاعرانہ انداز نظر کی طرح پیچ و خم رکھتی ہے۔ وہ جب ان کے اشعار کے نقاب میں چھپ جاتی ہے تو گفتگو میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور گفتگو میں واضح نہیں ہوتی تو اشعار میں نمایاں ہوتی ہے۔ اس شخصیت کی تکمیل میں خود ان کی عمر کے تقریباً ساٹھ سال اور ان کی کئی پشتیں شریک ہیں۔ اسے وقت کے تقاضوں نے سنوارا ہے۔ اور مختلف قسم کے افراط اور تصورات نے رنگ و روغن چڑھائے ہیں۔ جنون و حکمت کی آمیزش، شعلہ و شبنم سے ساز، فکر و نشاط سے وابستگی، عرش و فرش کی سیر، سیف و سبو سے شغل، سموم و صبا سے دلچسپی، اور "حرف آخر" بکنے کی آرزو نے جوش کی شخصیت کو پیچیدہ تر بنا دیا ہے۔ یہ ایک بے قید و بند ہواؤں کی طرح پھرنے والا شاعر، اور وقت کی آواز پر کان دھر کر فکر کے سانچے میں ڈھلنے کے آرزومند تفکر پسند انسان کی شخصیت ہے۔ جو بے راہ روی اور اخلاقی اقدار دونوں کو دعوت دیتا ہے کہ اسے سہارا دیں۔ جوش کی زندگی اور اطوار میں کلاسیکیت اور رومانیت میں راستوں اور نئی جستجوؤں، قدامت اور جدت کی ایسی آمیزش ہے کہ وہ بعض اوقات مجموعۂ اضداد نظر آنے لگتے ہیں، اور اسی تضاد کی پرچھائیاں ان کی شاعری

---

[1] یہاں میں اپنے ہی ایک مضمون کے اقتباسات پیش کرتا ہوں

اور افکار پر پڑنے لگتی ہیں۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ وہی شخصیت بزم سخن میں کچھ اور ہوتی ہے اور بساطِ عمل پر کچھ اور۔ وہ ایک پروگرام بناتی ہے اور فکر و فلسفہ میں کھو جانے، رندی و سرمستی میں وقت گذارنے، لبِ حیات سے قصۂ خوش سننے اور تماشائے لبِ بام دیکھنے کے اوقات مقرر کرنا چاہتی ہے۔ ایسی شخصیت کے سمجھنے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے چلنے، اس کی صبح و شام میں شریک ہونے، خلوت و جلوت میں اس کے ساتھ وقت گذارنے، اس کے ہمراہ خوشی و غم کے لمحات بسر کرنے، اسے سوتے جاگتے مشاہدہ کرتے، اس کو دوستوں میں خوش طبعی کرتے اور سنجیدہ صحبتوں میں بحثیں چھیڑتے دیکھنے، اور دنیا زمندی و تمنائے ناز برداری کی منزلوں سے گذرتے اس پر نظر کرنے کی ضرورت ہے۔ شاید کوئی شخص ان کے "پروگرام" کی طرف متوجہ کرے کہ انہوں نے اپنا پتہ آپ بتا دیا ہے۔ لیکن یہ پروگرام محض ان کے جسم کی تلاش میں، وہ دیتا ہے۔ ان کی روح اور شخصیت اس میں نہیں ملتیں۔ یہ وہ جوش نہیں جو "میں" کہہ کر "کائنات" مراد لیتا ہے، اور اسے اپنی انفرادی ذات کے گرد محیط کر لینا چاہتا ہے۔ انہیں اپنے تضاد کا خود احساس ہے۔

جھکتا ہوں کبھی ریگِ رواں کی جانب
اڑتا ہوں کبھی کاہکشاں کی جانب
مجھ میں دو دل ہیں، ایک مائل بہ زمیں
اور ایک کا رُخ ہے آسماں کی جانب

لیکن اس تضاد میں وہ صورت نہیں ہے جسے نفسیات کی زبان میں شخصیت کا پارہ پارہ ہونا کہیں گے، بلکہ یہاں شاعر کو اپنی ہمہ جہتی اور آزاد نگاہ پر فخر ہے۔ جس کا تذکرہ وہ بار بار کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً:

اے محرمانِ کہنہ ولے رودستانِ نو
اک وضع پر نہیں ہے مرے ولولوں کی رَو
کعبے کا نور ہوں تو کبھی بتکدے کی ضو
گرتی ہے گاہ برف، نکلتی ہے گاہ لَو

دریا ہوں اک مقام پہ رہتا نہیں کبھی
اک خطِ مستقیم پہ بہتا نہیں کبھی

وہ زمزمہ ہوں جس کی نہیں کوئی خاص لے
وہ نالہ ہوں کہ ہو نہیں سکتا جو وقفِ نے
مجھ میں نہاں ہے دہر کی ہر گرم و سرد شے
زہرہ زلال و زمزم و زہراب و قند و مے

شاعر کا دل نفیر بنے اور تکبیر کا
سنگم ہوں رود ہائے جدید و صریر کا

"جلال و جمال" (سرود و خروش صفحہ ۲۸۷)

جوش آفریدی پٹھانوں کے ایک بہت ہی خوش حال گھرانے میں اس وقت پیدا ہوئے جب انیسویں صدی کا آفتاب غروب ہو رہا تھا، اور خود امارت و ثروت کے تصورات بدل رہے تھے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ افغانی خاندان سرزمین اودھ کی ہواؤں میں پلا تھا، رنگینیوں اور لطافتوں کی سرزمین! جوش اسے کبھی نہیں بھولتے کہ وہ افغانی ہیں۔ رئیس ابن رئیس ہیں، اور صاحب سیف و قلم اجداد کے وارث ہیں۔ اب بھی جب کبھی جوش کو چھیڑ دیا جائے، اور ان کے بزرگوں کا ذکر شروع ہو جائے تو وہ مزے لے لے کر ان کے کردار کے انوکھے پن کی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے دادا محمد احمد خاں کا ذکر کرتے ہوں، یا اپنے نانا رستم علی خاں (بھرت پور) کا، اپنے والد بشیر احمد خاں کا یا اپنے چچا اسحاق خاں کا، ہر ایک کی زندگی ایک دلچسپ داستان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بعض حیثیتوں سے یہ انوکھا پن ان کے کردار میں بھی ہے جسے حالات کے بدل جانے کے بعد بھی وہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

جوش کا کردار ایک ذہین، ذکی اور سریع الحس انسان کا کردار ہے، جو عمل میں کم اور خیال میں زیادہ اپنے ماحول اور گرد و پیش کے واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن غالباً بالکل وقتی اور عارضی طور پر۔ جس وقت کا جو جذبہ ان پر طاری ہوتا ہے اس وقت وہی ان کے لئے ساری صداقتیں رکھتا ہے۔ اور وہ اس کی گرفت میں ہوتے ہیں۔ جب اسی جذبے کی شدت کی بنا پر کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں تو ان کی ذہانت اور طباعی اس کے لئے استدلال بھی تلاش کر لیتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ جذباتی نتائج کو منطقی نتائج سمجھنے لگتے ہیں۔

شدت جذبات اور سریع الحسی نے جوش میں بہت سے متضاد عناصر پیدا کر دیئے ہیں، اور چونکہ وہ سب باتیں ان کی شاعری اور گفتگو میں نمایاں جگہ پا چکی ہیں اسی لئے جوش ان سے دست بردار بھی نہیں ہو سکتے۔ گو تفکر انہیں بہت عزیز ہے اور انہوں نے اسے سینے سے لگائے رکھا ہے لیکن ان کا ذہن طبعاً جذباتی ہے منطقی نہیں۔ بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو کہ ان کی منطق بھی جذبات ہی کی گود میں پرورش پاتی ہے۔ مذہب، خدا، حیات بعد موت، جبر و اختیار، مقصد حیات، علم انسانی، عقل و عشق کے مقامات، ان تمام مسائل پر انہوں نے غور کیا ہے اور حسین ترین شاعرانہ انداز میں ان کے بعض مقامات کو پیش بھی کیا ہے۔ لیکن ہر مقام پر عقل و جذبہ کی آویزش اتنی شدید رہی ہے کہ مفکر جوش کو شاعر جوش نے اکثر شکست دے دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف مطلق جبر کے قائل ہیں اور دوسری طرف انسان کو عمل پر اکسا کر خدا بننے اور کائنات کی تشکیل کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں باتیں جبر کے تحت ہو رہی ہیں۔ جوش میں عجیب طرح سے ایک بت پرست اور بت شکن کی روحیں مل گئی ہیں۔ خود کہتے ہیں:

عفریت، خبیث، دیو، اژدر، شیطان
درویش، اقطاب، امام، مرسل، یزدان
گیتی، گردوں، بہشت، دوزخ، اعراف
یہ سب ہیں مرے دل میں خروشاں و تپاں

جوش کا سینہ کتنے متضاد اور متصادم عناصر کی جولاں گاہ ہے! کیا ان کی شخصیت اور کردار میں ان کا اظہار نہیں ہو گا! پھر کیا جوش کی شخصیت ایک پارہ پارہ بیمار شخصیت ہے؟ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ ان کا ذہن جن تاثرات کو بجلی کی طرح قبول کر لیتا ہے ان کا اظہار ان کے تخیل کا نغمہ میں فوراً ہو جاتا ہے، چاہے عمل میں نہ ہو سکے۔ یہ چیز ان کے افتاد مزاج

سے ہم آہنگ ہے۔ کیوں کہ ان میں ناز برداری کے متمنی ایک عیش پرست کی روح ہے جس کا بچپن پھولوں کی سیج پر گذرا، جو محبت میں کامیاب رہا، جس نے اپنی راتیں زلفوں کے سائے میں گذاریں، جو اپنے حسب توقع نہ سہی پھر بھی ملک کی متاع عزیز بننے میں کامیاب ہوا۔ ان حالات میں اگر جوش کی شاعری اور کردار کے سمجھنے میں الجھنیں پیدا ہوں تو تعجب کی بات نہیں۔ سنہ ۱۹۴۲ء کے قریب جوش نے اپنی ارتقائے ذہن کی منزلیں یوں پیش کی تھیں

اک زمانہ وہ بھی تھا اے دوستان باصفا
ابر سا رہتا تھا میری روح پر چھایا ہوا
طیش رسم دشمنی پر طیش آتا تھا مجھے
غصہ انگاروں پہ راتوں کو لٹاتا تھا مجھے
موڑتی تھی دشمنی جب دوستی کی سمت باگ
میرے افغانی رگ و پے میں بھڑک اٹھتی تھی آگ
دیکھتا تھا آدمی کو جب دناءت کا شکار
اینٹھنے لگتی تھیں گردن کی رگیں بے اختیار
دل یہ کہتا تھا کہ ہر سینے میں خنجر بھونک دوں
خلق کو بھڑکے ہوئے دوزخ کے اندر جھونک دوں

لیکن اس مدت میں جب بالغ ہوئی میری حیات
آنکھ جھپکانے لگے دل میں رموز کائنات
دیکھتا کیا ہوں کہ ماحول و وراثت کا جُوا
نوع انساں کے ہے نازک شانے پہ رکھا ہوا
فطرت و طینت، سرشت و تربیت، طبع و خمیر
ایک انسان اور اتنے قید خانوں کا اسیر
کیا جہالت تھی کہ کھاتا تھا بشر پر پیچ و تاب
حدیے اس معصوم کو دیتا تھا مجرم کا خطاب
جس کے افسانے کا ہے عنوان آدم کا ہبوط
جس کی پیشانی پہ ہیں جبر و مشیت کے خطوط
پھول انگاروں پہ راتوں کو سلاتا تھا مجھے
حیف اس مظلومیت پہ تاؤ آتا تھا مجھے

اب مرا غیظ و غضب اپنے سے شرمانے لگا

مجھ کو انساں کے گناہوں پر ترس آنے لگا
بھید پایا تھا کہ دل سے غیظ کم ہونے لگا
آدمی کی بے نوائی دیکھ کر رونے لگا
اور جب اس سے بھی کچھ گہری نظر جانے لگی
مجھ کو انساں کی خطاؤں پر ہنسی آنے لگی
بے قراری کے عوض دل کو قرار آنے لگا
نوعِ انسانی کی گمراہی پہ پیار آنے لگا
اک نیا احساس اس سینہ میں اب پاتا ہوں میں
دشمنی کرتے ہیں دشمن اور گھبراتا ہوں میں
بے کس و مجبور انساں کو دعا دیتا ہوں میں
وار کرتا ہے کوئی تو مسکرا دیتا ہوں میں

"بلوغ حیات" (فکر و نشاط صفحہ ۱۱۰)

مفروضہ جبر کے عقیدے کے ماتحت خیالوں میں یہ تغیرات فکر کے مقابلے میں تخیل کے پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہی عقیدہ تضاد کے لئے ان کی سپر کا کام دیتا ہے۔

(۱۱)

مختصر یہ کہ جوش کی شاعری ان کے ذہنی ارتقاء کا آئینہ ہے۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کے جلال و جمال، حسن و قبح، اور بلندی و پستی کو بڑی خوبی سے منعکس کرتی ہے۔ ان کی ذہنی کش مکش، فکری درماندگی، تصور پرستی، سماجی عقائد ہر ایک کی تصلیک ان کی ہزار ہا نظموں میں بکھری پڑی ہے۔ ان کی شخصیت میں جو مزاجی بانکپن ہے وہ روایت اور بغاوت کی کش مکش سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن وہ روحانیت اور تصوف سے مادیت اور حقیقت کی طرف، تقدیر پرستی سے جبر کی طرف، اور جنون سے حکمت کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اور یہ سفر ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ جوش کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی شاعری کھوکھلی اور سطحی ہے یا رومانی عنصر کی زیادتی نے فکری عنصر کو ان کی شاعری میں بالکل ختم کر دیا ہے۔ ان کی تنقید ہو سکتی ہے۔ انہیں چھوڑا نہیں جا سکتا۔

اچھے وہ لوگ ہیں جنہیں اپنے عہد کی نبض دیکھنا اور اپنے عصر کے قلب کی ضربیں شمار کرنا آتا ہے اور بُرے وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں زمانے کو گالیاں دینے کے علاوہ ان دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں آتی۔

جوش

ڈاکٹر عبادت بریلوی

جوش ملیح آبادی

شخصیت کے چند اہم پہلو

جوش ملیح آبادی بظاہر دیکھنے میں تو لا ابالی معلوم ہوتے ہیں، لیکن جن لوگوں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے مزاج میں بڑی باقاعدگی ہے۔ اور وہ ایک بہت اچھے انسان ہیں۔ وہ انسانی زندگی سے محبت کرتے ہیں۔ اس کے کسی پہلو سے وہ منہ موڑنے کے قائل نہیں، وہ اس کو بسر کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس سے لطف اندوز ہونا آتا ہے۔ وہ اس سے مسرت حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت میں بڑی زندگی کا احساس ہوتا ہے اور بڑی جولانی نظر آتی ہے۔ وہ انسانی زندگی کے حسن کو دیکھتے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو میں حسن کو تلاش کر لینا ان کے مزاج میں داخل ہے۔ ان کے پاس احساسِ حسن اور حسنِ نظر ہے۔ وہ شباب کے پرستار ہیں۔ یہی ان کے نزدیک حاصلِ حیات ہے۔ ان کے پاس وہ نگاہِ شباب ہے جو حسنِ دل فریب پر سر دھننا سکھاتی ہے۔ چنانچہ وہ اس پر سر دھنتے ہیں۔ لیکن وہ صرف حسنِ دل فریب ہی کو نہیں دیکھتے، دوسرے پہلوؤں پر بھی ان کی نگاہ پڑتی ہے۔ وہ انسان سے محبت کرتے ہیں۔ وہ کسی شخص کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ وہ دوستوں کے بہت اچھے دوست ہیں، لیکن دشمنوں کے دشمن نہیں ہیں۔ دشمنی کا لفظ ہی سرے سے اُن کی لغت ہی میں نہیں ہے۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہونچا سکتے۔ کسی کی تکلیف ان سے برداشت نہیں ہوتی ۔۔۔ اسی لئے ہر ایک کے ساتھ نیکی کرتے ہیں ۔۔۔ وہ خیر کے قائل ہیں، شر سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ عفو و درگزر ان کا شیوہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پٹھان ہونے کے باوجود وہ کسی کے دشمن نہیں ہیں۔ یہ بات بظاہر بہت عجیب ہے لیکن وہ اس کو انسان کی ذہنی بلوغت سے تعبیر کرتے ہیں، اُن کے خیال میں انسان جب اس منزل پر پہونچتا ہے، تب کہیں جاکر اس میں انسانیت پیدا ہوتی ہے۔

ان کی زندگی میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جن سے ان کی شخصیت کے اس پہلو کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی ساری جائداد لوگوں نے تباہ کر دی لیکن انہوں نے کسی سے کچھ نہ کہا ۔۔۔ ان کے ساتھ عزیزوں اور رشتے داروں نے زیادتیاں کیں، لیکن انہوں نے کسی سے بدلا نہیں لیا ۔۔۔ بے شمار لوگ ان کے مقابلے میں صف آرا ہوئے لیکن انہوں نے کسی سے لڑائی نہیں لڑی ۔۔۔ انہوں نے اپنا سب کچھ کھو دیا، لیکن کسی کو تکلیف پہونچانے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ اگر کسی کی طرف سے کبھی کوئی زیادتی ہوئی تو اس کو انہوں

نے غائبانہ طور پر بھی معاف ہی کر دیا۔ کبھی کوئی بات دل میں نہیں رکھی۔

دس پندرہ سال پہلے کی بات ہے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے جوش صاحب کو ذہنی طور پر پریشان کرنا چاہا۔ یہ جان کر کہ وہ دوستوں سے بلا کی محبت کرتے ہیں اور کسی دوست کی ذرا سی تکلیف بھی ان کے لئے پریشانی کا باعث ہو جاتی ہے۔ ان کے عزیز دوست مجازؔ کی موت کے بارے میں انہیں خواہ مخواہ فون کر دیا۔ جوش صاحب نے فون پر جب یہ خبر سنی تو فوراً ہانپتے کانپتے میرے پاس پہونچے۔ مجازؔ ان دنوں دلی میں میرے یہاں مہمان تھے۔ لیکن مجھے بغیر اطلاع دیئے ہوئے کہیں غائب ہو گئے تھے، جوش صاحب کو اس عالم میں دیکھ کر تو میں بھی گھبرایا، اور مجھے بھی یقین ہو گیا کہ واقعی یہ خبر صحیح ہے — لیکن صبح کو معلوم ہوا، کہ یہ خبر غلط تھی — مجازؔ نے کہیں رات کو شراب پی لی تھی۔ صبح کو وہ جوش صاحب کے یہاں پہونچے اور بہت معذرت کی۔ جوش صاحب نے مجھے ان الفاظ میں یہ خوش خبری سنائی:۔

"صبح جب دفتر پہونچا تو معلوم ہوا کہ مردود مجاز، آزادؔ کے کمرے میں پڑا سو رہا ہے۔ ابھی میرے پاس آیا تھا۔ میں نے بہت ڈانٹا پھٹکارا، اور اس ہدایت کے ساتھ اپنے گھر روانہ کر دیا کہ وہاں جا کر وہ غسل کرے اور کھانا کھائے — معلوم نہیں کس ابن زیاد نے اس کی موت کا فون کیا تھا۔ اللہ اسے نیکی کی توفیق دے۔ میں اس کے اس قاتلانہ فعل کو معاف کرتا ہوں۔ ہلاک کر دیا مجھے اس بدبخت کے فون نے —"

نیاز مند:

جوش

ایسی وحشت اثر خبر دینے والے کے حق میں بھی جوش صاحب نے دعائے خیر ہی کی، اور اس کے اس قاتلانہ فعل کو معاف کر دیا جس نے انہیں ہلکان کر دیا تھا۔ اور جس کے اثر سے اُن کی حالت دگرگوں ہو گئی تھی۔ جوش صاحب کی زندگی میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جو اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خیر کے قائل ہیں شر کو نا پسند کرتے ہیں۔ اور دشمن تک کے ساتھ بھلائی کرنا ہمیشہ اُن کے پیش نظر رہتا ہے۔

جوش صاحب کا ظاہر اور باطن ایک ہے۔ وہ کسی بات کو چھپاتے نہیں۔ اپنی زندگی کے تمام واقعات (گفتنی اور ناگفتنی) بے تکلفی اور بے باکی کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ رندی اور شاہد بازی جوش صاحب کے مزاج میں داخل ہے۔ اور انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ایک عالم کیف و مستی میں گذارا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جن عجیب و غریب حالات سے انہیں دوچار ہونا پڑا ہے۔ اور جو عجیب و غریب تجربات انہیں ہوئے، ان سب کی تفصیل کو وہ مزے لے لے کر سناتے ہیں۔ عام طور پر لوگ ایسے واقعات پر پردہ ڈالتے ہیں۔ لیکن جوش صاحب ان کو بیان کرنے میں کبھی کوئی حجاب محسوس نہیں کرتے — بات یہ ہے کہ جوش صاحب کو منافقت سے نفرت ہے۔ ریاکاری سے وہ کوئی واسطہ نہیں رکھتے — زندگی کے مختلف واقعات کی پردہ پوشی ان کے نزدیک منافقت اور ریاکاری ہے۔ اسی لئے وہ اس معاملے میں ہمیشہ نڈر اور جرأت مند ہونے کا اظہار کرتے ہیں — اور یہ جوش صاحب کی شخصیت کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو کسی دوسرے انسان میں ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتی — میں نے زندگی میں ایسا سچا، صاف گو، نڈر، اور بے باک شخص نہیں دیکھا۔

کشادہ دلی اور روشن خیالی کے۔ رنگ بھی ان کی شخصیت میں بہت نمایاں ہیں ــــ وہ اپنے عقائد اور خیالات و نظریات میں پختہ ہیں۔ اور اسی پختگی کا نتیجہ ہے کہ کسی دوسرے کے خیالات کا اثر ان پر ذرا کم ہی ہوتا ہے۔ لیکن وہ ہر شخص کے خیالات کو سننے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ وہ جذباتی آدمی ضرور ہیں لیکن اختلافات کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مختلف مذاہب کے لوگوں سے انہیں واسطہ پڑا ہے انہوں نے ان سب سے مذہبی اور فلسفیانہ مسائل پر بحثیں کی ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں کبھی بھی تنگ نظری کا اظہار نہیں کیا ہے ــــ اختلاف کے باوجود وہ لوگوں کی عزت کرتے ہیں ــــ بات دراصل یہ ہے کہ جوشؔ صاحب بڑے روشن خیال آدمی ہیں ــــ انسان اور انسانی زندگی کا پورا مد و جزر اُن کے سامنے رہا ہے۔ وہ اس کی نفسیات کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کی مجبوریاں اور معذوریاں ہمیشہ ان کے سامنے رہتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک انسان جب کوئی خیال قائم کرتا ہے تو اس کے پیچھے اس کی وراثت اور ماحول کا ایک وسیع و عریض پس منظر ہوتا ہے۔ اسی پس منظر میں اس کے عقائد و خیالات جنم لیتے ہیں۔ اور وہ ان گنت محرکات کے پیش نظر انہیں ظاہر کرنے اور ان پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اختلاف ان کے نزدیک جرم نہیں ہے ــــ اسی خیال نے انہیں مخالفوں کا دل رکھنا اور ان کے عقائد و خیالات کو عزت و احترام کے ساتھ دیکھنا سکھایا ہے ــــ جوشؔ صاحب کے دوست عالم اور مجتہد بھی ہیں۔ رند اور شاہد باز بھی ــــ اور وہ ان دونوں سے دوستی کو نباہتے ہیں۔

جوشؔ صاحب بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں، اور ایک شاعر کے مزاج کی تمام خصوصیات ان کی شخصیت میں موجود ہیں۔ ان کا ذہن لطیف خیالات کا منبع ہے۔ وہ بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں، ان کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے۔ وہ تخیل کے سہارے بہت اونچا اڑتے ہیں ــــ یہاں تک کہ بعض اوقات آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں ــــ اُن کے تخیل کی بلندی اور پرواز ان کی باتوں کو ایک طرف تو بلند آہنگ بناتی ہے اور دوسری طرف ان میں بڑی رنگینی اور رچاؤ کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے ــــ وہ باتیں نہیں کرتے، شعر کہتے اور شاعری کرتے ہیں ــــ ان کی ہر بات کا محرک کوئی نہ کوئی شاعرانہ خیال ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ شعریت میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے ــــ معمولی سے معمولی بات کو لطف کا رنگ و آہنگ دے دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ بیٹھنے والے گھنٹوں ان کی دلچسپ باتیں سنتے ہیں ــــ اور کبھی اکتاتے نہیں برخلاف اس کے انہیں ان کی ہر بات میں لطف آتا ہے، اور وہ یوں محسوس کرتے ہیں جیسے ان پر رنگ و نور کی بارش ہو رہی ہے اور فضا میں سرور و سرخوشی کی بجلیاں کوندرہی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ جوشؔ صاحب کا مزاج شاعرانہ ہے، اور وہ بنیادی طور پر ایک شاعر ہی ہیں۔ اُن کی شاعرانہ عظمت بعض لوگوں کو گمراہ کر دیتی ہے۔ اور وہ یہ خیال قائم کر لیتے ہیں کہ جوشؔ صاحب کو علم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے جوشؔ صاحب مختلف علوم کے بہت بڑے عالم ہیں۔ انہوں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا ہے۔ اور وہ ہر مذہب کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ وہ فلسفے کے بہت بڑے عالم ہیں اور مختلف فلسفیانہ مسائل پر غور و فکر ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ انہیں تاریخ سے دلچسپی ہے۔ اور وہ تاریخ کے فلسفے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ عمرانیات کا بھی انہوں نے باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔ اور وہ معاشی اور معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے نشیب و فراز کو عالمانہ زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں ــــ علم نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر انہوں نے غور و فکر کیا ہے اور وہ انفرادی اور اجتماعی نفسیات کے تمام پہلوؤں کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ وہ مابعد الطبیعیات کے بھی بہت بڑے عالم ہیں۔ اور اس کے تمام اسرار و رموز ان کے سامنے پوری طرح

بے نقاب ہیں — وہ زبان کے بہت بڑے مزاج داں ہیں اور لسانیات کے مختلف معاملات و مسائل کو سمجھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے — جوش صاحب کو ان علوم سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور وہ ان سب پر ایسی گفتگو کرتے ہیں جس کو سن کر ان علوم کے پروفیسر بھی عش عش کرتے ہیں۔

جوش صاحب نے زندگی بھر محنت کی ہے۔ اور ان علوم کے مطالعے میں اپنا بہت سا وقت صرف کیا ہے — ان کے مطالعے کے اوقات معین ہیں۔ وہ ایک پروگرام کے تحت کام کرنے کے عادی رہے ہیں۔ لیکن وہ لوگوں پر اس کو ظاہر نہیں کرتے کہ وہ کتنا کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ یہ خیال قائم کر لیتے ہیں کہ جوش صاحب کا بیشتر وقت لہو و لعب میں گذرتا ہے۔ اور وہ زندگی کے سنجیدہ معاملات سے دلچسپی نہیں لیتے۔ اپنے ایک خط میں اس صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے مجھے لکھتے ہیں:-

> "میں آج کل خوب کام کر رہا ہوں۔ آج کل ہی پر موقوف نہیں۔ زندگی کے ہر دور میں یہاں تک کہ زندگی کی بھری برسات یعنی عنفوانِ شباب میں بھی میں کبھی کام سے غافل نہیں رہا —
>
> صبح کے چار بجے سے لے کر شام تک تو کتابوں، علمائے علم و ادب کی صحبتوں اور شعر و سخن کی کاوشوں میں سرگرم رہتا تھا۔ اور راتوں کو یادش بخیر مہکتے گیسوؤں، دمکتے مکھڑوں، کھنکتے ساغروں، اور تھرتھراتی سارنگیوں میں غرق ہو جایا کرتا تھا۔
>
> عبادت میاں! میری راتیں خالی خولی اور کھوکھلی "عیاشیاں" نہیں ہوتی تھیں۔ بلکہ میں ان راتوں کے بینکوں میں جس قدر وقت اور روپیہ جمع کیا کرتا تھا، صبح چار بجے بیدار ہوتے ہی، گذری ہوئی راتوں کے بینکوں سے وہ تمام و کمال وقت اور روپیہ مع سود وصول فرما کر اس روپے کو تعمیراتِ ادب کی تزئین و توسیع میں لگا دیا کرتا تھا —"

اس محنت کا پھل انہوں نے پایا ہے۔ ہمارے شاعروں میں سے (سوائے علامہ اقبال کے) شاید ہی کسی شاعر نے علم و ادب کے مطالعے میں اتنی محنت کی ہو جتنی کہ جوش صاحب نے کی ہے — ان کی شاعری میں بھی اس محنت اور کاوش کو خاص دخل ہے — وہ الفاظ کے استعمال، اور ان کی دروبست میں جو محنت کرتے ہیں، اس کا اندازہ ان کی نظموں کے مسودوں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ ان مسودوں کو پڑھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ صرف جوش صاحب ہی انہیں پڑھ سکتے ہیں — یہی وجہ ہے کہ ان کا ایک ایک لفظ ہیرے کی طرح ترشا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

جوش صاحب کے عقائد و نظریات عرصۂ دراز تک ادب و شعر کی دنیا میں موضوعِ بحث رہیں گے۔ وہ بہت کچھ ہیں، اور کچھ بھی نہیں ہیں — انہوں نے اس قدر شدت سے محسوس کیا اور سوچا ہے کہ انہیں خود اپنی خبر نہیں رہی ہے۔ وہ انسان کی عظمت کے قائل ہیں۔ اور انسانیت کی عظمت اور برتری پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ ان کے خیال میں مجبور محض ہے وہ اس کی اس مجبوری پر کڑھتے اور خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ وہ حد درجہ جذباتی ہیں۔ اس لئے انسان کی معمولی سی تکلیف بھی ان کے لئے پریشانی کا باعث بن جاتی ہے — یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت خشیت کے شکوہ سنج نظر آتے ہیں۔ انہیں انسان

موت کے سائے میں زندگی بسر کرتا اور اپنی موت کی طرف دوڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے — وہ حد درجہ جذباتی ہیں، لیکن اس کے باوجود عقلیت پسند ہیں۔ وہ پیچھے کی طرف لوٹنے کے قائل نہیں۔ آگے کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں — وہ روایت کے پرستار ضرور ہیں۔ لیکن ان کا مزاج ایک انقلابی کا مزاج ہے — ایک انقلابی کے مزاج میں جو شدت ہوتی ہے وہ جوش صاحب میں بھی ہے۔

لیکن اس شدت کے باوجود وہ کبھی فکر کا دامن نہیں چھوڑتے۔ غور و فکر ان کے مزاج کا بنیادی جزو ہے — انہوں نے زندگی میں نہ جانے کیا کیا کچھ سوچا ہے۔ نہ جانے کیسے کیسے خیالات قائم کئے ہیں — اسی لئے عقلمند کے لحاظ سے وہ ایک معما معلوم ہوتے ہیں — لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ وہ ایک متشکک ہیں اور انہوں نے ساری زندگی اسی تشکیک کے عالم میں بسر کی ہے — لوگ ان کی اس کیفیت کو نہیں سمجھتے۔ اسی لئے ان کے بارے میں طرح طرح کے غلط خیالات قائم کر لیتے ہیں، اور ان کے عقائد اور خیالات و نظریات کے بارے میں غلط نتائج نکالتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ جوش صاحب جبر کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاج میں الم پسندی کی خصوصیت بہت نمایاں ہے۔ لیکن ان کی یہ الم پسندی اس شوخی اور شگفتگی کو ختم نہیں کر سکی ہے جس کا رنگ ان کی شخصیت میں پوری طرح رچا ہوا ہے۔ جوش صاحب صحیح معنوں میں باغ و بہار آدمی ہیں — ان کی باتیں بڑی پر لطف ہوتی ہیں — باتیں کرتے ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں — ان کی رنج والم کی باتیں بھی ایسی دلچسپ ہوتی ہیں کہ روتا ہوا آدمی بھی ہنسنے لگتا ہے — جوش صاحب مجلسی آدمی ہیں۔ وہ محفلیں منعقد کرتے ہیں، مجلسیں سجاتے ہیں۔ ان محفلوں اور مجلسوں میں وہ بیٹھتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا دربار لگا ہوا ہے — ان کا بہترین وقت وہ ہوتا ہے جب وہ ان محفلوں میں اپنے احباب کے ساتھ بیٹھ کر شگفتگی اور شادابی کے دریا بہاتے ہیں۔ اور جس کی وجہ سے ساری فضا رنگینیوں میں ڈوب جاتی ہے!

ہم دوسروں کے خیالات و ملفوظات کے اڑا لینے میں تو بہت شاطر ہیں، مگر یہ نہیں جانتے کہ انہیں تفکر کی ترازو میں کیونکر تولا اور تدبر کی بھٹی میں کیوں کر تپایا جا سکتا ہے۔

ارباب نظر اس حقیقت کو متعدد بار دہرا چکے ہیں کہ صرف "پڑھ لینے" سے کوئی شخص تعلیم یافتہ نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک کہ "پڑھا ہوا" انسان کافی طور سے "گڑھا ہوا" نہ بن جائے، اور اپنے "پڑھے ہوئے" کو ہضم کر کے جزو بدن نہ بنا لے۔ اس کا مرتبہ ایک "خواندہ جاہل" کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

یعنی علم جس وقت تک کہ صرف "معلوم" کی حد تک ہے اُسے کوئی درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ جب وہ "معلوم" کی منزل سے گزر کر "محسوس" کے دائرے میں آ جاتا ہے تو اس وقت وہ دنیا کی سب سے بڑی عزت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

جوش

تمکین کاظمی

جوش میری نظر میں

عثمانیہ یونیورسٹی کی اردو کی پروفیسری کے لئے جوش حیدرآباد آئے، اور ان کے ساتھ ہی ساتھ وحید الدین سلیم بھی پہونچے۔ چنانچہ دونوں نے جد و جہد شروع کی۔ جوش کا پلہ بھاری تھا۔ سلیم کو اپنی کوشش میں کامیابی مشکل نظر آنے لگی۔ جوش کی پارٹی شریف اور باوقار تھی، مگر سلیم کی پارٹی عیار، رذیل اور طرار تھی۔ چنانچہ اسی عیاری سے اس پارٹی نے جوش کو بے ہوش کر دیا۔ جوش جب کامیاب ہوتے نظر آئے تو سلیم کی پارٹی نے جوش کی بیوی کو اطلاع دی کہ جوش حیدرآباد میں کسی عورت سے نکاح کر رہے ہیں۔ کسی طرح آ جائیے۔ فوراً وطن چھوڑ دو۔ چنانچہ وطن سے ایک تار بلایا اور جوش سراسیمہ ہو کر حیدرآباد سے وطن بھاگے، اور پھر بیوی کو مطمئن کر کے حیدرآباد واپس ہوئے، تو یہاں تصفیہ ہو چکا تھا اور سلیم اپنا تقرر کرا چکے تھے۔ اس لئے جوش کو مجبوراً دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ناظر ادبی کی خدمت قبول کرنی پڑی۔

اسی زمانے میں میری ملاقات جوش سے ہوئی۔ امین الحسن بسمل مرحوم کے گھر پر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ یوں تو میں جوش کا کلام رسالوں میں پڑھتا رہتا تھا، اور ان کی ایک آدھ کتاب بھی میرے پاس تھی۔ مگر میں نے انہیں کبھی دیکھا نہ تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے کو ایسے پسند آئے کہ میں ان سے بے تکلف ملنے لگا۔ جوش کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی یک رنگی اور سیدھی سادی زندگی تھی، انہوں نے کبھی اپنی کوئی بات کسی سے نہیں چھپائی۔ حیدرآباد میں جو جد و جہد ان کے لئے ہو رہی تھی، وہ بلا کم و کاست سب سے بیان کرتے رہے۔ یہی وجہ تھی جو سلیم ان کی کوششوں سے واقف ہوتے اور رقابت پر کار دیکھ کر ریشہ دوانیاں کرتے رہتے تھے، اور اس بات کی اطلاع خود جوش کو بھی تھی۔ مگر وہ اپنی فطرت سے مجبور تھے۔ انہیں رازداری آتی ہی نہیں تھی۔ سیدھے سادے اجڈ پٹھان تھے۔

وحید الدین سلیم سے بھی میری ملاقات تھی۔ ان سے میں بہت زیادہ واقف بھی تھا، کیوں کہ ان کے مقالات میں نے بہت پڑھے تھے۔ مگر ان کے تنگ نظرین اور ان کی بے ڈھنگی زندگی اور دہریت سے مجھے اختلاف تھا۔ مگر سلیم جینیس تھے۔ بڑی ٹھوس قابلیت کے مالک تھے۔ اور بڑی ہمہ گیری ان میں تھی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی پروفیسری کے لئے واقعہ یہ ہے کہ سلیم جوش سے زیادہ موزوں تھے۔ ان کا انتخاب بہت صحیح تھا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یہ انتخاب قابلیت کی بنا یا علمیت کے اساس پر نہیں ہوا تھا، بلکہ ریشہ دوانی اور سازش کے

زیادہ تر ہوا تھا۔ اور جوش کو جو خدمت ناظرِ ادبی کی ملی تھی، وہ بھی نہایت ہی موزوں اور جوش کے لئے صد درجہ مناسب تھی۔ بہر حال قدرت نے سلیم اور جوش دونوں کو ان کے لئے موزوں جائدادیں دلوا دیں۔ اور دونوں نے اپنا اپنا کام نہایت ہی عمدگی سے کیا۔ سلیم نے کیا کیا؟ اس کا جواب میں کیوں دوں! جامعہ عثمانیہ دے گا، اور جوش نے کیا کیا؟ اس کی تفصیل میں کیا بیان کروں!... دارالترجمہ کی سیکڑوں کتابیں گواہ ہیں۔

دارالترجمہ کے مترجمین یوں تو بھی نہایت ہی قابل عالم فاضل اور اچھے انشا پرداز تھے، مگر علامہ عبداللہ عمادی، مولوی عنایت اللہ، قاضی تلمذ حسین وغیرہ ہی ان میں ایسے تھے جن کے ترجمے نظرِ ثانی کے محتاج نہ تھے ورنہ بیشتر حضرات کا یہ حال تھا کہ ایک ایک سطر میں چار چار غلطیاں کرتے تھے، جوش نے ان غلط نگاروں کے جملے اور فقرے ایک ضخیم مجلد کاپی میں نوٹ کر لئے تھے۔ اگر یہ کاپی محفوظ ہو تو بڑی دلچسپ چیز نظر آئے گی۔ جوش نے ایسے غلط نویسوں کو تعلیم یافتہ یا سند یافتہ جہلا کا خطاب دیا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ غلطیاں بھی ایسی ہی کرتے تھے۔

جوش نے جس محنت اور سلیقے سے ترجموں پر نظرِ ثانی کی، اور ان کے مفہوم کو برقرار رکھ کر زبان درست کی ہے۔ یہ ہر کسی شخص کا کام نہ تھا۔ چونکہ میں ان دنوں جوش سے دفتر پر زیادہ ملتا تھا اس لئے دیکھتا تھا کہ جوش بڑے ہی انہماک اور پوری توجہ سے اس کام کو انجام دیتے تھے، اور نہایت دیدہ ریزی سے ترجموں کو درست کرتے رہتے تھے۔ جوش کا یہ کارنامہ بہت ہی اہم اور قابلِ قدر ہے۔ آج آپ حضرات دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی کتابوں کو سر آنکھوں پر جو رکھتے ہیں وہ جوش ہی کی وجہ سے اس قابل بنی ہیں، ورنہ غلطیوں کا پوٹ اور ژولیدہ بیانی کا طومار، معلق نگاری کا سلطنت تھیں۔ افسوس ہے کہ جوش کی اس کاوش اور ان کے اس سنہری کارنامے کو کسی نے بھی نہیں سراہا، اور خود جوش نے بھی کبھی اس پر غور نہیں کیا۔ جوش کا یہ کارنامہ میری نظر میں نہایت ہی اہم اور بڑا ہی عظیم الشان ہے۔

دارالترجمہ میں دو ناظر تھے، ایک علامہ عبداللہ عمادی، جو "ناظرِ مذہبی" تھے۔ ان کا کام ترجموں کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھنا تھا وہ دوسرے جوش "ناظرِ ادبی" تھے۔ جن کا کام ادبی نقطۂ نظر سے ترجموں کو دیکھنا تھا۔ مولانا عمادی کا کام نسبتاً سہل تھا، کیوں کہ دارالترجمہ کی کتابوں میں مذہبی جھگڑے اور مناقشے نہ تھے، مگر وہ بھی پورے انہماک اور نہایت ہی احتیاط سے اپنا کام کرتے تھے، اور جوش بھی کامل توجہ، پوری ذمہ داری اور نہایت ہی دلچسپی سے اپنے فرائض کو انجام دیتے تھے۔ پھر لطف خاص یہ کہ جن مترجمین کی اتنی موٹی موٹی غلطیاں نکالتے۔ انہیں اپنے پاس بلا کر، چائے پلا کر ان کی غلطیاں اُن پر واضح بھی کر دیتے، اور اصلاح شدہ حصہ انہیں دکھا بھی دیتے۔ جسے دیکھ کر وہ لوگ بھی پھڑک جاتے، اور جوش کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ کیوں کہ یہ کتابیں انہیں لوگوں کے نام سے طبع ہوتی تھیں۔ اور وہی اس کا کریڈٹ پانے والے تھے۔ اس طرح یہ غلط نگار بھی اپنی غلطیوں سے واقف ہو کر آئندہ کے لئے محتاط ہو جاتے تھے۔

میرے سامنے دارالترجمہ میں کئی ایک ایسے مترجم تھے جو ایسے اغلاط کرتے تھے، مگر جوش کی تفہیم کے بعد وہ بھی محتاط ہو گئے تھے، اور صحیح اردو لکھنے لگے تھے۔ اس طرح جوش نے نہ صرف کتابوں کی نظرِ ثانی کی، بلکہ ایک استاد کی حیثیت سے ان لوگوں کو راہ راست پر لگایا تھا۔ اور یہ بڑی تعمیری کوشش تھی جس میں جوش بڑے ہی کامیاب رہے۔

جوش میں ایک خوبی یہ ہے کہ وہ کسی کو حقیر اور ذلیل نہیں سمجھتے۔ ہر ایک کا احترام کرتے۔ اور غلطی کو غلطی سمجھتے ہیں۔ کسی شخص کی غلطی کو خواہ مخواہ اہمیت دے کر رائی کا پہاڑ نہیں بناتے، بلکہ بالکل معمولی اور ناقابلِ التفات سمجھ کر اس کو درست

کردیتے، اور اس سے کہہ دیتے کہ بھئی تم سے یہ فروگذاشت ہوگئی تھی، میں نے ٹھیک تو کر دیا ہے مگر پھر بھی تم دیکھ لو۔ اس طریق اصلاح کی وجہ سے کسی کو بھی جوش سے شکایت پیدا نہ ہوتی تھی، بلکہ لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے، یہ جوش کی اعلیٰ ظرفی، اور بلند نگاہی اور ان کی شرافت کی دلیل تھی۔

جوش کی شاعری پر میں کچھ لکھنا نہیں چاہتا، کیوں کہ مجھ سے زیادہ اہل حضرات اس موضوع پر لکھنے کے لئے موجود ہیں، اور لکھ رہے ہوں گے۔ اور پھر اس موضوع پر ہر وہ شخص لکھ سکتا ہے جس کے سامنے جوش کا کلام ہو۔ اس کے لئے جوش سے واقفیت اور شناسائی اور "جوش شناسی" کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مگر صرف یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ایک شاعر اور حقیقی شاعر کے لئے جس دل و دماغ کی ضرورت ہے قدرت نے جوش کو وہ عطا کیا ہے اور بھرپور عطا کیا ہے۔ جوش ایک وسیع المشرب وسیع الخیال، ژرف نگاہ، بلند حوصلہ، پاک دل، باہمت اور وضع دار شاعر ہے۔

بعض باتیں دنیا میں عجیب و غریب دیکھنے میں آتی ہیں۔ وحید الدین سلیم، اور عبدالحق، باوجود پکے ملحد اور مکمل دہریہ ہونے کے مولوی اور مولانا اور مقدس بنے رہے، اور لوگ ان کو مذہبی اور مسلمان سمجھ کر پوجتے رہے، بلکہ اب تک پوجتے ہیں، اور نیاز فتحپوری اور جوش ملیح آبادی باوجود مسلمان اور پکے مسلمان ہونے کے ملحد اور دہریہ کہلاتے رہے، اور اب بھی کہلاتے ہیں۔ میں چونکہ ان چاروں سے نہ صرف واقف بلکہ بہت زیادہ واقف ہوں۔ اس لئے حیران ہوں کہ یہ کیا بوالعجبی ہے؟

ایک روز صبح صبح میں جوش کے گھر پہونچا، جوش صبح کی چہل قدمی کرکے اسی وقت واپس ہوئے تھے، ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے، جوش ناشتہ کر رہے تھے۔ اور میں چائے پی رہا تھا۔ ایک اندھا شخص سورۂ رحمٰن کی تلاوت فقیرانہ انداز سے زور زور سے کرتا ہوا سڑک پر سے گذرا۔

جوش کی رگ حمیت پھڑکی۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ جسم میں رعشہ پیدا ہوگیا۔ فی البدیہہ کہا ؎

اک گدا کی زباں پہ ہے قرآن
واہ کیا شانِ کبریائی ہے
کل جو دیہیم تختِ شاہی تھا
آج وہ کاسۂ گدائی ہے

یہ شعر اُن کے منہ سے ادا ہو رہے تھے، اور آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ دیر تک یہ کیفیت رہی۔ بڑی مشکل سے سنبھلے۔ غور فرمایئے۔ ایک ملحد، ایک کافر، ایک دہریہ یہ قطعہ کہتا ہے، اور اتنا متاثر ہو کر کہتا ہے۔

یہ قطعہ اور اس کا شانِ نزول میں نے اسی روز دوپہر میں مولانا عمادی کو سنایا، تو مولانا آبدیدہ ہوگئے، اور دیر تک جوش کو دعائیں دیتے رہے۔

جوش کے ایک دوست تھے، جو شاعر بھی تھے۔ روزانہ شام میں جوش ان کے گھر پہونچتے اور اپنی تازہ نظم سناتے تھے یہ بزرگ اس نظم کو سن کر راتوں رات اس مفہوم کو اپنی زبان میں نظم کر لیتے اور صبح لکھ کر کسی رسالے کو بھجوا دیتے۔ اور جوش نظم کہنے کے بعد گھر میں رکھ دیتے۔ اگر کوئی شخص اسے نقل کرکے کسی رسالے کو بھجوا تا تو طبع ہوجاتی، ورنہ پڑی رہتی۔ مگر ان شاعر صاحب کی نظم فوراً طبع ہوجاتی۔ اور جب جوش کی نظم طبع ہوتی تو یہ بہ کمال معصومیت لوگوں کو بتلاتے کہ دیکھئے صاحب میری یہ نظم آج سے چار ماہ پہلے فلاں رسالے میں طبع ہو چکی ہے۔ اب جوش نے میری نظم کو دیکھ کر نظم کہی اور چھپوائی ہے

دیکھنے والے دیکھتے اور قائل ہو جاتے۔ مگر اندرونی حال کسی کو معلوم ہی نہ تھا۔ چنانچہ اسی چکر میں نیاز فتحپوری بھی پھنسے، اور انہوں نے بھی جوش کی مخالفت کی۔ خیر مگر لطیفہ یہ ہے کہ یہ شاعر صاحب جوش سے دامے درمے قدمے سخنے سب طرح استفادہ کرتے تھے۔ جوش سے قرض لیتے مگر کبھی واپس نہ کرتے۔ جوش خود ان کا پروپیگنڈہ کرتے پھرتے۔ بلکہ ان کی ایک طویل نظم جوش ہی نے ایک پبلشر کو مجبور کر کے چھپوا دی تھی۔

ان شاعر صاحب کے والد بھی شاعر تھے، اور بڑے غیر ذمہ دار آدمی تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے کسی سے قرض لیا اور کاغذ شاعر صاحب سے لکھوا دیا۔ شاعر صاحب بھی چونکہ باپ کی طرح غیر ذمہ دار تھے، اس لئے انہوں نے بھی بےکار لی سعادت مندی کاغذ لکھ دیا۔ مدت گزر گئی۔ نہ باپ نے رقم ادا کی اور نہ بیٹے نے۔ قرض خواہ نے دعویٰ کیا اور عدالت سے ڈگری لے لی۔ اور شاعر صاحب کے گھر پر قرقی پہونچی۔ اس وقت اتفاقاً جوش بھی وہاں موجود تھے۔ جب شاعر صاحب کے گھر پر ڈگری کی تعمیل ہونے لگی، اور ان کے سامان نکالا جانے لگا تو انہوں نے گڑگڑا کر جوش سے کہا:

"بھیا! تم ذمہ لے لو، دو دن میں کوئی نہ کوئی انتظام کر دوں گا۔"

جوش نے ضمانت دینی چاہی، مگر ڈگری دار بدقسمتی سے پڑھا لکھا نہ تھا جو جوش کا احترام کرتا۔ اس نے کہا: "نقد رقم دیجئے یا اپنی موٹر قرق کرا دیجئے۔ رقم داخل کیجئے عدالت سے واپس لے لینا۔"

جوش مارے ہمدردی کے موٹر حوالے کر بیٹھے، اور خوش خوش تانگے میں بیٹھ کر گھر واپس ہو گئے۔ مگر دو کیا دس دن گزر گئے اور شاعر صاحب کوئی انتظام نہ کر سکے۔

جوش نے پندرہ روز تک تکلیف اٹھا کر نقد پانسو روپے عدالت میں جمع کرا کر اپنی موٹر واپس لی، مگر اس پانسو کے نقصان کے بعد بھی ان کی آنکھیں نہ کھلیں۔ اور وہ برابر دوستی کے پابند رہے اور مدتوں سلوک کرتے رہے۔

جوش نے اپنی وضع داری ہمیشہ برقرار رکھی، اور اس طرح ہمیشہ اپنے احباب کی مدد کرتے رہے۔ جوش کے بیسیوں دوست ایسے تھے جو وقت بے وقت ان سے روپیہ وصول کر لیتے اور پھر کبھی واپس نہیں کرتے تھے۔ جوش نے حیدرآباد دکن میں رہنے تک روپیہ جمع کرنے کی فکر نہیں کی۔ ہمیشہ مقروض رہتے اور مقروض ہی گئے۔ مگر حیدرآباد کی فضول خرچیاں۔ اور یہاں سے واپس جانے کے بعد کی تکلیفیں ان کو بہت ستاتی رہیں۔ اور پھر وہ محتاط ہو گئے۔

پولیس ایکشن کے بعد جب وہ حیدرآباد آئے اور میں نے پوچھا کہ:

"اب کیا حال ہے؟"

تو انہوں نے کہا کہ "میں نے بے اعتدالی چھوڑ دی ہے اور کچھ پس انداز بھی کر رکھا ہے۔ پہلے کی طرح مقروض نہیں ہوں خدا کرے اب بھی وہ محتاط ہوں، اور اسی احتیاط سے زندگی گذاریں۔ ظاہر ہے کہ ۶۵ سال کی عمر کو پہونچ کر اب وہ بدل ہی گئے ہوں گے:

جوش مجسم محبت اور سراپا خلوص ہیں۔ کوئی شخص ان سے ملنے گئے اور ان سے محبت کرنے لگے، ان کو سراہنے لگے، تو پھر وہ اس کے ہو رہتے ہیں۔ چاہے اس کے بعد ان کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔

ایک نوجوان شید الحمید خاں نامی جوش کے پاس آتے جاتے تھے۔ جوش ان سے اکثر کام لیتے تھے کبھی بازار سے کچھ چیزیں منگوا لیں کبھی ایک آدھ شیشہ منگوا لیا۔ کبھی کپڑا منگوا لیا۔ کبھی دستی یا تانبے منگوا لئے۔ اس طرح وہ کام کر دیتے

اور جوش کے پاس رہتے تھے۔ چونکہ ایک شریف گھرانے سے ان کا تعلق تھا اس لئے جوش ان کو دوست کی حیثیت سے رکھتے تھے، ہم نوالہ و ہم پیالہ بھی تھے۔ بلکہ صرف پیالے ہی کی خاطر وہ آتے بھی تھے۔ یہاں رہنے تک جوش نے ان کی بڑی مدد کی، بلکہ یہاں سے جانے کے بعد بھی ان کو روپے بھیجتے رہے۔ نو دس سال ہوئے کہ عبدالحمید خاں نے انتقال کیا۔ انتقال سے دو دن پہلے انہوں نے میرے سامنے سو روپے کی منی آرڈر جوش کی دہلی سے بھجوائی ہوئی وصول کی تھی، جو انہوں نے عید کی خاطر جوش سے منگوائے تھے۔ اور عید ہی کے روز غریب نے اچانک انتقال کیا۔

اسد عارف ایڈیٹر روزنامہ "صبح دکن" حیدرآباد اور غلام معین الدین قریشی ایم اے (مترجم غالب) آخری زمانہ میں جوش کے ساتھ بہت رہتے تھے۔ ہم پیالہ تھے۔ اسی صحبت میں حکیم آزاد انصاری بھی رہتے تھے۔ مگر وہ پیتے تھے یا نہیں مجھے معلوم نہیں۔ البتہ یہ چاروں درویش دفتر "صبح دکن" کے کمروں میں ہو حق کرتے رہتے تھے۔

لیفٹننٹ کرنل ڈاکٹر اشرف الحق بھی حیدرآباد کے ایک بڑے خاص بزرگ تھے۔ سب سے پہلے ہندوستان سے خصوصی مہارت ڈاکٹر اشتاینا خ کے آپریشن کی حاصل کرنے جرمنی گئے اور اعادہ شباب کے آپریشن کرنے لگے تھے جوش کی طرح اشرف بھی وضع دار تھے اور شاعر بھی تھے۔ غزل خوب کہتے تھے۔ عرفی تخلص تھا۔ ایک کلیات بھی چھپوا دیا تھا۔ جوش کی وجہ سے اشرف بھی دارالترجمہ آجاتے تھے۔ اور اجلاس ہی پر جام چھلکنے لگے۔ اور خوب گھلتی تھی۔

ڈاکٹر کے پہنچتے ہی ملا فدا علی ہاشمی، احسان مودودی سب جوش کے کمرے میں جمع ہو جاتے۔ اور ڈاکٹر مونچھ چڑھا چڑھا کر منہ بنا بنا کر غزل سنانے لگتے۔ اور فی البدیہہ ان سب لوگوں کو غزل میں گالیاں دیتے، اور سب ہنستے تھے۔ ڈاکٹر اعتدال پسند نہ تھے۔ جب پینے لگتے تو پیتے ہی چلے جاتے۔ انتہا یہ کہ ان کے پسینے تک سے شراب کی بو آنے لگتی۔ جب یہ بات محسوس کرتے، دس پندرہ روز مطلق نہ پیتے۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ رعشہ پیدا ہو جاتا۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے پھر مجبوراً پینا شروع کر دیتے۔ دن بھر میں ایک شیشہ ختم کرنے لگتے۔ مگر دو چار روز ہی ایک شیشے کا التزام رہتا اس کے بعد شیشے پر شیشہ چلتا۔ پانی ملاتے نہ سوڈا۔ شیشہ کھولا اور لگے غٹ غٹ پینے۔ مگر جوش ان کے ساتھ بیٹھ کر بھی شیشہ نہ چڑھاتے، بلکہ پیالہ ہی پیتے تھے۔ کمال یہ تھا کہ نہ تو ڈاکٹر ہی کبھی بے خود نظر آتے، نہ جوش۔ دونوں ہوش میں رہتے اور موڈ میں رہتے۔

جوش نے کبھی اپنے کسی دوست کو پینے کے لئے مجبور نہیں کیا۔ جو لوگ خود پینا چاہتے وہ ساتھ دیتے اور جو لوگ پینے والے نہ ہوتے وہ الگ رہتے۔ جوش کبھی کسی کو مجبور کر کے پلانا نہیں چاہتے تھے۔ ابتدا میں جب جوش کے پاس آنے جانے لگا، تو ان کے پینے پلانے کے وقت جاتا ہی نہ تھا۔ مگر جب میری موجودگی میں ڈاکٹر آجاتے تو دونوں مل کر پینے لگتے۔ میں جانا چاہتا تو ڈاکٹر روک دیتے۔ ڈاکٹر ہمیشہ میری تعریف کرتے کہ تو نے اچھا کیا جو اس مکروہ چیز کو منہ نہیں لگایا۔ اور پھر شراب کی برائیاں بیان کر کے کہتے کہ آئندہ بھی اسے منہ نہ لگانا۔ مگر جوش کبھی کبھی سرمستی کے عالم میں مجبور تو نہ کرتے، مگر یونہی تشویق دلانا چاہتے تھے۔ شاید ابتداءً ٹٹولتے رہے کہ میں بھی پینا چاہتا ہوں یا نہیں مگر جب انہوں نے یہ دیکھا کہ میں ع

منکر نتواں شد و ہمرنگ مستاں زیستن

پر عامل ہوں تو پھر کبھی مجھے مجبور نہیں کیا، اور نہ میرے سامنے پینے سے گریز کیا۔ البتہ احمد عارف اور قریشی آجاتے تو

خود میں وہاں سے کھسک جاتا تھا۔ کیوں کہ یہ دونوں میرے سامنے پینے سے رکتے تھے۔ اور میں ان سے اتنا بے تکلف ہونا نہیں چاہتا تھا۔

اور ایک "ڈاکٹر" (معاف کیجئے، یہ جوش ہی کا رسم خط ہے) بھی جوش کے ہم پیالہ تھے، مگر میری موجودگی میں وہ بھی شغل نہ فرماتے تھے۔ بہر حال جوش نے چھپ کر پینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ علانیہ پیتے، اور اپنی مے خواری کی کوئی خاص توجیہہ بھی نہیں کرتے تھے۔ گویا گناہ کرتے تھے، اور اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتے تھے۔ سنا ہے اب انہوں نے توبہ کرلی ہے۔ اگر یہ خبر سچ ہے تو یقیناً پروردگار عالم نے ان کی سب اعتدالیوں کو معاف فرما دیا ہوگا۔ جبھی تو انہیں توبہ کی توفیق نصیب ہوئی۔

جوش کو ایک دفعہ رباعیات کہنے کی سوجھی، اور انہوں نے جو رباعیاں کہنی شروع کیں تو کئی سو رباعیاں کہہ دیں قدوسی صاحب[1] ایک بڑے پابند اور داڑھی دار بزرگ یہاں تھے، جو آج کل کراچی ہی میں ہیں۔ انہوں نے ان میں سے بیشتر رباعیاں لکھ لیں، اور کتابی صورت میں شائع کردیں۔

صبح یا سحر جوش کا خاص موضوع ہے۔ جوش نے اس پر سیکڑوں رباعیاں لکھی ہیں۔ اور نظمیں بھی۔ کاش کوئی انہیں اکٹھا کرکے شائع کردے۔ جوش نے اپنا مجموعہ بڑی بے دردی سے ضائع کیا ہے۔ وہ نظم کہتے اور پھینک دیتے تھے، کوئی ملنے والا ان کی بیاض میں نقل کر دیتا تو رہ جاتی ورنہ ضائع ہو جاتی۔ البتہ بیاض لے کر نظم لکھنے بیٹھتے تو بیاض ہی میں لکھ دیتے، جو محفوظ ہو جاتی تھی۔ بیشترا ایسا ہوتا کہ وقتی طور پر متاثر ہو کر جوش نظم یا رباعی یا قطعہ فی البدیہہ کہہ دیتے، اگر کوئی لکھ لیتا تو رہ جاتی، ورنہ جوش کو یاد بھی نہ رہتا۔ اور وہ بیاض میں نہ چڑھا سکتے۔ اس طرح ان کا بہت سا کلام ضائع بھی ہوا ہے۔

رکھ رکھاؤ اور وضع داری میں جوش منفرد ہیں۔ ان کے ملنے کا ڈھنگ بھی خاص ہے اور سب سے ایک ہی طرح ملتے ہیں۔ تصنع، بناوٹ، اور وقتی تاثر سے وہ کوسوں دور رہتے ہیں۔ وہ جس طرح ہم سے ملتے تھے اسی طرح شہزادگان والا شان سے، اور مہاراجہ سرکشن پرشاد، اور سر اکبر حیدری سے بھی ملتے تھے۔ ذرہ برابر فرق محسوس نہ ہوتا تھا۔ وہی یک رنگی، وہی مسکراہٹ، وہی بے ساختگی، وہی سادگی، وہی بے تکلفی، ان کی بے تکلفی میں بے ادبی کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ وہ بہت ہی معصومانہ انداز میں ہر ایک سے ملتے اور ہر ایک کو گرویدہ کر لیتے ہیں۔

حسن کے متعلق جوش کا نظریہ بہت وسیع ہے۔ وہ رنگ کو حسن میں شریک نہیں کرتے۔ انہیں گورا، سفید، روکھا، پھیکا رنگ قطعاً پسند نہیں۔ وہ مید و شباب کی رنگت سے زیادہ حسن و طرح کو پسند کرتے ہیں۔ آپ ان کے مجموعے میں "جامن والی" پر بھی ایک نظم دیکھیں گے، اور سیاہ فام پتھر پھوڑنے (یا توڑنے) والی دو مزدور عورت پر بھی۔ عورت جوش کو ہر صورت میں حسین نظر آتی ہے۔ چاہے وہ کسی رنگ کی ہو، مگر مکمل عورت ہو۔ عظمت اللہ خاں مرحوم اور جوش اس معاملے میں ہم خیال تھے۔ یہ دونوں ہی "حسن سیاہ تاب" کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ عظمت مرحوم نے "آندھرا دیش کی سندر پتری، کالی کوئل سی کالی" جب کہی تو سب سے زیادہ جوش ہی نے اسے پسند کیا تھا۔

---

[1] اعجاز الحق قدوسی۔

جوش باوجود سادگی اور فروتنی کے مزاج میں ذرا سی بھی رکاوٹ کو بہت زیادہ محسوس کرتے تھے۔ وہ چونکہ ہر ایک سے ایک ہی طرح ملنے کے عادی تھے، اس لئے ان کا ملنے والا ذرا بھی اپنے انداز میں تبدیلی پیدا کرتا، تو آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ (جوش ملگرامی بنا کر حیدرآباد میں تھے، پھر وہ شہر بدر ہو گئے۔) ان کی شہر بدری ہی کے زمانے میں جوش حیدرآباد آئے۔ اور دوبارہ جب جوش .... حیدرآباد آئے تو جوش سے بھی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اور خاصی بے تکلف ملاقات تھی۔ جب حضور نظام دہلی سے حیدرآباد واپس آئے اور شہر میں جشن چراغاں ہوا، اور جگہ جگہ کمانیں بنائی گئیں تو ایک کمان دفتر نظامت ٹپہ (پوسٹ ماسٹر جنرل آفس) کے سامنے بھی نواب سردار نواز جنگ ناظم ٹپہ (پی ایم جی) نے بنوائی۔ اور اس پر ایک قطعہ یا رباعی بخط جلی لکھوانا طے ہوا۔ چونکہ ان دنوں نظامت ٹپہ ہی میں جوش کام کر رہے تھے، اس لئے جوش سے رباعی یا قطعہ لکھنے کی خواہش کی گئی۔ معلوم نہیں جوش صاحب کہہ نہیں سکے یا اس وقت کے لئے کہنا پسند نہیں کیا، اس لئے انہوں نے جوش کو مجبور کیا اور جوش نے فوراً دو رباعیاں اور دو قطعے کہہ دیئے۔ مگر یہ چاروں بھی نواب سردار نواز جنگ کو پسند نہ آئے۔ انہوں نے جوش سے کہا کہ اور کہئے۔

پھر جوش نے جوش کو پکڑا، اور جوش نے چار رباعیاں اور چار قطعات فی البدیہہ کہہ دیئے۔ اور جوش نے سردار نواز جنگ کو سنائے۔ جن میں سے دو قطعات کمان کے دونوں طرف لکھوائے گئے۔ یہ قطعات جوش ہی کے نام سے لکھوائے گئے اور انہیں کے مشہور ہوئے۔ اتنی بے تکلفی اور دوستی دونوں میں ہو گئی تھی، مگر جب جوش صاحب مددگار معتمد فوج ہوئے اور حضور نظام کے پاس آمد و رفت ہونے لگی تو ان کا طرز عمل بدلنے لگا۔ مجھ جیسے لوگ تو خاموش رہ گئے، مگر جوش کی بے نیازی اس کو برداشت نہ کر سکی۔ اور انہوں نے دل کھول کر ڈانٹ ڈپٹ کر دی۔ نتیجہ افتراق تھا۔ جب تک جوش صاحب حضور رباش رہے، یہ بات باقی رہی۔ مگر جوں ہی حضور رباشی اور معتمدی ختم ہوئی جوش صاحب کو بھی جوش آ گیا۔ اور ہوش درست ہوتے ہی انہوں نے پرانے دوستوں کو پھر ہموار کر لیا۔ چنانچہ پولیس ایکشن کے بعد جب وہ یہاں آئے تو بیکاپن ہوٹل پہنچتے ہی انہوں نے مجھے فون کیا کہ میں آدھے گھنٹے تک جوش کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ تم بھی وہیں آ جاؤ۔ چنانچہ پھر وہی جوش تھے اور وہی جوش۔ وہی مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین ہوش و جوش!

غرض یہ کہ جوش جتنے خوددار ہیں اتنے ہی صاف دل بھی۔ بہت جلد صاف بھی کر دیتے اور صاف بھی ہو جاتے ہیں جوش شاعر ہیں، اور عموماً شاعر اپنے معاصرین سے پرخاش رکھتے ہیں۔ مگر جوش نے کبھی کسی کی مخالفت نہیں کی۔ عزیز لکھنوی سے وہ کس طرح اُلجھے، میں خود حیران ہوں۔ مگر حیدرآباد میں تو وہ یہاں کے تمام شعراء سے نہ صرف خوش رہے بلکہ ان کے مداح اور سرپرست بنے رہے۔ علی اختر اور صدق جائسی کو انہوں نے شہزادہ والا شان کے دربار میں پہنچایا۔ امجد[1] سے وہ بڑے خلوص کے ساتھ ملتے تھے اور ان کے مداح تھے۔

جوش خط لکھنے میں کاہل واقع ہوئے ہیں۔ حیدرآباد سے جانے کے بعد انہوں نے مجھے کوئی خط مدت تک نہیں لکھا۔ بالآخر میں نے ہی پہل کی، تو جواب دیا۔ پھر سلسلہ جاری رہا۔ اب ہندوستان سے جانے کے بعد بھی وہ انہیں ہی سے

---

[1] افسوس کہ امجد حیدرآبادی پچھلے دنوں داغ مفارقت دے گئے۔

محمد حبیب اللہ رشدی

جوش
حیدرآباد دکن میں

سنہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے۔ میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا۔ یونیورسٹی کو قائم ہوئے ایک سال بھی نہ ہوا تھا۔ اردو کے پروفیسر مولوی سید وحید الدین سلیم پانی پتی تھے۔ ہم طالب علموں کی نظروں میں پروفیسر سلیم کی بڑی وقعت تھی۔ اُن کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو ہم اپنے لوحِ دل پر منقوش کر لیتے تھے۔ اکثر پروفیسر سرما اور گرما کی طویل تعطیلوں میں اپنے اپنے وطن چلے جاتے تھے۔ لیکن پروفیسر سلیم پانی پت جانے کے بجائے لکھنؤ اور ملیح آباد جاتے تھے۔ وہاں ان کے جگری دوست ڈاکٹر عبدالکریم صاحب رہتے تھے۔ (اب بھی بقیدِ حیات ہیں) وہاں سے وہ شاید دو چار روز کے لئے وطن کی صورت بھی دیکھ آتے ہوں گے۔

اُس سال پروفیسر سلیم شمالی ہندوستان سے واپس آئے تو ہم چند طلبہ سے بڑے والہانہ الفاظ میں ملاطفانہ تکلم کے ساتھ فرمایا:

"ہمارے دوست بشیر احمد خاں کے لڑکے کی ایک بہت عمدہ کتاب "روحِ ادب" کے نام سے نکلی ہے۔ اس میں نظم بھی ہے، نثر بھی ہے، تصویریں بھی ہیں۔ تم وہ کتاب ضرور منگوا لو۔"

استادِ عالی جاہ کے حکم کی میں نے فوراً تعمیل کی۔ کتاب آئی۔ کتنی خوب صورت کتاب تھی! کاغذ عمدہ، لکھائی اچھی، چھپائی اچھی، جلد اچھی، اور پھر متعدد تصویریں بھی ——— لیکن ان تصویروں میں اکثریت سگریٹ کی حسیناؤں کی تھی۔ اس زمانے میں قینچی سگریٹ کی ہر ڈبیہ میں کسی یورپی حسینہ کی تصویر ہوا کرتی تھی۔ ان تصویروں کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں اُکتا چکی تھیں۔ اس لئے "روحِ ادب" میں ان تصویروں کی موجودگی نے اس کو نظروں سے گرانے کا کام کیا۔

ہم چند احباب نے اس کتاب کو بڑے اشتیاق سے پڑھا۔ اس کی ایک نظم "سحر کی آمد آمد" مجھے اتنی پسند آئی کہ اس کو میں نے اپنی بیاض میں بھی نقل کر لیا۔ "روحِ ادب" کو میرے ایک عزیز دوست نے چھین لیا اور میرے تقاضوں کے باوجود واپس نہیں کی۔ میں نے انتقاماً ان سے لارڈ ٹینی سن کے مجموعۂ نظم لے کر اپنے دل کو ڈھارس تو دے لی مگر بیچارے ادب کی روح پھر میرے یہاں واپس نہ آئی۔ اور شاید میں پچھتاؤں گا کہ پھر کبھی صورت نہ دیکھی۔ پھر بھی وہ بیاض اس وقت موجود ہے

مہاراجہ کشن پرشاد، سر یمین السلطنت، حضور نظام مرحوم میر محبوب علی خاں کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ان کے بڑے معتمد علیہ دیوان ریاست یعنی وزیر اعظم تھے۔ موجودہ حضور نظام میر عثمان علی خاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد انہیں علیحدہ کر دیا، سر سالار جنگ اول کے پوتے نواب یوسف علی خاں کو دیوان بنایا، چند سال کے بعد انہیں بھی علیحدہ کر دیا اور خود ہی وزیر اعظم کا کام کرتے رہے۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے چند سال بعد غالباً حکومت انگریزی کے ایما پر ایک مجلس وزرا قائم کی جس کا صدر... سر علی امام کو بنایا گیا۔ درباری سازشوں سے ناراض ہو کر سر علی امام نے استعفیٰ دے دیا۔ عارضی طور پر ایک قدیم پارسی عہدیدار سر فریدوں جی کو، اور پھر ایک قدیم امیر گھرانے کے رکن نواب ولی الدولہ کو صدر اعظم بنایا گیا۔

استعفے رد و بدل کی وجہ سے مہاراجہ سر کشن پرشاد کی وہ پہلی سی آن بان نہیں رہی تھی، بلکہ ان کی حیثیت اس وقت ایک خانہ نشین امیر کی سی تھی۔ اگرچہ وہ اپنے آبائی منصب پر، پیشکار ریاست، ضرور تھے۔ مگر یہ خدمت برائے نام تھی، اور اس کی تنخواہ ایک طرح کی پنشن تھی۔ مہاراجہ بہادر کا نہ تو حضور نظام پر کوئی خاص اثر تھا اور نہ ریاست کے نظم و نسق میں انہیں کوئی دخل تھا۔ البتہ ان کی ذاتی خوبیاں خصوصاً ان کی علم دوستی اور شعر فہمی و قدر دانی ایسی تھی کہ وہ ریاست کے اندر اور باہر بھی بڑی مقبول شخصیت کے مالک تھے۔ وہ حکیم الامت حضرت اقبال کے بڑے قدر دان اور دوست تھے۔ اس پس منظر میں جوش کو صرف مہاراجہ بہادر کی توجہ سے ملازمت کا مل جانا مبہم نظر آتا تھا۔

شاید میں نے ایسا ہی کچھ جواب دیا۔

دو چار روز کے بعد کا واقعہ ہے کہ میں مولوی سلیم کے یہاں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک خوب رو، سرخ و سفید نوجوان داخل ہوا۔ تاک نقشے کو دیکھ کر مجھے "روح ادب" کے مصنف کی تصویر یاد آئی۔ مگر تصویر میں مصنف کے چہرے پر فلسفیانہ سنجیدگی اور عینک نے اسے خاصا معمر بنا دیا تھا۔ اور یہ نوجوان تو بالکل بچا سا معلوم ہوتا تھا۔ کچھ شبہ سا رہا ـــــ ممکن ہے شبیر حسن خاں نے اپنے چھوٹے بھائی کو کسی کام سے بھیجا ہو!

آنے والے نوجوان کو پروفیسر سلیم سے تخلیے میں کچھ کہنا تھا، اس لئے میں نے اٹھنے اور تعارف حاصل کرنے کا موقع نہ تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہی جناب جوش تھے۔

اس واقعے کے کچھ ہی مدت کے بعد کالج کی تعطیلیں شروع ہو گئیں۔ میں اپنے والدین کے پاس اضلاع پر چلا گیا اور پھر بمبئی روانہ ہو گیا۔ اس لئے تعطیل کے ختم ہونے پر بھی حیدرآباد واپس نہ آ سکا۔ کئی ماہ بعد ہم لوگ جب حیدرآباد پہنچا تو علمی حلقوں میں ایک غلغلہ بپا ہوا تھا کہ جوش صاحب اردو کے پروفیسر بنائے جا رہے ہیں۔

اس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی میں ہر شعبے کا صرف ایک پروفیسر ہوتا تھا، جس کی تنخواہ کا گریڈ پانسو تا ہزار تھا۔ ریڈر اور لکچرار کے القاب مستعمل نہ تھے بلکہ پروفیسر کے تحت ایک یا دو اسی کے درجے کے ہوتے تھے جو اسسٹنٹ پروفیسر کہلاتے تھے۔ خواہ تنخواہ کے لحاظ سے وہ ریڈر ہوں یا لکچرار۔ مولوی سلیم الدین وحید کا گریڈ ریڈر کا تھا، اور سید سجاد صاحب کا لکچرار کا۔ مگر دونوں کا لقب اسسٹنٹ پروفیسر تھا۔ اب علمی حلقوں میں یہ بات حسرت آمیز طنز کے ساتھ کہی جاتی تھی کہ جوش صاحب نے یہ استدلال پیش کیا ہے کہ یونیورسٹی میں اردو کے دو ریڈر یا لکچرار تو موجود ہیں مگر پروفیسر کا عہدہ خالی ہے، اس لئے مجھے پروفیسری دی جائے۔

بہت بعد میں یہ معلوم ہوا کہ اس قصے کی اصل وجہ یہ تھی کہ نواب مہدی یار جنگ (ابن عماد الملک سید حسین بلگرامی) نے جو ریاست کے محکمۂ سیاسیات (امورِ خارجہ) کے وزیر تھے، یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جس طرح آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایک کرسیٔ شعر ہوتی ہے اسی طرح عثمانیہ یونیورسٹی میں بھی شاعروں کے لیے ایک استاد کی جگہ قائم کی جائے اور وہ جوش کو دی جائے۔

یہ بات بھی مشہور ہوئی کہ حضور نظام نے جناب جوش کی صلاحیت و قابلیت کے متعلق حضرت علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی (ناظرِ ادبی دارالترجمہ) کی رائے طلب کی تھی۔ حضرت علامہ نے جوش کی صلاحیتِ شعرگوئی کو آزمانے کے لیے مرحوم سے آصف جاہ کے ایک سہرے کو نظم کرنے کی فرمائش کی۔ جوش نے اس واقعے کو بڑی خوبی سے نظم کیا۔ جس پر علامہ طباطبائی نے جوش کے متعلق اچھی رائے لکھ بھیجی۔

ممکن ہے نواب مہدی یار جنگ کی اس تجویز میں اس رائے کا بھی کچھ دخل ہو۔ بہرحال، جوش کو اردو کی پروفیسری دی جانے کی افواہ میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوگی۔ اس افواہ کے بعد میں نے نہ تو حضرت سلیم کی زبان سے ہمارے دوست بشیر احمد خاں کے لڑکے کا کوئی حال سنا، اور نہ جناب جوش کو کبھی حضرت سلیم کی محفل میں دیکھا۔

پروفیسری پر جوش کے تقرر میں کوئی موانع تھے۔ ریاستی حالات کے لحاظ سے اگر ڈپٹی کلکٹری یا کسٹمس یا پولیس یا کسی اور محکمے میں اچھی آمدنی کی ملازمت کے لیے کوشش کی جاتی تو بہ آسانی تقرر ہو جاتا، اور کوئی شور و شر نہ ہوتا۔ مرزا یاس یگانہ چنگیزی کا سب رجسٹراری پر تقرر ہوا۔ علمی حلقوں کو برسوں پتہ نہ چلا کہ وہ ریاست حیدرآباد میں موجود ہیں (کہیں سنا ہے کہ سب رجسٹراری کا عہدہ بالائی آمدنی کے لحاظ سے پروفیسری سے زیادہ منفعت بخش ہوتا ہے) لیکن یونیورسٹی کی بات اور تھی۔ اول تو یہ کہ یونیورسٹی نئی نئی قائم ہوئی تھی جس میں تمام مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ اس لیے حیدرآباد کے تمام دانشور طبقے کی یہ خواہش تھی کہ یہ نیا تجربہ کامیاب رہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر یونیورسٹی کالج کی پرنسپلی کے لیے یہ طے کیا گیا تھا کہ ایسے شخص کو منتخب کیا جائے جو علوم مشرقیہ اور مغربیہ دونوں میں اونچا درجہ رکھتا ہو۔ یہ بھی مشہور تھا کہ پرنسپلی پر کیمبرج کے مشہور مستشرق پروفیسر ایڈورڈ براؤن کو بلایا جا رہا ہے۔ یہ خیال بعد میں بعض مصالح کی بنا پر ترک کر دیا گیا۔

پرنسپلی کے لیے دوسرا انتخاب ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا رہا تھا۔ مگر وہ یونیورسٹی کالج کے قائم ہونے سے پہلے وفات پا گئے۔

پرنسپل کے تقرر کے بغیر ہی کالج کا افتتاح ہوا۔ عارضی طور پر ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر آف ایجوکیشن) کو کالج کا نگران پرنسپل قرار دیا گیا۔ اس طرح پہلے مہدی یار جنگ بلگرامی اور ان کے بعد سرسید احمد خاں کے پوتے سید راس مسعود (سر مسعود جنگ) کالج کے نگران پرنسپل رہے۔

کالج کا پہلا تعلیمی سال یونہی گزر گیا۔ دوسرے سال کے ابتدائی زمانے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا تقرر ہوا، جو اس زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی عثمانیہ یونیورسٹی کے لیے ایسے موزوں پرنسپل تھے کہ شاید قدرت نے انہیں اسی کے لیے تیار کیا تھا۔ مگر بعض پیچیدگیوں نے انہیں یونیورسٹی سے جدا کر دیا اور وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہو کر چلے گئے۔

ارباب یونیورسٹی کو اسی انداز کے کسی موزوں شخص کی تلاش تھی، مگر ٹھیک ریاستی روایات کے مطابق حضور نظام نے اچانک ایک سائنس کے پروفیسر کو اپنے فرمان کے ذریعے یونیورسٹی کا پرنسپل بنا دیا۔ یہ بزرگ ریاست ہی کے باشندے یعنی "ملکی" تھے۔ اور حیدرآباد ہی کے ایک قدیم کالج میں جس کا الحاق مدراس یونیورسٹی سے تھا، سائنس کے پروفیسر تھے اور "ملکی تحریک" یعنی صوبہ پرستی کے بڑے علم بردار تھے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی جوش کے قدر داں تھے۔ اگر وہ رہتے تو شاید یہ مرحلہ کسی نہ کسی صورت سے طے ہو ہی جاتا۔ مگر "ملکی" اور سائنس داں پرنسپل کو ایک "غیر ملکی" اور شاعر سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی۔ یونیورسٹی کے معاملات میں پرنسپل کو بڑا دخل تھا۔ جوش کو اس وسیلے سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔

اس کے علاوہ ہماری یونیورسٹیوں کے ارباب حل و عقد کا معیار قابلیت صرف ڈگریاں ہوتی ہیں۔ صحیح اہل علم اور تخلیقی ادب کی صلاحیت کو پرکھنے اور قدر کرنے کا درد سر وہ نہیں پالتے۔ غرض حضرت جوش کو اپنا جوہر منوانے کے لئے صبر سے کام لینا پڑا۔

حیدرآباد میں ایک بہت قابل پارسی مسٹر کیقباد تھے۔ وہ بی اے تھے۔ اردو تقریباً ان کی مادری زبان تھی۔ فارسی بہت اچھی جانتے تھے اور اس میں شعر کہتے تھے۔ ایک زمانے میں مولانا حمید الدین فراہی صدر مدرس دار العلوم کالج کے حلقۂ درس قرآن میں بھی حاضری دے چکے تھے۔ ان صلاحیتوں کی بنا پر ان کے لئے یہ تجویز ہوئی کہ وہ انتقالی سررشتے کے بجائے یونیورسٹی کے دارالترجمے کے لئے کہیں زیادہ موزوں ثابت ہوں گے۔ چنانچہ ان کی [illegible] ان میں کسی قدر مناسبت کے ساتھ دارالترجمے کے مترجم بنائے جانے کی تحریک ہوئی۔ یہ تحریک متعلقہ دفاتر کے مراحل سے کامیابی کے ساتھ گذر کر حضور نظام کے ملاحظہ میں پیش ہوئی۔

غالباً حضور نظام کو یہ خیال گذرا کہ یہ انگریزی داں پارسی آدمی ہیں، انہیں اردو فارسی سے کیا تعلق، چنانچہ حضور نے مسٹر کیقباد کی اس تحریک پر کچھ اس قسم کا حکم لکھا کہ "دارالترجمے کے لئے اس پارسی کا نام کیوں پیش ہوا ہے جبکہ شبیر حسن خاں جوش کا سا لائق آدمی موجود ہے ـــــ"

حضور نظام کے الفاظ کچھ ہی ہوں، ان کا جوش کی تائید میں ایک لفظ ہی جوش کے تقرر کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ فوراً دارالترجمے میں مترجم بنا دیئے گئے۔ اور کچھ ہی مدت کے بعد علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی کے منتقل ہو جانے پر ان کی جگہ "ناظر ادبی" بنا دیئے گئے۔ جس کی تنخواہ پانسو روپے تھی۔

مسٹر کیقباد کو حضور نظام کے اس فیصلے سے رنج ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ مگر قسمت نے عجیب پلٹا کھایا۔ ایک نیا محکمہ "دستوری اصلاحات" کا قائم ہوا۔ جس میں مسٹر کیقباد ترقی کے ساتھ لے لئے گئے۔ اور تقریباً اسی زمانے میں جبکہ جوش "ناظر ادبی" بنے، ان کی تنخواہ آٹھ سو روپے ہو چکی تھی۔ اس سے کچھ عرصے بعد ان کی محنت اور کارگذاری کے صلے میں حضور نظام نے انہیں "کیقباد جنگ" کا خطاب دیا تھا۔

میرا یہ خیال ہے کہ حضرت جوش کو ایسے زمانے میں جب کہ ان کی شاعری بہار پر آ چکی تھی، اگر دارالترجمے سے وابستہ ہونے کا موقع نہ ملتا تو شاید ان کی شاعری کا وہ رنگ نہ ہوتا جو اب ہے۔ دارالترجمے میں اس وقت حضرت ذکاء اللہ دہلوی

کے صاحبزادے مولوی عنایت اللہ تھے۔ اسے "ناظم" تھے۔ مولانا عمادی "ناظر مذہبی" اور علامہ نظم طباطبائی "ناظر ادبی" تھے جن کی جگہ بعد میں حضرت جوش نے لے لی۔ مترجموں میں قاضی تلمذ حسین، مولوی ابوالخیر مودودی، (برادر بزرگ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)، سید ہاشمی فرید آبادی وغیرہ تھے۔ نظام شاہ لبیب تیموری، تمنا صاحب اور جاگی پرشاد صاحب بھی مختلف عہدوں پر تھے۔

ایک سکھ مترجم تھے جن کا نام غالباً بلدیو سنگھ تھا۔ یہ سائنس کی کتابوں کا ترجمہ کرتے تھے۔ اور اس زمانے میں یہ سنا تھا کہ بلدیو سنگھ نے جتنی کتابوں کا ترجمہ کیا تھا اتنا ترجمہ کسی نے نہیں کیا۔ جاگی پرشاد نے ہزاروں اصطلاحیں جمع کی تھیں جن کو غالباً انجمن ترقی اردو نے کتابی صورت میں شائع کیا۔

دارالترجمے کے اس ابتدائی دور کے مترجموں میں سے اب صرف تین جاری بقید حیات ہیں۔ مولوی ابوالخیر مودودی اور مولوی سید ہاشمی فرید آبادی لاہور میں ہیں۔ جاگی پرشاد حیدرآباد دکن ہی میں ہیں۔ اور سنا ہے کہ وہاں آج کل اردو کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔

"ناظر ادبی" ہونے کی وجہ سے حضرت جوش کے فرائض میں یہ داخل تھا کہ ترجمہ شدہ ہر کتاب کو اس نظر سے دیکھیں کہ اس میں کوئی ادبی سقم نہ رہے۔ اس کی وجہ سے انہیں مختلف علوم کی کتابیں دیکھنے اور مترجموں سے تبادلۂ خیال کرنے کا بڑا نادر موقع ملا۔ دارالترجمے میں مولوی ابوالخیر، مولوی سید ہاشمی، مولانا عمادی سے جوش کے خاص تعلقات تھے۔ مولانا عمادی ایسے بزرگ تھے کہ عربی میں تبحر علمی رکھنے کے باوجود اردو ادب اور شاعری کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ زندہ دلی کا یہ عالم تھا کہ جوش کی آئے دن کی شوخیوں سے نہ صرف یہ کہ ناخوش نہیں ہوتے بلکہ لطف اٹھاتے اور داد دے کر حوصلہ بڑھاتے تھے۔

حضرت جوش کی وجہ سے بعض اوقات مولوی ابوالخیر مودودی یا مولوی سید ہاشمی کا کمرہ محفلِ مشاعرہ بن جاتا تھا جو مولوی عنایت اللہ کے سے منتظم کام کرنے والے کے تنغص کا باعث ہوتا تھا۔

جوش کی اس زمانے کی ایک نظم "پروگرام" ہے جو محض سخن گستری نہیں ہے بلکہ اس زمانے میں ان کی روزمرہ کی زندگی کا صحیح ریکارڈ ہے۔

قیامِ حیدرآباد کے ابتدائی زمانے میں جوش کی پہلی نظم "دامن والیاں" وہاں کے ایک ماہنامے میں شائع ہوئی اس نظم کو دیکھ کر بہت سے لوگ جوش کی شاعری کے معترف ہو گئے۔ اور بہت سے مضحکہ اڑایا کرتے تھے۔ اس وقت تک ترقی پسند ادب نے جنم نہیں لیا تھا۔ روایتی انداز میں شاعری کرنے والوں کو محنت کش طبقے میں حسن نظر ہی نہ آتا تھا۔

میرے عزیز اور جگری دوست معین الدین قریشی مرحوم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبا میں پہلے شخص تھے جنہوں نے جوش کے کمالِ شاعری کو پہچانا۔ حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹی نے قریشی مرحوم کا سا دوسرا کوئی طالب علم پیدا نہیں کیا۔ شعر و ادب کا خون قریشی کی رگ رگ میں دوڑتا پھرتا تھا۔ وہ جوش کے ایسے پرستار تھے کہ اب تک جوش کے احباب میں ان کا ثانی مجھے نظر نہیں آیا۔

قریشی کو جوش کی "روحِ ادب" اتنی پسند تھی کہ انہوں نے اس کے ایک شعر کی تصویر حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ قیوم مرحوم سے بنوائی تھی۔ اتفاق کی بات کہ ابتدائی زمانے میں جوش نے انہیں کے محلے میں مکان لیا تھا۔ اس وجہ سے جوش سے ان کے مراسم بڑھتے گئے۔

میں نے سنہ ۱۹۲۷ء میں ایم اے کیا۔ قسمت کے ایک کرشمے نے میرے اپنے منصوبے اور خواہش کے ایک ہفتہ وار اخبار کا ایڈیٹر بنا دیا۔ ناتجربہ کاری کی قیمت میں اپنی عمر عزیز کے دو تین برس نذر کرنے پڑے۔ اس سخت کش مکش کے دور میں شاعری اور ادب سے لطف اندوزی کا کیا موقع تھا! اس مدت میں قریشی مرحوم اور احمد عارف مرحوم (مدیر و مالک "صبح دکن") کے جوش سے مراسم بہت بڑھ چکے تھے۔ آخر ایک روز ایک دوست کی شادی میں، ہم لوگ جمع تھے کہ حضرت جوش بھی تشریف لائے۔ وہاں نشست رہی۔ اس کے بعد جوش ہم سب کو اپنے دولت خانے پر لے گئے، اور وہاں دیر تک صحبت بھی رہی۔ اور جوش کی متعدد نظمیں سنیں۔ مجھ سے بھی شعر سنانے کی فرمائش ہوئی، بلکہ اصرار کیا گیا۔ مجھے جوش کے کلام کے مقابلے میں اپنے شعر سنانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ بہرحال دو ایک نظمیں سنائیں۔ حضرت جوش نے بہت داد دی مگر مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ فیاضی سے کام لے رہے ہیں۔ غرض حضرت جوش کو اپنے شعر سنانے کا میرا یہ پہلا اور آخری موقع تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی یہ جسارت نہیں ہوئی۔

اس واقعے کے کچھ ہی دنوں بعد جوش ہمارے ہی محلے (نام پلی) کے ایک مکان میں اُٹھ آئے۔ جو میری سکونت سے بہت ہی قریب تھا۔ یہ مکان ایک باغ میں تھا جو "اندر جیت کا باغ" کہلاتا تھا۔ جوش کے سارے قیام حیدرآباد کی مدت میں انہیں اس سے بہتر مکان نہ ملا ہوگا۔ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ مکان شاعری کے لئے بنایا گیا تھا۔ کچھ مدت کے بعد جوش نے اپنے خانہ باغ میں وہ ساحرانہ نظم سنائی۔ جس کا مطلع ہے ؎

دیدنی تھا میری محفل کا سماں کل رات کو
مہرباں تھا وہ بتِ نامہرباں کل رات کو

اب ہم اربابِ ثلاثہ یعنی میں، قریشی اور عارف کا التزاماً روزانہ کا پروگرام بن گیا کہ دن بھر اپنے کام کاج میں معروف رہتے لیکن پانچ چھ بجے شام کو جوش کے ہاں پہونچ جاتے۔ چند اور احباب بھی جمع ہو جاتے۔ اکثر تو یہ ہوتا کہ سب مل کر باہر کہیں نشست جماتے۔ کبھی کبھی جوش کے خانہ باغ ہی میں محفل جمتی۔ اس دور کے آخری دو تین سال ویکاجی ہوٹل کے صحن میں داہنی جانب کی جھاڑی ہمارے لئے مخصوص سی ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں جوش کے برادر نسبتی ابرار حسن خاں مرحوم بھی جوش کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ وہ محفل کے بلبلِ ہزار داستاں تھے۔ اتنے ذہین اور اتنے خوش تقریر انسان تھے کہ اُن کی موجودگی میں کسی کا چراغ نہیں جلتا تھا۔

اس دور میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جوش کا کلام بتدریج بلاغت اور پختگی کی بلندی کو چھو رہا ہے۔ ایک نظم کے بعد دوسری نظم میں نمایاں ترقی نظر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوش نے تشبیہوں اور استعاروں کا کوئی مخزن تلاش کر لیا ہے۔ جہاں سے وہ روزانہ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے اٹھا لاتے ہیں۔ ان کے کلام کی ترقی کی یہ رفتار دیکھ دیکھ کر مجھے اپنی شاعری کے متعلق احساس کمتری بڑھتا جاتا تھا۔ یوں تو میں جوش کی آمد سے کئی سال پیشتر سے شعر کہتا تھا، مگر قریشی مرحوم کی ادارت میں کالج کا رسالہ "مجلۂ عثمانیہ" جاری ہونے کے بعد ان مرحوم کی حوصلہ افزائی اور قدردانی نے اس وہم میں مبتلا

کر دیا تھا کہ میں بھی کوئی بڑا شاعر ثابت ہوں گا۔ لیکن اب تقریباً روزانہ جوش کا کلام بلند سے بلند تر ہوتا دیکھ کر میں نہایت سنجیدگی سے یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ میں واقعی شاعر ہوں بھی یا نہیں؟ اگر واقعی شاعر ہوں تو میرا کلام مائل بہ ترقی کیوں نہیں؟ کئی روز اسی ادھیڑ بن میں گذارنے کے بعد آخر ایک روز تنہا تالاب "حسین ساگر" کے کنارے جا بیٹھا۔ اور اپنے تمام قوائے عقلی کو جمع کر کے کسی قطعی فیصلے پر پہونچنے کے لئے غور کرنا شروع کیا۔ بات یہ سمجھ میں آئی کہ اردو شعر عربی اوزان پر کہا جاتا ہے اس لئے ہر شخص آسانی سے شعر موزوں نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر طبیعت میں موزونی ہو تو تھوڑی سی مشق کے بعد شعر موزوں ہونے لگتے ہیں ـــــ بس، یہاں آ کر ہم دھوکا کھا جاتے ہیں کہ ہم بھی شاعر ہیں۔ حالانکہ وہ صرف موزونی طبع ہے مگر شاعری ایک اور ہی چیز ہے جو انسان کے شعوری اور تحت شعوری، دونوں قسم کے تجربات کو تخیل کے مقناطیس سے حسب ضرورت کھینچ نکالتی ہے۔ اور شعر کے قالب میں ڈھالنے کے لئے موزونی طبع کے حوالے کرتی ہے ـــــ وہ ایک وہبی چیز ہے جو ہر کسی کو محض اس کی آرزو کرنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ یہ عین ممکن ہے کہ کسی غیر شاعر میں قدرت نے دوسری عمدہ صلاحیتیں ـــــ شاید شاعری سے بہتر صلاحیتیں ـــــ ودیعت کی ہوں، مگر وہ شاعری کے چکر میں پڑ کر نہ تو اپنی اُن خاص صلاحیتوں کو پہچانتا ہے اور نہ ان سے کام لے کر قدرت کے منشاء کو پورا کرتا ہے۔ جونہی یہ بات میرے ذہن پر واضح ہوئی فوراً دل نے فیصلہ کیا کہ بس شاعری بند ـــــ اپنے اس فیصلے کو "ترک شعر" کے عنوان سے نظم کیا، اور اشاعت کے لئے "مخزن" کو دے کر ہمیشہ کے لئے شاعری کے عذاب سے اپنے ذہن کو نجات دلا دی۔ آج تک میں اپنے اس فیصلے کی صحت پر نہ صرف مطمئن بلکہ نازاں بھی ہوں۔

اس فیصلے کے بعد جوش کی محفلوں میں شعر سننے کا لطف بڑھ گیا۔ اور جوش کی روزافزوں ترقی کو دیکھ دیکھ کر یہ مسرت دل میں چٹکیاں لینے لگی کہ اردو شاعری جس کی عمر فارسی شاعری سے صدیوں کم ہے اب اس قابل ہوتی جا رہی ہے کہ اس کو فارسی کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔

ایک دن یہ اطلاع ملی کہ حضرت فانی بدایونی حیدرآباد تشریف لائے ہیں۔ ہم سب کو ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ جس دن ہمیں یہ اطلاع ملی تھی اسی دن شام کو شاید احمد عارف نے فانی کی آمد کے متعلق جوش سے دریافت کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

جوش نے کہا "چلو ابھی چلیں"۔

فانی ریلوے اسٹیشن کے مقابل "محبوب سرائے" میں جو سرکاری سرائے تھی، اور جس کا انتظام ہوٹلوں کا سا تھا، ٹھہرے ہوئے تھے۔ جوش نے رہبری کی۔ فانی موجود نہیں تھے۔ معلوم ہوا۔ مہاراجہ بہادر کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔ اب مہاراجہ بہادر خانہ نشین امیر نہیں تھے، بلکہ دوبارہ ریاست کے صدر اعظم بن چکے تھے۔ عام حالات میں اگر صاحب خانہ موجود نہ ہو تو ملاقاتی واپس چلا جاتا ہے مگر یہ فانی کا کمرہ تھا۔ حضرت جوش خود صاحب خانہ بن گئے۔ بوتل کھلی، دور چلنے لگے۔ شعر خوانی شروع ہو گئی خبر نہیں کتنا وقت گذر گیا۔

جب حضرت فانی کمرے میں داخل ہوئے تو کوئی اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ کمرے میں طوفان بدتمیزی مچا ہوا تھا۔ فانی کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ تھکے ماندے چلے آ رہے ہیں۔ وہ خود بہت سنجیدہ آدمی تھے۔ مستی خیز نگاہوں سے جوش کو

دیکھا۔ اور خوم بان کی طرح ایک جگہ بیٹھ گئے۔

حضرت جوش نے کسی کا تعارف نہیں کیا۔ بعض دوست سرد رسے کے عالم میں فانی سے اس طرح پیش آنے لگے، جیسے برسوں کے بے تکلف دوست ہیں۔ پھر بھی ان مرحوم نے متانت آمیز تحمل سے کام لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دل میں کہہ رہے ہوں:

"جوش! یہ کن لوفروں کو یہاں لے آئے؟"

غرض حضرت فانی سے یہ پہلی ملاقات میرے لئے تو خوش گوار نہیں تھی۔ ہم نے بعد میں جوش سے اس کی شکایت بھی کی کچھ ہی مدت کے بعد نیاز فتح پوری بھی حیدرآباد آئے اور فاضل جوش ملگرامی کے یہاں مقیم ہوئے۔ ایک دفعہ جوش نے فانی، نیاز، ہوش وغیرہ کو چائے پر بلایا اور اپنے بہت سے احباب کو بھی مدعو کیا۔ پانچ چھ بجے باغ میں سب جمع ہوئے۔ چائے نوشی اور خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ مجمع قدرے بڑا تھا۔ اس لئے الگ الگ ٹولیاں سی بن گئیں۔ شام ہوئی ایک مختصر سی پارٹی باہر کے کمرے میں آ بیٹھی۔ اور دور چلنے لگے۔

اس روز خصوصیت سے ابرار حسن خاں مرحوم پہلے ہی سے دور چلا رہے تھے یا اسی صحبت میں ذرا تیز روی سے کام لیا تھا کہ بہک سے گئے۔ ہوش ملگرامی کے پاس جا بیٹھے اور ان پر نا خوش گوار فقرے کسنے لگے۔ جوش ملگرامی حضور نظام کے درباری بن چکے تھے۔ اپنی اس تازہ اہمیت کو کیسے بھلا سکتے تھے۔ ابرار کے چبھتے ہوئے فقروں سے مشتعل ہو گئے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ تین چار اصحاب رخصت ہو گئے۔

اس موقع پر ابرار مرحوم کی جو نیر سے مجھے بھی اچھی نہیں لگیں۔ مگر وہ اپنے آپے میں کہاں تھے۔ تیر نکل جانے کے بعد اسے واپس کیوں کر لیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد رسالہ "نگار" میں جوش کے خلاف جو ہنگامہ برپا ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اس کے اور بھی چند اسباب تھے۔ مگر اس کی علت مشتعلہ یہی صحبت تھی۔

بعد میں یہ بھی سنا گیا کہ ہوش کو یہ شکایت تھی کہ جوش نے اپنے گھر بلا کر اپنے بہنوئی سے گالیاں دلوائیں۔ یہ بات صحیح نہیں تھی۔ جوش کو بھی ابرار مرحوم کی وہ حرکت پسند نہیں آئی تھی۔ ابرار جب بہک جاتے تو پھر کسی کے قابو میں نہیں آ سکتے تھے۔

بہرحال مہینوں بلکہ برسوں جوش کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم جاری رہی۔

جناب نیاز فتح پوری نے اپنی حد تک جو کچھ کیا وہ اس قابل تھا کہ جوش کی شعری کوتاہیوں کی تحقیقات کے لئے ایک رائل کمیشن بیٹھایا جاتا، اور پھر جوش سے منصب شاعری چھین کر انہیں کالے پانی بھیج دیا جاتا۔ مگر اردو کی نادان پبلک جوش کی شاعری کو مانتی ہی رہی۔ اور محفل شعر و سخن میں ان کی کرسی بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ اس مہم کے لئے "نگار" کے جتنے صفحے وقف کئے گئے، ان کی سیاہی اور کاغذ آج تک ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں۔ اور ہمارے اہل قلم پر کمال کے پر پرواز کو کاٹنے کے لئے تنقید کی قینچی کا بے مصرف ہونا ثابت کر رہے ہیں۔

محلہ نام پلی جہاں ہم رہتے تھے، حیدرآباد کے مشہور پارک "باغ عامہ" کے قریب ہی واقع ہے۔ طلوع آفتاب سے

قبل میں اکثر تالاب حسین ساگر پر تفریح کے لئے جاتا۔ اور کبھی کبھی "باغ عامہ" ہی میں ٹہلا کرتا تھا۔ ایک روز صبح سویرے حضرت جوش سے اس باغ میں مڈبھیڑ ہوگئی۔ اُس زمانے میں جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، قریشی مرحوم اور عارف مرحوم کے ساتھ میں شام کو روزانہ حضرت جوش کی محفل شعر و ادب میں حاضر رہتا تھا۔ اس محفل کے دوسرے شرکاء تو صبح آٹھ نو بجے تک خواب راحت کے مزے لیتے تھے۔ مجھے علی الصباح باغ میں دیکھ کر جوش نے تعجب کیا، اور یہ طے ہوا کہ آئندہ سے دونوں ساتھ ساتھ تفریح کریں گے۔

ادھر کیقباد جنگ بھی صبح کو اسی باغ میں تفریح کے لئے آتے تھے۔ مگر اُن کی تفریح قاعدے کی پابند تھی۔ اُن کے چند چکر معین تھے۔ ان کو پورا کرکے وہ اپنے مکان چلے جاتے تھے جو باغ کے قریب ہی تھا۔ مولوی عبدالحق مرحوم بھی اورنگ آباد سے حیدرآباد آچکے تھے۔ اور باغ کی ایک اور سمت میں مقیم تھے۔ صبح کی تفریح کے لئے وہ بھی آجاتے تھے اس طرح اکثر ان حضرات سے صبح کو علیک سلیک ہوجاتی تھی۔

کبھی کسی وجہ سے جوش صاحب نہ آتے اور میں اکیلا ہوتا تو کیقباد جنگ کے ساتھ، تفریح کے بجائے، فوجی انداز سے باغ میں چکر لگاتا۔ انہیں نے ایک مرتبہ دارالترجمہ میں جوش کی ملازمت کا مذکورہ بالا واقعہ سنایا تھا۔ میں نے اُن کی اس ناکامی کے اثر کو زائل کرنے کی نیت سے کہا — "اعلیٰ حضرت نے آپ کو دارالترجمہ کی دلدل میں نہ پھنسنے دیا، ورنہ آپ کی ترقی کے وہ امکانات پیدا نہ ہوتے جو اب ہیں"۔

انہوں نے بھی تقدیر کے اس کھیل پر اظہار تعجب کیا۔

کیقباد جنگ بہت قابل آدمی تھے۔ مگر اُن کی قابلیت سے زیادہ میں اُن کی عالمانہ افتاد طبیعت سے متاثر تھا۔ مجھے جتنے پارسی حضرات سے ملنے کا اتفاق ہوا، ان میں یہی ایک ایسے شخص تھے جن سے گفتگو کرتے وقت کسی قسم کے ذہنی تحفظات کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔

حضرت فانی کچھ ہی مدت کے بعد "صلح سرائے" سے ہمارے محلے کے قریب ایک مستقل مکان میں منتقل ہوگئے۔ اب اکثر یہ ہونے لگا کہ ہم لوگ جوش کے ہاں پہونچتے اور جوش ہم سب کو فانی صاحب کے مکان پر لے جاتے۔ وہاں محفل شعر گرم ہوتی۔ ہمیں فانی صاحب کا کلام سننے کا بھی موقع مل جاتا تھا۔

حضرت جوش نے، خبر نہیں حکیم آزاد انصاری کو کس طرح "دریافت" کر لیا تھا۔ حکیم آزاد انصاری غالباً جوش سے بہت پہلے حیدرآباد آچکے تھے۔ اُن کے صاحبزادے، جوش کے ساتھ دارالترجمے میں مترجم تھے۔ میں نے سب سے پہلے حکیم آزاد انصاری کو "نظام کالج" کے ایک مشاعرے میں غزل سناتے دیکھا تھا۔ بوڑھے آدمی تھے، چہرے پر مولویانہ خشونت کے آثار دیکھ کر اس کا گمان بھی نہ تھا کہ کبھی ان بزرگ کی ہم نشینی نصیب ہوگی — لیکن جوش کی "دریافت" نے یہ ثابت کر دیا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ مولویانہ پوست کے پردے میں ایک باغ و بہار آدمی چھپا ہوا تھا۔ شعر میں وہ اپنے رنگ کے تنہا شاعر تھے۔ ان کے اکثر اشعار کی خصوصیت یہ تھی کہ اُن کی نثر نہیں کی جا سکتی تھی۔ یعنی ہر مصرع ایسا موزوں ہوتا تھا کہ اس میں ہلکی سی تعقید بھی نہیں پائی جاتی، اور الفاظ کی نشست بالکل نثری ترتیب میں ہوتی۔ بہ حیثیت انسان کے وہ ایک مجوبہ تھے۔ ستر سال کے قریب عمر تھی۔ لیکن جوش کی محفل میں داخل ہوتے

وقت اپنی عمر کا لبادہ باہر ہی اتار کر رکھ دیتے تھے۔ ہمیں یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ ہم سے بھی کم عمر ہیں۔ ان میں وہ زندہ دلی اور شوخی بھری ہوئی تھی کہ بہت سے نوجوان بھی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

یہ جوش کا جگایا ہوا جادو تھا!

ریاست حیدرآباد میں سرکاری ملازموں کو مکان بنانے کے لئے قرضہ دیئے جانے کی اسکیم منظور ہوئی۔ شروع شروع میں تو شاید یار لوگوں نے مکان کے لئے قرضہ لیا اور روپیہ اُڑا دیا۔ اس پر حکومت نے یہ شرط لگائی کہ پہلے زمین خرید لو، اور خریداری کے کاغذ دکھاؤ تو قرضہ منظور ہوگا۔ لوگ قرض لے لے کر ادھر اُدھر مکان بنوانے لگے۔ بھلا حضرت جوش کیوں نہ بنواتے؟

لیکن زمین خریدنے کے لئے روپیہ تھا اور نہ یہ درد سر اٹھانے کی فرصت!

آڑے وقت میں مولوی ابوالخیر کی زمین بہت کام آئی۔ انہوں نے جوش کے خیالی محل کی تعمیر کے لئے اپنی زمین کچھ وقت کے لئے "ادھار" دے دی۔ قرضہ مل گیا۔ بہت سا روپیہ سابقہ قرض خواہوں کی نذر ہوگیا۔ شاید ڈھائی ہزار بچ رہا تھا۔ اس زمانے میں بھابی صاحبہ (بیگم جوش) سخت پردہ کرتی تھیں۔ اور دنیا کا اتنا تجربہ بھی نہ رکھتی تھیں۔ انہیں غالباً تعمیر مکان کے قرضے کا علم ہی نہ ہوا ہوگا۔ اگر علم ہوا بھی ہو تو علم ریاضی کی تعلیم اتنی اچھی نہ پائی تھی جتنی حضرت جوش کی تھی۔ اس لئے وہ ضرور جمع و تفریق کی پیچیدگیوں میں دھوکا کھا گئیں۔ اور تعمیر مکان کی بجائے کبھی رقم گھر کے دروازے سے باہر ہی باہر منڈلاتی رہی۔

میں اُن دنوں چند ہفتوں کے لئے حیدرآباد سے باہر رہا۔ واپس آیا تو دیکھا کہ جوش کے حلقۂ خاص میں ایک نئی صورت جلوہ افروز ہے، اور اس شدت سے جوش پر مسلط ہے کہ روز کے ملنے والے احباب حیران ہیں۔ ان صاحب کا نام حکیم جعفری لکھنوی بتایا گیا۔

حکیم جعفری صاحب نے تعمیر مکان کی اُس بچی ہوئی رقم کو جوش سے چھین کر اس لئے اپنے وہاں محفوظ کر لیا تھا کہ جوش اس کو برباد کر دیں گے۔ اور ادھر جوش نے اپنے دل میں اس رقم کو بمبئی کے سفر کے لئے مختص کر رکھا تھا۔ یہ رنگ دیکھ کر میں یہ سمجھا کہ شاید حکیم صاحب جوش کے بچپن کے دوست ہیں، اس لئے ہم سب پر افضلیت کے حقوق رکھتے ہیں۔ ایک روز تنہائی میں میں نے جوش سے اُن کے متعلق سوالات کئے۔ معلوم ہوا بالکل نئے دوست ہیں، جن سے انہیں دنوں میں جوش سے تعارف ہوا تھا!

ہمیں دونوں حضرات پر حیرت ہوتی تھی۔ جعفری صاحب کی اس بے پناہ بے تکلفی پر بھی اور حضرت جوش کی اس بے پایاں صلاحیتِ حوالگی پر بھی۔

حکیم جعفری صاحب ملنے ملانے میں بہت اچھے آدمی تھے۔ ذوق سخن رکھتے تھے۔ غالباً ملازمت کے جویا تھے۔ جس کے لئے جوش بھی کوشاں نظر آتے تھے۔ وہ اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جن کا مکان حضرت فانی کے مکان کے مقابل چند ہی قدم کے فاصلے پر تھا۔ اُن کی بس ایک بات سب کو کھلتی تھی کہ وہ اپنی اور جوش کی خصوصیت کا جا و بے جا، موقع بے موقع، تکرار اعلان کیا کرتے تھے۔ جوش کے ملنے والوں میں سنّی بھی تھے، شیعہ بھی تھے، ہندو بھی تھے،

کہ سب ملنے والے جوش کی شمع شاعری کے پروانے تھے۔ مذہب و عقائد کے اظہار یا بحث سے کسی کو کوئی واسطہ نہیں تھا۔ حکیم صاحب کی یہ بات جوش کو بھی پسند نہیں تھی۔ جس کا اشارۃً اُن پر اظہار بھی کیا گیا۔ مگر اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔

اُنہی دنوں میں جوش نے "ذاکر سے خطاب" والی نظم کہی تھی، جو میں نے نہیں سنی تھی، غالباً فانی سُن چکے تھے۔ میری واپسی کے چند روز کے بعد فانی صاحب کے مکان پر جو نشست ہوئی اس میں روزانہ ملنے والوں کے علاوہ، اتفاقاً اور کئی احباب جمع تھے۔ چند حضرات نے اپنا اپنا کلام سنایا اور پھر سب نے فانی صاحب سے فرمائش کی۔ فانی معذرت کرتے رہے، پھر یکایک اُن کی آنکھوں میں شرارت کی چمک پیدا ہوئی۔ جعفری صاحب پر نظر ڈالی اور جوش سے کہا :

"تم اپنی ذاکر والی نظم سناؤ"

جوش کچھ ہچکچائے، اور کوئی دوسری نظم شروع کر دی۔

فانی نے روکا اور اصرار کیا، "نہیں، ہم تو ذاکر والی نظم ہی سُنیں گے"

اب جعفری صاحب نے فانی سے بھی بڑھ کر اصرار شروع کر دیا کہ، "جوش، ذاکر والی نظم ہی سُناؤ"

جوش مجبور سے ہو گئے۔ کچھ اس انداز سے جعفری کو دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں :

"اچھا، تم بھی!"

پھر تو شبیر حسن خاں نے سینہ تان کر وہ نظم شروع کی۔

پہلے شعر پر فانی کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ جعفری پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی، پھر ہمہ تن، جوش کی طرف متوجہ ہو گئے۔

دو ایک شعر پر تو جعفری صاحب نے واہ واہ کی، اور پھر ایسی چپ سادھ لی کہ اُن کو دیکھ کر رحم آتا تھا۔ نظم ختم ہوئی محفل برخاست ہو گئی۔

اس کے چند روز بعد جوش صاحب بمبئی روانہ ہو گئے۔ حکیم جعفری سے جوش نے وہ روپیہ کس طرح حاصل کیا یہ میرے لئے آج تک ایک راز ہے۔

کچھ روز کے بعد حکیم جعفری ایسے غائب ہوئے کہ پھر کبھی ان کی صورت تک نظر نہ آئی۔ اب وہ باتیں یاد آتی ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص نیلے آسمان سے اچانک اتر آیا تھا۔ چند روز رہ کر پھر فضائے آسمانی میں غائب ہو گیا۔ اس واقعے کو اب تقریباً تیس سال ہوتے ہیں۔ اس مدت میں ایک درجن سے زیادہ حضرات کو اپنے وفورِ خلوص میں جوش پر مسلط ہوتے دیکھا جو کچھ مدت کے بعد ایسے غائب ہو جاتے ہیں کہ برسوں دکھائی نہیں دیتے۔ شاید حکیم جعفری ہی کی سنت ہے جو ابھی تک جاری ہے!

بمبئی جانے سے چند روز پیشتر یکایک جوش پر رباعیوں کی بارش ہونے لگی۔ ہم سمجھتے تھے کہ جوش کی جولانیاں صرف نظم کے میدان ہی تک محدود رہیں گی، لیکن رباعیوں کا دروازہ ایسا کھلا کہ روزانہ کئی کئی نئی رباعیاں کہہ جاتے تھے۔ بمبئی سے واپس آئے تو رباعیوں کا ایک انبار بھی ساتھ لائے۔

آخر وہ دور بھی آیا کہ جوش کو حضور نظام کے شہزادوں نے یاد کرنا شروع کیا۔ شہزادے اعظم جاہ اور معظم جاہ

اب بڑے ہو چکے تھے۔ خبر نہیں کس نے اُن کو شاعری کا راستہ دکھلا دیا۔ شاید پہلے پہل بڑے شہزادے اعظم جاہ نے شعراء کو اپنے دربار میں یاد کرنا شروع کیا تھا اور پھر معظم جاہ کو اس کا شوق ہوا۔ حضرت فانی اور جناب جوش کی روز کی ڈیوٹی ہو گئی مغرب سے کچھ پہلے ایک بڑی سی موٹر "ایڈ ریجینٹ" کے باغ میں داخل ہوتی، اور معظم جاہ کے ایک نوجوان کایستھ مصاحب جو شاید خود بھی شاعر تھے حضرت جوش کو بتے بغل میں داب لے جاتے اور ہم روز کے نیاز مند کف افسوس ملتے رہ جاتے۔

جوش اور فانی کے علاوہ اور کئی شعراء کے "جملہ حقوق بحق سرکار محفوظ" ہو گئے۔ بعض احباب سے وہاں کی صحبت کا یہ حال سنا کہ شہزادہ صاحب کے کسی پسند کردہ مصرعے یا شعر پر حاضر شعراء وہیں بیٹھے بیٹھے غزلیں کہتے ہر غزل میں سے جتنے شعر پسند آ جاتے وہ شہزادے صاحب کی نذر ہو جاتے۔ اس کے صلے میں حاضرین کو شام کا کھانا پینا اور رات کے ایک بجے تک جاگنا انعام میں ملتا۔ سنا تھا کہ صرف نجم آفندی صاحب کو دو یا تین سو روپیہ تنخواہ گویا ان کے کلام کی "رائلٹی" ملا کرتی تھی۔

ہماری سوسائٹی کی جہاں ہر کل ٹیڑھی ہے وہاں یہ چیز بھی قلم بند کرنے کے قابل ہے کہ ہمارے بعض رؤسا، امراء اور سرمایہ دار اپنے روپیہ اور اثر کے زور سے مصنف اور شاعر بھی بن بیٹھے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کا بہت سا کلام استاد ذوق کا اور بعد کا تھوڑا سا کلام مرزا غالب کی تراوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔ جس کی شہادت مولانا حالی کے بیان سے ملتی ہے۔ حضور نظام مرحوم، میر محبوب علی خاں آصف داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ حیدرآباد کے مستند لوگوں سے سنا کہ وہ شاگردی بھی بہادر شاہ ظفر کی سی تھی۔ موجودہ دور میں حیدرآباد کے شہزادوں نے "استاد" کا لقب دے کر بھی ان شعراء کی تالیف قلوب نہ کی۔ جن کی ذہنی کاوشوں کا استحصال کر کے وہ دنیا پر اپنی شاعری کا سکہ بٹھاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں انگریز امراء کا یہ طریقہ کتنا غنیمت تھا کہ وہ ادیب یا شاعر کی مالی امداد کر کے اس سے اتنی ہی خواہش رکھتے تھے کہ کتاب اُن کے نام پر معنون کی جائے، نہ یہ کہ تصنیف کو اپنے ہی دماغ کی کاوش ظاہر کر کے اہل دنیا کے لئے رہتی دنیا تک دھوکا کھاتے رہنے کا سامان چھوڑ جائیں۔ اگر "خیر جاریہ" کا ثواب صاحب خیر کو اس کے مرنے کے بعد اس وقت تک ملتا رہتا ہے جب تک کہ اس کار خیر سے اہل دنیا مستفید ہوتے رہتے ہیں تو پھر ایسے "شر جاریہ" کا مواخذہ بھی لا متناہی زمانے تک ملتے رہنا ثابت ہوتا ہے۔ اس عجیب صورت حال میں شاعر یا ادیب اگرچہ مجبور و مظلوم ہے مگر "شر" کی اعانت کرنے کے جرم سے بچ نہیں سکتا۔ کیا ابھی اس کا وقت نہیں آیا کہ علمی دنیا میں اس "شر" کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جائے۔ بہرحال یہ دربار داریاں جوش کو کئی لحاظ سے مہنگی پڑیں۔

(مضمون کی طوالت کے خوف سے حضرت جوش کے بیسیوں دلچسپ واقعات کو جن میں بعض کا تسلسل کراچی تک پہونچتا ہے افسوس کے ساتھ چھوڑ رہا ہوں۔ اب ان کے حیدرآباد کو خیرآباد کہنے کے واقعے کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ صاحب تذکرہ کے ساتھ ساتھ راوی کا بار بار اپنی ذات کو پیش کرنا کوئی مستحسن طرز بیان نہیں، مگر واقعات کا پس منظر پیش کرنے کی خاطر میں اپنے زاویۂ نگاہ سے اعراض نہیں کر سکتا۔ جس کے لئے قارئین سے ... معذرت خواہ ہوں۔

میرے خانگی حالات کچھ ایسے ہوگئے تھے کہ مجھے اخبار سے دست بردار ہونا پڑا۔ خیال ہوا کہ چند روز ملازمت کر لوں۔ جب حالات کچھ موافق ہو جائیں تو اپنے منصوبے پر کاربند ہو جاؤں۔ تعلیمات کا سر رشتہ ہی ایک ایسا سر رشتہ تھا جہاں مجھے فوراً ملازمت مل سکتی تھی۔ کیوں کہ ریاست میں تعلیمات کا بجٹ بڑھتا جا رہا تھا۔ بکثرت نئے سکول کھولے جا رہے تھے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے محکموں میں ملازمت کے سلسلے میں دیر بھی لگتی، اور ریاستی داؤ پیچ سے بھی کام لینا پڑتا۔ جس کی صلاحیت مجھ میں بہت کم تھی۔

فرقہ نے بہت جلد ضلع اورنگ آباد کے تعلقہ پٹن کے مدرسے کی ہیڈ ماسٹری مل گئی۔ حضرت فانی کے لئے بھی ملازمت کی کوشش ہو رہی تھی۔ مہاراجہ بہادر کی توجہ سے انہیں بھی محکمۂ تعلیم میں ایک ضلع کے ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری مل گئی۔ عجیب اتفاق کہ ہم دونوں کا تقرر ساتھ ساتھ ہوا۔

میں جس مقام پر بھیجا گیا وہ شہر حیدرآباد سے تین سو میل سے زیادہ فاصلے پر تھا۔ ریل کے علاوہ موٹر بس میں بھی سفر کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے سفر میں تقریباً چوبیس گھنٹے لگ جاتے تھے۔ اس ملازمت کی وجہ سے میں شہر کی دلچسپ صحبتوں اور دوسری تحریکوں سے یک لخت کٹ سا گیا۔ دو چار روز کی چھٹیاں ہوتی بھی تو سفر کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ البتہ سرما اور گرما کی طویل تعطیلوں میں شہر آ کر رہتا تھا۔ ویسے تو حضرت جوش سے روزمرہ کی ملاقات شہزادے صاحب کی دربارداری نے پہلے ہی ختم کر دی تھی۔

ایک مرتبہ طویل تعطیلات میں میں حیدرآباد آیا تو معلوم ہوا کہ جوش صاحب نے باغ والا مکان چھوڑ دیا ہے اور کچھ ہی فاصلے پر ایک اچھے سے مکان میں رہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جوش کی ایک نظم پر حضور نظام بہت ناراض ہوئے کہ اس میں جوش ملیح آبادی پر چوٹیں کی ہیں۔ اس نظم کا ہوش والا شعر یہ ہے ؎

مٹا داغِ ہوس اور مدہوش بن جا
اٹھا جامِ زر اور سلطانیاں کر

اس نظم کو حضور نظام سے گستاخی پر ہی محمول کیا گیا۔ جناب جوش نے حضور نظام کو ایک عریضہ لکھا تھا، وہ ہمیں سنایا۔ ہم سب نے پسند کیا۔ میرے لئے یہ جوش کی نثر نگاری کا پہلا نمونہ تھا جس میں نظم کی طرح، جوش کی انفرادیت کارفرما تھی۔ اس عریضے پر حضور نظام کا دل جوش سے صاف ہو گیا۔ جوش کو باریاب کیا۔ شہزادوں کے دربار کا حال پوچھا، اور اپنے اطمینان کا اظہار کر کے رخصت کیا۔ اس مرحلے کے بخیر و خوبی گزر جانے پر ہم بھی مطمئن ہوگئے۔ چھٹیاں ختم ہوگئیں، میں اپنی ملازمت پر چلا گیا۔ چھ مہینے دو مہینے کے بعد اخبار سے معلوم ہوا کہ حضور نظام نے جوش کو ریاست سے چلے جانے کا حکم جاری کر دیا ہے۔

اخبار پڑھ کر میں دھک سے رہ گیا۔ کہ یہ کیا ہوا؟

افسوس تو یہ رہا کہ میں جوش کے رخصت ہوتے وقت حیدرآباد میں موجود نہ تھا، بلکہ مجھے اخبار جس وقت ملا اس وقت جوش حیدرآباد سے جا چکے تھے۔

کسی کا مقولہ ہے کہ کوئی درجہ اول کا آدمی ریاستوں میں نہ پنپ سکتا ہے نہ ترقی کر سکتا ہے۔ اس کے

مصداق دو واقعات تو میرے سامنے کے تھے۔ پہلا سر علی امام کا، اور دوسرا علامہ عبداللہ یوسف علی کا۔ یہ دونوں حضرات حیدرآباد سے ڈرامائی انداز میں رخصت ہوئے تھے۔

حضرت جوش کی حد تک تو میرا یہ خیال ہے کہ قدرت نے ٹھیک وقت پر جوش کو حیدرآباد سے نکال لیا، ورنہ میرے اندازے میں وہ وقت قریب تھا کہ جوش کے ذہن پر ریاستی زنگ لگنا شروع ہو جاتا۔ اگر جوش اور دس پانچ سال حیدرآباد میں رہ جاتے تو زندگی کی وہ تڑپ جو اب تک ان میں باقی ہے یقیناً ایک انفعالی آرام طلبی بلکہ قنوطیت میں بدل جاتی۔

جوش پونے اور بمبئی میں

جوش کے حیدرآباد سے جانے کے بعد ہمیں اس کی کوئی اطلاع نہیں ملی کہ وہ ملیح آباد گئے یا دھول پور، جہاں اُن کے ماموں نواب رستم علی خاں رہتے تھے۔ غرض کم و بیش ایک سال کے بعد ۱۹۳۵ء کے آخری مہینوں میں اخباروں سے معلوم ہوا کہ جوش دہلی سے "کلیم" نامی ماہوار رسالہ نکالنے والے ہیں۔ میں نے اطلاع ملتے ہی خط لکھا۔ جواب بھی ملا اور رسالہ "کلیم" بھی۔ جس کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔

"کلیم" اکتوبر ۱۹۳۵ء سے جاری ہوا تھا جس کو اب ۲۶ برس ہوتے ہیں۔ رسالہ کے حجم اور معیار دونوں کے اجتماع کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا تھا کہ اردو میں بہت کم رسالے ایسے نکلے۔ غالباً مالی خسارے کی وجہ سے جوش کو یہ رسالہ بند کرنا پڑا۔ اور وہ دہلی سے لکھنؤ اور ملیح آباد چلے گئے۔ پھر جب لکھنؤ سے حلقۂ ادب کے تحت ۱۹۳۹ء میں "نیا ادب" اور "کلیم" کے نام سے رسالہ شائع ہوا تو وہ اس کے مدیر اعلیٰ ہو گئے۔

جب تک جوش دہلی میں رہے ہم لوگ جوش سے ملنے کے لئے حیدرآباد سے دہلی جانے کے منصوبے بناتے تھے۔ مگر کوئی منصوبہ پورا نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ جوش نے حکیم آغا داؤد تعلی مرحوم کو حیدرآباد سے دہلی بلایا۔ جب وہ حیدرآباد سے روانہ ہو رہے تھے میں حیدرآباد میں تھا اور اتفاق سے ان سے اسی وقت ملاقات ہوئی جب وہ دہلی جانے کے لئے ریلوے اسٹیشن کو جا رہے تھے۔ ہم دو تین آدمی اُن کے ساتھ ریلوے اسٹیشن تک گئے۔ اور ٹرین آنے کے بعد رشک و حسرت کے ساتھ گلے مل مل کر انہیں رخصت کیا۔

اس زمانے میں میری خانگی زندگی بہت پریشان کن رہی۔ دو ایسے بزرگوں نے وفات پائی جن کی وجہ سے شہر حیدرآباد سے میرا رشتہ کٹ گیا۔ ملازمت کے سلسلے میں دو تین جگہ تبادلے ہوئے۔ اس کی وجہ سے بھی زندگی میں ہم آہنگی اور سکون نہ رہا۔ غرض انہیں پریشانیوں میں سات آٹھ سال گزر گئے۔

اسی دوران میں حضرت فانی نے وفات پائی۔ وفات سے کچھ مدت پہلے وہ بھوپال کے مشہور مشاعرے میں شرکت کے لئے حیدرآباد سے بھوپال گئے تھے۔ جوش اور جگر وغیرہ نے بھی اس مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ یہ پہلا مشاعرہ تھا جس کو ہم نے ریاست حیدرآباد کے ایک دور افتادہ ضلع میں ریڈیو پر سنا تھا۔ جناب فانی کی غزل کو جگر صاحب نے اصرار کر کے سنوایا تھا۔ ہم نے جناب جوش کی زبان سے اُن کا کلام سنا۔ اُف! کیا احساس تھا! برسوں کے بعد جوش کی آواز سنی، مگر صورت دیکھنے اور ملنے کو ترستے ہی رہے۔

فانی مرحوم کے بیان کے مطابق جوش انہیں بھوپال سے لکھنؤ لے گئے تھے۔ اس سفر میں وہ بیمار ہو گئے۔ حیدرآباد واپس آنے کے بعد ان کی علالت بڑھتی گئی۔ میں اس وقت اپنی ملازمت سے چھٹی لے کر حیدرآباد آیا ہوا تھا۔ ایک روز ایک صاحب نے اطلاع دی کہ:

"فانی صاحب کی علالت بڑھ گئی ہے۔ انہوں نے شہزادہ معظم جاہ سے وطن جانے کی اجازت لے لی ہے، اور آج وطن جا رہے ہیں۔"

دو چار روز کے بعد ایک شام کو عارف مرحوم گھبرائے ہوئے آئے، اور کہا:

"فانی کا انتقال ہو گیا۔ چلو ان کے گھر چلیں۔"

میں نے کہا "وہ تو بدایوں جا چکے ہیں۔ ان کے گھر چلنے سے کیا فائدہ!"

مگر وہ اصرار کرتے رہے۔

اس پر میں نے پوچھا "آخر انہیں وفات کی خبر کیسے ملی؟"

کہا "میں نے ریڈیو پر سنی ہے۔"

لیکن جناب عارف کو یہ یاد نہ تھا کہ فانی کی وفات کی خبر حیدرآباد کے ریڈیو کی تھی یا دہلی کے آل انڈیا ریڈیو کی۔ بہرحال وہ بڑے مصر تھے کہ "فانی" کے گھر چلو۔

فانی صاحب کا مکان قریب ہی تھا۔ میں نے گھر سے نکل کر عارف مرحوم سے کہا: "ہم لوگ پہلے ذرا دور سے اُن کے مکان کو دیکھیں کہ کیا ماجرا ہے، اس کے بعد آگے بڑھیں۔"

قریب کا راستہ چھوڑ کر ہم ایسے راستے سے گئے کہ فانی صاحب کا مکان دور سے نظر آسکے۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ مکان کے سامنے کچھ پٹرومکس روشن ہیں، اور کرسیوں پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ماتھا ٹھنکا کہ فانی صاحب بدایوں نہیں گئے، یہیں وفات پائی۔ بڑا افسوس یہ تھا کہ اُس غلط اطلاع کی وجہ سے ہم لوگ عیادت کو بھی نہ جا سکے۔

بہرحال مکان پر پہنچے۔ دیکھا کہ اور لوگوں کے ساتھ قاضی عبدالغفار صاحب بھی موجود ہیں۔ عارف صاحب سے ان کے مراسم تھے۔ عارف نے قاضی صاحب سے حال پوچھا۔ قاضی صاحب نے درد بھری آواز میں فانی صاحب کی علالت اور وفات کا حال بیان کیا۔

عارف مرحوم فانی صاحب کی صورت دیکھنے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ ہم دونوں کو اندر لے جایا گیا۔ ہم نے چہرہ دیکھا۔ عارف مرحوم نے نہایت درد کے ساتھ فانی کا یہ شعر پڑھا ؎

سُنتے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ!

اس کے بعد عارف پر عجیب کیفیت طاری رہی۔ جس سے وہ تین چار روز تک آپے میں نہ آسکے۔

جوش فانی مرحوم کا جو احترام ملحوظ رکھتے تھے، اس سے میں ہمیشہ متاثر ہوتا تھا۔ ایک وہ دور تھا کہ جوش اپنا ہر تازہ کلام فانی مرحوم کے یہاں سنایا کرتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی ان کے ساتھ شوخیاں بھی کرتے تھے، جس کو وہ مرحوم ایک بزرگانہ حلم

کے ساتھ گوارا کرلیتے تھے۔ اور عین ممکن ہے کہ بعض اوقات جوش کی شوخیوں سے دل ہی دل میں لطف اندوز بھی ہوتے ہوں ـــــ فانی مرحوم نے اپنی زندگی پر غم کو ایسا مسلط ـــــ کر رکھا تھا کہ بقول جوش ایک چلتا پھرتا تعزیہ معلوم ہوتے تھے جس کے سامنے کھُل کر ہنسنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

اس موقعے پر ایک لطیفہ یاد آتا ہے۔ فانی مرحوم جب مستقلاً حیدرآباد میں رہنے لگے تو کچھ مدت کے بعد ـــ اُن کے صاحبزادے بھی حیدرآباد آگئے۔ انہیں غالباً طب سے شغف تھا۔ بڑی شاداب داڑھی پال رکھی تھی۔ ہم نے اب تک یہی دیکھا تھا کہ اکثر باپ داڑھی والے ہوتے ہیں اور بیٹے صفاچٹ۔ یہاں معاملہ برعکس تھا۔ فانی صاحب داڑھی منڈاتے تھے، اور صاحبزادے ریش دراز کے مالک تھے۔

غرض ایک روز فانی صاحب مہاراجہ کشن پرشاد کے ہاں پہلی مرتبہ اپنے صاحبزادے کو لے گئے۔ فانی مرحوم نے ابھی مہاراجہ بہادر سے اپنے صاحبزادے کا تعارف نہ کرایا تھا کہ جوش صاحب یکایک بول اٹھے۔

"حضور، فانی صاحب کے والد بزرگوار بھی وطن سے تشریف لے آئے ہیں"!

یہ کہہ کر صاحبزادے صاحب کی طرف اشارہ کر دیا!

مہاراجہ بہادر تو نہایت صاف دل، سادہ طبیعت انسان تھے، صورت حال ایسی تھی کہ کسی جہاں دیدہ، کائیاں آدمی کے سامنے بھی یہ فقرہ کہا جاتا تو تھوڑی دیر کے لئے باور کر ہی لیتا۔

دن گذرتے گئے۔ سنہ ۱۹۴۳ء آگیا۔ اخباروں سے اطلاع ملی کہ بنگلور میں ایک مشاعرہ بڑے اہتمام سے منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے تمام مشہور شعراء مدعو کئے گئے تھے۔ جناب جوش بھی بنگلور گئے تھے۔ اس کے بعد یہ سنا کہ شالیمار فلم کمپنی کے مالک ڈبلیو زیڈ احمد صاحب نے حضرت جوش اور ساغر نظامی سے فلموں کے لئے مکالمے، گیت، وغیرہ لکھنے کا معاہدہ کرکے اُنہیں پونے بلا لیا ہے۔

میں اُس زمانے میں ریاست حیدرآباد کے ایک مغربی ضلع، بیڑ میں تھا۔ بیڑ سے پونے تک کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ سو میل تھا۔ یہ سفر ریل سے بھی کیا جا سکتا تھا اور موٹر بس سے بھی۔ ظاہر ہے کہ اس خبر سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ دوسرے یارانِ طریقت حیدرآباد میں تھے جو پونے سے چار پانچ سو میل دور تھا۔

میں نے جناب جوش کو خط لکھا اور چھٹیوں میں پونے پہونچا۔

جوش اس وقت اسٹوڈیو میں تھے۔

تقریباً دس سال کے بعد ایک ایسے دوست سے ملنا، جس سے روزانہ، اور بعض اوقات دن میں دو دو مرتبہ ملاقات اور یکجائی رہتی ہو، جذبات میں کچھ ایسا ہیجان پیدا کرتا ہے، دیر تک گلے ملتے رہے۔ میں نے یہ سفر موٹر بس سے کیا تھا۔ گرد و غبار میں اٹا ہوا تھا۔ جوش گھر لے گئے جو قریب ہی تھا، نہا دھو کر آدمی بنا اور اسٹوڈیو آیا، اور کہانی کی تصنیف کا منظر دیکھتا رہا۔

ساغر نظامی صاحب نہایت سنجیدہ، فینانس منسٹر کے انداز میں میز کے سامنے بیٹھے ہوئے لکھتے جاتے تھے۔ اُن کے مقابل کرشن چندر صاحب ایم اے، فلاسفی کے طالب علم کی طرح، غور و فکر کے بوجھ تلے فقرے رکھتے جاتے تھے۔

ذرا ہٹ کر ایک آرام کرسی پر حضرت جوش دراز رہتے۔ اور ان دونوں حضرات کے خیالات کی تائید کرتے تھے، یا کبھی کبھی کوئی اعتراض یا اپنا کوئی خیال پیش کرتے تھے۔ اس کے بعد حضرت ساغر کہانی کی گاڑی کو آگے بڑھاتے چلے جاتے تھے۔

لطف یہ تھا کہ فلمی کہانی لکھنے کا ان تینوں میں سے کسی کو بھی پہلے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اور حضرت جوش تو وہ تھے کہ اس وقت تک دو چار فلمیں بھی انہوں نے نہ دیکھی ہوں گی۔ حیدرآباد میں "بولتے فلم" کی ایجاد کے بعد کئی مرتبہ میں نے جوش صاحب کو فلم دیکھنے کی ترغیب دی تھی، اور وہ کبھی کامیاب نہ ہوئی تھی۔ مجھے تو یاد نہیں آتا کہ جوش نے کبھی وہاں کوئی فلم دیکھی ہو ——

بہرحال، جب دفتر کا وقت ختم ہوا، ہم چاروں گھر آئے۔ ساغر نظامی اور جوش ایک ہی کوٹھی "طاہر پیلس" میں رہتے تھے جو آدھی آدھی تقسیم تھی۔ کرشن چندر صاحب غالباً ان دونوں کے بعد اس "اتحاد ثلاثہ" میں منسلک ہوئے تھے، اور شاید انہیں دنوں میں پونے آئے تھے۔ انہوں نے ابھی تک علیحدہ مکان نہیں لیا تھا۔ عارضی طور پر ساغر نظامی ہی کے ساتھ ٹھیرے ہوئے تھے۔

اب جوش کو دیکھا کہ وہ صرف ہمارے ہی محبوب جوش نہیں تھے، بلکہ سارے ہندوستان کے محبوب جوش تھے۔ گذشتہ دس سال کی مدت میں ان کے کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ اور عامی وسیع اشاعت پا چکے تھے۔ ان کے متعلق گجراتی اور مرہٹی اخباروں میں بھی مضامین شائع ہو چکے تھے، اس لئے پونے میں مرہٹے اور گجراتی اہل علم جوش کی تصویر سے اتنے آشنا ہو چکے تھے کہ انہیں دیکھتے ہی پوچھ بیٹھتے تھے کہ،

"کیا آپ جوش ملیح آبادی ہیں؟"

اس کے بعد پھر وہ ایسی قدردانی اور خلوص کا مظاہرہ کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔

اسی زمانے میں مشہور آرٹسٹ "ادیامہ" اور مشہور ترقی پسند ادیبہ ڈاکٹر رشید جہاں بھی پونے آئیں۔ حضرت جوش کے ہاں مجھے ان دونوں کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ افسوس ہے کہ کچھ مدت کے بعد پہلے ادیامہ نے اور پھر ڈاکٹر رشید جہاں نے دنیا کو خیرباد کہا۔

پونے میں جوش کے مخلصوں کا ایک حلقہ قائم ہو گیا۔ جس میں جناب محمد فصیح صاحب اور جناب قدوس صاحب کو خصوصیت حاصل تھی۔ یہ دونوں حضرات تقریباً روزانہ کے ملاقاتی تھے۔ جناب فصیح صاحب کی یہ خصوصیت تھی کہ ہر بات کی فوراً تاویل پیش کر دیتے تھے۔ اور بعض اوقات ان کی تاویلیں اتنی پرلطف ہوتی تھیں کہ ساری محفل کو ہنسا دیتے تھے۔ جوش صاحب نے ان کو "شاہِ تاویلات" کا لقب دیا تھا۔

چھٹیاں ختم ہوئیں۔ میں واپس ہوا۔

تقریباً ایک سال کے بعد پھر پونے گیا۔

ساغر صاحب شالیمار چھوڑ کر بمبئی جا چکے تھے، اور غالباً فضلی برادرس سے وابستہ ہو چکے تھے۔

میں نے جناب جوش اور کرشن چندر صاحب کے سامنے اردو کے لئے نستعلیق ٹائپ کے ان خاکوں کا ذکر کیا جو میں نے کئی سال کی محنت کے بعد مرتب کیا تھا۔ دونوں نے اصرار کیا کہ دوبارہ آؤں تو وہ ضرور لاؤں۔

بعد کے سفر پونا میں میں نے وہ خاکے دکھائے۔

دونوں حضرات کو ان خاکوں کے متعلق ٹائپ ڈھلوانے کی بڑی فکر ہوئی۔ ڈبلیو زیڈ احمد صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ بڑی دلچسپی کا اظہار کیا، اور اس کے لئے سرمایہ لگانے پر آمادگی ظاہر کی۔

یہ طے ہوا کہ میں اپنی ملازمت سے رخصت لے کر پونے آ جاؤں۔ شالیمار میں منسلک رہوں گا۔ مگر اپنے خاکوں کو مکمل کرنے کا کام کروں گا۔ اور پھر اس کے ڈھالنے کا انتظام کیا جائے گا۔ اب پھر حضرت جوش کے ساتھ حیدرآباد سے زیادہ یکجائی کا موقع ملا۔

اس دوران میں میرا تبادلہ عثمانیہ کالج گلبرگہ ہو چکا تھا۔ میں نے کالج سے لمبی رخصت لی اور ۱۵ رمئی سنہ ۱۹۴۵ء سے میں نے وہاں کام شروع کیا۔ پہلے کئی مہینے تو حضرت جوش کے ساتھ "طاہر پیلس" میں رہا۔ اس کے بعد کمپنی نے ایک بڑا بنگلہ کرائے پر لیا تھا، جس میں الگ الگ فلیٹ تھے۔ مجھے ایک کمرے کا فلیٹ دیا گیا۔ میں وہاں اٹھ گیا۔ لیکن سارا دن شالیمار میں، اور پھر شام کو جناب جوش کی معیت میں کبھی منیجر صاحب کے یہاں اور اکثر قدوس صاحب کے یہاں نشست جمتی تھی۔ حضرت جوش دن بھر جو کچھ کہتے، شام کو ہم لوگ تازہ بتازہ سنتے۔

یہ زمانہ عجب ہیجانی زمانہ تھا۔

جنگ اپنے آخری مراحل پر تھی۔

اسی سال اگست کے وسط میں جاپان نے شکست تسلیم کر لی۔

جنگ ختم ہو گئی!

جنگ کی وجہ سے پونے اور بمبئی کی زندگی اپنے معمول پر نہیں تھی۔ پونے فوجی مرکز تھا۔ جاپان کے حملے کے خوف سے امریکہ نے جو جنگی سامان وہاں جمع کر رکھا تھا، اس کو دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا تھا۔ پونے میں کارتوس، اسلحہ وغیرہ بنانے کے بڑے بڑے سرکاری کارخانے تھے۔ ہزاروں مزدور وہاں کام کرتے تھے۔ فوجی چھاؤنیاں اور گودام جنگل میں کئی کئی میل تک پھیلے ہوئے تھے۔

جنگ کے ختم ہونے کا اعلان ایک بڑا اہم واقعہ تھا۔

جس روز جاپان کے ہتھیار ڈال دینے کی اطلاع پہونچی تھی، اس روز گورے سپاہی مارے خوشی کے سڑکوں پر سر ایک سے ہاتھ ملاتے، گلے ملتے پھر رہے تھے۔ انہیں بڑی خوشی تھی۔ معلوم نہیں یہ بیچارے امریکی تھے یا انگریز تھے۔ کب سے اپنا گھر بار چھوڑے دنیا میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو برما کے جنگلوں میں جاپانیوں کے مقابلے میں سخت مصیبتیں جھیل چکے تھے۔

ہم لوگوں کو عام طور پر گورا سپاہیوں سے ایک نفرت سا رہتا تھا۔ لیکن اس روز اُن کی یہ خوشی دیکھ کر مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔

انہیں خوشی تھی اپنے وطن جانے کی، اپنے پیارے رشتے داروں سے ملنے کی، فوجی زندگی کے عذاب سے چھوٹنے کی، موت و زیست کی کش مکش سے نجات پانے کی۔

غرض جناب جوش کے قیام پونا کا یہ پس منظر تھا — جنگ کا خاتمہ، غیر ملکی فوجوں کی واپسی، کانگریسی لیڈروں کی رہائی، ہندوستان کی آزادی کی منزل کا قریب نظر آنا، ہندو مسلم فسادات میں اضافہ، مسلم لیگ کی طاقت میں روزافزوں

ترقی، مطالبۂ پاکستان کی مقبولیتِ عام۔

جنگ کے دوران میں فلمی کاروبار نے بڑی ترقی کی تھی۔ فلم بنانے والوں نے خوب روپیہ کمایا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہی فلمی ترقی کی رفتار میں سرعت کے ساتھ کمی آتی گئی۔ فلم بنانے والوں پر ایک خوف و ہراس چھانے لگا۔ اس کا اثر کام کرنے والوں پر بھی پڑنے لگا۔

جناب جوش اور کرشن چندر صاحب نے فلم "من کی جیت" میں بہت کام کیا۔ اس کے تو تقریباً تمام مکالمے جوش کے منظور کردہ ہیں، یا خود ان کے لکھوائے ہوئے ہیں۔ گیت بھی زیادہ تر انہیں کے ہیں۔ ایک یا دو گیت پنڈت بھرت ویاس کے ہیں جو ہندی کے مشہور شاعر ہیں، وہ بھی اس وقت شالیمار سے وابستہ تھے۔

جناب جوش کا ایک گیت ؎

نگری مری کب تک یونہیں برباد رہے گی

بے حد مقبول ہوا۔ اب تک اس کا ریکارڈ بجایا جاتا ہے۔ "من کی جیت" کے علاوہ جناب جوش کے گانے فلم "غلامی" "شہزادی" (آولدو) "پرتھوی راج" میں بھی شامل ہیں۔

میں جوش کے ملک شاعری کا برسوں سے معترف اور مداح تھا، مگر اندیشہ تھا کہ آیا وہ فلم کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکیں گے یا نہیں ــــ جوش کے گانوں کی مقبولیت اور پھر ان کو فلمی گیت لکھتے دیکھ کر وہ اندیشہ جاتا رہا۔ کسی فلم میں جس جس موقع پر گانے رکھے جاتے، فلم ڈائرکٹر وہ موقعے جوش صاحب کو بتا دیا کرتا تھا۔ اور وہ انہیں ذہن میں رکھ کر کسی وقت بھی گانے لکھنے بیٹھ جاتے۔

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ گانے اس طرح لکھتے تھے جیسے کوئی خط لکھ رہا ہو۔ اور جب سناتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ عام گانوں سے وہ کتنے بلند اور کتنے منفرد ہوتے تھے۔ لطف یہ تھا کہ جوش نے ان گانوں میں کبھی ادبی معیار سے انحراف نہیں کیا۔

بعض گانے ایسے تھے جن کو غزلِ مسلسل کہا جا سکتا ہے۔

اور پھر لطف یہ کہ تین چار گانوں کی فرمائش ہوتی، اور جوش صاحب نو دس گانے کہہ دیا کرتے کہ اس میں سے ڈائرکٹر کو جو پسند آئیں چن لے۔

کبھی کوئی ڈائرکٹر کسی مصرعے یا شعر پر مطمئن نہ ہوتا تو جوش نہ صرف یہ کہ برا نہیں مانتے تھے بلکہ وہیں ٹہل ٹہل کر ایک کے بجائے تین تین چار چار مصرعے لکھ دیتے تھے۔

فلم کے موقعے کے لحاظ سے جوش جو الفاظ، جو تشبیہیں اور جو استعارے استعمال کرتے تھے وہ بجائے خود ادبیت کا ایک دلچسپ پہلو رکھتے تھے۔

مشکل یہ ہے کہ ان کے کہے ہوئے تمام فلمی گانے کبھی یکجا نہیں کیے گئے۔ بہت سے ضائع بھی کر دیے گئے، جوش کو ان گیتوں کی پروا بھی نہیں تھی۔

میں بعض ایسے گیت جو جوش پھینک دیتے تھے اٹھا کر رکھ لیتا تھا۔ مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ میرا ان کا

ساتھ اُن کے پونے آنے کے دو ڈھائی سال کے بعد ہوا۔ پتہ نہیں اس سے پہلے کتنا مواد ضائع ہوا۔
سنہ ۴۷ء کے آغاز تک فلمی صنعت میں روز بروز اداسی بڑھتی گئی۔
جولائی سنہ ۴۷ء میں میں پونے سے اپنی حیدرآباد کی ملازمت پر واپس چلا گیا۔
سیاسی سرگرمیاں بھی تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ آخر اگست سنہ ۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم ہو گئی اور پاکستان وجود میں آ گیا۔
شالیمار کمپنی بھی بند ہو گئی۔
بعد میں سنا کہ پونے میں ڈبلیو زیڈ احمد اور احمد جعفر صاحب کو (جو پونے کے اہم سیاسی لیڈر اور ایک بڑے کاروباری خاندان کے بزرگ ہیں) قتل کرنے کا تخریب پسند ہندوؤں نے منصوبہ بھی بنایا تھا۔ اس سے ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کو ان کے ایک ہمدرد ہندو دوست نے آگاہ کیا۔ وہ وہاں سے یکایک کراچی روانہ ہو گئے۔ جوش صاحب بمبئی چلے گئے۔
مجھے ان کا خط ملا کہ وہ شمالی ہند جانے والے ہیں۔
میں اُن سے رخصت ہونے کے لئے بمبئی گیا۔ چند روز کے بعد حیدرآباد واپس ہوا۔
جوش اس زمانے میں بہت پریشان رہے۔
دہلی سے سرکاری رسالہ "آج کل" کی ادارت کے لئے اُن کا نام لیا جا رہا تھا، اور ہمیں امید تھی کہ کانگریس کی حکومت ضرور جوش کو یہ خدمت دے گی۔ مگر شاید سردار پٹیل کی مخالفت حائل ہوتی رہی۔ ایک مرتبہ مجھے جوش کا مایوسی بھرا خط ملا جس سے بڑی کوفت ہوئی۔
بہرحال سنہ ۴۸ء کے آخری زمانے میں انہیں دہلی بلایا گیا، جہاں وہ آٹھ نو سال تک "آج کل" سے وابستہ رہے۔ پھر سنہ ۵۵ء کے آخر میں پاکستان آ گئے۔

شعر ایک ازلی عکس ہے —— کیا مکدّر آئینہ
عکس قبول کر سکتا ہے۔ پیمبر و شاعر دونوں ایک ہی
روحانی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ کیا کسی پیمبر
کے متعلق کبھی یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی فرد یا گروہ
سے نفرت کرتا اور ذاتیات کی بنا پر عداوتیں پالا کرتا تھا؟!
—— اس طرح میں دریافت کروں گا کہ کیا کسی شاعر
کے اختیار میں یہ بات ہے کہ وہ کسی سے نفرت کرے یا
کسی کی عداوت دل میں پال سکے؟!

جوش

اعجاز الحق قدوسی

ریش اور رندی کا رشتہ

کئی سال پہلے کی بات ہے، ایک روز میں اور جوش صاحب موٹر میں بیٹھے ہوئے جمشید روڈ سے گذر رہے تھے۔ وہ موٹر ڈرائیو کر رہے تھے، میں ان کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔ ہم دونوں خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ اچانک ایک دوسری موٹر ہمارے پاس سے گذری۔ اس میں دو خوش پوش نوجوان تھے۔ ان دونوں نے ہمیں نہایت ہی متبسمانہ انداز اور استعجاب کی نظروں سے دیکھا، اور گذر گئے۔

جوش صاحب نے ایک اچٹتی ہوئی نظر ان کے چہروں پر ڈالی اور مجھ سے پوچھنے لگے "قدوسی! ان دونوں کی آنکھوں میں ایک سوال غلطاں تھا۔ اس لئے یہ متعجب بھی تھے اور متبسم بھی۔ تم نے بھی محسوس کیا؟"

میں نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

بولے۔ "ان کی نگاہیں یہ استفسار کر رہی تھیں کہ اس داڑھی اور رندی کا کیا رشتہ ہے، اور کب سے ہے؟ لیکن انہیں کیا معلوم کہ یہ تعلق کتنا قدیم اور کتنا گہرا ہے۔ یہ کوچہ بافت نوجوان کیا جانیں کہ اختلاف مشرب اور مسلک کے باوجود محبت کے چوراہے دو مختلف راہیوں کو اس طرح ملا دیتے ہیں کہ ان میں اختلاف مسلک کا گمان باقی نہیں رہتا۔ ان کی باہمی محبت کی تقدیریں مشترک ہوتی ہیں۔ لیکن راہیں علیحدہ علیحدہ! لوگ ان کے وضع قطع کو دیکھ کر اس قسم کے تعلقات سے شکم پہ مسکراتے ہیں۔ لیکن وہ روحانی ربط و یگانگی کو نہیں جانتے۔"

آج کئی سال کے بعد پھر وہی سوال مجھ سے جناب صہبا مدیر افکار نے کیا ہے۔ تو اس کا جواب تو صرف اتنا ہی ہو سکتا تھا جو جوش صاحب نے دیا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ کمبخت ہیں، وہ بھلا اس مختصر سے جواب پر کہاں اکتفا کر سکتے ہیں؟ جب تک کہ میری زندگی کے اس پہلو کا وہ پورے طور پر جائزہ نہ لے لیں، نہ خود مطمئن ہوں گے اور نہ مجھے مطمئن بیٹھنے دیں گے۔ اس لئے عافیت اسی میں محسوس ہوتی ہے کہ جوانی کے وہ واقعات جو اب کبھی کبھی میرے حافظے میں ابھرتے ہیں، اور ماضی کی وہ خوش گوار یادیں جو اب بھی پیری کی تلخیوں کو گوارا بنائے ہوئے ہیں، اپنی زندگی کے ان طویل افسانوں میں سے جن کا تعلق صرف جوش سے ہے یہاں دہرا دوں۔

میں پیدا تو مشرقی پنجاب کے مشہور شہر جالندھر میں ہوا ہوں۔ لیکن میرا آبائی وطن ضلع سہارنپور کا ایک مشہور قصبہ

گنگوہ ہے جو سلسلۂ صابریہ کے مشہور صوفی درویش اور میرے جد اعلیٰ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی، اور آخری دور کے مشہور محدث مولانا رشید احمد گنگوہی کی وجہ سے غیر معمولی شہرت و عظمت رکھتا ہے۔ میرے خاندان کا پرانا ماحول پرانی وضع کا تھا۔ میں نے قدیم علماء کے دامن میں تربیت پائی۔ اور اپنی خاندانی ریت کے مطابق علوم مشرقیہ کی تعلیم حاصل کی۔ جہاں شاعری گناہ اور شعر کا پڑھنا جرم سمجھا جاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب داغ اور امیر کے چرچے ختم ہو رہے تھے۔ مولانا حالی کا مقدمۂ شعر و شاعری شائع ہو چکا تھا اس مقدمے نے اس دور کی شاعری میں ایک نئے انقلاب کے سامان پیدا کئے تھے۔ اور شاعری کا ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ میرے دماغ کے ایوان۔ اگرچہ میرے بیٹھے ہوئے تھے لیکن میں نہیں جانتا کہ شعر سے مجھے کیسے مناسبت پیدا ہوئی۔

جوش کے چھوٹے چھوٹے کتابچے "مقالات زریں" اور دوسرے دو ایک ناموں سے شائع ہوئے تھے جو اُن کی نظم و نثر کے مجموعے تھے۔ یہ کتابچے میری نظر سے گزرے۔ میری عمر اس وقت سولہ سترہ سال کی ہوگی۔ گو مجھے شعر کا صحیح شعور نہ تھا۔ لیکن ان مجموعوں کو پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ شعر کی لطیف شراب کوئی سانچے میں ڈھالا جا رہا ہے۔ میں نے ان کتابچوں کی نظم و نثر میں ایک نیا پن اور ایک عجیب کیف محسوس کیا۔ یہ تھی جوش کے کلام سے میری پہلی واقفیت زمانہ گزرتا گیا ماہ و سال بیتتے گئے، جوش کی غائبانہ محبت و عقیدت میرے اس معصوم دل و دماغ میں پرورش پاتی رہی۔ جس پر میرے بزرگوں اور پرانے ہر قسم کے تحریرداروں نے یہ کہہ کر پہرے بٹھا رکھے تھے کہ عشقیہ شاعری خرب اخلاق ہوتی ہے۔ محبت کا یہ ننھا سا پودا ایک تناور درخت بن گیا۔ میرے دل میں یہ تمنا پرورش پانے لگی کہ کاش میری جوش سے ملاقات ہوتی، کاش میں ان کے نغموں کو ان کی زبان سے سن سکتا۔ قصبے کے دیہاتوں اور رسالوں میں جہاں ایک بھی میرا ہم مذاق نہ تھا، جہاں شعر سے تعلق رکھنا گناہ کبیرہ سے کم نہ تھا، میرے دل میں جب کبھی یہ تمنا کروٹ لیتی تھی میں اس جذبے کو دبانے کی کوشش کرتا تھا، اور سمجھتا تھا کہ یہ تمنا بھی ان تمناؤں میں سے ہے، جو

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

میں شامل ہو کر رہے گی۔ ہمارے قصبے میں ایک بھی شخص ایسا نہ ملتا تھا جس سے میں اپنے دل کی لگن کہہ سکوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ؎

میں ہوں وہ تاریخ جو عصیر افسانوں میں ہو
میں ہوں وہ انسان جو شہروں کے ویرانوں میں ہو

لیکن کسے معلوم تھا کہ ایک دن داڑھی اور رندی کا تعلق مقدر ہو چکا ہے

غالباً سنہ ۱۹۴۲ یا ۱۹۴۳ء کی بات ہے، میں مظاہر العلوم سہارنپور میں پڑھتا تھا۔ یہ اگرچہ یوپی کی علوم اسلامیہ کی دارالعلوم دیوبند کے بعد سب سے بڑی درس گاہ ہے۔ جہاں سیکڑوں طالب علم تعلیم پاتے ہیں۔ لیکن یہاں داخل ہونے کے بعد بھی مجھے یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ زمین بدل گئی ہے لیکن آسمان وہی ہے مگر بہر حال مجھے اپنے ہم خیال ملنے لگے۔

دارالاقامہ میں میرے برابر کے ایک کمرے میں ایک صاحب رہتے تھے جن کا نام ضیا خلیق۔ یہ میرے ہم جماعت بھی تھے اور ہم مذاق بھی۔ شاعری کے رسیا تھے یا یوں کہئے کہ وہ اور میں ایک ہی بیماری میں مبتلا تھے۔ تسکین ذوق کے لئے یہ بے چارے چھپ چھپ کر ادبی رسالے لاتے، اور رات کے سناٹے میں چھپ کر دنیا سوئی ہوتی، وہ بیٹھ کر ان رسالوں میں

سے ہلکے سُروں میں ترنم سے وہ اشعار سُنتے جو ان رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ وہ پڑھتے رہتے، میں سر دُھنتا تھا۔ کبھی میں پڑھتا اور وہ لطف لیتے۔ اس طرح دونوں کا سہما ہوا ذوقِ شعری بغیر کسی جادہ و منزل کے پروان چڑھ رہا تھا ایک دن صبح کا وقت تھا۔ ہم حدیث کے درس میں مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث کی درس گاہ میں بیٹھا ہوا تھا درس شروع ہو چکا تھا، خلیق صاحب آئے، اور جلدی سے میرے برابر بیٹھ گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی چیز کو اپنے کوٹ میں نہایت احتیاط سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے موقع پا کر اور آنکھ بچا کر آہستہ آہستہ ان سے پوچھا۔

کیا لائے ہو، جسے چھپانے کی کوشش کر رہے ہو؟"

بولے " چپ رہو۔ نسخۂ کیمیا ہے نسخۂ کیمیا: آج رات کو ملاقات ہوگی تو دکھاؤں گا۔ آنکھیں کھل جائیں گی" بات آئی گئی ہوئی۔ درس ختم ہو گیا۔ اور ہم سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

میں رات کا اس طرح انتظار کرنے لگا جیسے کوئی شبِ وصل کا منتظر ہوتا ہے۔ اللہ اللہ کر کے رات آئی۔ جب سارے دار الاقامہ کو نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا، تو خلیق نے آہستہ سے میرے کمرے کی زنجیر کھٹکھٹائی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ وہ کمرے میں آہستہ سے داخل ہوا۔ اس کی بغل میں ایک خوب صورت رومال میں لپٹی ہوئی ایک کتاب تھی جسے وہ نہایت مضبوطی سے دبائے ہوئے تھا۔

اُس نے بیٹھتے ہی نہایت ادب سے اس کتاب کو میز پر رکھا.... اور میری طرف دیکھ کر تبختر سے مسکرایا جیسے دولتِ بے قیاس اس کو مل چکی ہے۔ اُس نے کہا۔ قدوسی! خدا کی قسم اس شاعری کے پیچھے ابتک ہم جھک مارتے رہے ہیں اور ہمیں اس مجلس میں خبر ہی نہیں کہ آج سے چار رسال پہلے شاعری کا نیا آفتاب طلوع ہو چکا ہے۔ اٹھو، پرانے ساغروں کو توڑ کر نئے جام و مینا کا اہتمام کرو!"

یہ کہہ کر اس نے رومال کھولا، اور اس میں سے ایک کتاب نکال کر میرے سامنے رکھی۔ اور کہنے لگا: یہ لو مستقبل کی شاعری کے نقیب کا صحیفۂ شاعری۔ جب پڑھو گے تو آنکھیں روشن ہو جائیں گی"

میں نے دیکھا، وہ جوش کا پہلا مجموعہ "روحِ ادب" تھا۔

خلیق وہ مجموعہ مجھے دے کر چلا گیا۔ اور میں نے پچھلی رات کے سناٹوں میں اسے پڑھنا شروع کیا۔ مجھے اس مجموعے میں وہ سب کچھ مل گیا جس کی طلب میں میرا ذوق مدت سے حیران و سرگرداں تھا۔ اس مجموعے نے جوش کے متعلق میری آتشِ اشتیاق کو اور تیز کر دیا۔ لیکن اب بھی میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ وہ بھٹکی ہوئی تمنا ہے جسے کبھی اپنی راہ اور منزل نہ مل سکے گی۔

زمانہ اور آگے بڑھ گیا!

سنہ ۱۹۲۷ء میں میں تلاشِ معاش کے سلسلے میں حیدرآباد دکن پہونچا۔ جوش اس زمانے میں حیدرآباد آ چکے تھے۔ اور مجھے یہ معلوم بھی تھا کہ وہ جو دواے دل بیچتے تھے یہیں موجود ہیں۔ لیکن سنتے ہیں کہ صدرے پرشتی کی حکومت بھی نہیں چلتی۔ میں ایک سال تلاشِ معاش میں اس قدر حیران و سرگرداں رہا کہ جوش سے نہ مل سکا۔

ایک روز کا اتفاق سنیئے کہ میرے پاس میرے ایک دوست علامہ حیرت بدایونی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ میری جوش

سے غائبانہ عقیدت سے بھی واقف تھے۔ بولے: قدوسی! یار کتنے دن ہو گئے اور جوش سے تم اتنی عقیدت کا اظہار بھی کرتے ہو لیکن کبھی تم نے جوش سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ چلو آج میں تمہیں جوش سے ملا کر لاؤں۔ ان کے اصرار پر میں ان کے ساتھ ہو لیا۔

ہم دونوں دارالترجمہ پہونچے۔ اس وقت دارالترجمہ کا دفتر اسٹیشن ناپلی ،صلح سرائے کے سامنے واقع تھا۔ میں اس زمانے میں ناپلی میں رہتا تھا۔ ہم دونوں روانہ ہوئے۔ میں حیرت کے ساتھ خوشی سے یہ سوچتا جوا چلا جا رہا تھا کہ جوش کی رندی میرے تقشف کو برداشت بھی کر سکے گی یا نہیں؛ لیکن پھر بھی داڑھی رندی کے آغوش میں کشاں کشاں چلی جا رہی تھی۔ ہم دونوں دفتر دارالترجمہ میں جوش صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔

صاحب سلامت کے بعد حیرت صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا:

"جوش صاحب! میں آج آپ کے ایک نادیدہ عاشق کو لے کر آیا ہوں۔ ان سے ملئے، یہ ہیں قدوسی صاحب جو عالم طفلی ہی سے آپ کا عشق اپنی فطرت میں لے کر آئے ہیں۔"

جوش صاحب نے نہایت تپاک اور متبسمانہ چہرے کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا۔ بہت دیر تک مجھ سے میرے حالات پوچھتے رہے۔ آخر میں میں نے ان سے عرض کیا کہ

"آپ کی زبان سے آپ کے کلام کے سننے کی تمنا ایک طویل عرصے سے میں اپنے قلب میں لئے ہوئے ہوں۔ اگر زحمت نہ ہو اور آپ دو چار شعر عطا فرمائیں تو نہ صرف یہ کہ میری دیرینہ تمنا پوری ہوگی بلکہ آپ ہمارے اس وقت کو بھی تاریخی بنا دیں گے۔"

جوش صاحب نے کہا: "بہت اچھا صاحب لیجئے میری ایک تازہ نظم کے چند اشعار سنئے۔" یہ کہہ کر وہ گنگنائے اور ہلکے ترنم[1] میں یہ چند شعر سنائے ؎

اے نرگس جاناں یہ نظر کس کے لئے ہے
یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شرر کس کے لئے ہے
اے زہرہ جبینوں کے لئے بھیک مزیت
پیغام بر فتح و ظفر کس کے لئے ہے
اے کجکلہ کو نہ عمر مری شام بلا کی
یہ زلف رسا تا بہ کمر کس کے لئے ہے
اے عارض تابندہ و روئے عرق آلود
یہ شہد، یہ شبنم، یہ شکر کس کے لئے ہے
اے خود سے الجھتی ہوئی بدمست جوانی
ہر سانس میں یوں زیر و زبر کس کے لئے ہے

---

[1] جوش اس زمانے میں ترنم سے پڑھتے تھے۔

اے یار کبھی جوش سے اس نظم کی ضد پر
یہ پوچھ کہ تو خاک بسر کس کے لئے ہے

یہ ہیں وہ پہلے اشعار جو میں نے جوش کی زبان سے سنے، اور یہ تھی رندی اور داڑھی کی پہلی ملاقات جو آئندہ چل کر رندی اور تقشف کا زبردست سنگم ثابت ہوئی۔

دن گذرتے گئے میری اور جوش کی ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ تکلف کے حدود ٹوٹتے گئے۔ بے تکلفی ان کی جگہ لیتی گئی۔ رسمی تعلقات کو خلوص و محبت نے اس طرح شکست دی کہ من تو شدم کا گمان ہونے لگا۔ فقرے کسے جانے لگے کہ ایک زاہد نشین کو جوش کی دوستی در میکدہ تک پہنچا کر لائی ہے۔ خدا خیر کرے۔ اوروں کا کیا ذکر خود میں بھی پکار اٹھا ؎

دیکھا ہے ہم نے حلقۂ شیخ حرم کو بھی
وہ اہتمام خدمت پیر مغاں کہاں

لیکن حقیقت یہ تھی کہ نہ رندی نے میکدے کو چھوڑا تھا، اور نہ کوئی حرم سے سوئے میکدہ آیا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ جب بھی قائم تھے اور آج بھی قائم ہیں۔ لیکن فکر و نظر اور مشرب و مسلک کے اختلاف کے باوجود اصل بات یہ ہے کہ مجھ میں اور جوش میں کچھ مشترکہ قدریں ایسی ہیں جو ہم دونوں کی دوستی اور تعلقات میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہی میری اور ان کی دوستی کا راز ہے۔

آج ۳۵ سال سے ہم دونوں میں جو چشمکیں صرف اتنی رہتی ہیں کہ وہ میرے افکار و عقائد و اقرار کو تقلید — اور روایات پرستی کا نام دیتے ہیں۔ اور میں ان کے دعوئ تعقل اور افکار کو مجذوب کی بڑ اور فرقۂ ملامتیہ کی طرح اقرار کا ایک پردہ سمجھتا ہوں۔ اگر ان کے انکار کے ان حسین و خوب صورت پردوں کو جن کو ان کی طباعی اور ذہانت نے بڑی چابک دستی سے تیار کیا ہے ہٹا کر دیکھا جائے، تو ہمیں وہ اقرار کے اسی چوراہے کے سرے پر نظر آتے ہیں، جہاں پہونچ کر ہر متشکک متجسس اور بھٹکا ہوا راہی سکون کی دولت حاصل کرتا ہے۔

دیکھئے وہ انکار کی وادی میں سرگرداں ہونے کے باوجود کس طرح اپنے دل کی سچی آواز کو منتقل کرتے ہوئے ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎

اک عمر سے انکار پہ مائل ہے دماغ
اور دل ہے کہ اقرار کئے جاتا ہے

ایک اور "عجز" سے اقرار کی ایک اور آواز سنئے ؎

اللہ کو قہار بتانے والو
اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں

اب اور غزل میں تو بہت کھل کر انہوں نے اپنے انکار کے پردوں کو خود ہی اپنے ہاتھوں سے نوچ ڈالا ہے ؎

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روز حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی والہانہ شیفتگی اور عقیدت کا مظہر ان کی متعدد نظمیں ہیں مثلاً ایک نظم میں کہتے ہیں ؎

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزمِ کافری
رعشۂ خوف بن گیا، رقصِ بتانِ آذری
تیری پیمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے
دشت نوردوں کو دیا تو نے مقامِ سروری

اور آج تو وہ صاف صاف یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

جوش سا کافر و کافر گر و کافر گفتار
نظر آتا ہے مسلماں ہے یہ معلوم نہ تھا

خیر یہ بات تو جملۂ معترضہ کے طور پر درمیان میں آ گئی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ میرے اور اُن کے تعلقات بڑھتے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کے تقرب و اختصاص کی دولت نے مجھ جیسے نااہل کو بھی ان لوگوں میں شامل کر دیا جنہیں وہ اپنی نظمیں اور غزلیں کہنے کے بعد سب سے پہلے سناتے تھے۔ اب تو حافظہ کچھ خراب ہو چکا ہے۔ لیکن وہ زمانہ تھا کہ جوانی کے ساتھ ساتھ میرا حافظہ بھی جوان تھا۔ جو کچھ وہ سناتے تھے، ایک ہی دفعہ میں دماغ پر پتھر کی لکیر ہو جاتا تھا۔ میں اس زمانے میں ان کے ان ہم نشینوں میں تھا جنہیں ان کا کلام سب سے زیادہ یاد تھا۔ اکثر محفلوں اور مخصوص صحبتوں میں مجھ سے پوچھتے

"کہو قدوسی! کیا سنائیں؟"

میں اُن کی نظم کے دو چار شعر پڑھتا۔ بہت خوش ہوتے، اور جوش میں آ کر کہتے۔ "بھائی عرب میں ہر شاعر کا ایک راوی ہوتا تھا۔ یہ میرے راوی ہیں راوی۔ اس ظالم نے کس غضب کا حافظہ پایا ہے۔ میری بیسیوں نظمیں اس کو زبانی یاد ہیں"۔

پھر تو جوش کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ ہر دوسرے تیسرے روز رات کو میرے یہاں آ جاتے اور کہتے "حیرت مرحوم کہاں ہے میاں! اسے بلا کر لاؤ۔ الطاف انصاری کو بلاؤ۔ میر ابن علی کو بلاؤ۔ جاؤ سب مردودوں کو بلا کر لاؤ۔ میں آج سنانے کے موڈ میں ہوں۔"

میں سب کو اکٹھا کرتا۔ محفل جمتی۔ جوش صاحب اپنا اٹیچی کیس کھولتے۔ جس میں ان کی مختلف بیاضیں رہتی تھیں اور کہتے: "آج تمہیں صرف مناظرِ فطرت پر سناؤں گا"۔ پھر وہ اسی موضوع پر ترنم سے پڑھتے۔ اس لحن اور گرج کے ساتھ کہ سوتے تو کیا مُردے بھی اگر سن پاتے تو قبر سے نکل پڑتے۔

وہ کئی کئی گھنٹے اسی موضوع پر مسلسل پڑھتے تھے۔ نہ سننے والے تھکتے تھے اور نہ سنانے والے پر ماندگی کا کوئی اثر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی چاندنی راتوں میں یہ محفلیں حسین ساگر کے کنارے اور کبھی عثمان ساگر کے کنارے جمتی تھیں۔ عمر یہی صالح ہوتا تھا۔ عارف، معین، ابرار حسن خاں اثر، حکیم آزاد انصاری، جو آج سب مرحوم ہو چکے ہیں، ان میں شریک ہوتے۔ ایک عجیب وقت اور عجیب سماں ہوتا تھا۔ وہ باتیں آج بھی یاد آتی ہیں تو میں ان شیریں یادوں اور خوشگوار ماضی کو آنسوؤں سے یہ کہہ کر خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں:

میں نے کہا: "آج میں ایک سوالی بن کر آیا ہوں مجھے امید ہے کہ آپ میرے سوال کو رد نہ فرمائیں گے۔"
بولے: "کچھ کہو تو سہی!"
میں نے کہا: "جناب میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ صرف آج رات کے لئے مجھے اپنی تمام بیاضیں دے دیجئے۔ میں ان میں سے اپنے مطلب کی چیزیں نقل کرنا چاہتا ہوں۔ کل صبح کو سورج طلوع نہ ہو پائے گا کہ میں ان بیاضوں کے ساتھ آپ کے دروازے پر موجود ہوں گا۔"
بولے: "یہ بات ہے تو بہت مشکل، کیوں کہ تم خود بھی جانتے ہو کہ یہ میری تمام عمر کا سرمایہ ہیں لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ وہ مانگ رہا ہے جس سے میں دریغ نہیں کر سکتا۔ لو بھائی وہ اٹیچی کیس سامنے رکھا ہے، اٹھاؤ اور لے جاؤ۔ لیکن خدا کے لئے حفاظت کرنا۔"
میں نے کہا: "جوش صاحب! فکر نہ کیجئے اور یقین کیجئے کل صبح کو میں یہ بیاضیں لئے یہاں موجود ہوں گا۔"
میں اس اٹیچی کیس کو لے کر گھر آیا۔ رات کو میں نے ان تمام بیاضوں کا جائزہ لیا۔ رات کے متعلق جس قدر نظمیں، رباعیاں اور قطعات تھے، انہیں ایک خاص ترتیب سے نقل کیا۔ بعض نظمیں جو کسی دوسرے عنوان کے تحت تھیں، ان عنوانوں کو بدل کر اپنے موضوع کے مطابق بنایا۔ پھر اس پر ایک چھوٹا سا مقدمہ لکھا۔ اس مجموعہ کا نام "شاعر کی راتیں" رکھا۔
جس وقت صبح کو مؤذن کی آواز کان میں آئی تو میں اس مجموعے کی ترتیب سے فارغ ہو چکا تھا۔ دوسرے دن صبح کو میں یہ مجموعہ اور اٹیچی کیس لے کر جوش صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے ان سے کہا: "لیجئے حضور، امانت تو لے لیجئے۔" پھر میں نے اپنا ترتیب دیا ہوا مجموعہ ان کے سامنے پیش کیا، اور اس کی اشاعت کے متعلق اپنا خیال ظاہر کیا۔
بہت دیر تک وہ اس مجموعے کو دیکھتے رہے۔ پھر کہنے لگے "قدسی! خیال تو یہ بہت اچھا ہے۔ مگر اس کی اشاعت کی کیا صورت ہوگی؟"
میں نے کہا: "اس کی فکر نہ کیجئے۔ صرف آپ کی اجازت کی دیر ہے۔ میں اسے خود شائع کروں گا۔"
بولے: "جو جی چاہے کرو۔ تمہیں مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہ تھی۔"
چنانچہ یہ مجموعہ غالباً سنہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ "شاعر کی راتیں" اردو ادب کے میدان میں تمام مجموعوں میں جو اب تک شائع ہو چکے ہیں اپنی نوعیت کا پہلا مجموعہ ہے۔ "شاعر کی راتیں" شائع ہوتے ہی پورے ہندوستان میں اس کی دھوم مچ گئی۔ ہر طرف سے اس کی مانگ تھی۔ چنانچہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئی۔ لیکن چار مہینے میں دوسرا ایڈیشن چھپ گیا۔
مجھے اس کتاب سے ایک ہزار روپیہ وصول ہوا۔ میں چھ سو روپے لے کر جوش صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ڈرتے ڈرتے ان سے کہا: "بندہ پرور! آپ کے لگائے ہوئے درخت میں کچھ آم آئے ہیں۔ اس کے پھل لایا ہوں۔ آپ انہیں قبول کرلیں۔ تو میری بڑی عزت افزائی ہوگی۔" یہ کہہ کر میں نے چھ سو روپے پیش کئے۔ روپے دیکھتے ہی برہم ہو گئے۔

اعجاز الحق قدوسی

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے پٹرول کے ڈبے نے ماچس کو دیکھ لیا ہے۔ نہایت برہم ہو کر کہنے لگے۔ قدوسی!
مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی کہ تم مجھے اس قدر ذلیل کرو گے۔ اول تو یہ کہ میں اپنے مخلصین سے کچھ لوں، میرے لئے
انتہائی شرم کی بات ہے۔ دوسرے یہ کہ میں تمہاری پریشان حالیوں سے واقف ہوں۔ میں بہت دن سے چاہتا
تھا کہ تمہاری مدد کروں، لیکن تمہاری خودداری سے واقف ہوتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کچھ پیش
کروں اور تم اسے قبول نہ کرو۔ اور بیٹھے بٹھائے اچھے دل برے ہوں۔ قدرتاً یہ موقع نکل آیا۔ جاؤ یہ روپیہ لے جاؤ
اور مجھے شرمندہ نہ کرو میں ویسے ہی تم سے بے حد شرمندہ ہوں کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکا۔

ان کے کمالِ فن کے بعد اُن کی شرافتِ نفس، اولوالعزمی اور بلند کرداری کا یہ پہلا نقش تھا جو میرے قلب پر
اس طرح منقوش ہوا کہ مر کر بھی نہیں مٹ سکے گا۔

اپنے اہلِ کمال ہم عصروں کی توقیر کا جذبہ جس قدر میں نے جوش میں پایا وہ دوسروں میں کم نظر آیا۔ حضرت آزاد
انصاری کی وہ بے حد عزت کرتے تھے ایک دن ان کی پریشان حالی کو بیان کرتے ہوئے کہنے لگے: قدوسی! دیکھو
زمانہ کس قدر ناقدر شناس ہے۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو اس بوڑھے انسان کو زر و جواہر میں تول کر کہتا،
"نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز"

آج بھی جب وہ کبھی حکیم آزاد انصاری کا تذکرہ کرتے ہیں تو پہلے ایک آہ سرد اُن کے منہ سے نکل جاتی ہے

فانی مرحوم کے جب حیدرآباد آنے کی خبریں گرم ہوئیں تو ان کے آنے سے قبل اپنے ایک ایک دوست سے
کہتے تھے۔ لو بھائی فانی حیدرآباد آ رہے ہیں۔ اب شعر و سخن کا لطف آئے گا۔ اب محفلیں خوب گرم رہیں گی۔
فانی آئے تو ابتداً صرف سرائے میں ٹھہرے۔

جوش صاحب نے ان کے آنے کے دوسرے روز ان کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت ترتیب دی۔ بعض
عمائدین شہر اور حیدرآباد کے نامی گرامی شعراء کو جمع کیا، اور حضرت فانی کی اس طرح تعظیم و توقیر کی کہ اُن کے لئے
بچھ بچھ جاتے تھے۔ ہر ایک نے اپنا کلام سنایا سب سے آخر میں حضرت فانی کا نمبر آیا۔ فانی نے اپنی فطری سوز و گداز
سے ملے ترنم میں غزل پڑھی؛ جب وہ اس مقطع پر پہنچے ؎

نزع میں فانی چپکے چپکے تو نے یہ کس کا نام لیا
کیوں او کافر! اب بھی زباں پر تیری خدا کا نام نہیں

تو جوش نے داد دیتے ہوئے کہا: "خدا کی قسم فانی وہ مقطع کہا ہے کہ اگر ساری عمر بھی اسے پڑھے جاؤ، تو
سننے والے کو ایک نیا لطف آئے گا۔

پھر ان آنکھوں نے وہ زمانہ بھی دیکھا کہ دونوں میں شکر رنجی ہوئی، اور ملال اس درجہ بڑھا کہ دونوں
نے ایک دوسرے کے خلاف رباعیاں کہیں۔

جوش نے ایک رباعی میں کہا ؎

تو اور بنے حریفِ اربابِ نظر
افسوس ہے اے دماغِ فانی افسوس

ایک اور رباعی میں پھر اپنے شکوے کو فانی سے اس طرح دہرایا ؎

مجبور ہوں منہ موڑ نہیں سکتا ہوں
رشتے ہیں قوی توڑ نہیں سکتا ہوں
احباب ہیں مبتلائے عاداتِ قبیح
واقف ہوں مگر چھوڑ نہیں سکتا ہوں

فانی نے بھی جواباً کئی رباعیاں لکھیں، ان کی اس وقت ایک رباعی یاد آتی ہے ؎

کیا خضرِ طریق کہہ کے رہزن کہئے
بخت نہیں موم کہہ کے آہن کہئے
ورنہ تو وہ دوستوں نے ایذا دی ہے
شرم آتی ہے دشمنوں کو دشمن کہئے

لیکن وہ فانی کی عظمتِ فن کے اس وقت بھی معترف تھے۔ اور آج بھی ان کے مداح ہیں۔

جرأت وطبّاعی جوش کا ایک امتیازی وصف ہے۔ ایک روز میرے سامنے ایک دوست نے ان سے کہا کہ، جناب ایک صاحب کہتے ہیں کہ جوش کا ایک نقص یہ ہے کہ ان کی شاعری کا کوئی خاص موضوع نہیں ہے۔ وہ فکر وخیال کی مختلف وادیوں میں ٹامک ٹوئیے مارتے ہیں۔

جوش نے اسی وقت ہنستے ہوئے برجستہ جواب دیا کہ "یہ تو میری شاعری کی بڑی دلیل ہے۔ کیوں کہ قرآن میں شاعروں کے متعلق آیا ہے۔ فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّہِیْمُوْنَ۔

ایک روز رات کو تقریباً گیارہ بجے آئے۔ اُن کے ساتھ عارف مرحوم مدیر "صبح دکن" بھی تھے۔ بولے قدوسی صاحب ذرا میرے ساتھ چلو!۔

میں نے کہا کہ "آخر کچھ بتاؤ تو سہی کہ کہاں کے ارادے ہیں؟"

بولے۔ بات یہ ہے کہ میں ایک بخیل پر نظم کہنا چاہتا ہوں، اور عطا کے وقت اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں قاضی تلمذ حسین کے پاس لے چلتا ہوں، جو خاصے کفایت شعار ہیں! پر تم سے واقف بھی نہیں۔ تمہیں کچھ منہ سے بولنا نہیں، صرف خاموشی سے ایک سائل کا پارٹ ادا کرنا ہے۔ صرف تین چار منٹ لگیں گے"۔

میں ساتھ ہو لیا۔

ہم تینوں قاضی تلمذ حسین کے مکان پر پہونچے۔ زنجیر کھٹکھٹائی۔ قاضی صاحب باہر آئے۔ صاحب سلامت کے بعد نہایت تپاک سے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ قاضی صاحب مرحوم گراں گوش تھے۔ جوش صاحب نے ذرا بلند آواز سے کہا: "قاضی صاحب! اس وقت زحمت دہی کا یہ سبب تھا کہ یہ صاحب نہایت پریشان حال مسافر ہیں۔ میں نے بھی ان کی کچھ مدد کی ہے۔ اگر آپ بھی کچھ ان کی مدد فرمائیں تو اچھا ہو"۔

قاضی صاحب نے ایک روپیہ جیب سے نکالا، اور میری طرف بڑھایا۔ لیکن جوش صاحب نے انہیں روکتے ہوئے کہا: "قاضی صاحب! شبنم کا قطرہ اس پیاسے کی کیا پیاس بجھائے گا"۔

قاضی صاحب سنبھلا اُٹھے، ان کے چہرے کی عجیب و غریب کیفیت تھی۔ بہت تلملا کر بولے "جوش صاحب! لوگوں نے گداگری کے نئے نئے ڈھونگ بنائے ہیں۔ کوئی حاجی بن کر آتا ہے، کوئی مسافر بن کر لوٹتا ہے۔ آخر کب تک کوئی اپنی کمائی ان کی نذر کرتا رہے!" وہ اٹھے اور گھر میں سے پانچ روپے کا نوٹ لے کر آئے، اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے۔ "لیجئے حضرت! دیکھنے میں تو آپ بڑے معقول معلوم ہوتے ہیں۔ یہ لیجئے میری اوقات کی خطا معاف کیجئے"

جوش نے پھر انہیں روکا اور کہا۔ "قاضی صاحب! اس سے بھی اس غریب کا کیا بھلا ہوگا؟"

قاضی صاحب چڑ گئے، اور بگڑ کر بولے "تو جوش صاحب! آپ کا مطلب یہ ہے کیا میں اپنا سارا گھر ان کی نذر کر دوں؟ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتا"

جوش صاحب کی بڑی رد و قدح کے بعد وہ بگڑتے ہوئے اور پانچ روپے گھر سے لے آئے، اور دس روپے مجھے دیتے ہوئے کہنے لگے "لیجئے اور مجھے معاف کر دیجئے!"

میں نے سلام کیا اور روپے جیب میں رکھ لیے۔

ہم تینوں وہاں سے اٹھے۔ میں نے جوش صاحب سے کہا: "آپ نے مجھے سائل بھی اور قاضی صاحب کے چہرے کا رنگ بھی دیکھ لیا، لیکن ان روپوں کا کیا ہوگا؟"

جوش نے کہا۔ "ہوگا کیا بھائی، ان کی مٹھائی کھائی جائے گی"

جوش اور عارف کا یہ اصرار تھا کہ میں یہ روپے ان کو دے دوں۔ چلتے چلتے آخر میرا گھر آ گیا۔ وہ روپے مجھ سے چھینتے رہے اور میں دروازہ کھلوا کر گھر میں داخل ہو گیا

صبح کو میں دارالترجمہ میں قاضی تلمذ حسین کی خدمت میں حاضر ہوا، اور میں نے وہ روپے اصل محرک بتائے بغیر ان کو پیش کرتے ہوئے کہا "حضرت یہ جوش کی شرارت ہے۔ نہ میں سائل ہوں اور نہ مجھے ان کی ضرورت ہے۔ یہ لیجئے آپ کے روپے حاضر ہیں"

قاضی صاحب نے وہ روپے جیب میں ڈالتے ہوئے کچھ شرمندہ اور کچھ مسکراتے ہوئے چپکے سے کہا "اس کم بخت کو جب سوجھتی ہے ایسی ہی سوجھتی ہے"

شعر گوئی کو میں نے جس قدر مہربان جوش پر پایا، شاید ہی وہ اس قدر کسی پر مہربان ہو۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ اکثر گھر سے دفتر آتے ہوئے ایک نظم مکمل کر لیتے تھے۔

ایک دن میں نے ان کی اس زود گوئی کی تعریف کرتے ہوئے کچھ کہا تو کہنے لگے "قدوسی! شاید تمہیں یقین نہ آئے۔ راستہ چلتے ہوئے راہ کے ذرات مجھے آواز دیتے ہیں کہ خدا کے لئے ہمیں نظم کر لیجئے"

ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ اردو کا سب سے بڑا شاعر آپ کے نزدیک کون ہے؟"

بولے "نظیر اکبر آبادی! کہ اس کی شاعری زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتی ہے"

میں نے پوچھا کہ "فارسی شعراء میں آپ کس سے متأثر ہیں؟"

کہنے لگے "فارسی شاعری میں حافظ و نظیری اپنا جواب نہیں رکھتے"

ہندو پاک میں ہر مشہور شاعر کے ساتھ عموماً شاگردوں کی ایک فوج ظفر موج رہتی ہے مگر جوش صاحب اس نعمت

سے محروم ہیں۔ ایک دن جسونت سنگھ پرواں کا ایک خط مجھے دے کر کہا کہ "اس بے چارے کو میری شاگردی کا جنون ہو گیا ہے۔ خط کے ساتھ انہیں لکھ دو کہ میری برداشت میں یہ فن وہبی ہے اکتسابی نہیں۔ اگر وہ اس کو اکتسابی سمجھتے ہیں تو کم از کم اس کا تو یقین کر لیں کہ میرے دماغ میں اصلاح دینے کا خانہ بالکل نہیں۔ اس لئے معذور سمجھ کر مجھے معاف فرمادیں"

بذلہ سنجی و ظرافت میں بھی جوش صاحب اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ایک مرتبہ مولانا عبدالقدیر مرحوم بدایونی مفتی عدالت عالیہ نے چند خوش گو شعرا اور اہل ذوق کو چائے پر مدعو کیا ان میں جوش صاحب بھی تھے۔ مولانا کے تقدس و تبحر علمی کے باوجود جوش صاحب کبھی کبھی چوٹ کر جاتے تھے۔ جب یہ چائے ان کے سامنے آئی، کے سامنے لائی گئی تو برجستہ مولانا سے مخاطب ہو کر کہا:

"حضرت۔ یہ تو شیر کو گھاس کی دعوت ہے!"

میں دور رنگل میں تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ جوش اپنے اس شعر کی بنا پر میر عثمان علی خاں والیٔ دکن کے عتاب کی زد میں آ گئے ہیں۔ ع

کبھی جوش سے جوش کی قدر شہا
کبھی دل بہ دون کی ثنا خوانیاں کر

آخر جوش کو حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ وہ پہلے دہلی، پھر پونہ اور بمبئی رہے۔ اس پندرہ بیس سال کے عرصے میں ان سے میری ملاقات بالکل نہیں ہوئی۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں پاکستان بننے کے بعد حیدرآباد دکن سے کراچی آیا، غالباً سنہ ۱۹۵۴ء میں جوش صاحب بھی مستقل طور پر پاکستان آ گئے۔ اور ایک بڑے طویل عرصے کے بعد میں اُن سے ملا، اس حال میں کہ میری داڑھی سفید ہو چکی تھی اور ان کی رندی میں بھی اعتدال آ چکا تھا۔ لیکن ہم دونوں کا خلوص اسی طرح جوان تھا، اور آج بھی جوان ہے سہ

واقعات اپنے بیاں کیجئے کیا کیا اے جوش
ایسے ٹکڑے ہیں بہت سے مرے افسانے میں!

زندگی کی آویزشوں میں مردانہ وار حصہ لینے کے بجائے آبا کی چھوڑی ہوئی دولت پر زندگی بسر کرنے والے اس قدر کاہل، کمزور ذہن پست حوصلہ، تن پرور، وہم پرست، خود بیں، رسوم نواز اور جھوٹی عزت کے دلدادہ ہوتے ہیں کہ ان بے چاروں میں یہ صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی کہ وہ کارزار حیات میں ایک بہادر سپاہی کے فرائض انجام دے سکیں!

جوش

محمود علی خاں جامعی

جوش اور دنیاداری

حضرت جوش ملیح آبادی کا کلام سننے اور ان کو دیکھنے کا اتفاق مجھے پہلے پہل سنہ ۴۲ء میں دہلی میں ہوا۔ میں اس وقت مکتبۂ جامعہ سے متعلق تھا۔ خبر ملی کہ حضرت جوش تشریف لائے ہیں، اور ان کے اعزاز میں دیش بندھو گپتا سروپرائٹر "تیج" نے ایک ادبی نشست منعقد کی ہے۔ اتفاق سے مجھے بھی اس میں شرکت کی دعوت ملی۔ میں ذرا تاخیر سے وہاں پہونچ سکا۔ محفل شروع ہو چکی تھی، اور باہر سے بڑی گھن گرج کی آواز آرہی تھی۔ میں اندر پہونچا۔ وہاں فرش پر نشست کا انتظام تھا۔ میں خاموشی سے سب کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اور تقریباً ایک گھنٹے جوش صاحب کو بالکل مبہوت ہو کر سنتا رہا۔ جب نشست ختم ہوئی تو عجیب تحیر اور خود فراموشی کا احساس تھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا، ہم کسی دوسری دنیا میں پہونچے ہوئے تھے۔ جہاں سے اب رفتہ رفتہ ہم نیچے آرہے ہیں۔ اور دماغ پر یہ احساس تھا کہ جیسے وہ گھن کا بنا ہوا ہے اور اس پر ابھی تک ہتھوڑوں کی ٹھن ٹھن بارش ہو رہی ہے۔ محفل کے بعد میں نے دیش بندھو گپتا کی معرفت جوش صاحب سے اپنا تعارف کرایا، اور ان سے ان کی قیام گاہ پر حاضری کی اجازت لے کر واپس آگیا۔

اس زمانے میں میں نے مکتبۂ جامعہ سے قدیم اور جدید صاحب طرز شعراء کے سو سو شعر شائع کیے تھے۔ اور وہ ملک میں بہت مقبول ہوئے تھے۔ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ اس سلسلے میں جوش کے سو شعر بھی شائع کیے جائیں۔ اچھا ہے اس سلسلے میں نظم کی نمائندگی بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ اس سٹ کی جتنی کتابیں چھپ چکی تھیں وہ لے کر میں دوسرے روز جوش صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ حکیم محمود علی خاں دہلوی کے یہاں مقیم تھے، اور ل۔ احمد اکبرآبادی ان کے ہمراہ تھے۔ وہاں ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے وہ سٹ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ اور ان سے ان کے سو شعر بھی شائع کرنے کی اجازت چاہی — موصوف نے بلاتامل اجازت فرما دی۔ لیکن یہ فرمایا کہ، آخر آپ انتخاب کیوں کر کریں گے؟ کیوں کہ اب تک میرے ایک مجموعے "روحِ ادب" کے علاوہ اور کوئی کلام شائع نہیں ہوا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ آپ کا کلام اکثر رسائل میں چھپتا رہتا ہے۔ انہیں کی مدد سے انتخاب کر دوں گا۔

فرمایا کہ جب تک زیادہ سے زیادہ کلام پیش نظر نہ ہو انتخاب اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں یہ کر سکتا ہوں کہ جو چند بیاضیں میرے ساتھ ہیں وہ آپ کو دے دوں۔ آپ یہیں بیٹھ کر انتخاب کر لیں۔ ان میں سارا کلام تو نہیں ہے۔ لیکن حصہ بہرحال

سامنے آجائے گا۔" میں نے اس تجویز پر بڑی خوشی کا اظہار کیا، اور ان کی بیاضیں لے کر بیٹھ گیا۔ کوئی تین چار گھنٹے میں انتخاب کر کے ان کے سامنے پیش کیا۔

جب انہوں نے پسند فرما لیا، تو ان سے ان کی تصویر کی درخواست کی۔

انہوں نے فرمایا کہ میرے ساتھ تو کوئی تصویر نہیں ہے۔

میں نے عرض کیا کہ اس کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ میرے ساتھ کسی اسٹوڈیو میں تشریف لے چلیں، آدھ گھنٹے میں یہ [illegible] ہو جائے گی۔

انہوں نے اسے منظور کر لیا، اور پھر تو وہیں تھوڑی دیر بعد میں ان کو لے کر کشمیری گیٹ پہنچا۔ وہاں ایک اسٹوڈیو میں ان کا فوٹو اتروایا پھر وہ کہیں اور چلے گئے، اور میں اپنے گھر چلا آیا۔

تین چار دن بعد جب انہیں رخصت کرنا تھا میں دوبارہ حاضر ہوا تو جوش کے سو شعر ان کی خدمت میں پیش کئے۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ انہیں دیکھ کر جوش صاحب کو کس قدر حیرت ہوئی۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

فرمایا تو صرف اتنا کہ مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ میرا سا بھی جنون سے بڑا ہے انسانوں سے نہیں۔ —— اور اس کے بعد مجھے ہمیشہ جن کے خطاب سے یاد کرتے رہے۔

غرض کچھ عرصے بعد جوش صاحب دوبارہ وہاں تشریف لائے۔ اور ریلوے روڈ پر ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ اس مرتبہ وہ تنہا تھے۔ میں وہاں بھی ان سے ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا۔ وہاں آپ نے مجھے اپنی نثر کے چند مضامین پڑھ کر سنائے جو آپ نے رسالہ "کلیم" کے لئے لکھے تھے۔ جوش صاحب کا ارادہ عنقریب رسالہ "کلیم" دہلی سے جاری کرنے کا تھا۔ اور اسی کے امکانات کا جائزہ لینے اس مرتبہ تشریف لائے تھے۔ جو مضامین موصوف نے مجھے سنائے۔ ان میں سے ایک واقعہ اب تک ذہن میں محفوظ ہے۔ جس سے جوش کی شخصیت اور خود فراموشی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

ایک روز صبح جوش صاحب اٹھے۔ ہاتھ منہ دھو کر ناشتے سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد غسل خانے تشریف لے گئے۔ وہاں غسل سے فارغ ہو کر کپڑے پہنے۔ اس پر شیروانی، جوتا پہنا، چھڑی ہاتھ میں لی، اور باہر جانے کے لئے چل پڑے۔ جب مکان کے صحن میں پہنچے تو گھر کے کسی فرد نے ان کی بیوی کی توجہ ان کی جانب منعطف کرائی۔ اور فوراً انہوں نے آواز دے کر کہا۔

"یہ کہاں چلے؟"

جوش صاحب نے جواب دیا: "کہاں کیا؟ کام سے جا رہا ہوں۔"

بیوی نے کہا۔ "مگر اس طرح؟ ایسا کون سا کام ہے؟"

جوش صاحب نے کہا۔ "کیا کام کی نوعیت بھی بتانی ضرورت ہے؟ اور اس طرح سے کیا مطلب؟"

بیوی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "مطلب کچھ نہیں، لیکن ذرا ایک نظر اپنے آپ کو تو دیکھئے۔"

اس پر جوش صاحب نے جھک کر دیکھا۔ اور لاحول ولا قوۃ کہتے ہوئے دوبارہ غسل خانے میں داخل۔

دراصل بات یہ تھی کہ جوش صاحب نے سب کپڑے تو پہن لئے تھے، مگر پاجامہ پہننا بھول گئے تھے۔

اس ہوٹل کے قیام کے زمانے میں، میں اکثر ان کے ساتھ رہا۔ اور غروب آفتاب کے بعد جب وہ شغل فرماتے تھے تب بھی

بار میں ان کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ان کو میری یہ ادا بہت پسند تھی کہ جب وہ شراب پیتے تو میں بھی لیمن کا ایک گلاس اپنے سامنے رکھ لیتا تھا۔ اور ان کے ساتھ اس کی چسکیاں لیتا رہتا تھا۔

وہ فرمانے لگے کہ "آپ آداب شراب نوشی سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔"

اس نشست میں انہوں نے ان کو اپنے اور جگر کے دیرینہ تعلقات کا حال بتایا۔ اس کے بعد وہ کبھی میرے سامنے جگر کا نام نہ لیتے تھے بلکہ "آپ کے دوست" کہتے تھے۔ اور اتفاق یہ ہے کہ یہی رویہ بعد میں جگر صاحب نے بھی اختیار کیا۔ وہ بھی کبھی میرے سامنے جوش کا نام نہ لیتے تھے، بلکہ "آپ کے دوست" سے ہی ان کا تذکرہ کرتے تھے۔ اس میں بہت لطیف دوستانہ رقابت کی جھلک نظر آتی تھی۔ ان سے اس طرز تخاطب میں مجھے بڑا لطف آتا تھا۔

اس کے بعد تیسری بار جوش صاحب دہلی تشریف لائے تو میں نے انہیں مکتبہ جامعہ میں ٹھیرایا۔ تقریباً ایک ہفتہ قیام رہا۔ اسی دوران میں ان کا معاہدہ تاج پریس کے ایکسپریس سے جس کے مالک ایک ہندو [illegible] تھے ہو گیا اور وہیں سے "کلیم" شائع ہونا طے پایا۔

اب انہوں نے ایک مکان قرول باغ میں کرایہ پر لے لیا۔ اہل و عیال کو بلا لیا۔ اور وہیں مستقل ہو گئے۔ میں بھی چونکہ قرول باغ ہی میں رہتا تھا۔ اس لئے اب شب و روز کی صحبت رہنے لگی۔ اور باہمی تعلقات تکلفات کی حدود سے بہت آگے بڑھ گئے۔ اور ان میں ایک دوستانہ کیفیت پیدا ہو گئی۔ جس میں ظاہری آداب کا زیادہ لحاظ نہیں رہتا اور ایک دوست اپنے دوسرے بے تکلف دوست سے اپنے تمام ہی راز اگل دیتا ہے۔

اس پریس سے تقریباً ایک سال "کلیم" شائع ہوتا رہا۔ اور اسی دوران میں اس نے آپ کے کلام کا دوسرا مجموعہ "شعلہ و شبنم" کے نام سے شائع کیا۔ اس کے بعد بعض وجوہ کی بنا پر جوش صاحب کا معاہدہ اس پریس سے ختم ہو گیا —— "شعلہ و شبنم" کی تمام جلدیں مکتبہ جامعہ میں منتقل ہو گئیں۔ لیکن رسالہ "کلیم" کے متعلق جوش صاحب کافی فکرمند تھے۔ چنانچہ ل۔ احمد اکبر آبادی نے میرا نام تجویز کیا اور جوش صاحب نے "کلیم" کا سب انتظام میرے سپرد فرما دیا۔ تقریباً ایک سال تک "کلیم" میرے انتظام میں نکلا۔ مہینے بھر کے موصول شدہ مضامین جمع کر کے ان کے پاس بھیج دیتا تھا۔ جوش کا صرف یہ کام تھا کہ وہ ان سے رسالہ ترتیب دے کر مجھے واپس کر دیتے۔ پھر کسی بات سے کوئی واسطہ نہ رکھتے۔

اسی دوران میں میں نے جوش صاحب کی رباعیوں کا مجموعہ "جنون و حکمت" شائع کیا۔

پھر جوش صاحب دریا گنج منتقل ہو گئے۔ "کلیم" بھی ان کے ساتھ گیا۔ کوئی پانچ چھ پرچے براہ راست ان کے انتظام سے شائع ہوئے، اس کے بعد وہ بند ہو گیا۔

اسی زمانے میں یو۔ پی کونسل کے ایک انتخاب میں ل۔ احمد اکبر آبادی فرخ آباد کے حلقے سے کھڑے ہوئے۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ جوش صاحب فرخ آباد چلیں۔ ان کے تشریف لے جانے پر اکثر ادبی نشستیں ہوں گی۔ ان محفلوں کے اجتماع سے کارکن فائدہ اٹھائیں اور ل۔ احمد کے حق میں رائے ہموار کریں۔

چنانچہ جوش صاحب فرخ آباد تشریف لے گئے۔

میں ان کے ہمراہ گیا۔

وہاں بہت سی چھوٹی موٹی محفلوں کے علاوہ ایک بڑا اجتماع کرنا بھی طے پایا۔ اس کی صدارت کے لئے ایک فارسی کے

عالم پنڈت سندر نرائن عشرت کو منتخب کیا گیا۔ موصوف نے بھی اپنا خطبہ بڑے اہتمام سے تیار کیا۔ جلسہ شروع ہونے پر وہ کھڑے ہوئے اور فرمانا شروع کیا:

"صاحبانِ والاشان! اس وقت ہمارے درمیان جو مہمانِ عظیم الشان تشریف رکھتے ہیں ......"

بس اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ وہیں بھرے جلسے میں دھڑ سے گرے اور وہیں ختم ہوگئے ــــ جلسے میں ہلچل مچ گئی، اور وہ سب درہم برہم ہوگیا۔

جوش صاحب پر اس واقعہ کا بہت گہرا اثر ہوا۔ [illegible] وہاں سے سننے کے بعد یہ طے ہوا کہ جوش صاحب اب قیام نہ کر سکیں گے، اور انہیں جلد از جلد واپس ہی جانا چاہئے۔

لیکن واپسی سے پہلے انہیں قائم گنج جانا بھی ضروری تھا ــــ بات یہ تھی کہ جوش صاحب کے اجداد جب افغانستان سے ہندوستان آئے تو سیدھے قائم گنج آئے تھے اور وہیں قیام کیا تھا۔ ان کا مکان اب بھی وہاں موجود تھا۔ جوش صاحب کی دیرینہ خواہش تھی کہ اپنے بزرگوں کا یہ مکان دیکھیں۔ چنانچہ دوسرے روز میں ان کو لے کر قائم گنج گیا۔ پھر ہم لوگ اس مکان پر گئے۔

جوش صاحب تھوڑی دیر وہاں بیٹھے۔ صاحب خانہ نے کچھ مدارات کی۔ اس کے بعد جوش صاحب وہاں کے پٹھانوں کی سادہ معاشرت اور گھریلو زندگی کے خوش گوار تاثرات لے کر واپس ہوئے۔

جوش صاحب بہت ہی بھولے بھالے اور معصوم صفت انسان ہیں۔ ان کا بھولا پن ہر ملنے والے پر واضح ہو جاتا ہے اور اسے بہت متاثر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر "کلیم" کے زمانے کے ایک واقعہ کا خیال آتا ہے۔

"کلیم" کے ایجنٹوں کو ہم ۲۵ فی صدی کمیشن دیا کرتے تھے۔ ایک روز جوش صاحب نے تعجب سے دریافت کیا کہ یہ کیوں کر معلوم کرتے ہو کہ کس کا کیا کمیشن ہوا؟ یہ تو بڑا حسابی طول عمل ہے۔

میں نے انہیں سمجھایا کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ بہت سیدھا سادہ حساب ہے۔ سو کا ۲۵ چوتھائی ہے۔ اب جتنا بل ہوا، اس کا چوتھائی کمیشن وضع کر دیا۔ ایک رسالے کی قیمت اگر آٹھ آنے ہو تو آٹھ پیسے کمیشن ہوا۔ اگر آٹھ روپے کا بل ہو تو دو روپے کمیشن ہوا۔

جوش صاحب سخت حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے گویا میں لوہے کے چنے چبا کر ان کے سامنے اس آسانی سے پانی میں گھول کر پیش کر رہا تھا کہ ان کے لئے صرف گلاس اٹھا کر اسے شربت کی طرح پی لینے کے سوا کوئی کام نہ رہا تھا۔

جوش صاحب کی آنکھ میں مروت کا زبردست مادہ ہے۔ وہ کسی ملنے والے سے ایسی بات کہہ سکتے ہی نہیں، جس سے اس کے اعراض کرنے یا نظر پھیرنے کا ذرا سا پہلو نکلتا ہو۔ مثال کے طور پر "کلیم" کی پالیسی، نظم کی ہمت افزائی اور غزل سے سرد مہری تھی۔ جگر صاحب سے قریبی اور دلی تعلق کی بنا پر میں نے "شعلۂ طور" پر ایک مضمون لکھا، اور اسے دیگر مضامین کے ساتھ جوش صاحب کے پاس بھیج دیا۔ جوش صاحب پھر مروت کی وجہ سے انکار نہ کر سکے۔ اور اس مضمون کو "کلیم" کے لئے منظور کر کے بھیج دیا۔

اپریل سنہ ۳۰ء میں وہ مضمون شائع ہوگیا۔

اس کے شائع ہوتے ہی جوش صاحب پر اعتراضات کی بوچھار شروع ہوگئی لیکن جوش صاحب نے کبھی مجھ سے یہ

نہ کہا کہ یہ مناسب نہ تھا۔

یا ایک دوسرے موقع پر جب جوشؔ صاحب اپنی سکونت دریا گنج منتقل کر رہے تھے، تو انہوں نے طے کیا کہ "کلیم" کو بھی وہ اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اور اسے وہ ہمیشہ براہِ راست اپنی نگرانی میں شائع کریں گے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ یہ بات وہ مجھ سے کیوں کر کہیں۔ اور کہیں تو پھر کس منہ سے میرا سامنا کریں گے۔ غرض بہت سوچ بچار کے بعد ایک بہت بڑا وفد ترتیب دیا گیا جس میں تمام اعزا اور احباب شامل تھے۔

یہ وفد جس کی سرکردگی جوشؔ صاحب کر رہے تھے ایک دن میرے یہاں آیا۔ میں نے سب لوگوں کو بٹھایا۔ مدارات وغیرہ کی۔ اور اسی انتظار میں رہا کہ اس وفد کے ورود کا سبب معلوم ہو، لیکن جوشؔ صاحب کی زبان سے مقصد کا ایک لفظ نہ نکل سکا۔ صرف "کلیم" کی مالی حالت دریافت کی۔ اور جب میں نے انہیں مختلف حالات بتا دیئے تو پھر ادھر ادھر کی ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد اٹھ کر رخصت ہو گئے۔

ضلع فرخ آباد میں جو میرا وطن ہے قائم گنج پٹھانوں کی مشہور بستی ہے۔ وہاں ایک خاں صاحب تھے بڑے شیر دل، بڑے بہادر، لاٹھی چلانے میں ماہر، جان دینا اور جان لینا ان کا ایک کھیل تھا۔ دور دور ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی لیکن وہ اپنی بیوی سے بہت ڈرتے تھے۔

ایک دن کسی صاحب نے ان سے دریافت کیا۔ خاں صاحب! آپ یوں تو اتنے بہادر مشہور ہیں لیکن بیوی سے اتنا ڈرتے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

فرمانے لگے: "بھائی! مرد کی ساری عزت عورت کے ہاتھ میں ہے۔ اگر چاہے تو ابھی مرد کی کرکری کر دے۔ وہ کسی کے سامنے آنکھ اٹھانے کے قابل بھی نہ رہے۔ تو یہ وجہ ہے بیوی سے دبنے کی۔"

اس قصے سے یہ بتانا مقصود تھا کہ پٹھان عام طور پر بیویوں سے ڈرا اور دبا کرتے ہیں۔ جوشؔ صاحب بھی ملیح آباد کے کھرے پٹھان ہیں، اور ان کے کلام کا تمام جوش اسی پٹھانپن کا مرہونِ منت ہے۔ وہ بھی اپنی بیوی سے بہت ڈرا اور دبا کرتے ہیں۔

جوشؔ صاحب اپنی خیالی دنیا میں کچھ ایسے کھوئے ہوئے ہیں اور رہتے ہیں کہ وہ دنیا داری کے مصرف کے آدمی ہی نہیں رہے۔ یہ بھی بیوی کے "ڈنڈے کا زور" تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کمانے کی بیک چپیٹ پر مجبور ہیں ——— بیوی ان کی شراب نوشی سے رنجور رہیں، اور شاہ خرچی پر کڑی نگرانی رکھتی ہیں۔ انہیں شک تھی کہ وہ جاڑے کی راتوں میں اٹھ کر جوشؔ صاحب کے تلوے چھو کر دیکھا کرتیں۔ اگر وہ ٹھنڈے ہوتے تو یہ نتیجہ نکالتیں کہ ضرور وہ اٹھ کر کہیں گئے ہیں۔ اگر گرم ہوتے تو اطمینان سے لیٹ جاتیں۔

ایک مرتبہ میں ان کے یہاں پہنچا۔ دیکھا تو گھر میں تنہا جوشؔ صاحب بیٹھے ہیں۔ بیوی کہیں عزیزوں میں ملنے گئی ہیں۔ جوشؔ صاحب کی صورت یہ تھی کہ صرف کرتہ، پاجامہ، اور چپل میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی تمام شیروانیاں، ٹوپی، بوٹ، کنگھا، برش، نقدی وغیرہ، غرض کہ تمام ایسی چیزیں جو کسی مرد کے گھر سے باہر جانے کے لئے ضروری ہوں، سب قفل کنجی میں بند کر گئی تھیں، تاکہ جوشؔ صاحب کسی طرف نکل نہ جائیں، بلکہ پابند گھر میں بیٹھے رہیں۔

شراب نوشی پر بھی ان کی پابندی عائد رہتی تھی۔ سب شراب اپنے قبضے میں الماری میں بند رکھتیں...... اور

غروب آفتاب کے بعد خود اندر سے تین یا چار پیگ یکے بعد دیگرے باہر بھیج دیتیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جوش صاحب کو سیری نہیں ہوئی۔ انہوں نے حساب گڑبڑ کرکے اور پیگ منگایا۔

اندر سے صاف جواب آیا کہ آپ کی مقررہ تعداد پوری ہو گئی۔

اس وقت جوش صاحب کی برہمی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ وہ سقراط، بقراط اور افلاطون سے ان کے دادی، نانی، وغیرہ کے تمام رشتے نکالنے لگتے۔ لیکن یہ سب کچھ احباب سے مخاطب ہو کر کہتے۔ کبھی براہ راست اُن سے مخاطب ہو کے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔

جب کبھی جوش صاحب کے پاس کوئی چیک آجاتا، اور ایسے مواقع آتے ہی رہتے تو جوش صاحب وہ چیک بھنانے جاتے۔ گھر آتے ہوئے، بہت سی شراب کی بوتلیں خریدتے۔ اور راستے میں جتنے قابل اعتبار احباب کے گھر پڑتے سب کے یہاں ایک ایک بوتل چھوڑتے ہوئے گزرتے کہ وقت پڑنے پر کام آئے گی۔ گھر جانے سے پہلے میرے پاس آتے اور فرمائش ہوتی کہ جتنے روپے کم ہیں ان کا جھوٹا حساب بنا دو۔ پھر وہ حساب اور باقی روپے لے جا کر بیوی کو دے دیتے۔

جوش صاحب شراب نوشی کے ضابطے کی پابندی میں بالکل منفرد ہیں۔ کوئی دوسرا شخص میری نظر میں اس قدر ضابطے کا پابند شرابی نہیں گذرا ہے۔

جوش صاحب اول تو کبھی دن میں شراب نہیں پیتے، وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے کہ "جب آفتاب غروب ہو جاتا ہے، تو میں آفتاب بجام طلوع ہوتا ہوں"۔

چنانچہ ایک موقع پر میں نے دیکھا کہ جگر مراد آبادی، حکیم آزاد انصاری، اختر شیرانی، مجاز وغیرہ شراب پی رہے تھے جوش اپنے ہاتھ سے انڈیل انڈیل کر انہیں پلا رہے تھے۔ لیکن کیا مجال کہ ایک قطرہ بھی چکھا ہو۔ اِدھر چراغ روشن ہوئے اور اُدھر ان کی سب سے بیتی بڑھی حتیٰ کہ وہ بھی شریک ہو گئے۔

جوش صاحب کا ضابطے کے معاملے میں یہ حال تھا کہ وہ ہمیشہ مردانے کمرے میں بیٹھ کر شغل کرتے تھے۔ شراب میں سوڈا اور برف ضرور ڈلتے۔ ایک پیگ اندر سے آیا اس میں سوڈا اور برف ملایا۔ ایک آدھ نمکی منگائی اور گلاس سامنے میز پر رکھ دیا۔ دوست احباب جمع ہوتے۔ ان سے باتیں شروع ہوتیں۔ جوش صاحب کی یہ صحبت بہت پر لطف ہوتی۔ ایک ایک گھونٹ پیتے جاتے، اور دلچسپ لطائف بیان کرتے جاتے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اشعار سُناتے۔ اپنے کم اور متقدمین فارسی اساتذہ کے زیادہ۔ بہت ہی لطیف مباحث رہتے۔

عموماً دو تین گھنٹے کے بعد یہ صحبت ختم ہو جاتی، اور جوش صاحب کھانے کے لئے اندر تشریف لے جاتے۔ کھانے میں عموماً وہ روٹی کم اور روکھا بُھنا گوشت زیادہ کھاتے تھے لیکن خوراک بہت زیادہ نہ ہوتی۔ کھانے کے بعد وہ باہر آتے اور کچھ دیر چہل قدمی کرتے۔ پھر جا کر لیٹ جاتے۔ صبح اٹھتے تو روز نہاتے اور نہانے کے بعد ایک گلاس لیموں کا شربت پیتے۔ پھر اپنے معمولات میں مصروف ہو جاتے۔

برائی کی اصلاح کے مختلف طریقے ہیں۔ ایک تو بے قرار کا، اور دوسرے حل کر اُسے دور کرنے کا۔ میں عموماً آخر الذکر طریقے پر عامل ہوں۔ اسی بنا پر میں شراب پینے والوں کا بائیکاٹ نہیں کرتا، بلکہ ان سے گھل مل رہتا ہوں کہ ممکن ہے اس پر اصلاح کی کوئی صورت نکل آئے۔

(باقی صفحہ ۲۳۰ پر)

شاہد احمد دہلوی

جوش ملیح آبادی دید و شنید

میرے والد مرحوم کو اردو کی نئی مطبوعات منگانے کا شوق تھا۔ کتابیں اور رسالے چھپتے ہی ان کے پاس پہونچ جایا کرتے تھے
غالباً سنہ ۲۵ء یا سنہ ۲۶ء کا ذکر ہے کہ نئی کتابوں میں ایک کتاب "روحِ ادب" بھی آئی تھی۔ یہ کتاب اس زمانے میں شائع
ہونے والی کتابوں سے یکسر مختلف تھی۔ اس کی ہر بات انوکھی تھی۔ "بانگِ درا" کے سائز پر چھپی تھی، جو اس زمانے میں بالکل
مروج نہیں تھا۔ کتابت و طباعت بڑی دیدہ زیب تھی۔ چند تصویریں بھی اس کتاب میں شامل تھیں۔ "روحِ ادب" میں چھوٹے
چھوٹے شاعرانہ مضامین تھے۔ شاعرانہ مختصر مضامین لکھنے کا خبط اب سے چالیس سال پہلے ہر ادیب کو تھا۔ بلکہ اسے کمالِ
نثر نگاری سمجھا جاتا تھا کہ ایسی عبارت لکھی جائے جس میں موٹے موٹے عربی فارسی کے الفاظ اور مغلق ترکیبیں ہوں اور اصل
بات بہت ذرا سی ہو۔ بلکہ اگر اصل بات سرے سے اس میں ہو ہی نہیں تو اور بھی اچھا۔ اس صورت میں یہ تحریر ادب کا شاہکار بن
جاتی تھی۔ ایسے ہر ادیب کی ہر تحریر شاہکار تصور کی جاتی تھی۔ کتنے ہی ادیب ایسے تھے جو صرف شاہکار ہی لکھا کرتے تھے۔ اصل
میں یہ ہماری گیتانجلی کے ترجمے سے اردو میں پھیلی تھی۔ ٹیگور کی مابعدالطبیعاتی شاعری کو یار لوگ سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں،
جھٹ اس کے ترجمے پر اتر آئے۔ چونکہ ٹیگور کو نوبل پرائز ملا تھا، اس لئے یہ سمجھ لیا گیا کہ ضرور اس میں کوئی بڑے کام کی بات
کہی گئی ہے۔ الا یہ کہ آج تک یورپ والوں ہی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ملارمے اور ماترلنک قسم کے شاعر یہ کیا فرما گئے ہیں کہ:

ایک دروازہ کھلا
ایک دروازہ بند ہوا اور
ایک بچے کے رونے کی آواز آئی

انہیں یہی معلوم نہ ہو سکا کہ اس پر کہاں شعر ختم ہو جاتا ہے؟ ٹیگور نے بھی یہی گُر استعمال کیا، اور ایشیا نے اسے جھنڈے پر چڑھا لیا۔
اردو کی شامتِ اعمال، یہ کتاب کہیں سے نیاز فتحپوری کے ہاتھ لگ گئی۔ "عرضِ نغمہ" کے نام سے اس کا ترجمہ فوراً تیار ہو گیا
نام ہی دیکھ لیجئے "عرضِ نغمہ"۔ اس کے اندر جو گت ٹیگور کی شاعری کی بنی ہے اسے کسی وقت فرصت سے دیکھئے گا۔ تو
اس کا جوہر آپ پر کھل جائے گا۔ ہمارے ادیبوں کے ہاتھ ایک سہل نسخہ لکھنے لکھانے کا آیا تھا سب کے سب عرضِ نغمہ
کرنے لگے۔ البتہ اتنا اضافہ ٹیگور پر اور کیا کہ ایشیائی ریمیوں میں بہت سارے آہ — ڈیش اور نقطے اور ڈنڈے (!) جابجا

ڈال دیئے۔ تاکہ پڑھنے والے ان ڈلیوں اور ڈنڈلوں سے نفس مضمون کی پہیلی پر سر پھٹول کرتے رہیں۔ پیاز کو چھیلے، بہت ہی پرت اُترتے چلے جائیں گے۔ مغز آپ کہیں نہیں پائیں گے۔ یہی حال اس نیازی یا پیازی ادب کا تھا، جسے "اسلوبِ لطیف" سے موسوم کیا گیا۔ جو دراصل ہماری نثر کا "چوہا جاتی" اور "سانڈے کے تیل" کا دور تھا۔

بات میں سے بات نکل آئی ہے۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہونچی تری جوانی تک

ہاں تو ذکر تھا "روحِ ادب" کا۔ اس میں جو نثر پارے درج تھے ان کا اندازِ تحریر روشِ عام سے یکسر مختلف تھا۔ واقعی یہ معلوم ہوتا تھا کہ نثر میں نظمیں لکھی گئی ہیں۔ مصنف کا نام تھا۔۔۔ نواب شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی۔ ہم لوگ جوش صاحب کو یہیں سے جاننا پہچاننا تھا۔ اس کے بعد "ہمایوں" میں اُن کا کلام بالالتزام شائع ہونے لگا، اور بعض اور متعدد ادبی رسالوں میں بھی۔ "ساقی" میں جنوری سنہ ۱۹۳۰ء یعنی پہلے ہی پرچے سے جوش صاحب کا کلام آنے لگا۔ سنہ ۳۲ء میں مجھے اپنے منجھلے بھائی بشیر احمد اور دوسرے عزیزوں سے ملنے حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے جن ادیبوں اور شاعروں سے حیدرآباد میں ملنا تھا، اُن کی فہرست خاصی طویل تھی۔ منجھلے صاحب پولیس کے آدمی! انہیں تمام سلسلوں کی خبر تھی۔ فہرست دیکھ کر بولے:

"فرحت اللہ بیگ سے تمہیں سید وزیر حسن ملوائیں گے۔ فانی، جوش اور علی اختر سے کرنل اشرف الحق۔ مولوی عنایت اللہ سے تم بھی، میں بھی ساتھ چلا چلوں گا۔ تمکین کاظمی تو یہ سامنے ادارہ علمیہ میں روز شام کو آتا ہے اور یہ نا کارہ اور آوارہ اور کون کون ہے، انہیں تھانے میں یہیں کیوں نہ بلا لیا جائے؟"

میں نے کہا "مناسب نہیں ہوگا۔ پہلے ایک ایک بار میں سب کے ہاں ہو آؤں۔"
بولے "تو پھر یہ کرتے ہیں کہ تھانے میں نہیں، کھانے پر سب کو بلائے لیتے ہیں۔"
میں نے کہا "اسے بھی بعد کے لئے اٹھا رکھو۔"
یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کرنل اشرف الحق باہر ہی سے آواز دیتے در آئے۔
"شاہد کہاں ہے، شاہد کہاں ہے!"

میں دوڑ کر ان سے لپٹ گیا۔ اُس وقت مجھ سے عمر میں دُگنے تھے۔ میرے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ چودہ سال ولایت میں رہ کر ایڈنبرا سے ڈاکٹری کی سندیں لے کر آئے تھے۔ اور قلعہ گولکنڈہ میں افواجِ باقاعدہ کے بڑے ڈاکٹر تھے۔ الکوحل کی روح کو زندہ رکھنے کے لئے، ہر وقت پیتے تھے۔ اور اتنی پیتے تھے کہ مرنے لگتے تھے۔ وہ تو شراب کیا چھوڑتے، شراب انہیں چھوڑ دیتی تھی۔ اچھا ہونے کے بعد مہینوں نہیں پیتے تھے، پھر کوئی دوست انہیں بہکا دیتا اور سلسلہ پھر جاری ہو جاتا۔ مگر اتنی پینے پر بھی میں نے ڈاکٹر صاحب کو کبھی بہکتے یا بدہوش ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ اس قدر عجیب و غریب کردار کے آدمی تھے کہ ان پر ایک علیحدہ مضمون لکھنے کی ضرورت ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ منجملہ اور صفات کے شعر کہنے کا بھی خاص ملکہ رکھتے تھے۔ مگر شعر تو کیا نرا کفر کا نقش۔ عریاں تخلص تھا۔ شعر و شاعری کی وجہ سے حیدرآباد کے تمام شاعروں سے تعلق تھا۔ اور سب کا دم بھی ان سے نکلتا تھا۔ کیونکہ خدا اسی بات پر غش ہو لکھ دیا کرتے تھے۔ اور ستم یہ کہ خود جا کر اُسے سنا بھی دیتے

تھے۔ خیر تو ڈاکٹر صاحب سے یہ طے ہوگیا کہ جوش صاحب سے مجھے وہ اگلے دن ملوا دیں گے۔

دوسرے دن صبح دس بجے ڈاکٹر صاحب آئے، اور مجھے دارالترجمے لے گئے۔ سب سے پہلے ابوالخیر مودودی سے ملوایا۔ جو ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی ہیں۔ وہاں ہاں سے نرم و نازک آدمی تھے۔ مگر ان کے الفاظ لفظ لفظ سے علمیت ٹپکتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ خوش اخلاقی سے کھانے پر مدعو کیا۔

مولانا عمادی سے ملوایا۔ انہوں نے بھی دعوت کی پیش کش کی۔

جوش صاحب سے ملوایا۔ گرم جوشی سے ملے۔ دعوت کا دن مقرر کر لیا۔

باہر نکل کر میں نے کہا: "بھائی جان! اگر دعوتیں ایسی فراخ دلی سے منظور کی گئیں، تو مینجو صاحب بگڑ جائیں گے۔"

بولے: "میں مینجو کو سمجھا لوں گا۔" اس کے بعد گھڑی دیکھ کر بولے "ابھی دوپہر کے کھانے میں کچھ دیر ہے۔ لگے ہاتھوں علی اختر سے بھی مل لو۔"

میں نے کہا "چلئے!"

علی اختر کے گھر پہونچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ لڑکا برآمد ہوا۔

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "ابا ہیں؟"

وہ "ہیں" کہہ کر اندر بھاگا۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا "سنو! اُن سے بولو شاہد احمد دہلوی ملنے آئے ہیں"

لڑکا میرا نام جانتا تھا۔ ایک نظر اُس نے مجھے دیکھا اور تیر ہوگیا۔ پانچ منٹ گزر گئے، واپس نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ آج کل علی اختر کے سارے جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکل آئی ہیں، دوا لے بیٹھا ہوگا۔ دفتر سے چھٹی لے رکھی ہے۔ بارے لڑکا منہ لٹکائے واپس آیا، اور نیچی نظریں کئے بولا۔

"ابا کہیں باہر گئے ہوئے ہیں"

جب ہم کار میں واپس آ بیٹھے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا "گھر ہی میں تھا"

میں نے پوچھا: "تو ملے کیوں نہیں؟"

بولے "کل معلوم ہو جائے گا"

اگلے دن ڈاکٹر صاحب علی اختر کے ہاں سے ہوتے ہوئے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ "علی اختر ملے تھے اور بہت شرمندہ تھے کہ کل تم سے نہیں ملے۔ دراصل اس بیچارے کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ تمہاری دعوت کر سکے۔ یہاں کا رواج یہی ہے کہ مہمان کی دعوت ضرور کی جاتی ہے"

اُن کی اس حرکت پر مجھے غصہ بھی آیا اور ترس بھی آیا کہ محض ایک بیہودہ رواج کے باعث اس دفعہ اُن سے ملاقات نہ ہو سکی۔

جوش صاحب کے ہاں ڈاکٹر صاحب مجھے لے گئے۔ خاصی پرتکلف دعوت تھی۔ دسترخوان پر ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ دونوں کو سناتے تھے۔ جوش صاحب شاعر بھی تھے اور بادہ خوار بھی۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب سے ان کی خوب چھنتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی زبانی مجھے جوش صاحب کے بہت سارے واقعات معلوم ہوئے۔ ان میں سے چند

آگے بیان ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب عمدہ ولایتی شراب پیا کرتے تھے، جوش صاحب بلا نوش تھے، جو بھی مل جائے چڑھا جاتے تھے۔ انہیں جب بھی فرصت ملتی شام کو ڈاکٹر صاحب کے ہاں جا پہنچتے۔ عمدہ اور معتدل کی لت تھی، اس لئے گلاس پر گلاس چڑھائے چلے جاتے ڈاکٹر صاحب دو تین گلاسوں میں جھک جاتے تھے۔ بوتل یا تو ہفتے میں ایک خرچ ہوتی تھی، یا اب تیسرے ہی دن ان کی بیوی کہہ دیتیں کہ آپ شہر جائیں تو اچھی بوتل لیتے آئیں۔

شروع شروع میں تو یہ ذرا اچھا رہا۔ مگر جب مہنگا پڑنے لگا تو ڈاکٹر صاحب کے نشے ہرن ہو گئے۔ ایک دن شہر گئے تو ایک ولایتی بوتل بھی لائے، اور دیسی کثرت سے کی بھی۔

گھٹرا دیکھ کر ان کی بیوی چلکیں "جب گھڑا آپ تو نہیں پیتا تو آپ کیوں لائے ہیں؟ اس موئے شرابی نے آپ کو بھی گھڑے پر لگا دیا۔"

ڈاکٹر صاحب نے بڑی متانت سے کہا "یہ گھڑا اسی موئے شرابی کے لئے ہے۔"

ڈاکٹر صاحب گلاس خود کبھی نہیں بناتے تھے۔ گھر میں بیوی بنا کر دیتی تھیں، اور گھر کے باہر ایک ملازم جو ہمیشہ ساتھ رہا کرتا تھا۔ اب یہ ہونے لگا کہ جب جوش صاحب آجاتے تو ڈاکٹر صاحب کے آواز لگانے پر ملازم دو گلاس بیگم صاحب سے بنوا کر یا خود بنا کر لاتا، اور بھرے والا گلاس جوش صاحب کو پکڑا دیتا۔

جوش صاحب کہتے کہ "آپ نے بھی دیسی پینی شروع کر دی!"

تو ڈاکٹر صاحب کہتے "ہاں۔ مگر یہ دیسی اچھی ہے۔"

فریب کا یہ سلسلہ دنوں جاری رہا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اُن کے دل میں کوئی بات رہتی نہیں تھی۔ شاید ہر شرابی کا دل منافقت سے خالی ہو جایا کرتا ہے۔

جب جوش صاحب کے لئے نظام دکن میر عثمان علی خاں نے ملک بدری کا فرمان جاری کیا تو مجھے کسی نے حیدرآباد سے اطلاع دی کہ "ساقی" میں "غزل گو سے خطاب" جو نظم جوش کی چھپی ہے اس پر یہ عتاب ہوا ہے۔ چپقی کے ایک منہ چڑھے آدمی نے نظام کو سنا دیا کہ "حضور! یہ گستاخی جوش نے آپ کی شان میں کی ہے۔"

اس زمانے میں جریدۂ شاہی اور روزنامہ "رہبر دکن" میں روزانہ میر عثمان علی خاں کی ایک پھسپھسی سی غزل مع رائے استاد جلیل چھپا کرتی تھی۔ یہ رائے بھی حضرت خود ہی لکھ دیا کرتے تھے کہ "سبحان اللہ! کیا غزل ہوئی ہے"

مجھے اطلاع دینے والے نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ شاید ریاست میں "ساقی" کا داخلہ بھی ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔

جوش کو چوبیس گھنٹے میں ممالک محروسہ سے نکل جانے کا حکم ملا تھا۔ یہ بارہ ہی گھنٹے میں وہاں سے نکل لئے کہ کہیں منسوخی اور تنبیہ کا دوسرا فرمان جاری نہ ہو جائے۔ "رہبر دکن" میں روزانہ ذرا ذرا سی بات پر فرمان نکلتے رہتے تھے۔ سبحان اللہ! پڑھنے کے لائق ہوتی تھی عبارت ان فرمانوں کی۔ کاش، کوئی انہیں جمع کر کے شائع کر دے۔ خدمی اور حاجی بغلول کو آپ بھول جائیں گے۔

نیز یہ ایک الگ کہانی ہے۔ دراصل نظام کے منجھلے شہزادے معظم جاہ کے شبینہ دربار میں جوش کا عمل دخل ضرورت سے

زیادہ ہو گیا تھا۔ اس دربار کے واقعات سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ شرر کا دربار حرام پور اس کے آگے گرد تھا۔ جوش اس دربار کے حاضر باش تھے۔ میں نے حیدر آباد کے ثقہ راویوں سے سنا ہے کہ معظم جاہ کے اشارے پر کل حاضر باش ننگے ہو کر ناچنے لگتے تھے۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا تھا وہ لکھا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی نیا پکھیرو ذرا نہیں نکوڑ کرتا تو پیش خدمتوں کو حکم ہوتا کہ آپ کو بنا لاؤ۔

وہ اس غریب کو اٹھا لے جاتے، اور پچھاڑ کر اتنی پلاتے کہ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ پھر اسے دربار میں برہنہ کر کے پیش کیا جاتا۔ اور اسے اوندھا کر کے جلتی ہوئی موم بتی لگا دی جاتی۔

یہ منظر دیکھ کر سب کے دلوں کے کنول کھل جاتے۔ اور جب وہ ہوش میں آتا تو اس سے کہا جاتا "آئندہ کبھی سرکار کے حکم سے سرتابی نہ کرنا"۔

ان تمام بیہودگیوں کی اطلاع عالی جاہ کو پہونچتی رہتی تھی۔ مگر وہ شفقتِ پدری میں مرے جاتے تھے۔ بیٹے سے تو کچھ نہ کہتے۔ اس کے حاضر باشوں کی تاک میں لگ جاتے۔ چنانچہ طویلے کی بلا بندر کے سر۔ جوش صاحب پر نزلہ گرانے کا انہیں بہانہ ہاتھ آ گیا۔

جوش صاحب حیدر آباد چھوڑنے کے کچھ عرصے بعد دلی آ گئے۔

حیدر آباد میں جوش صاحب دار الترجمہ میں ناظرِ ادبی تھے۔ سنا ہے کہ علامہ اقبال سے کسی بڑے آدمی کے علم تعارفی اور سفارشی خط لے کر حیدر آباد گئے تھے۔ نرا کھرا شاعر سوائے شعر کہنے کے اور کیا کر سکتا ہے؟ مگر اس وقت مہاراجہ کشن پرشاد جیسے علم دوست برسرِ اقتدار تھے۔ وہ شاعروں کو بھی کہیں نہ کہیں کھپا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ فانی کو انہوں نے اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا تھا۔ اور یگانہ کو کہیں اضلاع میں سب رجسٹرار رکھوا دیا تھا۔ جوش کو انہوں نے دار الترجمہ کی پول میں دوا لیں دیا۔

ان کا کام یہ تھا کہ تراجم کی نظرِ ثانی کیا کریں۔ وہاں وہ کیا کرتے ہوں گے؟ اس کا اندازہ یہاں ترقی اردو بورڈ میں ان کی کارکردگی سے ہوا۔

بورڈ نے اردو کی نایاب اور کمیاب کتابوں کے شائع کرنے کا بھی انتظام کیا ہے۔ مولوی نذیر احمد کی کتاب "منتخب الحکایات" کے متعلق بورڈ کے سکریٹری شان الحق صاحب کا ایک مراسلہ میرے نام آیا کہ آپ اس مطبوعہ کتاب میں جو غلطیاں کتابت و طباعت کی وجہ سے داخل ہو گئی ہیں، ان کی تصحیح کر دیجئے، اور کتاب پر آٹھ دس صفحے کا مقدمہ لکھ دیجئے۔ پاکستان میں یہ کتاب مجھے کہیں نہیں ملی۔ لہٰذا دلی سے اس کا ایک نسخہ کسی نہ کسی طرح منگوایا، اور اسے ٹھیک ٹھاک کر کے بورڈ کو بھیج دیا۔

ایک مہینے بعد حقی صاحب کا ٹیلی فون آیا کہ "منتخب الحکایات کا کوئی اور نسخہ ہو تو بورڈ کو بھیج دیجئے۔ بورڈ اس کی قیمت ادا کرے گا"۔

میں نے کہا "قیمت تو اس کی چھ آنے یا آٹھ آنے ہی ہے۔ مگر وہ کتاب ملتی کہاں ہے؟ پہلے بھی بڑی مشکل سے ملی تھی ـــــ"

معلوم ہوا کہ ناظرِ ادبی نے نہ صرف میرے مقدمے کی زبان ٹھیک کر دی، بلکہ اصل کتاب کی زبان بھی ٹھیک کر دی اور فقرے

کے فقرے اس بری طرح کاٹے ہیں کہ اصل عبارت پڑھی نہیں جا سکتی۔

میں نے کہا۔ خیر میری زبان تو وہ ٹھیک کر سکتے ہیں۔ مگر جس کی کتابیں پڑھ کر ہم سب نے اردو زبان سیکھی ہے، اُس کی زبان میں بھی جوش صاحب کو غلطیاں نظر آگئیں۔ ذرا مجھے اصلاح شدہ نسخہ بھیج دیجئے، تاکہ میں بھی جوش صاحب کے افادات سے محروم نہ رہوں۔

حقی صاحب بُردبار آدمی ہیں۔ انہوں نے یہ لطائف الحیل اس قضیہ کو ٹالا۔ ادھر میں نے دلی سے ایک اور نسخہ مہیا کر کے انہیں بھیجا۔

دارالترجمہ کے ناظم مولوی عنایت اللہ مرحوم بڑے مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ اُن کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ جوش صاحب سے خوش نہیں تھے۔ جب کام کرنے کا یہ اسلوب ہو تو کوئی خوش ہو بھی کیسے سکتا ہے؟

دلی آنے کے بعد جوش صاحب نے ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ جو ادبی ماہنامے شائع ہو رہے ہیں، ان کی مالی حالت کیسی ہے۔ اور انہیں کیسے چلایا جا رہا ہے۔ یار لوگوں نے ورغلایا۔ جوش صاحب چڑھ گئے سُولی پر۔ دریا گنج میں ایک مکان کرائے پر لیا گیا۔ اور ڈپوں کے کٹڑے میں دفتر کے لئے ایک بالاخانہ کر کے فرش سے سجایا گیا۔
ایک دفعہ مجھے بھی اس دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جوش صاحب کو واہ واہ کرنے والے گھیرے رہتے۔ دن بھر چائے، شربت، پان، سگریٹ سے تواضع ہوتی۔ ادھر سورج ڈوب ہوا، اُدھر جوش صاحب پیمانہ بکف طلوع ہوئے۔ مفت خوروں کو بھی چسکی لگانے کا موقع ملا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ یہی شغل رہا۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھر سدھارے۔

ادبی رسالے بھلا کہیں ایسی شاہ خرچیوں سے چلتے ہیں؟

چند مہینے بعد دفتر چھوڑنا پڑا۔ گھر ہی پر دفتر بھی چلا گیا۔ پرچہ چلنے کی کوئی صورت نہیں نکلی۔
جوش صاحب کو یہ مغالطہ تھا کہ جتنی اچھی وہ نظم لکھتے ہیں، اتنی ہی اچھی نثر بھی لکھتے ہیں۔ ایک سینما مضمون نگار اسرائیل احمد خاں انہوں نے خدا جانے کہاں سے تلاش کر کے نکالا تھا۔ وہ اینڈے بینڈے مضامین لکھا کرتا تھا۔

یہ زمانہ تھا ہمایوں، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، عالمگیر، اور ساقی کے شباب کا۔ جوش صاحب نے محسوس کر لیا کہ پبلک بڑی ناقدر شناس ہے۔ وہ نسل کبھی مستقبل بعید میں پیدا ہوگی جو ان کے رسالے کی صحیح قدر دانی کر سکے گی۔
رسالہ بند کرنے کے بعد انہوں نے ایک مقامی پبلشر سے اپنی کتابیں چھپوانے کا معاملہ کیا۔ چند سال ان کی رائلٹی پر گزارہ ہوا۔

پھر یہ سنا کہ ملیح آباد کی طرف اُن کا کوئی بہت بڑا زمیندار عزیز مر رہا ہے یا مر گیا ہے اور اس کی پوری املاک کے وارث جوش صاحب ہی ہیں، اب انہیں کئی کروڑ روپیہ ملنے والا ہے۔ اس لئے وہ دلی سے چلے گئے ہیں۔ یہ سُننے میں آج تک نہیں آیا کہ انہیں وہاں سے کیا ملا؟

جوش صاحب کے دورانِ قیام دہلی ہی میں کرنل اشرف الحق دلی آئے، تو مجھ سے کہا کہ
"جوش کے ہاں چلو۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو ان کا گھر معلوم نہیں کہ کہاں ہے۔ کہیں دریا گنج میں رہتے ہیں۔ پھر آپ ہی نے تو کہا تھا کہ جوش سے دُور کی دوستی رکھنا۔ ویسے بھی میں شعر و شاعری کا آدمی نہیں، اور نہ جوش کا ہم مشرب۔ آج تک میں اُن کے گھر نہیں

گیا۔ اور نہ وہ میرے گھر آئے۔ سر راہے گاہے یا کسی اجتماع میں اُن سے سرسری سی ملاقات ہو جایا کرتی ہے۔ آپ اُن کے ہاں جو آ رہے ہیں ساتھ جا کر کیا کروں گا؟"

ڈاکٹر صاحب نے اس زمانے میں شراب بالکل چھوڑ رکھی تھی۔ بولے "تمہارا چلنا ضروری ہے۔ اگر وہاں پہنچ پلانے کا قصد ہوا تو تم مجھے روک سکو گے۔"

لہٰذا مجھے ان کے ساتھ جانا پڑا۔

مغرب کے بعد ہم جوش صاحب کے مکان پر پہونچے۔ نیچے ایک بڑا سا کمرہ [illegible] جوش صاحب کے ساتھ پانچ سات آدمی بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھا تو سب نے اٹھ کر تعظیم دی

ڈاکٹر صاحب نے کہا "شاہد کو تو جانتے ہونا؟"

جوش صاحب نے کہا "جی ہاں۔ مگر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

بیٹھے کے بعد اوروں سے تعارف ہوا۔

حکیم آزاد انصاری کو میں پہلے سے جانتا تھا۔ اب وہ جوش صاحب کے ہاں مستقلاً آن پڑے تھے۔ بڑھاپے اور بیماری میں اُن کا کوئی پرسانِ حال نہیں رہا تھا۔ کبھی کسی کے ہاں اور کبھی کسی کے ہاں جا پڑتے۔ میزبان ان کے بستر کی وجہ سے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ اس کے بعد ان سے شعر کہلوا کہلوا کر اپنی بیاض بھرتا۔ جب وہ اپنے شعر دینے میں پس و پیش کرتے تو میزبان بگڑنے لگتا۔ حکیم صاحب اس بے غوری اور نا قدری کو تاڑ جاتے، اور کسی اور شاگرد یا قدردان کے ہاں اٹھ بیٹھتے۔ ایک صاحب کا تو پورا دیوان آزاد انصاری ہی کا ہے۔ دلّی میں انہوں نے کئی ٹھکانے بدلے۔ آخر آخر میں ایک مفلس مگر مخلص شاگرد کے ہاں چلے آئے تھے۔ جب اُن کی حالت بگڑی اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو وہ غریب شاگرد حیدرآباد انہیں لے کر پہونچا۔ اور ان کے بیٹے کے گھر انہیں چھوڑ آیا۔ بیٹا اچھا خاصا پیسے والا تھا، مگر بااکراہ اس نے باپ کو وصول کیا۔ بڑھے میں دم ہی کیا تھا۔ دو چار دن بعد اللہ کو پیارا ہو گیا۔

تو یہ آزاد انصاری بھی جوش صاحب کے یہاں موجود تھے۔ نہال سیوہاروی بھی پہونچے ہوئے تھے۔ وہ شراب تو پی ہی رہا تھا۔ ایک گلاس ڈاکٹر صاحب کے لئے اور ایک میرے لئے تیار کر کے پیش کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا: "شاہد تو نہیں پیتے۔ اور میں نے بھی آج کل چھوڑ رکھی ہے۔"

جوش صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اور بے ساختہ اُن کے منہ سے نکلا ؎

ساقی کے مدیا دہنیں ہیں خمور
برعکس نہند نام زنگی کافور!

کیا واقعی بالکل نہیں؟"

میں نے کہا "جی ہاں۔ میں نہیں پیتا۔"

جوش صاحب نے ازراہِ عنایت مزید اصرار نہیں کیا۔ مگر ڈاکٹر صاحب سے بولے "جی یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کو تو پینی پڑے گی۔" یہ کہہ کر ان کے ہاتھ میں لبریز گلاس تھما دیا۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کو ٹہوکا دیا۔ مگر انہوں نے متاسف نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اور چپکے سے بولے "جوش نہیں

مانتا۔ تھوڑی سی پی لینے میں کوئی مضائقہ نہیں :

جوش صاحب کو سرور گٹھ رہا تھا۔ ان کی گل افشانی شروع ہو گئی۔ بلا کا حافظہ پایا ہے اس شخص نے۔ نثر بڑھتا جاتا تھا اور زبان کھلتی جاتی تھی۔ ظریفانہ رباعیوں کے بعد اپنا فحش کلام سنانا شروع کر دیا۔ جب وہ بھی ختم ہو گیا تو فی البدیہہ کہنا شروع کر دیا۔ مگر آخر میں اعتراف بھی کیا کہ۔ اس کا استاد تو رفیع احمد خاں ہے :

دو گھنٹے بعد میں نے اجازت چاہی تو ڈاکٹر صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ بولے " شاہد تم مجھے گھر پہونچا کر جانا :

باہر نکل کر میں نے تراہا بیرم خاں کا تانگہ کیا۔ پھاٹک سے ٹیڑھی حویلی تک انہیں سہارا دے کر لے گیا۔ نیچے کرایہ دار رہتے، اوپر کی منزل میں ڈاکٹر صاحب کا قیام تھا۔ زینہ طے کرنا ایک عذاب ہو گیا۔ جب انہیں ان کے کمرے میں پہونچایا تو اُن کی چھوٹی بیگم جو اُن کے ساتھ آئی تھیں بولیں :

" شاہد میاں یہ کیا کیا؟ "

ڈاکٹر صاحب پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھتے رہے۔

میں نے کہا " بھابی یہ جوش صاحب کے یہاں سے آ رہے ہیں :

چیخ کر بولیں " اس موئے کے پاس انہیں کون لے گیا تھا؟ "

میں نے کہا " خود ہی گئے تھے :

" شاہد میاں تم نے بھی انہیں نہیں روکا؟ "

" روکا تھا۔ بھلا یہ رکنے والے تھے؟ "

ڈاکٹر صاحب بڑبڑائے " عباسی شاہد کو جانے دو، اسے دیر ہو رہی ہے :

اس کے بعد خدا جانے میاں بیوی میں کیا فضیحتا ہوا۔

اگلے دن ڈاکٹر صاحب میرے یہاں آئے تو ان کے بیگ میں ولایتی بوتل موجود تھی۔ اور وہ ہر آدھے گھنٹے بعد گلاس بناتے اور پیتے رہے۔ ان کی شراب پھر شروع ہو گئی تھی۔ اور اب خود ان کے روکے بھی نہیں رک سکتی تھی۔

پھر دو دن تک ڈاکٹر صاحب نہیں آئے تو مجھے مزاج پرسی کے لئے ان کے گھر جانا پڑا۔ پہلے بھابی اور بچوں کا کمرہ بیچ میں پڑتا تھا۔ بھابی کا چہرہ اترا ہوا تھا، بولیں :

" نہ کچھ کھا سکتے ہیں اور نہ پی سکتے ہیں۔ ہچکی لگی ہوئی ہے :

ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں جا کر دیکھا کہ وہ بے سدھ پلنگ پر پڑے ہوئے ہیں۔ اور ڈاکٹر محمد عمران کے سرہانے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے جاتے ہی ڈاکٹر عمر نے میری ٹانگ لی :

" اماں کیوں لے گئے تھے انہیں اُس کے پاس؟ "

میں نے کہا " اب کیفیت کیا ہے؟ "

بولے " مر رہے ہیں :

میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ لو بھئی الٹی آنتیں گلے پڑیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب کو کھانسی اٹھی، اور وہ لو کہتے ہوئے

اٹھ بیٹھے۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے، چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی، سینے میں سانس نہ سماتا تھا۔ مگر خوش مزاجی کی وہی کیفیت۔ ہانپ کر بولے:

"بھائی — یہ عمر کہتا ہے کہ میں مر رہا ہوں۔ مگر میں مروں گا نہیں — عباسی ایک گلاس بنا دینا:"

ڈاکٹر عمر نے کہا "مرنے سے بدتر تو ہو گئے مگر چھوڑتے اب بھی نہیں۔"

بولے "تیری طرح کم ظرف تھوڑی ہوں۔ پینے کا نام بھی بدنام کرتا ہے۔"

اتنے میں عباسی بیگم گلاس بنا لائیں۔ ڈاکٹر صاحب کے منہ سے لگا دیا۔

پی کر بولے "بھائی — اب میری دوا بھی یہی ہے۔"

غرض ڈاکٹر صاحب ایک ہفتے تک زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا رہے۔ بے ہوشی میں ڈاکٹر عمران کے انجکشن لگاتے رہے۔ ہوش میں آنے کے بعد انہوں نے شراب نہیں پی۔ مہینے بھر میں ساٹو نٹے ہو گئے۔ اور خیر سے حیدرآباد سدھارے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پطرس بخاری نے مجھے رقعہ بھیجا، اور زبانی بھی کہلوا بھیجا کہ سالک صاحب آئے ہوئے ہیں، کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔

میں وقت مقررہ سے کسی قدر پہلے پہونچ گیا، تاکہ سالک صاحب سے باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔ ہم دو چار آدمی سالک صاحب سے گپ شپ کر رہے تھے کہ جوش صاحب بھی آن پہونچے۔ علیک سلیک کے بعد کوٹھی کے برآمدے میں گئے۔ وہاں جگل کشور مہرا بیٹھے ہوئے تھے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور پطرس بخاری کے پرسنل اسسٹنٹ تھے۔ جوش صاحب نے اُن سے پوچھا:

"پینے پلانے کے لئے کیا ہے؟"

انہوں نے گھبرا کر کہا: "بخاری صاحب تو نہیں پیتے۔"

جوش صاحب نے کہا: "وہ نہیں پیتے تو کیا ہم تو پیتے ہیں۔ جاؤ بخاری صاحب سے کہو کہ ہمارے لئے کچھ پینے کو بھیجیں!"

وہ دوڑے ہوئے گئے، اور بخاری سے کچھ کھسر پھسر کر کے پھر جوش صاحب کے پاس پہونچے۔ خبر نہیں پھر ان دونوں کے درمیان کیا گذری۔

مہمان آنے شروع ہو گئے۔ آنے والوں میں بڑے متضاد قسم کے لوگ تھے۔ خواجہ حسن نظامی بھی تھے اور دیوان سنگھ مفتوں بھی۔ تقریباً بیس جفادری قسم کے حضرات کھانے پر جمع ہو گئے۔

جوش صاحب الگ گھاس پر ٹہلتے رہے تھے۔ مجھے ان کے قریب جگہ ملی۔ پوچھنے لگے: "اسے کس نے بلایا ہے؟"

میں نے کہا: "کسے؟"

خواجہ صاحب کی طرف اشارہ کیا، بولے "جب سے یہ آیا ہے واللہ کفن اور کافور کی بو چلی آ رہی ہے۔"

اُن کے اس فقرے کا مزہ اوروں نے بھی لیا۔ اور بات شدہ شدہ بخاری صاحب تک بھی پہونچ گئی۔ وہ کھِل کھِلا کر ہنسے۔ اس کے بعد جوش صاحب نے بھری میز پر بخاری صاحب کو مخاطب کر کے کہا: "دو شعر ہو گئے ہیں، سُن لیجئے۔"

مجھے تو شعر وِعر یاد نہیں رہتے۔ مطلب یہ تھا کہ نام تو بخاری ہے مگر چندری اتنی سی ہے کہ پینے کو شراب مانگو تو —

ملتا ہے ٹھنڈا، برف کا سادہ پانی۔

سب نے واہ واہ، سبحان اللہ میں ان اشعار کو اڑا دیا۔

خود بخاری صاحب نے کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہیں کیا، بلکہ خوب داد دی۔

فتح پوری کے قریب ایک ہوٹل میں فراق گورکھپوری دلی آکر ٹھہرے ہوئے تھے۔ شام کو ان کے کمرے میں بہت سارے پینے والے شاعر جمع ہوئے۔ ان میں جوش، جمال، مجاز اور تاثیر بھی تھے۔ جوش صاحب تو شاعرِ انقلاب ہونے کے علاوہ شاعرِ اعظم بھی ہیں مگر اپنے پندار میں فراق بھی ان سے اپنے آپ کو کم نہیں کچھ زیادہ ہی سمجھتے تھے۔ جوش نے جب رباعیاں کہنی شروع کیں تو فراق نے بھی اردو، ہندی آمیز زبان میں روپ سروپ کی رباعیوں کی بھرمار شروع کر دی۔ جوش صاحب نے کبھی کسی سے مقابلہ نہیں کیا۔ خبر نہیں یہ اُن کی بزدلی ہے یا شرافت، مگر فراق صاحب ہمیشہ میدان میں اتر آتے ہیں اور شمشیر براں بن جاتے ہیں۔ ویسے تو جوش اور فراق میں برا دوستانہ تھا، اور دونوں ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ مگر فراق جوش کو اپنا حریف سمجھتے تھے۔ جب ہوٹل کے کمرے میں کئی دور ہو گئے۔ تو پینے والوں کے دل کھل گئے۔ اور دلوں کے ساتھ زبانیں بھی کھل گئیں۔

جوش اور فراق میں چلنی شروع ہوئی۔ پہلے مذاق ہی مذاق میں، پھر نشہ زدہ سنجیدگی کے ساتھ۔

حاضرین میں سے کچھ جوش کے ساتھ ہو گئے اور کچھ فراق کے ساتھ۔

فراق کچھ حد سے آگے ہی نکل گئے۔ نوبت تیز تر تازی اور گالی گلوج تک پہونچی۔ اس میں ذرا کمی آتی تو تاثیر کبھی جوش کو شہ دیتا اور کبھی فراق کو۔

فراق ایسے بے قابو ہو گئے کہ ماں بہن کی گالیوں پہ اُتر آئے۔ جوش نے ان گالیوں کو بھی کڑوا گھونٹ بنا کر حلق سے نیچے اُتار دیا۔ مگر جب فراق نے بیٹی کی گالی دی تو جوش کے تیور بگڑ گئے۔ بولے:

"ہم پٹھان ہیں۔ ہم آپ کو قتل کر دیں گے؟"

یہ کہہ کر اٹھنے لگے۔ سب نے بڑھ کر انہیں پکڑ لیا، اور معاملہ رفع دفع کیا۔ اس سارے قضیے میں تاثیر کے چہرے پر جو بشاشت کی خوشی تھی وہ دیکھنے کی چیز تھی۔

جوش صاحب اور علی اختر مرحوم کا کسی بات پہ اختلاف ہوا۔ دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ کوئی بہت بڑی بیہودہ بات ہوئی ہوگی جوش صاحب کی طرف سے جو علی اختر جیسے سادھو قسم کے آدمی کو ناگوار گذری۔ اس زمانے میں نیاز فتح پوری بھی حیدرآباد پہونچے ہوئے تھے۔ اُن کے مراسم دونوں شاعروں سے تھے۔ علی اختر تو بے چارے خاموش ہو گئے۔ مگر نیاز صاحب نے محسوس کیا کہ انہیں جوش سے بدلہ لینا چاہئے۔ چنانچہ لکھنؤ واپس پہونچ کر نیاز صاحب نے نگار میں کلام جوش پر تنقید لکھنے کا سلسلہ جاری کر دیا،

جوش نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا کہ یکسر خاموشی اختیار کی۔

نیاز صاحب بک جھک کر خود ہی خاموش ہو رہے۔

جس نوعیت کی تنقید نیاز صاحب لکھتے ہیں۔ اس سے خود اپنی علمی فوقیت جتانا مقصود ہوتا ہے۔ مگر پڑھنے والا بھانپ جاتا ہے کہ اس میں جو کچھ تو بہت ہوتی ہے، خلوص مطلق نہیں ہوتا۔ "اس مصرع میں ہ دب رہی ہے۔ یہ مصرع چست نہیں ہے۔ پہلے مصرع کا دوسرے مصرعے سے ربط نہیں ہے۔ اس میں تنافر ہے۔ اگر یہ مصرع یوں ہوتا تو بہتر تھا۔" اس

کے بعد وہ اپنی اصلاح پیش کر دیتے ہیں اور شعر کا انگلا روپ بھی لکھ دیتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے "نگار" کا "جگر نمبر" شائع کیا ہے، ان کا انداز تنقید ملاحظہ فرما لیا جائے۔

پاکستان بن جانے کے بعد جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے تھے، ان کی وفاداری کو ہمیشہ شبہ کی نظر سے حکومت ہند نے دیکھا۔ یہاں تک کہ ابوالکلام آزاد کے بعض بیانات پر پٹیل نے انہیں بھی مطعون کیا۔ مگر جوش صاحب کی وفاداری کسی کو مشتبہ نظر نہ آئی۔ پنڈت نہرو مروت کے آدمی ہیں۔ انہوں نے ان کے حلوے مانڈے کا انتظام کیا۔ تقریباً دو ہزار روپے ماہانہ کی انہیں یافت کرا دی گئی۔ کام کچھ نہیں، صرف نگرانی اور مشورہ۔ حکومت ہند نے انہیں "پدم بھوشن" کے اعلیٰ خطاب سے بھی نواز دیا۔ دس سال تک جوش صاحب ہندوستان میں خوب موج مارتے رہے۔ لیکن ہندو ایک مسلمان کو اچھے حالات میں دیکھنا بھلا کیسے پسند کر سکتا تھا۔ تاک میں لگے رہتے، اور ان کی ذرا ذرا سی بات کی گرفت کرتے۔ جوش صاحب ایک غیر محتاط آدمی۔ قدم قدم پر ان سے لغزش ہوتی۔ خفیف الحرکتی اور بعض غلط باتیں بھی کرتے۔ یار لوگ بڑھا چڑھا کر اوپر کے حلقوں میں پہونچاتے اور وزیر اعظم کے کان بھرتے۔ پنڈت جی طرح دے جاتے۔ مگر چشم پوشی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ سنا ہے کہ جوش صاحب کے ساتھ اتنی بگڑ گئی کہ ہندوستان میں ان کا مزید قیام خطرے میں پڑ گیا۔

جب دلی کی فضا اُن کے لئے ضرورت سے زیادہ گرم ہو گئی تو انہوں نے پاکستان کا رُخ کیا۔ یہاں آکر کراچی کے چیف کمشنر نقوی سے ملے اور ان کے ذریعے صدر اسکندر مرزا سے۔ لو صاحب! یہاں کوئی چار ہزار روپے ماہانہ کا ان کے لئے انتظام ہو گیا۔ یہاں کا معاملہ پکا کر کے موصوف پھر دلی گئے۔ اور سنا ہے پاکستان کی پیش کش دکھا کے پنڈت جی سے پھر مصالحت کرنی چاہی۔ مگر وہاں سے جواب مل گیا کہ آپ کا پاکستان چلا جانا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ اردو، ہندی اور اپنے بچوں کے مستقبل پر ایک بیان دے کر جوش صاحب کراچی چلے آئے۔

ادھر اخبار والوں کو سن گن مل گئی، کہ نقوی صاحب نے جوش پروری کے لئے کیا کیا اسباب مہیا کئے ہیں۔ مار دو اخباروں میں لے دے شروع ہو گئی۔ اور جوش صاحب "از آں سو راندہ و از ایں سو درماندہ" کی زندہ مثال بن کر رہ گئے۔ چار ہزار روپے ماہوار کا سہانا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

اپنے موجودہ حال سے جوش صاحب سخت نا مطمئن اور ناخوش ہیں۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ مجھ پر پندرہ بیس افراد خاندان کا بار ہے۔ اپنی اولاد کے علاوہ اولاد کی اولاد کے بھی جوش صاحب ہی کفیل ہیں۔ بیاہی تیاہی بیٹی اور داماد بھی اُنہیں کے سر ہیں۔ سُنا ہے کہ داماد صاحب بی اے بی ٹی ہیں۔ اسکول کی ملازمت کو بہت گھٹیا چیز تصور کرتے ہیں۔ حضرت جوش کا داماد، اور اسکول ماسٹری! دنیا کیا کہے گی؟ لہٰذا مع بیوی اور جوان جوان بچوں کے جوش کے گھر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں ـــــ اور شاعرِ انقلاب کی عزت و آبرو کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جوش صاحب ستر کے پیٹے میں ہیں۔ اتنی عمر اور اتنی دنیا دیکھنے کے بعد بھی اُن کے مزاج کا بھولپن نہیں گیا۔

بھولپن پر ان کے مزاج کا ایک اور پہلو یاد آ گیا۔ اپنی شاعری کی بدولت جوش صاحب ہمیشہ سے حکام رس رہے ہیں، اہل غرض انہیں گھیرے رہتے ہیں۔ سفارش کرنے میں جوش صاحب ذرا بھی ہیر پھیر نہیں کرتے۔ سفارش بیشتر نالائقوں ہی کی کی جاتی ہے۔ جوش صاحب نے کبھی بڑے آدمی سے کسی کی سفارش کی، اور اس کی تعریف کے پل بھی باندھ دیئے۔ بڑے آدمی نے کہا:

"مگر جوش صاحب، یہ صاحب تو اس جگہ کے لئے موزوں نہیں۔"

"جی اور کیا۔ بالکل ناموزوں ہیں۔"

"تو اس صورت میں یہ جگہ تو انہیں نہیں دی جا سکتی۔"

"جی بے شک۔ کیسے دی جا سکتی ہے۔"

چلئے چھٹی ہوئی۔ امیدوار سے کہہ دیا کہ "صاحب، آپ تو اس جگہ کے لئے قطعی ناموزوں ہیں۔"

اس نے واویلا مچایا کہ "حضرت مجھ سے زیادہ موزوں کوئی اور ہے ہی نہیں۔"

"یقیناً آپ سے زیادہ موزوں کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے۔"

"صاحب، یہ بڑا متعصب افسر ہے۔"

"جی ہاں۔ میرا بھی یہی اندازہ ہے۔ سخت متعصب ہے کم بخت۔"

غالباً جوش صاحب سب کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لئے ان کی گفتگو ہمیشہ ماشیاتی ہوتی ہے۔ اسے آپ چاہیں تو ان کا بھولپن کہہ لیں، چاہے یہ کہہ لیں کہ جوش صاحب بے پیندی کے لوٹے ہیں۔

اس سے ملتا جلتا واقعہ گلڈ کے قیام کے وقت پیش آیا۔ جمیل جالبی صاحب سے جوش صاحب کا خاصا ربط ضبط ہے۔ طے پایا کہ جمیل صاحب جوش صاحب کو گلڈ کے پہلے اجلاس میں شرکت کی دعوت دیں۔ جمیل صاحب نے مجھے بھی ساتھ لے لیا — ڈرگ روڈ میں ان کی کوٹھی پر پہونچ کر پھاٹک پیٹا، تو ایک ادھیڑ عمر کے صاحب تشریف لائے اور بولے۔

"آہا میں اطلاع کرتا ہوں۔"

جمیل صاحب نے بتایا کہ یہ وہ جوش صاحب کے معروف داماد ہیں جو کچھ نہیں کرتے۔

تھوڑی دیر میں لوٹ کے آئے، اور بولے "چلے جائیے۔"

کمرے میں جوش صاحب براجمان تھے۔ اور ان کے چند ہوا خواہ انہیں گھیرے ہوئے تھے۔ جمیل صاحب نے گلڈ کی مختصر روئداد سنائی اور جوش صاحب سے شرکت کی استدعا کی۔

بولے "ضرور ضرور۔ مگر آپ آکر مجھے لے جائیں۔"

جمیل صاحب نے کہا "میں خود آکر آپ کو لے جاؤں گا۔"

مگر وقت مقررہ پر جب جمیل صاحب انہیں لینے گئے تو بے نیل و مرام واپس آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جو لوگ انہیں گھیرے رہتے ہیں، انہوں نے جوش صاحب کو یہ کہہ کر بہکا دیا کہ گلڈ کی طرف سے آپ کو کوئی عہدہ تو پیش کیا ہی نہیں گیا۔ اس صورت میں آپ کا جانا مناسب نہیں۔

دوسرے دن الیکشن ہونے والا تھا۔ اس میں پانچ چھ سو ادیب و شاعر عہدہ داروں اور مجلس عاملہ وغیرہ کا انتخاب کرنے والے تھے۔ گھر بیٹھے جوش صاحب کو عہدہ کون دے جاتا۔ چنانچہ آج تک جوش صاحب گلڈ کے ممبر نہیں بنے۔ اور ان کے دل میں یہی سمائی ہوئی ہے کہ انہیں گلڈ میں کوئی بڑا عہدہ ملنا چاہئے۔ گویا گلڈ میں عہدوں کی خیرات بٹ رہی ہے۔ جس کی تقسیم ان کے گھر سے شروع ہونی چاہئے۔

بہت سی خرابیاں ہیں جوش صاحب میں۔ خرابیاں سب ہی میں ہوتی ہیں کسی میں کم کسی میں زیادہ مگر اپنی تمام خرابیوں

کے باوجود جوش ایک مقناطیسی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان سے طبیعت متنفر نہیں ہوتی۔ ان سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ شعر کا تو ان کے جواب ہی نہیں ہے۔ مشاعروں میں جب وہ پڑھتے ہیں تو سب کے چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ باتیں بھی بھولی بھولی اور مزے دار کرتے ہیں۔ بس ——

وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی :

ایک پٹا ہوا مفلس شاعر پاکستان میں اُن سے لپٹ گیا۔ کبھی حیدرآباد میں بھی اُن کی جان کو آیا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ اللہ اس کی روح کو نہ شرمائے۔ مرحوم بڑا ہی بے غیرت تھا۔ جوش صاحب نے اس کا نام ہی کتّا رکھ دیا تھا۔ سنٹرل ہوٹل میں جوش صاحب کو کسی نے عصرانہ دیا۔ عصرانہ ختم ہوا۔ جوش صاحب نے اپنا کلام سُنانا شروع کیا کہ مرحوم پیشر پیشر کرتا آ پہونچا۔

جوش صاحب نے میزبان سے کہا۔ دیکھو، وہ کتّا آیا ہے۔ اسے کچھ کھانے کو دو۔ کتّے نے خوب سیر ہو کر کھایا اور داد دینے آ بیٹھا۔

مرحوم ہر فن مولا تھا۔ نثر بھی لکھتا تھا، شعر بھی کہتا تھا۔ یزید کی تعریف میں ایک پوری کتاب بھی اس نے لکھی تھی۔ جسے چھاپنے کے لئے اسے کوئی پبلشر نہیں ملتا تھا۔ گانے بجانے میں بھی کچھ دخل تھا۔ کھانا بھی پکا لیتا تھا۔ ایک دفعہ جوش صاحب سے بولا ——

"مچھلی تو کبھی میں آپ کو پکا کر کھلاؤں گا۔ آپ انگلیاں ہی چاٹتے رہ جائیں گے۔"

"ارے بھئی تو کھلاؤ نا کسی دن۔"

"کل ہی لیجئے۔"

اگلے دن وہ مچھلی پکا کر لے آیا۔ اچھی پکائی تھی۔ مگر چلتے وقت پتیلی کے ساتھ سولہ روپے کچھ آنے بھی لاگت کے جوش صاحب سے لے گیا۔

جوش صاحب جیسی گھن گرج کے شعر کہتے ہیں، پڑھتے بھی اسی گھن گرج سے ہیں۔ روزانہ صبح کو باقاعدگی سے شعر کہتے ہیں۔ شائقین ان کا کلام سننے کے لئے بے تاب رہتے ہیں۔ آج تک کوئی چھپا شعر اُن کا نہیں سُنا۔ سابق چیف کمشنر نقوی نے سابق صدر سکندر مرزا کو باور کرا دیا تھا کہ جوش اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ یہ لطیفہ حکومت کے ایک بڑے عہدے دار نے سنایا کہ کوئی وزیر دستم کا انگریز پاکستان آیا ہوا تھا۔ ایوان صدر میں اس کے اعزاز میں ڈنر تھا۔ معزز مہمانوں میں جوش صاحب بھی شامل تھے۔ آج کل تو کھڑا کھانا (بوفے) ہوتا ہے۔ کھاتے بھی جاؤ اور ٹہل ٹہل کر مہمانوں سے باتیں بھی کرتے جاؤ۔ معزز مہمانوں کے ساتھ ٹہلتے ہوئے سکندر مرزا جوش صاحب کے قریب آ گئے۔ جوش صاحب کا نام تو انہیں یاد نہ آیا۔ تعارف کراتے ہوئے بولے۔

"Meet the greatest poet of urdu.

وہ بھی ایک ہی بوجھ بجھکڑ تھا۔ ہاتھ بڑھا کر بولا۔

"Oh I see! so you are Mr. Ghalib."

انجمن دانشورانِ ادب کے صدر جناب عبدالخالق عبدالرزاق ایک قابل اور علم دوست آدمی ہیں۔ اصل وطن تو دلّی تھا

گو سالہا سال سے کراچی میں رہتے ہیں۔ سگرٹ کنگ کہلاتے ہیں۔ مہینے دو مہینے میں اُن کے ہاں ایک پُرتکلف دعوت ہوتی ہے، جس میں پندرہ بیس ممبر اور دو چار ماحضر نوازی مہمان شریک ہوتے ہیں۔ اتفاق سے اس انجمن کے تقریباً تمام ممبر خوش خور بھی ہیں (سوائے جناب صدر کے جو کھاتے کم ہیں مگر کھلا کر زیادہ خوش ہوتے ہیں)، لہٰذا شیخ صاحب کھانے کا نت نیا اہتمام کرتے ہیں کبھی بریانی اور قورمے کی دعوت ہوتی ہے، کبھی سیخ کے کباب اور پوریوں کی، اور کبھی مُرغ مسلّم کی، اور کبھی آموں کی۔ جاڑوں میں نہاری اور پایوں کی دعوت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اس میں جوش صاحب بھی شریک ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب ان کے قدردان اور ناز بردار ہیں۔ اس لئے ان کے لئے عمدہ سے عمدہ شراب بھی منگواتے ہیں۔ مغرب کے بعد ہی مہمان جمع ہو جاتے ہیں۔ فضلی، ماہر القادری، محمد تقی، رئیس امروہوی، جون ایلیا، رازق الخیری، اے ڈی اظہر، صہبا لکھنوی، ممتاز حسین، شان الحق حقی، الطاف گوہر، مہاجر صاحب اور کئی اور حضرات جن کے نام اس وقت یاد نہیں آرہے۔ شیخ صاحب کی کوٹھی کے کشادہ سبزہ صحن میں بیضوی حلقے میں کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ مہمان آتے جاتے ہیں اور بیٹھتے جاتے ہیں۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی ہیں۔ جوش صاحب کی میز الگ ایک طرف کو لگی ہوئی ہے۔ شراب کی بوتل ہے، سوڈا ہے، تھرمس میں برف کی ڈلیاں ہیں۔ دو گلاس ہیں، ایک ٹائم پیس بھی میز پر دھری ہوئی ہے۔ کیوں کہ جوش صاحب گھڑی دیکھ کر پیا کرتے ہیں۔ وقت ختم ہوا، شراب کا دور ختم ہوا۔ مجاز مرحوم کو بھی جوش صاحب نے نصیحت کی تھی کہ،

"میاں گھڑی رکھ کر پیا کرو۔"

اس بلا نوش نے جواب میں کہا تھا کہ:

"میرا بس چلے تو گھڑا رکھ کر پیوں۔"

جوش صاحب کا ساتھ دینے کے لئے ایک اور صاحب جا بیٹھے ہیں۔ جوش صاحب پیئے رہتے ہیں، یہ چُسکی لگاتے رہتے ہیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے میں جوش صاحب پانچ چھ گلاس پی جاتے ہیں۔ اور یہ دو ہی میں جھک جاتے ہیں۔ اور جب کھڑے ہوتے ہیں تو اُن کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگتی ہیں۔ جوش صاحب میں کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا۔ کھانے کا وقت ہو گیا۔ لمبی میزوں پر کھانا چنا گیا۔ کھڑا کھانا بھی ہوتا ہے اور بیٹھا بھی۔ جوش صاحب کا کھانا انہیں کی میز پر پہنچ گیا۔ ماشاء اللہ خوش خور ہیں۔ جبھی تو پینسٹھ برس کی عمر میں بھی ٹانٹے بنے ہوئے ہیں۔ سچ ہے "ایک ڈاڑھ چلے، ستر بلا ٹلے۔" شیخ صاحب ایک ایک کے پاس جا کر کہتے ہیں۔

"آپ نے تو لیا ہی نہیں۔"

"آپ تو کچھ کھا ہی نہیں رہے۔"

"بھائی، آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ لیجئے نا۔"

اصرار کر کر کے سب کو کھلا رہے ہیں۔

"شیخ صاحب، آپ بھی تو کچھ کھائیے نا۔"

"جی ہاں۔ میں بھی کھا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے کچھ چینگ لیا اور آگے بڑھ گئے۔

ماہر القادری کھانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔ یعنی اتنا کہ اس کے بعد مزید انصاف کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ اتنے میں برف میں لگے ہوئے آم آجاتے ہیں تو مولانا تأسف سے فرماتے ہیں۔

"ارے! یہ تو پہلے بتا دینا چاہیئے تھا کہ آم بھی ہیں"۔
میں نے کہا "یہی تو نقصان ہے مولانا شارٹ ہینڈ میں کھاتے ہیں"۔
اور صہبا کہتے ہیں "قوم کا نقصان کر دیا شیخ صاحب نے"۔
پھر قوم آموں پر دست درازی شروع کرتی ہے۔ مگر مولانا ماہر القادری بھی تین دانوں سے زیادہ نہیں کھا سکتے۔
آموں سے نمٹنے نہیں پاتے کہ آئس کریم آجاتی ہے۔ مولانا افسردگی سے کہتے ہیں:
"لیجئے ابھی یہ بھی باقی ہے"۔
اس کے لئے بھی کہیں نہ کہیں گنجائش نکل آتی ہے۔
کھانے سے فارغ ہو کر سب کرسیوں کے حلقے میں آ بیٹھتے ہیں۔ جوش صاحب بھی حلقے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان کے دائیں ہاتھ سے شعر خوانی کا چکر چلتا ہے۔ شاعر اپنا اپنا کلام سناتے ہیں۔ آخر میں جوش صاحب کا نمبر آتا ہے۔ وہ خوب اسٹیم بھر چکے ہیں۔ ایک بیاض سامنے رکھ کر شروع ہو جاتے ہیں۔ کس بلا کا کلام ہے۔ سننے والے پھڑک پھڑک کر داد دیتے ہیں۔ بیسیوں بند کی طویل نظم ہے۔ مگر اکھرتی نہیں۔ جی یہی چاہتا ہے کہ نظم کبھی ختم نہ ہو۔ اور ماشاءاللہ کتنی جان ہے پڑھنے والے میں۔ پوری آواز سے پڑھتے پڑھتے ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا۔ آواز مکرر ہی تک نہیں۔ کیا اس شاعر کا یہی ایک وصف ایسا نہیں کہ اس کے تمام عیوب کو نظر انداز کر کے اسے گلے لگا لیا جائے؟ ع
نازت بکشم کہ نازنینی!

جوش اور دنیاداری (صفحہ ۲۱۵ سے آگے)

کراچی آنے کے بعد عرصے تک ان سے ملاقات نہ ہوئی، اور ہوئی تو اس وقت جب انہوں نے شراب ترک کر دی تھی۔ میں نے انہیں کہلا بھیجا کہ "عرصے سے بیمار ہوں۔ حتیٰ کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہوں۔ آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے، کیا کروں۔ کیسے ملوں؟"
تو جوش صاحب میرے یہاں تشریف لے آئے۔
اس وقت میں نے ان سے دو سوال کئے،
ایک تو ترک شراب کی وجوہ؟
اور دوسرے پاکستان ہجرت کرنے کے اسباب؟
شراب کے متعلق انہوں نے میری امید کے خلاف فرمایا، اور میری تمام خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ کہنے لگے: "میں نے ہمیشہ کے لئے ترک نہیں کی ہے، بلکہ عارضی طور پر چھوڑ دی ہے۔ اس کا سبب مالی حالات ہیں۔ میرے متعلقین مثلاً لڑکا، داماد، وغیرہ سب بڑے لاٹ صاحب ہیں؛ جب ایک کمانے والا موجود ہو تو انہیں کمانے کی کیا ضرورت ہے؟"
پاکستان آنے کے متعلق فرمایا کہ "اگرچہ بھارت میں میری کافی عزت تھی، اور وہاں کافی راحت و آرام تھا، لیکن سب پنڈت نہرو کے دم تک تھا۔ علاوہ ازیں وہاں یہ اندیشہ بھی تھا کہ میری اولاد اردو سے محروم اور بے بہرہ ہو جائے گی۔ اس چیز کو میں گوارا نہ کر سکا۔ اور پاکستان آ گیا۔

جوش اور عملۂ ترقی اردو بورڈ

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی
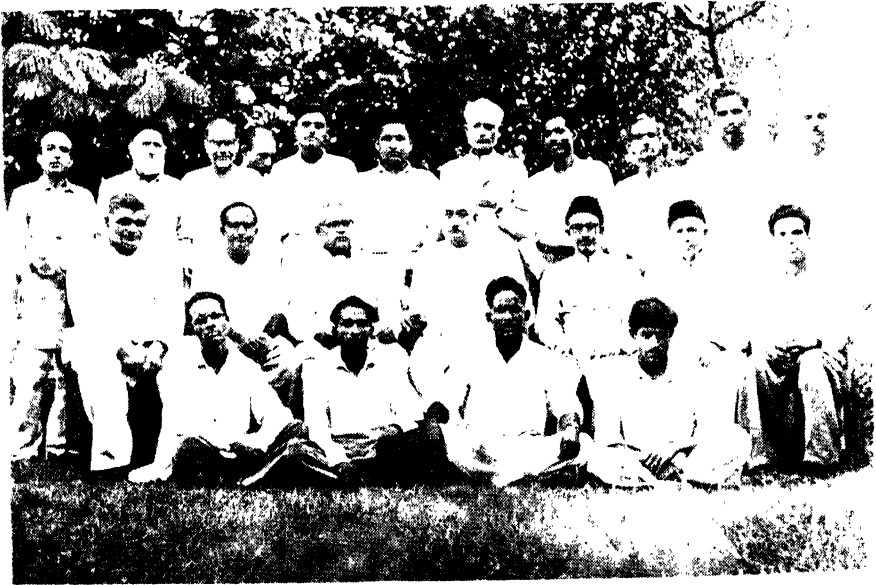
میاں محمد صادق

جوش ایک انسان

حضرت جوش ملیح آبادی سے جہاں تک مجھے یاد ہے سنہ ۱۹۳۴ء میں جب کہ میں دہلی میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی تھا، خاں صاحب حکیم محمود علی خاں ماہر اکبر آبادی کے ذریعے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اگرچہ جوش صاحب مشہور و معروف کانگریسی تھے اور میں ایک پولیس افسر — تعارف دن بدن غیر معمولی طور پر ترقی کرتا چلا گیا۔ اس وقت بھی بعض لوگ اس تعلق کو تعجب کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور آج تک دیکھتے چلے آئے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے اس الجھن کو صاف کرنا چاہئے۔ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ حضرت جوش اگرچہ پیدائشی شاعر اور ادیب ہیں طبعاً متلاشیِ حق اور حق شناس بھی ہیں۔ خوش قسمتی سے مجھے بھی ابتدا ہی سے یہی مرض لاحق ہے ؎

یارانِ زمانہ سے صفا ڈھونڈ رہا ہوں
بُت خانوں میں پھرتا ہوں خدا ڈھونڈ رہا ہوں
ہے رحم کے قابل مری ناتجربہ کاری
اس عہد میں ہوں اور وفا ڈھونڈ رہا ہوں

یہی حال جوش صاحب کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

حق کو کسی اہلِ یقیں سے پوچھو
معنی سے نہ واعظانِ دیں سے پوچھو
برداشت کی طاقت ہو تو اسرارِ حیات
رندانِ خرابات نشیں سے پوچھو

جوش صاحب کو رندانِ خرابات نشیں سے کب فیض پہنچا اس کی تو ان کو خبر ہوگی۔ مگر مجھے حضرت جوش کے الفاظ میں جو تجربہ حاصل ہوا، وہ حسبِ ذیل ہے ؎

ہر عالمِ دیں پناہ جاہل نکلا
ہر کوہِ جبل کاہِ لبِ ساحل نکلا

ضمیرِ مستعد سے آگاہ کر دے

"پیغمبر اسلام" ان کی ایک معرکہ آرا نظم ہے۔ اس کو پڑھ کر کوئی بڑا ہی سنگ دل اُن کو ملحد کہہ سکتا ہے۔ مگر محمدؐ کا شناسا ہو کر کوئی ملحد کس طرح ہو سکتا ہے؟ ان کے کلام سے عقیدتِ رسولؐ کی ان گنت مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

جوش صاحب کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ ایک بے کینہ دل کے مالک ہیں، اور کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتے۔ حیدرآباد دکن میں وہ دربار شاہی کے رکن تھے لیکن مزدوروں کی حالتِ زار پر ایک نظم لکھ ماری۔ ہوتے ہوتے نظام حیدرآباد کو خبر ہوئی۔ پیشی ہوئی۔ نظم سنانی پڑی۔ ڈر کر نہیں، بڑے دھڑلے سے سنائی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بیک بینی و دو گوش حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔

اہالیانِ دربار و اقربانِ اسلاف نے ہر چند کوشش کی کہ جوش صاحب معافی نہ سہی اظہار افسوس ہی کر دیں، مگر خوددار جوش نے ایسے بھی گوارا کیا۔ وہاں سے نکل دہلی پہنچے۔ بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ اس کو ہوش ربا کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا؟

حضرت جوش کی وارفتگی کا ایک واقعہ اور یاد آ گیا۔ سخت سردی کا موسم تھا۔ رات کے وقت میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں، حضرت جوش کھڑے ہیں، اور موسم گرما کے لباس میں ملبوس ہیں۔ میں ذرا گھبرایا کہیں ان کو نمونیہ نہ ہو جائے۔ مگر انہوں نے فرمایا کہ اس وقت سردی خود ان سے گرمی حاصل کر رہی ہے۔ میں ان کو دیکھتا رہ گیا۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ کر زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ میں نے ہر چند روکا مگر بے سود۔ میرے گھر والے اور اہل محلہ جاگ پڑے۔ آخر بڑی دقت سے ان کو خاموش کیا، اور اپنی کار پر ان کو گھر چھوڑ آیا۔

اس کے بعد میں نے پوچھا کہ آپ تو کہا کرتے تھے کہ ہم شراب نوشی غم غلط کرنے کے لئے کیا کرتے ہیں، یہ رونا کیسا تھا؟

فرمایا کہ اگر شراب نوشی کی ابتدا میں غم کا غلبہ ہو تو بعد میں بھی غم سر پر سوار رہتا ہے، اور شادمانی میسر نہیں آتی، بے سروری کا عالم چھا جاتا ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

حضرت جوش کانگریسی ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ ان سے بحث ہو پڑی۔ انہوں نے مجھے کانگریس کی بعض شخصیتوں کے بارے میں چیلنج کیا۔ مگر میں نے جب سب سے بڑے کانگریسی مہاتما گاندھی کی مسلمانوں کے اور بالخصوص لندن

کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی کارروائی کی اصل کیفیت بتلائی تو وہ میرے خیالات سے متفق ہوگئے، اور انہوں نے تمام واقعات کو رسالہ "کلیم" میں بھی تفصیل سے لکھ ڈالا۔ اس کے بعد سے وہ بجائے کانگرس کے فارورڈ بلاک میں شمار ہونے لگے۔

ایک دفعہ میرے مکان "حمید منزل" میں نمازِ مغرب کے وقت چند احباب تشریف فرما تھے۔ جوش صاحب اور حکیم آزاد انصاری بھی آنکلے، نماز کی تیاری کا اہتمام ہونے لگا، تو جوش صاحب کچھ پریشان سے نظر آئے۔ میں نے ان کو سمجھا بجھا کر وضو کرایا، اور نماز کے لئے تیار کیا۔ حکیم آزاد انصاری بھی شامل ہوئے۔ نماز ختم ہوئی تو جوش صاحب نماز کے خاتمے سے پہلے ہی غائب ہو چکے تھے۔

اس کے بعد جب میں نے ان سے پوچھا، تو کہا "جونہی میں نماز کے لئے کھڑا ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ نبی کریمؐ میرے سامنے کھڑے ہیں، اور فرما رہے ہیں کہ جوش! تو بھی ان ریاکاروں میں شامل ہے؟" اسی وقت میں نیت توڑ کر بھاگ نکلا۔ اور اپنے مکان پہنچ کر دم لیا۔

اس کے بعد جوش صاحب نے یہ تمام ماجرا اپنے رسالہ "کلیم" میں بھی لکھ مارا۔

ایک دفعہ انہوں نے اپنے ایک ہم مشرب شاعر کے متعلق مجھ سے شکایت کی کہ اس نے اُن کے کلام کے ریکارڈ تیار کرلئے ہیں، اور ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ مگر بار بار وعدہ کے میرا حق مجھے نہیں دیتا۔ اس کے بعد اتفاق ایسا ہوا کہ میں سائیکلوں کے سرقے کی چھان بین میں مصروف تھا جو کوتوالی شہر دہلی میں ہو رہی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت جوش سر برہنہ اور سراسیمہ وہاں آپہنچے۔ کہنے لگے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے دوست کو جس نے مجھے رائلٹی نہیں دی آپ پکڑ لے آئیے۔"

اسی وقت مجھے معلوم ہوا کہ ان کا وہ دوست بھی کوتوالی میں موجود ہے۔ حیرانی ہوئی، مگر ساتھ ہی جوش صاحب کا یہ شعر بھی یاد آگیا ؎

کوئی حد ہی نہیں ہے احترامِ آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

اپنے تکلیف دینے والے کی پریشانی پر کون اس طرح پریشان ہوتا ہے؟

آخر میں یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں ؎

بہت دل خوش ہوا اے ہم نشیں کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

ماہر القادری

جوش کی اعلیٰ ظرفی

جوش صاحب کا وطن اور مولد و منشا ملیح آباد، آموں کے سبب پہلے ہی سے مشہور تھا، جوش صاحب کی شاعرانہ شہرت نے اس بستی کو اور زیادہ مشہور کر دیا، اور اب اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے کہ ملیح آباد کی شہرت میں آموں کو زیادہ دخل ہے یا جوش صاحب کی شخصیت کو:

جوش صاحب پٹھانوں کے ایک سنی گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے باپ کا نام بشیر احمد خاں تھا جو قصبہ کے آبائی زمیندار بلکہ چھوٹے موٹے تعلقدار تھے۔ جوش صاحب کا نام ان کے والدین نے شبیر احمد خاں رکھا۔

جوش صاحب نے جب شعر کہنا شروع کیا، تو ان دنوں عزیز لکھنوی مرحوم کی شاعری کی بہت دھوم تھی، اور تو اور، اس زمانے کے سب سے بڑے اردو شاعر لسان العصر اکبر الہ آبادی تک عزیز سے متاثر تھے، اور ان کی شاعری کے مداح تھے۔ فرماتے ہیں

تشبیہ جلوۂ حق فقط عزیز ہی ہیں!

شاد عظیم آبادی اردو کے مشہور شاعر ہیں، مگر عجیب بات ہے کہ ان کا صرف یہ شعر ــــ

تمنّاؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

کی شہرت کا سبب بنا ہوا ہے۔ خود میں نے بیسیوں شاعروں اور اہلِ ذوق کی زبان سے شاد کا صرف یہی شعر سنا۔
اسی طرح عزیز لکھنوی کے اس شعر:

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

کو غیر معمولی شہرت نصیب ہوئی۔ اور جہاں کہیں عزیز کا ذکر چھڑتا ہے، وہاں اُن کا یہ شعر بھی ضرور سنایا جاتا ہے۔
ملیح آباد لکھنؤ سے قریب ہی ہے۔ عزیز لکھنوی کی شاعرانہ شہرت بھی تھی۔ جوش صاحب کا لکھنؤ آنا جانا بھی رہتا تھا، اس لئے انہوں نے عزیز کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کیا

جوش صاحب شروع میں غزل بھی کہتے تھے۔ ان کے ذہن و فکر کو "غزل" ہی نے جلا بخشی ہے۔ اور اسی صنف نازک و لطیف کے آغوش میں ان کی شاعری پروان چڑھی ہے۔

جوش صاحب کی غزلوں کے یہ شعر پڑھئے۔ اور لطف اٹھائیے ؎

آنکھیں سہیلیوں سے ملی، نیند ہے چشمِ ناز میں
بھر دے حنا کا رنگ بھی نرگسِ نیم باز میں

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا
یہ کہ معلوم نہیں، تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

قدم پست و بلند دہر میں تھرا ہی جاتا ہے
چلے کتنا ہی بچ کر کوئی ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے
سمجھتی ہیں مآلِ گل، مگر کیا زورِ فطرت ہے
سحر کے وقت کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

جوش کی غزلوں ہی نے اردو دنیا سے ان کا تعارف کرایا۔ "غزل" کا جوش کی شہرت اور شاعرانہ تربیت فکر پر بہت بڑا احسان ہے — مگر بعد میں چل کر انہوں نے "غزل" کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم کر دیا۔ اگرچہ اس محاذ پر انہیں شکست ہو گئی۔ ان کی یہ "اینٹی غزل" تحریک برگ و بار نہ لا سکی، اور "غزل" کی مخالفت میں ان کے ماہنامہ "کلیم" کی آواز دب کر رہ گئی۔

مگر —

غزل سے بیزار ہو کر انہوں نے خود اپنی شاعری کو "لطافتِ تغزل" سے محروم کر دیا! شعر و ادب کا یہ ایک "حزنیہ" ہے:

حکیم آزاد انصاری مرحوم کا نام آج کوئی نہیں جانتا، مگر اب سے پچیس تیس سال پہلے وہ اردو دنیا کے جانے معروف شاعر تھے۔ جوش صاحب سے آزاد انصاری کا بڑا یارانہ تھا۔ جب جوش صاحب نے "غزل" کے خلاف آوازِ بلند کی تو آزاد انصاری نے جوش صاحب کی مخالفت میں رباعیاں کہیں۔ اور "غزل" کے مداحوں کو

"نمک خوارانِ غزل"

کہہ کر مخاطب کیا۔

"غزل" کا ذکر آ گیا، غزل کی مدافعت و مخالفت میرا موضوع نہیں ہے۔ ہاں! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جوش صاحب عزیز لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ لکھنؤ سے تعلق کے سبب ان کا لکھنؤ زیادہ آنا جانا ہو گیا۔ یہ ان کے شباب کا زمانہ تھا۔ ملیح آباد کے مضافات میں لکھنؤ کی صحبتیں بہت زیادہ رنگین اور دلکش تھیں۔ ان صحبتوں سے اور

خوب خوب لطف اندوز ہوئے۔ شاعر اور جوان تنومند اور خوب رو شاعر کی جوانی ہنگاموں سے خالی رہ ہی نہیں سکتی۔

عزیز لکھنوی شیعہ تھے۔ جوش صاحب کو لکھنؤ میں زیادہ تر شیعہ گھرانوں کا ماحول ملا۔ اسی صحبت اور ماحول سے متاثر ہو کر وہ شیعیت کی طرف پوری طرح مائل ہو گئے۔ اور اپنے نام — شبیر احمد خاں — کو بدل کر "شبیر حسن خاں" کر دیا۔ ان کے معتقدات میں پہلی تبدیلی لکھنؤ میں واقع ہوئی۔

جوش صاحب کا سن تیس سال کے لگ بھگ ہوگا جب انہوں نے روزگار کی جستجو میں اپنے وطن (ملیح آباد) کو چھوڑا، اور وہ حیدر آباد دکن پہنچ کر دارالترجمہ میں "ناظر ادب" کی خدمت پر مامور ہو گئے۔ ملیح آباد کو چھوڑتے ہوئے انہیں بہت رنج ہوا۔ جس کا اظہار انہوں نے (نیز) ایک نظم میں کیا ہے — جو واقعی بڑی پُر درد اور اثر انگیز نظم ہے!

اگر وطن میں ان کے مالی حالات، ان کے آباء اجداد کے حالات کی طرح اطمینان بخش رہتے تو وہ نہ ملازمت کرتے اور نہ وطن کو چھوڑتے۔ اس عار کو انہوں نے بہ جبر و اکراہ گوارا کیا تھا — کسی اخلاقی شاعر نے تجربہ و مشاہدہ کے بعد ہی کہا ہے ؎

آں کہ شیراں را کند روبہ مزاج
احتیاج است احتیاج است، احتیاج

حیدر آباد دکن میں حضرت جوش کا زمانہ فراغت اور معاشی اطمینان کا زمانہ تھا۔ ان کے پاس اب سے تقریباً اٹھائیس سال پہلے سواری کے لئے موٹر کار موجود تھی۔ یہ وہ دور تھا کہ ہندوستان میں کسی شاعر کو موٹر تو کیا بگھی اور ٹم ٹم بھی میسر نہ ہوتی، اور بہت سے تو سائیکل رکھنے کی بھی استطاعت نہ رکھتے تھے۔

قیام حیدر آباد دکن کے شروع کے چند سالوں میں جوش صاحب ذہن و فکر کے اعتبار سے مذہبی رہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد لکھی اور اس شان سے لکھی،

پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

اور

جو یہ پہاڑوں کی ٹوٹ جائیں فلک تو کیا عرش کانپ اٹھتا
اگر نہ دل پر میں روک لیتا تمام زور شباب تیرا

ان کی بعض معرکہ آرا نعتیہ نظمیں بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔ دکن کے مشہور شاعر جناب علی اختر مرحوم نے مجھ سے بیان کیا کہ جوش صاحب نے جب ایک نعتیہ نظم کہنی شروع کی تو ان دنوں شراب پینی چھوڑ دی، اور نظم پوری ہونے تک وہ اس شغل سے مجتنب رہے۔

میں سنہ ۱۹۳۰ء میں حیدر آباد دکن پہنچا، اور وہاں پہنچنے کے چند دن بعد ہی جوش صاحب سے ملاقات ہو گئی (غالباً) سنہ ۱۹۳۰ء ہی میں حضرت فانی بدایونی بھی آگرہ چھوڑ کر حیدر آباد دکن آ گئے۔ میں ان محفلوں میں شریک رہا ہوں کہ دکن کے مشہور شوقین موسیقار رفعت کا گانا ہو رہا ہے۔ جوش صاحب، دوران کے بہنوئی ابرار حسن خاں آثر مرحوم سرخوشی کے عالم میں تالیاں بجا رہے ہیں۔ گانے کے بعد جوش صاحب نے اپنا کلام ترنم کے ساتھ سنانا شروع کیا

تو اچھل پڑے ۔ سویرا کر دیا!"

جوش صاحب برسوں تک اپنا کلام ترنم سے سناتے رہے ۔ ان کی اس خود شناسی، خود آگاہی اور ذہانت کی داد دینی چاہیئے کہ انہوں نے پھر "ترنم" چھوڑ کر "تحت لفظ" اختیار کیا ۔ اس تبدیلی میں آغا شاعر دہلوی کے فیض صحبت کو بھی کچھ نہ کچھ دخل ہے ۔ آغا شاعر تحت لفظ پڑھتے تھے اور مشاعروں کو لوٹ لیتے تھے ۔ بڑے بڑے گلے باز شاعروں کا رنگ ان کے سامنے نہ جمتا تھا ۔ جوش صاحب کے تحت لفظ میں آغا شاعر کے پڑھنے کا انداز پایا جاتا ہے جوش صاحب کے ترنم کی تھوڑی سی جھلک پنڈت آنند نرائن ملا کی شعر خوانی میں ملتی ہے ۔

غالباً سنہ ۱۹۴۱ء یا سنہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے ۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم ان دنوں اپنے ایک عقیدتمند نواب محمود حسین خاں کے بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے ۔ جوش صاحب کا بنگلہ بھی یہاں سے قریب ہی تھا ۔ مولانا مرحوم کے پاس جوش صاحب کا آنا جانا رہتا تھا ۔ ایک دن مولانا عبدالقدیر بدایونی نے مجھ سے فرمایا کہ "آج مغرب کے بعد جوش صاحب یہاں آئیں گے ۔ اُن کے ذہن میں بعض مذہبی مسائل کے بارے میں شکوک پیدا ہو گئے ہیں، ان پر گفتگو ہوگی ــــ !"

غرض جوش صاحب وقت مقررہ پر تشریف لائے اور انہوں نے مسئلہ "خیر و شر" اور "جبر و اختیار" کے بارے میں اپنی الجھنیں اور شکوک و شبہات پیش کئے ۔

مولانا نے بڑی معقولیت کے ساتھ جوش صاحب کے ہر شبہے کا جواب دیا ۔ مجھے اب تک یاد ہے ۔ مولانا نے مثال دے کر جوش صاحب کو سمجھایا کہ : ایک وہ شخص جس کے ہاتھ میں رعشہ ہو اور دوسرا وہ شخص جس کے ہاتھ صحیح سلامت ہوں اُن دونوں کے ہاتھوں کی جنبشیں جبر و اختیار کے نقطۂ نگاہ سے ایک جیسی نہیں ہیں ۔

یہ گفتگو خاصی طویل رہی ۔ میں نے برسبیل تذکرہ اس گفتگو کا ایک جملہ یہاں نقل کر دیا ہے ۔ وہ پہلا دن تھا جب مجھے اس کا علم ہوا کہ جوش صاحب تشکیک کے مرض میں مبتلا ہیں ۔

میں اس مسئلے پر مختصر سی گفتگو کرنا چاہتا ہوں ۔ یہ بڑا ہی نازک مسئلہ اور انتہائی باریک بات ہے ۔ "شک" ہر ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے ۔ انبیائے کرام کے علاوہ شکوک و اوہام سے کسی انسان کو مفر نہیں ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ، وحی و رسالت ، خیر و شر ، ثواب و عذاب آخرت ، اور اس قسم کے دوسرے دینی معتقدات کے بارے میں کوئی "شک" پیدا ہوا اور شک پیدا ہونے کے بعد آدمی اپنے اندر گھٹن اور کرب محسوس کرے کہ یہ شک کسی طرح دور ہو جائے ، تو تحقیق و تفتیش کے بعد یہ شک دور ہو سکتا ہے ۔ مگر کسی کو اس قسم کے شک میں لطف آنے لگے اور اس کی خود رائی اور انانیت اس "شک" کو صاحب تشکیک کی ذہانت کا کارنامہ سمجھنے لگے تو پھر یہ ایک "شک" شاخ در شاخ ہوتا چلا جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ شک کرنے والے کے ذہن اور فکر پر شکوک و شبہات کا جال تن جاتا ہے ۔ پھر دل حق بات قبول کرنے کے لئے مشکل ہی سے تیار ہوتا ہے ۔ قرآن کریم میں دل کی اس کیفیت کو "رین" سے تشبیہ دی گئی ہے ۔

جوش صاحب کے شکوک بھی اسی قسم کے شکوک تھے ۔ انہیں بھی شک میں لطف آنے لگا ، اور وہ سمجھنے لگے کہ یہ "شک" ان کی ذہانت کا مظہر ہے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یقین کی کیفیت کو شکوک و شبہات دباتے چلے گئے : اور ان

پنڈت سوز ہوشیار پوری

جوش ایک عظیم شخصیت

ماہنامہ افکار، کراچی کا "جوش نمبر" شائع ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں مجھ سے بھی کہا گیا ہے کہ میں قبلہ جوش صاحب کے بارے میں کچھ لکھوں۔ چنانچہ جب بھی میں کچھ لکھنے بیٹھا ناکام رہا۔ اصل میں شدت جذبات نے مجھے کچھ لکھنے ہی نہیں دیا۔ یہ صرف میں ہی جانتا ہوں کہ مجھے قبلہ سے کس قدر عقیدت و محبت ہے۔ جہاں محبت کرنے والا سراپا محبت ہو جائے وہاں وہ گم سا ہو جاتا ہے اور اپنے محبوب کے بارے میں اظہار خیال بھی نہیں کر سکتا۔ لوگ اس کے اس فعل کو اس کی بے پروائی، خود بے رخی سے بھی منسوب کرنے لگتے ہیں۔

آج جب میں کچھ اپنے آپ میں ہوں سوچ رہا ہوں کہ جوش نمبر میں جوش صاحب کی زندگی کا وہ کون سا رخ ہوگا جس پر ملک کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب روشنی نہ ڈالیں گے۔ تصور میں ہر بات آ رہی ہے جو آپ کی ذات سے متعلق ہوگی اس لئے یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ میں اپنی عمر کے اس حصے کا ہی ذکر کروں جو میں نے جوش صاحب کی صحبتوں میں گزارا ہے۔

اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے کہ قبلہ مجھے اچانک دہلی کے صدر اسٹیشن کے باہر ایک تانگے میں سوار ہوتے نظر آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی میں مسلمانوں پر انتہائی مظالم ٹوٹ پڑے تھے اور کچھ علاقوں میں تو مسلمان کی شکل عنقا ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے چہرے پر وہی آب و تاب تھی۔ میں چونکہ کچھ فاصلے پر تھا، میں نے زور سے آواز لگائی:

جوش صاحب ذرا ٹھہریئے!

آپ آواز سنتے ہی تانگے سے اترے اور بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔

میں نے پوچھا۔ آپ تو بمبئی میں رہتے تھے؟

فرمانے لگے: جی میں اب "آج کل" کا چیف ایڈیٹر ہو کر یہاں آ گیا ہوں۔

دوران گفتگو آپ کی بے محل "جی جی" اور "ہاں ہاں" سے میں سمجھ گیا کہ انہوں نے مجھے پہچانا نہیں۔ لیکن چونکہ وضع دار اور پرخلوص انسان ہیں مجھ پر یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ مجھے جانتے نہیں۔ ایسے واقعات اکثر لوگوں کے ساتھ پیش آتے رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ تو کسی سٹے والے نے کہا۔

"حضرت آپ مجھے ہر ملاقات پر بھول جاتے ہیں۔"

فرمانے لگے: "بھئی میں خدا تو نہیں جو سب کو یاد رکھوں۔"

اس کے بعد میں اکثر ان سے ملنے لگا۔ چونکہ میرا دفتر آپ کے دفتر کے بالکل مقابل تھا، تقریباً روز ہی آپ سے ملاقات ہو جاتی۔ آپ کی معصومیت کے ساتھ ساتھ آپ کے دبنگ پن نے مجھے موہ لیا۔ چھوٹے لوگوں سے ملتے وقت اُن سے بھی چھوٹا ہو جانا اور بڑے لوگوں سے ملاقات کے وقت خود کو ان سے بھی بڑا سمجھنا آپ کی فطرت میں داخل ہے۔ اور شاید اسی خوبی نے آپ کو ہر دل عزیز بنا دیا ہے۔ مجھے کوئی بھی ایسا وقت یاد نہیں جب انہوں نے میری کسی آرزو کو ٹھکرا دیا ہو۔

شام کی اکثر نشستیں کالٹن میں ہوا کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ کھانا کھاتے وقت آپ نے اپنا ایک نوالہ مجھے دے دیا، اور میرے ہاتھ کا نوالہ خود لے لیا۔ میں نے پوچھا "جوش صاحب۔ یہ کیا بات ہے؟"

فرمانے لگے "یہ ملیح آباد کی ایک رسم ہے۔ کہتے ہیں اس سے محبت بڑھتی ہے۔"

میں حیرت میں پڑ گیا کہ وہ شخصیت جس نے ہندوستان جیسے ملک میں جنم لے کر بھی روایات کہن کی ہر زنجیر کو توڑ پھینکا ہو محبت کی رسموں کی آج بھی قائل ہے۔ بات کا انداز نہایت معصومانہ تھا۔ لیکن شاعر کی باطنی کیفیت کا پتہ دیتا تھا۔

کئی مرتبہ میں نے دیکھا کہ کالٹن میں جناب مجاز لکھنوی بھی تشریف فرما ہیں۔ میں نے جوش صاحب سے درخواست کی کہ مجاز صاحب کو بھی اپنے پاس بلا لیا جائے۔

فرمانے لگے "نہیں۔ اس کی آوارگی مجھے پسند نہیں۔ آج کل وہ بہت بگڑتا جا رہا ہے۔"

میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ جوش صاحب کی حقارت انتہائی محبت کا ردعمل ہے۔ اس لئے زیادہ اصرار نہ کیا۔

آپ کی شام کی نشستوں میں کبھی کبھی زاہد قسم کے لوگ بھی شامل ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک زاہد قسم کے شاعر بھی شریک محفل تھے۔ شراب کا جام آیا تو اٹھا کر پینے لگے۔ جوش صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا:

"آپ کیا دیکھ رہے ہیں جناب۔ لائیے مجھے دیجئے۔ آپ کے ہاتھ میں تو یہ جام یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے نامرد کے ہاتھ میں کوک شاستر"

وہ شاعر کچھ کھسیانے سے ہو گئے اور تمام محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔

میں ایسے موقعوں پر اکثر یہ سوچتا تھا کہ یہ صرف جوش صاحب ہی ہیں۔ جو لاکھوں کی جائیداد کھو کر بھی اس قدر خوش و خرم نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر نشیب و فراز کو مذاق میں ٹال دینا جانتے ہیں۔ اور یہی ان کے اعلیٰ قسم کے مفکر ہونے کی دلیل ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر فریب جہاں کچھ حقیقت رکھتا ہے وہاں ہر حقیقت بجز فریب کچھ نہیں۔ بقول غالب ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے!

---

۱ دہلی کے ایک مشہور شراب خانے کا نام ہے۔

میرے نزدیک جوش صاحب کی زندگی کا اہم پہلو اُن کی راست گوئی ہے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں وہی کہتے ہیں
ابن الوقت ہونا ان کی فطرت میں نہیں ہے۔ ورنہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو شعرا انگریزوں کے زمانے میں جیل کے خوف
سے صرف غزلیں ہی کہتے تھے، آج حب الوطنی کے گیت بھی الاپنے لگے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے شعرا کا مقصد العین .....
عقیدت گوئی نہیں، بلکہ برسرِ اقتدار لوگوں کی دل جوئی ہے۔ ایسے شاعر یا ادیب زندگی میں تو سرفراز ہو جاتے ہیں، لیکن حیاتِ
جاوداں انہیں نصیب نہیں ہوتی۔ زمانے کی نقاد نظر جب ایسے لوگوں پر پڑے گی تو ان کی حیثیت صفر ہو کر رہ جائے گی۔ اس
دنیا میں جہاں عام لوگ سطحی نظر رکھتے ہیں۔ وہاں اعلیٰ درجے کے مفکر اور فلاسفر بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ جوش صاحب
کو اعلیٰ قسم کے مفکرین کی صف میں لا کر کھڑا کریں گے۔ اس وقت دو رخی کی سیاست ہو گی جو ایک مخلص انسان کو اپنے وطن
میں بھی آرام سے نہیں رہنے دیتی۔ اور نہ وہ لوگ ہوں گے جو انہیں صرف ہندو یا مسلمان بننے پر مجبور کرتے ہیں جاہ و
حشمت یا نام و نمود کی ہوس شاعر کو اس کے اپنے مقصد سے دور لے جاتی ہے۔ چند تعریفی نظمیں کہہ لینا یا مرثیہ خوانی کر لینا شاعر
کی فطرت کے عین منافی ہے۔

دن گذرتے گئے اور ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۵۳ء کا وہ منحوس دن بھی آ پہونچا، جب مجھے اپنی ملازمت کے سلسلے میں تبدیل ہو کر
ناگپور آنا پڑا۔ آپ سے ملاقات ۲۰ دسمبر کو ہوئی۔ میں بچوں کی طرح رونے لگا۔ آپ اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرمانے لگے "اچھا تو میں
جاتا ہوں۔ آپ روتے رہئے"

میں نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا "آپ جا رہے ہیں اس لیے رو رہا ہوں"

آپ پھر کہنے (مسکراتے ہوئے) ارشاد فرمانے لگے "ناگپور کوئی پردیس نہیں۔ اپنے ہندوستان ہی میں ہے
اصل میں تو تمام دنیا ہی ایک گھر ہے"

مجھے اپنی تنگ نظری کا احساس ہوا۔ اور ناگپور کے لئے سفر پر آمادہ ہونے کی ہمت ہو گئی۔ اس کے بعد مجھے دہلی میں
آپ سے ملاقات کا دو مرتبہ شرف حاصل ہو سکا۔

نومبر سنہ ۱۹۵۵ء میں آپ کراچی تشریف لے گئے۔ ہندوستان کے مختلف اخبارات میں آپ کے پاکستان چلے جانے پر
نکتہ چینی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ پاکستان کے اخباروں نے بھی آپ کی آمد کو سراہا نا۔ اس زمانے میں میں اکثر سوچتا تھا کہ
یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا ایک انسان کو کہیں بھی رہنے کا حق نہیں؟ حیرت ہے کہ اچھے اچھے لوگ یہ کہنے لگے کہ ہندوستان کے
بٹ گئے دو حصوں میں یا تو ہندو بن کر رہو یا مسلمان۔ انسان کا یہاں کوئی کام نہیں۔ عجیب سیاست ہے کہ ایک شاعر جو تقسیم
ملک سے پہلے اپنے وطن پر فدا ہوتا رہا۔ اب سے اس کے اپنے وطن میں ہی کوئی جگہ نہ رہی۔ معمولی سی سوجھ بوجھ کا
انسان بھی یہ جانتا ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے جوش صاحب کی وطن کے لئے ترجیحات کراچی اور دہلی کے لئے یکساں تھیں
لہٰذا اب وہ چاہے دہلی میں رہیں یا کراچی میں۔ کیا سیاسی بنیاد پر اہل سیاست ایک وطن پرست کو کہیں کا بھی نہیں رکھیں
گے۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہوا جیسے دو بھائیوں کی جائیداد ایک ساہوکار کے قبضے میں ہو اور تیسرا شخص ساہوکار کے قرضے
سے اس جائیداد کو چھڑوا لے۔ پھر دونوں بھائی اپنی جائیداد ہاتھ لگنے پر اس شخص کے جانی دشمن ہو جائیں۔

زمانے کا سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ وہ کسی شخص کے بارے میں بھی صحیح جائزہ نہیں لیتا۔ اور اس پر صرف سطحی نظر ڈال
کر اس کے بارے میں کچھ بھی فیصلہ کر لیتا ہے۔ نتیجہ بھی اسی نقطے کے شکار رہتے۔ ہندو تو انہیں مسلمان سمجھتے ہی تھے مسلمان

بھی یہ سمجھنے لگے کہ ان کے قول و فعل اسلام کے عین منافی ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں میں جو کھوٹ پیدا ہو گیا ہے اسے ہر چند نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اور انہیں حق کی طرف مائل کیا ہے۔ انسانیت کا درس دیا ہے۔ فرسودہ روایات پر اگر شاعر نے ایک طنزیہ نگاہ ڈالی بھی ہے تو کون سا ظلم ڈھا دیا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جوش صاحب ملحد ہیں۔ یہ صحیح طور پر تو نہیں جانتا۔ اور پھر میرے نزدیک ایک ذہین مفکر کا ملحد ہونا کوئی حیرت کی بات بھی نہیں۔ لیکن پھر بھی مندرجہ ذیل شعر ان کی باطنی معنویت کا آئینہ دار ہے۔ اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آپ کے تحت الشعور میں کسی ایسی طاقت کا وجود ضرور ہے جو قدرت پر حاوی ہے ؎

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

بہرحال کچھ بھی ہو۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جوش صاحب آئندہ زمانے کی امانت ہیں۔ زندگی میں ان کی بے قدری بھی ان کے ایک بڑا انسان ہونے کی دلیل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر بڑے انسان پر زمانے نے ہر ستم روا رکھا ہے۔ یہ یاد اور ہے کہ ہم مردہ پرست اس کے بعد اسے پوجنے بھی لگے۔ دیرینہ غلامی کے زیرِ اثر ہندوستان تو خاص طور پر مردہ پرست ملک ثابت ہوا ہے۔ یہاں گاندھی جی جیسے محسن کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اور آج اس دیس کے باسی انہیں اوتار ماننے پر بھی آمادہ ہیں۔

جوش کی اعلیٰ ظرفی

(صفحہ ۲۲۲ سے آگے)

کی ایک صحبت میں اپنی غزل سنائی۔ جس کے دو شعر یہ ہیں :

گھٹا بھی چھائی ہے مقبلِ بہار ہے ساقی
اب اس کے بعد تجھے اختیار ہے ساقی
رکھی ہے کل سے کہ لے میکشوں نے بھر کے شراب
اسی کا نام غمِ روزگار ہے ساقی!

اس غزل کو سن کر بولے :
"جو کچھ لکھ رہے ہو ایسے بن بھی جاؤ!"

جوش صاحب کے اس ظرف کی میں داد دیتا ہوں کہ ان کی مانند ہیبت اور دہریت پر جیا سے بڑی بڑی تعنت چوٹیں کی ہیں۔ ان کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو بگڑ جاتا مگر جوش صاحب اس کے جواب میں مسکراتے ہی رہے۔ اور اب جہاں کہیں مل جاتے ہیں، بڑی ہی گرم جوشی سے ملتے ہیں۔ مزاح اور تفریح کی باتیں کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ یہ صحبت دراز تر رہے۔

خواجہ حمید الدین شاہد

جیسا دیکھا جیسا پایا

حضرت جوش ملیح آبادی کی عظیم شخصیت کے بارے میں مجھ جیسے کم سواد اور ہیچ مداں کا کچھ لکھنا ایسا ہے جیسا آفتاب کو چراغ دکھانا۔ لیکن جب مجھے اس بات کا علم ہوا کہ جناب صہبا صاحب مدیر رسالہ "افکار" اکتوبر سنہ ۱۹۹۶ میں "جوش نمبر" شائع کر رہے ہیں تو حضرت جوش سے میری دیرینہ عقیدت کا یہ تقاضا تھا کہ اس ادبی گلدستے میں اپنی عقیدت کے چند پھول بطور نذرانہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر لوں۔

صہبا صاحب ساری اردو دنیا کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اہل اردو کی مردہ پرستی کی قدیم روایت کے برخلاف اپنے دور کے ایک بڑے فن کار کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرنے کے لئے معاصرین کو دعوت فکر و نظر دے کر ایک اچھی مثال قائم کر دی۔

حضرت جوش جیسے باکمال اور فقید المثال شاعر کی خدمات شعر و ادب کا اعتراف بہر حال ضروری تھا۔ یہ زمانے کی ستم ظریفی اور ہمارے احساس کی انتہائی پستی ہے کہ ہم کو اپنے باکمالوں اور محسنوں کی یاد ان کے مر جانے کے بعد ہوتی ہے

موجود میں سو عیب نظر آتے ہیں
ہر چیز پسند آتی ہے غائب ہو کر

تعزیتی جلسے، قرار دادیں اور اظہار عقیدت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ ہر سال بڑی دھوم دھام سے فن کار کا یوم بھی مناتے ہیں۔ اور تعریف کے پل باندھ دیتے ہیں۔ دوران حیات کہ وہ ہماری تحسین و تعریف سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ان سارے ہنگاموں کا مقصد صرف اپنی نمود و نمائش ہوتا ہے، کہ قوم کار کے کمال کا اعتراف کسی باکمال کی خدمات کا صحیح اعتراف تو اس کی زندگی ہی میں ہونا چاہیے۔ زندہ قوم کے افراد اپنے باکمالوں کی قدر و منزلت ان کی زندگی ہی میں [illegible]۔ یہ شخصیت پرستی نہیں بلکہ اعتراف شخصیت ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ گزشتہ چند برسوں سے اردو والوں میں یہ احساس پیدا ہو چلا ہے۔ جس کا ایک زندہ ثبوت "افکار" کا یہ "جوش نمبر" ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں اپنے فرض کی انجام دہی کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن میری علمی بے بضاعتی، اور [illegible] شاید ہی [illegible] کو پورا [illegible] ہو۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

میرا یہ منصب نہیں کہ میں حضرت جوش کے علم و فضل اور شاعری کے باب میں کچھ عرض کروں۔ وہ تو ان چند باکمال اور عظیم المرتبت شاعروں میں سے ہیں جنہیں زمانہ صدیوں بعد پیدا کرتا ہے۔ وہ جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے ہی بڑے انسان بھی ہیں۔ اور انسان بننا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہے ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر ملنے والا ان کی خاندانی شرافت، ذاتی وجاہت، عالمانہ عظمت اور سب سے بڑھ کر ان کی خوش اخلاقی اور انسانی ہمدردی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی شخصیت اور انداز گفتگو میں ایسی مقناطیسی کشش ہوتی ہے کہ جو بھی ایک دفعہ ان سے مل لیتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے ان کا ہو جاتا ہے۔ ان کے شریفانہ برتاؤ، میٹھی گفتگو اور وضعداری کی آن بان دیکھنے کے بعد بے ساختہ یہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ اس وقت سے میں حضرت جوش سے واقف ہوں، لیکن دور دور سے۔ جب وہ حیدرآباد دکن میں تشریف رکھتے تھے تو اکثر اوقات مجھے ادبی حلقوں اور شہر دکن کی محفلوں میں انہیں دیکھنے کی سعادت نصیب ہوتی رہی۔ اس وقت میری عمر بہت کم تھی۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اہل حیدرآباد حضرت جوش سے بے پایاں محبت رکھتے تھے۔ جس محفل میں وہ جاتے ان کے ہزاروں شیدائی اُن کی آمد میں اپنی آنکھیں بچھا دیتے تھے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد جب اس کا شعبۂ تالیف و ترجمہ قائم ہوا تو ہندوستان کے گوشے گوشے سے چوٹی کے ارباب علم و فضل کو اردو زبان و ادب کی خدمت کے لئے چن لیا گیا تھا جن میں سے پروفیسر وحید الدین سلیم، مولوی عنایت اللہ دہلوی، علامہ عبداللہ عمادی، مولوی علی حیدر طباطبائی، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، پروفیسر الیاس برنی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔ اس کاروان علم کے حدی خواں حضرت جوش بھی ایک رکن رکین تھے۔ برسوں آپ نے شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ میں اردو زبان و ادب کی گراں بہا خدمات انجام دیں، اور اپنی بلند و بہار شخصیت اور گداز اخلاق و طبع سے اپنے ساتھیوں کے دلوں کو موہ لیا تھا۔

قیام حیدرآباد کا زمانہ دراصل حضرت جوش کی زندگی کا ایک رنگین اور درخشاں باب اور ان کی شاعری کے شباب کا دور ہے۔ اسی دوران میں ان کی شاہکار نظمیں وجود میں آئیں۔ اور ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ چونکہ خود حضرت جوش ایک بڑے گھرانے اور معمول خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ریاست حیدرآباد کے امیرانہ ماحول میں وہ بہت جلد گھل مل گئے۔

ریاست کے علم دوست صدر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت اور شہزادہ معظم جاہ کے درباروں میں آپ کی بڑی عزت و توقیر کی جاتی تھی، اور وہ اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ علمی و ادبی حلقوں میں ان کو سر آنکھوں پر بٹھایا

جاتا تھا۔ غرض عوام و خواص میں جو مقبولیت اور شہرت ان کو ملی وہ دوسرے شاعروں کو نصیب نہ ہو سکی۔ حیدرآباد سے واپسی کے بہت دن بعد دلی میں رسالہ "آج کل" کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے، پاکستان منتقل ہونے تک حضرت جوش نے اردو زبان و ادب کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ مجھے کئی بار دلی جانے کا اتفاق ہوا، اور وہاں کے ادیبوں، شاعروں اور یونیورسٹی کے پروفیسروں سے ملاقاتیں رہیں۔ ان اصحاب سے مختلف صاحبان علم و فضل کے متعلق بات چیت رہی، لیکن ان کے دلوں میں حضرت جوش کی جو قدر و منزلت تھی وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ حضرت جوش کی شخصیت اور عظمت کا سکہ ہر ایک کے دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے کوئی بھی ایسا نہیں ملا جس نے ان کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالا ہو۔ ہندوستان کے سارے علمی، ادبی حلقوں میں حضرت جوش کے ترک وطن کو بہت محسوس کیا گیا، بلکہ بعض گوشوں سے سخت ناراضی اور برہمی کا اظہار بھی ہوا۔ میں نے دلی میں بڑے بڑے لوگوں کو بڑے رنج و ملال کے جذبات کے ساتھ یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "حضرت جوش کے چلے جانے سے ہندوستان کے علمی و ادبی ماحول میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ ایک مدت تک پر نہیں ہو سکتا۔"

حضرت جوش پاکستان میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد سے ترقی اردو بورڈ میں شعبہ ادبی و مدیر شعبۂ لغت کے عہدے پر فائز ہیں۔ جب میں بھی اس بورڈ سے منسلک ہوا، تو مجھے حضرت جوش کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس قلیل مدت میں، حضرت جوش کی شخصیت، علمیت اور ان کے شریفانہ برتاؤ سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ ایک میں ہی کیا، ان کا ہر ملنے والا ان کی خوش اخلاقی، وضع داری اور ہمدردی کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ ان کے سینے میں درد بھرا دل ہے جو دوسروں کے دکھ درد کو نہ صرف محسوس کرتا ہے، بلکہ ہر شخص کو اپنا غم سمجھتا ہے۔ حاجت مندوں کے کشودِ کار میں جو کچھ ان سے بن پڑتا ہے کر گزرتے ہیں اور پھر اس کے نتائج و عواقب کی پروا نہیں کرتے۔ حضرت جوش کے دوست احباب کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں ہر طبقے اور مکتب خیال کے افراد شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے بھی ہیں جن کو ان کے معتقدات اور مسلک سے اتفاق نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ ان کے گہرے دوست ہیں۔ نظریات کے اختلاف کے باوجود حضرت جوش کی عالمانہ شخصیت اور شاعرانہ عظمت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، اور بڑے فن کار کی یہی پہچان ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شاعر بڑا لاابالی ہوتا ہے اور کسی قسم کی ذمہ داری اپنے اوپر عائد کرنا نہیں چاہتا۔ اس کی زندگی بے ترتیبی سے بسر ہوتی ہے، لیکن حضرت جوش کی ذات اس سے مستثنیٰ ہے۔ ان کے روزانہ کے معمولات کا ایک باقاعدہ پروگرام ہے جس کی وہ بڑی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ اگر کسی ناگزیر وجہ سے اس پروگرام میں خلل پڑ جاتا ہے تو ان پر ایک حادثہ گزر جاتا ہے۔

سحر خیزی تو ان کی طبیعت ثانی بن گئی ہے۔ ہر روز اپنے مقررہ وقت پر وہ بیدار ہو جاتے ہیں اور چھڑی ہاتھ میں لے کر چہل قدمی کے لئے باہر نکل جاتے ہیں۔ تین میل پیدل چلنے کے بعد طلوع آفتاب کے حسین مناظر سے اپنی آنکھیں روشن کر کے گھر لوٹتے ہیں۔ اس کے بعد سارے کام مثلاً غسل کرنا، داڑھی بنانا، ناشتہ کرنا وغیرہ سب کا ایک وقت مقرر ہے۔ وقت پر سوتے ہیں، وقت پر کھاتے ہیں، اور وقت پر سوتے ہیں۔ بسا اوقات دوسروں سے پہلے بورڈ کے دفتر پہونچ

جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی دفتر کے وقت کے بعد بھی اپنے کمرے میں بیٹھے کام کرتے رہتے ہیں۔ اپنے مفوضہ کام کو بڑی دلچسپی اور انہماک کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ ان کی محویت اور انہماک کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کوئی ان کے کمرے میں داخل ہو جائے تو انہیں خبر تک نہیں ہوتی۔

ان کی میز پر کئی کتابیں کھلی اور بند پڑی رہتی ہیں۔ مختلف کتابوں کو پڑھتے اور کام کی باتیں کاغذ پر لکھتے چلے جاتے ہیں
ان کی تحریر کا بھی ایک خاص انداز ہے۔ ہر لفظ پر اعراب لگاتے ہیں۔

ایک روز میں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ:

> میں یہ نہیں چاہتا کہ کوئی میری تحریر کو غلط پڑھے۔
> اس لئے اعراب لگاتا ہوں۔ اور اب تو اس کا اتنا عادی ہو چکا
> ہوں کہ بغیر اعراب کے ایک سطر بھی نہیں لکھ سکتا

اردو زبان اور اس کی قواعد کے مسائل پر بڑی گہری نظر ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کے بڑے دل دادہ ہیں لیکن کوئی اچھی بات کسی گوشے سے بھی مل جائے تو اسے قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو جب کبھی کوئی لفظ یا زبان کے کسی مسئلے کے سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے تو ہم حضرت جوش کی طرف رجوع ہوتے ہیں، اور وہ بڑے عمدہ طریقے سے اس کی تشریح اور تفہیم کر دیتے ہیں۔

حضرت جوش بڑے عالی ظرف اور بلند حوصلہ انسان ہیں۔ اپنے معاصرین میں جن کو وہ علم و ادب میں بڑے رتبے کا سمجھتے ہیں ان کی دل کھول کر تعریف کرتے ہیں۔ معاصرانہ چشمک اور تنگ نظری سے وہ کوسوں دور ہیں۔ ۳۱ جنوری سنہ ۱۹۵۵ء میں اردو کے منفرد رباعی گو شاعر حضرت امجد حیدر آبادی (جو گذشتہ مارچ میں وفات پا گئے) کا جشنِ الماسی منایا گیا، تو حضرت جوش نے بہ نفسِ نفیس اس تقریب میں شرکت کی اور بھرے جلسے میں حضرت امجد کے بارے میں ان خیالات کا اظہار فرمایا:

> حضرت امجد کا شرف و مجد دراصل اس کا مقتضی تھا کہ ان کی قدر شناسی کی جاتی
> میں آپ تمام حضرات کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے امجد کی جوبلی منا کر اپنے ذوق
> کی صحت اور اپنے ذہن کی شرافت کا کتنا بڑا ثبوت دیا ہے جس کا ذکر ناممکنات
> سے ہے...... اختلافِ مسلک کے باوجود جب میں ان کی رباعیاں پڑھتا ہوں
> اور سنتا ہوں تو جھوم جھوم جاتا ہوں۔ یہ امجد کی شاعرانہ عظمت کا سب سے بڑا ثبوت
> ہے کہ میں بھی ان کے اشعار پہ وجد کرتا ہوں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں اپنے کو
> خدانخواستہ کوئی بڑا آدمی سمجھتا ہوں۔ میرا مقصد اس سے یہ ہے جیسا کہ پہلے عرض
> کر چکا ہوں کہ ان کے اشعار کی معنویت سے غیر متفق ہونے کے باوجود میں ان کے
> اشعار پر سر دھنتا ہوں، اور وہ شاعر جو منکر و مخالف کو بھی داد دینے اور قدر کرنے پر
> مجبور کر دے کوئی معمولی شاعر نہیں ہو سکتا۔ اختلافِ مسلک کی بنا پر میں نے اکثر چاہا کہ
> میں ان کے اشعار سے لطف اندوز ہونا ترک کر دوں، مگر جناب والا جادو وہ جو سر چڑھ کر
> بولے۔ مجھے اس کا اقرار ہے کہ میں اس پر قادر نہ ہو سکا۔

ایک رسالہ کے "شخصیات نمبر" میں اپنے شاعر دوست حضرت فانی مرحوم پر جو مضمون تحریر فرمایا ہے، اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

> ہر چند فانی کے معتقدات، مسلمات، نظریات اور ان کے فلسفۂ حیات سے مجھے کوئی تعلق نہیں، بلکہ دبی زبان سے یہ بھی کیوں نہ کہہ دوں کہ مجھے ان کے نظریات سے اختلاف ہے۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود میں بڑی بلند آہنگی کے ساتھ یہ کہنے پر اپنے کو آمادہ پاتا ہوں کہ فانی ہی وہ شخص تھا جس نے غزل کی سی غیر فطری اور بے معنی صنف کو فطری اور بامعنی بنا دیا۔۔۔۔ فانی باقی رہے گا اور اس کا کلام میرے اور دنیا کے نظریاتی اختلاف کے باوجود محض اس بنا پر زندہ رہے گا کہ اس میں خلوص ولولے اور شعریت کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔

حضرت جوش بڑے نڈر، بے باک اور مستقل مزاج انسان ہیں۔ جس بات کو وہ اپنی دانست میں صحیح سمجھتے ہیں اس کے اظہار کرنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ چاہے ایسا کرنے میں ان کو اپنے مخالفین کا ہدف ملامت بننا ہی کیوں نہ پڑے اور ان کا ذاتی یا مالی نقصان ہو جائے۔ وہ مخالفتوں کی پروا نہیں کرتے، اور اپنی بات پر بڑی ثابت قدمی سے اڑے رہتے ہیں۔ مایوسی اور ناکامی کے احساس کو زندگی کی توہین سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں کامیاب انسان وہی ہے جو ہر حال میں خوش اور پُر اُمید رہے اور اپنے آپ کو حالات اور ماحول کے مطابق ڈھال لے۔

ہمارے اسلاف صدیوں کی محنت و جاں فشانی کے بعد آنے والی نسلوں کے لئے، مشرقی تہذیب و شائستگی کا جو سرمایہ چھوڑ گئے تھے، وہ بڑی تیزی کے ساتھ مغربی تہذیب کے طوفان میں بہا چلا جا رہا ہے۔ حضرت جوش اس دم توڑتی ہوئی تہذیب و شائستگی کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ ان کو اپنی قدیم تہذیبی اقدار کا اتنا خیال ہے کہ وہ کسی قیمت پر بھی انہیں اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اور جب دوسروں کو اس سے کیسر خالی پاتے ہیں تو اُن کو روحانی کرب اور ذہنی کوفت ہوتی ہے۔

گذشتہ جنوری میں حضرت جوش ڈاکٹر زور صاحب کی دعوت پر یوم قلی قطب شاہ کے مشاعرے میں شرکت کے لئے حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تھے۔ اتفاق سے ان دنوں میں بھی وہاں تھا۔ میں نے دیکھا کہ حضرت جوش اپنے قدیم دوستوں سے ملنے کے لئے ہر ایک کے مکان پر تشریف لے گئے۔ حضرت امجد سے دو بار اُن کی قیام گاہ پر ملاقات کی، علامہ حیرت بدایونی اور حضرت نجم آفندی کے گھر گئے۔ اپنے مرحوم دوستوں کے بچوں سے ملے۔ حتیٰ کہ ان محلوں کی بھی زیارت کی جہاں وہ رہتے تھے۔ ان سڑکوں اور مقامات کی بھی سیر کی جو انہیں بے حد پسند تھے۔ پرانے دوستوں سے مل کر ایسے خوش ہوئے گویا اُن کو سب کچھ مل گیا ہے۔ رات دیر گئے تک احباب کی محفلیں جمی رہتی تھیں لیکن ان کے ابرو پر بل نہیں پڑا حالانکہ وہ رات میں جلد سونے کے عادی ہیں۔

آخر میں اتنا اور عرض کروں گا کہ حضرت جوش کی ہمہ صفت موصوف شخصیت کا دیانت دارانہ جائزہ لیتے وقت کسی قسم کے تصنع یا مصلحت کو پیش نظر رکھنا میری دانست میں اظہار صداقت کے منافی ہے۔ چنانچہ اس مختصر سے مضمون میں میں نے حضرت جوش کے بارے میں وہی کچھ لکھا ہے جو دیکھا اور محسوس کیا۔

مبین الحق صدیقی

جوش کی اصول پسندی

حضرت جوش ملیح آبادی سے میری پہلی ملاقات کراچی میں ہوئی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب وہ سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہا کرتے تھے۔ اور کراچی سے مراسلوں میں "از قبرستان کراچی" ۔ جوش مرحوم" لکھا کرتے تھے۔ اس وقت تک جوش صاحب ترقی اردو بورڈ سے وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ اور پاکستان آنے کے بعد ایک اجنبی کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ حضرت جوش سے ملنے کا مجھے عرصے سے اشتیاق تھا۔ چنانچہ مولانا اعجاز الحق قدوسی کی ہمراہی میں جوش صاحب سے میری پہلی ملاقات ان کے مکان پر ہوئی۔ قدوسی صاحب جوش صاحب کے دیرینہ دوستوں میں سے ہیں، اور میرے عزیز بھی ہوتے ہیں۔ قدوسی صاحب کی داڑھی سے مجھے ہمیشہ ڈر لگتا تھا، اور ان کا عجیب قسم کا رعب بحیثیت ایک مولوی میرے دل پر طاری تھا۔ جب بھی وہ میرے گھر پر ملنے آتے تو ان سے سوائے دو چار سنجیدہ باتوں کے کبھی کوئی خاص بات نہ ہوتی۔ لیکن جب انہوں نے جوش صاحب سے اپنی دوستی کے قصے سنائے تو میں نہ صرف مولانا کی باتوں میں خاص دلچسپی لینے لگا بلکہ جوش کی ہمہ صفت موصوف شخصیت کا بھی قائل ہو گیا۔ اس سلسلے میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جوش صاحب کی دوستی دوسرے بڑے مولویوں سے بھی رہی ہے۔ جس زمانے میں جوش صاحب حیدرآباد دکن میں تھے، ان کے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے بھی بڑے مراسم تھے۔ ایک بار چوری چھپے جوش صاحب کی ملاقات کراچی میں بھی مولانا مودودی سے ہوئی۔ مولانا کو شاید ان دنوں پتھری کی شکایت تھی۔ جوش صاحب جب اُن سے ملے تو مولانا نے اپنی پتھری کی بیماری کی شکایت کی۔ جوش صاحب نے ہنس کر جواب دیا:

۔ اللہ میاں تمہارے پرانے گناہوں کی پاداش میں اندر سے سنگ باری کر رہے ہیں؟

پہلی بار جوش صاحب سے نہایت سرسری سی ملاقات ہوئی۔ مولانا قدوسی نے میرا تعارف کرایا، اور حضرت جوش نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ پھر میرے اصرار پر کچھ تازہ کلام بھی سنایا۔ پہلی ملاقات میں ہی ان کی عظمت مآب شخصیت کا میں دل سے معترف ہو گیا۔ اس کے بعد برابر میری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اور ہر بار مجھے ان کے نئے اوصاف کا پتہ چلتا رہا۔

جوش صاحب روزمرہ کے معمولات میں جتنے بااصول واقع ہوئے ہیں، اتنا بااصول کم سے کم میں نے اپنی زندگی میں

کسی شاعر کو نہیں دیکھا۔ جوش صاحب وقت کی پابندی کا سختی سے خیال رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ جوش صاحب کو ہمارے ایک دوست نے دو پہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ اور جوش صاحب نے انہیں تقریباً گیارہ بجے کا وقت دیا۔ انہوں نے اعلیٰ پیمانے پر دعوت کا انتظام کیا۔ اور اپنے بہت سے احباب کو اس تقریب میں مدعو کیا۔ اتفاق سے وہ حضرت انتظامات میں ایسے معروف ہوئے کہ بارہ بج گئے اور وہ تقریباً بارہ بجے جوش صاحب کو لینے کے لئے روانہ ہوئے۔ جب وہ جوش صاحب کے مکان پر پہونچے تو دیکھا کہ وہ میرزا عالمگیر قدر کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے (مرزا صاحب جوش صاحب کے عہد طفل کے دوستوں میں سے ہیں۔ ان کی دوستی اس زمانے سے ہے جب جوش صاحب کانوں میں دُر ڈالے جرنیلی ٹوپی اوڑھے اور کالی شیروانی پہنے مرزا صاحب کے ساتھ لکھنؤ میں گھوما کرتے تھے۔ اور آج بھی مرزا صاحب سائے کی طرح اُن کے ساتھ رہتے ہیں) جوش صاحب کو ہمارے دوست نے لاکھ منایا اور بے حد خوشامد کی۔ مگر جوش صاحب کسی طرح دعوت میں شرکت کے لئے تیار نہ ہوئے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ

"پابندیٔ وقت آپ پر لازم تھی۔ میں آپ کا ایک گھنٹے تک انتظار کرتا رہا"

چنانچہ وہ حضرت مایوس ہو کر لوٹ گئے اور تقریب کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔

جوش صاحب طبعاً بڑے خود دار اور وضع کے پابند ہیں۔ جس شخص سے بھی ان کے مراسم ہو جاتے ہیں۔ وہ ان مراسم کو ہمیشہ نباہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وقت پڑنے پر دوستوں کی مدد، ان سے ہمدردی اور سچی رفاقت کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔ پرخلوص اور بے لاگ دوستی اُن کا مسلک ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت حساس بھی ہیں۔ اور ہر چھوٹی بڑی بات کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم ان کے چہرے کی بشاشت سے ان کے احساس و غم کا اندازہ نہ لگا سکیں۔ اور یہ معلوم کرنے سے قاصر رہیں کہ ایک شاعر جو بظاہر بشاش نظر آتا ہے اندر سے اس کا دل کتنا مغموم و آزردہ ہے۔

ایک دفعہ حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ان کے ایک پرانے ملاقاتی اور دوست جو ایک بڑے آفیسر بھی تھے آئے ہوئے تھے۔ جوش صاحب کو جب ان کے متعلق علم ہوا تو انہیں ٹیلی فون کیا اور ملنے کا وقت لیا۔ شاید وہ صاحب اس وقت نہا رہے تھے۔ اس لئے ٹیلی فون پر نہ مل سکے۔ دو تین گھنٹے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ دورے پر چلے گئے۔ جوش صاحب کو ان کے اس رویئے سے سخت کوفت ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے ان صاحب کو خط لکھا، اور ان کے اس رویئے کی سخت مذمت کی۔ مجھے نہیں معلوم کہ خط کا انہیں کیا جواب ملا۔ لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ جوش صاحب دوستوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو کس شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

جوش صاحب کا ایک اور واقعہ بھی خاصا دلچسپ ہے۔ جوش صاحب جس زمانے میں دلی میں تھے اس زمانے کی بات ہے۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ اور وہ مسوری گئے ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں پنڈت نہرو بھی مسوری میں مقیم تھے۔ جوش صاحب نے ان کے پرسنل سکریٹری کو ٹیلی فون کیا کہ وہ پنڈت جی سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ سکریٹری مدراسی تھا۔ اور جوش صاحب اور اردو زبان سے زیادہ واقف نہ تھا۔ اس نے افسوس کا اظہار کیا کہ پنڈت جی کا پروگرام طے شدہ ہے اور وہ بہت مصروف ہیں۔ جوش صاحب کو برا لگا۔ اور بات آئی گئی ہوئی۔ چند روز کے بعد پنڈت جی کو معلوم ہوا کہ جوش صاحب بھی مسوری آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی صاحبزادی اندرا گاندھی سے کہا کہ ان سے کوئی

وقت متعین کر کے انہیں مدعو کریں۔ جوش صاحب تو بھرے بیٹھے تھے۔ انہوں نے اس مدراسی سکریٹری کے رویے کی سخت شکایت کی۔ اور کہا

"جب پنڈت جی کو مجھ سے ملنے کی فرصت نہیں تو میں بھی مصروف ہوں اور نہیں مل سکتا!"

مسز اندرا گاندھی نے انہیں سمجھایا کہ یہ غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے۔ اس مدراسی سکریٹری کو آپ کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا، اور نہ اس نے پنڈت جی کو آپ کے متعلق کچھ بتایا۔ اور اس غلطی کی معافی مانگی۔ تب جوش صاحب بڑی مشکل سے چلنے کو تیار ہوئے اور دعوت قبول کی۔

جوش صاحب کے پاکستان آتے ہی ان کی مخالفت شروع ہوگئی۔ اس مخالفت میں ان کے کئی دوست نما دشمنوں کا ہاتھ تھا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے کبھی اور کسی موقع پر اوچھے ہتھیار استعمال نہیں کئے اور اپنے بدترین دشمنوں کو بھی ہمیشہ معاف کر دیا۔ اسے ان کی وسعت قلبی کہیئے یا اعلیٰ ظرفی کہ انہوں نے ساری زندگی میں کبھی کسی کی برائی نہیں کی۔ چنانچہ کراچی آنے کے بعد مخالفانہ سرگرمیوں کا بھی انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔۔ ہاں انہیں رنج ضرور ہوا۔۔۔ پھر جب اس زمانے میں سربراہِ مملکت اسکندر مرزا سے اُن کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے بڑی جرأت کے ساتھ ذیل کی رباعی لکھ کر اسکندر مرزا کو پیش کی۔

میں آتے ہی تجھ پہ جو نہیں چھایا ہوں
میں جوشش کو ہمراہ نہیں لایا ہوں
اے خسروِ ذی جاہ تری محفل میں
شبیر حسن خاں کی طرح آیا ہوں!

اس سے اُن کی خودداری، عزتِ نفس اور کردار کی بلندی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جوش صاحب کی زندگی میں ہاتف غیبی کو بھی بڑا دخل ہے۔ اس سلسلے میں چند واقعات کا اظہار خالی از دلچسپی نہ ہوگا حال ہی میں جوش صاحب نے اپنے ایک دوست زیبا ردولوی صاحب کی بیگم کے متعلق کہا کہ ہاتف غیبی جیسے ان سے کہہ رہا ہے کہ دو تین روز میں زیبا صاحب کی بیگم کا انتقال ہو جائے گا۔ اور واقعی دو تین روز بعد ان کی بیگم کا انتقال ہو گیا۔

ایک اور موقع پر جوش صاحب ہمارے ساتھ حیدر آباد گئے۔ راستے میں جوش صاحب کا ہاتف غیبی بول اُٹھا کہ رٹز ہوٹل میں جگہ نہیں ملے گی۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ اور ہم لوگوں کو اندلس ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا۔ اندلس ہوٹل میں بھی جوش صاحب کے ہاتف غیبی کا کمال دیکھنے میں آیا

اس ہوٹل کے منیجر نے جوش صاحب کی بڑی آؤ بھگت کی۔ ہم لوگ میرپور خاص کے مشاعرے میں جا رہے تھے۔ ہوٹل کا بل ادا کر کے جب ہم لوگ روانہ ہونے لگے تو ہوٹل کے منیجر صاحب، جو جوش صاحب کے آگے پیچھے بچھے جا رہے تھے نہایت عقیدت سے کہنے لگے کہ:

"واپسی میں سرکار یہیں قیام فرمائیں۔ اور آپ سب ہمارے مہمان ہوں گے"

جوش صاحب نے بہت منع کیا۔ لیکن وہ حضرت نہ مانے۔ بلکہ یہ بھی فرمانے لگے کہ آپ کے اگر کچھ اور دوست احباب ہوں تو انہیں بھی یہیں ٹھہرائیں۔

جب ہم میرپور خاص روانہ ہو گئے، تو جوش صاحب کے ہاتف غیبی نے پھر صدا دی کہ یہ منیجر صاحب یا تو نوکری سے علیحدہ کر دیئے گئے ہیں، یا ایک دو روز میں جب ہم واپس لوٹیں گے علیحدہ کر دیئے جائیں گے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

جب ہم میرپور خاص کے مشاعرے سے لوٹے تو منیجر صاحب ہمیں دیکھ کر بڑے سٹپٹائے۔ وہ تو یہ سمجھے تھے کہ یہ حضرات اب کہاں واپس لوٹیں گے۔ لیکن ہم کو دوبارہ ہوٹل میں پا کر منیجر کا متغیر چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ اس بیچارے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔

ہم لوگ دل میں ہنس رہے تھے کہ یہ بے چارہ شاید یہ سمجھ رہا ہے کہ اب ہم اس کی دعوت پر ہی ہوٹل میں آئے ہیں، اور اب اُس کی خاصی حجامت ہوگی۔ بہرحال اس کی حالت اس وقت قابلِ رحم تھی۔ دوسرے روز صبح جب ہم لوگ ہوٹل کا بل ادا کر کے کراچی روانہ ہوئے تو ہمیں منیجر نظر نہ آیا۔ ہم نے سوچا کہیں گیا ہوگا۔

کافی دنوں کے بعد اس سے کراچی میں اتفاقاً ملاقات ہوگئی۔ تو اس نے بڑی شرمندگی کا اظہار کیا اور بتایا کہ اسی روز اسے مالکوں نے نوکری سے علیحدہ کر دیا تھا۔ اس طرح جوش صاحب کے ہاتف غیبی کی تیسری پیش گوئی بھی صحیح ثابت ہوئی۔

آخر میں حضرت جوش کی ایک ایسی تحریر کے اقتباس پر اپنے ان تاثرات کو ختم کروں گا جس سے جوش صاحب کی افتادِ طبع، اصول پسندی، خود اعتمادی اور ان کے باغیانہ مزاج کا صحیح طور پر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں،

> "جب میرے خیالات و اقوال کا کارواں نئے راستے پر آہستہ آہستہ گامزن ہونے لگا تو میرے مرحوم باپ کو سخت اندیشہ پیدا ہو گیا کہ میں گمراہ ہو جاؤں گا انہوں نے مجھے بڑی نرمی اور احتیاط کے ساتھ سمجھانا، اور ایک مدت تک سمجھانے سے تنگ آ کر دھمکانا شروع کر دیا۔
>
> مگر مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور آبائی عقائد و روایات سے میری بغاوت بڑھتی ہی چلی گئی۔ جس کا نتیجہ ہوا کہ میرے باپ نے وصیت نامہ تحریر فرما کر میرے پاس بھیج دیا کہ اگر اب بھی میں اپنی ضد پر قائم رہوں گا تو وہ اس وصیت نامے کو جس میں انہوں نے مجھے جائیداد سے محروم کر کے میرے نام صرف سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا، رجسٹری کے آہنی صندوق میں داخل کر کے میرے مستقبل کو زندانِ محرومی میں ہمیشہ کے لئے مقفل فرما دیں گے۔
>
> لیکن مجھ پر اس کا بھی مطلق اثر نہیں ہوا۔ اور یہ وصیت نامہ اس کے دوسرے دن ہی لکھنؤ کے ڈسٹرکٹ جج کے صندوق میں بند کر دیا گیا۔
>
> لیکن چھ ماہ بعد جس وقت کہ میں اپنے کمرے میں دوپہر کے وقت ایک عجیب خواب دیکھ رہا تھا، ماما نے مجھے جگایا اور کہا:
>
> "میاں بلا رہے ہیں"

(باقی صفحہ ۲۶۷ پر)

عبدالحلیم انصاری (آرٹسٹ)

جوش جوان ہے

کراچی کے ماہنامہ "افکار" کا "جوش نمبر" حضرت جوش ملیح آبادی کی پینسٹھویں سالگرہ کی تقریب منا رہا ہے۔ ہم اس ہنگام مسرت و شادمانی پر حضرت جوش کی خدمت گرامی میں پرخلوص ہدیۂ تہنیت و تبریک پیش کرتے ہیں اور جناب صہبا لکھنوی مدیر و ناظم افکار کو بھی مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔ جن کا یہ اقدام نیک زندہ پروری کی زندہ مثال ہے۔ زندوں کے کام زندگی ہی میں ہونے چاہئیں۔ یہ ایک دل خوش کن اور حیات افزا تصور ہی نہیں، بلکہ قدردانی کا صحیح جذبہ اور شعور جوہر شناسی کا ثبوت ہے۔

زندوں کی زندگی میں قدردانی علامت ہے کسی قوم کی بیداری، احساس زندگی اور تعمیر خودی، — جس زندگی یا جس معاشرے کے اندر احساس حیات اور عرفانِ خودی کا شرارہ نہ ہو، اُس کو زندہ کہنا کب درست؟

عزت مآب شاعرِ انقلاب!

جوش شاعر انقلاب ہے اور انقلاب کا دوسرا نام شباب ہے۔ اس نسبت سے اگر ہم انقلاب کو عنوانِ شباب یا عنفوانِ انقلاب قرار دے لیں تو شباب حیات کی ایک اچھی سرخی یا تشریح ہو سکتی ہے۔

دنیا لاکھوں کروڑوں برس بوڑھی ہوتے ہوئے بھی جوان رہتی اور جوان کہلاتی ہے۔ اُس کے دانت کبھی گرتے نہیں۔ اس کے بال کبھی جھڑتے نہیں، اور نہ کبھی سفید ہوتے ہیں۔ نہ کبھی وہ خضاب لگاتی اور نہ کبھی اُس نے وسمہ کا استعمال کیا۔ جو آج کے سائنس سے بہت پہلے کی چیز ہے۔ پھر بھی اس کا حسن اسود، اپنی چمک دمک میں کوبرا پالش سے کسی طرح کم نہیں، اور اس کی شکیں لٹیں ایک حسین ناگن کی طرح بل دار و طرح دار سے بلا شبہ اس کا ناگن نما جوبن اور فریب کناں تبسم کتنا حسین دلکش اور من موہن!

عبدالحلیم انصاری

انقلاب اپنی آتشیں حرارت سے گردشِ دوراں کو کبھی تیز، کبھی تیز تر کر دیتا ہے کبھی انقلاب کی گرم و تیز آندھیاں کرۂ ارضی سے ٹکراتی ہیں، اور کبھی ایتھر کی لہریں اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔

انقلاب کی حرکت یا برکت سے نہرِ حیات کا قافلۂ امواج رواں دواں چلتا ہے۔ اور یہ بھی ایک مسلمہ ہے کہ انقلاب کی آغوش میں ہر عزم جواں ہوتا ہے، ہر حوصلہ بلند اور ہر جذبہ قوی ہوتا ہے ؎

نوائے عشق نہ کرتی اگر حدی خوانی
نہ کارواں نہ کوئی میرِ کارواں ہوتا (جوش)

مطالعۂ کائنات کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے مجھے تجربہ ہے کہ انقلاب کبھی بوڑھا نہیں ہوتا، اور نہ کبھی کمر خمیدہ ہوتا۔ اِن دونوں لفظوں کا استعمال اس کی شانِ خود اعتمادی کے خلاف اور اس کی فطرت خود مختاری کے متضاد ہے۔ تو پھر جوش کو بوڑھا کیوں مانا یا سمجھا جائے جب کہ بذاتِ خود وہ پیکرِ انقلاب اور خالقِ شباب ہے۔ کم از کم میں تو اُس تصویرِ شباب و استقلال، اُس کوہِ سطوت و جلال اور اس قوتِ تخلیق و اجتہاد کو بوڑھا ماننے کے لئے تیار نہیں۔

دنیائے محیط میں رہ کر میں نے جس طرح اس دنیا کا تجربہ کیا ہے، حلقۂ جوش میں رہ کر اس جہانِ صبا و جام کا بھی مطالعہ کیا ہے یعنی عالمِ شباب و شاب کا۔

جب وہ خود کہہ رہا ہے ؏

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب

ایسی صورت میں شباب پر شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ البتہ تغیر کے لفظ سے دھوکہ ہو سکتا ہے، لیکن اگر انسان تغیر کے فلسفے کو سمجھ لے تو اس کا ذہن جلد اس الجھن سے آزاد ہو سکتا ہے۔

ہر تغیر تمدن کا دم بھرتا ہے۔ اور زندگی کے ساتھ اپنا رابطہ ظاہر کرتا ہے۔ تعمیر اور تخریب تغیر کے پہلو ہیں اور زندگی کتاب ہے تغیر و انقلاب کی۔

زندگیوں کا تغیر سے نیچرل رابطہ ہے۔ بعض حالات میں، "اَن نیچرل" اور غیر صحیح رابطہ بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف اوضاع و الوان اور مختلف فیشن و شائل کے ملبوسات حتیٰ کہ متروکات تک انقلاب کے توشک خانے میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ انقلاب کے توشک خانے کی وسعت کا اگر اندازہ لگایا جائے تو "عمر عیار کی زنبیل" سے طویل ہی اس کو سمجھا جاتا ہے۔

مہتمم توشک خانہ وقت اور ماحول کے لحاظ سے رعایتِ رنگ اور تناسبِ قامت کا خیال رکھتے ہوئے اہالیانِ زمان و مکاں کو جو لباس و پوشاک عطا کرتا ہے ان پر انقلابِ وقت کی مہریں ثبت ہوتی ہیں۔ اُس کے پوشاک گھر اور انقلاب نگر میں پراچین کال کے کلچرل اور تہذیبی آثار ہوتے ہیں اور پرانی ریت رواج کی چیزوں کا وافر ذخیرہ!

جب دنیا اپنی عمر کی کروڑوں منزلیں طے کرنے کے باوجود جوان ہے تو ہمارا شاعر انقلاب باسمِ شباب اپنے سفرِ حیات کی ۷۵ ویں منزل پر بوڑھا کیوں؟ مزید یہ کہ وہ رند ہے اور رند بحکم پیرِ مغاں ہر وقت جواں ہے۔ پیرِ مغاں — شہنشاہِ رندانِ جہاں ہے، اور قبلۂ حاجاتِ مے کشاں۔ اس لئے اس کے حکم کے آگے تمام رندانِ جہاں کے سرِ تسلیم خم — اور

خم کے خم جس کے حضور میں بصد تعظیم نذر۔
جس کی ذات "منجملۂ ارباب کرامات" جس کی بات - مایۂ صد فخر و مباہات" جس کا جام "بمنزلۂ آبِ حیات"
جب جام اُس کا آبِ حیات تو پھر زندگی اس کی حیات ہی حیات، شباب ہی شباب!
اس کے بربطِ دل کا نغمہ فضاؤں کی لہروں میں بھی اور قلم کے پردوں پر بھی رقصاں و شاداں ہے
اُس کے نغمۂ شباب سے فضا جواں، اُس کے نعرۂ انقلاب سے حیات جواں
جوانی کا اظہار اور سرخوشی مژدۂ جاں فزا ہے۔ جو کشف و کرامات ہے جامِ جہاں نما اور جہانِ شباب نما کا
ط　مژدہ اے جوش تمنا کہ جوانی آئی
لیکن یہ جوشِ تمنا، تمنائے جوش کے سوا کچھ نہیں ـــــ اس لئے جوانی حیاتِ جوش کی نشانی ہے "دوامی" اور حیاتِ جاودانی!

شاعرِ اخلاق

سالہائے گذشتہ کی بات ہے کہ میرا قیام دہلی میں مستقل طور پر سنہ ۵۱ء تک رہا۔ اس دوران میں جوش صاحب سے ملاقات اور ملاقات کے بعد ہی افادات کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ پہلی ہی ملاقات میں جوش صاحب کے اخلاق، تپاک، متانت اور شائستگی نے مجھ پر گہرا اثر کیا۔ میں وقتاً فوقتاً ملتا رہا۔ اور ان نشستوں میں حضرت جوش کے متعدد دیکھے اور سیکھے۔ اور اس بلند پایہ شخصیت کی زندگی کے مختلف گوشوں کا غائر اور عمیق جزء مطالعہ کیا۔ اس طرح اس شاعرِ انقلاب اور شاعرِ ملیح آباد کو قریب سے دیکھنے سمجھنے اور اس کے شاعرانہ و عالمانہ کمال سے بہرہ اندوز ہونے کے بیش از بیش مواقع ملے۔

گاہے گاہے ملتے ملتے موصوف کے اخلاق کے نقوش میرے صفحۂ قلب پر مرتسم اور گہرے ہوتے گئے۔ اور باہمی اخلاص دارتباط میں حسن و استحکام بڑھتا گیا۔ اس استادِ شعر و سخن اور نقادِ فن و ادب نے ناچیز کی تخلیقات کی قدر کی۔ اور اپنے خود نوشتہ اشعار و قطعات ازراہ مہربانی عنایت فرما کر، اور ہر مکتوب کو تحریر کے نام کے ساتھ منسوب کر کے اسے اُن عطیات و نادرات کا اہل قرار دیا۔

حضرتِ جوش پر جب میں نے مضمون لکھنے کا ارادہ کیا ہے تو جوش میری نظر میں ایک دل کش تصویر اور ایک دلچسپ موضوع رہا ہے ایسا موضوع کہ جب میں اس پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں تو اس کے اندر سے کتنے مضمون پھوٹ نکلتے ہیں تب مجھے معلوم ہوا کہ جوش بذاتِ خود مخرج ہے گوناگوں موضوعات کا ـــــ ایسی حالت میں میں نے اپنے کو حیران و ششدر پایا کہ کون سا موضوع اختیار کروں اور کون سا نظر انداز کروں ؎

مشکل حکایتیست کہ ہر ذرہ عین اوست
اماں نمی تواں کہ اشارت بلو کنند

جوش شاعرِ اعظم ہے۔ شاعرِ اعظم کی شخصیت کے کتنے ہی حسین، روشن اور درخشاں پہلو ہیں [illegible] کے شلمت روشن مسائے بھی۔

شعر و شاعری سے متعلق اس کی کتنی خوبیاں اور ملکاتِ شاعری کی جولانیاں میرے لئے کشش کا باعث رہی ہیں، کتنے فنی اقدار اس کے نام کے ساتھ خلعتِ شاعری پر چمک رہے ہیں، اور اس کا دامن زرنگار تہذیبی قدروں سے مالامال ہے۔

میری نظر میں جوش کی حیات کا سب سے حسین پہلو اس کا حسنِ اخلاق ہے۔ اور یہی اس کی شخصیت کا وہ دلکش و دلفریب پہلو ہے جس سے مجھے سب سے پہلے سابقہ پڑا۔ میں اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جوش خلاق حرف و معنی کے علاوہ شاعرِ اخلاق ہے۔ دیگر کمالات شعر و شاعری کے باوجود جوش کا اخلاق اپنی جگہ پر خود ایک کمال ہے جو تمام کمالات پر فائق ہے۔ یہی انسان کا وہ جوہر ہے جس کے بغیر کوئی انسان صحیح معنی میں انسان بن سکتا ہے نہ شاعر، نہ عارف، نہ ادیب، نہ معمارِ قوم، نہ مصلح عالم!

جس انسان میں یہ جوہر نہ ہو خواہ وہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو مگر اس کا درجۂ انسانیت مشتبہ رہتا ہے۔ اسی لئے انسانیت کی پرکھ اور تشخیص ہوتی ہے۔ اور انسان کا شرف، وقار اور مرتبہ معلوم ہوتا ہے۔ میرے نزدیک جوش ایک بڑا شاعر ہی نہیں بڑا آدمی بھی ہے!

میں نے جوش کو صادق، مخلص اور صاف دل پایا۔ میں نے تجربہ کیا کہ وہ زاہد کی طرح ریاکار نہیں۔ لیڈر کی طرح سیاہ کار نہیں۔ تاجر کی طرح ایمان دار نہیں!

میں حیران تھا یہ سمجھ نہیں کہ ان کا دل اس قدر صاف کیوں ہے۔ جب کہ بعض تزکیہ نفس والوں کے کتنے ہی قلوب زنگ آلود! عرصے تک میں یہ راز نہ پا سکا۔ آخر کار ایک عارف نے مجھے اس بھید کا پتہ دیا ؎

دارد اگر صفائے دل از شراب دارد
روشن تر است شیشہ وقتیکہ آب دارد

مے خواروں کا وہ مست الست اور دکان ذوب کا بادہ فروش اور سِرِّ خدا سے آگاہ! بلا شبہ جوش رمز شناس عارف اور اسرارِ فطرت کا راز داں ہے اور میں نے اس کو آیاتِ فطرت کا بڑا مفسر پایا ہے!

جوش حق گو، صاف گو، بے باک گو اور آزاد گو شاعر ہے۔ جو بات کہتے ہیں وہ کبھی اور کہیں چوکتا نہیں۔ اس نے "خانقاہی مشن" کا پردہ چاک کیا۔ اور کسی "دیسی گورنر" کی بھی پردہ داری روا نہ رکھی۔ وقت کا کوئی دارا ہو کہ جمشید ہو کوئی سکندر ہو ؎

"آئینہ عیب پوش سکندر نمی شود!"

کے مطابق جوش نے جو کچھ کہا منہ پر کہا، برملا کہا، تن کر کہا، گونج کر کہا، برس کر کہا۔

جوش صاحب کے پاس بیٹھنے اٹھنے میں مجھے کئی بار ساتھ ساتھ کھانے پینے کے موقعے بھی پیش آئے ہیں جن کو میں یہاں بہ نظرِ احتیاط "ہم نوالہ و ہم پیالہ" نہیں لکھ رہا تاکہ "ہم پیالہ" کا مطلب "ہم جام" نہ سمجھ لیا جائے۔

میں جوش صاحب کے پاس اپنی نشستوں کا شمار نہیں کرا سکتا لیکن پنج سالہ پلان کے مطابق میرے پنج سالہ قیام میں جوش صاحب سے ملنے جلنے کے جتنے موقعے ملے ان کو شمار کرنا بے معنی اور غیر ضروری سمجھا۔ میں

جوش صاحب کے پاس تنہا بھی بیٹھا ہوں اور حلقۂ احباب میں بھی۔ کتنی ہی چیزیں میرے علم و مطالعہ اور مشاہدے میں آئی ہیں — سرکاری و نیم سرکاری باتیں بھی اور کچھ نجی حال احوال بھی۔

باتیں کتنی پرلطف لیکن بے تکلف! اب وہ باتیں خواب ہیں اور ٹیلیفون تک پہنچے جیسے ہوا!

طبیعت سادہ باتیں سادہ۔ بعض وقت اتنی سادہ اور دلچسپ جیسے گفتار معصومانہ!

باتوں میں بناوٹ بالکل نہیں، اس لئے حلاوت زیادہ!

بااخلاق، بامروت، باوضع، باوقات — خوش پوش، خوش نوش، خوش مذاق، خوش مزاج، اور بوقت نیچ بذلہ سنج!

شریف نواز، ایثار کردار، حساس، خوددار اور سلیقہ پسند!

انسان کی عزت کرنے والے — حتیٰ کہ دفتر کے چپراسی، چوکیدار اور قاتل بردار کے ساتھ نرمی اور اخلاق کا برتاؤ، اور ان پر حاکمانہ نہیں عاطفانہ نظر!

دوستوں پر شدید بھروسہ کرنے والے۔ انجام سے واقف لیکن فطرت سے مجبور!

ان کی مجلس ان کی شاعری کی طرح معیاری ہے۔ آج کی تہذیبی دنیا اور تخریبی ماحول میں کہاں یہ بساطِ تہذیب و نشاط؟ بلاشبہ ان کی مجالس و اجلاس ایک ادارۂ علمیہ سے کم نہیں۔ کوئی بصارت و بصیرت رکھنے والا کتنی روشنی اور علم و عرفان کا سرمایہ لے کر اٹھ سکتا ہے۔

اپنی ہر مجلس و نشست میں تہذیبی شائستگی کا بڑا خیال رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص آدابِ مجلس سے ناواقف ہوا یا کوئی حرکت خلافِ تہذیب ہوئی یا کوئی بات گری ہوئی، تو میں نے جوش صاحب کے چہرے پر ناگواری کے آثار دیکھے ہیں۔ اور بعض وقت ضبط کی حد سے گزر کر مجلس میں تنبیہ کرتے بھی دیکھا ہے۔

اسی طرح ایک دوسری بات جو ان کے لئے قابلِ برداشت نہیں، یہ کہ غلط تلفظ کے ساتھ الفاظ بولنا، اس سے ان کو بڑی چڑ ہے۔ الفاظ کی غلط ادائیگی سے ان کے کان میں خراش پیدا ہوتے میں نے محسوس کیا ہے۔ ان کے چہرے کے رنگ کے تغیر سے۔

جب کوئی عبارت یا اشعار لکھتے ہیں تو جابجا حرفوں پر اعراب لگا دیا کرتے ہیں۔ جب میں نے اپنے کچھ "افکار" بغرضِ ملاحظہ سامنے رکھے تو صاحب عبارت کہیں کہیں زیر زبر لگاتے گئے۔ یہاں تک کہ ڈاک کے لفافے اور کارڈ تک جو میرے پاس موجود ہیں [illegible] حرکات کے مرہون ہیں۔

[illegible] بیان میں میں نے جوش صاحب کے ساتھ اپنے ذاتی روابط اور ان کے ذاتی محاسن کا ذکر کیا ہے۔ ان کی شاعری پر کچھ نہیں لکھا۔ نہ ان کے ہنگامہ خیز پیغامات پر، نہ اعلانِ بغاوت پر، نہ دعوتِ انقلاب پر، نہ ان کے زورِ قلم [illegible] پر، نہ تنقید و تبصرہ پر۔ البتہ ان کے کلام پر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ،

كلامك كمالك

اور اُن کا بیان سحر ہے!

تنقید و تبصرہ ناقدینِ شعر و سخن کا کام ہے۔ اور اربابِ علم و ادب کا۔ مجھے اپنی بے مائیگی اور کمزوری کا اعتراف ہے کہ مجھ میں

اہلیت نکتہ چینی نہیں۔

وہ بزرگ میری نظر میں محترم اور قابلِ قدر ہیں جن کو جوش صاحب کی خدمت اور جلوت و خلوت میں مجھ سے زیادہ قرب و شرف حاصل رہا ہے۔ لیکن مجھے زیادہ مسرت اور خوشی اس بات کی ہے کہ میں نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر ایک تاریخی دستاویز مرتب کی ہے جو تاریخ کے طالب علم کے کام آسکے اور مستقبل کا مورخ اس سے استفادہ حاصل کر سکے۔

اس عظیم شخصیت کا گہرا مطالعہ کرکے تا پیرہنِ اس کی زندگی کے روشن و تابناک اور انقلاب پرور زاویوں کی ترتیب و نگارش کے ذریعے ایک شاہکار تیار کیا ہے۔ برائے نذرِ مستقبل۔

جس زمان و مکاں کو مستقبل کہتے ہیں یقین ہے وہاں اس کی قدر و پذیرائی ہوگی۔ کیوں کہ وہ مستقبل کا شاعر ہے۔

میں پھر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ موقعے کے رواں دواں لمحات ہمیشہ وقت کے ہم رکاب سفر کرتے ہیں اور وقت کا کبھی ٹھیراؤ نہیں وہ مسلسل رفتار ہے۔ لیکن حالتِ رفتار ہی میں وقت کی گرفت ایک بڑی صفت جابکدستی مصورانہ کام ہے۔ میں نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ وقت کی بروقت گرفت کا نتیجہ ہے۔

جوش صاحب کے خدوخال کے پنسل اسکیچ کے بعد یہ کیریکٹر اسکیچ ہے۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ بزبانِ نقش و حرف، آرٹسٹ کا بیان ہے۔ آرٹسٹ کا ہر نقش اس کا ترجمان ہوتا ہے اور وہی اس کا پیغام یا بیان۔ لہٰذا آرٹسٹ اپنی زبان میں اپنا بیان پیش کر رہا ہے۔ ؎

حدیثِ عشق بیاں کن بہر زباں کہ تو دانی

اور چونکہ یہ میرا ذاتی مطالعہ اور مشاہدہ ہے۔ اس لئے ؎

حدیثے سراسر بیانِ وقوع
نگویم بتواز زبانِ وقوع

کچھ اسکیچوں کے بارے میں

میں نے حضرت جوش کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ بہت دلچسپی سے دیکھا ہے، اور بہت قدر و عزت سے دیکھا ہے، مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھا ہے مختلف اوقات میں دیکھا ہے، اور مختلف رنگ میں دیکھا ہے۔ اوقات کا اختلاف اور الوان کا عکس قدرتی طور پر حالات و انداز پر ضرور پڑتا ہے۔ اس قدرتی اثر کو اخذ کرنا یا ضبطِ قلم کرنا کا رِفن ہے۔

جوش کا مطالعہ میرے نزدیک صرف تحریرات کا مطالعہ نہیں ہے۔ جوش میری نظر میں "محشرِ خیال" ہے۔ میرے نزدیک جوش ایک کتاب بھی ہے اور مرقع بھی۔ کتاب "حرف و حکایت" اور مرقع "نقش و نگار"

جہاں میں نے جوش کے خدوخال کے نقوش سپردِ قلم کئے ہیں اس کے کردار کے نقوش بھی محفوظ کئے ہیں۔ یعنی یہ کہ جہاں میں نے اس کی شبیہہ کشی کی ہے کردار کشی بھی کی ہے ـــ میں نے جوش کو دیکھا ہی نہیں ہے آرٹسٹ کی نگاہ سے بلکہ اس کو پڑھا بھی ہے عارف کی آنکھوں سے۔

جوش کے مطالعے میں چند دن، چند ہفتے یا چند مہینے ہی نہیں بلکہ "پنج سالہ پلان" کا ایک عرصہ تمام صرف ہوا ہے کہ جس مدت میں تعمیرِ نو کے ہزاروں خاکے اور منصوبے تکمیل کو پہونچے ہیں میں نے اپنے بہت سے ذہنی خاکوں میں رنگ بھرا

ہے اور بہت سی مفید چیزیں حاصل کی ہیں، جو تعمیر حیات کے مقصد میں کام آسکیں، یا کم از کم زندگی کی ارتقا، شناس بن سکے۔

جوش ایک ادارۂ عالیہ ہے اور ایک جامعہ ہے شعر و فلسفہ، ادب اور عقلیت پسندی کا۔ یقیناً وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کے فنون وادب اور "جنون و حکمت" پر ریسرچ کا کوئی ذہین و ہوش مند اسکالر ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کر سکتا ہے۔

اہرام جوش!

ملیح آباد

جوش
کے
مقدر کا مثلث

کراچی　　　　دہلی
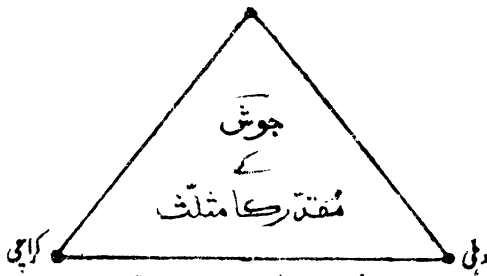
ج۔ و۔ ش۔ کے تین حرفوں کا مرکب ایک مثلث کی شکل بناتا اور جوش کے دورِ حیات کا احاطہ کرتا ہے شاعر انقلاب کو انقلاب آزما مراحل سے گذار کر فیصلہ کن مستقر پر پہونچاتا ہے۔ یہ تین نقطے جس زاویے کی تشکیل کرتے ہیں وہ جادہ ہائے منزل کے موڑ بھی بتلاتے ہیں اور ارتقائے حیات کا نقطہ بھی!

میرے نزدیک جوش کی فکر کے زاویے مصر کے اہرام کے مماثل ہیں۔ اس لئے ہم ان کو "اہرام جوش" کا نام دے سکتے ہیں اور "پاک اہرام" بھی کہہ سکتے ہیں۔ تاکہ حضرت جوش کا تاریخی وجود فن کی عظمت و بلندی کے ساتھ آثار قدیمہ کی حیثیت سے درخشاں اور قائم رہے۔

وہ جوش جس کی سحر طراز قلم نے آج کے "فرعونی تماشاگروں" کے لئے "عصائے موسیٰ" کا کام کیا اور جس کی صدائے حق نے آج کی طاغوتی طاقتوں کے لئے "ضرب کلیم" کا!

وہ جوش جس نے باطل کے طلسم توڑے اور ان کے پرخچے اڑا دئے۔ جس نے نخوت و پندار کے کتنے خود سر بُت غرق نیل کئے۔ کتنے سحر و دجل کے عمل ایک پھونک میں اڑا دئیے اور کتنے مکر و فریب کے حسین و رنگین جال تار تار کر دئے۔ تارہائے رنگیں کا انتشار انقلاب کے خاکوں میں تار عنکبوت کی طرح لرزاں ہے آج بھی۔

انقلاب کی ہوا کے ڈر سے یا شاعر انقلاب کے پیام کی دہشت سے۔

اُس کے قلم کی ادنیٰ جنبش ہمیشہ طلسم شکن ثابت ہوئی ہے۔ اس کا ایک ایک حرف سحر سوز اور اس کا ہر "کلمۂ حق" قصر استبداد پر جیسے برق!

حاسد و فاسق حریفوں کے انتقامی طوفانوں نے جوش و خروش کو جوش کا قلم بیک جرم بلی پی گیا ہے اور جانے اُس کے قلم نے کتنے شعلے اُگلے۔

سحر کاری اس کی آتش بیانی ہے اور شعلہ باری اس کا شعار!
فیضی کی طرح اگر وہ چاہے تو کہہ سکتا ہے ؎

آنم کہ بہ سحر کاری ترِ حرف
از شعلہ تراش کردہ ام حرف

اُس دارائے لیاقت و شجاعت کی زد سے کوئی فرعون وقت بچ نہ سکا، اور کوئی سرکش و بد دماغ پناہ نہ پا سکا کسی کمیں گاہ میں۔

اُس مشاق فن کار تیر انداز نے اپنے ترکش فکر سے تیر نکال کر ہر سرکش کے دماغ کو تاکا اور نشانہ بنایا ہے کامیاب رہا لیکن جہاں اُس نے تیر برسائے اور شعلہ باری کی، اُس نے پھول بھی برسائے اور شبنم افشانی بھی کی۔
اگر وہ کہیں شعلۂ تپاں کی طرح گرم فغاں رہا ہے تو تبسم کناں بھی رہا ہے گل خنداں کی طرح۔

وہ غنچہ نواز شاعر! وہ انسان دوست جوش!! جس نے جہاں "انسان پایا ہے" اس انسان کے ساتھ اس نے محبت و رواداری برتی ہے۔ اور احترام کا تحفہ خلوص دل پیش کیا ہے۔ اس کو سراہا ہے۔ نوازا ہے اور جام محبت پلایا ہے دل کھول کر "فیاض ساقی" کی طرح۔

جوش! مشرقی تہذیب و ثقافت کا ممتاز اور منفرد نمائندہ ہے۔
جوش: پیغمبر انقلاب ہے۔ پیغام شباب ہے۔ شمع حیات ہے اور کردار کا معمار۔
جوش: شاہِ سخن ہے۔ شاہکار شعر و سخن ہے اور فخر انجمن۔
جوش: حسین و رنگین مرقع ہے آپ اپنے نقش و نگار کا۔

اور احترام جوش۔ احترام جوش میں اس کی عظمت کردار، جرأت گفتار، حرف بے باک، صدق و اخلاص اور شعر و معانی کا ایک غیر فانی نقش۔
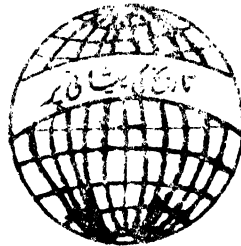
میری دلی دعا ہے کہ خداوند کریم حضرت جوش کی عمر دراز کرے اور تاریخ کی پیشانی پر ہمارے "شاعر اعظم" کا کام اور نام جگمگاتا رہے طغرائے امتیاز بن کر۔

غالب اور جوش

مرزا غالب رند مشرب اور رند شاعر تھے۔ اور اپنے وقت کے پیر مغاں، دو مختار دین و ایمان! اپنی پیری کے دوران میں مرزا نے اپنے ایک خط میں جناب سرور کو لکھا۔

"۶۴ سال کی عمر، جوش شباب کہاں؟"

(اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۳۰)

اس خط کا سن ۱۸۶۰ء لکھا ہے

اسے بڑا اتفاق ہی سمجھنا چاہیے کہ آج ایک دوسرا رند اور قدیم شاعر، جس نے ۶۵ سال کی عمر میں سال شباب منا رہا ہے۔ شباب اس کا جوش پر ہے اور شہرۂ انقلاب اس کا سرگرم عمل۔

یہ درست ہے کہ فرق بظاہر ایک اکائی کا ہی ہے لیکن اگر ۶۴ اور ۶۵ کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو ایک سال کا نمایاں فرق سامنے آتا ہے۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات۔

ایک دلچسپ و معنی خیز انکشاف! غالب کے خط کا سن ۱۸۶۰ء ہے اور جوش کے جشن کا سن ۱۹۶۰ء ہے۔ یہ تطابق ہمیں غالب اور جوش کا درمیانی فاصلہ بتاتا ہے۔ جو کامل ایک صدی کے برابر ہوتا ہے۔ یقیناً یہ ایک دلچسپ انکشاف بھی ہے اور اتفاق بھی!

جوش عالم کہنہ کے نظام فرسودہ اور سڑے ہوئے ماحول کو اپنا تعارف اس طرح دیتے ہیں: "نام ہے میرا شباب" اور اپنے کام یا نظام حیات کو تیزی سے تبدیل کرتا ہے، جو قوموں میں انقلاب، ذوق و حال اور قوت عمل مضمحل ہو رہے ہوں، یا قوم پر جمود طاری ہو، وہ اس کے اندر شباب کی اسپرٹ دوڑا کر اسے نئی زندگی اور نیا ماحول عطا کرنا چاہتا ہے —— شباب! جوش کی شاعری کا جان نواز روح پرور نغمہ ہے اور اسم با مسمیٰ! جس کے اندر حیات ہی حیات اور جوش ہی جوش ہے، جس کے اندر مستی ہی مستی اور ولولہ ہی ولولہ ہے۔

ہم ہمہ دانی کا بھوت اس قدر سوار ہے کہ اکثر و بیشتر افراد بغیر شرم محسوس کئے اس بیسویں صدی میں اس کا ڈھنڈورا پیٹتے نظر آتے ہیں، کہ سیاسیات، دینیات، ادبیات، نفسیات، معاشیات، طبیعیات، مابعد الطبیعیات اور خدا جانے کتنے "یات" سے لے کر شطرنج، چوسر، علم الہندسہ، موسیقی، عروض، پتنگ بازی، ریل، جعفر، کشتی اور گھوڑوں کی جراحی تک میں انہیں ایسی دست گاہ کامل حاصل ہے کہ ملک میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جوش

سلام مچھلی شہری

جوش حفیظ کے ساتھ

"جوش تمہیں کب متاثر کرتے ہیں؟"

"جب وہ اپنے خاص موڈ (Mood) میں ہوتے ہیں!"

"وہ تمہیں بطور انسان کیسے لگتے ہیں؟"

"بہت بلند — بلندی جو کرب و نشاط کی بدولت نصیب ہوئی ہو!"

"تم ان کی رومانی نظمیں پسند کرتے ہو یا سیاسی؟"

"مجھے ان کی 'رباعیاں' بہت پسند ہیں!"

"تم ان کو بہت اچھی طرح جانتے ہو؟"

"ہاں بہت اچھی طرح — بلکہ نہیں —!"

اور جب صورت یہ ہے تو کیا میں جوش پر کیا لکھ سکتا ہوں (کوشش ضرور کروں گا مگر ابھی نہیں کچھ دنوں بعد) اس وقت تو پرانے البم میں ایک گروپ فوٹو نظر آ گیا۔ سوچا صہبا کو بھیج دوں۔ وہ اپنے جریدے کا "جوش نمبر" نکال رہے ہیں، شاید ان کے کام آ جائے۔

حفیظ جالندھری آئے ہوئے تھے۔ جوش نے ان کے اعزاز میں ایک مخصوص ادبی نشست کا انتظام کیا تھا۔ آناد ہند ہوٹل میں۔ میں بھی وہیں قیام پذیر تھا، کسی نے مجھے بھی بلا لیا تھا۔

گلابی فضا قائم ہوئی۔ گلابی باتیں شروع ہو گئیں۔ باتیں ختم ہوئیں تو نظم خوانی کا دور شروع ہوا، مگر اس دور کو اسی گلابی فضا نے جلد ہی اپنی زد میں لے لیا، اور — اور پھر وہی باتیں قہقہے، خامشی اور پھر وہی فضا۔ یہ سلسلہ رات کے دو بجے تک جاری رہا!!

مجھے یاد پڑتا ہے کہ شاید حفیظ جالندھری نے "مصلحتاً"، اور ایک دوسری بزرگ ہستی نے "اصولاً" اس محفل کا ایک دوسرا گروپ فوٹو بھی (شاید میری کتابوں کی الماری میں، گاؤں میں محفوظ ہو۔ جب ان "بزرگ ہستی" پر کچھ لکھوں گا تو اسے تلاش کرنے کی کوشش کروں گا) اس چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا جو اس محفل میں بہت عزیز سمجھی جا رہی تھی

مجھ پر حفیظ کی متانت اور جوش کی ذہانت چھائی جارہی تھی ـــــ

جوش گفتگو کر رہے تھے اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شاعری کی طرح بات چیت کے دوران بھی الفاظ غلاموں کی طرح ان کے حضور سر جھکائے ، صف بستہ ہیں ، اور وہ انہیں اشاروں سے بلائے جارہے ہیں ۔ اس نشست میں وہ مجھے بہترین Talker نظر آئے ۔ حفیظ نہ جانے کیوں زیادہ شاداب نہیں تھے حالانکہ وہ بھی ایسی محفلوں کی جان ہوتے ہیں ۔

جوش کی وضعداری ، مہمان نوازی اور دوست کی خاطر داری ، اس محفل میں بھی اپنے نقوش اجاگر کر رہی تھی ـــ ایک عظیم شاعر تو جوش ہیں اور رہیں گے ، مگر انسان کے روپ میں وہ اسی وقت بہت بلند نظر آتے ہیں ، جب ان کے احساس تنہائی اور اس کے گداز کو محسوس کر لیا جائے ـــــ اس صحبت میں ، جوش کے قہقہوں میں اداسی کی لہر بھی دوڑ جاتی تھی ۔

بسمل سعیدی نے کسی نشاطیہ نظم کی فرمائش کی ، مگر جوش اپنی تازہ رباعیاں سنانے لگے ، اور ـــــ اور یہ بہت اچھی بات ہوئی ـــــ ان رباعیوں میں طنز نے درد کا روپ دھار لیا تھا ۔ اور درد وہی تھا جس میں آج کی پوری دنیا مبتلا ہے ۔

اس کے بعد حفیظ کی باری آئی ، اور انہوں نے دو غزلیں اور کچھ تازہ شعر سنائے ۔ ان اشعار میں موسیقی بھی تھی اور فکر کی گہرائی بھی ۔

رات کے دو بج گئے تھے ۔ گلابی فضا بھی گویا تھک سی گئی تھی ۔ ذرا دیر بعد یہ یادگار ادبی نشست ختم ہو گئی ۔ میں اپنے کمرے میں آیا تو بہت دیر تک جوش کے متعلق سوچتا رہا ـــــ میرے ذہن کے پردوں سے دور ، اب بھی گلاس کھنک رہے تھے ، مگر ان کی نغمگی کچھ ایسی تھی مانو آنسوؤں کا جلترنگ ـــــ !!

جوش کی اصول پسندی (صفحہ ۲۵۶ سے آگے)

چنانچہ میں اپنے باپ کے پاس پہونچا ، سر جھکائے ہوئے اور ادب کے ساتھ ـــ میرے شفیق باپ نے مجھ سے کہا :

"شبیر"

اور میں نے آنکھیں اٹھائیں تو دیکھا کہ میرے باپ کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہیں ۔

"یہ دیکھو دوسرا وصیت نامہ ! میں نے جائداد میں تمہارا حصہ تمہارے دونوں بھائیوں کے برابر کر دیا ہے ۔ میرے باپ نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا ۔

مجھ پر باپ کی شفقت اور اس وقت کی حالت کا یہ اثر پڑا کہ میری ہچکیاں بندھ گئیں ۔ کہ اتنے میں میرے باپ کی آواز پھر گونجی :

"شبیر ! اس دولت اور جائیداد کی خاطر لوگ ماں باپ اور بھائی بہن تک کو مار ڈالتے ہیں اور یہاں تک کہ ایمان بھی گنوا دیتے ہیں ۔ مگر تم نے اس دولت اور جائیداد کی اپنے اصول کے سامنے ذرہ برابر بھی پروا نہیں کی ۔ مجھے تمہاری یہ استواری اور استقامت بہت پسند آئی ۔ اگر تمہارا سا آدمی مجوسی بھی ہو جائے تو اس کی عزت کرنی چاہیئے :

جمیل جالبی

جوش کے لطیفے

کسی قوم کی تخلیقی بیماری کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس کے ہاں لطیفوں کی پیدائش کا سلسلہ بند ہو جائے۔ لطیفے کسی قوم کی تخلیقی صلاحیتوں کی تاریخ کے قدموں کے نشان ہیں جن سے ہم اس قوم کی پسند و ناپسند، اس کے رویوں، مزاج اور انداز نظر کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ ایک طرف وہ لطیفے ہیں جو مجموعی طور پر سارے معاشرے کے مزاج پر روشنی ڈالتے ہیں اور جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کدھر جا رہا ہے۔ دوسری طرف وہ لطیفے ہیں جو کسی فرد کی ذات سے مختص ہیں اور خود اس شخصیت کی تاریخ بن جاتے ہیں۔ مولانا حالی نے پہلی بار "یادگار غالب" میں غالب کے لطیفوں کو یکجا کر کے انہیں غالب کی شخصیت کا جزو بنا دیا۔ آج ہم ان لطیفوں کے ذریعے غالب کی شخصیت کا اندازہ کرتے ہیں۔ اگر یہ لطیفے نہ ہوتے تو اندازہ کیجیے کہ غالب کی شخصیت آج کس قدر مختلف ہوتی! لطیفے جذبات، احساسات اور خیالات کا برجستہ اور برمحل اظہار ہوتے ہیں جس میں شخصیت بغیر کسی تصنع یا بناوٹ کے کھل کر سامنے آتی ہے۔

جوش صاحب باغ و بہار آدمی ہیں۔ ان کے پاس بیٹھیے تو اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ان کی ظرافت، ان کی ذہانت و طباعی کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہاں جو چند لطیفے —— اور اس لفظ کو میں وسیع معنی میں استعمال کر رہا ہوں —— میں نے پیش کیے ہیں ان سے جوش صاحب کی شخصیت اور مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

(۱)

سنہ ۴۴ء کی بات ہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میں اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا کہ میرٹھ میں کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرے میں ہندوستان کے سارے معروف و مشہور شعراء جمع ہوئے تھے۔ بڑا سا پنڈال بنایا گیا تھا۔ دور دور سے لوگ مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ برسوں بعد جوش و جگر ایک ساتھ مشاعرے میں شریک ہو رہے تھے۔ اس بات کی بھی بڑی دھوم تھی۔

مشاعرہ شروع ہوا، اور تقریباً رات کے ڈیڑھ بجے جوش صاحب کی باری آئی۔ جوش صاحب اس رات مشاعرہ کی فضا اور ماحول سے اس درجہ مطمئن تھے کہ ان کا جی چاہتا تھا کہ بس سناتے رہیں۔ انہوں نے رباعیاں سنانی شروع کیں اور مسلسل سناتے رہے۔ جب وہ اٹھنے کا ارادہ کرتے، لوگ فرمائشیں شروع کر دیتے۔ اور جوش صاحب پھر

سنانا شروع کردیتے۔ جوش صاحب ایک رباعی سناتے، ایک پان کھاتے پھر پیگ کرتے اور پھر ایک رباعی سُناتے یہ سلسلہ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے سے جاری تھا۔

جب بہت دیر ہوگئی، اور جوش صاحب تھک سے گئے تو انہوں نے اعلان کیا:

"بس بھئی بس، اب تھک گئے ہیں۔"

یہ سن کر پیچھے سے ایک شخص کھڑا ہوا ۔۔۔ بنیان کندھے پر، جسم ننگا ۔۔۔ اور اُس نے زور سے چلا کر کہا:

"ایک اور ہوگی پہلوان! تھوک کے۔"

(۲)

میں اور مولانا اعجاز الحق قدوسی جوش صاحب کے ہاں بیٹھے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ قدوسی صاحب کو پیاس محسوس ہوئی۔ فوراً ریفریجریٹر سے ایک بوتل اور گلاس نکال لایا۔ یہ شراب کی بوتل تھی جو عام طور پر خالی ہونے کے بعد جگ کے بجائے کام میں لائی جاتی ہے۔

جوش صاحب میری طرف مخاطب ہوکر بولے: "جالبی صاحب! رم کی بوتل میں پانی!"

مولانا قدوسی دوسرا گلاس پی رہے تھے۔ غالباً رم کی بوتل میں پانی کا خیال انہیں مولانا قدوسی کی سفید داڑھی دیکھ کر آیا۔

اتنے میں مولانا پانی پی چکے تو جوش صاحب بولے:

مولوی نے اپنا دامن سی لیا
رم کی بوتل سے پانی پی لیا

اور پھر اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے مولانا پر فقرے چست کرنا شروع کردیئے۔ مولانا اُن کے تیس سال پرانے دوست ہیں۔ مولانا کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں:

رندوں کو نہ دیکھ چشم کم سے
قدسی ہے یہ قوم نامسلماں

(۳)

آزاد انصاری مرحوم سے آخر آخر میں جوش صاحب کی بیگم ناراض ہوگئی تھیں۔ وہ آتے تو وہ نہ پان بھیجتیں، اور نہ خاطر تواضع کرتیں۔ اس واقعے کے پیچھے ایک اور کہانی ہے جو پھر کبھی سناؤں گا۔

جب شام ہونے لگی اور دونوں وقت ملنے لگے تو جوش صاحب کا وقت مے نوشی آ پہونچا۔ جنہوں نے جوش صاحب کو شراب پیتے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ سورج غروب ہونے کے فوراً بعد پینا شروع کرتے ہیں۔ بیگم اندر سے ہر آدھ گھنٹے کے بعد ایک پیگ بنا کر بھیجتی رہتی ہیں۔ گھڑی سامنے میز پر رکھ دی جاتی ہے، وہ ہر پانچ منٹ کے بعد ایک گھونٹ پیتے ہیں، اور اسی طرح چھ گھونٹوں میں ایک پیگ پیتے ہیں۔ جب دو گھنٹے ہوجاتے ہیں، اور چار پیگ ختم ہوجاتے ہیں تو وہ کھانا کھاتے ہیں اور سوجاتے ہیں۔ صبح نور ظہور کے تڑکے اٹھتے ہیں۔ ٹہلنے جاتے ہیں۔ آکر بچوں کے ساتھ ورزش کرتے ہیں، اور پھر اپنا کام شروع کردیتے ہیں۔ ادھر آٹھ بجے ادھر شعر و شاعری اور دوسرے

تخلیقی کام ختم ہوئے۔ ان کی زندگی بہت باقاعدہ ہے۔

یہ ایک ایسی ہی شام کا ذکر ہے۔ آزاد انصاری بھی موجود تھے، آزاد انصاری کی موجودگی سے بیگم کا پارہ چڑھ گیا اور بہت تقاضوں کے بعد بغیر تیار کئے شراب کی بوتل بھیج دی۔ اب جوش صاحب اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ سوڈا آئے تو کام شروع ہو۔ مگر سوڈا ہے کہ نہ اب آتا ہے نہ جب۔ اگر کچھ بولتے ہیں تو بیگم خفا ہو جاتی ہیں۔ بیگم سے ہر شریف آدمی کی طرح جوش بھی بہت ڈرتے ہیں۔ کئی دفعہ تقاضا کیا، مگر وہ سنی ان سنی کر دیتیں۔ آخر جب بہت دیر ہو گئی تو جوش صاحب نے بیگم کو آواز دی۔

"اللہ کی بندی ذرا یہاں تو آؤ۔"

یہ سن کر جب وہ آئیں تو جوش صاحب گفتگو کے سے انداز میں بولے: ؎

کشتیٔ مے کو حکم روانی بھی بھیج دو
جب آگ بھیج دی ہے تو پانی بھی بھیج دو

شاعر کی بیوی۔ عمر بھر کا ساتھ۔ خاندانی عورت۔ شعر سنتے ہی ہنس پڑیں اور رام ہو گئیں۔

(۴)

ابھی پچھلے دنوں ایرانی سفارت خانے سے دعوت نامہ آیا۔ جوش صاحب پیر حسام الدین راشدی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ گئے اور میں مولانا اعجاز الحق قدوسی اور مبین الحق صدیقی کے ساتھ۔ وہ سفارت خانے میں ہم سے پہلے پہونچے اور ہمارے پہونچنے سے پہلے واپس آ گئے۔ ہم جب پہونچے تو محفل برخاست ہو چکی تھی۔ اطلاع ملی کہ وہ مجھے اور مبین الحق صدیقی کو گھر بلا گئے ہیں۔

رات کے دس بجے تھے۔ میں اور مبین الحق صدیقی اُن کے گھر پہونچے۔ ہم دونوں کو دیکھ کر بولے "اچھا ہوا آپ لوگ آ گئے مجھے سخت وحشت ہو رہی تھی۔"

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب جوش صاحب نے ریڈیو کے مشاعرے سے "بول اکتارے جھن جھن جھن" نظم پڑھی تھی اور اس بات پر کہ انہیں مشاعرے میں سب کے بعد پڑھوایا گیا تھا چند حاسدوں نے ان کے خلاف اخبار "ڈان" میں خطا شائع کرانا شروع کر دیئے تھے۔

میں نے کہا "جوش صاحب وہ نظم تو بہت اچھی تھی۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا۔ اس نظم میں تصور انسان الوہیت کے درجے پر پہونچ گیا ہے جہاں رنگ و نسل اور قوم و ملت کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔"

بولے "میں نے اسی موضوع پر لکھی ہے۔ لیکن انداز بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ مابعد الطبیعاتی موضوع سہل ہو کر ہر خاص و عام کے ذہن میں اُتر جائے اور ہر شخص اس سے لطف اندوز ہو۔ اس کے قافیے، اس کے الفاظ، اور ساتھ ساتھ بحر جو میں نے استعمال کی ہے وہ ساری نظم کو موسیقی کا اثر عطا کر رہی ہے۔"

میں نے کہا "جوش صاحب! یہ نظم ذرا پھر سن لی جائے۔"

آواز دی "ذرا بیگ بھیج دو۔"

اس کے جواب میں اندر سے آواز آئی "ابھی تو بھیج کر آئے ہو اب پھر شروع کر دیا۔" یہ ان کی بیگم تھیں۔

رازدارانہ انداز میں آہستہ سے بولے "مادر مہربان ہیں۔ انہیں ہر دم ہماری صحت کا خیال رہتا ہے"۔

(۵)

"ترقی اردو بورڈ" کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ بورڈ کا دفتر ابھی قائم ہی ہوا تھا۔ میٹنگ میں جوش صاحب سے ان کی دفتری ضروریات دریافت کی گئیں۔ انہوں نے بتایا کہ "ایک چپراسی، ایک بابو، اور ایک مہتر"

پیر حسام الدین راشدی بولے "جوش صاحب! مہتر کیا کریں گے مہترانی لے لیجئے"۔

جوش صاحب نے فوراً جواب دیا "ہاں مہترانی بجوانی"۔

(۶)

تین چار سال پہلے کی بات ہے۔ مولانا عبدالحامد بدایونی نے جوش صاحب کو مدعو کیا۔ اُس زمانے میں جوش صاحب کے ایک مرثیئے کی بڑی دھوم تھی۔ یہ محفل صرف اسی لئے منعقد کی گئی تھی کہ جوش صاحب مرثیہ سنائیں گے۔

میں بھی مدعو تھا۔

مرثیہ شروع ہوا اور ختم ہو گیا۔ چائے چلی اور ختم ہو گئی۔ لیکن پان کا دور دور پتہ نہیں۔ حاضرین بے چین تھے اور میزبان بالکل غافل۔ طرفہ تماشہ یہ کہ میزبان خود مسلسل پان کھائے جا رہے تھے۔ میں نے مولانا اعجاز الحق قدوسی سے کہا کہ جوش صاحب کے اس مرثیئے کے ایک مصرعے کو اگر یوں کر دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ ؏

پان کھانا اور ہے اس کا کھلانا اور ہے!

جوش صاحب برابر میں بیٹھے تھے۔ مصرع سن لیا۔ فوراً بولے۔

مال ملا کس نہ دہد

(۷)

جوش صاحب بہت بھلکڑ ہیں۔ ذرا سی دیر میں بات بھول جاتے ہیں۔ اور تو اور اپنے اشعار تک بھول جاتے ہیں۔ اکثر میں نے اُن کا شعر پڑھا کہنے لگے:

"جمیل صاحب! یاد نہیں ہے کہ میرا ہے۔ ویسے معلوم میرا ہی ہوتا ہے"۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کوئی سفارش ہیں پکڑ لایا۔ جب میرے پاس آئے تو کہنے لگے کہ "بھئی اتنا تو یاد ہے کہ سفارش کرنی ہے اور ان صاحب کی کرنی ہے لیکن یہ بھول گیا ہوں کہ کیا سفارش کرنی ہے"۔ ویسے یہ جملہ کہتے وقت وہ مجسم سفارش بنے ہوئے تھے۔

مرزا عالمگیر قدر بھی اُن کے ساتھ تھے۔ کہنے لگے "میاں! ایسا پہلی بار ہی نہیں ہوا۔ ابھی دو تین مہینے پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب پکڑ کر لے گئے۔ وہاں جو کچھ کہا وہ سب کچھ ان صاحب کے خلاف تھا جن کی سفارش مقصود تھی"۔ شاعر آدمی ہیں، ہر ادا سے "ہر انداز اور ہر ادا سے شاعری ٹپکتی ہے۔

جو جوش صاحب سے ملتا ہے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ میرے گھر آئے۔ لوگوں نے فرمائشیں شروع کیں۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ "چنا جور گرم" سنایئے۔

کہنے لگے، "کاپی نہیں لایا"۔

اصرار کیا گیا کہ "کچھ اشعار تو زبانی یاد ہوں گے؟"
کہا: "کہاں یاد ہیں۔ یادداشت اتنی خراب ہوگئی ہے کہ: ؎

ہم نے اپنی سی کہیں بھول نہ دیکھی نہ سنی
ہاتھ اٹھایا تھا دعا کو کہ دعا بھول گئے"

(۸)

حکومت کی طرف سے "ابھی دو سال ہوئے" یہ اعلان ہوا کہ حکومت معذور ادیبوں کی امداد کرے گی۔ یہ خبر سُن کر جوش صاحب بولے:

"جمیل صاحب! ادب تو خود سب سے بڑی معذوری ہے۔"

(۹)

پیر حسام الدین راشدی جوش صاحب کے بہت دوست اور بڑے قدرداں ہیں۔ ایک دفعہ جوش صاحب نے پیر صاحب سے کسی کام کے لئے کہا۔

پیر صاحب مصروف آدمی۔ بھول گئے۔

یاد دہانی کے طور پر جوش صاحب نے کاغذ کے ایک پُرزے پر صرف یہ لکھ کر بھیجا ؎

حسام الدین بھی شمشیر نکلے
مرے حق میں بُت بے پیر نکلے

جواب میں پیر صاحب خود پہونچ گئے۔

(۱۰)

جس زمانے میں "پاکستان رائٹرز گلڈ" وجود میں آیا ہی تھا کہ میرے سپرد یہ کام کیا گیا کہ میں جوش صاحب کو گلڈ کا ممبر بنانے کے لئے اُن کے پاس جاؤں۔ گلڈ کے کارکنان کا یہ خیال تھا کہ جوش صاحب میرے کہنے سے ممبر ضرور بن جائیں گے میں گیا۔ وہ گھر پر موجود نہیں تھے۔ میں ایک پرچہ لکھ آیا، اور فارم اور خط چھوڑ آیا۔ یہ دونوں چیزیں انگریزی میں تھیں جب وہ گھر واپس آئے تو یہ چیزیں نظر سے گذریں۔ اردو کے ادیبوں کی انگریزی زبان میں کارگذاری دیکھ کر چراغ پا ہوگئے۔ فارم پر یہ لکھ کر واپس کردیا:

"انگریزی میں انجمن کا نام چھاپ کر بڑا ہی فخر محسوس فرمایا گیا ہوگا۔
زندہ باد انجمن مصنفین پاکستان!
پائندہ باد اردو زبان!!
رخشندہ باد جماعت دارایانِ لسان!!!"

اور اس کے نیچے یہ لکھا تھا:

"حضرت جمیل،
ہم کہاں کے دانا ہیں، کس ہنر میں یکتا ہیں

کیونکر ہمیں بنلستے ہیں آپ ہم عناں اپنا

جوش مرحوم

یہ سارا غصہ اِس بات پر تھا کہ یہ سب کچھ انگریزی میں کیوں ہے۔ اس بات کا یہ نتیجہ ہوا کہ جوش صاحب آج تک پاکستان رائٹرز گلڈ کے رکن نہ بن سکے نہ بنے۔

لوگ ہزار طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر بات صرف یہ ہے۔

(۱۱)

جوش صاحب کو پابندیٔ وقت کا بہت خیال ہے۔ اس معاملے میں وہ خالص انگریز ہیں۔ ادیب و شاعر ہوتے ہوئے بھی وقت کی پابندی کم از کم ہمارے ہاں تو معجزہ ہے

ایک دفعہ میرا، مبین الحق صدیقی، مولانا قدوسی، جوش صاحب اور بعض دوسرے احباب کا حیدر آباد جانے کا پروگرام تھا۔ یہ طے ہوا تھا کہ صبح آٹھ بجے چلیں گے تاکہ ٹھنڈے وقت حیدر آباد پہونچ جائیں۔ لیکن سب کو جمع ہوتے ہوتے نو بج گئے۔ اور جب جوش صاحب کے ہاں پہونچے تو دس بجے تھے۔ دو گھنٹے کا انتظار جوش صاحب کے بس کا کہاں تھا جیسے ہی ہم پہنچے تو بچے نے ایک پرچہ لاکر دیا جس پر لکھا تھا:

"میں نے آج لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کیا، اور اس قدر عجلت کے ساتھ طیاری کی کہ ٹھیک سوا آٹھ بجے ملبوس ہوکر بیٹھ گیا تاکہ آپ کو ایک دقیقہ بھی انتظار کی زحمت نہ گوارا کرنا پڑے۔

لیکن آپ نہ آنا تھے نہ آئے۔ اور جب شدید انتظار کرتے کرتے میں خود اپنی نگاہوں میں احمق معلوم ہونے لگا تو میں نے "اِنّا اللہ" کا نعرہ لگایا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ تاکہ آپ کو نصیحت حاصل ہو، اور آپ آئندہ کسی اللہ کے بندے کو کرب انتظار میں مبتلا فرما کر اسے اپنے کو احمق سمجھنے پر مجبور نہ کریں"

مرحوم جوش

۵۹ ۷

یہ خط پڑھ کر اس تاخیر سے مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔ اور میں سوچنے لگا کہ واقعی بہت برا ہوا۔ سارا پروگرام کرکرا ہوگیا میں نے قدوسی صاحب سے کہا کہ "اب کیا ہو۔ جوش صاحب کو کہاں تلاش کیا جائے؟ ان کے بغیر میں تو نہیں جاؤں گا؟ اسی اُدھیڑ بن میں آدھ گھنٹہ گذر گیا۔

ابھی ہم لوگ صلاح و مشورہ کر ہی رہے تھے کہ موصوف گھر کے اندر سے برآمد ہوئے اور کہنے لگے:

"کہئے کیسی زحمت ہوئی؟"

اور یہ کہہ کر ہنستے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔

میں نے کہا ؎

بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں "اب" جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں:

نریش کمار شاد

جوشیئے

بمبئی کی ایک معروف ادب پرور اور بوڑھی مغنیہ کے ہاں محفل مشاعرہ منعقد ہو رہی تھی جس میں دوسرے شعراء کے علاوہ جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری، اسرارالحق مجاز اور ساغر نظامی بھی شریک تھے۔

مشاعرے کے اختتام پر ایک دبلی پتلی سی لڑکی جس کی کم سن آنکھیں بجائے خود کسی غمناک شعروں کی طرح حسین تھیں، ایک مختصر سی آٹوگراف بک لے کر شرماتی، لجاتی باری باری سب شاعروں سے آٹوگراف لینے لگی۔

اس جہاں دیدہ مغنیہ کی موجودگی میں یہ نوعمر حسینہ زندگی کے تضاد کو نہایت واضح اور موثر انداز میں پیش کر رہی تھی — اسی تضاد کو مدنظر رکھتے ہوئے جگر مراد آبادی نے اس کی آٹوگراف بک میں لکھ دیا:

ازل ہی سے چمن بندِ محبت
یہی نیرنگیاں دکھلا رہا ہے
کلی کوئی جہاں پر کھل رہی ہے
وہیں اک پھول بھی مرجھا رہا ہے

اور جب حفیظ صاحب کی باری آئی تو اس معصوم لڑکی کے چہرے پر ایک حسرت کی نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے لکھ دیا:

معصوم اُمنگیں جھول رہی ہیں دل داری کے جھولوں میں
یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مرجھانا ہے

اس کے بعد دوسرے شاعروں نے بھی اپنی طبعی افتاد کے مطابق اپنے دل و دماغ کے ہنگامی تاثرات کو اشعار کی صورت میں قلم بند کر دیا

جوش ملیح آبادی کے پاس جب آٹوگراف بک لائی گئی تو انہوں نے کچھ لکھنے سے پہلے اس کی ورق گردانی شروع کر دی! جگر اور حفیظ کے برمحل اشعار نے جہاں ان کے احساسِ جمال کو تازگی اور شگفتگی بخشی وہاں دوسرے کئی شاعروں کے اوٹ پٹانگ شعر ان کے مذاقِ سلیم پر بار بھی گزرے۔ اور انہوں نے اپنے اس ردِعمل کو ان الفاظ میں تحریر کر دیا۔

"آٹوگراف بک ایک ایسا اصطبل ہے جس میں گھوڑے اور گدھے

نہیں دیتیں۔ شام کو پینے کے لئے بہت جی چاہتا ہے لیکن پچھلے تین چار ماہ سے جگر کی خرابی کے مرض میں مبتلا ہوں — ڈاکٹروں نے پینے کی سخت ممانعت کر دی ہے۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ پینے کے لئے اقتصادی آسودگی کی بھی ضرورت ہے۔ اور میں مالی طور پر ان دنوں بہت ضرورت مند ہوں "

جوش صاحب نے اس کی تقریر کو غیر دلچسپی سے سنتے ہوئے کہا: "آپ تنگ دستی کی شکایت مجھ سے بلا وجہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ آپ کو دیکھ کر ہی کہنے کو جی چاہتا ہے

تن درستی اگر نہ ہو غالب
تنگ دستی ہزار نعمت ہے

جوش صاحب ایک بار گرمی کے موسم میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کی غرض سے ان کی کوٹھی تک پہونچے، تو وہاں ملاقاتیوں کا ایک جم غفیر پہلے سے موجود تھا۔ کافی دیر تک انتظار کے بعد بھی جب مولانا سے ملاقات کے لئے جوش صاحب کی باری نہ آئی، تو انہوں نے اکتا کر ایک چٹ پر یہ شعر لکھ کر مولانا کی خدمت میں بھجوا دیا:

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا!!

مولانا نے یہ شعر پڑھا، تو زیر لب مسکرائے اور فی الفور جوش صاحب کو اندر طلب کر لیا۔

جوش صاحب اپنے ایک شاعر دوست بسمل سعیدی کو لے کر شام کے وقت ایک رئیس کے ہاں اس نیت سے پہونچے کر وہاں خورد و نوش کا انتظام ہوگا۔

اس رئیس نے جوش صاحب کا خیر مقدم تو بہت گرم جوشی سے کیا، لیکن پینے پلانے کے سلسلے میں نہایت بے دلی سے صرف ایک بار اتنا پوچھا۔

"کیوں جوش صاحب کچھ پیجئے گا؟"

جوش صاحب نے معنی خیز نظروں سے بسمل کی طرف دیکھنے کے بعد اپنی روایتی وضع داری سے کام لیتے ہوئے کہا —

"نہیں جناب نوازش آپ کی"

اور اس کے بعد کچھ رسمی گفتگو ہوئی، اور پھر جوش صاحب بسمل کو ساتھ لے کر اپنی کار میں واپس چلے آئے۔ راستے میں کار چلاتے چلاتے انہوں نے بسمل سے پوچھا:

"رئیس زادے نے جس انداز سے ہمیں پینے کی دعوت دی اُسے دیکھا؟"

اور بسمل کے جواب کا انتظار کئے بغیر دریافت کرنے لگے:

"اس انداز کے اظہار کے لئے کوئی مناسب لفظ بتاؤ:"

بسمل نے چند لمحوں تک فکر کرنے کے بعد کہا:

"اردو میں تو غالباً کوئی لفظ نہیں، البتہ عربی میں اس موقع کے لئے ایک لفظ ہے "استنکاس"

جوش صاحب مسکراتے ہوئے کہنے لگے :

"اس انداز کے لئے کوئی لفظ تو نہیں سوجھ رہا، لیکن ایک ترکیب خود ہی تلاش لی ہے ۔ اور اسے رباعی کے ایک مصرعے میں نظم بھی کر دیا ہے ۔ ع

اللہ ری تری دعوتِ انکارِ طلب

جوش صاحب جب حکومتِ ہند کے ماہنامہ "آج کل" کے مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے اولڈ سکریٹریٹ دہلی میں باقاعدہ کام کرنے لگے تو ان کے ایک دیرینہ دوست نے دفتر میں آکر پوچھا :

"کہئے جوش صاحب، سرکاری ملازمت میں کیسی گذر رہی ہے ؟"

جوش صاحب نے اداس ہو کر جواب دیا،

"کیا بتائیں بھائی جنگل کے بادشاہ کو تانگے کے آگے جوت دیا گیا ہے ۔"

جوش صاحب ایک دعوتِ شراب میں مدعو تھے ۔ میزبانوں کی طرف سے شراب کی بوتل اور خالی گلاس ان کے آگے رکھ دیئے گئے، لیکن سوڈے کا نشان تک نہیں تھا ۔

جوش صاحب نے سوڈے کے انتظار کی زحمت سے اکتا کر میزبانوں سے مخاطب ہو کر یہ شعر موزوں کر دیا ؎

کشتیِ مے کو حکمِ روانی بھی بھیج دو
جو آگ بھیجتے ہو تو پانی بھی بھیج دو

کسی مشاعرے میں ایک نو مشق شاعر اپنا غیر موزوں کلام پڑھ رہے تھے ۔ اکثر شعراء آدابِ محفل کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاموش تھے ۔ لیکن جوش صاحب پورے جوش و خروش سے ایک ایک مصرعے پر داد و تحسین کی بارش کئے جا رہے تھے ۔

گوپی ناتھ امن نے انہیں ٹوکتے ہوئے پوچھا :

"قبلہ ! یہ آپ کیا کر رہے ہیں ؟"

"منافقت ۔۔ " جوش صاحب نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا ۔ اور پھر داد دینے میں مصروف ہو گئے ۔

کسی محفلِ مشاعرہ میں جوش صاحب اپنی نظم سنا رہے تھے ۔ تو کنور مہندر سنگھ بیدی نے حاضرین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا :

"دیکھئے کم بخت پٹھان ہو کر کیسے عمدہ شعر پڑھ رہا ہے ۔"

جوش صاحب نے فوراً بیدی صاحب پر جملہ چست کیا :

"اور ظالم سکھ ہو کر کیسی اچھی داد دے رہا ہے ۔"

سونی پت ضلع رہتک میں مشاعرہ ہو رہا تھا جس میں دوسرے شعراء کے علاوہ قبلۂ رنداں حضرت جوش بھی مدعو تھے۔ وہاں سرکاری طور پر شراب نوشی کی ممانعت ہے۔ اس لئے تلوک چند محروم جب اسٹیج پر اپنا کلام سنانے کے لئے آئے تو جوش صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

"جوش صاحب! اگر اجازت ہو تو غزل عرض کرنے سے پہلے ایک رباعی آپ کے متعلق سناؤں؟"

"ہاں ہاں ضرور!" جوش صاحب نے گوش بر آواز ہوتے ہوئے کہا۔

اور محروم صاحب نے اسی وقت کہی ہوئی اپنی یہ رباعی سنا دی۔

جب آئے جناب جوش سونی پت میں
برپا ہوا اک خروش سونی پت میں
ہوش ان کے اڑے کہا جب ان سے میں نے
ممنوع ہے ناؤ نوش سونی پت میں

جوش صاحب کے لئے ناؤ نوش کا اہتمام چونکہ منتظمین کی طرف سے ہو چکا تھا، رباعی سن کر انہوں نے یہ شعر کہہ دیا ؎

کیوں ان کے اڑیں گے ہوش سونی پت میں
جو کرتے ہیں ناؤ نوش سونی پت میں

جوش صاحب ایک رات کسی ایسی محفل میں مدعو تھے، جہاں زیادہ تر پرہیزگار شاعر تھے۔ جوش صاحب نے اپنے معمول کے مطابق جب چراغِ بادہ روشن کر دیا، تو ان کے پاس بیٹھے ہوئے کچھ شاعر محض ان کا ساتھ دینے کی نیت سے بار بار پانی پینے لگے۔ ڈیڑھ دو پیگ پینے کے بعد جوش صاحب نے ان شاعروں سے خطاب کرتے ہوئے یہ مصرع پڑھا۔ ؏

پانی پی پی کے کوستے ہیں مجھے

اور پھر چیلنج کیا کہ تم میں سے کوئی ایسا جو اس مصرع کو مطلع بنا دے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ قافیہ "کوستے" ہو۔

کچھ دیر تک فکر کرنے کے بعد جب کوئی بھی شاعر شعر نہ کہہ سکا تو جوش صاحب نے خود ہی اپنی شرط کو اس طرح پورا کر دیا۔ ؏

پلتے ہیں شہ پرستے ہیں مجھے
پانی پی پی کے کوستے ہیں مجھے

دہلی کے کسی مشاعرے میں جب کنور مہندر سنگھ بیدی کے ساتھ جوش ملیح آبادی تشریف لائے تو وہاں گیانی گورمکھ نہال سنگھ نے ان کا خیر مقدم کیا۔ جوش صاحب نے نہایت ترحم آمیز نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کنور صاحب سے کہا — دیکھئے یہ بیچارے شاعروں میں ایسے دکھائی دے رہے ہیں جیسے رفیع احمد قدوائی کسی طوائف کے کوٹھے پر گانا سنتے ہوئے یا میں کسی گرجے میں تراویح پڑھتا ہوا پکڑا جاؤں۔

نظم

روحِ ادب

۱۹۲۰ء

گریۂ مسرت ۲۸۳
خیالاتِ زرّیں ۲۸۴
حالاتِ حاضرہ ۲۸۷
حقیقتِ دل ۲۸۸
ایک نغمہ ۲۸۹
ہماری سیر ۲۹۰
محسوسات ۲۹۲
عنبریات ۲۹۱
ستارے ۲۹۴

نقش و نگار

۱۹۲۴ء

کون اٹھا ہے شرماتا ۲۹۷
جمنا کے کنارے ۲۹۶
گنگا کے گھاٹ پر ۲۹۸
جنگل کی شہزادی ۲۹۹
افکارِ اولیں ۳۰۳
کوہستانِ دکن کی عورتوں سے ۳۰۴
چند جرعے ۳۰۵
آج کی رات ۳۰۸
صبح سے کہہ ۳۰۹
پروگرام ۳۱۰
جوانی کی رات ۳۱۱
الوداع ۳۱۲
درد انگیز کھلونا ۳۱۳
انگیٹھی ۳۱۴
اترے ہوئے چہرے ۳۱۵
ماں جائے کی یاد ۳۱۶
خدا سے اک سوال ۳۱۶
مطالعہ و تفکر ۳۱۷
چاند کے انتظار میں ۳۱۹
زرد کلیاں ۳۲۰
عقدۂ لاینحل ۳۲۱
خواب کی پرچھائیں ۳۲۳
انتہائی بے تعلقی ۳۲۴

شعلہ و شبنم

۱۹۳۶ء

تمہید ۳۲۵
پیمانِ محکم ۳۲۶
صدائے بیداری ۳۲۷
کسان ۳۲۷
لمحۂ آزادی ۳۳۰
خزینۂ زندگی سے ۳۳۰
شکستِ زنداں... ۳۳۲
سجادے ۳۳۳
شاہِ ہندوستان ۳۳۳
ریوڑی ۳۳۴
گم شدگی ۳۳۵
بیابان کی ناگن... ۳۳۵
روحِ شام ۳۳۶
آواز کی پرچھائیاں ۳۳۷
پیش گوئی ۳۳۸
ناگفتنی آواز ۳۳۹
جنت ملیسی باپو ۳۴۰
کرن اور ہیلی بازار ۳۴۱
چاندنی کا چاند ۳۴۱
گریۂ مسرت ۳۴۲
ذاکر سے خطاب ۳۴۴
شیخ ہدایت ۳۴۸
جدید رنگِ تغزل ۳۵۱
قدیم رنگِ تغزل ۳۵۷

روحِ انتخاب

نگار خانۂ گیتی مرے کلام کا صید
طلسم خانۂ گردوں مرے سخن کا شکار

(جوش)

فکر و نشاط

۱۹۳۷ء

شمع فروزاں ، ۳۶۰
شیٔ لاحاصل ، ۳۶۱
نقاد ، ۳۶۱
ہم لوگ ، ۳۶۴
خطار فتار ، ۳۶۵
پیرانہ بددعا ، ۳۶۵
فوجی بینڈ ، ۳۶۶
مولوی ، ۳۶۷
انکشافِ فطرت ، ۳۶۷

جنون و حکمت

۱۹۳۶ء

حقائق ، ۳۶۸
حسن و عشق ، ۳۷۰
پیرانِ سالوس ، ۳۷۲
خمریات ، ۳۷۳
متفرقات ، ۳۷۵

حرف و حکایت

۱۹۳۸ء

سرشکِ تبسم ۳۷۷
شاعرِ عجیب و غریب ۳۷۸
نغمۂ خانقاہ ، ۳۷۹
محشرستاں ، ۳۸۱
پیٹ بڑا بدکار ۳۸۲
دعوتِ امتحان ، ۳۸۳
غلط بخشی ، ۳۸۵
حسن چین ، ۳۸۶
شعر کی آگ ، ۳۸۸
جادو کی سرزمین ، ۳۸۸
ابتر ۳۸۹
رہزنی یا رہبری ، ۳۹۰

آیات و نغمات

۱۹۴۱ء

نیا میلاد ، ۳۹۱
باغی روحوں کا کورس ، ۳۹۲
تو اگر واپس نہ آئی ، ۳۹۵
خالی دل ، ۳۹۶
ریل کی پٹریاں ، ۳۹۷
رقصِ ہزار شیوہ ، ۳۹۹
مہاجن ، ۴۰۱
رباعیات ، ۴۰۲

عرش و فرش

۱۹۴۴ء

نامکمل خاکے ، ۴۰۴
اترا ہوا چہرہ ، ۴۰۶
سونی جنت ، ۴۰۷
اربابِ ادب ہوشیار ۴۰۹
رباعیات ، ۴۱۰

رامش و رنگ

۱۹۴۵ء

اپنی ملکۂ سخن سے ۴۱۲
برسات کا پچھلا پہر ۴۱۳
[illegible] ، ۴۱۸
[illegible] ۴۱۷
رباعیات ، ۴۲۴
بسنت ، ۴۲۵
نامہ لے کے کون ، ۴۲۷

سنبل و سلاسل

۱۹۴۷ء

رفیقۂ حیات سے ، ۴۲۸
مستقبلِ ہندوستان ، ۴۳۰
اے جانِ من ، ۴۳۱
رباعیات ، ۴۳۶

سیف و سبو

شام کا رومان ۴۳۹
برسات کی چاندنی ۴۴۰
تعاقب ۴۴۰
ہنوز ۴۴۲
حی علیٰ خیر العمل ۴۴۳
رباعیات ۴۴۳

سرود و خروش

۱۹۵۲ء

ماتمِ آزادی ۴۴۴
مناجات ۴۵۲
کھوکھلے دعوے ۴۶۱

سموم و صبا

۱۹۵۴ء

نگاہ ابن مردہ ، ۴۶۲
بیسے بعد ، ۴۶۳
وہی رفتار ، ۴۶۴
کلکتہ ۴۶۵
اعترافِ عجز ، ۴۶۸
کب تک ۴۷۲
بچھو کا ۴۷۴
رباعیات ۴۷۵

طلوعِ فکر

۱۹۵۷ء

منتخب بند ۴۷۷

نئی نظمیں

گل بدنی ۴۸۳
آگ ۴۸۵
لافانی حروف ۴۸۸

لسان العصر اکبر الٰہ آبادی

پہلی رائے

مکرم جذبات شبیر حسن خاں، جوش رئیس زادے ہیں، شرافت اور وضع داری کے نشان ان میں بہت نمایاں ہیں۔ حقائق عالم اور معرفت باری تعالیٰ میں ان کے اشعار نہایت بلیغ و دل آویز ہوتے ہیں اور یہ اُن کا فطری جوہر ہے۔

آپ کی نثر بھی خوب ہے۔ کیوں نہ ہو، آپ اہل دل بھی ہیں، اہل زبان بھی۔ میری خوش نصیبی ہوگی کہ میرے بعد آپ جیسے یاد کرنے والے باقی رہیں۔ آپ کا شعر ؎

فنا ہو جا، چھلک اٹھے گا سینہ شمعِ عرفاں سے
ابھی تو دل کے آئینے پہ غافل داغِ ہستی ہے

عجیب شعر ہے۔ داغِ ہستی کے متعلق بہت کچھ خیالات ذہن میں ہیں جنہیں لکھ نہیں سکتا۔ اس شعر نے روح کو تازہ کر دیا۔

اس وقت آپ کی طبیعت کا جو رنگ ہے، اس پر ایک اعلیٰ پرتو پڑ رہا ہے جس کے لئے صرف شعر ہی کافی نہیں۔ آپ کو اپنی قدر کرنا چاہیے، آپ بہت کچھ ہو سکتے ہیں۔ کوشش کیجیے کہ نماز میں لذت ملے، اور علم باطن حاصل کیجیے۔

یہ پُرجوش طبیعت ہونہار ہے۔ نثر میں ندرت تشبیہات سے آپ کے ذہن کی قوت ظاہر ہوتی ہے۔ خدا مبارک کرے۔ کاش کسی وقت میں، آپ اور اقبال یکجا ہوتے۔

آپ کی صحبت روحانی غذا ہے۔ عبرت، معرفت، بے خودی، جوش روحانی سے آپ کے اشعار لبریز ہوتے ہیں۔ آپ نے چشم بد دور عمدہ طرز بیان پایا ہے۔ بابی سوسائٹی میں رہ کر ایسے خیالات عالی حیرت افزا ہیں۔

مجھے آپ سے روحانی محبت ہے۔ آپ کے تصور سے دل کو فرحت ہوتی ہے۔ خدا آپ کو زندہ اور بزم معنی کو آپ کی ذات سے روشن رکھے۔

اکبر از الٰہ آباد

(منقول از 'روحِ ادب'۔ ۱۹۲۰ء)

شرر لکھنوی

پہلا تبصرہ

از زمیں تا بہ آسماں سخن است

عالم کے نامحدود جلوے کسی فضل کسی دور کے محتاج نہیں، صرف معرفت سے بھرا ہوا دل اور حقیقت نگر آنکھیں درکار ہیں۔ ہستی کے وہ جوہر لطیف، قدرت کے وہ رنگین لطیفے، جنہیں عام نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں۔ فطری شاعر انہیں صرف دیکھتا ہی نہیں بلکہ اُن سے گفتگو کرتا ہے اور ان سے محو راز و نیاز ہو جاتا ہے۔

آج اُن تمام جواہر و لطائف سے لبریز ایک نظم و نثر کا مجموعہ، سبد گل کی طرح میرے سامنے ہے جس کے تازہ پھولوں کی شمیم اطرافِ عالم میں پھیل چکی ہے۔ یہ مجموعہ تیار ہونے سے پہلے ہی اپنی دل فریبی کے نقشے میرے دل کے ایوان میں مکوّن کر چکا۔

یہ تصنیف ایک ایسے خاندانی رئیس کی کوششوں کا نتیجہ ہے جس کے اوصاف لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادی کی گراں قدر تحریر سے ظاہر ہیں۔ کچھ کیفیت میرے مکرم دوست منشی رفیع احمد خاں ایم اے نے حوالۂ قلم کی ہے اور سچ پوچھو تو اس تصنیف کا حق ادا کیا ہے۔

آپ کے کلام میں جو رنگینیاں، جو بلند ہونے والے سچے جذبات، بے مثل استعاروں اور نازک تشبیہوں کے باریک پردوں میں چھپائے گئے ہیں" وہ سب کے سب انسانی فطرت کو بلندیوں کی طرف ہدایت کرنے والے اور روحانیت میں جان ڈال دینے والے ہیں۔

ایسی حکیمانہ اور عارفانہ شاعری اور اس میں اس قدر خوبیاں محض آپ کی خداداد طبیعت کا نتیجہ ہے۔ آپ کی شاعری مصوری کا جذبۂ اتم بھی اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ اس کا ثبوت بعض مضامین کی وہ نظر فریب رنگین تصویریں ہیں، جو بہت اہتمام سے تیار کرائی گئی ہیں۔ اور اس بات کا نمونہ بنائی گئی ہیں کہ دیکھو ہماری اردو شاعری اس صورت سے بھی ترقی کے مدارج قبول کر سکتی ہے۔ اور یہ تصویریں ہماری شاعرانہ ترقی کے لئے دراصل نئے قسم کے تراشے ہوئے بلوریں زینے ہیں جنہیں طے کرنے کے بعد انسانی دماغ وہاں پہونچ سکتا ہے، جہاں آفتاب و ماہتاب کی قندیلیں روشن ہیں۔ اور جہاں کی معنویت بیان میں آ ہی نہیں سکتی۔ مصور جذبات حضرت جوش کا یہ حسن و جمال اور یہ حقائق و معارف !! یہ بات ایسی ہے کہ دنگ ہو جانا پڑتا ہے۔ اور حضرت اکبر کے اس قول کی تائید کرنا پڑتی ہے کہ " آپ اہلِ دل بھی ہیں اور اہلِ زبان بھی"!

راقم حضرت جوش کا ایک قدیم نیاز مند: شرر لکھنوی

(منقول از 'روح ادب' ۔ ۱۹۲۰ء)

(۱)

روحِ ادب

(منظومات)

گریۂ مسرت

نازنین و ضعیف اک بیوی یادِ شوہر میں سست بیٹھی تھی
غم زدہ، مضمحل، پریشاں حال شکل غمگین، پُرشکن خط و خال
سوزِ ہجراں کی آنچ سینے میں! پھر وہ برسات کے مہینے میں!
اُودی اُودی گھٹائیں آتی تھیں اُس کے دل پر بلائیں آتی تھیں
دل میں کہتی تھی "کب وہ آئیں گے کب یہ دن بیکسی کے جائیں گے"
منہمک تھی انہیں خیالوں میں غرق تھی ہجر کے ملالوں میں
در و دیوار پر اداسی تھی چشم و ابرو پہ بدحواسی تھی

دفعتاً چاپ سی ہوئی محسوس
ہل گیا خوف سے دلِ مایوس

یک بیک بام و در جھلک اٹھے در و دیوار سب مہک اٹھے

اس نے حیرت سے مڑ کے جب دیکھا
پیارے شوہر کو پشت پر پایا!

آنکھ اٹھاتے ہی ہو گئی حیرت سامنے اس کے تھی وہی صورت
روز روتی تھی اس کی فرقت میں اشک بہنے لگے مسرت میں

ہنس کے شوہر نے چھیڑ سے پوچھا
میرے آنے سے کیا ہوئی ایذا؟

دل کے چشمے یہ کیوں اُبل آئے؟
اشک کیوں دفعتاً نکل آئے؟

سُن کے شوہر کا یہ عجیب خیال　　عرض کرنے لگی وہ دل کا حال
بولی "آنکھیں تھیں ہجر سے خونبار　　ہوگئی تھیں فراق سے بیمار
تابشِ حسن نے دوا بخشی　　لذتِ دید نے شفا بخشی
یہ مری آنکھ میں جو آنسو ہیں　　ان میں صدہا خوشی کے پہلو ہیں

پردۂ اشک میں مسرت ہے
آج آنکھوں کا غسلِ صحت ہے!"

خیالاتِ زرّیں

تو رازِ فراغت کیا جانے، محدود تری آگاہی ہے
اپنے کو پریشاں حال سمجھنا عقل کی یہ کوتاہی ہے
دولت کیا؟ اک روگ ہے دل کا حرص نہیں گمراہی ہے
دنیا سے بے پروا رہنا سب سے بڑی یہ شاہی ہے

اس قول کو میرے مانے گا جو صاحبِ دل بن جاتا ہے
کہتے ہیں جسے شاہنشاہی حاجت کا روا ہو جانا ہے

پینے کو میسّر پانی ہے، کھانے کے لئے حاضر ہے غذا
تفریح کو سبزہ جنگل کا صحت کی محافظ صاف ہوا
پوشش کے لئے ملبوس بھی ہے رہنے کو مکاں بھی ستھرا سا
اور اس کے سوا کیا حاجت ہے انصاف تو کر تو دل میں ذرا

راحت کے لئے جو ساماں ہیں قدرت نے بہم پہنچائے ہیں
اے بندۂ زر! پھر تیری ہوس نے پاؤں کیوں پھیلائے ہیں

دولت کا نتیجہ کلفت ہے، سامانِ امارت ذلت ہے
جس دل میں ہوس کی کثرت ہے، دور اس سے حقیقی راحت ہے

ارماں بہت ہیں کم کر دے ہستی یہ نہیں اک غفلت ہے
آغاز سراپا دھوکا ہے، انجام سراسر عبرت ہے

تاریخ اٹھا بتلائے گی وہ، دنیا میں خوشی کا نام نہیں
جس دل پہ ہوس کا سکہ ہے اس دل کے لئے آرام نہیں

صحت ہیں تری کچھ ہرج نہیں، اعضا میں ترے نقصان نہیں
پھر بھی یہ شکایت تجھ کو ہے "اسباب نہیں سامان نہیں"

انعام خدا کا منکر ہے، اللہ پہ اطمینان نہیں
تو حرص و ہوا کا بندہ ہے، مضبوط ترا ایمان نہیں

دنیا کی حکومت تیری ہے اپنے کو گدا کیوں کہتا ہے
سامان فراغت حاضر ہیں بے کار پریشاں رہتا ہے

یہ ابر، یہ وادی، یہ گلشن، یہ کوہ و بیاباں یہ صحرا
یہ پھول، یہ کلیاں، یہ سبزہ، یہ موسم گل، یہ سرد ہوا
یہ شام کی دل کش تفریحیں، یہ رات کا گہرا سناٹا
یہ پچھلے پہر کی رنگینی، یہ نور سحر، یہ موج صبا

معبود کی کس کس بخشش کو منکر ہے گا چھپائے جائے گا
اللہ کی کس کس نعمت کو اے منکر دیں جھٹلائے گا

اللہ کی رحمت عام ہے سب پر شاہ ہو اس میں یا ہو گدا
یہ چاند، یہ سورج، یہ تارے، یہ نغمۂ بلبل، یہ دریا
دونوں کے لئے یہ تحفے ہیں، کچھ فرق اگر ہے تو اتنا
ان جلووں سے لذت پاتا ہے آزاد کا دل منعم سے سوا

شاہوں کے سروں میں تاج گراں سے درد سا اکثر رہتا ہے
جو اہل صفا ہیں ان کے دل میں نور کا چشمہ بہتا ہے

آگاہ ہو جو تو چاہتا ہے دنیا میں نہیں وہ ہونے کا
اسباب طرب کا جویا تو، سامان یہاں ہے رونے کا

"دولت" کو بھلا کیا سمجھا ہے اخلاق کی قوت کھونے کا؟
ایمان کے دل کا داغ ہے یہ، سکّہ یہ نہیں ہے سونے کا

کیا کرتا ہے ناداں؟ بھاگ اِدھر سے نار ہے ان دیناروں میں
یوں ہاتھ نہ ڈال اِن دوزخ کے لَو دیتے ہوئے انگاروں میں

اسبابِ تموّل زنجیریں، ایوانِ حکومت زنداں ہے
دلچسپ جسے تو سمجھا ہے، وحشت کا وہ ساز و ساماں ہے
سکّوں کی چمک پر مرتا ہے، دولت کے لئے سرگرداں ہے
تو رازِ فنا معلوم تو کر دنیا کے لئے کیوں حیراں ہے

اُس شے سے تعلق ہی کیسا، جو چیز کہ جلنے والی ہے
سامانِ تعیش جمع کئے جا! موت بھی آنے والی ہے

آراستہ ہو کر جلووں سے جب سامنے دنیا آتی ہے،
راحت کے ترانے گاتی ہے، دولت کی چمک دکھلاتی ہے
جب آنکھ پہ قبضہ کرتی ہے، سینے میں ہوس بھڑکاتی ہے
ایمان و یقیں کی شمعِ درخشاں بن کے دھواں اڑجاتی ہے

ملتا ہی نہیں ہے جسم سے پھر جب عضو کوئی کٹ جاتا ہے
بس یونہی ہوس کے بندے کا معبود سے دل ہٹ جاتا ہے

شاہوں کی امارت جسمانی، قانع کی حکومت روحانی
ظاہر کی مسرت سلطاں کو، آزاد کو لذّت وجدانی
دنیا کے تماشے عبرت زا، عقبےٰ کے مناظر لاثانی
مرنے میں حقیقی آزادی، جینے میں سراسر حیرانی

بندے جو ذرا بھی عقل ہے تجھ میں نام جہاں میں کر جانا
اللہ اگر توفیق تجھے دے موت سے پہلے مر جانا

آرام کی خواہش مہمل ہے، یہ "قبر" نہیں ہے دنیا ہے
یہ زیست نہیں ہے "کلفت" ہے، یہ "سانس" نہیں ہے ایذا ہے

آگاہ ہو اے ناداں! کدھر تو پیاس بجھانے جاتا ہے
ذرّوں کی چمک کا یہ چشمہ، یہ ریگِ رواں کا دریا ہے!

سُن جوش کی باتیں غور سے تو مشتاق نہ بن اس ابذل کا
اے دوست! "یہ دنیا" سایہ ہے گرمی کے پریشاں بادل کا

حالاتِ حاضرہ (بزمانۂ جنگ)

ہر چیز پہ سکوت ہے ہر شے پہ یاس ہے — غم حکمراں ہے دہر میں دنیا اُداس ہے
جلوے ہیں شامِ غم میں نہاں صبحِ عید کے — دھندلے ہیں خط و خال عروسِ امید کے
کشتی رواں ہے زیست کی دریائے زہر میں — بجلی تڑپ رہی ہے مسرت کی لہر میں
عالم ہے شاخِ گل میں عجب پیچ و تاب کا — کانٹے ہیں اور پھول نہیں ہے گلاب کا
"لذّت" اُٹھی ہے خوابِ وسعتِ خیال سے — "آب" آئینے سے "قوتِ برقی" نہال سے
صبحیں چھپی ہیں فکر کی پُر ہول رات میں — دورا ہے زہر چشمۂ آبِ حیات میں
تابندگی کے راز سے محرم نہیں رہے — وہ رُوئے گل پہ قطرۂ شبنم نہیں رہے
فطرت کو انتظام پہ قدرت نہیں رہی — پانی گھٹا میں پھول میں نکہت نہیں رہی
سینوں میں قلب برف کے مانند سرد ہیں — بس حد ہوئی کہ چہرۂ خوباں بھی زرد ہیں
سلطاں بڑھے ہیں دہر کے لشکر لئے ہوئے — اور ان کے ساتھ قحط بھی خنجر لئے ہوئے
یہ جنگ کیا ہے؟ ایک مجسّم جنون ہے — گلزارِ کائنات کے تھالوں میں خون ہے
خلقت تمام قحط سے بے آب و دانہ ہے — اس پر وبا کا زور یہ کیسا زمانہ ہے
عالم کے بام و در میں مریضوں کی آہ ہے — دنیائے طب ہجومِ مرض کی گواہ ہے
نسخوں سے تھک گئی ہیں غریبوں کی انگلیاں — نبضوں نے کیں نگار طبیبوں کی انگلیاں
اب حد کے اختیار میں قیمت نہیں رہی — "ڈاکہ" رہا ہے رسمِ تجارت نہیں رہی
خنجر سے غم کے رشتۂ آرام کٹ گیا — شعلے سے آتشی کے اندھیرا لپٹ گیا
پچھلے پہر میں اب وہ صباحت نہیں رہی — وہ جھٹپٹے کی سانولی صورت نہیں رہی
گرمی کی شام اور کوئی بانکپن نہیں! — جاڑوں کی صبح، اور سنہری کرن نہیں!

ہستی کی مملکت میں تباہی کا راج ہے!　　　ہشیار ہو کہ فرقِ مصیبت پہ تاج ہے!

محویتِ جنوں میں مری یاس مٹ گئی!

دل یوں مٹا کہ قوتِ احساس مٹ گئی!

حقیقتِ دل

آئیں اسکول کے احباب سنیں دردِ مرا　　　گرم کردے گا ہو، ہر نفسِ سرد مرا

آئیں بیٹھیں، مری تقریر سنیں، غور کریں　　　عافیت کا کوئی سامان، بہر طور کریں

کیوں شکایت ہے کہ پڑھنے کا اسے شوق نہیں　　　دل میں تحصیلِ کمالات کا کچھ ذوق نہیں؟

مدرسہ کیوں نہیں آتا، یہ شکایت کیا ہے　　　کاش پوچھیں تو ترے دل پہ مصیبت کیا ہے؟

آئیں اور جھک کے سنیں کان لگا کر باتیں

تیغ باتیں ہیں چھری باتیں ہیں خنجر باتیں

میں لڑکپن سے جسے عشقِ کمالات رہا　　　علم حاصل ہو اسی فکر میں دن رات رہا

پڑھائی سے کام تھا مجھ کو نہ کسی ہم سن سے　　　لڑکے کہتے تھے کبھی ہم نہیں کھیلے ان سے

اور اب میں وہی کم بخت کہ پڑھتا ہی نہیں　　　سامنے علم کا میدان ہے بڑھتا ہی نہیں

دل یہ کہتا ہے کہ اب زیست کے دن ہیں تھوڑے　　　حرف گھس گھس کے نظر سے کوئی آنکھیں پھوڑے

دوستو! دل میں خیال اب یہی آیا ہوگا

کیوں ہوا اس میں یکایک یہ تغیر پیدا؟

اپنی تکلیف کے کس طرح بتاؤں اسباب　　　ہوگا مجھ سا بھی نہ دنیا میں کوئی خانہ خراب

غور سے اب مرے پڑھنے کی حکایت سنئے

دل کا جب تک نہ کہوں حال کوئی کیا جانے؟

(۱)

ایک تنکا بھی اگر آنکھ میں پڑ جاتا ہے　　　آدمی ہے کوئی ایسا جسے چین آتا ہے؟

- - - - - - - - - - - - - - - -　　　- - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - -　　　- - - - - - - - - - - -

چین لینے دیں بھلا کب مجھے ایسی آنکھیں؟
جن کے پردوں میں سمائی ہوں کسی کی آنکھیں؟

(۲)

اکثر آنکھوں کی اذیت کو بھلا دیتا ہوں ۔ میز سے بڑھ کے کتاب ایک اٹھا لیتا ہوں
لیکن آساں نہیں اس قلب کا شاداں ہونا ۔ جس کی تقدیر میں لکھا ہو پریشاں ہونا
روبرو آنکھ کے جس وقت کتاب آتی ہے ۔ اک جھلک صفحۂ قرطاس پہ پڑ جاتی ہے
نقطہ نقطہ نظر آتا ہے مجھے برق لباس ۔ شمعیں جل اٹھتی ہیں ہر مرکز دائرے کے پاس
دیر تک کچھ نظر آتا نہیں بجلی کے سوا ۔ دفعتاً ہوتی ہے ہر سطر میں جنبش پیدا
حرف دب جاتے ہیں کچھ دیر میں رفتہ رفتہ ۔ صاف کھنچ جاتا ہے ہر لفظ پہ اُن کا نقشہ!

(۳)

جب کیا قصد کریں یاد کتابیں سن کر ۔ ہم سبق آئے سنانے کہ اُٹھا دردِ جگر
یک بیک جوش ہوا ذہن و ذکا میں پیدا
اک ترنم سا ہوا فوجِ ہوا میں پیدا
دوست کی آئی صدا جس بن لگا نہ میرا ۔ کان رکھتا ہے تو سن دل سے فسانہ میرا
میری آواز کی پابند سماعت تیری ۔ گھیر لی ہے مرے جلوے نے بصارت تیری
عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن ۔ دل بدستِ دگرے دادن و حیراں بودن
جوشؔ تعلیم کجا، عشقِ جگر دوز کجا؟
محفلِ علم کجا، جلوۂ گھر سوز کجا؟

ایک نغمہ

مرے قلب کو زندگی دو، جِلاؤ ۔ حقیقت کی محفل سے پردہ اُٹھاؤ
میں قطرہ ہوں مجھ کو سمندر بناؤ ۔ کچھ اس طرح تا دیر نغمے سناؤ
یونہی پیاری چڑیو! ابھی اور گاؤ

مہکتے ہوئے پھول کے پاس آؤ　　لچکتی ہوئی شاخ پر بیٹھ جاؤ
ہوا میں کبھی اڑ کے بازو ہلاؤ　　کبھی صاف چشمے میں غوطہ لگاؤ
یونہی پیاری چڑیو! ابھی اور گاؤ

پھدک کر ادھر سے اُدھر دوڑ جاؤ　　چہک کر ادھر سے اِدھر پر ہلاؤ
چہک کر کبھی شاخ پر چہچہاؤ　　اُچھل کر کبھی نہر پر گنگناؤ
یونہی پیاری چڑیو! ابھی اور گاؤ

کبھی برگ تازہ کو منہ میں دباؤ　　کبھی کنج میں بیٹھ کر پھڑپھڑاؤ
کبھی گھاس پر لوٹ کر دل لبھاؤ　　کبھی جا کے بیلوں کو جھولا جھلاؤ
یونہی پیاری چڑیو! ابھی اور گاؤ

نہیں جاگتی رُوح میری جگاؤ　　میں غفلت میں ہوں دل پہ چرکے لگاؤ
کوئی سرمدی ساز کی گت بجاؤ　　مجھے اپنے نغموں کے معنی بتاؤ
یونہی پیاری چڑیو! ابھی اور گاؤ

میں بے تاب ہوں مجھ کو جلوہ دکھاؤ　　میں گمراہ ہوں مجھ کو رستہ بتاؤ
نہ جھجکو نہ سمٹو نہ کچھ خوف کھاؤ　　مرے پاس آؤ، مرے پاس آؤ!
یونہی پیاری چڑیو! ابھی اور گاؤ

ہماری سیر

لوگ ہنستے ہیں، چھپاتے ہیں　　شام کو سیر سے جب آتے ہیں
لیمپ کی روشنی میں یاروں کو　　داستانیں نئی سناتے ہیں

ہم پلٹتے ہیں جب گلستاں سے　　آہ بھرتے ہیں، تھرتھراتے ہیں
میز پر سر سے پھینک کر ٹوپی　　ایک کرسی پہ لیٹ جاتے ہیں

آپ سمجھے یہ ماجرا کیا ہے؟　　سُنیے، ہم آپ کو سُناتے ہیں

وہ لگاتے ہیں صرف چکر ہی   ہم مناظر سے دل لگاتے ہیں
وہ نظر ڈالتے ہیں لہروں پر   اور ہم تہہ میں ڈوب جاتے ہیں
گھر پلٹتے ہیں وہ "ہوا" کھا کر
اور ہم "زخم" کھا کے آتے ہیں

محسوسات

(قطعات)

تاریک رات اپنی سیاہی میں جس طرح   ہے انجلائے نور کو پنہاں کئے ہوئے
یوں ہیں ترے خیال میں بیٹھا ہوا ہوں میں   آنکھوں کو بند دل کو فروزاں کئے ہوئے

"پپیہا" جب تڑپتا ہے گھٹا میں پی کہاں کہہ کر   ہماری روح سوزِ عشق سے اس طرح جلتی ہے
تلاشِ تربتِ عاشق میں کوئی نازنیں جیسے   بلا کی دھوپ میں پتھر پہ ننگے پاؤں چلتی ہے

غزلیات

(۱)

ہم نے نکالیں سیکڑوں راہیں کچھ بھی سکونِ غم نہ ہوا
جان کو کچھ آرام نہ پہونچا، دل کا دھڑکنا کم نہ ہوا
کیا نزع کی تکلیفوں میں مزا جب موت نہ آئے جوانی پر
کیا لطف جنازہ اٹھنے کا ہر گام پہ جب ماتم نہ ہوا
اشکوں کے نکلنے میں ہے تسلی، دل کے تڑپنے میں ہے مزا
واللہ کہ وہ انسان نہیں، اس راز سے جو محرم نہ ہوا
جب سے نگاہیں تم سے لڑائیں، عیش گیا، آرام گیا
کس صبح کو آہ سرد نہ کھینچی، کون سی شب ماتم نہ ہوا

راحت کا جہاں میں نام نہیں، ایذا کے سوا آرام نہیں
جس روز سے دل نے یہ سمجھا، اُس روز سے کوئی غم نہ ہوا
گھر بھر میں کسی کا پرتو تھا قندیلِ تصور روشن تھی
کیا وجد کے قابل تھا یہ سماں کل رات کو تو ہمدم نہ ہوا

(۲)

بے ہوشیوں نے اور خبر دار کر دیا　　سوئی جو عقل، روح کو بیدار کر دیا
فطرت نے شام ہوتے ہی دریا کو روک کر　　آئینۂ ثوابت و سیار کر دیا
ہم جن تصورات میں رہتے ہیں رات دن　　کتنوں کو اس جنون نے بے کار کر دیا
سوجھا عجیب کاتبِ تقدیر کو مذاق
شاعر بنا کے ہم کو زمیں دار کر دیا

(۳)

عمارت پر نہ جا کچھ بھی نہیں شاہوں کی محفل میں
محبت کا خزانہ ہے مرے ٹوٹے ہوئے دل میں
جب آنکھیں بند کرتا ہوں جھلکتا ہے مرے دل میں
وہ پرتو جو سماتا ہی نہیں ہے چشمِ باطل میں
کبھی جن کا تبسم رُوح کو بیدار کرتا تھا
وہی اب سو رہے ہیں قبر کی تاریک منزل میں
جب آدھی رات پردہ ڈال دیتی ہے زمانے پر
کوئی دربار کرتا ہے مرے کاشانۂ دل میں
کلی مُرجھائی، ٹپکیں شاخِ گل سے خون کی بوندیں
ہوائے گرم یہ کیا کہہ گئی پھولوں کی محفل میں
یہ صوتِ سرمدی ہے، جس پہ تارے رقص کرتے ہیں
یہ حُسنِ دوست ہے جس کی تڑپ ہے ماہِ کامل پر
نظر نے پا لیا ہے انتہائے عیشِ فانی کو

خوشی کے نام سے اب درد اٹھتا ہے مرے دل میں
مری راتیں، مری تخئیل دونوں تجھ سے روشن ہیں
اُتر آ چودھویں کے چاند! رکھ لوں میں تجھے دل میں
مزاج خاکساری میں نزاکت ہے قیامت کی
نہ لے جاؤ مجھے مغرور انسانوں کی محفل میں
صدا دی جب درِ دل پر یہ دنیا نے کہ "حاضر ہوں"
ندا آئی "پلٹ جا، تیری گنجائش نہیں دل میں"
زمانہ ہی بُرا ہے، دُور کیوں جاؤ، ہمیں دیکھو!
جواں ہیں اور کوئی ولولہ باقی نہیں دل میں
سبق لیتا ہے اکثر معرفت کا فلسفہ ہم سے
کہ ہم ڈوبے ہوئے ہیں جوشؔ روحانی مسائل میں

(۴)

یوں ہم اس شوخ کو پہلو میں لیے بیٹھے ہیں　　　کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ پیے بیٹھے ہیں
تم سے اظہارِ خیالات کریں یا مر جائیں　　　آج اس بات کا ہم عہد کیے بیٹھے ہیں
ضد دلانا جو ہے مقصود تبسم کو ترے　　　ہم پھر آج اپنے گریباں کو سیے بیٹھے ہیں
ہنس رہے ہیں شبِ عذ و دہ مکاں میں اپنے　　　ہم ادھر عیش کا سامان کیے بیٹھے ہیں
جو مقدر میں ہے وہ بن کے رہے گا اے جوشؔ
آپ کیوں دل کو پریشان کیے بیٹھے ہیں

(۵)

جب سے مرنے کی جی میں ٹھانی ہے　　　کس قدر ہم کو شادمانی ہے
شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے　　　یہ مرا فنِ خاندانی ہے
کیوں لبِ التجا کو دوں جنبش　　　تم نہ مانو گے اور نہ مانی ہے
رُوح کیا؟ آہ کی خفیف ہوا　　　خون کیا؟ آنسوؤں کا پانی ہے
آپ ہم کو سکھائیں رسمِ وفا　　　مہربانی ہے مہربانی ہے

افکار — جوش نمبر

دل ملا ہے جنہیں ہمہ رہا سا — تلخ اُن سب کی زندگانی ہے

کوئی صدمہ ضرور پہونچے گا

آج کچھ دل کو شادمانی ہے

(۶)

تجربہ کے دشت سے دل کو گزرنے کے لئے — روز اک صورت نئی ہے غور کرنے کے لئے

جب کوئی بنتا ہے لاکھوں ہستیوں کو میٹ کر — صبح تاروں کو دباتی ہے ابھرنے کے لئے

حاملِ اسرارِ فطرت ہوں گدا بھی ہوں تو کیا — بات یہ کافی ہے مجھ کو فخر کرنے کے لئے

روح کو چمکا، خودی کو توڑ کر زینے بنا — دو یہ تدبیریں ہیں دنیا میں ابھرنے کے لئے

غور سے دیکھا نظامِ دہر تو ثابت ہوا — آدمی پیدا ہوا ہے کام کرنے کے لئے

صبح اٹھ کر آنسوؤں سے خون کے روتا ہوں میں — دل کے نقشہ میں وفا کا رنگ بھرنے کے لئے

گوہرِ مقصود ملتا ہے، ہمت شرط ہے — مضطرب رہتا ہے ہر موتی ابھرنے کے لئے

آنکھ سرمائی ہوئی ہے بال پیشانی پہ ہیں — آئینہ خانے میں جاتے ہیں سنورنے کے لئے

کہہ دو دنیا کے حوادث سے نہ چھیڑیں اس طرح

جوش ہم تیار ہی بیٹھے ہیں مرنے کے لئے

ستارے (متفرق اشعار)

ہر سمے رونے کا [illegible] نغمہ ہے — عشرت کا بہترین حصہ ہے

رنگیں رخوں نے ذبح کیا دل کو ریل پر — مرنے کو اور جائیے "پنجاب میل" پر

بات رہ جاتی ہے اس پہ مرتے ہیں — ہم جو کہتے ہیں کر گزرتے ہیں

کذب شیوہ نہیں مرا میں سخن ساز نہیں — اپنے نغمے کی مرے ساز میں آواز نہیں

ہر اسٹیشن پہ دو اک زخم کاری دل پہ کھاتے ہیں — سفر کرتے ہیں یا ہم جنگ کے میداں میں جاتے ہیں

تعبیر خیز یہ دنیا کی رُت ہے — لبوں پر ہے خدا سینے میں بُت ہے

وہ سامنے ہیں دل میں تلاطم خدا بچائے — دو ڈاک گاڑیوں میں تصادم خدا بچائے

کہتے ہو غم سے پریشان ہوئے جاتے ہیں — یہ نہیں کہتے کہ انسان ہوئے جاتے ہیں

تنہا [illegible] پر ہجوم [illegible] کبھی ایسا نہ تھا — آج ہے دل پر جو سناٹا کبھی ایسا نہ تھا

(۲)

نقش و نگار

(نگار خانہ)

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا رَین کا جاگا نیند کا ماتا
نیند کا ماتا، دھوم مچاتا انگڑائیاں لیتا، بل کھاتا
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

رُخ پہ سُرخی آنکھ میں جادو بھینی بھینی بو میں خوشبو
بانکی چتون، سمٹے ابرو نیچی نظریں بکھرے گیسو
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

نیند کی لہریں گنگا جمنی جلد کے نیچے ہلکی ہلکی
آنچل ڈھلکا مسکی ساری ہلکی مہندی دھندلی بندی
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

ڈوبا ہوا رُخ تابانی میں انوارِ سحر پیشانی میں
یا آبِ گہر طغیانی میں یا چاند کا ٹکڑا پانی میں
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

رُخسار پہ موجِ رنگینی چھٹکی چاندنی بھیگی بھینی
آنکھوں میں نقوشِ خود بینی مکھڑے پہ سحر کی شیرینی
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

آنکھ میں غلطاں عشرت گاہیں   نیند کی سانسیں جیسے آہیں
بکھری زلفیں عریاں باہیں   جان سے ماریں جب کو چاہیں

یہ کون اٹھا ہے شرماتا

پھیلا پھیلا آنکھ میں کاجل   الجھا الجھا زلف کا بادل
نازک گردن پھول سی ہیکل   سرخ پپوٹے نیند سے بوجھل

یہ کون اٹھا ہے شرماتا

کچھ جاگ رہی کچھ سوتی ہے   ہر موج صبا منہ دھوتی ہے
ناشستہ رخ یا موتی ہے   انگڑائی سے جز بز ہوتی ہے

یہ کون اٹھا ہے شرماتا

چہرہ پھیکا نیند کے مارے   پھیکے پن میں شہد کے دھارے
جو بھی دیکھے جان کو وارے   دھرتی ماتا بوجھ سہارے

یہ کون اٹھا ہے شرماتا

ہلچل میں دل کی بستی ہے   طوفانِ جنوں میں ہستی ہے
آنکھ میں شب کی مستی ہے   اور مستی دل کو ڈستی ہے

یہ کون اٹھا ہے شرماتا

(سنہ ۱۹۲۵ء)

جمنا کے کنارے

خورشید طلوع ہو رہا ہے   افسانہ شروع ہو رہا ہے
جلووں کی ہے چھوٹ شاخسار پر   رقصاں ہے شعاع ہر کلس پر
رہ رہ کے جھلک رہا ہے پیہم   ہر ذرۂ خاک دامنِ عالم
گردوں کی جبیں دمک رہی ہے   پودوں کی کمر لچک رہی ہے
جاگے ہیں طیور چہچہاتے   چونکے ہیں حسین کسمساتے
مکھڑوں پہ لئے بصد تجلی   شبنم کی نمی، صبا کی خنکی

پونچھیں منہ کو اگر ذرا بھی　　　رومال میں چھوٹ آئے سرخی
رگ رگ میں ہے محو پرفشانی　　　وارستہ مزاج نوجوانی
پھوٹی ہے کرن جو تلملاتی　　　شبنم کی دھڑک رہی ہے چھاتی
لائی ہے نسیم بوئے گیسو　　　گلیوں میں مچل رہی ہے خوشبو

اس عالم رنگ و بو کے اندر
میدان سے اک ذرا سا ہٹ کر

اک قصر قریب رود جمنا　　　لہروں کو بتا رہا ہے مینا
یوں قصر کا عکس ہے سر آب　　　ارماں جیسے ہو دل میں بیتاب

اس قصر کے بام پر کھلے سر
اک زہرہ جبین و ماہ پیکر

نوخیز، حسیں، بلند بالا　　　اوڑھے ہوئے سرمئی دوشالا
افسوں بہ نگاہ و زلف بردوش　　　غرفے میں کھڑی ہوئی ہے خاموش
فردوس کے در کئے ہوئے باز　　　ٹیکے ہوئے کہنیاں بصد ناز
رنگین کلائیوں کے جوڑے　　　چہرے کو ہتھیلیوں پہ رکھے
گل دان میں پھول ہنس رہا ہے　　　قرآں ہے کہ رحل پر دھرا ہے
طوفان ہیں دل ربائیوں کے　　　مڑنے میں لچک کلائیوں کے
آنکھوں میں ہے تاب صبح روشن　　　ہونٹوں میں شگفتگی کا مسکن
انجم کی طرح جبیں پہ ٹیکا　　　خورشید سپہر کم سنی کا
کانوں میں نظر فریب بندے　　　لے کاش کوئی یہ پھول چن لے
چہرے پہ ہے گرم لن ترانی　　　الہڑ، کافرانی جوانی
اک سانس میں نیند سے گرانبار　　　اک سانس میں بیقرار و بیدار
اک سانس میں پاس آ رہی ہے　　　اک سانس میں دور جا رہی ہے
الجھی، بکھری سیاہ زلفیں　　　چھپتی ہوئی نیند انکھڑیوں میں
دریا کی ہوا جو کھا رہی ہے　　　بشاش ہے مسکرا رہی ہے

اور یوں کہ قریب لب ذرا سا — عارض میں پڑا ہوا ہے حلقہ
اس حلقۂ دل نشیں کے اندر — غلطیدہ ہیں ناز کے سمندر
یہ شانِ جمال اللہ اللہ — انسان کے بھیس میں شبِ ماہ
یہ حسن، یہ دلکشی، یہ عالم — سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے شبنم
جس خاک سے گذرے کیمیا ہو — جس بُت پہ نظر کرے خدا ہو

شاعر کا بھی اک حقیر سجدہ
لے دشمنِ دیں قبول فرما
"حُسن تو ہمیشہ در فزوں باد
رویت ہمہ سال لالہ گوں باد
قدِ ہمہ دلبرانِ عالم
در خدمتِ قامتت نگوں باد"

(حافظ)

(سنہ ۱۹۳ء)

گنگا کے گھاٹ پر!

بڑھائے سرخیٔ عارض ہوائے صحرا سے — نہایا کون چلا آ رہا ہے گنگا سے
سرا دُلائی کا سر پر، نظر جھکائے ہوئے — دبائے دانتوں میں آنچل بدن چُرائے ہوئے
لبوں پہ مہرِ خموشی، خموشیوں میں خطاب — کمر میں لوچ جبیں پر دمک نظر میں شراب
قدم قدم پہ تمنائیں دل ستانی کی — رُخِ شگفتہ پہ طغیانیاں جوانی کی
شرابِ ناب لئے نرگسی کٹوروں میں — نموِ حسن کا رواں سُرخ سُرخ ڈوروں میں
دراز زلف میں جادو، سیاہ آنکھ میں مد — نسیمِ صبحِ بنارس، ہلالِ شامِ اودھ
ہوائے صبح سے روشن چراغِ سیم تنی — شگفتہ غسل کے سے مزاجِ گل بدنی
نظر نہ آئے وہ چہرے پہ چادر آبی — بیانِ چشم میں گلکاری شکر خوابی
خنک نسیم سے اُبھرے ہوئے نقوشِ شباب — صبا خمیر میں برسات کی شبِ مہتاب
عجیب حسن ٹپکتا ہے چشم و ابرو سے — مہک رہی ہے ہوا کمسنی کی خوشبو سے

مقابلہ جو کرے کوئی چاند پھیکا ہے　　جبینِ شوخ پہ صندل کا سرخ ٹیکا ہے
نمی ہے زلف میں اشنان کر کے نکلی ہے　　یہ کس کی موت کا ساماں کیے نکلی ہے
لبوں پہ کھیل رہا ہے اثر نہانے کا　　گماں ہوتا ہے ہر بار مسکرانے کا
سیاہ زلف پر آنچل خفیف آبی ہے　　برہنہ پا ہے تو ہر نقشِ پا گلابی ہے
مری طرف سے کوئی کاش یوں ہو گرمِ خطاب　　کہ وقتِ صبح ہے اے دخترِ شبِ مہتاب

ازل کے دن سے درِ حسن کا بھکاری ہوں
ادھر بھی ایک نظر میں ترا پجاری ہوں

(۱۹۲۳ء)

جنگل کی شاہزادی

پیوست ہے جو دل میں وہ تیر کھینچتا ہوں　　اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں
گاڑی میں گنگناتا مسرور جا رہا تھا　　اجمیر کی طرف سے جے پور جا رہا تھا
تیزی سے جنگلوں میں یوں ریل جا رہی تھی　　لیلیٰ ستار اپنا گویا بجا رہی تھی
خورشید چھپ رہا تھا رنگیں پہاڑیوں میں　　طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں
کچھ دور پر تھا پانی، موجیں رکی ہوئی تھیں　　تالاب کے کنارے شاخیں جھکی ہوئی تھیں
لہروں میں کوئی جیسے دل کو ڈبو رہا تھا　　میں سو رہا ہوں ایسا محسوس ہو رہا تھا
اک موجِ کیف پرور دل سے گزر رہی تھی　　ہر چیز دلبری سے یوں رقص کر رہی تھی

تھیں رخصتی کرن سے سب وادیاں سنہری
ناگاہ چلتے چلتے جنگل میں ریل ٹھہری

کانٹوں پہ خوبصورت اک بانسری پڑی ہے　　دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے
زاہد فریب، گل رخ، کافر، دراز مژگاں　　سیمیں بدن، پری رخ، نوخیز، حشر ساماں
خوش چشم، خوبصورت، خوش وضع، ماہ پیکر　　نازک بدن، شکر لب، شیریں ادا، فسوں گر
کافر ادا، شگفتہ، گل پیرہن، سمن بو　　سروِ چمن، سہی قد، رنگیں جمال، خوش رو
گیسو کمند، مہوش، کافور فام، قاتل　　نظارہ سوز، دل کش، سرمستِ شمعِ محفل

ابرو ہلال سے گوں، جاں بخش، رُوح پرور　　　نسریں بدن، پری رُخ، سیمیں عذار، دلبر

آہو نگاہ، نوریں، گُل گوں، بہشت سیما　　　یاقوت لب، صدف گوں، شیریں، بلند بالا

غارت گرِ تحمل، دل سوز، دشمنِ جاں　　　پروردۂ مناظر، دوشیزۂ بیاباں

گلشن فروغ، کم سن، نمونۂ ماہ پارا　　　"دلبر کہ در کفِ او موم است سنگِ خارا"

ہر بات ایک افسوں، ہر سانس ایک جادو　　　قدسی فریب مژگاں، یزداں شکار گیسو

صحرا کی زیب و زینت، فطرت کی نور دیدہ　　　برسات کے ملائم تاروں کی آفریدہ

چہرے پہ رنگِ تمکیں، آنکھوں میں بیقراری　　　ایمائے سینہ کوبی، فرمانِ بادہ خواری

لوہا تپانے والی جلوؤں کی شعلہ فشانی　　　سکّے بٹھانے والی، اٹھتی ہوئی جوانی

ڈوبے ہوئے سب اعضا حسنِ مناسبت میں　　　پالی ہوئی کلوں کے آغوشِ تربیت میں

حسنِ ازل ہے غلطاں شاداب نیچری میں　　　یا جان پڑ گئی ہے جنگل کی تازگی میں

غور میں ہزار دل سے قربان ہو گئی ہیں
رنگینیاں سمٹ کر انسان ہو گئی ہیں

چین ستم گری سے ناآشنا نہیں ہے　　　میں کون ہوں؟ یہ اس کو معلوم ہی نہیں ہے

ہر چیز پر نگاہیں حیرت سے ڈالتی ہے　　　رہ رہ کے اُڑنے والی چادر سنبھالتی ہے

آنچل سنبھالنے میں یوں بل سے کھا رہی ہے
گویا ٹھہر ٹھہر کر انگڑائی آ رہی ہے

کچھ دیر تک تو میں نے اُس کو بغور دیکھا　　　غش کھا رہی تھی عقبیٰ، چکرا رہی تھی دُنیا

گاڑی سے پھر اُتر کر اُس کے قریب آیا　　　طوفانِ بے خودی میں پھر یہ زباں سے نکلا

اے درسِ آدمیت اے شاعری کی جنت　　　اے صانعِ ازل کی نازک ترین صنعت

اے رُوحِ صنفِ نازک اے شمعِ بزمِ عالم　　　اے صبحِ روئے خنداں اے شامِ زلفِ برہم

اے تو کہ تیری نازک ہستی میں کام آئی　　　قدرت کی انتہائی تخیلِ دل رُبائی

چشم و چراغِ صحرا اے نورِ دشت و وادی　　　رنگیں جمال دیوی جنگل کی شاہزادی

بستی میں تو جو آئے، اک حشر سا بپا ہو　　　آبادیوں میں ہلچل، شہروں میں غلغلہ ہو

رندانِ بادہ کش کے ہاتھوں سے جام چھوٹیں　　　تسبیحِ شیخ اُلجھے، توبہ کے عزم ٹوٹیں

نظروں سے اتقا کے رسم و رواج اتریں / زہاد کے عمامے شاہوں کے تاج اتریں
آنکھیں ہوں شک افشاں نالے شرر فشاں ہوں / کیا کیا نہ شاعروں کے ملبوس دھجیاں ہوں
شہروں کے ہوش ول پر اک آسمان ٹوٹے / پروردۂ تمدن عشووں کی نبض چھوٹے
اس سادگی کے آگے نکلیں لبوں سے آہیں / جھک جائیں دلبروں کی خود ساختہ نگاہیں
تیری ادا کے آگے شرما کے منہ چھپائیں / ناپے ہوئے کرشمے، تولی ہوئی ادائیں
تیری نظر کی رو سے ہو جائیں خستہ و گم / مشق و مزاولت کے پالے ہوئے تبسم
امن و اماں کے رخ کو بے آب و رنگ کر دے / دنیا کو حسن تیرا میدان جنگ کر دے
کتنی ہی قسمتوں کے بدلے فلک نوشتے / خون اور دوستی کے کٹ جائیں کتنے رشتے

تصنیف ہوں ہزاروں چھپتے ہوئے فسانے
ان انکھڑیوں کی زد پر کانپیں شراب خانے

تیرے پجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا / اے کاش جنگلوں میں میرا قیام ہوتا
یہ بن یہ گل، یہ چشمے مجھ سے قریب ہوتے / شاعر کے زیر فرماں یہ سب رقیب ہوتے
کیوں میری گفتگو سے حیرت فروش کیوں ہے / اے نازنیوں کی دیوی اتنی خموش کیوں ہے
بجنے لگیں وفا کی محفل میں شادیانے / ہاں تیرے لبوں کو جنبش اے سرمدی ترانے
یوں چپ ہے مجھ سے گویا کچھ کام ہی نہیں ہے / یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے

سننا تھا یہ کہ ظالم اس طرح مسکرائی
فریاد کی نظر نے، ارماں نے دی دہائی:

عشوہ جبیں پہ لے کر دل کی امنگ آیا / چہرے پہ خون دوڑا، آنکھوں میں رنگ آیا
شرما کے آنکھ اٹھائی زلفوں پہ ہاتھ پھیرا / اتنے میں رفتہ رفتہ چھانے لگا اندھیرا
چمکا دیا حیا نے ہر نقش دلبری کو / دانتوں میں یوں دبایا چاندی کی آرسی کو
سن کر مری مچلتی آنکھوں کی داستانیں / اس کی نگاہ میں بھی غلطاں ہوئیں زبانیں
شرما کے پھر دوبارہ زلفوں پہ ہاتھ پھیرا / دیکھا تو چھا چکا تھا میدان پر اندھیرا
کچھ جسم کو چرایا، کچھ سانس کو سنبھالا / کاندھے پہ نرم آنچل انگڑائی لے کے ڈالا
تاریک کر کے میری آنکھوں میں اک زمانہ / جنگل سے سر جھکا کر ہونے لگی روانہ

ہونے لگی روانہ، ارماں نے سر جھکایا — دل کی مشال کانپا رہ رہ کے بن کا سایا
بے ہوش ہو چلا میں، سینے سے آہ نکلی — اتنے میں رات لے کر قندیلِ ماہ نکلی

مڑ کر جو میں نے دیکھا، اُمید مر چکی تھی
پٹری چمک رہی تھی، گاڑی گزر چکی تھی

(سنہ ۱۹۲۲ء)

اشکِ اوّلیں

(۱)

خوشا وہ دن کہ شادابی تھی دل میں بیبِ لڑکپن کی — بہاریں لوٹتی تھی جب وہ میرے ساتھ گلشن کی
کلی روحوں کی کھلتی تھی خنک جاڑوں کی راتوں میں — انگیٹھی کے کنارے نیند اڑ جاتی تھی باتوں میں
ہوائے سرد کے جھونکے ہمیں بے خود بناتے تھے — فرشتوں کی طرح شفاف چشموں میں نہاتے تھے
جب اوجِ چرخ پر ساون کے بادل گھر کے آتے تھے — ہوائے نرم میں کیا کیا نہ ہم دھومیں مچاتے تھے
میں پہروں نیم کے نیچے لیے جھولا جھلاتا تھا — وہ گاتی تھی، مگر اس کو نہ کچھ آتا نہ جاتا تھا
خفا ہوتے تھے تو اک دوسرے کا منہ چڑاتے تھے — گھروندے صحن میں بن بن کے اکثر ٹوٹ جاتے تھے

نہ دن کو دل دھڑکتا تھا، نہ شب کو آنکھ روتی تھی
محبت اتنی نازک تھی کہ مطلق حس نہ ہوتی تھی

کسے معلوم تھا، اک روز ہوگی سرگرانی بھی — دبے پاؤں چلی آتی ہے تیزی سے جوانی بھی
زمیں پھرتی رہی، ذرّات میں ہوتی رہی گردش — اسی کے ساتھ محسوسات میں ہوتی رہی گردش
بھرے ظالم کے شانے کشتیٔ طفلی کے کھینے سے — کلی کھلتی رہی جلووں کی مبہم سانس لینے سے
جوانی، سینۂ طفلی میں اٹھلاتی رہی برسوں — کوئی مبہم تمنا دل کو گرماتی رہی برسوں
مچلتا سا رہا ذوقِ تماشا آنکھ کے تل میں — تڑپ بھرتی رہی اک غیر محسوس آرزو دل میں
زمینِ برف میں تخمِ شرر بوتی رہی بجلی — تنِ نازک میں رفتہ رفتہ حل ہوتی رہی بجلی
جلا ہوتی رہی پردے ہی میں زلفِ پریشاں پر — زمرد کے ورق چڑھتے رہے رخسارِ تاباں پر

لب و رخسار کو دیتی رہی درسِ درخشانی

دلِ نازک کے نامعلوم ارمانوں کی جولانی

(۳)

نہ دیکھی تھی ابھی دنیا، سمجھ لیتا میں یہ کیوں کر
کہ کچھ دن میں سفر سے کوئی پلٹے گا جواں ہو کر

نظر اب جو اٹھائی تو یکایک دیکھتا کیا ہوں
کہ میں تنہا ہزاروں بجلیوں کی زد پہ بیٹھا ہوں
دلِ نورس سے چھٹنے پہ ہیں نبضیں محبت کی
شناسائی کے ماتھے پر ہیں لہریں اجنبیت کی
نظر میں مضمحل ہیں چشمکیں اگلے زمانے کی
لبِ نازک پہ ہے سکتے میں عادت مسکرانے کی

خلافِ رسم یہ عالم جو میرے روبرو آیا
معاً آنکھوں میں اشکِ اولیں آرزو آیا

نظر پہلے تو آئی اک چمک آنسو کے محمل میں
یکایک کھل گیا پھر اک دریچہ سا مرے دل میں
حریمِ جاں کی میں نے اس دریچے سے زیارت کی
نظر آئی مجھے خونیں کفن دیوی محبت کی
بگولے پھول کو تابوت پر کھلتے ہوئے دیکھا
اجل کو زندگانی سے گلے ملتے ہوئے دیکھا
صدائیں گونج اٹھیں دل میں ہزاروں آبشاروں کی
ہوا چلنے لگی سینے میں لافانی بہاروں کی
معاً اک آگ سی سوزِ دروں نے دل میں بھڑکائی
تمنا کمسنی غم نے لی سینے میں انگڑائی
مرے پہلو میں پہلی مرتبہ اک پھانس سی کھٹکی
گھٹا سی چھا گئی دل پر کڑا سی روح میں چمکی
نرالا خوف، انوکھی کشمکش، ناآشنا ہلچل
گراں جیسے ہوں آنکھیں کچھ دھواں جیسے خواب میں بادل
دکھائی اک نئی دنیا نے کچھ یوں بزم آرائی
یکایک آئے چشمِ کور میں جس طرح بینائی

جہاں کا ذرہ ذرہ دیدۂ حیراں نظر آیا
میں خود اپنے کو اک بدلا ہوا انساں نظر آیا

وہ بھڑکی آگ سینے میں رگ و پے کو تپا ڈالا
زباں سے یہ مری بے ساختہ نکلا - جلا ڈالا
یہ سنتے ہی جبینِ حسن پر پہلی شکن آئی
جلو میں سیکڑوں جلوے لیے گویا دلہن آئی
غرورِ حسن نے بگڑے ہوئے انداز سے دیکھا
نیازِ عشق صدقے ہو گیا اس ناز سے دیکھا
کہا کچھ زیرِ لب زلفیں ہٹا کر روئے تاباں سے
مہک دوشیزگی کی آئی اس عطر افشاں سے
ہوائی گومگو میں پڑ کے غش کھانے لگی گویا
جماہی کی طرح کی سانس نیند آنے لگی گویا

نظر میں آ گیا رنگِ تمنا کھنچ کے سینے سے
گلابی ہو گیا کچھ اور بھی چہرہ پسینے سے

بچا کر آنکھ پرکھا اُس نے میرے دل کی حالت کو
ادا سے پھیر کر آنکھوں پر انگشتِ شہادت کو

اٹھائیں انکھڑیاں رُخ سے ہٹا کر کاکلِ مشکیں
نظر میں یادِ ایامِ طرب نے کروٹیں بدلیں

یکایک کھنچ گیا دل میں تخیل کج ادائی کا
لبوں پر آ چلا کچھ کچھ تبسم دل رُبائی کا

خفیف اک رنگِ الفت حسن کے پندار میں جھلکا
تصورِ صحبتِ دیرینہ کا رخسار میں جھلکا

ستم ہی ڈھا دیا بھولے سے عریاں ہو کے باہوں نے
بقدرِ یک نظر تقصیر کی نیچی نگاہوں نے

گلے پر ہمدمِ طفلی کے تیغِ خوں فشاں پھیری
ذرا سا مسکرا کر سُرخ ہونٹوں پر زباں پھیری

مٹا ڈالا ہے جس ظالم نے میری شادمانی کو
الٰہی! خیر کی توفیق دے اس کی جوانی کو

(سنہ ۱۹۲۳ء)

کوہستانِ دکن کی عورت

یہ اُبلتی عورتیں، اِس چلچلاتی دُھوپ میں
سنگِ اسوَد کی چٹانیں آدمی کے رُوپ میں

واہ کیا کہنا ترا، اے حسنِ ارضِ آفتاب
یہ برشتہ رنگ، یہ تپتے ہوئے سنگیں شباب

ہر سراپا، بت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل
اتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل

چال جیسے تند چشمے، تیوریاں جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں بے مثال

عورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز پتھریلا شباب

یہ جواں چہرے یہ چہروں پہ بے بینائی کا جوش
تو کہے آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش

جسم ہیں کچھ اس قدر ٹھوس، الحفیظ والاماں!
لیجیے چٹکی تو چھل جائیں خود اپنی اُنگلیاں

مچھلیاں شانوں کی ابھری سی، بنی سی کاکلیں
آہن و فولاد کے پٹھے، سلاخوں کی رگیں

دید کے قابل ہے ان کافرینوں کا رنگ رُوپ
کھُب چکی ہے جس میں بارش، رَس چکی ہے جس کو دھوپ

ان بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی الاماں!
پتھروں کا دودھ پی پی کر ہوئی ہیں جو جواں

کنکروں کے فرش پر دنیا سُلاتی ہے جنہیں
آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنہیں

کیا خبر، کتنے دلوں کی جوش پامالی ہوئی
ان اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہیں پالی ہوئی

(سنہ ۱۹۳۴ء)

خمریات

چند جرعے

جرعۂ اوّل

تعالی اللہ شانِ بادہ خواری — نئی ہلچل، نرالی بے قراری
کوئی کروٹ سی دل میں لے رہا ہے — لہو میں کشتیاں سی کھے رہا ہے
یہ کس کی سن رہی ہے روح آہٹ — رگوں میں ہے مسلسل سنسناہٹ
چمکتی ہیں فضائیں بجلیاں سی — لچکتی ہے رگ و پے میں کماں سی
زبس رفتارِ خونِ زندگانی — بغیر اسبابِ شادی، شادمانی
نئی شکلیں ہیں سینے پر منقش — مبارک امتزاجِ آب و آتش
پئے بیٹھا ہوں آج اے زاہدِ خام — شرابِ رندخوار و ساغر آشام
ادھر ہنگامۂ صہبا پرستی — اُدھر آویزشِ تمکین و ہستی
سخن کی داد خود سے پا رہا ہوں — کلی کی طرح کھِلتا جا رہا ہوں

اٹھا ساغر کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زاہد ریائی

جرعۂ دوم

رگ و پے میں ہے غلطاں نوجوانی — ہر اک لمحہ ہے عمرِ جاودانی
مری مٹھی میں ہے رنجِ مہ و سال — نہاں ہے ماضی و مستقبل و حال
ترانے وقت سے آزاد ہو کر — ہوئے ہیں ساز کے پردوں سے باہر

گھٹا سی اک سنہری آ رہی ہے
پھریری پر پھریری آ رہی ہے

گراں زنجیرِ دانش گل رہی ہے
متانت کی جوانی ڈھل رہی ہے

ہواؤں میں ہیں شاہانہ ترانے
اُبلتے ہیں گلابی سے خزانے

سبو کی آگ سے دہکے ہوئے ہیں
فضا میں پھول سے مہکے ہوئے ہیں

چمن بر دوش ہے کوئل کی کوکو
صراحی در بغل پھولوں کی خوشبو

کبھی ظلمت، کبھی انوارِ مہتاب
خدا معلوم بیداری ہے یا خواب

یہ کیسی طرفگی ہے آج ساقی
صراحی میں ہے تو بس جرعہ باقی

اُٹھا ساغر کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زہدِ ریائی

جُرعۂ سوم

تعالی اللہ شانِ مے پرستی
گھٹا سی ہے گرجتی اور برستی

نری ساون کی چڑھتی آ رہی ہے
سوئے میخانہ بڑھتی آ رہی ہے

اٹھی ہیں جھومتی کالی گھٹائیں
گھٹائیں شوخ متوالی گھٹائیں

اُبلتی ہے شرابِ ارغوانی
برستا ہے مزے لے لے کے پانی

سرِ میخانہ حوریں آ رہی ہیں
نگاہیں رام رس ٹپکا رہی ہیں

ہر اک ذرے میں جنباں ہیں بانیں
زمیں پر لوٹتی پھرتی ہیں تانیں

فنا کی بیڑیاں پھر گل رہی ہیں
بقا کی مشعلیں پھر جل رہی ہیں

ہر اک ذرہ کھلا جاتا ہے گویا
گلے آ کر ملا جاتا ہے گویا

بڑھا جاتا سوئے دریا ہوئے وادی
مبارک دولتِ خود اعتمادی!

ہوائیں چل رہی ہیں سنسناتی
مہکتی سرسراتی گنگناتی

شریعت پر تباہی آ رہی ہے
مشیت کو جماہی آ رہی ہے

اُٹھا ساغر کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زہدِ ریائی

جُرعۂ چہارم

عجب شاہانہ کیفیت ہے طاری　　ستاروں پر ہے میرا حکم جاری
زمیں اس وقت اک وہم و گماں ہے　　مرے شہپر کے نیچے آسماں ہے
ابد کا نور رقصاں ہے جبیں پر　　خلا ہے وقت کے سینے کے اندر
ہر اک لمحہ ترانے گا رہا ہے　　زمانہ یوں کمر لچکا رہا ہے
برستے ہیں فسوں پرور ترانے　　اُبلتے ہیں جوانی کے فسانے
مجازی صورتوں پر ہے بحالی　　حقائق ہو چکے ہیں لااُبالی
بہکتے، رقص کرتے، لڑکھڑاتے　　اُٹھے ہیں بھنچے دھومیں مچاتے
چمکتی ہیں بتوں کی بالیاں سی　　فضا پر بج رہی ہیں تالیاں سی
جوانی رُوح میں اٹھلا رہی ہے　　نظر پر کاکلیں بکھرا رہی ہے
نہ دل کو امتیاز این و آں ہے　　نہ خود پر بندہ ہونے کا گماں ہے

اٹھا ساغر کہ پھر آواز آئی
کہ یہ مستی بہ از زہدِ ریائی

جُرعۂ پنجم

تعالیٰ اللہ شکستِ خود نمائی　　بھرا ہے خاک میں زورِ خدائی
فلک پر نشہ سا چھایا ہوا ہے　　زمیں کو حال سا آیا ہوا ہے
جوانی ہے زمیں سے آسماں تک　　برابر آسماں سے لامکاں تک
چمن میں فصلِ گل اٹھلا رہی ہے　　ہوا پر عمرِ رفتہ گا رہی ہے
ہتھیلی پر لئے ہوں گلستاں کو　　کہاں کا گلستاں سارے جہاں کو
فلک حیرت سے منہ کھولے ہوئے ہے　　زمیں اُڑنے کو پَر تولے ہوئے ہے
فرشتے ہر طرف منڈلا رہے ہیں　　پیامی آ رہے ہیں جا رہے ہیں
نظر میں صورتیں سی پھر رہی ہیں　　نقابیں اٹھ رہی ہیں گر رہی ہیں

شریعت سے کنارا ہو چکا ہے　　مشیت کا اشارا ہو چکا ہے
جبینِ "حال" پر ہے نقشِ "ماضی"　　کوئی حد بھی ہے ان بدمستیوں کی
زمانے کے بعید و متصل مست　　دماغ عقل پرور مست، دل مست
بقا مست و حیاتِ جاوداں مست　　فنا سرشار و مرگِ ناگہاں مست
ہوائے تاک و برگِ یاسمن مست　　بتِ نوخیز و صہبائے کہن مست
بلند و پست مست و جزو و کل مست　　عنادل مست، گلچیں مست، گل مست
شگوفہ مست و سُنبل مست و چمن مست　　زباں مست و دہاں مست و سخن مست
تدبّر مست، حکمت مست، دیں مست　　عقاید مست، ظن مست و یقیں مست
ملک مست و فلک مست و فضا مست　　قمر مست و فضا مست و صبا مست
مغنّی مست، بربط مست، نَے مست　　سبو کش مست، ساغر مست، مے مست
خزف مست و صدف مست و گہر مست　　شرر مست و حجر مست و شجر مست
جہاں مست و زماں مست و مکاں مست　　عناصر مست، جوہر مست، جاں مست
رواجِ خیر مست و رسمِ شر مست　　سفالیں کوزہ مست و کوزہ گر مست
یہ ہے بدمستیوں کا زور ساقی!　　محیطِ غیب میں ہے شور ساقی!
مجھے ارض و سما سے کد نہیں ہے　　وگرنہ مستیوں کی حد نہیں ہے
اگر چاہوں تو دنیا کو ہلا دوں　　زمیں کیا آسمانوں کو نچا دوں

فلک کیا، عرش کو بھی پست کر دوں
خودی کیسی - خدا کو مست کر دوں

(سنہ ۱۹۲۳ء)

آج کی رات

دیدنی ہے مری محفل کا سماں آج کی رات　　موجِ صہبا میں ہے رقصِ دو جہاں آج کی رات
کُھل گیا ہے کوئی اس طرح گل افشانی پر　　ذرّے ذرّے پہ ہے جنّت کا گماں آج کی رات
قابلِ دید ہے بکھرے ہوئے پھولوں کی بہار　　ہر شکن فرش کی ہے کاہکشاں آج کی رات

ایک موہوم سا نقطہ ہے جہاں ارض و سما
ایسا اک دائرہ ہے رطلِ گراں آج کی رات

اثرِ مے سے ہے پگھلا ہوا سونا گویا
عرق آلودہ رخِ سیم براں آج کی رات

پرتوِ بادۂ روشن سے ہے بے گرد و غبار
افقِ عربدۂ زہرہ وشاں آج کی رات

قابلِ ظلم نہیں فطرتِ خوباں اس وقت
تا درِ جور نہیں طبعِ بتاں آج کی رات

شمع ہے قابلِ پروانۂ آشفتہ مزاج
حسن ہے مائلِ صاحب نظراں آج کی رات

آبِ حیواں کا نہ کر ذکر کہ حاصل ہے مجھے
دولتِ قربِ مسیحا نفساں آج کی رات

جوشِ کہسار کے مانند گذر عالم سے
یہ ہے فرمانِ جہانِ گذراں آج کی رات

اُف ری ساحل پہ غزل ہائے رواں کی ہلچل
اک تلاطم ہے سرِ آبِ رواں آج کی رات

غلغلہ ساز کا ہے دیرِ مغاں سے لے کر
تا بہ خلوت گہہ حورانِ جناں آج کی رات

جیسے بھیگی ہوئی زلفوں کی مہک عود آمیز
نفسِ شام ہے یوں مشک فشاں آج کی رات

خادمانِ درِ ساقی کے سروں پر کج ہے
کلہِ خواجگیِ کون و مکاں آج کی رات

تلقہ باندھے ہوئے مے خوار ہیں سرگرمِ طواف
جوشؔ ہے قبلۂ رندانِ جہاں آج کی رات

(سنہ ۱۹۲۴ء)

صبحِ میکدہ

مے خانے کو صبح جا کے دیکھا
عالم تھا سکوتِ خواب کا سا

ہلکی سی وہ روشنی گلابی
کہتی تھی کہاں گئے شرابی

تھیں فرش پہ سلوٹیں سی ہر سو
زانو سے ملے تھے شب کو زانو

پیدا تھا سکوت سے ترانہ
تھی فرش کی ہر شکن فسانہ

شیشوں سے جو مے چھلک گئی تھی
رودادِ نشاط کہہ رہی تھی

کچھ نقشِ قدم جہاں بنے تھے
سجدوں کے وہیں نشاں بنے تھے

حجروں کی ہوا بسی ہوئی تھی
خوشبو سے نئی جوانیوں کی

آتی تھی خموشیوں سے ہر بار
رقاصہ کے گھنگروؤں کی جھنکار

شیشوں کے خطوط میں بصد ناز — غلطیدہ تھی ہاؤ ہو کی آواز
گنبد میں تھی محو پرفشانی — اربابِ نظر کی شعر خوانی
پردوں میں مچلتی تھیں زبانیں — پھولوں میں بھری تھیں داستانیں
لہریں سی ہوائیں لے رہے تھے — ملبوس حریر و پرنیاں کے
بالائے ہوا بنے ہوئے تھے — دزدیدہ نگاہیوں کے جادے
چھنچھے سے فضا میں کھل رہے تھے — نظروں کے خطوط مل رہے تھے
آئینوں میں کچھ عیاں تھا کچھ گم — اک زہرہ جمال کا تبسّم
وہ حجلۂ کیف جس میں شب بھر — تھا مطرب و مے سے ایک محشر
سنتا ہی تھا اور نہ رو رہا تھا — جاگا ہوا شب کا سو رہا تھا
نغمے کہ چھڑ رہے تھے شب بھر — آسودہ تھے بام و در کے اندر
حجرے میں تھی رات یوں سمائی — جاذب میں ہو جیسے روشنائی
یوں جذب کئے ہوئے تھے ذرّات — انفاس و تبسّم و خیالات

ذرّوں کو کوئی فشار اگر دے
پھر منعقد ایک بزم کر دے

(سنہ ۱۹۲۶ء)

تاثرات

پروگرام

اے شخص! اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈنا چاہے — وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا
اور صبح کو وہ ناظرِ نظارۂ قدرت — طرفِ چمن و صحنِ بیاباں میں ملے گا
اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی — شہرِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا
اور شام کو وہ مردِ خدا، رندِ خرابات — رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملے گا
اور رات کو وہ خلوتیِ کاکل و رخسار — بزمِ طرب و کوچۂ خوباں میں ملے گا

اور ہو گا کوئی جبر تو وہ بندۂ مجبور
مُردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملے گا

(سنہ ۱۹۳۳ء)

جوانی کی رات

شب، کہ حریمِ ناز میں شور صدا اضطراب تھا　　عشق بھی تھا برہنہ سر حسن بھی بے نقاب تھا
آنکھوں میں روئے یار تھا، آنکھیں تھیں روئے یار پر　　ذرّہ تھا آفتاب میں ذرّے میں آفتاب تھا
خشک تکلّفات کی ٹوٹ چکی تھیں سب حدیں　　چشمکِ بے دریغ تھی خندۂ بے حجاب تھا
حُسن کی بزمِ عشوہ میں شمعِ وفا تھی ضَو فگن　　عشق کی بارگاہ میں زمزمۂ باریاب تھا
سر پہ صُراحیاں لئے رقص کناں تھے مُغبچے　　نرگسِ نیم باز میں رنگِ شرابِ ناب تھا
معرکۂ عظیم تھا ناز میں اور نیاز میں　　زلف میں بھی تھی برہمی دل کو بھی پیچ و تاب تھا
مَوجِ ہوا میں عطر تھا چِھٹکی ہوئی تھی چاندنی　　پھول تھے صحنِ باغ میں چرخ پہ ماہتاب تھا
عشق کی نبضِ تیز میں دوڑ رہی تھیں بجلیاں　　حُسن کے دستِ ناز میں شعلہ مثال رباب تھا
پرتوِ یار اس طرف، رامش و رنگ اس طرف　　چشم بھی فتح مند تھی، گوش بھی کامیاب تھا
درد سے قلب چُور تھے کیف سے رُوح مست تھی　　سوز بھی بے نظیر تھا، ساز بھی لاجواب تھا

ہونٹوں کو وقتِ گفتگو چُومتی تھی شگفتگی
بات جو تھی سو پھول تھی، پھول جو تھا گلاب تھا

اور سحر کو ہم نشیں! آنکھ کھلی تو کیا کہوں　　طاق میں شمع کشتہ تھی، چرخ پہ آفتاب تھا
توبہ شکن گلابیاں، فرش پہ چُور چُور تھیں　　خُلد فروش جامِ زر شرم سے آب آب تھا
نغمۂ رقص و بے خودی جلوۂ حسن و شاعری　　شب کو تھا بحرِ بیکراں، وقتِ سحر سراب تھا
بربط و چنگ کی صدا، ایک فسردہ گونج تھی　　شمع و شراب کا سماں ایک پریدہ خواب تھا
لرزشِ بادہ و خمِ زلفِ سیاہ کے عوض　　تھا تو چراغِ کشتہ کے دُود کا پیچ و تاب تھا

گنبدِ قصرِ عیش میں گونج رہی تھی یہ صدا
رات نہ تھی وہ کیف کی جوش ترا شباب تھا　　(سنہ ۱۹۲۲ء)

الوداع[1]

اے ملیح آباد کے رنگیں گلستاں ، الوداع	الوداع ، اے سرزمینِ صبحِ خنداں الوداع
الوداع ، اے کشورِ شعر و شبستاں الوداع	الوداع ، اے جلوہ گاہِ حسنِ جاناں الوداع

تیرے گھر سے ایک زندہ لاش اُٹھ جانے کو ہے
آ گلے مل لیں کہ آوازِ جرس آنے کو ہے

آ ، کلیجے میں تجھے رکھ لوں مرے "قصرِ سحر"[2]	اس کتابِ دل کے ہیں اوراق تیرے بام و در
جا رہا ہوں تجھ میں کیا کیا یادگاریں چھوڑ کر	آہ کتنے طورِ خوابیدہ ہیں تیرے بام پر

روح ہر شب کو نکل کر میرے جسمِ زار سے
آ کے سر ٹکرائے گی تیرے در و دیوار سے

ہائے کیا کیا نعمتیں مجھ کو ملی تھیں بے بہا	یہ خموشی ، یہ کھلے میدان ، یہ ٹھنڈی ہوا
وائے یہ جاں بخش بستاں ، ہائے یہ رنگیں فضا	مر کے بھی ان کو نہ بھولے گا دلِ درد آشنا

مست کوئل جب دکن کی وادیوں میں گائے گی
یہ سُبک چھاؤں ببولوں کی بہت یاد آئے گی

کل سے کون اس باغ کو رنگیں بنانے آئے گا	کون پھولوں کی ہنسی پر مسکرانے آئے گا
کون اس بستر کو سوتے سے جگانے آئے گا	کون ان پودوں کو سینے سے لگانے آئے گا

کون جاگے گا قمر کے ناز اُٹھانے کے لئے
چاندنی راتوں کو زانو پر سلانے کے لئے

آم کے باغوں میں جب برسات ہوگی پُر خروش	میری فرقت میں لہو روئے گی چشمِ مے فروش
رس کی بوندیں جب اڑا دیں گی گلستانوں کے ہوش	کُنجِ رنگیں میں پکاریں گی ہوائیں "جوش جوش"

سن کے میرا نام موسم غم زدہ ہو جائے گا
ایک محشر سا گلستاں میں بپا ہو جائے گا

---

[1] دکن جاتے ہوئے یہ نظم کہی گئی تھی
[2] مصنف کے مکان کا نام

صبح جب اس سمت آئے گی برافگندہ نقاب　　　آہ کون اس دل کشا میداں میں چھیڑے گا رباب
اس افق پر شب کو جب انگڑائی لے گا ماہتاب　　　چاندنی کے فرش پر لہرائے گا کس کا شباب

جگمگائے گی چمن میں پنکھڑی کس کے لئے
رنگ برسائے گی ساون کی جھڑی کس کے لئے

گھر سے بے گھر کر رہی ہے آہ فکرِ روزگار　　　سرنگوں ہے فرطِ غیرت سے اَب و جد کا وقار
خلعتِ ماضی ہے جسمِ زندگی پر تار تار　　　پھر بھی آنکھوں میں ہے آبائی امارت کا خمار

شمع خلوت میں ہے روشن تیرگی محفل میں ہے
رُخ پہ گردِ بے کسی شانِ ریاست دل میں ہے

کوچ کا پیغام لے کر آگیا مہرِ مُنیر　　　گھر کا گھر ہے وقفِ ماتم زرد ہیں بُرنا و پیر
رخصتِ بلبل ہے نالاں ہیں چمن کے ہم صفیر　　　آرہی ہے کان میں آوازِ گویا[1] و بشیر[2]

چھُٹ رہا ہے ہات سے دامن ملیح آباد کا
رنگ فق ہے عزتِ دیرینۂ اجداد کا

کیا بتاؤں دل پھٹا جاتا ہے میرا ہم نشیں　　　آئیں گے یاں خرمنِ اجداد کے جب خوشہ چیں
آگے دروازے پہ جیسے ہی جھکائیں گے جبیں　　　گھر کا سناٹا صدا دے گا "یہاں کوئی نہیں!"

جوشِ بخشش کا کلیجہ غرقِ خوں ہو جائے گا
میرے گھر کا پرچمِ زر سرنگوں ہو جائے گا

آہ اے دورِ فلک! تیرا نہیں کچھ اعتبار　　　مٹ کے رہتی ہے ترے جورِ خزاں سے ہر بہار
نوعِ انساں کو نہیں تیری ہوائیں سازگار　　　فکرِ دنیا اور شاعر تف ہے اے نیل و نہار

موجِ کوثر وقف ہو اور تشنہ کامی کے لئے
خواجگی رختِ سفر باندھے غلامی کے لئے

آ گلے مل لیں خدا حافظ گلستانِ وطن!　　　اے امانی گنج[3] کے میدان اے جانِ وطن

۱؎ حسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں المتخلص بہ گویاؔ۔
۲؎ نواب محمد بشیر احمد خاں بشیرؔ رئیس اعظم ملیح آباد۔
۳؎ وہ میدان جہاں مصنف نے نظارۂ مناظر کی خاطر آبادی سے باہر مکان تعمیر کیا تھا۔

الوداع، اے لالہ زار و سُنبلستانِ وطن　　السّلام اے صحبتِ رنگینِ یارانِ وطن

حشر تک رہنے نہ دینا تم دکن کی خاک میں
دفن کرنا اپنے شاعر کو وطن کی خاک میں

(سنہ ۱۹۲۴ء)

دردانگیز کھلونا

ہاں یہی ہے وہ کھلونا اے دلِ آشفتہ حال　　کھیلتا پھرتا ہے جس سے ایک طفلِ خورد سال

ہاں یہی ہے وہ کھلونا، دیکھ چشمِ اشک بار　　جس کی حسرت میں مرے بچے کا دل ہے بیقرار

اس کھلونے کی شُبک گُل کاریوں کے درمیاں　　ثبت ہیں اک تیرہ قسمت باپ کی محرومیاں

اس کا آب و رنگ ہے آئینۂ عبرت فزا　　یہ مگر رنگِ پریدہ ہے کسی مایوس کا

اس کے آئینوں میں ٹکڑے ہیں دلِ محروم کے　　اس کی تابانی ہیں آنسو ہیں کسی معصوم کے

اس میں غلطاں ہے کسی بچے کا شوقِ مضمحل　　اس کے سینے میں دھڑکتا ہے کوئی ننھا سا دل

کھیل دولت مند بچے! تو سدا پھولے پھلے
ہم ادھر ہنستے ہوئے آئے تھے اور روتے چلے

(سنہ ۱۹۲۵ء)

انگیٹھی

بچپن کی اے اداس انگیٹھی! خدا گواہ　　کیا کہیے تجھ پر آج پڑی کس طرح نگاہ

تُو، اور خاکِ سرد پہ یوں جسمِ سوگوار!　　افسوس، اے زمانۂ طفلی کی یادگار

میری ہی طرح کیا ترا پہلو بھی سرد ہے؟　　کیا تیرے آئینے پہ بھی ماضی کی گرد ہے؟

افسوس وہ نشاط کے موسم، وہ زمزمے　　جاڑوں کی دل فریب وہ راتیں، وہ چہچہے

شعلوں سے تیرے ہائے وہ اٹھتا ہوا دھواں　　وہ قہقہوں کی گونج وہ شیریں پہیلیاں

خوشبو وہ تیری آنچ کی جاں بخش و دل نواز　　وہ تیرگی میں رنگ ترا دل میں جیسے راز

شعلے وہ سرخ سرخ دلوں میں تلے ہوئے　　وہ سرخیوں میں نرم تبسم گھلے ہوئے

شعلوں کے بار بار وہ انداز دل نشین　　　دم بھر میں زرنگار، تو دم بھر میں سُرمگیں
ڈوبی ہوئی حیات میں تیری وہ گرمیاں　　　وہ گرمیوں میں لطف کے قصوں کی نرمیاں
وہ سادگی کی بزم میں بجتے ہوئے ستار　　　کلیوں کا، کوئلوں کی چٹکنا وہ بار بار
وہ غنچگی کا عہد، وہ گُل باریاں تری　　　اُڑتی ہوئی ہوا میں وہ چنگاریاں تری
وہ نرم نرم جسم، وہ تیزی حرارتیں　　　وہ ذمّہ داریوں سے معرّا شرارتیں
وہ چھوکرے، ادب سے دَروں میں کھڑے ہوئے　　　دایاؤں کے سروں پہ وہ آنچل پڑے ہوئے
ماماؤں کی صفوں میں وہ مغلانیوں کی شان　　　رکھا ہوا وہ تخت پہ چاندی کا پان دان
وہ تیرے گرد و پیش، بصد شانِ افتخار　　　آواز پان دان کے کھلنے کی بار بار
شایانِ آفریں، وہ خواتین کا شعار　　　شوخی کے رنگ میں بھی وہ اک نوع کا وقار
وہ ہیکلیں گلوں میں، لبوں پر وہ لالیاں　　　ہلتی ہوئی وہ کانوں میں سونے کی بالیاں
وہ لونڈیوں کے رُخ پہ نشاں خاکِ دُھول کے　　　جوڑے وہ اونچے اونچے وہ موباف تول کے
وہ مرد و زن لحافوں کے اندر گھُسے ہوئے　　　رعب آفریں دروں میں وہ پردے کھنچے ہوئے
وہ پچھلے بیٹھنے سے طبیعت کا انتشار　　　پہلو رضائیوں میں بدلنا وہ بار بار
ہلکی رضائیوں کی وہ افسانہ باریاں　　　اطلس کی سُرخ گوٹ پہ وہ سُرخ دھاریاں
وہ "ایک بادشاہ" کی بیٹی کا ذکرِ خیر،　　　وہ ولولے جنوں کے، وہ پریوں کا شوقِ سیر
وہ مرحمت میں غرق بڑی بوڑھیوں کی ذات　　　وہ کاٹنا ڈلی کا کہانی کے ساتھ ساتھ
وہ اک عجیب شانِ طرب سے ملی ہوئی　　　شیریں حکایتوں میں سرودوں کی راگنی
کیوں، اب بھی یاد ہیں وہ لڑکپن کے زمزمے؟　　　لے شیخ خواب گاہِ فراغت جواب دے!

جن کو بھُلا رہی ہیں ہماری جوانیاں
اب ان میں تجھ کو یاد ہیں کتنی کہانیاں؟

(سنہ ۱۹۲۸ء)

اُترے ہوئے چہرے

آہ وہ لوگ کہ تھے میرے لڑکپن میں ظریف　　　جن کو ہنسنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا

میرے آبا کی لگاتار نوازش کے طفیل — رنگ رلیوں ہی میں کٹتا تھا زمانہ جن کا
اُن کے بعد اب ہیں کچھ اس درجہ ملول و غمناک — کہ اُنہیں دیکھ کے پھٹتا ہے کلیجہ میرا
میرا افلاس ملاتا نہیں اب ان سے نگاہ — میرے اجداد کی دولت کا تھا جن پر سایا
جس سے رہتی تھی شریفوں کے خط و خال میں آب — کیا ہوا، دورِ فلک! وہ مرے گھر کا نقشا
دیکھتی کاش جوانی بھی مری شاد مجھیں — مست تھا جن کے لطیفوں سے لڑکپن میرا
دستِ خالی کی طرف دیکھ کے رہ جاتا ہوں — اُن کا چہرہ نظر آتا ہے جب اُترا اُترا
آہ، اُن میں سے ہر اُترا ہوا چہرہ اے جوشؔ — مقبرہ ہے مرے اجداد کی فیاضی کا

فرطِ غم سے قدم اُٹھتے نہیں بڑھنے کے لئے
کتنی قبریں ہیں یہاں فاتحہ پڑھنے کے لئے

(سنہ ۱۹۳۰ء)

ماں جائے کی یاد

میں دیس میں تم وطن سے باہر — اے بھائی! بہن نثار تم پر
انگنائی میں ہو رہا ہے غوغا — ساون کی ہے رُت ہوا ہے پُروا
سائے میں گرجتی بدلیوں کے — استادہ ہیں دو شریر بچے
اک موجِ رواں ہے اک چمن ہے — اک خیر سے بھائی، اک بہن ہے
کچھ دیر سے دونوں لڑ رہے ہیں — کیا جانیے کیوں جھگڑ رہے ہیں
میں دیکھ رہی ہوں اور چپ ہوں — کس جی سے بھلا منا دکھاؤں
اس جنگ کے آئینے کے اندر — بچپن ہے ہمارا جلوہ گستر

کرتے تھے شرارتیں، اُودھم بھی
لڑتے تھے اسی طرح سے ہم بھی

(سنہ ۱۹۳۰)

خُدا سے ایک سوال

مادّی عہد میں یہ ناداری — کون اپنی کرے گا غم خواری

کس طرف جائیں کس سے بات کریں — ہر طرف ایک جمود ہے طاری
کس سے کہیئے کہ اپنی صحت ہے — برتر از صد ہزار بیماری
اہلِ افلاس غرقِ رشک و حسد — اہلِ دولت رہینِ غدّاری
اٹھ گیا ہائے دوستی کا چلن — لٹ گیا ہائے شہرِ دل داری
جس کے چہرے پہ فکر کے آثار — اس کی صورت سے سب کو بیزاری
مطمئن ہستیوں کا دنیا میں — مشغلہ ہے غریب آزاری
قدرداں کون ہے زمانے میں — علم و فن کی ہے سرد بازاری
افترا ہے وسیلۂ توقیر — راستی وجہِ ذلّت و خواری
حج اکبر طوافِ کیسۂ زر — حمد و تہلیل حرفِ عیّاری
جزوِ ایماں مذاقِ بغض و نفاق — راہ عرفاں شعارِ مکّاری
نظر آتی ہے اہلِ دانش میں — سیرتِ شاہدانِ بازاری
مایۂ صد نشاطِ روحانی — اہلِ دولت کی کفش برداری
اپنی تکمیل سے ہے شرمندہ — میری تخئیل کی فسوں کاری
بے خبر سو رہی ہے اک دنیا — منفعل ہے ہماری بیداری
فرقِ اغیار پر چمکتا ہے — ہند کا افسرِ جہاں داری

اس تلاطم میں ہم ادیبوں کی
کیا ضرورت تھی اینہ دِ باری

(سنہ ۱۹۲۲ء)

مطالعۂ نظر

(قطعات)

حوض میں مستانہ بط کے تیرنے سے جس طرح — کائی میں پڑتا چلا جاتا ہے خطِ رہ گزار
حافظے پر یونہیں اک بیدار کن گہری خراش — ڈال دیتی ہے شبِ غم میں پپیہے کی پکار

وصل کی راتوں میں جب اس طرح سے آتا ہے یاد
ہجر کے عہدِ زبوں کا گریۂ صبح و مسا
جیسے اکثر نیند میں کروٹ بدلتے وقت جوش
کان میں آتی ہے ہلکی موجِ باراں کی صدا

بوندیوں کا سلسلہ ہے اور ہلکے ابر سے
پڑ رہی ہیں اس طرح سبزے پہ کرنیں گاہ گاہ
وقتِ گریہ جس طرح مکتوبِ غم لکھتے ہوئے
آنسوؤں سے چھن کے آتی ہے سرِ کاغذ نگاہ

ایک ہلکی سی مسرت ایک مبہم سی خوشی
روح میں کچھ یوں مچلتی ہے بوقتِ پیچ و تاب
جیسے ہلکے ابر میں موہوم سا خطِ ہلال
یا کسی بیمار بچے کا تبسم وقتِ خواب

صبح کے ہنگام جیسے مدرسے کی گھنٹیاں
طفل کے ذوقِ شکر خوابی کو کرتی ہیں نڈھال
یونہیں بے تاب و تواں بچوں کے مفلس باپ کی
نیند اڑا دیتا ہے اے خوابِ اجل تیرا خیال

شب کو اکثر کھوکھلی تاریکیاں میدان کی
روح پر کرتی ہیں طاری اس طرح خوابِ گراں
دل سمجھتا ہے کہ مجھ پر غم سا ہے چھایا ہوا
جس طرح کہرے پہ ہو جاتا ہے بارش کا گماں

پھاڑتے ہی جیسے میلا چیتھڑا اڑتی ہے گرد
یونہیں وہ دو شخص جو اک دوسرے سے ہیں خفا
گفتگو کرتے ہیں جب آپس میں از راہِ نفاق
دیکھتا ہوں ان کے ہونٹوں سے غبار اٹھتا ہوا

غبار اک دوسرے پر پھینکتے ہیں تیز رو موٹر
مخالف سمت سے ہمدوش ہو کر جب گزرتے ہیں
یونہیں دو بد گہر اشخاص جب ملتے ہیں کسی میں
نئی تاریکیاں اک دوسرے سے اخذ کرتے ہیں

دشت ہے تاریک اور رہ رہ کے کوندے کی لپک
چھو رہی ہے یوں افق کی ظلمتِ خاموش کو
جیسے اس مایوس کی آنکھوں کا عالم جو غریب
حال کہنا چاہتا ہو اور کہہ سکتا نہ ہو

باغ پر ہیں جھکے ہوئے بادل　　　　یہ ہے جھونکوں میں سرِ یانی کی
کنج پر چھائی ہے وہ کیفیت　　　　نیند جس طرح نوجوانی کی

سنایا مجھے ایک مطرب نے آج　　　　وہ نغمہ کہ تھا دل میں سویا ہوا
جوانی کی راتوں میں یادش بخیر　　　　جسے چھیڑتا تھا کوئی مہ لقا
کچھ اس طرح نغمے کا ہر زیر و بم　　　　مری سمت آنکھیں اٹھانے لگا
کسی اجنبی شہر میں جس طرح　　　　کوئی بھولا بچھڑا ہوا آشنا
سرِ راہ لوگوں کے انبوہ سے
بڑھے یک بیک مسکراتا ہوا

نسیب[1]

چاند کے انتظار میں تارے

کس نے وعدہ کیا ہے آنے کا　　　　حسن دیکھو غریب خانے کا
روح کو آئینہ دکھاتے ہیں　　　　در و دیوار مسکراتے ہیں
آج گھر "گھر" بنا ہے پہلی بار　　　　دل میں ہے خوش سلیقگی بیدار
غرق ہے روح خوش جمالی میں　　　　نظم ہے طبع لاابالی میں
جمع ساماں ہے عیش و عشرت کا　　　　خوف دل میں فریبِ قسمت کا
سوزِ قلبِ کلیم آنکھوں میں　　　　اشکِ امید و بیم آنکھوں میں
چشم بر راہ، شوق کے مارے
چاند کے انتظار میں تارے
رات بھیگی، شگفتہ ہار ہوا　　　　رنگ کلیوں میں آشکار ہوا

---

[1] نسیب، عربی میں اُس شاعری کو کہتے ہیں جس میں حسن و عشق کا ذکر ہو۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں پھیلی ہلکی ہلکی مہک چنبیلی کی
وعدہ جنجال بن گیا جی کا رنگِ امید ہو چلا پھیکا
اک جہاں چشم تر میں گرد ہوا دل وہ دھڑکا کہ رنگ زرد ہوا

دفعتاً اک چمک سی دوڑ گئی
بام و در پہ جھلک سی دوڑ گئی

دل میں چمکی امید کی بجلی انگلیاں اور ہو گئیں ٹھنڈی
الاماں شوق دید کی یورش بڑھ گئی اور خون کی گردش

اپنی حدِ وفا ہوئی محسوس
اُن کی آوازِ پا ہوئی محسوس

چھا گئی بام و در پہ رعنائی دل میں لی ولولوں نے انگڑائی
جل اٹھی شمع دل کے محبس میں صبح گویا ہوئی بنارس میں
فرطِ شادی سے بوکھلا سا گیا دل میں احساس شادمانی کا
تار نظروں کے دم بدم کانپے لڑکھڑائی زباں قدم کانپے
نہ رہا سلسلہ وہ آہوں کا رشتہ سمٹا مری نگاہوں کا

آئے وہ اشک تھم گئے بارے
چاند نکلا سبک ہو گئے تارے

(سنہ ۱۹۲۳ء)

زرد کلیاں

بھیجی ہیں کسی نے بھر کے داماں بیلے کی چمن فروز کلیاں
ڈوبی ہوئی عطرِ کم سنی میں دونے کی حسین کوری سینکیں
کلیوں سے مگر عیاں ہے زردی یہ روحِ غم ان میں کس نے بھر دی؟
گویا ہیں زبانِ حال سے یوں اے شاعرِ خوش نصیب و محزوں
بھیجا ہے چھپا کے ہم کو جس نے جانے اسے غم دیئے ہیں کس نے

یوں زرد وہ روئے دل نشیں ہے　　اک چھینٹ بھی خون کی نہیں ہے
ہم سے کہا ہے حیا کے کہنا　　لازم نہیں اب خموش رہنا
مجھکو تری یاد نے ڈبویا　　مرجھائی ہوئی کلی ہوں گویا
بھرتی ہوں چھپ کے شب کو آہیں　　ہٹتی نہیں چاند سے نگاہیں
شاما جو سحر کو بولتی ہے　　آنکھوں کی گرہ کو کھولتی ہے
لب خشک ہیں منہ ہے اترا اترا　　پنڈا کب سے ہے پھیکا پھیکا
چہرے سے عیاں ہے دل کی الجھن　　ڈھیلے ہیں کلائیوں کے کنگن
اللہ یہ کیا ہوا ہے مجھکو　　دیکھو جسے دیکھتا ہے مجھکو
اب حد سے سوا ہے خستہ حالی　　نزدیک ہے وقتِ پائمالی
آنا ہو تو آ کہ دل ہے بے تاب　　ایسے میں ابھی چمن ہے شاداب

جلد آ کہ فروغِ رنگ و بو ہو
قبل اس کے کہ خونِ آرزو ہو

(سنہ ۱۹۲۳ء)

عقدۂ لاینحل

درسِ عبرت ہے یا اولی الابصار　　میرا افسانۂ دلِ بیمار
یہ فسانہ نہیں، حقیقت ہے　　"شاعری سے نہیں مجھے سروکار"
دل میں ہیں جذبہائے گوناگوں　　الجھی جاتی ہے کاکلِ گفتار

کم پڑی ہوگی نوعِ انساں پر
جس مصیبت سے آج میں ہوں دوچار

اُس طرف حسن خود سر و خود بیں　　اِس طرف عشق، ضابط و خود دار
اُس طرف ناز و دلبری کا شکوہ　　اِس طرف شعر و بےخودی کا وقار
اُس طرف حسن، غرقِ صد نخوت　　اِس طرف عشق، محوِ صد پندار
اُس طرف شوخیوں میں بھی تمکیں　　اِس طرف اضطراب میں بھی قرار

اُس طرف بے رُخی ہے درماں سے
اِس طرف ہے پرستشِ آزار

اُس طرف چارہ گر ہے بے پروا
اِس طرف بے نیاز ہے بیمار

اُس طرف اعتبارِ عشوہ و ناز
اِس طرف اعتمادِ صبر و قرار

اُس طرف کیفِ نرگسِ مخمور
اِس طرف دورِ بادۂ اشعار

اُس طرف عہد ہے نہ سُننے کا
اِس طرف بند ہیں لبِ گفتار

کہنے جاؤں تو وہ سُنیں رُوداد
سُننے آئیں تو میں کروں اظہار

مجھکو یہ کد، وہ ہوں تبسّم ریز
اُن کو یہ ضد کہ یہ کرے اصرار

یہ رَوِش ترک بھی اگر کر دُوں
ایک عقدہ ہے اور بھی دُشوار

فرض کیجئے اُسے بھی سُلجھا دوں
گتھیاں اور بھی تو ہیں دو چار

مُدّعا ہے غرض وہ پیچیدہ
کہ دُعا مانگنا بھی ہے دشوار

مجھکو وصل و فراق، دونوں رَسَن
مجھکو تریاق و زہر، دونوں دار

عہدِ اخلاص توڑنے میں بھی ننگ
رشتۂ شوق جوڑنے میں بھی عار

اُن کا آنا بلائے ہوش و خرد
اُن کا جانا وداعِ صبر و قرار

اُن سے ملئے تو عافیت برباد
اُن سے کھنچئے تو زندگی بے کار

اُن کی وابستگی بھی سوزِ جحیم
اُن کی بیگانگی بھی شعلۂ نار

اُن کا پردا بھی موجبِ ایذا
اُن کا جلوہ بھی باعثِ آزار

اُن کی دُوری بھی خنجرِ خوں ریز
اُن کی قربت بھی دشنۂ خوں خوار

اُن کے کھونے پہ بھی نہیں راضی
اُن کے پانے پہ بھی نہیں تیّار

کون سمجھے گا ان معمّوں کو
عشق ہی مست عشق ہی ہُشیار

عشق ہی، ہجر کے لئے بے چین
عشق ہی وصل کے لئے بیمار

عشق ہی قدر دانِ جلوۂ نور
عشق ہی مدح خوانِ گوشۂ تار

عشق ہی راہِ سعی میں خفتہ
عشق ہی بزمِ فکر میں بیدار

کس قدر ہیں عمیق یہ باتیں — کس قدر ہے عجیب یہ گفتار

کون سمجھے گا ان معموں کو

دور ہیں آہ محرمِ اسرار

اس طرف تو یہ کش مکش دل میں — اور اُدھر ہے یہ رنگِ لیل و نہار

اک طرف زاہدوں کی مجلس میں — میری غیبت کا گرم ہے بازار

اک طرف عاقلوں کی محفل سے — سخنِ ناروا کی ہے بوچھار

قابلِ مضحکہ مرے انداز — درخورِ سرزنش مرے اطوار

گوش، پامالِ طعنۂ احباب — چشم مجروحِ خندۂ اغیار

راہزن جمع، راہبر ناپید — رات تاریک، راہ ناہموار

آنکھ نم ناک، راستے خس پوش — نو خوابیدہ، ظلمتیں بیدار

جلوے معدوم، رمزیے مفقود — چشم خوننابہ ریز، گوش فگار

وضعِ اہلِ وطن، معاذ اللہ — تہمتوں کے لگا دیئے انبار

غربت افسردگیٔ وطن، کلفت — غیر بے حس عزیز ناہنجار

کس سے جا کر کہے کوئی احوال — کس سے جا کر کرے کوئی اظہار

اہلِ ظاہر مجھے خس و خاشاک — اہلِ باطن، مجھے در و دیوار

بند ہے مجھ پہ فیضِ دیر و حرم — تنگ ہیں مجھ سے کافر و دیندار

سخت ہیں مجھ پہ کفر کے آئین — تیز ہے مجھ پہ شرع کی تلوار

اک طرف موت، ایک جانب زیست — وہ بہت سہل، یہ بہت دشوار

ہر سخن آگ، ہر نفس بجلی

وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

(سنہ ۱۹۲۴ء)

خواب کی پرچھائیں

سناٹا پچھلی رات کا ہے، مخلوق خدا کی خواب میں ہے

تاروں کی نگاہیں نیچی ہیں، ہلکی سی چمک مہتاب میں ہے

اطراف میں روشن داتوں کے کچھ نُور سا دھیما دھیما ہے
دیواروں کے نیچے گلیوں میں، پُرہول اندھیرا چھایا ہے
پتّوں کو میٹھے خواب میں ہیں دوڑی ہوئی بیلیں کاخوں پر
بول اُٹھتا ہے بے ہنگام کبھی اک آدھ پرندہ شاخوں پر
اللہ یہ کیسی بے چینی اس وقت دلِ بے تاب میں ہے؟
یہ عکس ہے کس کا ذرّوں پر، کس کی یہ جھلک مہتاب میں ہے؟
فردوس کی شمعیں روشن ہیں یا عکس چراغِ طور ہے یہ
گھر بھر میں یہ کس کا پرتو ہے، ہر چیز پہ کیسا نور ہے یہ؟
حلقے میں گھرا ہوں جلووں کے، ہستی کا نہیں کچھ ہوش مجھے
اس وقت یقیناً خواب میں کوئی دیکھ رہا ہے جوشؔ مجھے
غربت میں ہے شانِ صبحِ وطن ہر چیز پہ وہ رعنائی ہے
پردیس میں اپنے مجنوں کی تسکین کو لیلیٰ آئی ہے
طوفان سا جوئے شیر میں ہے، حسن آیا ہے کشتی کھینے کو
بے تاب ہے شیریں بازوئے فرہاد کے بوسہ دینے کو
اک رنگ سا مجھ پر رقصاں ہے اک نور سا دل پر چھایا ہے
اُن ہونٹوں پہ شاید سوتے میں ہلکا سا تبسّم آیا ہے

(سنہ ۱۹۲۵ء)

انتہائی بے تعلّقی

روبرو اُس کے گیا میں اس قدر مدّت کے بعد
اس کا کیا غم اُس نے ادنیٰ سی عنایت بھی نہ کی
مجھ کو تو صرف اس کا شکوہ ہے کہ اس نے مجھ سے جوشؔ
اتنے دن تک دُور رہنے کی شکایت بھی نہ کی

(سنہ ۱۹۳۰ء)

(۳)

شعلہ و شبنم

تہدیہ

اے رُوحِ عصرِ حاضرِ ہندوستانِ نو — لایا ہے اک صحیفۂ سخن داں ترے لئے

اس مصحفِ عظیم کی اسطری وسعتیں — ہر مد ہے مشرقین بداماں ترے لئے

ہر منظرِ حیات کو دیکھا ہے غور سے — چھوڑا نہیں ہے ایک بھی عنواں ترے لئے

رکھی ہے جس مقام پہ رُوح الامیں کی سانس — دل کو وہاں کیا ہے پرافشاں ترے لئے

لایا ہوں بزم و رزم کی ارضِ تضاد سے — یہ طبلِ جنگ و سازِ شبستاں ترے لئے

کتنی شبوں کے طاق میں رکھ کر چراغِ دل — پڑھی ہے رُوحِ عالمِ امکاں ترے لئے

اس کی خبر بھی ہے کہ بنایا گیا ہے لحن — کتنی شبوں کا گریۂ پنہاں ترے لئے

ڈھالے ہیں مرغزار و گلستاں کی شکل میں — کتنے مہیب و تیرہ بیاباں ترے لئے

گوندھی گئی ہے تارِ سخن میں خبر بھی ہے — کن مہوشوں کی زلفِ پریشاں ترے لئے

کس کو خبر، تراش کے کن ظلمتوں کا دل — لایا ہوں میں یہ چشمۂ حیواں ترے لئے

میں تجھ سے کیا کہوں کہ سخن میں کیا ہے حل — کس شوخ کا تبسمِ پنہاں ترے لئے

واقف بھی ہے کہ موجِ سخن میں ہوئی ہے صرف — کن انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں ترے لئے

لایا ہوں وزنِ شعر کی منزل میں کیا کہوں — کیوں کر جراحتِ دلِ انساں ترے لئے

تعبیر کی ترازوئے نرم و نہفتہ میں — تولے ہیں کتنے خوابِ پریشاں ترے لئے

کیا پوچھتا ہے جوشؔ کی بربادیوں کا حال
پُرزے ہے کب سے جیب و گریباں ترے لئے

(سنہ ۱۹۳۶ء)

آتش کدہ

پیمانِ محکم

قسم اُن غازیوں کی موت سے جو جنگ کرتے ہیں
اُنہی تلوار کی بُرِش سے جن کے زخم بھرتے ہیں

قسم اُن کی جو ہنس کر خون میں اپنے نہاتے ہیں
خوشی سے رن میں ڈٹ کر منہ پہ تلواریں جو کھاتے ہیں

قسم اُن کی نظر تیر و سناں سے جن کی لڑتی ہے
اکڑ جاتے ہیں طبل جنگ پر جب چوٹ پڑتی ہے

قسم اُس نور کی بخشا گیا تھا جو رسالت کو
قسم اُس سوزِ پنہاں کی جو ملتا ہے محبت کو

قسم اُس برق کی جو گر کے خرمن پھونک دیتی ہے
قسم اُس موت کی جو خنجروں میں سانس لیتی ہے

قسم ہے اُس کماں کی جو سرِ میداں کڑکتی ہے
قسم اُس آگ کی جو قلبِ شاعر میں بھڑکتی ہے

قسم اُس زخم خوردہ شیر کی خونی ڈکاروں کی
گرج سے جس کی بنضیں چھوٹ جاتی ہیں کچھاروں کی

قسم اُس جذبۂ غیرت کی جو آزاد کرتا ہے
قسم اُس طنطنے کی جس پہ ہر خوددار مرتا ہے

قسم اُس شعلۂ غم کی جو فرقت میں بھڑکتا ہے
قسم ہے اُس لہو کی چشم تر سے جو ٹپکتا ہے

قسم اُس گھن گرج پُرہول توپوں کے دہانوں کی
گرج سے جن کی ہل جاتی ہیں بنیادیں چٹانوں کی

قسم اُس کھڑکھڑاہٹ کی زرہ سے جو نکلتی ہے
قسم ان زمزموں کی جن کی زد پر فوج چلتی ہے

قسم گھوڑوں کی اُن ٹاپوں کی جو رن کو ہلاتی ہیں
سروں پر گرد کا اک خوں چکاں بادل بناتی ہیں

قسم اُس سانس کی جو موت کے ہنگام چلتی ہے
قسم اُس وقت کی جب زندگی کروٹ بدلتی ہے

قسم اُس عزم کی سادات جب میداں میں جاتے ہیں
دمِ رخصت عروسِ نو کا جب گھونگھٹ اٹھاتے ہیں

قسم اُن کی نبوت اپنی شرافت کا جو لاتا ہے
نسب ناما ہے پر اپنے خون کی مہر جب لگاتا ہے

قسم اے موت اُن کی رنگ تیرا جو اُڑاتے ہیں
تری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جو مسکراتے ہیں

قسم اُن قوتوں کی جو ملی تھیں رام و لچھمن کو
قسم اُس آگ کی جو کھا گئی تھی ملکِ راون کو

قسم اُس نور کی روشن تھے جادے جس سے صحرا کے
دہکتا تھا جو ٹیکے کی طرح ماتھے پہ سیتا کے

قسم اُس ضرب کی توڑا تھا جس نے بابِ خیبر کو
قسم اُس شیر کی جس نے پچھاڑا تھا عنتر کو

قسم اُس پیاس کی کوثر کی رو پر جس کا قبضہ تھا
قسم اُس ابر کی جو کربلا میں گھر کے برسا تھا

قسم اُس تیر کی چلنا تھا جو چِلّے سے ارجن کی　　قسم میدان میں گاتی ہوئی تلوار کی دُھن کی
قسم اس جوش کی، جو ڈوبتی نبضیں اُبھارے گا　　کہ اے ہندوستاں جیسے ہی تو مجھ کو پکارے گا

مری تیغِ رواں باطل کے سر پر جگمگائے گی
ترے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی

(سنہ ۱۹۳ء)

صدائے بیداری

یہ مانا، سرزمینِ ہند پر نکبت برستی ہے　　زبانوں پر حدیثِ اوج ہے فکروں میں پستی ہے
یہ مانا، آج ہم میدانِ وحشت میں رجز خواں ہیں　　عدو بھی سر پہ ہے آپس میں بھی دست و گریباں ہیں
مگر راتوں کو جب فکرِ وطن میں سر جھکاتا ہوں　　فضائے سرد میں دھیمی سی اک آواز پاتا ہوں
یہ آواز اس لطافت سے مرے کانوں میں آتی ہے　　صبا جس طرح زیرِ شاخِ سنبل گنگناتی ہے
فضا میں جس طرح روح الامیں کی بال جنبانی　　برستا ہو کہیں کچھ دور جیسے خواب میں پانی
جگاتی ہے سحر جس نازسے نغموں کو دریا میں　　ہوا کی سنسناہٹ جس طرح گنجان صحرا میں
حقیقت کیا بتاؤں اس صدائے روح افزا کی　　نہاں ہیں جس کے اندر کاوشیں امروز و فردا کی

یہ مشرق محو ہے صبحِ تجلی زا رہ ہونے میں
یہ روحِ ایشیا مصروف ہے بیدار ہونے میں

(سنہ ۱۹۲۸ء)

کسان

جھٹپٹے کا نرم رَو دریا، شفق کا اضطراب　　کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب
دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ　　دُور دریا کے کنارے دھندلے دھندلے سے چراغ
زیرِ لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود　　مشعلِ گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دُود
وسعتیں میدان کی سورج کے چھپ جانے سے تنگ　　سبزۂ افسردہ پر خوابِ آفریں ہلکا سا رنگ
خامشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا　　شام کی خنکی سے گویا دن کی گرمی کا گلا

اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا — تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلہ
خار و خس پر ایک درد انگیز افسانے کی شان — بامِ گردوں پر کسی کے روٹھ کر جانے کی شان
دوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سرور — چرخ پر بادل، زمیں پر تتلیاں، سر پر طیور
پارہ پارہ ابر، سرخی، سرخیوں میں کچھ دھواں — بھولی بھٹکی سی زمیں، کھویا ہوا سا آسماں

پتیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

یہ سماں، اور اک قوی انسان یعنی کاشت کار — ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ بوستاں — ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں
ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بو، گلشن پناہ — نازبردارِ لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ امید و بیم — محرمِ آثارِ باراں، واقفِ طبعِ نسیم
صبح کا فرزند، خورشیدِ زر افشاں کا علم — محنتِ پیہم کا پیماں، سخت کوشی کی قسم
جلوۂ قدرت کا شاہد، حسنِ فطرت کا گواہ — ماہ کا دل، مہرِ عالم تاب کا نورِ نگاہ

قلب پر جس کے نمایاں نور و ظلمت کا نظام
منکشف جس کی فراست پر مزاجِ صبح و شام

خون ہے جس کی جوانی کا بہارِ روزگار — جس کے اشکوں پر زراعت کے تبسم کا مدار
جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہے شراب — اڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرور گلاب
تیغِ آہن جس کے نقشِ پا سے ہوتا ہے رقیق — شعلہ خو جگنوؤں کا ہمدم، تیز کرنوں کا رفیق
خون جس کا بجلیوں کی انجمن میں بار یاب — جس کے سر پر جگمگاتی ہے کلاہِ آفتاب
لہر کھاتا ہے رگِ خاشاک میں جس کا لہو — جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیلِ رنگ و بو
دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر — دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر
جس کی جاں کاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبضِ تاک — جس کے دم سے لالہ و گل بن کے اتراتی ہے خاک
سازِ دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ — مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ
خون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں — لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عز و وقار — کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاجدار

سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی　　　جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ　　　جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار

دھوپ کے جھلسے ہوئے رُخ پر مشقت کے نشاں　　　کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں

ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل

کون ہل؟ ظلمت شکن، قندیلِ بزمِ آب و گل　　　قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل
خوش نما شہروں کا بانی، رازِ فطرت کا سراغ　　　خاندانِ تیغِ جوہر دار کا چشم و چراغ
دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام　　　شامِ زیرِ ارض کو صبحِ درخشاں کا پیام
ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا　　　مضمحل ذروں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا
جس کے چھو جاتے ہی مثلِ نازنینِ مہ جبیں　　　کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے بیلائے زمیں
پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک　　　مسکرا کر اپنی چادر کو ہٹا دیتی ہے خاک
جس کی تابش ہیں درخشانی ہلالِ عید کی　　　خاک کے مایوس مطلع پر کرن امید کی

جس کا مس خاشاک میں بنتا ہے اک چادر حسین
جس کا لوہا مان کر، سونا اُگلتی ہے زمین

ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سُرخیاں　　　اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں
اس سیاسی رتھ کے پہیوں پہ جمائے ہے نظر　　　جس میں آ جاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر
اپنی دولت کو جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے　　　دیکھتا ہے ملکِ دشمن کی طرف جاتے ہوئے
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں سے راہ　　　فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
پھر رہا ہے خوں چکاں آنکھوں کے نیچے بار بار　　　گھر کی نا امید دیوی کا شبابِ سوگوار
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا　　　بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منہ اُترا ہوا

سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک دل اور یہ ہجومِ سوگواری! ہائے ہائے
یہ ستم، اے سنگ دل سرمایہ داری ہائے ہائے

تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار
جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مُڑتی ہے دھار

بے کسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہات
کیا چبا ڈالے گی او کم بخت! ساری کائنات

ظلم اور اتنا کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی

دیکھ کر تیرے ستم، اے حامیٔ امن و اماں
گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں

ادعائے پیرویٔ دین و ایماں اور تو!
دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو!

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرہ — اہلِ دل کے آب ہیں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لئے بے تاب ہیں

(سنہ ۱۹۲۹ء)

لمحۂ آزادی

سُنو اے بستگانِ زلفِ گیتی
ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے

کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

(سنہ ۱۹۳۱ء)

شریکِ زندگی سے خطاب

اے شریکِ زندگی اس بات پر روتی ہے تو
کیوں مرا ذوقِ ادب ہے مائلِ جام و سبو

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ اہلِ خانقاہ
داڑھیوں سے ہندیوں کو کر رہے ہیں رو سیاہ

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ معنیٔ صلوٰۃ
خم کئے دیتی ہے اپنے وزن سے پشتِ حیات

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ دشمن کا عتاب
تیری ہم جنسوں کی راہوں میں اُلٹتا ہے نقاب

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ ہے گرمِ فغاں
سبحہ و زنّار میں جکڑا ہوا ہندوستاں

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ تیرے نونہال
بن رہے ہیں مغربی تہذیب سے رنگیں جمال

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ تھے جو شہسوار
آج اُن لڑکوں میں ہے لیلیٰ و سلمیٰ کا نکھار

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ ہندی نوجواں
کھو چکا ہے صف شکن اسلاف کی رُوحِ تپاں

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ شمشیرِ وطن　　بن چکی ہے بزمِ محکومی کی شمعِ انجمن
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ آنت کا شباب　　شیب کی ناوقت یورش سے ہے جویائے خضاب
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ بیٹے کی جبیں　　باپ کے ماتھے کی سی تابندگی رکھتی نہیں

چھوڑ کر چہرے کے دھبے آئینہ دھوتی ہے تو
میری درویشانہ مے خواری پہ کیا روتی ہے تو

(سنہ ۱۹۳۶ء)

شکستِ زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا اُن کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
اُبلیں گے زمیں سے مارِ سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا اُن کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا اُن کو خبر تھی، ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

(سنہ ۱۹۳۱ء)

سجاد سے

(اگر پدر نتواند، پسر تمام کند)

اے مری آنکھوں کے تارے اے مرے لختِ جگر
ہنس کہ تیرے دم سے ہے فردوس آغوشِ پدر
لیکن اے نورِ نظر، یہ دور مٹ جانے کو ہے
زندگی میں ایک دورِ تلخ بھی آنے کو ہے
یہ زمانہ طور سے بے طور ہو جائے گا کل
یہ زمیں یہ آسماں کچھ اور ہو جائے گا کل
اس ورق کو جب اُلٹ دے گی ہوائے انقلاب
مجھ پہ یعنی بند ہو جائے گا جب ہستی کا باب
میرے مرتے ہی چلے گی وہ قیامت کی ہوا
پھیر لیں گے تجھ سے مُنہ ظالم عزیز و اقربا
گو، خدا کا شکر ہے "بھائی" کوئی تیرا نہیں
تجھ کو "نادر زاد" دشمن کا کوئی کھٹکا نہیں
پھر بھی خونی اقربا کے صید ہوتے ہیں یتیم
بے کسوں کی آہ ہے اُن کے لئے موجِ نسیم
لطف کے پردے میں کرتے ہیں یگانے پائمال
مہر کی نظریں یتیموں کے لئے بنتی ہیں جال
جو چھڑکتے ہیں پسینے پر ترے خونِ جگر
کل پسینہ بھی نہ ٹپکائیں گے تیرے خون پر
باپ کے مرتے ہی ہو جاتی ہے دنیا خشمگیں
اس تلاطم میں زمیں برسوں جگہ دیتی نہیں

ہو چکا ہے اقربا کے ہاتھ سے پامال، دیکھ
دور کیوں جاتا ہے اپنے باپ ہی کا حال دیکھ

دیکھ، کیوں کر میرے دل کو پارہ پارہ کر دیا
مہر کو کچھ اس طرح توڑا کہ تارا کر دیا

لیکن اس ہلچل میں ہو جاتا ہے جس سے جی نڈھال
عزتِ دیرینۂ اجداد کا رکھنا خیال

ہر نفس تیار رہنا ہر بلا کے واسطے
صاحبِ سیف و قلم بننا خدا کے واسطے
"ضعف" ہے روزِ ازل سے تیرہ بختی کا شکار
زورِ علم و قوتِ بازو ہے شانِ کردگار
دل ہے تسخیرِ قوائے بحر و بر کے واسطے
ناتوانی کفر ہے نوعِ بشر کے واسطے

قبر میں روحِ پدر کو شاد کرنے کے لئے
سر کٹانا ہند کو آزاد کرنے کے لئے

ہاں، تو میں تجھ سے یہ کہتا تھا کہ اے جانِ پدر
جب مرا ہو جائے گا اس دارِ فانی سے سفر

رونے والوں کو مرے مرنے پہ آجائے گا صبر — شہر سے باہر کسی گوشے میں ہوگی میری قبر
محو ہو جائے گی دل سے کلفتِ مرگِ پدر — وقت کے مرہم سے بھر جائے گا یہ زخمِ جگر
ہوں، جو ہوں گے دل نشیں منظر ترانے بے بدل — ثبت ہوگی میری چشم و گوش پر مہرِ اجل
ہوں گی طالع کس قدر صبحیں برافگندہ نقاب — میں نہ دیکھوں گا مگر تا حشر بیداری کا خواب
چاند اوجِ آسماں سے نور جب برسائے گا — ساحلِ گل ریز پر مجھ کو نہ لیکن پائے گا
بدلیاں برسات کی کیا کیا نہ ہوں گی بے قرار — میرے اُجڑے باغ میں لیکن نہ آئے گی بہار
جائے گا آوازہ میری شاعری کا دور دور — خاک کے پھندے سے ہوگا نطق میرا چور چور

یوں تو آتا ہے نہ اس دل میں تلاطم آئے گا
قبر پر تو آئے تو لب پر تبسم آئے گا

لیکن اے جانِ پدر! دنیا ہے وہ مضبوط جال — آدمی کا جس کے پھندوں سے نکلنا ہے محال
تو نئے ماحول میں اُس وقت، ہوگا غالباً — اور نئے احباب سے معمور ہوگی انجمن ا
ہو سکے گی یاد بھی میری نہ بھولے سے مخل — کارِ ہستی میں ترا اس طرح لگ جائے گا دل
عہدِ پارینہ کو انساں وقت دے سکتا نہیں — آدمی اس کش مکش میں سانس لے سکتا نہیں
پھر بھی اس طوفان میں اے جوش کی رُوحِ رواں! — مادر و خواہر کی خدمت کو سمجھنا حرزِ جاں
اور اس کے بعد اے جانِ تمنائے پدر! — چند لمحوں کی بھی فرصت دے سکے دنیا اگر
باپ کی سوتی ہوئی قسمت جگانے کے لئے — قبر پر دو پھول لے آنا چڑھانے کے لئے

باغِ ہستی کے نہ وہ باغِ جناں کے پھول ہوں
مژدۂ آزادیِ ہندوستاں کے پھول ہوں!

(سنہ ۱۹۳۳ء)

شاعرِ ہندوستاں

زندہ مُردوں کی ہے بستی، کون سُنتا ہے یہاں — تا بہ کے چیخا کروں "ہندوستاں ہندوستاں"
اک نظر بھی قدر دانِ جوہرِ قابل نہیں — ہند کے اُجڑے ہوئے سینے کے اندر دل نہیں
آئیں یوسف بھی اگر لپٹے ہوئے بازار میں — ایک گاہک بھی نہ پائیں ہند کے بازار میں

گم شدگی

دن نے ٹھنڈی سانس لی، خورشید اوجھل ہو گیا
رنگ اڑا صحرا ہوا خاموش، دریا سو گیا
نور سمٹا، تیرگی پھیلی، ہوائیں رک گئیں
پھول کمہلائے، چمن سنولائے، شاخیں جھک گئیں
رنگِ گل، شورِ چمن، جوشِ صبا، کچھ بھی نہیں
ایک غم انگیز وحشت کے سوا کچھ بھی نہیں
اڑ گیا رنگِ شفق، دل چرخ کا تھرا گیا
رفتہ رفتہ روئے عالم پر دھواں سا چھا گیا
اس دھوئیں میں اپنی زریں روشنی کھوتے ہوئے
میں نے دیکھا روحِ انسانی کو گم ہوتے ہوئے

(سنہ ۱۹۲۸ء)

پیا بن ناگن کالی رات

ایک دکھیا، حزیں، پریشاں حال — پی کی دوری سے جس کا جی ہے نڈھال
روتی رہتی ہے ساری ساری رات — اک قیامت ہے جان پر برسات
سوئے گردوں نظر اٹھاتی ہے — دردِ دل اس طرح سناتی ہے
دیکھنے کی نہیں مری حالت — زرد ہو لے اے مناظرِ قدرت!
بادلوں سے ہلال کو ڈھانکو — اپنا خنجر نیام میں رکھ لو
اے تر و تازہ حسرتو! بن کی — اے گلابی گھٹاؤ! ساون کی
جلدی اس دیس سے گزر جاؤ — واری، اک بوند بھی نہ ٹپکاؤ
ورنہ مہکیں گے پھول گلشن میں — آگ لگ جائے گی مرے تن میں
یوں نہ پاپی پپیہے تان لگا! — جس نگر میں ہے پی، وہیں اڑ جا!

دیکھ، پُروائی! دل نہ کمہلا جائے — کوئی جھونکا ادھر نہ آنے پائے
زلفِ ماضی سنوارنے والی — تو ہے چوٹیں اُبھارنے والی
پی کی نگری میں جا کے بھر جل تھل — میرے سر پر گرج نہ او بادل
ہائے کیوں کر نہ اختلاج رہے — پی ہیں پردیس میں براج رہے
سوجھتا ہی نہیں ہے ہات کو ہات — ڈس رہی ہے نگوڑی کالی رات
کھائے جاتی ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا — دل میں چبھتی ہے بوندیوں کی صدا
کیا ہوا تجھ کو ہائے جی کے زور — مور جنگل میں کر رہے ہیں شور!
سوندھی سوندھی زمین کی خوشبو — آنکھ میں بن رہی ہے کیوں آنسو؟
یونہی چھاتی جو دھڑکے جائے گی — ہائے کس طرح نیند آئے گی
گھر اکیلا ہے، پڑ رہی ہے پھوار — کیا ہو رکھ ہے لے سکھی! سنسار!
اے سہیلی! بجا نہیں اوسان — یہ تو جی بھر کو برتا، ترے قربان

سیج سونی ہے اور برستی رات
باؤلی ہو گئی ہے کیا برسات

(سنہ ۱۹۲۴ء)

رُوحِ شام

مغرب کی وادیوں میں خورشید اُتر رہا ہے — تصویرِ بے خودی کا ہر نقش اُبھر رہا ہے
پامال و خشک پتے بکھرے ہوئے پڑے ہیں — سرسوں کے کھیت سارے پھولے ہوئے کھڑے ہیں
چرواہے جھٹپٹے کی تانیں سُنا رہے ہیں — چوپائے سر جھکائے میداں سے جا رہے ہیں
روحیں لرز رہی ہیں فرقت کے دل جلوں کی — ظلمت میں بج رہی ہیں یا گھنٹیاں گلوں کی
گلے گذر چکے ہیں سبزہ پڑا ہے رَوندا — کیا کیا مہک رہا ہے بھولا ہوا کروندا
اک سمت چھوٹی چھوٹی رنگیں پہاڑیاں ہیں — اک سمت گل بداماں ڈھاکے کی جھاڑیاں ہیں
کیا دل کشی عیاں ہو گل رنگ جھاڑیوں کی — ترشی ہوئی ہیں راہیں جن میں سے گاڑیوں کی
ان جھاڑیوں کے اندر میری نظر لڑی ہے — دوشیزہ اک کمر تک ڈوبی ہوئی کھڑی ہے

سرشار جھاڑیوں کے نغمے سنا رہی ہے　　محراب رنگ و بو میں شمعیں جلا رہی ہے
ٹیکا نہیں جبیں پر، نیلم جڑا ہوا ہے　　اک ہار سا گلے میں ترچھا پڑا ہوا ہے
رخ پر اثر شفق کے آغوشِ تربیت کا　　زلفِ سیہ پہ جنباں پرچم الوہیت کا
آنچل پڑا ہوا ہے زلفِ سیہ پہ دھانی　　غمگیں سُروں میں گم ہے اٹھتی ہوئی جوانی

اے جوشؔ ادب سے جھک جا تو جانتا نہیں ہے
دربار میں ہے کس کے؛ پہچانتا نہیں ہے
اس بھیس میں جو مست و بے خود بنا رہی ہے
یہ روحِ شام تجھ کو جلوے دکھا رہی ہے

(سنہ ۱۹۲۳ء)

آواز کی سیڑھیاں

کل جھٹپٹے کے وقت کہ تھا زرد آفتاب　　چھایا ہوا تھا عرصۂ ہستی پہ رنگِ خواب
ظلمت کی بڑھ رہی تھی لگاوٹ فضا کے ساتھ　　اک راگنی سی کھیل رہی تھی ہوا کے ساتھ
ہر سانس پر شفق کا گریباں تھا چاک چاک　　تھا اک خلا سا وقت کے سینے میں ہولناک

اتنے میں آئی مل کے صدائے طیور سے
بن کے کسی نگار کی اک تان دور سے

بے صرفہ جستجو کی کہانی لئے ہوئے　　اک نوا سیر غم کی جوانی لئے ہوئے
نا آزمودہ غم کی جبیں چومتی ہوئی　　تپتی ہوئی، لرزتی ہوئی، جھومتی ہوئی
بیگانہ رسمِ عیش کی فکرِ فضول سے　　مٹتی ہوئی غروب کی یادِ ملول سے
روتا ہوا سکوت لبِ جو لئے ہوئے　　دوشِ ہوا پہ عشق کے آنسو لئے ہوئے

کچھ سرخیٔ شفق میں سیاہی سی آگئی
میداں پر اک اداس خموشی سی چھا گئی

ویرانہ فرطِ درد سے غمناک ہو گیا　　اتنے میں کچھ ٹھہر کے پھر آئی وہی صدا
نغمے کی نبض سرد سکڑ سی، تپاں ہوئی　　گویا ٹھہر کے موج دوبارہ رواں ہوئی

پھر اس کے بعد تیز ہوئی تان دفعتاً　　اللہ رے زور، گونج اٹھا گنبدِ کہن
اور اس کے بعد لحن کا دامن سمٹ گیا　　اور یوں صدا کا زور بتدریج گھٹ گیا
گویا سفید دودھ سی پتھر کی سیڑھیاں　　پتلی، سبک، خنک، متناسب، گہر فشاں
تیشے سے زیر و بم کے اتر کر سنور گئیں
ساحل سے تابہ نہر، مچلتی اتر گئیں

(سنہ ۱۹۲۹ء)

پیش گوئی

جھٹپٹے وقت کا ہے سناٹا　　ابر چھایا ہوا ہے ہلکا سا
شام کی تیرگی سے ہیں مدھم　　دشت میں رہرووں کے نقشِ قدم
کس تکلف سے چل رہی ہے ہوا　　جیسے کوئل کی وادیوں میں صدا
دھیمی دھیمی ہواؤں کا ہے اثر　　گھاس کے نرم نرم ریشوں پر
نور ظلمت پہ ہو رہا ہے فدا
کیا سلونی ہے جھٹپٹے کی فضا
دیر سے ایک گاؤں کی لڑکی　　بھولی بھالی حسین چھوٹی سی
عمر ابھی جس کی دس برس کی ہے　　ایک لکڑی کے پل پہ بیٹھی ہے
غور سے اک طرف جمائے نظر　　رکھے رخسار کو ہتھیلی پر
سر پہ آنچل پڑا ہے ساڑھی کا　　داہنے ہاتھ میں ہے جس کا سرا
نرم گردن میں خم، کلائی میں بل　　ناک میں کیل، آنکھ میں کاجل
رخ پہ زلفیں، نگاہ میں بچپن　　جیسے دھیمی پھوار میں گلشن
رخ پہ موجیں سی زندگانی کی　　جھلکیاں طفلی و جوانی کی
کیوں میں گم ہوں اسے نہیں معلوم
یہ فراغت ہے کس قدر معصوم
ڈھیر ہیں زرد زرد پھولوں کے　　سامنے جھنڈ ہیں ببولوں کے

شمع سی اک جلائے دیتی ہے — خود بخود مسکرائے دیتی ہے
کوئی دنیا میں کہہ نہیں سکتا — کیوں کر اس کا شباب گذرے گا
اس کے حالات شیب کیا ہوں گے — ہم تصور میں لا نہیں سکتے
اب بھی کہہ سکتے ہیں مگر اتنا — کہ اُسے جب یہ یاد آئے گا
کہ مرے مائکے کے ویرانے — یوں سناتے تھے شب کو افسانے
کبھی دھومیں مچائی جاتی تھیں — کھیتیاں جب کٹائی جاتی تھیں
شام ہوتی تھی کتنی خوش منظر — بیٹھتی تھی میں جا کے جب پُل پر
صبح یوں روز مُسکراتی تھی — شام اس طرح گنگناتی تھی
ہُوک سی اک اٹھے گی سینے میں — دل سے ٹپکیں گی خون کی بُوندیں
نہ تو جاگے گی اور نہ سوئے گی
دیر تک سر جھکا کے روئے گی

(سنہ ۱۹۳۹ء)

فاختہ کی آواز

آج تو فاختہ کی نرم آواز — ہے کچھ اس طرح غرق سوز و گداز
جیسے پیری میں یاد طفلی آئے — جیسے جل جل کے شمع بجھ جائے
جیسے یعقوب غرق شیون میں — جیسے سیتا کی جستجو بَن میں
شب کو جس طرح دل میں درد اٹھے — بیوگی نو عروس کی جیسے
شام کو زیر سایۂ کہسار — جیسے وادی میں دھیمی دھیمی پھوار
جیسے ہو بر نہ آئی ہو وہ مُراد — جیسے بچھڑے ہوؤں کی دل میں یاد
جیسے اشکوں کی لہر سینے میں — پانی آنے لگے سفینے میں
جیسے سُسرال میں کوئی لڑکی — دیکھ کر بدلیوں کو ساون کی
صبح پنگھٹ کی نیم کے نیچے
مائکے کی گھٹائیں یاد کرے

(سنہ ۱۹۲۲ء)

بن باسی بابو

جنگلوں کے سرد گوشے ریل بل کھاتی ہوئی
جہل کے سینے پہ زلفِ علم لہراتی ہوئی

بزمِ وحشت میں تمدن نازفرماتا ہوا
تند انجن کا دھواں میداں پہ بل کھاتا ہوا

فطرتِ خاموش میں بھرتا ہوا سوز و گداز
صنعتِ پرکار کے چلتے ہوئے جادو کا ناز

الاماں دنیائے نادانی میں دانائی کا زور
بھاپ کی پھنکار، لوہے کی گرج، پانی کا شور

متصل جھنکار سے گونجی ہوئی خاموشیاں
یا بہ کُل ویرانیوں میں نغمۂ شہر رواں

پھول گھبرائے ہوئے سے پتیاں ڈرتی ہوئی
گرم پرزوں کی صدائیں شوخیاں کرتی ہوئی

ایک اسٹیشن فسردہ، مضمحل، تنہا، اداس
جھٹپٹے کی بدلیاں، پرہول جنگل آس پاس

جنگلے نالے اندھیری وادیاں ہلکی پھوار
بن کے گرد و پیش کوسوں تک کھجوروں کی قطار

قد آدم گھانس گہری ندیاں اونچے پہاڑ
ایک اسٹیشن فقط لے دے کے باقی سب اجاڑ

کاش جا کر بابوؤں سے جوشؔ! یہ پوچھے کوئی
جنگلوں میں کٹ رہی ہے کس طرح سے زندگی؟

پائی تھی کس شہر میں تعلیم؟ رہتے تھے کہاں؟
ساتھ کے کھیلے ہوؤں کا یاد ہے نام و نشاں؟

کس جگہ طالع: وہی تھی نوجوانی کی سحر؟
روز و شب کن صحبتوں میں عمر ہوتی تھی بسر؟

رات دن رہتا تھا جن کی رونقوں سے دل کو کام
یاد ہیں کیا اب بھی ان مڑتی ہوئی گلیوں کے نام؟

سچ کہو اٹھتے ہیں جب بادل اندھیری رات میں
جب پپیہا کوک اٹھتا ہے بھری برسات میں

شب کو ہوتا ہے گھنے جنگل میں جب بارش کا زور
سائیاں بھیگی ہوئی راتوں میں جب کرتا ہے شور

روح تو اس وقت فرطِ غم سے گھبراتی نہیں!
تم کو اپنے عہدِ ماضی کی تو یاد آتی نہیں؟

(سنہ ۱۹۲۷ء)

گرمی اور دیہاتی بازار

دوپہر، بازار کا دن، گاؤں کی خلقت کا شور
خون کی پیاسی شعاعیں، روح فرسا لو کا زور

آگ کی رو، کاروبارِ زندگی کا پیچ و تاب
تند شعلے، سرخ ذرے، گرم جھونکے - آفتاب

شور، ہل چل، غل غلہ، ہیجان، لو، گرمی، غبار
بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں قطار اندر قطار

مکھیوں کی بھن بھناہٹ، گرد کی بو، مرچوں کی پھانس
خربزے، آلو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز، گھانس

دھوپ کی شدت، ہوا کی یورشیں، گرمی کی رَو
کملیوں پر سرخ چانول، ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جَو

گرم ذروں کے شدائد، چھکڑوں کی سختیاں
چھکڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کا دھواں

ماؤں کے کاندھوں پہ بچے گردنیں ڈالے ہوئے
بھوک کی آنکھوں کے تارے پیاس کے پالے ہوئے

بام و در لرزے ہوئے خورشید کے آفات سے
ہر نفس، اک آنچ سی اٹھتی ہوئی ذرات سے

مرد و زن گردش میں چیلوں کی صدا سنتے ہوئے
چلچلاتی دھوپ کی رو میں چنے بھنتے ہوئے

میان سے موسم کی تیغِ بے اماں نکلی ہوئی
پیاس سے انسان و حیواں کی زباں نکلی ہوئی

لو کے مارے بام و در کی روح گھبرائی ہوئی
دوستوں کی شکل پر بیگانگی چھائی ہوئی

یوں شعاعیں سایۂ اشجار سے چھنتی ہوئی
بے مروت کی سپاٹ آنکھوں کی جیسے روشنی

آسماں پر ابر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا رم
نشے میں ممسک کا جیسے وعدۂ جود و کرم

ہر روش پر چڑچڑاپن، ہر صدا میں بے رخی
ہر جگر گھٹتا ہوا، ہر کھوپڑی پکتی ہوئی

سر پہ کافر دھوپ جیسے روح پر عکسِ گناہ
تیز کرنیں جیسے بوڑھے سود خواروں کی نگاہ

(سنہ ۱۹۲۶ء)

بدلی کا چاند

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا، ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب، وہ ہلکے بادل سے، چاندی کے ورق برسانے لگا
وہ سانولے پن پر میداں کے، ہلکی سی صباحت دوڑ چلی

تھوڑا سا اُبھر کر بادل سے وہ چاند جبیں جھلکانے لگا
لو ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے
لو، پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں ظلمت کا قدم تھرّانے لگا
بادل میں چھپا تو کھول دیئے بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا تو گردوں دریا کی طرح لہرانے لگا
سمٹی جو گھٹا تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا
غرفوں سے جو جھانکا گردوں کے امواج کی شمعیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے، کہسار کا سر چکرانے لگا
پردہ جو اُٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسّم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی، میدان کا دل گھبرانے لگا
اُبھرا تو تجلّی دوڑ گئی، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
اُلجھا تو سیاہی دوڑا دی، سُلجھا تو ضیا برسانے لگا

کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے، کیا قید ہے کیا آزادی ہے
انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

(سنہ ۱۹۳۰ء)

گریۂ مسرّت

آج تڑکے، الحفیظ والاماں — دوستو! عثمان[1] ساگر کا سماں
دیدنی تھی نرم پودوں کی لچک — بدلیاں چھائی ہوئی تھیں دُور تک
ظلمتیں تھیں نور سے گرمِ ستیز — ڈالوں پر تھی ہوائے تند و تیز
سامنے تھیں پتھروں کی حسرتیں — نرم و نازک جھاڑیوں کی شکل میں

---

[1] حیدرآباد کا ایک رُوح پرور تالاب

جزر و مد میں تھی بفرطِ اضطراب — ساغرِ عثمان ساگر کی شراب

رُوحِ طوفاں در بغل، کف در دہاں
لو سنو، کس طرح تھیں موجیں رواں

جھاگ اُڑاتی، پھاندتی، اڑتی ہوئی — کپکپاتی، لوٹتی، مُڑتی ہوئی
چلبلی، اُبھری ہوئی، نکھری ہوئی — چیختی، سر پھوڑتی، بپھری ہوئی
بجلیاں دامن میں چمکاتی ہوئی — دم بہ دم آتی ہوئی، جاتی ہوئی
اِس طرف سے اُس طرف ہوتی ہوئی — پتھروں کو چھانٹتی، دھوتی ہوئی
گرتی، پڑتی، مست، سر دھنتی ہوئی — مُرتعش قالین سا بُنتی ہوئی
زیر و بم کا تار دکھلاتی ہوئی — اُٹھ کے بڑھتی، گر کے چکراتی ہوئی
گنگناتی، صف بہ صف آتی ہوئی — لڑتی، بھڑتی، گونجتی، گاتی ہوئی
مچھلیوں کو درسِ غم دیتی ہوئی — ہچکیوں پر ہچکیاں لیتی ہوئی
ساحلِ رنگیں سے ٹکراتی ہوئی — اینڈتی، اٹھلاتی، بل کھاتی ہوئی
دم بہ دم ہنستی ہوئی، روتی ہوئی — رلتی، کتراتی، جدا ہوتی ہوئی
جا بہ جا دلدل میں کاجل پارتی — چوکڑی بھرتی، چھلانگیں مارتی
پے بہ پے غاروں کے اندر گھومتی — ناچتی، حلقے بناتی، جھومتی
بلبلاتی، بھاگتی، مُنہ موڑتی — مڑ کے پھر ساحل پہ موتی توڑتی
گاتی، لہراتی، گرجتی، ہانپتی — دوڑتی، بڑھتی، سمٹتی، کانپتی

تو کہے دریا میں تھا فرقِ نمو
یار کی کڑیل جوانی کا لہو!

یہ سماں تھا، اور اک رنگیں پرند — روحِ شاعر کی طرح بے قید و بند
بے خودی کے جام چھلکاتا ہوا — گزرا میرے پاس سے گاتا ہوا

نغمہ سن کر اس قدر جی خوش ہوا
ہچکیاں لے لے کے میں رونے لگا

(سنہ ۱۹۳۲ء)

اسلامیات

ذاکر[1] سے خطاب

ہوشیار اے ذاکرِ افسردہ فطرت! ہوشیار　　　مردِ حق! اندیشۂ اور باطل سے ہو زار و نزار
ضعف کا احساس اور مومن کو، یہ کیا خلفشار　　　لَا فَتیٰ اِلّا عَلی، لَا سَیفَ اِلّا ذُوالفِقار

تو حُسینی ہے، کسی قوت سے ڈر سکتا نہیں
موت سے ٹکرا کے بھی ساونت مر سکتا نہیں

تو نہیں رُوحِ شہیدِ کربلا سے بہرہ مند　　　تیرے شانوں پر تو زلفِ بزدلی کی ہے کمند
سخت استعجاب ہے اے پیشہ ور ماتم پسند　　　پیکرِ وضیغم کے سینے میں ہو قلبِ گوسفند

ننگ کا موجب ہے یہ اہلِ وغا کے واسطے
یوں نہ ماتم کر شہیدِ کربلا کے واسطے

---

[1] ۔ ذاکر، بدبخت اور غلام ہندوستان کا جو خود اپنی وسعت سے برباد اور اپنے ہی بوجھ کے نیچے کچلا ہوا ہے، ایک ایسا سست رگ اور زہر بر فطرت فرد ہے جو (۱) واقعاتِ کربلا کو ضعف اور عدم صحت سے بے نیاز ہو کر اور رُوحِ شہادتِ امام سے بیگانہ ہوتے ہوئے ماہِ محرم کی مجلسوں میں محض اس لئے بیان کرتا ہے کہ سامعین روتے روتے بیہوش ہو جائیں۔ (۲) اس شدت کے ساتھ رلانے کی اچھی طرح مول تول کر کے فیس بھی لینا ہے۔ (۳) فیس کے ساتھ ساتھ "انعام" اور "تحائف" کے واسطے بھی غیر ملفوظ طور سے مصر ہوتا ہے۔ (۴) اس ناجائز فیس اور ان نارواتحائف کو شرمناک جمود اور عبرت انگیز بے حسی کے ساتھ اپنے ہی نفس کی خاطر دوسرے محرم تک صرف کرتا رہتا ہے۔ (۵) ملت کو بیدار کرنے کے عوض تھپکتا اور لوریاں دیتا ہے، اور فاتح و جنگجو بنانے کے بدلے بزدل و مظلوم بنانے کی سعی میں سرگرم رہتا ہے۔
(۶) شہیدِ اعظم کی قربانی کے مغز اور روح کو خلقت کی نظروں سے بعد ہزار اہتمام مخفی رکھتا ہے۔ (۷) حق کی طرف ملتفت نہیں ہوتا، اور باطل سے بے حد ڈرتا ہے۔ (۸) اور اپنے ان خدمات کا صلہ پانے کے لئے آستانِ حکومت پر بھی ناصیہ فرسائی کرتا ہوا دیکھا جاتا ہے۔

مانعِ شیون نہیں میرا پیامِ مستقل　　　گریہ فطری شے ہے دشمن پر بھی بھر آتا ہے دل
دل نہیں پتھر ہے مولیٰ پر نہ ہو جو مضمحل　　　گریۂ مومن سے ہے تزئینِ بزمِ آب و گل

کون کہتا ہے کہ دل کے حق میں غم اچھا نہیں
پھر بھی شغلِ گریہ نصب العین بن سکتا نہیں

ہاں میں واقف ہوں کہ آنسو ہے وہ تیغِ آبدار　　　سنگ و آہن میں اتر جاتی ہے جس کی نرم دھار
ہے مگر مردانگی کو ان خنک اشکوں سے عار　　　جن کے شیشوں میں نہ غلطاں ہوں شجاعت کے شرار

اشک ہے سوزِ دروں پالی ہے ایماں کی قسم
قلبِ شبنم پر شعاعِ مہرِ تاباں کی قسم

سوچ تو اے ذاکرِ افسردہ طبع و نرم خو　　　آہ! تو نیلام کرتا ہے شہیدِ دل کا لہو
تاجرانہ مشق ہے مجلس میں تیری ہاؤ ہو　　　فیس کا دریوزہ ہے منبر پہ تیری گفتگو

عالمِ اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہے تو
خونِ اہلِ بیت میں لقمے کو تر کرتا ہے تو

حرص نے تجھ کو سکھایا ہے دنائت کا سبق　　　کربلا کے ذکر میں لیتا نہیں کیوں نامِ حق
چشمۂ دولت ہے تیرا سیلِ اشکِ بے قلق　　　خون کی چادر سے سونے کے بناتا ہے ورق

خانۂ برباد ہے دولت سرا تیرے لئے
اک دفینہ ہے زمینِ کربلا تیرے لئے

کیا بتاؤں کیا تصور تو نے پیدا کر دیا　　　غیرتِ حق کو بھلا کر حق کو رسوا کر دیا
کربلا و خونِ مولیٰ کو تماشا کر دیا　　　"آبِ رکنا باد" و "بستانِ مصلےٰ" کر دیا

عشقِ گریہ عیش کی تمہید ہے تیرے لئے
عشرۂ ماہِ محرم عید ہے تیرے لئے

سوچ تو کچھ جی میں اے مشتاقِ راہِ مستقیم　　　مومنوں کے دل ہوں اور واماندۂ امید و بیم
شدتِ آہ و بکا سے دل ہوں سینوں میں دو نیم　　　کیوں یہی لے دے کے تھا کیا مقصدِ ذبحِ عظیم

خوف ہے قربانیٔ اعظم نظر سے گر نہ جائے
ابنِ حیدر کے لہو پر دیکھ پانی پھر نہ جائے

سازِ عشرت ہے تجھے ذکرِ امامِ مشرقین　　ڈھالتا ہے تیرے سکّے، بستگانِ غم کا بین
تیری دارالضرب ہے اہلِ عزا کا شور و شین　　سر جھکا لے شرم سے اے تاجرِ خونِ حسین

ذہن میں آتا ہو جس کا نام تلواروں کے ساتھ
اُس کا ماتم اور ہو سکّوں کی جھنکاروں کے ساتھ

غم کے سکّے، بہرِ زر تا کے بٹھائے جائیں گے؟　　کب تک آخر ہم پئے عشرت رُلائے جائیں گے؟
دام پر تا چند بول دانے گرائے جائیں گے؟　　آنسوؤں سے تا کجا "موتی" بنائے جائیں گے؟

بہرِ لقمہ تا بہ کے منبر پہ منہ کھولے گا تو؟
تا کجا پانی کے کانٹے پر لہو تولے گا تو؟

کربلا میں اور تجھ میں اتنا بعد المشرقین　　اُس طرف شورِ رجز خوانی، ادھر لے دے کے بَین
اُس طرف تکبیر، اِدھر ہنگامہ ہائے شور و شین　　اِس طرف اشکوں کا پانی، اُس طرف خونِ حسین

وہ تھے کس منزل میں اور تو کون سی منزل میں ہے
شرم سے گڑ جا اگر احساس تیرے دل میں ہے

کربلا سے واقفیت بھی ہے مردِ منفعل؟　　کربلا در پردہ بشاش اور بظاہر مضمحل
جس کی رفعت سے بلندی آسمانوں کی خجل　　جس کے ذرّوں میں دھڑکتے ہیں جواں مردوں کے دل

خندہ زن ہے جس کی رفعت گنبدِ افلاک پر
مہرِ تکمیلِ نبوت ثبت جس کی خاک پر

جس کے ہر ذرّے میں غلطاں ہیں ہزاروں آفتاب　　خار کی نبضوں میں جاری ہے جہاں خونِ گلاب
جس کے خار و خس میں ہے خوشبوئے آلِ بوتراب　　کربلا! تاریخِ عالم میں نہیں تیرا جواب

کربلا! تو آج بھی قائم ہے اپنی بات پر
مہر اب بھی سجدہ کرتا ہے ترے ذرّات پر

اے چراغِ دودمانِ مصطفیٰ کی خوابگاہ　　تیرے خار و خس پہ ہے تابندہ خونِ بے گناہ
تیری جانب اٹھ رہی ہے اب بھی یزداں کی نگاہ　　آ رہی ہے ذرّے ذرّے سے صدائے لا الٰہ

اے زمیں! خوش ہو کہ تیری زیب و زینت ہے حسین
تیرے سناٹے میں محوِ خوابِ راحت ہے حسین

جو دہکتی آگ کے شعلوں پہ سویا وہ حسین　　　جس نے اپنے خون سے عالم کو دھویا وہ حسین
جو جواں بیٹے کی میّت پر نہ رویا وہ حسین　　　جس نے سب کچھ کھو کے پھر کچھ بھی نہ کھویا وہ حسین

مرتبہ اسلام کا جس نے دوبالا کر دیا
خون نے جس کے دو عالم میں اُجالا کر دیا

نُطق جس کا نغمۂ سازِ پیمبرؑ، وہ حسین　　　تھا جو شرحِ مصطفےٰ تفسیرِ حیدرؑ وہ حسین
تشنگی جس کی جوابِ موجِ کوثر، وہ حسین　　　لاکھ پر بھاری رہے جس کے بہتّر، وہ حسین

جو محافظ تھا خدا کے آخری پیغام کا
جس کی نبضوں میں مچلتا تھا لہو اسلام کا

ہنس کے جس نے پی لیا جامِ شہادت، وہ حسین　　　مر گیا لیکن نہ کی فاسق کی بیعت، وہ حسین
ہے رسالت کی سپر جس کی امامت، وہ حسین　　　جس نے رکھ لی نوعِ انسانی کی عزت، وہ حسین

وہ کہ سوزِ غم کو سانچے میں خوشی کے ڈھال کر
مسکرایا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

اے حسین! اب تک گل افشاں ہے تری ہمت کا باغ　　　آندھیوں سے لڑ رہا ہے آج بھی تیرا چراغ
تو نے دھو ڈالے جبینِ ملّتِ بیضا کے داغ　　　تیرے دل کے سامنے لرزاں ہے باطل کا دماغ

فخر کا دل میں در بچہ باز کرنا چاہیے
جس کا تو آقا ہو اُس کو ناز کرنا چاہیے

کھول آنکھیں اے اسیرِ کاکلِ زرتشت دیکھ　　　آہ کن موہوم موجوں پر بہا جاتا ہے تو
ختم ہے آنسو بہانے ہی پہ تیری آرزو　　　اور شہیدِ کربلا نے تو بہایا تھا لہو

ہاتھ ہے ماتم میں تیرا سینۂ افکار پر
اور حسین ابنِ علی کا ہاتھ تھا تلوار پر

تھیں بہتّر خوں چکاں تیغیں حسینی فوج کی　　　اور صرف اک سیدِ سجّاد کی زنجیر تھی
اتنی تیغوں کی رہی دل میں نہ تیرے یاد بھی　　　حافظے میں صرف اک زنجیر باقی رہ گئی

ذہن کو بے چارگی سے اُنس پیدا ہو گیا
اے شجیعِ عالم کے پیرو! یہ تجھے کیا ہو گیا

آہ! تُو، اور سازِ برگِ عافیت کا اہتمام　　　　کیوں نہیں کہتا کہ باطل کی حکومت ہے حرام
تجھ کو، اور زنداں کا ڈر، کیوں اے غلامِ ننگ و نام　　　　جانتا ہے رہ چکے ہیں قید میں کتنے امام؟

تو مثالِ اہلِ بیتِ پاک مر سکتا نہیں
عشق کا دعوےٰ ہے اور تقلید کر سکتا نہیں

دیکھ مجھ کو دیکھ میں ہوں ایک رندِ بادہ خوار　　　　رسمِ تقویٰ ہی سے واقف ہوں نہ طاعت سے دوچار
سر پہ شملہ ہے نہ کاندھے پر عبائے زرنگار　　　　موت کو سمجھا ہوں میں لیکن حیاتِ پائدار؛

رسمِ در راہِ زہد و تقوےٰ کو سبک کرتا ہے تو
قتل سے ڈرتا نہیں میں، قید سے ڈرتا ہے تو

خوف کا جن ہے زمانے سے ترے سر پر سوار　　　　خوف ہے اک نامبارک طائرِ مُردار خوار
باغ و بُستاں سے نہیں ہوتی نظر جس کی دوچار　　　　روز و شب لاشوں پہ منڈلاتا ہے جو دیوانہ وار

تیرے سر پہ اس کا منڈلانا تماشا تو نہیں
غور کر تُو اک عفونت خیز لاشا تو نہیں؟

خلق میں محشر بپا ہے اور تو مصروفِ خواب　　　　خون میں ذلت کی موجیں کھا رہی ہیں پیچ و تاب
تیری غیرت کو خبر بھی ہے کہ دشمن کا عتاب　　　　تیری ماں بہنوں کی راہوں میں الٹتا ہے نقاب

اب تو زخمِ شمشیر کی صورت بھڑنا چاہیے
یہ اگر ہمت نہیں تو ڈوب مرنا چاہیے

دیکھ تو کتنی مکدّر ہے فضائے روزگار　　　　کس طرح چھایا ہوا ہے حق پہ باطل کا غبار
بزمِ یزدانی میں رُوحِ اہرمن ہے گرمِ کار　　　　میان سے باہر اُبل پڑ اے علی کی ذوالفقار

نقشِ حق کو اب بھی او غافل! جلی کرتا نہیں
اب بھی تقلیدِ حسین ابنِ علی کرتا نہیں؟

شمعِ ہدایت

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزمِ کافری
رعشۂ خوف بن گیا رقصِ بتانِ آذری

خشک عرب کی ریگ سے لہر اُٹھی نیاز کی
قلزمِ نازِ حسن میں اُف رے تری شناوری

اے کہ ترا غبارِ راہ تابشِ روئے ماہتاب
اے کہ ترا نشانِ پا نازشِ مہرِ خاوری

اے کہ ترے بیان میں نغمۂ صلح و آشتی
اے کہ ترے سکوت میں خندۂ بندہ پروری

اے کہ ترے دماغ پر جنبشِ پرتوِ صفا
اے کہ ترے ضمیر میں کاوشِ نور گستری

چھین لیں تو نے مجلسِ شرک و خودی سے گرمیاں
ڈال دی تو نے پیکرِ لات و ہبل میں تھرتھری

تیرے قدم پہ جبہ سا روم و عجم کی نخوتیں
تیرے حضور سجدہ ریز چین و عرب کی خود سری

تیرے کرم نے ڈال دی طرحِ خلوص و بندگی
تیرے غضب نے بند کی رسمِ دراز ستم گری

تیرے سخن سے دب گئے لاف و گزاف کفر کے
تیرے نفس سے بجھ گئی آتشِ سحرِ سامری

لحن سے تیرے منتظم پست و بلندِ کائنات
ساز سے تیرے منضبط گردشِ چرخِ چنبری

چینِ ستم سے بے خبر تیری جبینِ دل کشی
حرفِ وفا سے تابناک تیری بیاضِ دل بری

تیری پیمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے
بخشا گدائے راہ کو تو نے شکوہِ قیصری

بھٹکے ہوؤں پہ کی نظر رشکِ خضر بنا دیا
راہزنوں کو دی ندا بن گئے شمعِ رہبری

سلجھا ہوا تھا کس قدر تیرا دماغِ حق رسی
پگھلا ہوا تھا کس قدر تیرا دلِ پیمبری
چشمہ ترے بیان کا غارِ حرا کی خامشی
نغمہ ترے سکوت کا نعرۂ فتحِ خیبری
زمزمہ تیرے ساز کا لحنِ بلالؓ حق نوا
ساعقہ تیرے ابر کا لرزشِ رُوحِ بوذریؓ
آئینہ تیرے خُلق کا طبعِ حسن کی سادگی
جذبہ ترے عروج کا آلِ عبا کی برتری
جھلکیاں تیرے ناز کی جنبشِ کاکلِ حسین
رنگ ترے نیاز کا گردشِ چشمِ جعفریؓ
شان ترے ثبات کی عزمِ شہیدِ کربلا
شرح ترے جلال کی ضربتِ دستِ حیدری
رنگ ترے شباب کا جلوۂ اکبرِ قتیل
نقش ترے شکیب کا خونِ گلوئے اصغری
تیرا لباس فاخرہ چادرِ کہنۂ بتول
تیری غذائے خوش مزا نانِ شعیرِ حیدری
تجھ پہ نثار جان و دل مڑکے ذرا یہ دیکھ لے
دیکھ رہی ہے کس طرح ہم کو نگاہِ کافری!
تیرے گدائے بے نوا، تیرے حضور آئے ہیں
چہروں پہ رنگِ خستگی سینوں میں دردِ بے پری
آج ہوائے دہر سے ان کے سروں پہ خاک ہے
رکھی تھی جن کے فرق پر تو نے کلاہِ سروری
تیرے فقیر اور دیں کوچۂ کفر میں صدا
تیرے غلام اور کریں اہلِ جفا کی چاکری

طرفِ کُلہ میں جن کے تھے لعل و گہر ٹکے ہوئے
حیف اب اُن سروں میں ہے دردِ شکستہ خاطری
جتنی بلندیاں تھیں سب ہم سے فلک نے چھین لیں
اب نہ وہ تیغ غزنوی، اب نہ وہ تاجِ اکبری
اُٹھ کہ ترے دیار میں پرچمِ کفر کھل گیا
دیر نہ کر کہ پڑ گئی صحنِ حرم میں اَبتری
خیز و دلِ شکستہ را، دولتِ سوز و ساز دہ
مسلمِ خستہ حال را، رخصتِ ترکتاز دہ

بادۂ سر جوش

جدید رنگِ تغزّل

(۱)

صبح بالیں پہ یہ کہتا ہوا غم خوار آیا
اُٹھ کہ فریاد رسِ عاشقِ بیمار آیا!

بختِ خوابیدہ گیا ظلمتِ شب کے ہمراہ
صبح کا نور لئے دولتِ بیدار آیا

خیر سے باغ میں پھر غنچۂ گلرنگ کھلا
شکر ہے دَور میں پھر ساغرِ سرشار آیا

جھوم اے تشنۂ گلبانگِ نگارِ عشرت
کہ لبِ یار لئے چشمۂ گفتار آیا

شکرِ ایزد کہ وہ سرخیلِ مسیحا نفساں
زلف بردوش پئے پرسشِ بیمار آیا

رخصت اے شکوۂ قسمت کہ سرِ بزمِ نشاط
ناسخِ مسئلۂ اندک و بسیار آیا

للہ الحمد کہ گلزار میں ہنگامِ صبوح
حکمِ آزادیٔ مرغانِ گرفتار آیا

غنچۂ لیت اچٹک جاگ اٹھی موجِ صبا
شعلۂ حسن ابھر کہ مصر کا بازار آیا

خوش ہو اے عشق کہ پھر حسن ہوا مائلِ ناز
مژدہ اے جنسِ محبت کہ خریدار آیا

اے نظر! شکر بجا لا کہ کھلی زلفِ دراز
اے صدف! آنکھ اٹھا ابرِ گہربار آیا

بادباں ! ناز سے لہرا کے چلی بادِ مراد　　کارواں ! عید منا قافلہ سالار آیا
خوش ہو اے گوش ! کہ جبریلِ ترنم چہکا　　مژدہ اے چشم ! کہ پیغمبرِ انوار آیا
خوش ہو اے پیرِ مغاں ! جوش ہوا نغمہ فروش
مژدہ اے دخترِ رز ! رندِ قدح خوار آیا !

(۳)

گذر رہا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا　　چراغِ مجلسِ روحانیاں جلاتا جا
اٹھا کے ناز سے شب آفریں نگاہوں کو　　کسی کی سوئی ہوئی روح کو جگاتا جا
نگاہِ مہر سے اے آفتابِ عالمِ پاک　　حقیر خاک کے ذروں کو جگمگاتا جا
ملا کے مجھ سے نظر عزتِ جنوں کی قسم　　چراغِ محفلِ عقل و خرد بجھاتا جا
اسیر کر کے سیہ کاکلوں کے حلقے میں　　کمندِ عقلِ تنک مایہ سے چھڑاتا جا
اٹھا کے عارضِ گلگوں سے دو گھڑی کو نقاب　　نظر سے ارض و سما کا حجاب اٹھاتا جا
مزاج پوچھ کے اے شاہِ عارض و کاکل　　گدائے راہ کی بھی آبرو بڑھاتا جا
اگر یہ لطف گوارا نہیں تو مستِ خرام !
جبینِ جوش پہ ٹھوکریں لگاتا جا

(۴)

چلا ہے سوئے حرم دل سے ساز کرتا جا　　طوافِ کعبۂ حسنِ مجاز کرتا جا
ملے جو وقت تو اے رہروِ رہِ اکسیر　　حقیر خاک سے کچھ ساز باز کرتا جا
بلند و پست وہاں کے ارے معاذ اللہ　　یہیں سے سیرِ نشیب و فراز کرتا جا
تلاشِ جادۂ بے پیچ و خم سے قبل اے دوست　　تجسسِ خمِ زلفِ دراز کرتا جا
اگر جبیں کو ہے ذوقِ حریمِ بے رنگی　　بساطِ رنگ پہ مشقِ نماز کرتا جا
چلا ہے خدمتِ یارِ درست پیماں میں　　پرستشِ صنمِ حیلہ ساز کرتا جا
وہاں جمال کو فرصت نہیں توقف کی　　یہیں سے دیدۂ باطن کو باز کرتا جا
مثالِ جوش اسی آب و گل کے عالم سے
نظر کو خوگرِ طغیانِ ناز کرتا جا

(۴)

پھر سر کسی کے در پہ جھکائے ہوئے ہیں ہم
پردے پھر آسماں کے اُٹھائے ہوئے ہیں ہم

چھائی ہوئی ہے عشق کی پھر دل پہ بے خودی
پھر زندگی کو ہوش میں لائے ہوئے ہیں ہم

جس کا ہر ایک جزو ہے اکسیرِ زندگی
پھر خاک میں وہ جنس ملائے ہوئے ہیں ہم

ہاں کون پوچھتا ہے خوشی کا نہفتہ راز
پھر غم کا بار دل پہ اٹھائے ہوئے ہیں ہم

ہاں کون درسِ عشق و جنوں کا ہے خواستگار
آئے کہ ہر سبق کو بھلائے ہوئے ہیں ہم

آئے، جسے ہو جادۂ رفعت کی آرزو
پھر سر کسی کے در پہ جھکائے ہوئے ہیں ہم

بیعت کو آئے جس کو ہو تحقیق کا خیال
کون و مکاں کے راز کو پائے ہوئے ہیں ہم

ہستی کے دامِ سخت سے اکتا گیا ہے کون؟
کہہ دو کہ پھر گرفت میں آئے ہوئے ہیں ہم

ہاں کس کے پائے دل میں ہے زنجیرِ آب و گل
کہہ دو کہ دامِ زلف میں آئے ہوئے ہیں ہم

ہاں کس کو جستجو ہے نسیمِ فراغ کی؟
آسودگی کو آگ لگائے ہوئے ہیں ہم

ہاں کس کو سیرِ ارض و سما کا ہے اشتیاق؟
دھونی پھر اُس گلی میں رمائے ہوئے ہیں ہم

جس پر نثار کون و مکاں کی حقیقتیں
پھر جوشؔ اس فریب میں آئے ہوئے ہیں ہم

(۵)

بالا ہیں جوشؔ دامِ زمان و مکاں سے ہم
رسمِ تعینات کو لائیں کہاں سے ہم

کوثر کی آرزو میں رہیں گے نہ تشنہ کام
پیماں یہ کر چکے ہیں مئے ارغواں سے ہم

انمول بیچنے والے ہیں جس چیز سے کبھی
ارزاں ہیں آج کل اسی جنسِ گراں سے ہم

اب اے خدا عنایتِ بے جا سے فائدہ؟
مانوس ہو چکے ہیں غمِ جاوداں سے ہم

روز اک نئی زمیں سے گزرتے ہیں ہم نفس
ملتے ہوئے ہیں موجۂ آبِ رواں سے ہم

یہ طرفہ بات ہے کہ بایں فقر و بے زری
ہیں بہرہ یاب دولتِ کون و مکاں سے ہم

جب حسن چاہے عشق کے سانچے میں ڈھال لے
پگھلے ہوئے ہیں آتشِ رطلِ گراں سے ہم

پائندہ باش، اے خمِ ابروئے دل نشیں!
اب کھیلتے ہیں موت کے تیر و کماں سے ہم

اہلِ زمیں غریب ہیں ہم نکتہ چیں نہ ہو
آتے ہیں گاہ گاہ یہاں آسماں سے ہم

جنگل ہے، آب جو ہے، شبِ ماہتاب ہے　　　ایسے میں اُن کو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم
ہاں آسمان! اپنی بلندی سے ہوشیار!　　　لے سر اُٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

اٹھنا تھا جن کو چین و عجم سے سو اُٹھ چکے
اب جوش اُٹھے ہیں کشورِ ہندوستاں سے ہم

(۶)

مری مجال، تیری بزم، اور لن ترانیاں　　　میں نقشِ پائے رہروان، تو افسرِ جہانیاں
سخن فروشیاں نہ کر جہانِ حسن و عشق میں　　　کہ یاں ہر ایک خال میں ہیں لاکھ نکتہ دانیاں
وہ زیبِ انجمن ہوا تو کوئی بولتا نہیں　　　معاشرانِ بزم کیا ہوئیں وہ گل فشانیاں!
ذرا اثر نہ پڑ سکا جنونِ ذوقِ دید پر　　　پیمبروں نے لاکھ کیں نظر کی پاسبانیاں
شدید بدگمانیوں پہ حسنِ ظن ہے یار سے　　　عمیق حسنِ ظن میں ہیں ہزار بدگمانیاں
عجیب طرفہ راز ہیں مری شبوں کے راز بھی　　　جنہیں نہاں کئے ہوئے ہیں سیکڑوں جوانیاں
شبابِ رفتہ کے قدم کی چاپ سُن رہا ہوں میں　　　ندیم! عہدِ شوق کی سُنائے جا کہانیاں

مری بساطِ مے کشی پہ جوش سجدہ ریز ہیں
کروڑ قہرمانیاں، ہزار ہا کیانیاں

(۷)

وقتِ سحر ہے، آؤ ہم نفسو! وضو کریں　　　مینا اُٹھائیں، خدمتِ جام و سبو کریں
لو کھل گیا وہ پرچمِ خورشیدِ زرنگار　　　اُٹھو، کہ وا دریچۂ صد رنگ و بو کریں
طائر خروش میں ہیں، صبا گرمِ اختلاط　　　آؤ، حریمِ کیف میں پھر ہاؤ ہو کریں
مستانہ وار جیبِ جوانی کے چاک میں　　　پھر رشتۂ شرابِ کہن سے رفو کریں
ملبوسِ زندگانی و رخصتِ حیات کو　　　صہبا کی نرم آنچ سے پھر شست و شو کریں
آؤ، بنائیں یار کو پھر صدرِ انجمن　　　آئینۂ آفتاب کے پھر رُو برو کریں
دنیا کو آؤ، رشکِ بہشتِ بریں بنائیں　　　خشکی کو، آؤ، روکشِ صد آب جو کریں
میلا ہے کہنہ دوش کا مُرجھا چلا ہے ہار　　　پھر تازہ پھول گوندھ کے زیبِ گلو کریں
آنے لگی ہے دیر سے ناقوس کی صدا　　　آؤ، تصورِ صنمِ سادہ رُو کریں

بہرِ دعا زمانہ اٹھائے ہوئے ہے ہاتھ　　　　یارو! اٹھو، کہ بیعتِ دستِ سبو کریں

پھر آؤ دل کا جوش کے نغموں سے درس لیں

پھر آؤ تازہ رسم و رہِ آرزو کریں

(۸)

فکر ہی ٹھہری تو دل کو فکرِ خوباں کیوں نہ ہو　　　　خاک ہونا ہے تو خاکِ کوئے جاناں کیوں نہ ہو

دہر میں اے خواجہ ٹھہری جب اسیری ناگزیر　　　　دل اسیرِ حلقۂ گیسوئے پیچاں کیوں نہ ہو

زیست ہے جب مستقل آوارہ گردی ہی کا نام　　　　عقل والو! پھر طوافِ کوئے جاناں کیوں نہ ہو

جب نہیں مستوریوں میں بھی گناہوں سے نجات　　　　دل کھلے بندوں غریقِ بحرِ عصیاں کیوں نہ ہو

اک نہ اک ہنگامے پر موقوف ہے جب زندگی　　　　مے کدے میں رند رقصاں و غزل خواں کیوں نہ ہو

جب خوش و ناخوش کسی کے ہاتھ میں دینا ہے ہات　　　　ہم نشیں پھر بیعتِ جامِ زر افشاں کیوں نہ ہو

جب بشر کی دسترس سے دور ہے "حبل المتیں"　　　　دشتِ وحشت میں پھر اک کافر کا داماں کیوں نہ ہو

ایک ہے جب شورِ جہل و بانگِ حکمت کا مآل　　　　دل ہلاکِ ذوقِ گلبانگِ پریشاں کیوں نہ ہو

اک نہ اک رفعت کے آگے سجدہ لازم ہے تو پھر　　　　آدمی محوِ سجودِ سترِ خوباں کیوں نہ ہو

اک نہ ایک پھندے ہی میں پھنسنا ہے جب انساں کو　　　　دوش پر دامِ سیاہِ سنبلستاں کیوں نہ ہو

جب فریبوں ہی میں رہنا ہے تو اے اہلِ خرد　　　　لذتِ پیمانِ یارِ سست پیماں کیوں نہ ہو

ہاں جب آویزش ہی ٹھہری ہے تو ذرّے چھوڑ کر　　　　آدمی خورشید سے دست و گریباں کیوں نہ ہو

اک نہ اک ظلمت سے جب وابستہ رہنا ہے تو جوشؔ

زندگی پر سایۂ زلفِ پریشاں کیوں نہ ہو؟

(۹)

ہاں اس طرف بھی عابدِ شب زندہ دار دیکھ　　　　ایمان دھل نہ جائے گا، صرف ایک بار دیکھ

تا کے یہ جست و خیز بہ آہنگِ خانقاہ　　　　آ بوستاں میں رقصِ نسیمِ بہار دیکھ

مستوریوں لطف و عطا کا گذر نہیں　　　　مستوں میں جوششِ رحمتِ پروردگار دیکھ

تا چند اشتیاقِ نمودِ ہلالِ عید!　　　　ابرو پہ نازِ طرۂ زلفِ نگار دیکھ

اے قدردانِ سکۂ مقلوبِ سلسبیل!　　　　رطلِ شراب کا زرِ کامل عیار دیکھ

ظرفِ گل میں آب و رنگ دیکھتا ہے کیا؟ — آ جامِ زر میں آتشِ دانا کا رنگ دیکھ
اک واہمہ ہے طنطنۂ شیخِ مدرسہ — آ میکدے میں ولولۂ بادہ خوار دیکھ
دودِ چراغ و مسجد و محراب تا کجا! — آ پیچ و تابِ ابرِ سرِ کوہسار دیکھ
تا کے تصورِ لبِ نہر و خرامِ حور؟ — نازِ سہی قدانِ لبِ جوئبار دیکھ
تا کے ہوائے کاکلِ پیرانِ پارسا؟ — او نامراد! عربدۂ زلفِ یار دیکھ

کیا دیکھتا ہے زہد کے کوچے میں رہ کے شیخ
کوئے مغاں میں جوش کا عز و وقار دیکھ

(۱۰)

ہنوز شعلہ ہے پردے میں منہ چھپائے ہوئے — مگر کنول ہیں کہ روشن ہیں سب جلائے ہوئے
ہنوز قطرۂ نیساں ہے اور ضمیرِ سحاب — مگر صدف میں ہیں موتی سے جگمگائے ہوئے
ہنوز سنگ کے سینے میں ہے زرِ اصنام — ابھی سے کتنے برہمن ہیں سر جھکائے ہوئے
ہنوز میان سے باہر نہیں ہوئی ہے وہ تیغ — پڑے ہیں کتنے مگر خون میں نہائے ہوئے
ہنوز غیبتِ خورشید سے افق ہے اداس — تمام دشت کے ذرے ہیں جگمگائے ہوئے
ہنوز چہرۂ رخ پہ چھائی نہیں ہے مست گھٹا — چمن کی خاک ہے خود کو دلہن بنائے ہوئے
چہک رہے ہیں عنادل مہک رہی ہے نسیم — ہنوز غنچے ہیں بندِ قبا لگائے ہوئے
نہیں ملا ہے صبا کو ہنوز اذنِ خرام — مگر چراغ ابھی سے ہیں جھلملائے ہوئے
سُلگ رہے ہیں برابر ہزار ہا خرمن — ہنوز ابر ہے بجلی میں منہ چھپائے ہوئے
ہنوز دور ہے اعلانِ تاج پوشیٔ شاہ — کھڑے ہیں کتنے گدا آسرا لگائے ہوئے
کھلے ہوئے ہیں صبا میں ہزار ہا نافے — ہنوز زلف میں ہیں وہ گرہ لگائے ہوئے
ہنوز یار ہے خلوت گزین و حجلہ نشیں — تمام بزم کے چہرے ہیں مسکرائے ہوئے

سنا ہے جوش اٹھے گی کسی کی آنکھ ادھر
دلوں کو لوگ ابھی سے ہیں تھامے ہوئے

(۱۱)

لے لیا دل اک جوشِ ادا نے — کانِ شوخی، جانِ حیا نے

آفتِ جانے، فتنۂ شہرے　　جانِ جہانے، روحِ روانے
موجِ تبسم کے دامن میں　　برق کی رَو، بجلی کے خزانے
وقتِ خرامِ ناز جِلو میں　　صبحِ چمن کے تازہ ترانے
بکھری ہوئی زلفِ سیہ میں　　شامِ طرب کے لاکھ فسانے
جنبشِ لعلِ عہد شکن میں　　کتنے حیلے، کتنے بہانے
رقصاں تابِ چشمِ سیہ میں　　کیف کے دن، شورش کے زمانے
رُخ پہ رکا فرِ زلف کی لہریں　　جیسے لمحے شب کے سہانے
گاہ بہ لب سرچشمۂ نوشیں　　گاہ بہ گردن تیغ روانے
گاہ بہ خلوت سازِ خموشی　　گاہ بہ جلوت شعلہ زبانے
گاہ بہ گفتار آیۂ رحمت　　گاہ بہ رفتار آبِ روانے
گہ بہ تلطف نرم نسیمے　　گہ بہ تحکم سخت کمانے
گاہ بہ شوخی مستِ غزالے　　گاہ بہ مستی خوابِ گرانے
گاہ بہ نورِ صبح "یقینے"　　گاہ بہ ابرِ شام "گمانے"
گاہ بہ مسند "گفتہ حدیثے"　　گاہ بہ پہلو "رازِ نہانے"

شکر کہ بختِ جوش کے عقدے
کھول دیے پھر زلفِ رسا نے

قدیم رنگِ تغزل

(۱)

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا　　جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا
دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا　　جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا
اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد　　اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا
اتنا مانوس ہوں فطرت سے، کلی جب چٹکی　　جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا

مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا　　(سنہ ۱۹۲۱ء)

(۲)

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

یہی تو ہیں دو ستونِ محکم، انہیں پہ قائم ہے نظمِ عالم
یہی تو ہے رازِ خلدِ آدم، نگاہ میری، شباب تیرا

صبا تصدق ترے نفس پر، چمن ترے پیرہن پہ قرباں
شمیمِ دوشیزگی میں کیسا بسا ہوا ہے شباب تیرا

تمام محفل کے روبرو گو، اٹھائیں نظریں، ملائیں آنکھیں
سمجھ سکا ایک بھی نہ لیکن، سوال میرا، جواب تیرا

ہزار شاخیں ادا سے لچکیں، ہوا نہ تیرا سا لوچ پیدا
شفق نے کتنے ہی رنگ بدلے، ملا نہ رنگِ شباب تیرا

ادھر مرا دل تڑپ رہا ہے، تری جوانی کی جستجو میں
ادھر مرے دل کی آرزو میں مچل رہا ہے شباب تیرا

کرے گی دونوں کا چاک پردا، رہے گا دونوں کو کر کے رسوا
یہ شورشِ ذوقِ دید میری، یہ اہتمامِ حجاب تیرا

جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جائیں، فلک تو کیا عرش کانپ اٹھے
اگر میں دل پر نہ روک لیتا تمام زورِ شباب تیرا

بھلا ہوا جوش نے ہٹایا نگاہ کا چشمِ تر سے پردہ
بلا سے جاتی رہیں گر آنکھیں، کھلا تو بندِ نقاب تیرا　　(سنہ ۱۹۲۵ء)

(۳)

پہچان گیا سیلاب ہے اس کے سینے میں ارمانوں کا
دیکھا جو سفینے کو میرے، جی چھوٹ گیا طوفانوں کا

یہ شوخ فضا، یہ تازہ چمن، یہ مست گھٹا، یہ سرد ہوا
کافر ہے اگر اس وقت بھی کوئی رخ نہ کرے مے خانوں کا

یہ کس کی حیات افروز نظر نے چھیڑ دیا ہے عالم کو
ہر خاک کے ادنیٰ ذرّے میں ہنگامہ ہے لاکھوں جانوں کا

مطرب! بربط ہاتھ سے رکھ دے، نادانی نے در کھول دیا
فریاد، کہ چھُو کر ٹوٹ گیا، پھر کانچ سا ارمانوں کا

ہاں ظلم و ستم سے بھی قدرے پڑتی ہیں خراشیں سینے پر
سب سے ہے مہلک زخم مگر اے حسن! ترے احسانوں کا

دنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقائق کی تلخی
اور ہم نے حقائق کے نقشے میں رنگ بھرا افسانوں کا

کم بخت جوانی سینے میں ناگن کی طرح لہراتی ہے
ہر موجِ نفس اک طوفاں ہے کونین شکن ارمانوں کا

اے جوشؔ جنوں کی شام و سحر میں وقت کی یہ رفتار نہیں
داناؤں کی طولانی صدیاں، اور ایک نفس دیوانوں کا

(سنہ ۱۹۲۲ء)

(۴)

قدمِ انساں کا راہِ دہر میں تھرّا ہی جاتا ہے
چلے کتنا ہی کوئی بچ کے ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا، پھر بھی
ہجومِ کشمکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے

خلافِ مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں مگر ناصح!
وہ آتے ہیں تو چہرے پر تغیّر آ ہی جاتا ہے

ہوائیں زور کتنا ہی لگائیں آندھیاں بن کر
مگر جو گھر کے آتا ہے وہ بادل چھا ہی جاتا ہے

شکایت کیوں اسے کہتے ہو، یہ فطرت ہے انساں کی
مصیبت میں خیالِ عیشِ رفتہ آ ہی جاتا ہے

سمجھتی ہیں مآلِ گُل مگر کیا زورِ فطرت ہے
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسّم آ ہی جاتا ہے

(سنہ ۱۹۲۷ء)

(۴)

فکر و نشاط

(منظومات)

شمعِ فروزاں

میں اے جوش! اس دور میں ہوں وہ شاعر
اندھیرے میں جس طرح شمعِ فروزاں

حریفوں کے آگے مری شاعری ہے
کہ ہے پیشِ تورات و انجیل، قرآں

مرا دل وہ فیاض خرمن ہے جس سے
چمن ریز ہے دامنِ خوشہ چیناں

دمِ فکر دل میں مچاتی ہے دھومیں
تمنائے بیداریِ نوعِ انساں

مرا شعر اس عصرِ بے رنگ و بو میں
پسِ تیرگی جلوۂ آبِ حیواں

مرا دل دھڑکتا ہے یوں زیر و بم سے
جھپکتی ہے جس طرح مژگانِ دوراں

مری طبع ہے تازہ اندیشیوں سے
شگفتہ تر از خندۂ نازنیناں

مری سادگی میں بھی وہ دل کشی ہے
شبِ ماہ میں جس طرح خوابِ طفلاں

شبِ تار میں میری آشفتہ حالی
دمِ صبح گویا خمِ زلفِ جاناں

مرے ذہن پر رشحۂ ابرِ معنی
جوانی کے ماتھے پہ جس طرح افشاں

مری بارشِ فکرِ رنگیں کی رَو میں
منقش تنک رنگیِ ہم نشیناں

بساطِ ادب پر مری طبعِ رنگیں
سرِ شاخ جس طرح مرغِ خوش الحاں

مری چشمِ تر میں تمنا کی ہل چل
سرِ آب جس طرح موجِ چراغاں

خراماں ہے دل میں مرے روحِ وحشت
بہ انداز دوشیزگانِ بیاباں

مری روح پر عکسِ تخئیلِ رنگیں
جبیں پر ہے جس طرح زلفِ پریشاں

مرے دل میں عہدِ تمنا کی راتیں   گھنے باغ میں جس طرح برق و باراں
مرا دل ہے اے جوشؔ داغوں کی ضو سے
"برشتہ تر از حسنِ صحرا نشیناں"

سعیٔ لاحاصل

اے جوشؔ تنگیوں میں پرافشاں ہوئے تو کیا   بہروں کی انجمن میں غزل خواں ہوئے تو کیا
ہندوستاں غلام ہے، گونگا ہے سرد ہے   ہندوستاں میں آپ سخن داں ہوئے تو کیا
اک وسوسہ جو قوم ہر خود فی صُدُورِ ناس   اس وسوسے میں جذبۂ ایماں ہوئے تو کیا
جس چرخِ تیرہ پر ہے سیہ ابر کا ہجوم   اس چرخ تیرہ پر مہِ تاباں ہوئے تو کیا
جو سرزمینِ شور ہو محروم رنگ و بو   اس سرزمیں پہ ابرِ خراماں ہوئے تو کیا
موجوں نے جس کی توڑ دیا ہو صدف کا دل   اس جوئے عمر میں قطرۂ نیساں ہوئے تو کیا
جس گلستاں میں ایک ہے کانٹا ہو یا گلاب   اس گلستاں میں سنبل و ریحاں ہوئے تو کیا
ہم وزن وہم گہر ہوں جہاں زاغ و عندلیب   اس گلستاں میں مرغِ خوش الحاں ہوئے تو کیا
جس تیرگی میں ہو نہ سکندر نہ رُوحِ خضر   اس تیرگی میں چشمۂ حیواں ہوئے تو کیا
نکلے نہ بعض خانہ سے باہر جہاں نظر   واں آپ کائنات بر داماں ہوئے تو کیا

اندھوں سے جب پڑا ہے زمانے میں سابقہ
اے جوشؔ آپ یوسفِ کنعاں ہوئے تو کیا

نقاد

رحم اے نقادِ فن! یہ کیا ستم کرتا ہے تو   کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو
شاعری اور منطقی بحثیں یہ کیسا قتلِ عام   بُرشِ مقراض کا دیتا ہے زلفوں کو پیام
کیوں اٹھا ہے جنسِ شاعر کے پرکھنے کے لیے؟   کیا شمیمِ سنبل و نسریں ہے چکھنے کے لیے؟

اے ادب ناآشنا! یہ بھی نہیں تجھ کو خیال　　ننگ ہے بزمِ سخن میں مدرسے کی قیل و قال
منطقی کانٹے پہ رکھتا ہے کلامِ دل پذیر　　کاش اس نکتے کو سمجھے تیری طبعِ حرف گیر

یعنی اک نَے سے لبِ ناقد کو کھلنا چاہیے
پنکھڑی پر قطرۂ شبنم کو تلنا چاہیے

شعر فہمی کے لیے ہیں جو شرائط بے خبر　　سوچ، تو پورا اترتا بھی ہے اس معیار پر؟
جلتے دیکھا ہے کبھی ہستی کے دل کا تو نے داغ؟　　آنچ سے جس کی غذا پاتا ہے شاعر کا دماغ
دل سے اپنے پوچھ او زندانیٔ علم و کتاب!　　حسنِ فطرت کو بھی دیکھا ہے برافگندہ نقاب؟
تو پتا اسرارِ ہستی کا لگاتا ہے کبھی؟　　عالمِ محسوس سے باہر بھی جاتا ہے کبھی؟
کیا وہاں بھی اڑ کے پہونچا ہے کبھی اے نکتہ چیں؟　　کانپتا ہے جس فضا میں شہپرِ روح الامیں!
خامشی کی نغمہ ریزی پر بھی سر دھنتا ہے تو؟　　قلبِ فطرت کے دھڑکنے کی صدا سنتا ہے تو؟
اُن بتوں کی بزم میں تو بھی ہوا ہے باریاب؟　　خاک کو پرچھائیاں جن کی بناتی ہیں گلاب
جو تبسم چھین لیتے ہیں شبِ مہتاب سے　　جن کی برنائی جگاتی ہے دلوں کو خواب سے
سچ بتا تو بھی ہے کیا، اے کشتۂ صد حرص و آز　　نازدانِ کاکلِ شب رنگ و چشمِ نیم باز
تیری نبضوں میں بھی پھیلی ہے کبھی بجلی کی رو!　　سوزِ غم سے تیرا دل بھی کیا کبھی دیتا ہے لو؟
سچ بتا، اے عاشقِ دیرینۂ فکرِ معاش　　زہر میں تریاق کے عنصر کی بھی کی ہے تلاش؟
مجھ سے آنکھیں تو ملا، اے دشمنِ سوز و گداز　　تجھ پہ کیا اضداد کی توحید کا افشا ہے راز؟
تیری راتوں کی سیاہی میں بھی اے ظلمت مآب　　کیا کبھی طالع ہوا ہے مسکرا کر آفتاب؟
تو گیا بھی ہے نگارِ غم کی محفل کے قریب؟　　آنچ بھی محسوس ہوتی ہے کبھی دل کے قریب؟
طورِ معنی پر بھی اے نافہم چڑھ سکتا ہے تو؟　　کیا مصنف کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے تو؟

یہ نہیں، تو پھیر لے آنکھیں یہ جلوہ اور ہے
تیری دنیا اور ہے شاعر کی دنیا اور ہے

شعر کی تخلیق سے پہلے مری تقریر سن　　خود زبانِ شعر سے آ شعر کی تفسیر سن
دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بے شمار　　نطق پر بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار
ڈھال لیتی ہے جنہیں شاعر کی ترکیبِ ادب　　ڈھل کے گو وہ "گوہرِ غلطاں" کا پاتی ہیں لقب

اور ہوتی ہیں تجلی بخشِ تاجِ زرفشاں — پھر بھی وہ شاعر کی نظروں میں ہیں خالی سیپیاں

جن کے اسرارِ درخشاں روح کی محفل میں ہیں
سیپیاں ہیں نطق کی موجوں پہ موتی دل میں ہیں

شاعری کا خانماں ہے نطق کا ٹوٹا ہوا — اس کا شیشہ ہے زباں کی ٹھیس سے ٹوٹا ہوا
چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دلِ سرشار پر — لوٹ کر آتے نہیں وہ نغمے لبِ گفتار پر
جاگتے رہتے ہیں دل کی محفلِ خاموش میں — بند کر لیتے ہیں آنکھیں نطق کے آغوش میں
لوگ جن کی جاں گدازی سے ہیں دل پکڑے ہوئے — کھوکھلے نغمے ہیں وہ اوزان میں جکڑے ہوئے
شعر ہو جاتا ہے صرف اک جنبشِ لب سے نڈھال — سانس کی گرمی سے پڑ جاتا ہے اس شیشے میں بال
جام میں آتے ہی اڑ جاتی ہے شاعر کی شراب — ٹوٹ جاتا ہے کنارے آتے آتے یہ حباب

اس سے بڑھ کر اور ہو سکتی ہے کیا حیرت کی بات
"شعر" کو سمجھا اگر شاعر کی تو نے کائنات

"شعر کیا؟ جذبِ دروں کا ایک نقشِ ناتمام — "شعر" ہلکا سا اک اشارہ "ایک مبہم سا کلام"
کیف میں اک "لغزشِ پا" کلکِ گوہر بار کی — "اضطراری ایک جنبش سی" لبِ گفتار کی
"ایک صوتِ خستہ و موہوم" سازِ ذوق کی — "مرتعش سی ایک آواز" انتہائے شوق کی
شے حقیقت سے پرے اندر زمزمۂ داؤد کا — "تار ہیں محدود" پر اک عکس "لامحدود" کا
"شعر" کیا؟ عقل و جنوں کی مشترک بزمِ جمال — "شعر" کیا ہے؟ عشق و حکمت کا مقامِ اتصال
ظلمتِ ابہام میں پرچھائیں تفصیلات کی — پیچ و خم کھاتے بگولے میں چمک ذرات کی
جوئے قدرت کی روانی دشتِ مصنوعات میں — نوشنا نگیں ستارے کا اندھیری رات میں
"شعر" کیا؟ کچھ سوچ دل میں بہ لحنِ دل نشیں — "شعر کیا؟" ہر چیز کہہ کر کچھ نہ کہنے کا یقیں
شعر کیا ہے؟ نیم بیداری میں بہنا سوچ کا — برگِ گل پر نیند میں شبنم کے گرنے کی صدا
تر زبانی اور خاموشی کی مبہم گفتگو — لفظ و معنی میں توازن کی نہفتہ آرزو
بادلوں سے ماہِ نو کی اک اچٹتی سی ضیا — جھانکنا قطرے کے روزن سے [illegible]

مر کے بھی تو شاعری کا بھید پا سکتا نہیں
عقل میں یہ مسئلہ نازک ہے آ سکتا نہیں

تو سمجھتا تھا، جو کہنا چاہیئے تھا، کہہ گیا
پوچھ شاعر سے کہ وہ کیا کہہ سکا، کیا رہ گیا

کون سمجھے شعر یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں

ہم لوگ

خزاں کے جور سے ہر چند خوار ہیں ہم لوگ
مگر امانتِ فصلِ بہار ہیں ہم لوگ

ہر ایک سانس ہے گو صد ہزار حشر بدوش
مگر سراپا ثبات و قرار ہیں ہم لوگ

جلال چھو نہیں سکتا ہے یزداں کا
وہ دستِ غیب کے نقش و نگار ہیں ہم لوگ

زمیں سے کرتے ہیں ناز اور آسماں سے غرور
وہ کبر دوست کے آئینہ دار ہیں ہم لوگ

عیاں ہیں جن پہ تہی دستیاں سلاطیں کی
لباسِ فقر میں وہ شہریار ہیں ہم لوگ

جہاں میں ہیں مگر اہلِ جہاں سے کام نہیں
وطن میں رہ کے غریب الدیار ہیں ہم لوگ

کسی مقام پہ ٹھہرا نہیں قرار نہیں
مثالِ جوئے رواں بے قرار ہیں ہم لوگ

جوانیوں کو ہمیں سے ملی ہے نعمتِ ناز
وہ رازِ طرۂ زلفِ نگار ہیں ہم لوگ

فشردۂ غمِ ہستی سے کھینچتے ہیں شراب
بساطِ عیش پہ وہ بادہ خوار ہیں ہم لوگ

چمن میں سنتے ہیں ہر صبح نغمۂ الہام
امینِ زمزمۂ شاخسار ہیں ہم لوگ

جگر ہے وقت کا اپنی جناب میں صد چاک
وہ ناخنِ غمِ لیل و نہار ہیں ہم لوگ

حیات و موت کی پست و بلند راہوں میں
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار ہیں ہم لوگ

نفس میں سنتے ہیں آہٹ کسی کے قدموں کی
نہ پوچھ کیوں ہمہ تن انتظار ہیں ہم لوگ

وہ جبر دوست جسے "اختیار" کہتے ہیں
اس اختیار سے بے اختیار ہیں ہم لوگ

محیطِ سکۂ مقلوب کے طلسم میں
سفینۂ زرِ کامل عیار ہیں ہم لوگ

حیات کی ابدی رات کے اندھیرے میں
چراغِ عابدِ شب زندہ دار ہیں ہم لوگ

بجھے پڑے ہیں زمانے کے ہاتھ سے ہر چند
مگر ہمہ برق و شرار ہیں ہم لوگ

ادب سے آؤ ہمارے حضور اہلِ نظر!
جہانِ حسن کے پروردگار ہیں ہم لوگ

نگاہ روبرو، اے رُوحِ نعمتِ دارین　　　بہ ہوش باش کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ
بس اس خطا پہ کہ ہیں محرمِ رموزِ حیات
شکارِ کشمکشِ روزگار ہیں ہم لوگ

خطِ رفتار

دیکھ چشمِ غور سے راہوں میں قدموں کے نشاں　　　یہ لکیریں ہیں کہ جنبش میں ہے نبضِ کارواں
بعض نقشِ پا ہیں کچھ سہمے ہوئے سے مضمحل　　　جن سے ظاہر ہے کہ تھے پژمردہ ان لوگوں کے دل
اور کچھ اُبھرے نظر آتے ہیں فرشِ خاک پر　　　لے رہا ہے جن میں انگڑائی غرورِ مال و زر
کچھ نشاں ہیں ہلکے ہلکے دل فریب و دل نشیں　　　جن سے ثابت ہے کہ یہ رہرو تھے شاید نازنیں
کچھ نشاں ایسے بھی ہیں پامالِ بارِ آرزو　　　جن کے ہر خط میں [illegible] ہے تمنا کا لہو
کچھ نشاں ایسے ہیں گویا خون سارا جم گیا　　　فرطِ ناکامی سے جیسے دل دھڑکا دھڑک کر تھم گیا
بعض میں آمادگی ہے مسکرانے کے لئے　　　اور کچھ بے چین ہیں آنسو بہانے کے لئے
کچھ ہیں یوں زیر و زبر نغمے کے جیسے زیر و بم　　　جن سے ثابت ہے کہ یہ شاعر کے ہیں نقشِ قدم
اے مسافر دیکھ [illegible] کتابِ زندگی　　　یہ نشاں پا کے ہیں اوراقِ کتابِ زندگی
حرف ہیں ذرّوں کے دفترِ راہِ ناہموار کا　　　لکھ گیا ہے خاک پر کیا کیا قلم رفتار کا!
دیدۂ احساس پر [illegible] کے واسطے [illegible]
بزم [illegible] کے [illegible]

پیمبرانہ بد دُعا

جو مجھ پڑے گا تو سب سے بڑی سزا دوں گا　　　زمانہ [illegible]
ملے نہ آتشِ دوزخ کی تجھ کو گرم سرا　　　ملے وہ سوز جو [illegible] شاعروں کو عطا
رموزِ دہر سے جل جائے رسم و راہ تری　　　جبینِ زیست پہ [illegible] نگاہ تری

تجھے حقائقِ ہستی کا کھولنا آ جائے
کلی کو خار کے کانٹے پہ تولنا آ جائے

عشق و ہوس میں تری فطرت شفیق ہو جائے
ترے خمیر کا لوہا رقیق ہو جائے

دماغ سرحدِ قدرت سے متصل ہو جائے
ہر ایک ذرۂ ناچیز جزوِ دل ہو جائے

وہ طبعِ سخت میں پیدا ہو انقلابِ عظیم
کہ تیرے قلب میں چبھنے لگے گلوں کی شمیم

ترے دیار میں طوفانِ آرزو آ جائے
ترا ضمیر محبت کے رو برو آ جائے

نہ بہرہ ور ہو کبھی مرگِ ناگہانی سے
خدا دوچار کرے طولِ زندگانی سے

درِ حیات تری چشمِ دل پہ وا ہو جائے
نظر مآل تبسم سے آشنا ہو جائے

بلائے قہرِ خدا تجھ کو دیدہ ور کر دے
لطیف کر کے جہنم کو لطیف تر کر دے

خونی بینڈ

روح بے چین ہے خاموش ہو اے فوج کے بینڈ
اس طرح صبح کی مخمور ہواؤں میں نہ آ بینڈ

تجھ میں آواز ہے فولاد شکن تیروں کی
سنسناہٹ ہے لچکتی ہوئی شمشیروں کی

کتنی ماؤں کے کلیجے کی ہیں قاشیں تجھ میں
کتنے مہ پارہ جوانوں کی ہیں لاشیں تجھ میں

کتنی روندی ہوئی لاشوں کی ہے سرخی تجھ میں
کتنی بیواؤں کے چہرے کی ہے زردی تجھ میں

کتنی خوابیدہ ہیں مایوس نگاہیں تجھ میں
کتنے معصوم یتیموں کی ہیں آہیں تجھ میں

تیرا ہر راگ ہے ڈوبا ہوا چشمِ نم میں
رقصِ خوں کی دھمک ہے ترے زیر و بم میں

سسکیاں تجھ میں ہیں غلطیدہ دل افگاروں کی
گردشیں موت کی ہیں گت میں ترے تاروں کی

تیری ہر تان میں پوشیدہ ہیں لاکھوں آنسو
تیری آواز میں غلطاں ہے جوانوں کا لہو

گم ہیں رستے ہوئے زخموں کی بہاریں تجھ میں
تیغوں کی ہیں چلتی ہوئی دھاریں تجھ میں

نغمہ ہے لے میں تری خون کے فواروں کا
زمزمہ تجھ میں ہے چلتی ہوئی تلواروں کا

تیری آواز جب احساس پہ چھا جاتی ہے
موت کے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

مولوی

ہوئی اک مولوی سے کل ملاقات — شبیہِ قبّہ و تصویرِ منبر!
وہی ہوں گے جو فردوسِ بریں میں — خدا کے فضل سے حوروں کے شوہر
عمامہ بر سر و مسواک در جیب — اُٹنگا پائجامہ، دلق در بر
حنا سے ریش سرخ، آنکھوں میں سرمہ — لبیں ہلکی ہوئی، زلفیں معطّر
جھکے شانے پہ چوخانے کا رومال — عبا کے بند میں تسبیح احمر
کشادہ صدر اور کوتاہ گردن — شکم پُر رعب، قد رشکِ صنوبر
لٹیں بکھری ہوئی آنکھوں پہ عینک — لبیں ترشی ہوئی داڑھی شکم پر
عبا عنّاب گوں، دھانی عمامہ — گلوری منہ میں، لب خونِ کبوتر
جبیں کا داغ، اک دُکھی ہوئی رات — کمر کا گھیر، ایک سمٹا سمندر
بتوں کی چاہ میں ہم رشکِ مجنوں — خدا کے عشق میں یہ دیو پیکر
وضو کے فیض سے شاداب داڑھی — خدا کے خوف سے چہرہ گُلِ تر
سجودِ بے ریا، ماتھے کی بیندی — درودِ باصفا، ہونٹوں کا پوڈر
اوامر کی ثنا، ہجوِ نواہی! — حدیثیں برزباں، قرآں ازبر
ارم کے تذکرے کس کس مزے سے — حنائی ریش مٹھی میں پکڑ کر!
جبیں گہوارۂ انوارِ یزداں — زباں آئینۂ خُلقِ پیمبر
مگر آنکھوں میں ہنگامِ تبسّم
ریا کی چشمکیں، اللہ اکبر!

انکشافِ فطرت

آدمی بزم میں بوقتِ گفتار — لب پہ جب کوئی حرف لاتا ہے
درحقیقت خود اپنے ہی حق میں — کچھ نہ کچھ فیصلہ سناتا ہے

(۵)

جنون و حکمت

(رباعیات)

حقائق

دل، رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
ذرّات کو چھوڑ کر حریفوں کے لیے
اسلوبِ سخن کا نیا نکالا ہم نے
خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے

اپنے ہی دماغ و دل کا مقہور ہوں میں
واقف ہوں کہ سوچنے میں ہے جی کا زیاں
خود اپنے ہی دل میں ایک ناسور ہوں میں
کیا کیجیے، سوچنے پہ مجبور ہوں میں!

کرسی کا [illegible] کر دوں گا تجھے
اک حسن کا [illegible]
کونین کا شہریار کر دوں گا تجھے
[illegible] سے میں دوچار کر دوں گا تجھے

[illegible] کفر و ایمان [illegible]
"انکار" ہے اک دماغ کمزور و علیل!
وہم کی وحشت ہے یہ دانش کا جنوں
"اقرار" ہے اک عقلِ ضعیف و محدود!!

نومیدیٔ [illegible] انوار بھی جہل
اک قادرِ مطلق کا جہاں تک ہے سوال
اُمیدِ شہود و شوقِ دیدار بھی جہل
"انکار" بھی جہل ہے "اقرار" بھی جہل

ہنسنا بھی عجیب شے ہے، رونا بھی عجیب
پانا بھی ہے طرفہ بات، کھونا بھی عجیب
اک قادرِ مطلق کا بہ اوصافِ حسن
ہونا بھی عجیب ہے نہ ہونا بھی عجیب

آزادیٔ فکر و درسِ حکمت ہے گناہ
دانا کے لیے نہیں کوئی جائے پناہ
اس اژدرِ تہذیب کے فرزندِ رشید
یہ "مذہب" و "قانون" عیاذاً باللہ!

پامالِ صنم انسان ہوا جاتا ہے
بے چارہ پریشان ہوا جاتا ہے
گھٹتا ہے تو آتا ہے فرشتوں کا جمود
بڑھتا ہے تو شیطان ہوا جاتا ہے

دنیا میں ہیں بے شمار آنے والے
آتے ہی رہیں گے روز جانے والے
عرفانِ حیات ہو مبارک تجھ کو
اے شدتِ غم پہ مسکرانے والے!

ہر صاحبِ جوہر کو سبک سر کر دے
فطرت کو زبوں کر کے زبوں تر کر دے
افلاس کہ کھینچتا ہے ایماں کی طرف
کم بخت مسلسل ہو تو کافر کر دے

انساں پہ ہے کس درجہ خرافات کا بار
دن کا ہے کبھی وزن کبھی رات کا بار
پیدا ہو بشر میں کیا حکیمانہ مزاج
عقلوں پہ ہے صدیوں کی روایات کا بار

کیا جانیے چہرہ زرد ہوتا کیوں ہے
دل رنج و الم سے سرد ہوتا کیوں ہے
افسوس کہ اتنا بھی نہیں ہے معلوم
کانٹا چبھنے سے درد ہوتا کیوں ہے

خنجر ہے کوئی، تو تیغِ عریاں کوئی
صرصر ہے کوئی تو بادِ طوفاں کوئی
انسان کہاں ہے؟ کس گڑھے میں گم ہے؟
یاں تو کوئی "ہندو" ہے "مسلماں" کوئی

حسن و عشق

جلووں کی ہے بارگاہ میرے دل میں
غلطیدہ ہے مہر و ماہ میرے دل میں
اس دورِ خرد میں عشق گم ہو جاتا
ملتی نہ اگر پناہ میرے دل میں

افسوس یہ بن، یہ بکھرا ہوا سا تیری
دل ہی نہیں روح بھی ہے پیاسی تیری
ہنستی ہے تو منہ اترنے لگتا ہے ترا
کس درجہ مکمل ہے اداسی تیری

پابندِ ہراس کیوں ہے؟ تیرے قرباں
آشفتہ حواس کیوں ہے؟ تیرے قرباں
تجھ پر تو ہے انبساطِ عالم کا مدار
تو اتنی اداس کیوں ہے؟ تیرے قرباں

الفاظ میں غلطیدہ ہے جادو گویا
آواز بدل رہی ہے پہلو گویا
لہجے کا ترے درد، عیاذاً باللہ
لفظوں سے ٹپک رہے ہیں آنسو گویا

کہنا یہ ترا نیند کسے آتی ہے
راتوں کو طبیعت اور گھبراتی ہے
اُف سیج کے نامراد پھولوں کی مہک
ہر سانس میں کچھ پھانس سی چبھ جاتی ہے

ہے صبح افق سے جگمگانے والی
وعدے پہ ہے اُن کے مسکرانے والی
جا پچھلے پہر کے چاند! اُن سے کہہ دے
اب رات ہے دو گھڑی میں جانے والی

اے رونقِ لالہ زار! واپس آجا
اے دولتِ برگ و بار! واپس آجا
ایسے میں کہ نوبہار ہے خلد بدوش
اے نازشِ نوبہار! واپس آجا

ٹپکاتی ہوئی گھٹا جب آنسو آئی
فرقت کا جگاتی ہوئی جادو آئی
ہلکا ہلکا دھواں کلیجے سے اٹھا
سوندھی سوندھی زمیں سے خوشبو آئی

برسات ہے دل کو ڈس رہا ہے پانی
فرقت میں تری جھلس رہا ہے پانی
دل میں کبھی چبھتا ہے کلیجے میں کبھی
آڑا ترچھا برس رہا ہے پانی

ناگن بن کر مجھے نہ ڈسنا بادل!
یاراں کی کسوٹی پہ نہ کسنا بادل!
وہ پہلے پہل جدا ہوئے ہیں مجھ سے
اس دیس میں اب کی نہ برسنا بادل!

نکلی لبِ گل سے آہ "خوشبو" بن کر
سر میں آئی رمیدہ آہو بن کر
سر سے گئی دل میں ان کی تصویر لئے
تصویر ٹپکنے لگی "آنسو" بن کر

چُھو نکلا ہے کوئی نگار، الہٰی توبہ
رَس میں ڈوبا خمار، الہٰی توبہ
سکتے میں ہیں بھیرویں کی تانیں گویا
ہونٹوں کا خفیف اُبھار الہٰی توبہ!

گلشن میں کہاں سے یہ اثر آتا ہے؟
تخئیل کا ہر نقش اُبھر آتا ہے
اوڑھے ہوئے ہلکی سی دلائی کوئی شوخ
خوشبو میں چنبیلی کی نظر آتا ہے

جانے والے قمر کو روکے کوئی
شب کے پیکِ سفر کو روکے کوئی
تھک کر مرے زانو پہ وہ سویا ہے ابھی
روکے، روکے، سحر کو روکے کوئی!

کیا آج تعارف میں لُٹایا کوئی
کیا جانیے کیوں سنبھل نہ پایا کوئی
میں نے جو کہا "جوش مجھے کہتے ہیں"
آنکھوں کو جھکا کے مسکرایا کوئی!

فقروں کی یہ تازگی یہ لہجے کی بہار　　　قرباں ترے لے نگارِ شیریں گفتار
اللہ ری کھنکتی ہوئی آواز تری　　　جیبی پہ ہو جیسے اشرفی کی جھنکار

پیرانِ سالوس

قبروں پہ مریدوں کو جھکاتے رہیے　　　ڈھولک پہ سفیہوں کو نچاتے رہیے
اللہ اگر روٹھ رہا ہے، روٹھے　　　کیا اس سے غرض عرس مناتے رہیے

پُر ہول شکم، عریض سینے والو　　　خونِ قومِ تہی دست کا پینے والو
تم اہلِ خرد سے کیوں نہ رکھو گے عناد　　　خیرات پہ احمقوں کی جینے والو

اے شیخ کبھی تو رنج اٹھایا ہوتا　　　اس دل پہ کبھی تو زخم کھایا ہوتا
اس طرح لگاتا نہ دما دم ضربیں　　　بابا! دل اگر کہیں لگایا ہوتا

وہ رشتۂ تسبیح ہیں ہم پھندے ہیں　　　ہر عیب سے وہ پاک ہیں ہم گندے ہیں
دیکھو وہ نکل رہے ہیں مسجد سے شیوخ　　　گویا وہ خدا ہیں اور ہم بندے ہیں

ہم دیکھ کے مہوشوں کو کیا کہتے ہیں؟　　　اتنا ہی کہ بس "صلِّ علیٰ" کہتے ہیں
لیکن یہ غلامِ زر یہ اہلِ ریش دراز　　　موقع ہو تو ہر بُت کو "خدا" کہتے ہیں

ہر رنگ میں ابلیس سزا دیتا ہے　　　انساں کو بہر طور دغا دیتا ہے
کر سکتے نہیں گنہ جو احمق اُن کو　　　بے رُوح نمازوں میں لگا دیتا ہے

خمریات

(خیّام کے نام)

ہُشیار! کہ آفتاب ہونا ہے تجھے
پیغمبرِ انقلاب ہونا ہے تجھے
ہر صبح کو آتی ہے یہ ساقی کی صدا
بیدار! کہ خود شراب ہونا ہے تجھے

گردوں پہ ہے صبح کی جھلک اے ساقی
اُودی سی گھٹا ہے دُور تک اے ساقی
پڑتی ہے پھوار، ارغنوں لے دم دے
پتّوں پہ ہے بُوندوں کی کھنک اے ساقی

ساقی: غمِ بیش و کم سے مرتا کیوں ہے
میں رندِ بلا نوش ہوں ڈرتا کیوں ہے؟
تو کون و مکاں کو رکھ دے شانے پہ مرے
اور میں کہوں رکھ مذاق کرتا کیوں ہے؟

مرنے پہ تو یہ جاں ملے یا نہ ملے
یہ کنج، یہ بوستاں ملے یا نہ ملے
پینے میں کسر نہ چھوڑ، او خانہ خراب
معلوم نہیں وہاں ملے یا نہ ملے

کیا فائدہ شیخ! تجھ سے کینے میں مجھے
خشکی میں تجھے لطف سفینے میں مجھے
عیّاش تو دونوں ہیں مگر فرق یہ ہے
کھانے میں تجھے مزا ہے پینے میں مجھے

آئی ہے گھٹا مست بنائے گی ہمیں
افلاک پہ جھولے سے جھلائے گی ہمیں
ساقی! نہ رکے بات کہ دم بھر میں یہ رُت
ڈھونڈے گی بہت مگر نہ پائے گی ہمیں

جو غم کو نہ دیکھے وہ نظر دے ساقی
انگور سے دل کے زخم بھر دے ساقی
قاتل ہے کوئی چیز تو احساسِ لطیف
اس تیغ کی باڑھ کند کر دے ساقی

ہاں مشغلۂ جام و سبو جاری ہے
اب تک وہی رسمِ ہاؤ ہو جاری ہے
کھائی ہے کچھ انسان سے ٹھوکر ایسی
ہر دین کے ماتھے سے لہو جاری ہے

غالب ہے مرا جذبۂ غیرت مجھ پر
اک قہر ہے ناکسوں کی صولت مجھ پر
زاہد اگر آج مے کو جائز کر دے
اک قطرہ بھی پھر پیوں تو لعنت مجھ پر

کیا شیخ ملے گا گل فشانی کر کے
کیا پائے گا توہینِ جوانی کر کے؟
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے!

جھومی تاریک رات میرے دل میں
بدمست ہوئی حیات میرے دل میں
ساقی نے سبو دے کے اٹھایا جو رباب
گم ہو گئی کائنات میرے دل میں!

کل رات گئے مست تھی جب موجِ نسیم
شبنم میں نہا رہی تھی پھولوں کی شمیم
اک حور نے ساغر سے نکل کر یہ کہا
میں روحِ مے ہوش ربا ہوں تسلیم!

کس رات کو کی نہ بادہ خواری ہم نے
کب کاکلِ عشرت نہ سنواری ہم نے
اب تک تو یہ رات جس کو کہتے ہیں شباب
زلفوں ہی کے سائے میں گذاری ہم نے

دل کی جانب رجوع ہوتا ہوں میں
سر تا بقدم خضوع ہوتا ہوں میں
جب مہرِ مبیں غروب ہو جاتا ہے
پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

کل موتیوں کو رول دیا ساقی نے
سونے میں مجھے تول دیا ساقی نے
یہ سن کے کہ کھلتا نہیں مقصودِ حیات
مے خانے کا در کھول دیا ساقی نے

متفرقات

جھکتا ہوں کبھی ریگِ رواں کی جانب
اڑتا ہوں کبھی کاہکشاں کی جانب
مجھ میں دو دل ہیں، اک تو مائل بہ زمیں
اور ایک کا رُخ ہے آسماں کی جانب

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
آگے کئی صدیوں سے ترانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ علم
بہروں کو سُنانا ہے فسانہ اپنا

جب رخصتِ شباب پارا پارا ہوگا
دل کو رونے کا بھی نہ یارا ہوگا
حیراں ہوں کہ داغِ شیبِ ننگِ پیری
کیوں کر مری غیرت کو گوارا ہوگا

کیا عمر کے ساتھ جوش چلتا چہرہ؟
کیوں شیب کے سانچے میں نہ ڈھلتا چہرہ؟
"جذبات" پہ چہرہ، وقت پر عمر سوار
کیوں عمر سے آگے نہ نکلتا چہرہ؟

افسردہ نہ ہو، لوگ بُرا مانتے ہیں
مُنہ اُترے تو دوست اجنبی جانتے ہیں
چہروں کی شناخت اہلِ دنیا کو نہیں
چہروں کی فقط یہ آب پہچانتے ہیں

اب خواہشِ لذات نہیں ہو سکتی
اب دن کے سوا رات نہیں ہو سکتی
دَر کس لئے کھٹکھٹا رہی ہے دنیا
کہہ دو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی

یہ ارض ہی کچھ ہے نہ سما ہے واللہ
ہر خشک و تر ایک واہمہ ہے واللہ
راتوں کو کبھی کبھی بہکتا ہوں [illegible]
بندہ ہی جہاں ہے نہ خدا ہے واللہ

یہ دبدبہ، یہ رواق، اللہ اللہ
کسریٰ کا یہ طرفہ طاق، اللہ اللہ
کیوں کر نہ ترا فریب کھائیں احمق؟
دُنیا! ترا طمطراق، اللہ اللہ!

ساونت ہوں کب کسی سے ڈرتا ہوں میں
دوزخ سے نہ زندگی سے ڈرتا ہوں میں
اس طنطنہ و بہادری کے باوصف
دنیا! ترے آدمی سے ڈرتا ہوں میں

موقع مجھے میرے حسبِ فطرت دے دیں
قابو میں مرے مری طبیعت دے دیں
کچھ روز ہنسی خوشی سے جی لوں میں بھی
احباب مجھے اگر اجازت دے دیں

احباب کی یہ مزاج دانی، افسوس
یہ کفر بدوش بدگمانی، افسوس
جوشؔ اور بنے عدوئے اربابِ ادب!
افسوس ہے اے سرشتِ فانیؔ[1]! افسوس

جب رات کو چھوٹتے ہیں بادل کالے
ظلمت میں تپکتے ہیں دلوں کے چھالے
قرباں ترے اُس وقت کی تاریکی میں
انگشتِ سحر سے دل کو چھونے والے!

مرضی ہو تو سُولی پہ چڑھانا، یا رب!
سو بار جہنم میں جلانا یا رب!
معشوق کہیں "آپ ہمارے ہیں بزرگ"
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یا رب!!

کیا شیخ کی خشک زندگانی گذری
بےچارے کی اک شب نہ سہانی گذری
دوزخ کے تخیل میں بڑھاپا بیتا
جنت کی دُعاؤں میں جوانی گذری

قدموں پہ مرے عرشِ معلّٰی بھی سہی
خورشید کی انجمن میں ذرّہ بھی سہی
حُوریں حاضر ہوئی ہیں مجرے کے لئے
اچھا حاضر کرو، یہ تقویٰ بھی سہی!

[1] حضرت فانی بدایونی

(۶)

حرف و حکایت

(نظمیں)

سرشکِ تبسم

اُٹھا ساغر کہ انساں کشتۂ آلام ہے ساقی
یہ ربط ہے یہ ہے آگے خدا کا نام ہے ساقی

نہ جانے نوعِ انساں کیوں اجل سے خوف کھاتی ہے
اجل کہتے ہیں جس کو زحمتِ یک گام ہے ساقی

حقیقت کیا سمجھ میں آسکے اشیائے عالم کی
فقط اک شکل ہے ساقی فقط اک نام ہے ساقی

سناؤں سازِ حکمت کے ترانے کس توقع پر
کہ اب تک نوعِ انساں بندۂ اوہام ہے ساقی

صداقت آج بھی پوشیدہ ہے اولادِ آدم سے
دروغِ مصلحت آمیز اب بھی عام ہے ساقی

اُدھر یہ قول ہم نے شرح کر دی ہے حقائق کی
اِدھر اب تک وہی ابہام کا ابہام ہے ساقی

اُدھر "تکمیلِ دیں" کا ہو چکا ہے دعوئ محکم
اِدھر ایماں تھا جیسا خام اب تک خام ہے ساقی

اُدھر شدت کے ساتھ اعلان ہے اتمامِ نعمت کا
اِدھر ہر سانس اب تک زہر کا اک جام ہے ساقی

کہا جاتا ہے مجھ سے زندگی انعامِ قدرت ہے
سزا کیا ہوگی اُس کی جس کا یہ انعام ہے ساقی

شکایت کیا کسی خوں ریز چنگیز و ہلاکو کی
خود اپنا دل ہی جب خوں ریز و خوں آشام ہے ساقی

عمل کا رشتہ ہے جب دستِ ماحول و وراثت میں
تو پھر کیوں آدمیت موردِ الزام ہے ساقی

جسے کہتے ہیں عرفِ عام میں تخلیقِ انسانی
یہ کس آغاز کی سعیِ زبوں انجام ہے ساقی

وہاں بخشا گیا ہے میرے دل کو ذوقِ آزادی
جہاں موجِ ہوا تک مرغِ زیرِ دام ہے ساقی

تبسم اک بڑی دولت ہے میں بھی اس کا قائل ہوں
مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی

جسے اربابِ مذہب بادۂ توحید کہتے ہیں
وہ آبِ صاف بھی افسردہ اجسام ہے ساقی

خروشِ گریہ ہی حاصل نہیں غم ہائے پنہاں کا
یہاں تو ساز کے پردے میں بھی کہرام ہے ساقی

لڑکپن ضد میں روتا تھا جوانی دل کو روتی ہے　　　نہ جب آرام تھا ساقی نہ اب آرام ہے ساقی
تمنائیں جگاتی ہیں تو ناکامی سُلاتی ہے　　　نہ اپنی صبح ہے ساقی نہ اپنی شام ہے ساقی
بڑی دریا دلی کے ساتھ ہر خوں ریز طاقت کو　　　مشیت کی طرف سے اذنِ قتلِ عام ہے ساقی
یہ کس کی مہرِ ہیبت ثبت ہے گیتی کے سینے پر　　　کہ ہر ذرہ ازل سے لرزہ براندام ہے ساقی

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوشؔ کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

شبابِ مرعوبِ شیب

اک پیر کے پاس کچھ کھچی سی　　　بیٹھی ہے خموش ایک لڑکی
احساس کا خلفشار رُخ پر　　　پیری کے ادب کا بار رُخ پر
خامی پہ نگاہِ پختہ کاری　　　غنچے پہ خزاں کا رعب طاری
پیری کے جھکے نڈھال کاندھے　　　دریائے طرب کا بند باندھے
طوفاں کی سحر، جمود کی رات　　　شعلے کی جبیں پہ برف کا ہات
افسردہ ہے دامِ حزم میں گل　　　پژمردہ ہے جیبِ خار میں گل
تخریب کے سائے میں ہے تعمیر　　　نظروں میں پڑی ہوئی ہے زنجیر!
بے چین ہے حسن کی تب و تاب　　　کھلنے کے لیے کلی ہے بے تاب
سینے میں ہے موجِ پُرفشانی　　　پیری سے دبکی ہوئی جوانی
عشووں کا لہو ہے سوگواری　　　عارض کے خطوط میں ہے جاری
حسن آتشِ غم میں جل رہا ہے　　　کانٹوں پہ شباب چل رہا ہے
رہ رہ کے حواس کھو رہی ہے　　　اینٹھن سی رگوں میں ہو رہی ہے
اٹھنے کے لیے نظر ہے بے تاب　　　آنکھوں میں تڑپ رہے ہیں گرداب
بے چیں ہے ذوقِ خود نمائی　　　ہلچل میں ہے خونِ دلربائی
سینے میں اُمس سی ہو رہی ہے　　　بیدار ہے یوں کہ سو رہی ہے

کاکل کے مزاج پر خدارا　　　اے شیب کی ریش! رحم فرما
دے اذن کہ دام تو بچھا لے　　　شانوں پہ مچل کے بل کھا لے
ارباب نظر پہ وار کر لے
کونین کا دل شکار کر لے

(سنہ ۱۹۴۴ء)

فتنۂ خانقاہ

اک دن جو بہرِ فاتحہ اک بنتِ مہروماہ　　　پہنچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ
زہاد نے اٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ　　　ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لا الٰہ
برپا ضمیرِ زہد میں کہرام ہو گیا
ایماں، دلوں میں لرزہ براندام ہو گیا
یوں آئی ہر نگاہ سے آوازِ الاماں　　　جیسے کوئی پہاڑ پہ آندھی میں دے اذاں
دھڑکے وہ دل کہ روح سے اٹھنے لگا دھواں　　　ہلنے لگیں شیوخ کے سینوں پہ داڑھیاں
پرتو فگن جو جلوۂ جانانہ ہو گیا
ہر مرغِ شعلہ حسن کا پروانہ ہو گیا
اس آفتِ زمانہ کی سرشاریاں نہ پوچھ　　　بکھرے ہوئے شباب کی بیداریاں نہ پوچھ
رخ پر ہوائے شام کی گل باریاں نہ پوچھ　　　کاکل کی ہر قدم پہ فسوں کاریاں نہ پوچھ
عالم تھا وہ خرام میں اس گل عذار کا
گویا نزولِ رحمتِ پروردگار کا
گردن کے لوچ میں خمِ چوگاں لیے ہوئے　　　چوگاں کے خم میں گوشۂ دل و جاں لیے ہوئے
رخ پر لٹوں کا ابرِ پریشاں لیے ہوئے　　　کافر گھٹا کی چھاؤں میں قرآں لیے ہوئے
آہستہ چل رہی تھی عقیدت کی راہ سے
یا لو نکل رہی تھی دلِ خانقاہ سے

آنکھوں میں آگ عشوۂ آہن گداز کی　　　　لہریں ہر ایک سانس میں سیلابِ ناز کی
پلٹیں ہوائے دوش پہ زلفِ دراز کی　　　　آئینے میں دمک رُخِ آئینہ ساز کی

آغوشِ مہر و ماہ کی گویا پلی ہوئی
سانچے میں آدمی کے گلابی ڈھلی ہوئی

ساون کا ابر، کاکلِ شبگوں کے دام میں　　　　موجیں شرابِ سرخ کی آنکھوں کے جام میں
رنگِ طلوعِ صبح رُخِ لالہ فام میں　　　　چلتا ہوا شباب کا جادو خرام میں

انساں تو کیا، یہ بات پری کو ملی نہیں
ایسی تو چال کبکِ دری کو ملی نہیں

ڈوبی ہوئی تھی جنبشِ مژگاں شباب میں　　　　یا دل دھڑک رہا تھا محبت کا خواب میں
چہرے پہ تھا عرق کہ نمی تھی گلاب میں　　　　یا اوس موتیے پہ شبِ ماہتاب میں

آنکھوں میں کہہ رہی تھیں یہ موجیں خمار کی
یوں بھیگتی ہیں چاندنی راتیں بہار کی

ہاتھ اُس نے فاتحہ کو اُٹھائے جو ناز سے　　　　آنچل ڈھلک کے رہ گیا زلفِ دراز سے
جادو سا پڑ گیا نگہِ دل نواز سے　　　　دل مل گئے جمال کی شانِ نیاز سے

پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ اک سمت پھر گئی
اک پیر سے تو ہات سے تسبیح گر گئی

فارغ ہوئی دعا سے جو وہ مشعلِ حرم　　　　کانپا لبوں پہ سازِ حقیقت کا زیر و بم
ہونے لگی روانہ بہ اندازِ موجِ یم　　　　انگڑائی آ چلی تو بہکنے لگے قدم

انگڑائی فرطِ شرم سے یوں ٹوٹنے لگی
گویا صنم کدے میں کرن پھوٹنے لگی

ہر چیرہ پہ تیغ اٹھا کے ترے ساتھ جائیں گے　　　　اے حسن! تیری راہ میں دھونی رمائیں گے
اب اس جگہ سے اپنا مصلے اٹھائیں گے　　　　قربان گاہِ کفر پہ ایماں چڑھائیں گے

کھاتے رہے فریب بہت خانقاہ میں
اب سجدہ ریز ہوں گے تری بارگاہ میں

سورج کی طرح زہد کا ڈھلنے لگا غرور　　پہلوئے عاجزی میں مچلنے لگا غرور
رہ رہ کے کروٹیں سی بدلنے لگا غرور　　رخ کی جوان لو سے پگھلنے لگا غرور
ایماں کی شان عشق کے سانچے میں ڈھل گئی
زنجیرِ زہد سرخ ہوئی، اور گل گئی

پل بھر میں زلفِ لیلیٔ تمکیں بگڑ گئی　　دم بھر میں پارسائی کی بستی اجڑ گئی
جس نے نظر اٹھائی، نظر رخ پہ گڑ گئی　　گویا ہر اک نگاہ میں زنجیر پڑ گئی
طوفانِ آب و رنگ میں زہّاد کھو گئے
سارے کبوترانِ حرم ذبح ہو گئے

زاہد حدودِ عشق سے آگے نکل گئے　　انسان کا جمال جو دیکھا پھسل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ حسن کی گرمی سے جل گئے　　کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے
القصہ، دینِ کفر کا دیوانہ ہو گیا
کعبہ ذرا سی دیر میں بت خانہ ہو گیا

(سنہ ۱۹۳۸ء)

جھریاں

اس ضعیفہ کی دیکھئے صورت　　کس قدر جھریوں کی ہے کثرت
پوپلا منہ، کریہہ، بد منظر　　صبح جیسے مریض کا بستر
تنگ، دھندلی دھنسی ہوئی آنکھیں　　جیسے فرمانِ قتل پر مہریں
حلقے گہرے سیہ بجھا نم سے　　جیسے اندھے کنویں بیاباں کے
چھاؤں پلکوں کی سرد ڈھیلوں پر　　جیسے بیمار پر سیہ چادر
دانت دو اک قریب گرنے کے　　بھولے بھٹکے سے راہرو جیسے
کوزہ پشتی سے چال بے تاثیر　　جیسے ٹوٹی ہوئی کمان کا تیر!
بال رخ پر سفید زلفوں کے　　میلی دھوپ، لاش پر جیسے
مردہ ہنسے کی پھیکی گویا　　ٹوٹی قبروں کے روزنوں میں ہوا

جھریاں منہ پہ خال و خد نشاں　　جیسے دلدل میں گاڑیوں کے نشاں
جھریوں میں نہاں سہاگ رُتیا　　یہ نشاں ہیں ریکارڈ[1] کے گویا
جن میں سوتے ہوئے ہیں بیدار کے　　کروٹیں لے رہے ہیں حسرت سے
زمزمے عہد کامرانی کے
گیت گذری ہوئی جوانی کے

(سنہ ۱۹۳۷ء)

پیٹ بڑا بدکار[2]

پیٹ بڑا بدکار رہے بابا
پیٹ بڑا بدکار
شیر ببر اور نیولے کی گردن میں ڈالے ہار
اژدر کے اوجوش اڑا دے چوہے کا دربار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار رہے بابا
پیٹ بڑا بدکار
دولت کے آگے سر ٹیکیں بڑے بڑے گمبھیر
زر کے آگے بھاؤ بتائیں بڑے بڑے سردار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار رہے بابا
پیٹ بڑا بدکار
سورج کو پروانہ بنا دے ذروں کی قندیل
شہباز کو اپنی دُھن پہ نچائے کوؤں کا تہوار

---

[1] گراموفون کے ریکارڈ　　[2] یہ نظم بحر سے بے نیاز ہو کر بحر میں لکھی گئی ہے

پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار
فاضل کا اور رنگ اڑا دے جب مل دولت مند
ہاتی کا، اور خون بہا دے چیونٹی کی تلوار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار
ناداں بیٹھے کشتی میں اور دانا غوطے کھائے
کُتا سوئے گدّے پر، اور ٹہلے بجلی دار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار
کوّوں کو اور راگ سنائے کوئل بن کے بیچ
منعم کی، اور سیج سجائے مفلس کا دلدار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار
لوہا ڈر سے گر گر کانپے، پتھر تھر تھر ہوئے
مایا کی اے تیز کٹاری بل بے تیری دھار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار
پھول چمن کے مہکیں، جھومیں شاخیں، جھکیں دھان

شاعر اور فکرِ دنیا، عاشق اور بیوپار

پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار
شیر کے منہ میں سر دے دے اور ناگ کے بل میں ہاتھ
پیٹ بڑا نا پاپی ہے اس پاپی سے ہشیار
پیٹ بڑا بدکار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار

(سنہ ۱۹۴۴ء)

دعوتِ امتحاں

دلِ سخن کی قسم، روحِ شعر کی سوگند
کہ آج مجھ سا نہیں مردِ نادرہ گفتار

وہ روح سوئی ہوئی ہے جو نیم عالم میں
مرے دماغ کے خلوت کدے میں ہے بیدار

نقاب اُٹھا کے، اک اک رقص کرتی ہے
مرے ضمیر کی مسند پہ لیلیٔ اسرار

نگار خانۂ گیتی مرے کلام کا صید
طلسم خانۂ گردوں مرے سخن کا شکار

زمینِ شعر ہے مجھ سے فلک بدوش چمن
دیارِ نطق ہے مجھ سے عناں کیف گلزار

طلوع ہوگا جواب اب ہزار سال کے بعد
وہ آفتاب ہے میری نگاہ میں ضوبار

ہر ایک لفظ مرا ذی شعور و نغمہ طراز
ہر ایک حرف مرا ذی حیات و زمزمہ بار

ندیمِ چشم ہے ارض و سما کی جلوہ گری
رفیقِ گوش ہیں کونین کے لبِ گفتار

فرازِ شعر پہ میرے سخن کی قوسِ قزح
کہ دوشِ طفلِ برہمن پہ جلوۂ زنار

کنارِ بحر میں جس شان سے ستارۂ نور
جبینِ وقت پہ رقصاں ہیں یوں مرے اشعار

مرے حضور عناصر ہیں حاجب و درباں
مری جناب میں ہے روح الامیں عصا بردار

"ز ہر ہنر کہ زنم لافِ امتحاں شرط است"

"بیا زما و مکن پیش از امتحان، انکار
بلے کلیمم و کاذب نبوتم؟ گو نیل!
بلے خلیلم و ناپختہ دعوتم؟ گو نار!"
(غالب)

(سنہ ۱۹۳۷ء)

غلط بخشی

الٰہی! یہی ہے اگر روزگار　　کہ سینے رہیں اہلِ دل کے فگار
دنائت کو حاصل ہوں سرداریاں　　شرافت کرے کفش برداریاں
دبے اہلِ باطل سے حق کی سپاہ　　مصاحب ہوں اندھوں کے اہلِ نگاہ
سرِ محفلِ ممسکِ بدخصال　　کریم آ کے پھیلائیں دستِ سوال
زمیں کی خوشامد کرے آسماں　　مقلد ہوں گونگوں کے اہلِ زباں
سرِ راہ افلاس باصد قلق　　ادیب اپنے ماتھوں کا بیچیں عرق
جھکے خاک پر علم کی بارگاہ　　جبینِ جہالت پہ کج ہو کلاہ
حماقت ہو دوشِ خرد پر سوار　　لئے رخ پہ چاندی کے نقش و نگار
سعادت کرے نحس کا احترام　　شجاعت کرے بزدلی کو سلام
زمیں جب دکھانے لگے طمطراق　　لرزنے لگے چرخِ نیلی رواق
خزف اپنے مرکب کو جب ایڑ دے　　گہر ہو رکابوں کو تھامے ہوئے
پئے شب روی جب خراماں ہو زاغ　　نوا سنج بلبل دکھائے چراغ
اکابر کو مرکب بنائیں عوام　　لئے ہات میں سیم و زر کی لگام
سرِ بزم گُردانِ شمشیر زن　　بنے بزدلی صاحبِ انجمن
حریمِ محبت سے اربابِ راز　　اٹھائیں ذلیل اہلِ دولت کے راز
سرِ بزم جب آئیں اہلِ نظر　　بشکلِ غلامانِ زریں کمر
کہے بندگانِ ہوس کو "حضور"　　خدایانِ علم و ادب کا غرور
سفاہت پھرے مسکراتی ہوئی　　[illegible] کو جھڑکے سے کھاتی ہوئی"

ملے خار کو مژدۂ نوبہار　　میسر ہو اندھوں کو رُوئے نگار
اور اہلِ نظر با ہزاراں نیاز　　اسیرِ تماشائے زلفِ دراز
مُریدانِ دیرینۂ اہرمن　　خزاں میں بھی لوٹیں بہارِ چمن
رہیں فصلِ گُل میں بھی بے برگ و بار　　جہانِ معانی کے پروردگار
چھلکتے ہوں جب آسماں پر سحاب　　سفیہوں کے رخ پر ہو موجِ شباب
رہیں صبح سے شام تک بے گناہ　　محبت کے اقطابِ گیتی پناہ
لئیموں کی ہر شب ہو غرقِ شراب　　بنانِ نگاراں بصوتِ رباب
رہیں فصلِ باراں میں بھی تشنہ کام　　خرابات کے اولیائے کرام

ہنر ہو اور اس درجہ بے آبرو
تُفو بر تو اے چرخِ گرداں تُفو!

الٰہی! بپاسِ ہُنر دُشمنی　　بڑھا اس طرف ساغرِ جاں کنی
کدھر ہے خداوندِ بختِ دُژم　　سفاہت نوازی کی تجھ کو قسم
نہ رکھ پھول کو قیدِ خاشاک میں　　چھپا دے مجھے پردۂ خاک میں

مگر اے مُربّیٔ اہلِ ریا
میں دیوانگی میں یہ کیا بک گیا

مری ذات کو کر سکے پائمال　　تری خاک کی یہ نہیں ہے مجال
تری ذات جب تک کہ ہے استوار　　مجھے چھو سکیں گے نہ لیل و نہار
تری حیّ و قیّوم پائندہ ذات　　بہ الفاظِ دیگر ہے میری حیات
مرے سامنے اے خدائے زمیں　　ترا آسماں بول سکتا نہیں
مری موت ہے یہ کہ زردار ہوں　　کہ شاعر ہوں دانائے اسرار ہوں
مجھے تیری دولت کی حاجت نہیں　　کہ دل میں بجز ذوقِ حماقت نہیں
مرے دل میں، اور لکشمی کا وقار؟　　جو رہتی ہے اُلّو[1] پہ دائم سوار

---

[1] ہندو صنمیات میں دولت کی دیوی یعنی لکشمی کی سواری "اُلّو" ہے۔

جسے لوگ کہتے ہیں شاہنشہی — نہیں مجھ کو منظور وہ ابلہی
مجھے زر کی جانب نہیں التفات — مرا ایک حرف اور تری کائنات
یہاں موت ڈرتی ہے آتے ہوئے — فقیروں سے آنکھیں ملاتے ہوئے

نہ گھبرا مجھے خوئے نفرت نہیں
یہ رسمِ جنوں ہے شکایت نہیں

(سنہ ۱۹۳۴ء)

صحنِ چمن

آ کہ پھر صحنِ چمن بلغِ جناں ہے ساقی — دور تک سلسلۂ ابر رواں ہے ساقی
کنج میں مرغِ چمن زاد ہے سرگرمِ خروش — باغ میں بادِ صبا عطر فشاں ہے ساقی
آج خاشاک کے لب پر بھی ہیں شیریں نغمے — آج ذرات کے منہ میں بھی زباں ہے ساقی
شاخساروں پہ ہیں مرغانِ چمن گرمِ خروش — آسمانوں پہ گھٹا نعرہ زناں ہے ساقی
اس ترنم میں ازل ہے نہ ابد اے ہمراز — اس تلاطم میں زماں ہے نہ مکاں ہے ساقی
اس برستے ہوئے موسم کی ہر اک ساعتِ کیف — شبِ آدینۂ ماہِ رمضاں ہے ساقی
خار بدمست ہیں گل وجد میں کلیاں سرشار — آج گلشن میں قیامت کا سماں ہے ساقی
بزم پر وادیٔ ایمن کا گماں ہوتا ہے — آج وہ نور سرِ رطلِ گراں ہے ساقی
پائے جاناں پکڑوں کیوں نہ پیاپے سجدے — شورِ قلقل مجھے گلبانگِ اذاں ہے ساقی
غمِ ایام پہ دم بھر کے لیے غور کروں — اتنی فرصت ترے مستوں کو کہاں ہے ساقی
بے خطر ہو کے پلا مے کہ حقیقت میں قضا — بزدلوں کا فقط اک وہم و گماں ہے ساقی
کھول نغموں سے درِ رمز و اشارات کہ آج — سرِّ خوباں بہ حدیثِ دگراں ہے ساقی
روک رندوں کو نہ تا دیر کہ یہ دورِ بہار — موسمِ بندگیٔ لالہ رخاں ہے ساقی
نرمی و لطف سے لے کام کہ دل کے باتوں — زندگی کارگہِ شیشہ گراں ہے ساقی
کیوں سنوں زمزمۂ مدعیانِ عرفاں — بادہ خود کاشفِ اسرارِ نہاں ہے ساقی
جام دے جام کہ ہر قطرۂ صہبائے کہن — مصلحِ نسخۂ اجزائے جہاں ہے ساقی

کیفِ صہبا سے اُمنگوں کو جگا دے تو بھی　　فیضِ باراں سے ہر اک ذرہ جواں ہے ساقی
آج جی بھر کے پلا باغ میں پھیلی ہوئی آگ　　کوہساروں پہ گھٹاؤں کا دھواں ہے ساقی
چہرۂ خاک کی رنگینی و شوخی کی طرف　　عالمِ پاک بحسرت نگراں ہے ساقی
نشہ جس طرح چھلکتا ہے رگِ صہبا میں　　سینۂ ابر میں یوں برقِ تپاں ہے ساقی
ان کی خلقت نہیں حورانِ بہشتی کے لئے　　یہ تو زہاد کی شکلوں سے عیاں ہے ساقی
ہاں پلا آتشِ سیال کہ جس کی ہر بوند　　شمعِ محرابِ جہانِ گزراں ہے ساقی
ان چھلکتی ہوئی شاخوں کے خنک سائے میں　　مے کی اک بوند متاعِ دو جہاں ہے ساقی
آ! کہ یہ وقت ہے اک شمعِ سرِ جادۂ باد　　اٹھ! کہ یہ عمرِ رواں آبِ رواں ہے ساقی
شیخ کو کون یہ سمجھائے کہ گلِ رنگ شراب　　مایۂ تربیتِ روحِ رواں ہے ساقی
تجھ سے ممکن ہو تو اس درد کا درماں کر دے　　زندگی کو مرضِ سود و زیاں ہے ساقی

جوش کی بحثِ صدارت پہ پس و پیش نہ کر
جوش تو قبلۂ رندانِ جہاں ہے ساقی

(سنہ ۱۹۳۳ء)

شعر کی آگ[1]

میری نظمیں، آتشِ سوزاں کا ہے جن پر گماں　　سننے والے! یہ تو ہیں سیلی ہوئی چنگاریاں
فکرِ بے پروا نے سینے سے نکالا ہے جنہیں　　ناطقے نے برف کے سینے میں ڈھالا ہے جنہیں
اُن کا اک پرتو بھی آ سکتا نہیں اشعار میں　　سانس لیتے ہیں جو شعلے اس دلِ بیدار میں
یہ مرے نغمے، نظر آتے ہیں جو تپتے ہوئے　　سب کے سب ہیں شبنمِ الفاظ سے بھیگے ہوئے
کیا ملے گی میری نظموں کے خس و خاشاک میں　　وہ سنہری آگ روشن ہے جو میری خاک میں
کیا کہوں، وہ آگ جو رگ رگ کو گھلاتی ہوئی　　دوڑتی پھرتی ہے اس سینے میں بل کھاتی ہوئی
الاماں وہ سوزِ پنہانی جو میرے دل میں ہے　　آہ اس شعلے کی عریانی جو میرے دل میں ہے

---

[1] یہ ایطا کا پابند نہیں

ولولے اس روح کے آتے ہیں جب ہیجان میں　　　سنسناہٹ آنچ کی آتی ہے میرے کان میں
بجلیاں میری اگر کھنچ آئیں میرے راگ میں　　　ناطقہ تبدیل ہو جائے دہکتی آگ میں
سننے والے جل اٹھیں، شور فغاں اٹھنے لگے　　　پڑھنے والے کی رگ و پے سے دھواں اٹھنے لگے
نقطہ نقطہ برق خاطف بن کے ضَو دینے لگے
حرف گُل ہو جائیں، لب گفتار لَو دینے لگے!

جادُو کی سرزمیں

غروب، سلسلۂ کوہسار، ویرانہ　　　سُنا رہی ہے خموشی کوئی افسانہ
اِدھر پہاڑ، اُدھر کھیتیوں کی پگڈنڈی　　　ہوائے شام کہیں گرم اور کہیں ٹھنڈی
اِدھر اُدھر کچھ اندھیرے میں موزن ہیں وا　　　کہانیوں کے وہ جن ہیں یہ خواب کی پریاں
سیاہیوں میں چمکتی ہوئی جبینیں سی　　　نظر کے سامنے جادو کی سرزمینیں سی
رُخِ افق پہ سیہ دھاریوں کی باریکی　　　پہاڑیوں پہ گھٹا جھاڑیوں میں تاریکی
شکستہ حال گِدھوں کا ہجوم گھوروں پر　　　سیہ مشین کا بھُورا دھُواں کھجوروں پر
ندی اُداس، ہوا دردناک، بن خاموش　　　زمیں فسوں بہ بغل، آسماں فسانہ بدوش
دو رویہ تاڑ کے کھمبوں پہ ایک پرتو راز　　　ندی کے موڑ پہ صحرا نشیں دیئے کا گداز
دیئے کی لَو جو ہواؤں سے جھلملاتی ہے
فروغِ عمرِ گذشتہ کی یاد آتی ہے!

(سنہ ۱۹۳۲ء)

الّھڑ

گاؤں کی اک نگارِ ہوش رُبا　　　سر پہ چندری نہ ہات میں چھلّا
نورسا کِن ہے، نار ہے بے تاب　　　ہو رہی ہے طلوع صبحِ شباب
انکھڑیوں میں حیا نہ طرّاری　　　نہ نگاہِ کرم نہ بیزاری

ایک بھٹکی ہوئی سی شانِ حجاب — ایک کھویا ہوا سا استعجاب
رخ پہ ہلکی سی کش مکش سی ضرور — لیکن اس طرح جیسے تحتِ شعور
آ رہی ہے قدم بڑھائے ہوئے — زلف کھولے، نظر اٹھائے ہوئے

خواب میں جیسے چل رہا ہے کوئی
بے ارادہ مچل رہا ہے کوئی

رہزنی یا رہبری

سمجھ میں آئے گا اک عمر کے بعد — میں جو کچھ ہم نشیں سمجھا رہا ہوں
نہ جا ان کفر کی باتوں پہ میری — یہ حق کے گیت ہیں جو گا رہا ہوں
الجھتا ہوں زبوں عقلوں سے جتنا — خود اپنے سے سلجھتا جا رہا ہوں
بہ شکلِ رہزنی ہر قافلے کو — حقیقی راستے بتلا رہا ہوں
تفکر چھا رہا ہے مجھ پہ جتنا — میں اتنا زندگی پر چھا رہا ہوں
بغاوت کی ہوا کے بازوؤں پر — خدا کی سمت اڑتا جا رہا ہوں
ہوائے تند سے لڑتا جھگڑتا — گھٹا کی طرح گھرتا آ رہا ہوں

جسے یوں کھو رہا ہوں ہر قدم پر
اسی کو ہر نفس میں پا رہا ہوں
اسی کے بعد پر نازاں ہوں اتنا
اسی کے قرب پر اترا رہا ہوں
اسی کے رمز سے آگاہ ہو کر
اسی کی بات کو جھٹلا رہا ہوں
اسی کے نام کو تاریک کر کے
اسی کی ذات کو چمکا رہا ہوں

(سنہ ۱۹۳۵ء)

(۷)

آیات و نغمات

(نظمیں)

نیا میلاد

اب سے تقریباً پچھتّر سال پہلے، ہم نشیں
مبتلا تھی سخت تشویش و تذبذب میں زمیں

دہر کا بوڑھا تمدن مل چکا تھا خاک میں
اور جواں دستور گم تھا علم و ادراک میں

خاک پر رکھی ہوئی تھی کہنہ قدروں کی جبیں
اور نئی قدریں تھیں قصرِ ذہن میں خلوت نشیں

خستہ جاں تہذیبِ آثاری جا چکی تھی قبر میں
اور نئی تہذیب مضمر تھی حجابِ ابر میں

پشت پر ٹوٹی پڑی تھیں کچھ پرانی سیڑھیاں
اور آگے کوئی رہبر تھا نہ کوئی نردباں

دین کے دھارے کے اندر بجلیوں کی رَو نہ تھی
اور بے دینی میں شفاف و نمایاں ضو نہ تھی

ہو چکا تھا پوچ و مہمل حرفِ آئینِ قدیم
اور جدید اخلاق تھا زیرِ حجاباتِ عظیم

بے ضیا پیغمبری تھی، کافری تاریک و تار
کس غضب کی کشمکش تھی، کس بلا کا انتشار

بن چکا تھا نظمِ امروز ایک برقِ امن سوز
اور تھا دستورِ فردا کارخانے میں ہنوز

کہنگی بے روح تھی اور حدّتیں بے برگ و بار
وہ اُدھر مجبور تھی اور یہ ادھر بے اختیار

وہ ترازو تولتی تھی جو حقائق کو کبھی
وقت کے گھن سے پڑی تھی خاک پر ٹوٹی ہوئی

عالمِ ماضی، بطونِ گور کی پستی میں تھا
عالمِ آئندہ، بطونِ شاہدِ ہستی میں تھا

نسلِ انسانی کھڑی تھی ششدر و آتش بجاں
اک عبوری موڑ پر، دو عالموں کے درمیاں
کہنہ عالم میں حیات آمیز رقص و رم نہ تھا
جلد پیدا ہو نئے عالم میں اتنا دم نہ تھا

آج لیکن عصرِ حاضر کا سماں کچھ اور ہے / اب زمیں کچھ اور ہے اب آسماں کچھ اور ہے
ہاں وہی عالم کہ تھا مدت سے جس کا اشتیاق / آج پیدا ہو رہا ہے با ہزاراں طمطراق
جن کو یہ ڈر ہے کہ یہ مولود ہو گا نا سعید / اُن کے اوجِ ذہن پر ہے پرتوِ وہمِ شدید
اور جو کہتے ہیں جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے / کہہ دو چپ ہو جائیں اک جشنِ دگر ہونے کو ہے
آج جو چھایا ہوا ہے زندگی پہ یہ دُھواں / اس دھوئیں میں ہیں پرفشاں سیکڑوں رنگینیاں
اس شبِ جاں دیں میں صبحِ سیلِ احساسات ہے / اب بھی مانا رات ہے، لیکن یہ پچھلی رات ہے
شب کے اس دُھندلے افق سے با ہزاراں آب و تاب / امن و آسائش کا طالع ہو رہا ہے آفتاب
تیز تلواروں سے جو کیوں عصرِ نو چیں بر جبیں / یہ تو اس موسم کے پھل ہیں تیز تلواریں نہیں
ان پھلوں کو آدمی چکھ کر امر ہو جائے گا / آفتابِ حُبِّ انساں جلوہ گر ہو جائے گا
اک انوکھی ضو سے دنیا جگمگا دی جائے گی / شمع ہر بزمِ آدمیت کی جلا دی جائے گی
کہہ رہا ہے صاف لفظوں میں زمیں کا خلفشار / دردِ زہ میں مبتلا ہے مادرِ لیل و نہار
ہل رہا ہے یہ جو توپوں کی گرج سے آسماں / یہ تو ہے دراصل وضعِ حمل کی آہ و فغاں
جس کو ہے اسقاط کا اندیشہ وہ دیوانہ ہے / یہ حضورِ ارتقا، اک حرفِ گستاخانہ ہے
جنگ کی بھٹی سے آتی ہی یہ ہے بانگِ مراد / ارتقا، پائندہ باد، نوعِ انساں زندہ باد
آ چکی ہے نقطۂ تکمیل پر حیوانیت / دیکھ پیدا ہو رہی ہے اک جدید انسانیت
پرتوِ تائید ہے اس پردۂ تردید میں / ایک صالح زندگی ہے معرضِ تولید میں

آ رہا ہے تازہ وارث، عالمِ اسباب کا
جلد تر اعلان کر دو اک نئے میلاد کا!

باغی رُوحوں کا کورس

تضمین بر "باغیِ انساں"

معتبر آج بھی ہے، رطلِ گراں کیا کہنا / اب بھی قُلقُل ہے بہ از بانگِ اذاں کیا کہنا
قبضۂ بادہ میں ہے رُوحِ جہاں کیا کہنا / حکمراں آج بھی ہے پیرِ مغاں کیا کہنا
وہی دفتر ہے وہی مُہر و نشاں، کیا کہنا

بر سرِ فتنہ ہے ایماں کا طوفاں کب سے   آندھیاں جنت و دوزخ کی ہیں غلطاں کب سے
مرغِ دانش ہے سرِ عرش پرافشاں کب سے   عقل کی تند ہوائیں ہیں خروشاں کب سے
پھر بھی ہے شمعِ جنوں شعلہ فشاں کیا کہنا

کب سے آنسو ہے طربناک تبسم کے خلاف   کب سے لکنت ہے شکر ریزِ تکلم کے خلاف
کب سے تمکین ہے آئینِ تلاطم کے خلاف   کب سے قرأت ہے مزامیر و ترنم کے خلاف
آج بھی نغمہ ہے آشوبِ جہاں کیا کہنا

کب سے ہے پنجۂ تبلیغ میں دامانِ سکوت   کب سے ہے قمعِ شریعت سے ثنا خوانِ سکوت
کب سے ہے سجدہ و تسبیح میں طغیانِ سکوت   کب سے خورشید کی حدت میں ہے فرمانِ سکوت
پھر بھی جنبش میں ہے ذروں کی زباں کیا کہنا

خاک پر نوحۂ پیہم کی لگی ہیں مہریں   زیست پر دیدۂ پُرنم کی لگی ہیں مہریں
دفترِ عیش پہ بھی غم کی لگی ہیں مہریں   ذرے ذرے پہ جہنم کی لگی ہیں مہریں
پھر بھی دنیا پہ ہے جنت کا گماں کیا کہنا

کب سے ذہنوں پہ ہیں بارِ عقائد کے حجاب   کب سے انساں پہ اوہام کا نازل ہے عذاب
کب سے قدرت کے صحیفے پہ ہے سیلابِ کتاب   کب سے ادیان کی خشکی میں ہے تبلیغِ سراب
وہی رونق ہے سرِ آبِ رواں کیا کہنا

دل اگر دوزخِ پہلو ہے تو سر آتش در دوش   وہی نالوں کی گرج ہے وہی آہوں کا خروش
جلوۂ آشفتگیِ چشم ہے لے آفتِ گوش   عقل کے دور میں بھی عشق نہیں ہے خاموش
وہی نالے ہیں وہی شورِ فغاں کیا کہنا

کب سے نازل ہے حقائق پہ بلائے اوہام   ذہنِ نازک پہ جنت میں ہے دوزخ کی لگام
کب سے فطرت کے جگر میں ہے خراشِ الہام   کب سے ہے ذوقِ نظر علم شریعت سے حرام
وہی نظریں ہیں وہی حسنِ جواں کیا کہنا

آج بھی کاوشِ افسون و فسوں کاری میں   آج بھی کاہشِ بدمستی و سرشاری میں
آج بھی ولولۂ شوخی و طرّاری میں   آج بھی جلوۂ رنگیں کی طلب گاری میں
چشمِ انساں ہے بہر سو نگراں کیا کہنا

دین میں عشوۂ بے باک ہے شایانِ عذاب
غمزہ و ناز پہ پاک عمر سے ہے جہنم عتاب
دستِ ہمت شکنی میں ہے سرِ زلفِ شباب
پر بہ ایں شدتِ آیات و احادیث جواب
دستِ خوباں میں ہے سمندوں کی عناں کیا کہنا

روح کے نغمہ کدۂ عالمِ افلاک میں بھی
وہمِ فردوس کے ٹھنڈے خس و خاشاک میں بھی
فقہ کی سرد و خنک انجمنِ پاک میں بھی
شبنم و برف کے اس حلقۂ نم ناک میں بھی
اٹھ رہا ہے دلِ انساں سے دھواں کیا کہنا

ہند میں حرف و حکایت کے دریچے کب سے
تلخ ہیں برہمن و شیخ کے فقرے کب سے
تند ہیں اہلِ مناجات کے خطبے کب سے
ترش ہیں منبر و محراب کے لہجے کب سے
پھر بھی سرشار ہیں رندانِ جہاں، کیا کہنا

نغمہ و زمزمہ و جلوہ و شعر و مے و جام
وا دریغا کہ ہے ان میں سے ہر اک چیز حرام
خنجرِ زہد کی برش سے بپا ہے کہرام
لیکن اس کوچۂ ہلاکت میں بھی ہیں گرمِ خرام
زلف بر دوش، مسیحا نفساں کیا کہنا

آفریں باد بر ایں ہمتِ کونین شکار
نہ تو شکوے ہی سے واقف نہ شکایت سے دوچار
نشۂ عہدِ جوانی کا ہے ہر چند اتار
اس پہ قرنوں کا ہے شانوں پہ اٹھائے ہوئے بار
پھر بھی رقصاں ہے جہانِ گزراں کیا کہنا

شاہدِ ارض ہے گو جورِ فلک سے بیمار
حلق پر خنجرِ خوں ریز ہے، سر پر تلوار
زلف پر گردِ مہ و سال ہے چہرے پہ غبار
دلِ نازک بھی ہے گو وقت کے تیروں سے فگار
پھر بھی ابرو کی لچکتی ہے کماں کیا کہنا

کب سے تقوے کی حمایت میں ہے شمشیر و کتاب
کب سے شورش ہے کہ دب جائے اذانوں سے رباب
کب سے رندوں کے تعاقب میں ہیں آیاتِ عذاب
کب سے ہے نطقِ رسالت پہ رواں ہجوِ شراب
وہی ہل چل ہے سرِ کوئے مغاں، کیا کہنا

للہ الحمد کہ سعیٔ فقہا کے باوصف
للہ الحمد کہ جہدِ صلحا کے باوصف
للہ الحمد کہ خونِ شہدا کے باوصف
للہ الحمد کہ خود حکمِ "خدا" کے باوصف
ہے وہی گرمیٔ بازارِ بتاں، کیا کہنا

آفریں باد کہ اس جبرِ شریعت پہ بھی ہے　　　　آفریں باد کہ اس رعبِ نبوّت پہ بھی ہے
آفریں باد کہ اس خوفِ عقوبت پہ بھی ہے　　　　آفریں باد کہ اس دعوتِ جنت پہ بھی ہے
دستِ انساں میں بغاوت کی عناں کیا کہنا

تو اگر واپس نہ آتی

۴۴ء میں ایک شام سیر و تفریح کے دوران ایک خاتون نے
"اپالو بندر" پر کسی جذبے سے مغلوب ہو کر خودکشی
کے ارادے سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔۔۔ جوش
یہ دیکھ کر سمندر میں کود پڑے اور انھیں زندہ بچا لائے
یہ نظم اسی واقعے سے متعلق ہے۔

(۱)

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے　　　　حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے
ہاتھ آ جاتا اگر تیرا نہ میرے ہاتھ میں　　　　دل پہ کیا کچھ بیت جاتی اس اندھیری رات میں
اُف وہ طوفاں، وہ بھیانک تیرگی، وہ ابر و باد　　　　وہ ہوائے تند باراں، وہ غرّشِ برق و رعد[1]
دفعتہً وہ روشنی کے سلسلے کا ٹوٹنا　　　　وہ گھٹاؤں کی گرج سے نبضِ ساحل چھوٹنا
وہ "اپالو" کے کلیجے کی مچلتی "مان سُون"　　　　وہ سمندر کے تھپیڑے وہ ہواؤں کا جنون

اور اس طوفان میں اسے زندگی کی روشنی
کود پڑنا وہ سمندر میں ترا اک بارگی

(۲)

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے　　　　حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے
اس دلِ سوزاں میں آتے اس بلا کے زلزلے　　　　آسماں روتا، زمیں ہلتی، ستارے کانپتے

---

[1] "باد" اور "رعد" کا قافیہ میرے نزدیک درست ہے۔

موت اور پھر موت تیری الحفیظ و الاماں		ہڈیوں سے آنچ اٹھتی اور بالوں سے دھواں
لیکن اک لمحے کے بدلے پیکرِ حسن و حیات		جوش کو کھو کر کاوشِ ہستی سے مل جاتی نجات
پہلے ہوتا اک تلاطم، ایک طوفاں، ایک جوش		بعد ازاں تو اور میں اور گریۂ باراں کا خروش

انفصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں
آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب میں

(۳)

بحر کے سینے کو جب طوفان میں لاتی ہوا		سینے بہ سینے آتی ہمارے گُن گُنانے کی صدا
جب گھٹائیں رقص کرتیں اور پپیہے کوکتے		نور میں لپٹے ہوئے دونوں ابھرتے بحر سے
رات جب کچھ بھیگ جاتی اور جھکا جاتا قمر		سیر کرتے روز ہم باہیں گلوں میں ڈال کر
کوئلیں جب کوکنے لگتیں اندھیری رات میں		صبح تک دھومیں مچاتے ہم بھری برسات میں
چھیڑتا جب کوئی ساحل پر ہماری داستاں		پڑنے لگتیں بحر پر دھندلی سی دو پرچھائیاں
زندہ رہتے حشر تک غم کے پرستاروں میں ہم		سانس لیتے سازِ حسن و عشق کے تاروں میں ہم

وقف ہو جاتے محبت کے فسانے کے لئے
سرد ہو کر آگ بن جاتے زمانے کے لئے

خالی بوتل

ٹیس سی اک ہو رہی ہے قلبِ حق آگاہ میں		کیا بتاؤں ہم نشیں کیا شے پڑی ہے راہ میں
کیوں نہ چھا جائے دھواں سا سینۂ ادراک پر		بادۂ رنگیں کی بوتل اور ٹھنڈی خاک پر
آہ اے خاموش دیوی شب کو تیرے سامنے		کتنے رنگیں راگ ہوں گے کتنے شیریں قہقہے
جلوہ گر ہوگی نہ جانے کس بہشتِ اوج میں		چھا رہی ہوگی ہزاروں زمزموں کی موج میں
اے طلسمِ نغمہ و افسونِ کیفِ زندگی		اے حیاتِ آبگینہ، اے سحابِ سرخوشی
اے حصارِ عافیت، اے گنبدِ رقص و غنا		اے حریمِ سر بہ مُہر، اے معبدِ صدق و صفا
مجھ سے بڑھ کر کون کرسکتا ہے تیرا احترام		میں کہ ہوں اس وقت مینائی شریعت کا امام

تجھ میں شب کو جب کہ حسنِ بوستاں وہ چند تھا
دُختِ رز کی نوجوانی کا تموّج بلند تھا

حیف اے قصرِ بلوریں تجھ پہ اور گرد و غبار
جس میں کل تک معتکف تھی دُخترِ ابرِ بہار

شب کہ محفل میں تری شورِ رباب و چنگ تھا
مستی تھی، راگنی تھی، روشنی تھی، رنگ تھا

جذب ہر سینے میں تیرے گرمیاں تھا تسلی
دل میں تیرے سو رہی تھیں کتنی دھومیں رات کی

کل تری ہر بوند تھی، اے خالقِ شعر و شباب
ماہتاب اندر فشاں و آفتاب اندر رکاب

گم ہے تیرے جوہروں میں کتنے سینوں کی اُمنگ
تجھ میں غلطیدہ ہے کتنی نرگسی آنکھوں کا رنگ

تجھ میں محوِ خواب ہے اے چشمۂ باغِ ارم
کتنے برگِ لالہ سے ترشے ہوئے ہونٹوں کا خم

تجھ پہ ہوگی رات کو کس ناز سے چھلکی ہوئی
کتنے افسوں خیز مکھڑوں کی گلابی چاندنی

اور آج انداز و افسون و ادا کچھ بھی نہیں
ایک عبرت ناک شیشے کے سوا کچھ بھی نہیں

اے سپہرِ تاک کے ٹوٹے ستارے السلام
اے حریمِ کیف و مستی کے منارے السلام

السلام اے رشتۂ بشکستہ گوہر السلام
السلام اے جنتِ بے موجِ کوثر السلام

السلام اے شیشۂ محرومِ صہبا السلام
السلام اے محفلِ گم کردہ لیلیٰ السلام

ریل کی پٹڑیاں

کتنے اہلِ جہاں کے وہم و گماں
کتنی نقاشیٔ زمان و مکاں

کتنی اہلِ نشاط کی خوشیاں
کتنے جلتے ہوئے دلوں کا دُھواں

کتنے سیلاب کس قدر طوفاں
ریل کی پٹڑیوں میں ہے غلطاں

کتنی شر و فساد کی باتیں
کتنی جنگ و قتال کی گھاتیں

کتنی تاریک دل سیہ راتیں
کتنی سہمی ہوئی ملاقاتیں

کس قدر دیو کس قدر شیطاں
ریل کی پٹڑیوں میں ہے غلطاں

کتنے افکار، زندگانی کے　　　کتنے ارمان، شادمانی کے
ولولے کتنے کامرانی کے　　　حوصلے کس قدر جوانی کے
کتنی مقدارِ ہمتِ انساں
ریل کی پٹریوں میں ہے غلطاں

کتنی موجوں کے نو بہ نو گرداب　　　کتنے خطوں کے مختلف آداب
کتنے ملکوں کے گوہرِ نایاب　　　کتنی قوموں کے واقعاتِ شباب
کتنے باغوں کے سنبل و ریحاں
ریل کی پٹریوں میں ہے غلطاں

بدلیاں کتنی شادمانی کی　　　کتنی راتیں فسانہ خوانی کی
کتنی نیندیں نئی جوانی کی　　　کتنی دھومیں برستے پانی کی
کس قدر برق، کس قدر باراں
ریل کی پٹریوں میں ہے غلطاں

کتنی شمعوں کے مُردہ پروانے　　　کتنے بھولے ہوئے غم افسانے
کتنے افسردہ ماتمی گانے　　　کتنے خالی دلوں کے ویرانے
کتنی آنکھوں کے اشک ہائے رواں
ریل کی پٹریوں میں ہے غلطاں

کتنی آنکھوں کا بے صدا غوغا　　　کتنے چہروں کی دردناک صدا
کتنا رس اجنبی نگاہوں کا　　　کس بلا کا تعلقِ پیدا
کس غضب کا تلطفِ پنہاں
ریل کی پٹریوں میں ہے غلطاں

کتنی ہی تابشیں نگینوں کی　　　کروٹیں کتنے مہ جبینوں کی
کتنی انگڑائیاں حسینوں کی　　　کتنی آنچیں جوان سینوں کی
کتنے ماتھوں کی سُرخیِ افشاں
ریل کی پٹریوں میں ہے غلطاں

رندِ ہزار شیوہ

ہم نشیں! مجھ کو لرزتے ہوئے آگاہ نہ کر
کہ بلا خیز حوادث کی نظر ہے مجھ پر

ہاں میں واقف ہوں کہ اوہام زبوں کے فرزند
پھینکنا چاہ رہے ہیں مرے قلعے پہ کمند

میری آواز سے ہے رُوحِ قدامت کو عناد
میرے افکار سے آشفتہ ہیں اربابِ فساد

ہاں مری جان کے دشمن ہیں خیالاتِ عقیم
ہاں مرے خون کے پیاسے ہیں روایاتِ قدیم

جن پر اک عمر سے تقلید کا نازل ہے عتاب
وہ مجھے کافر و زندیق کا دیتے ہیں خطاب

میں نے خورشید حقائق کو جو چمکایا ہے
خون اوہام کی آنکھوں میں اتر آیا ہے

ہاں میں واقف ہوں کہ برگشتہ ہیں مجھ سے وہ عوام
جن کے افکار کو یرقان ہے عقلوں کو جذام

جن کا ادراک تعفن سے غذا پاتا ہے
جن کو بوئے گل و نسریں سے بخار آتا ہے

بھونکتے ہیں میرے افکار پہ وہ خانہ خراب
خود کو "علامہ" و "شاعر" کا جو دیتے ہیں خطاب

مسلکِ عذر کا ہر سالک بے ہودہ مزاج
میری آزاد روش سے ہے برافروختہ آج

مشورے ہیں مری تخریب کے گھر اہوں میں
کتنے بزدل ہیں کہ بیٹھے ہیں کمیں گاہوں میں

ہاں وہ کہتے ہیں مجھے بادہ کش و نامہ سیاہ
جن میں باقی نہیں اب جرأتِ رندی و گناہ

ہاں سیاست کو بھی کچھ بغض نہیں کم مجھ سے
طرّۂ افسرِ شاہی بھی ہے برہم مجھ سے

ہاں مری سمت ہے تقدیر سے دونوں کی نگاہ
خواہ وہ محتسبِ شہر ہو یا شحنۂ شاہ

شیر ہی مجھ سے پریشاں نہیں روباہ بھی ہے
"شاہ صاحب" بھی مری فکر میں ہیں شاہ بھی ہے

تو مگر خوف دلاتا ہے عبث یارِ حبیب
پھر تو دہرا کہ "تری موت کی ساعت ہے قریب"[1]

بند میں موت کے دھارے میں ابھرنے والے
موت کے نام سے ڈرتے نہیں مرنے والے

موت کا جام ہے صہبا کی صراحی مجھ کو
موت کے نام سے آتی ہے جمائی مجھ کو

روح ہے مجھ میں صعوبت کے پرستاروں کی
نشہ ہوتا ہے مجھے چھاؤں میں تلواروں کی

برسوں جھولا ہوں ان اجداد کے گہواروں میں
صبح منہ دیکھتے تھے اُٹھ کے جو تلواروں میں

---

[1] میں اس قسم کے قوافی کو درست سمجھتا ہوں

تیغ خوں ریز سے بڑھ چڑھ کے تھے ابرو جن کے　　تیر سینوں ہی میں ہوتے تھے ترازو جن کے
جانتا ہی نہیں درماندہ و حیراں ہونا　　کھیل ہے مجھ سے مجھے دست و گریباں ہونا
سیرِ گلزار ہے، شعلوں کا بھڑکنا مجھ کو　　لحنِ شیریں ہے کمانوں کا کڑکنا مجھ کو
اپنے تابندہ روایات کی کھاتا ہوں قسم　　زہر امرت ہے مرے حق میں، جراحت مرہم
رقص کرتا ہوں میں چلتی ہوئی تلواروں پر　　نیند آتی ہے دہکتے ہوئے انگاروں پر
اس کو کیا خوف جو چلتی ہوئی تلواروں سے　　مدتوں کھیل چکا ہو جو طرح داروں سے
اب مصیبت ہے مصیبت کا نہ ہونا مجھ کو　　کر دیا عشق کی گرم آنچ نے سونا مجھ کو
ہوں اگر دہر میں آثار ہیں پیکاروں کے　　زخم ہیں دل پہ مرے حسن کی تلواروں کے
ہوں اگر حشر میں دنیا کے بلاخانے میں　　ایسے ٹکڑے ہیں بہت سے مرے افسانے میں
کیا بھلا خوف ہیں کانٹوں کے گرفتار ہوں میں　　جس کو پھولوں نے ڈسا ہے وہ دل افگار ہوں میں
موجِ صرصر سے ڈراتا ہے اُسے تو بے کار　　پھنک چکا ہے جو نسیمِ سحری سے سو بار
اُس کو شعلوں سے ڈراتا ہے کوئی اے ہمدم　　نوجوانی میں جسے پھونک چکی ہو شبنم
قہرِ یزداں کو سمجھتا ہے وہ از قسمِ نیاز　　مہرِ خوباں کا جو مقتول ہے اے محرمِ راز
تیغِ دشمن سے جہاں مرد گئے، ڈرتے ہیں کہیں　　خنجرِ دوست کے مارے ہوئے مرتے ہیں کہیں
بحر میں آگ لگاتی ہے کہانی میری　　گرمیٔ برق پہ ہنستی ہے جوانی میری
کتنے گرداب میں دیکھے ہیں کنارے میں نے　　کتنے کاٹے ہیں مچلتے ہوئے دھارے میں نے
کتنے ادیان کی موڑی ہے کلائی میں نے　　کتنے اصنام کو بخشی ہے خدائی میں نے
شوق نے پاؤں سے مسلی ہیں وبائیں کیا کیا　　عشق نے ہجر کی جھیلی ہیں بلائیں کیا کیا
کتنا کھیلا ہوں تڑپتے ہوئے ارمانوں سے　　کتنا کھیلا ہوں امڈتے ہوئے طوفانوں سے
خوفِ جاں ہی نہیں، ہر خوف پہ خنداں ہوں میں　　اک رہا خوفِ خدا، خیر مسلماں ہوں میں
پوچھ، دم بھرتا ہے کب سے مری تنہائی کا　　تجربہ ہے مملکتِ حسن کی سیاحی کا
مانتی ہیں سفرِ شب کی گھٹائیں مجھ کو　　خوب پہچانتی ہیں خوف کی راتیں مجھ کو
کب سے دیوانہ خرامی کو مری جانتی ہیں　　ظلمتیں مجھ کو مری چاپ سے پہچانتی ہیں
بول اگر شوق ہے لے دیدۂ حیراں مجھ میں　　کتنے پنہاں شب و روز ہیں غلطاں مجھ میں

تو نے کیا کیا نہ اٹھایا ہے مری روحِ نیاز — تیز کرنوں کا غرور اور کڑی دھوپ کا ناز
کس قدر شدتِ سرما کے ہیں خنجر تجھ میں! — جذب ہیں کتنی سلیں برف کی اے سر تجھ میں!
بول ہو زلفِ گرویدۂ دلِ حیراں کب سے؟ — زہر کا کل ہے مرے خون میں سلطاں کب سے؟
کس قدر لو کے تھپیڑے ہیں پرافشاں تجھ میں! — کتنے طوفان ہیں اے سینۂ سوزاں تجھ میں!
وسعتِ دامن میں کیا بچھڑے ہوئے دریا کیا کیا — اس کفِ پا میں ہیں بیٹھے ہوئے صحرا کیا کیا
سر میں ہیں شورشِ کونین کے کس بل کتنے — گم ہیں کانوں میں گرجتے ہوئے بادل کتنے!
برق و باراں سے ہوئیں دشت میں باتیں کیا کیا — غرق ہیں دل میں برستی ہوئی راتیں کیا کیا!

زندہ ہیں خون کے دریا میں نہانے والے
جا ابھی اے سیلِ حوادث سے ڈرانے والے

مہاجن

قد کی لمبائی سے اک حد تک کمر جھولی ہوئی — سر پہ چٹیا مردہ چوہے کی طرح پھولی ہوئی
دانت پیلے، پنڈلیاں پیچیدہ، دھوتی داغدار — ناک میں مونچھوں کے گچھے، پیشانی پہ ندی کا غار
سامنے غلے کے بورے، پشت پر الماریاں — نتھنوں میں کروٹیں لیتی ہوئی زرداریاں
کھڑکیاں غلے کے اندر وزن سے دھنستی ہوئی — چست صدری، دائرے پر توند کے کسی ہوئی
خوب سے کرد کا ہے دل کو بہلاتا ہوا — دونوں نتھنوں کو پھلائے، توند سہلاتا ہوا
جب ہے نکلنے آب سرد و گرم میں دیتا ہوا — قرض کے طالب کے دل کا امتحاں لیتا ہوا
غنڈہ تا سپہ پر سپیہ، تیوری چڑھاتا بار بار — شدتِ حاجت کا اندازہ لگاتا بار بار
کشتیِ ہستی کو چوسے ہی میں کھینچتا ہوا — اپنی جانیں فریبوں کے بار سے لیتا ہوا
رخ کی تاریکی پہ زر کی سرخیاں چھائی ہوئی — بے حقیقت خاک، سونا بن کے اترائی ہوئی
گالوں کے بالے سودِ زر کا دم بھرتے ہوئے — سود کے بارے میں کچھ سرگوشیاں کرتے ہوئے

عالمِ اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہوا
بے زری کی شام سے اخذِ سحر کرتا ہوا

رُوپ متی

رخسار میں شمع کعبہ کی ضو		آنکھوں میں چراغ دیر کی لو
خوش پیکر و خوش جمال و خوش رو		چھلکی ہوئی چاندنی لب جو

پلکوں کی جھپک میں مسکراہٹ		شعلے کی خفیف تھرتھراہٹ
برسات کی راگنی کی راتیں		غلطیدہ حسین دست و پا میں

انفاس میں کمسنی کی خوشبو		بنگال کا انکھڑیوں میں جادو
چہرے پہ شباب کا تلاطم		بت خانے کی صبح کا تبسم!

عارض میں دمک دمک میں ندرت		برسات کے چاند کی لطافت

رس کی بوندیں کہ ترنم باتیں
آواز میں مالوے کی راتیں

رُباعیات

خود کو گم کردہ راہ کرکے چھوڑا		حوا کو بھی تباہ کرکے چھوڑا
کیا کیا نہ کئے خدا نے جنت میں جتن		آدم نے مگر گناہ کرکے چھوڑا

عالم محروم جاہ کر دے گا تجھے		امید غم بے پناہ کر دے گا تجھے
اے جھوٹ کے فائدوں کے منکر انساں		سچ بول کہ سچ تباہ کر دے گا تجھے

اعزاز انعام قہر بن جاتا ہے		بے عجز کثیف زہر بن جاتا ہے
وہ علم کہ اکسیر ہے انساں کے لئے		گر ہضم نہ ہو تو زہر بن جاتا ہے

کاکل کھل کر بکھر رہی ہے گویا		ندی سے ندی گزر رہی ہے گویا
آنکھیں تنی جھک رہی ہیں مجھ سے مل کر		دیوار سے دھوپ اتر رہی ہے گویا

(۸)

عرش و فرش

(نظمیں)

نامکمل خاکے

پئے تفصیلِ حُسن ساعتِ بار — آج جُنباں ہے یوں لبِ گفتار
ساحلِ بحر پر حبابوں کا — گوندھنا چاہتا ہوں گویا ہار
یا کلی سے اٹھانے بیٹھا ہوں — شبنمِ تازہ کے دُرِ شہوار
الحذر، وہ نگاہِ دھر فگن — الاماں، وہ بتِ الم شکار

چُست و چالاک، چاق و چابک دست — مست و مدہوش و سرخوش و سرشار
گل رُخ و مہ جبال و آئینہ رُو — نورس و نرم و نازدرہ گفتار
تیز و طرار و تند و تاب رُبا — شوخ و شنگ و شریر و شعبدہ باز
زرفشاں، مشک ریز، مے کدہ ساز — گل چکاں، مے فروش، زمزمہ بار
مہ گسل، مہر سوز، نجم شکن — شمعِ یوسف گداز و حور آزار
شبنمستاں بدوش و خلد بکف — غنچگی بر رُخ و چمن بہ کنار
طرفہ افسونِ دیدہ و مژگاں — زندہ اعجاز کاکل و رُخسار
آفتِ زاہدانِ گوشہ نشین — فتنۂ عابدانِ شب بیدار
شامِ عشرت بہ عشوۂ خونریز — صبحِ جنّت بہ نرگسِ بیمار
محرمِ رازِ شوخی و تمکیں
ساحل و موج، خفتہ و بیدار

لشکرِ نوریانِ عالمِ پاک
اُس کے جلووں سے نقش بردیوار

شوخیوں کی وہ دھوم رگ رگ میں
جیسے باراں میں جھومتے اشجار
چشم و رخسار یوں تجلی ریز
جس طرح شیشہ ہائے تاب گلنار
روئے گل ریز یوں عرق آلود
جیسے پھولوں پہ بوندیوں کا نکھار
یوں اُمنگوں کا رقص آنکھوں میں
جیسے ساغر میں ثابت و سیار
نور و ظلمت کی عشوہ کاری سے
یوں دل آویز کاکل و رخسار
جیسے گوکل کی شام کے سائے
جیسے گنگا کی صبح کے انوار
یوں تبسم میں ولولوں کا ہجوم
جیسے شاہانِ ہند کا دربار
بات جیسے صدائے خندۂ گل
چال جیسے خرامِ ابرِ بہار
گردشِ چشم و جنبشِ مژگاں
جیسے خوابوں میں رقصِ لیل و نہار
صندلی چہرہ اور سیہ ساری
جیسے کعبے پہ بارشِ انوار
سبزہ و گل پہ وہ لطیف خرام
جیسے کوئی بجا رہا ہو ستار
نگہِ شوق سے وہ رخ پہ حیا
جیسے شیشے کے متصل بوچھار
پردۂ چشم میں نہاں یوں شوق
جیسے قندیل نہر کے اس پار

موجِ انفاس خواب آگیں سے
یوں مچلتا ہوا گلے کا ہار
جیسے انوارِ صبح، گرمِ خرام
جیسے امواجِ بحرِ ناہموار

صبح کے نقرئی دھندلکے میں
روئے ناشستہ پر وہ نیند کا بار
جیسے حافظ کی مست تانوں میں
کیف کا جوش سرخوشی کا اُبھار

سرخیٔ جلد کے تموج سے
یوں پرافشاں لباس کا ہر تار
جیسے گلشن میں آتشِ گل کا
شبنم آلود جھٹ پٹے میں غبار

لہجہ غلطیدہ وہ جس طرح موتی　　مرمریں فرش پر یمین و یسار
جیسے چینی پہ سکۂ رقصاں　　اشرفی کی بلور پر جھنکار

بات کرنے میں چنگ کا عالم　　اتنی ہلکی سے اور یہ ایں ہنجار
جیسے فرقت کی چاندنی کے حضور　　دل میں تیرے کوئی مہین سی پھوار
یا کلی تڑکے سونگھنے کے وقت　　جیسے سینے میں سانس کی رفتار

حسن کی شرح غیر ممکن ہے　　بند ہو بند، اے لبِ گفتار
ساحلِ بحر پر حبابوں کا　　چاہتا تھا کہ آج گوندھوں ہار
اور کلی سے اٹھانے بیٹھا تھا　　شبنمِ تازہ کے دُرِ شہوار
نہ تو وہ ہو سکا نہ یہ صد حیف　　ٹوٹ جا خامۂ فضول نگار
نطق کے بس میں آ نہیں سکتی
بوئے گل، تابِ ماہ، طلعتِ یار

(سنہ ۱۹۴۴ء)

اترا ہوا چہرہ

قطرہ قطرہ کرکے ٹپکے ماہ و سال　　اور یوں جم کر کہ بھیگا بال بال
اور مانندِ بتانِ بزم گام　　سر سے گزرا کاروانِ صبح و شام
اور خاموشی سے وقتِ برق پا　　مثلِ شبنم روح میں کھپتا رہا
اور عزائم کے نفس کی تشنیاں　　خون میں کرتی رہیں تبدیلیاں
اور پھر دل کی خوشی کھوتے رہے　　تجربوں پر تجربے ہوتے رہے
دشمنوں کی بے محابا دشمنی　　دوستوں کا ادعائے دوستی
بےکسوں کے درد پر آہ و فغاں　　اور خلوت گاہ میں خود رحمیاں

Self pity ے

اقربا کے جور ہائے بے پناہ
اغنیا کی زہر میں ڈوبی نگاہ
شام کو بدمست امیروں کی صدا
صبح کو بھوکے فقیروں کی صدا
ہمدموں کی تلخ کامی کا ملال
مفلسی کا دکھ، غلامی کا ملال
شمعِ محفل پر نظر، محفل کی فکر
نوعِ انساں کے مستقبل کی فکر
شامِ غربت میں بصد رنج و محن
ملگجے پر خنجرِ صبحِ وطن
موسمِ باراں میں وقتِ ابر و باد
دوستانِ رفتہ کی رہ رہ کے یاد
حال کے آلام، ماضی کے ملال
دل میں چھالے، شیشۂ خاطر میں بال
وادیوں کی یاد، کہساروں کی یاد
گل رخوں کی یاد، مہ پاروں کی یاد
روح میں عشق و جوانی کا مراق
پہلوؤں میں نشترِ ہجر و فراق
روز و شب اک تازہ درد و خلفشار
جنگ کے اعلان، مرجانے کے تار
ہمدموں کی موت، دلداروں کی موت
چاند کی گم گشتگی، تاروں کی موت
جلوۂ شبنم دہکتے بھاڑ میں
سرخ آنسو قہقہوں کی آڑ میں
الغرض ہر آن دل جلتا رہا
کاروانِ زندگی چلتا رہا
دل ہجومِ غم سے گھبراتا رہا
ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتا رہا
آنسوؤں سے ظرفِ جاں بھرتا رہا
کام اپنا زہرِ غم کرتا رہا
دل متاعِ سرخوشی کھوتا رہا
عشوۂ شام و سحر ہوتا رہا
اور پھر کچھ دن کے بعد اے ہم نشیں
دیدہ ہائے صبح کھلتے جب سرِ زمیں

برِ عشم ارض و سما پر چھا گیا
آئینہ دیکھا تو دل مرجھا گیا

(سنہ ۱۹۴۳ء)

سونی جنت

ہاں یہی ہے وہ مکاں وہ جنتِ دورِ کہن
کل تھا جس کی انجمن میں حسن صدرِ انجمن
ہاں یہ پل ہے ریل کا، اور یہ چمکتی پٹریاں
داستاں در داستاں در داستاں در داستاں

ہاں یہ کھڑکی ہے وہی اور یہ سلاخیں ہیں وہی
جھانکتی تھی جن سے اُس مکھڑے کی میٹھی چاندنی
ہاں یہیں جب پڑ رہی تھی ایک دن ہلکی پھوار
گر رہا تھا سُرخ زلفوں کا سنہرا آبشار
چبھ رہی ہے دل میں مثلِ نیشتر کمبخت سانس
یہ مکاں ہے یا کوئی چبھتی ہوئی سینے کی پھانس
آہ یہ در جس پہ شمعِ زندگی کا نور تھا
حیف یہ گھر جو کلیمِ عصرِ نو کا طور تھا

آج عبرتناک ہے، بے روح ہے، بے ہوش ہے
کل حیات و نغمہ تھا، اب سر بسر خاموش ہے

گھر کو اندر سے بھی دیکھوں یا سڑک ہی پر رہوں
خیر اندر بھی چلوں، قربانِ دل ہے کیا کروں
اُف یہ سُرخی کا نشاں پہچانتا ہوں میں اسے
جانتا ہے یہ مجھے اور جانتا ہوں میں اسے
ہاں یہاں آرام کرتی تھی وہ تھک جانے کے بعد
ہاں یہاں رہ بیٹھتی تھی غسل فرمانے کے بعد
ہاں یہاں بیٹھے تھے بے چینی سے زانو پہ ہات
ہاں یہاں چھلکے تھے ان آنکھوں سے آنسو ایک دن
مسکرا کر اک ادا سے تو نے دیکھا تھا یہاں
کاٹ کر دانتوں سے اک پان بخشا تھا یہاں
دامنِ جاں سوزنِ سیال سے سیتا تھا میں
ہاں اسی گوشے میں اکثر رات کو پیتا تھا میں
وہ کسی کا درسِ ترکِ مے گساری ہائے ہائے
وہ مرا ہنس ہنس کے شغلِ بادہ خواری ہائے ہائے
ہاں چھڑا تھا قصۂ سوزِ نہانی ایک دن
[illegible] جب برسا تھا پانی ایک دن
آج بھی محفوظ ہیں سونے در و دیوار میں
وہ ترانے [illegible]
اب بھی جلوؤں کی شعاعیں ہیں وہیں تابندہ ہے
اب بھی ان غرفوں میں الفت کا فسانہ زندہ ہے
ذرے ذرے میں کھٹک محسوس ہوتی ہے یہاں
دل دھڑکنے کی دھمک محسوس ہوتی ہے یہاں
حُسن کے ذرات اب بھی رقص کرتے ہیں یہاں
کانپتی ہیں دھندلی دھندلی سی پرچھائیاں
ان ہواؤں میں جوانی کی مہک ہے آج بھی
ساحرانہ لوچ، ترکانہ لچک ہے آج بھی
جن کے ہر نقش میں تھا جلوۂ گل ہائے تر
چبھ رہے ہیں آج کانٹے بن کے وہ دیوار و در
خون میں ڈوبا ہوا انسان کا افسانہ ہے
کل جو گھر عشرت سرا تھا آج ماتم خانہ ہے
کون؟ یہ کیسی صدا؟ کس کی صدا؟ یہ کیا کہا؟
"جوش تنہا جوش" میں تیری اُداسی پر فدا!
اُف مرا دل شق ہوا جاتا ہے یہ کیا راز ہے؟
یہ مرے دل کی صدا ہے یا تری آواز ہے؟

خیر خواہِ جملہ اقوام و ملل — رازقِ بے قیدِ "ایمان و عمل"
ہاں، علی الرغم "نظامِ عرشِ پاک" — اے دوائے جملہ علت ہائے خاک
اے پیامِ آب بہرِ تشنگاں — اے نویدِ ناں برائے خستگاں
اے گدائے راہ و شاہِ شش جہت — اے ابوالافلاس و ابنِ مرحمت
دشمنِ پیمانۂ پست و بلند — حامیٔ بے چارگانِ دردمند
آبگینے سے ترے سکتے ہیں سنگ — اے کہ تو اُترے ہوئے چہروں کا رنگ
اے کہ تو جامِ سفالیں کا بھرم — اے کہ تو سازِ شکستِ جامِ جم
اے کہ تو برقِ سحابِ غم کشاں — اے کہ تو دردِ دماغِ خسرواں
اے کہ تو آئین شکن ۔ آئینہ ساز — عارفِ "شاہیں کش و قمری نواز"
اے کہ تیری ہر نگاہِ نکتہ یاب — صحبتِ "ذرّات" و مرگِ "آفتاب"
ہمدمِ شبیر و بدخواہِ "یزید" — موسیٔ نو بہرِ فرعونِ جدید
اے عدوئے "نوریانِ شعلہ خو" — اے انیسِ خاکیانِ "مُردہ رُو"
اے رفیقِ خستگانِ بے نوا — ناخدائے بندگانِ بے خدا
اے نگارِ بے نگاہانِ جہاں — اے کلاہِ بے کلاہانِ جہاں
منکرِ دارائیٔ "عرشِ بریں" — اولیں پیغمبرِ فرشِ زمیں

ہند را آتش بہ جامے دادۂ
پائے شل را ہم خرامے دادۂ
رُو بسوئے تو رقصندہ درخشندہ بلد
زندہ و پائندہ و تابندہ باد!

(سنہ ۱۹۴۴ء)

رُباعیات

ممنوع سُشبہ سے لطفِ پیہم لینے — عصیاں کی گھنی چھاؤں میں پھر دم لینے
آواز دو کا شمیر آپہونچا جوش — اللہ سے انتقامِ آدم لینے

یہ رات گئے میں طرب کے ہنگام
پرتو یہ پڑا پُشت سے کس کا سرِ جام؟
یہ کون ہے؟ "جبریل ہوں"۔ "کیوں آئے ہو؟"
سرکار! فلک کے نام کوئی پیغام؟

یہ شام خنک، یہ ابرِ افسردہ خرام
ہستی کی نوید اور نہ مستی کا پیام
گردوں پہ اک آہ سی ہے لیکن موہوم
دل پر اک بوجھ سا ہے لیکن گم نام

زلفیں ہیں کہ ژولیدہ خیالات کی رات
اے جانِ حیا ٹھیر بھی جا رات کی رات
اِن تیرہ گھٹاؤں میں کدھر جائے گی
شانوں پہ لئے ہوئے یہ برسات کی رات

ہر گام پہ جنبش میں ہے یہ زلفِ رسا
فوارے سے یا اُبل رہی ہے صہبا
یا موجِ خرام کا اشارہ پا کر
شانوں پہ امنڈ آئی ہے گھنگھور گھٹا

ذہنی مُردوں سے دل لگاؤں کیوں کر
چلتی لاشوں کے پاس جاؤں کیوں کر
مجرم ہو تو لاکھ بار کرلوں برداشت
احمق کا مگر بار اٹھاؤں کیوں کر

جیسے پیہم ہنسا بتاتا ہے کوئی
خود پر روؤں یہ چاہتا ہے کوئی
جب شام کو سیداں میں نکلی ہے ہوا
میرے دل میں کراہتا ہے کوئی

اے عمرِ رواں کی رات آہستہ گزر
اے ناظرِ کائنات آہستہ گزر
اک شے پہ بھی جمتے نہیں پاتی ہے نگاہ
اے قافلۂ حیات، آہستہ گزر

جو دل کی ہے وہ بات نہیں ہوتی ہے
جو دن نہ ہو وہ رات نہیں ہوتی ہے
ہستی ہے وہ طوفان کہ اکثر اے جوشؔ
اپنے سے ملاقات نہیں ہوتی ہے

(۹)

رامش و رنگ

اپنی ملکۂ سخن سے

(اعترافِ احسان)

اے شمعِ جوشش و مشعلِ ایوانِ آرزو اے مہرِ ناز و ماہِ شبستانِ آرزو
اے جانِ دردمندی و ایمانِ آرزو اے شمعِ طور و یوسفِ کنعانِ آرزو

ذرّے کو آفتاب، تو کانٹے کو پھول کر
اے روحِ شعر، سجدۂ شاعر قبول کر

دریا کا موڑ، نغمۂ شیریں کا زیر و بم چادر شبِ نجوم کی، شبنم کا رختِ نم
تتلی کا نازِ رقص، غزالہ کا حسنِ رم موتی کی آب، گل کی مہک، ماہِ نو کا خم

ان سب کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے تو
کتنے حسیں افق سے ہویدا ہوئی ہے تو

ہوتا ہے مہ وشوں کا وہ عالم ترے حضور جیسے چراغِ مُردہ سرِ بزمِ شمعِ طور
آکر تری جناب میں اے کارسازِ نور پلکوں میں منہ چھپاتے ہیں جھینپے ہوئے غرور

آتی ہے ایک لہر سی چہروں پہ آہ کی
آنکھوں میں چھوٹ جاتی ہیں نبضیں نگاہ کی

رفتار ہے کہ چاندنی راتوں میں موجِ گنگ یا بھیرویں کی پچھلے پہر قلب میں اُمنگ
یہ کاکلوں کی تاب ہے، یہ عارضوں کا رنگ جس طرح جھٹ پٹے میں شب و روز کی ترنگ

روئے حسیں نہ گیسوئے سنبل توام ہے
وہ برہمن کی صبح، یہ ساقی کی شام ہے

آواز میں یہ رس، یہ لطافت، یہ اضطراب		جیسے سُبک، مہین، رواں، ریشمی پھوار
لہجے میں یہ کھٹک ہے کہ ہے نیشتر کی دھار		اور گر رہا ہے دھارے شبنم کا آبشار
چہکی جو تو چمن میں ہوائیں مہک گئیں
گل برگِ تر سے اوس کی بوندیں ٹپک گئیں

جادو ہے تیری صوت کا گُل پر ہزار پر		جیسے نسیم صبح کی رو جوئبار پر
ناخن کسی نگار کا چاندی کے تار پر		مضراب عکس قوس رگِ آبشار پر
موجیں صبا کی باغ پہ صہبا چھڑک گئیں
جنبش ہوئی لبوں کو تو کلیاں چٹک گئیں

چشم سیاہ میں وہ تلاطم ہے نور کا		جیسے شرابِ ناب میں جوہر سُرور کا
یا چہچہوں کے وقت تموّج طیور کا		باندھے ہوئے نشانہ کوئی جیسے دور کا
ہر موج رنگ قامتِ گل ریز رم میں ہے
گویا شرابِ تند بلوریں قلم میں ہے

تجھ سے نظر ملائے، یہ کس کی بھلا مجال		تیرے قدم کا نقش حسینوں کے خد و خال
اللہ رے تیرے حسنِ ملک سوز کا جلال		جب دیکھتی ہیں خلد سے حوریں ترا جمال
پرتو سے تیرے چہرۂ پروین سرشت کے
گھبرا کے بند کرتی ہیں غرفے بہشت کے

چہرے کو رنگ و نور کا طوفاں کیے ہوئے		شمع و شراب و شعر کا عنواں کیے ہوئے
ہر نقش پا کو تاجِ گلستاں کیے ہوئے		سو طور اک نگاہ میں پنہاں کیے ہوئے
آتی ہے تو چمن میں جب اس طرز و طور سے
گل دیکھتے ہیں باغ میں بلبل کو غور سے

میرے بیاں میں سحر بیانی تجھی سے ہے		روئے سخن پہ خونِ جوانی تجھی سے ہے
لفظوں میں رقص و رنگ و روانی تجھی سے ہے		فقر گدا میں فخر کیانی تجھی سے ہے
فِدوی کے اس عروج پہ کرتی ہے غور کیا
تیری ہی جوتیوں کا تصدق ہے اور کیا

اے جانِ ذوق و محسنِ لیلائے ہنر　　اے کردگارِ معنی و خلّاقِ شعرِ تر
تیری نگاہِ ناز کا احساں ہے کس قدر　　کُھل جائے گر یہ بات کہ اردو زبان پر
چاروں طرف سے نعرۂ صلِّ علیٰ اٹھے
تیرے تبسموں سے زمیں جگمگا اٹھے

جب سے میرے نام کا بالائے بحر و بر　　میرے ہنر میں صرف ہوئی ہے تری نظر
فرقِ گدا پہ تاج ہے سلطاں برہنہ سر　　شہرت کی بزم تجھ سے منور نہیں مگر
پروانے کو وہ کون ہے جو مانتا نہیں
اور شمع کس طرف ہے کوئی جانتا نہیں

ہر خار ایک گل ہے تو ہر ذرہ آفتاب　　دل تیری بزمِ ناز میں جب سے ہے باریاب
زیرِ نگیں ہے عالمِ تمکین و اضطراب　　اک لشکرِ نشاط ہے ہر عزم کے ہم رکاب
بادِ مراد و چشمکِ طوفاں لیے ہوئے
ہوں بوئے زلف و جنبشِ مژگاں لیے ہوئے

تیری لٹوں سے موجۂ طوفاں مرا کلام　　تیرے لبوں سے چشمۂ حیواں مرا کلام
تیرے سخن سے نغمۂ یزداں مرا کلام　　تیری نظر سے طورِ بداماں مرا کلام
تو ہے پیامِ عالمِ بالا مرے لیے
اک وحیِ ذی حیات ہے گویا مرے لئے

اے آبِ ورنگِ حافظ و اے حسنِ انوری　　اے ماہِ شعر پرور و مہرِ سخن وری
میرے سخن کی پشت پہ مہرِ پیمبری　　تو نے ہی ثبت کی ہے بصد نازِ داوری
تیری شمیمِ زلف کی دولت لیے ہوئے
میرا نفس ہے بوئے رسالت لیے ہوئے

شب ہائے تلخ و ترش و سحر ہائے شکریں　　در ہائے آبدار و شرر ہائے دل نشیں
دولت وہ کون ہے جو مری جیب میں نہیں　　عقلِ نشاط خیز و جنونِ غم آفریں
ٹکرائی جب بھی مجھ سے خجل سروری ہوئی
یوں ہے ترے فقیر کی جھولی بھری ہوئی

نغمے پلے ہیں دولتِ گفتار سے تری — پایا ہے نطق چشمِ سخن بار سے تری
طاقت ہے دل میں نرگسِ بیمار سے تری — کیا کیا ملا ہے جوش کو سرکار سے تری

بانکے خیال ہیں خمِ گردن لیے ہوئے
ہر شعر کی کلائی ہے کنگن لیے ہوئے

اے میلِ نہفتہ ولے حسنِ شرمگیں — تجھ پر نثار دولتِ دنیا، متاعِ دیں
منسوب تجھ سے ہے جو بہ اندازِ دل نشیں — تیری وہ شاعری ہے مری شاعری نہیں

آوازہ چرخ پر ہے جو اس دردمند کا
گویا وہ عکس ہے ترے قدِ بلند کا

میرے بیان میں یہ جو وفورِ سرور ہے — طاقِ سخن وری میں جو یہ شمعِ طور ہے
یہ جو مرے چراغ کی ضو دور دور ہے — سرکار ہی کی موجِ تبسم کا نور ہے

شعروں میں کروٹیں یہ نہیں سوز و ساز کی
لہریں ہیں یہ حضور کی زلفِ دراز کی

مجھ رندِ حسن کار کی مے خواریاں نہ پوچھ — اس خوابِ جاں فروز کی بیداریاں نہ پوچھ
کرتی ہے کیوں شرابِ خرد باریاں نہ پوچھ — بے ہوشیوں میں کیوں ہیں یہ ہشیاریاں نہ پوچھ

پیتا ہوں وہ جو زلف کی رنگیں گھٹاؤں میں
کھنچتی ہے ان جھکی ہوئی پلکوں کی چھاؤں میں

ہشیار اس لیے ہوں کہ مے خوار ہوں ترا — شیدائے شعر ہوں کہ گرفتار ہوں ترا
لہجہ مرا صحیح ہے کہ نمک خوار ہوں ترا — صحت زباں میں ہے کہ بیمار ہوں ترا

تیرے کرم سے شعر و ادب کا امام ہوں
شاہوں پہ خندہ زن ہوں کہ تیرا غلام ہوں

میں وہ ہوں جس کے شعر نے ترے دل میں راہ کی — اک عمر جس کے عشق میں خود تو نے آہ کی
محویتِ شوق سے یہ تیری نگاہ کی — راتیں کٹی ہیں سائے میں چشمِ سیاہ کی

کیوں ہو نہ شاخِ گل کی لچک ہو بیان میں
تیری کمر کا لوچ ہے میری زبان میں

ترشے ہوئے لبوں کے بہکتے خطاب سے | زرتار کاکلوں کے مہکتے سحاب سے
سرشار انکھڑیوں کے دہکتے شباب سے | موجِ نفس کے عطر سے مکھڑے کی آب سے

بارہ برس تپا کے زمانہ سہاگ کا
سینچا ہے تو نے باغ مرے دل کی آگ کا

گرمی سے جس کی برف کا دل ٹوٹ کر رسے وہ آگ | شعلوں میں اوس کو جو مبدّل کرے وہ آگ
لُو سے جو زمہریر کا دامن بھرے وہ آگ | ضد ہے جو نامِ نارِ سقر پر دھرے وہ آگ

جس کی لپٹ گلے میں جلاتی ہے راگ کو
پالا ہے قلبِ ناز میں تو نے اُس آگ کو

(سنہ ۱۹۴۴ء)

برسات کا پچھلا پہر

پچھلا پہر، لطیف ہوا، مست سبزہ زار | لچھے سیاہ ابر کے، بالائے کوہسار
چڑیوں کی گونج، نہر کا خم، مور کی پکار | ہلکی، سبک، مہین، رواں، شبنمی پھوار

اور شبنمی پھوار سے ٹھنڈی ہوا کی چھیڑ
برسات کی دُلائی سے بادِ صبا کی چھیڑ

گردوں شراب نوش تو گیتی ہے مے پرست | رنگینیوں میں غرق ہے دنیائے بود و ہست
اوڑھے ہے اک حباب سی چادر بلند و پست | سبزہ غنودہ، پھول نہائے، ہوائیں مست

کہسار کی کمر پہ گھٹا سے کسی ہوئی
گلگوں فضا پہ خواب کی مستی پڑی ہوئی

[illegible] میں ظلمت اِدھر اُدھر | [illegible] کچھ صبح کی شکل
رہ رہ کے گردشیں سی شگوفوں کے رنگ پر | اور اس قدر لطیف کہ جچتی نہیں نظر

کہرے کا رنگ روئے فضا پر پھرا ہوا
ابرِ سفوف و شبنم و گل سے بھرا ہوا

(سنہ ۱۹۴۴ء)

"کوئی" سُن لے نہ کہیں !

اب کہ جب ٹوٹ چکا ہے ستمِ لیل و نہار
میرا دورِ طرب انگیز، مری فصلِ بہار

سایۂ آہ میں ہے زمزمہ خوانی میری
خفتہ ہے شیب کے زانو پہ جوانی میری

رُخ ہے اب قافلۂ عمر کا پستی کی طرف
بڑھ کے کافور رواں ہے مری ہستی کی طرف

اک روغن بھی نہیں باقی ۔۔۔ ہے خلافِ معمول
اب نہ رفتار میں بادل ہیں، نہ گفتار میں پھول

کیوں کسی پر کج ادائی کا لگاؤں الزام
اب مرے رُخ پہ ہے وہ صبح نہ آنکھوں میں وہ شام

سخت حیراں ہوں کہ اس پر بھی وفادار ہے تو
تجھ کو مجھ سوختہ ساماں سے محبت ہے وہی

مجھ کو گھر میں نہیں پاتی تو بہت روتی ہے
اب بھی آ پاؤں مرے چاٹ کے خوش ہوتی ہے

"کوئی" سُن لے نہ کہیں !!

(سنہ ۱۹۴۴ء)

تخلیق سے پیشتر

(طویل نظم "حرفِ آخر" کا ایک حصہ)

منظر (۱)

سینۂ عدم میں وجود کا [illegible]

(حسبِ روایاتِ پیشینہ)

سین (۱)

ایک افسونِ مدہوشِ ظلمت [illegible]
ایک گہرے سکوت کا عالم
روئے خنداں، نہ دیدۂ گریاں
جلوۂ گل، نہ رشحۂ شبنم
سازِ دیوانگی، نہ سوزِ خرد
نغمۂ سرخوشی، نہ نوحۂ غم
نہ محبت کا سینۂ صد چاک
نہ جوانی کے گیسوئے پُرخم
سوزِ تخلیق سازِ در پردہ
اور بیرونِ پردہ زیر نہ بم
جیسے بادل کی آڑ میں بجلی

؎ مصنف کی کتیا کا نام

جیسے بربط کے تار میں سرگم
نیم پوشیدہ، گاہ نیم عیاں
باہم آویزشِ وجود و عدم
اک عمیق و رسیدہ معنی میں
لفظ بننے کا جذبۂ محکم
جامد و پا بہ گل عناصر میں
اک ابھرتا ہوا سا جذبۂ رم
خود سے گلتی ہوئی سی اک زنجیر
خود سے کھلتا ہوا سا ایک علم
سینۂ قطرگی میں رہ رہ کر
پیچ و تابِ خروشِ موجۂ یم
بول اٹھنے کے شوقِ بے حد سے
خامشی مبتلائے کرب و الم
حرکت میں تخیلِ موجد
شش جہت میں تصورِ عالم
کربِ ناگفتہ حرف میں یزداں
فکرِ ناآفریدہ جام میں جم
کپکپی ظلمتوں میں یوں گویا
نور بننے کی کھا رہی ہے قسم
چند جگنو سے دم بدم تاباں
چند پلکیں سی پے بہ پے برہم
تیرہ اوجِ خلا پہ جنبش میں
عکسِ تسنیم و پرتوِ زمزم
پُر فسوں ظلمتوں میں پُر افشاں

جادوئے آذری و خوابِ صنم
دھندلی اونچی فضاؤں میں غلطاں
زلفِ حوا و دامنِ آدم
شست کوندے کی طرح لرزش میں
روحِ غفلت پہ ذہن کا پرچم
تیرگی اس حصار [illegible] کے مانند
ہر نفس ہو رہا ہو جیسے مدغم
یوں فضاؤں پہ سرگرانی سی
حمل سے جیسے وحشتِ مریم
ابروئے ذوقِ آفرینش میں
ایک دھندلے ہلال کا سا خم
ایک کھوئے ہوئے سے جادے پر
ایک رکتی ہوئی صدائے قدم
ایک اندازہ سا نہ ظن نہ یقیں
ایک ابہام سا نہ بیش نہ کم
ایک عالم بغیر لیل و نہار
ایک پیماں بغیر "لا" و "نعم"
اک تپاں حرفِ نارسیدہ بلب
ایک لرزاں نگینہ بے خاتم
ایک چشمک سی بے مقام و جہت
اک تمنا سی مخفی و مبہم
ایک تعمیر بے در و دیوار
ایک تشکیل بے حدوث و قدم
اک حکایت بغیر گوش و زباں

اک کتابت بغیر لوح و قلم
ایک نادیدہ معتزہ، بے ناخن
ایک آوارہ راز، بے محرم
اور اس آوارہ راز کے اندر
قلبِ خالق کی جنبشِ بہم

سین (۲)

عدم سے وجود کی جانب

(ایک دھندلکے کا سماں ہے)

چاروں طرف سکوت بہہ رہا ہے۔ گاہ گاہ وجہِ ذوالجلال سے ایک کرن سی پھوٹتی اور گرد و پیش کے سہانے پن میں گم ہو جاتی ہے۔ خدا کے جسم میں رہ رہ کر ایک تشنج کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اسے بار بار دورہ پڑتا ہے۔ اور وہ ہر بار تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے کہ ایک شدید ہیجان کے عالم میں جھُرجھُری لیکر خدا اپنا داہنا ہاتھ پوری قوت سے بلند کر کے آواز دیتا ہے۔

خدا کی پہلی آواز

اے مری تخئیل بن جا کائناتِ ہست و بود
ہاں پہن لے جذبۂ ایجاد تشریفِ وجود
اے عدم اٹھ گامزن ہو شکلِ موجودات میں
اے مرے اجمال آجا رنگِ تفصیلات میں
ہاں مجسم حسن ہو جا اے مرے دل کی ترنگ
اے نویلی سادگی بن جا نگارِ آب و رنگ
محملِ اسمار میں آ جا، لیلیٰ وجہِ جمیل
پردۂ اشکال میں چھپ جا مری روحِ جلیل
حلقۂ امکاں میں در آ اک نئے انداز سے
اے مری ذات اپنے دامن کو جھٹک کر ناز سے
اے مرے ہیجان بن جا کارگاہِ این و آں
معرضِ ہستی میں آ جائے زمیں اے آسماں

(یہ کہتے ہی خدا کو پھر شدت کے ساتھ جھُرجھُری آتی ہے۔ وہ اپنے جسم کو جھٹکتا، اور اس زور سے جھٹکتا ہے کہ اُس کے ہر بُن مُو سے ایک آنچ سی نکلنے لگتی ہے۔ آنچ میں اتنی ہی سرعت کے ساتھ گردش کرتی ہوئی بے شمار چنگاریاں کانپنے لگتی ہیں، اور کانپتے کانپتے پورے نظامِ شمسی کی شکل اختیار کر کے توازن، تطابق، حرکت و حرارت اور رنگ و نور کے ایک تابناک عالم میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ خدا اِس منظر کو اس تھکے ہوئے لیکن مسرت انگیز سکون کے ساتھ دیکھتا ہے جو کسی درد کے رفع ہونے

کے بعد محسوس ہوا کرتا ہے۔ وہ مسکراتا ہے،
دوبارہ مسکراتا ہے، اور پھر ایک ایسی
رستگاری آمیز تسکین کے ساتھ قہقہہ
لگا کر دفعتاً نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا
ہے، جو کاندھے سے کوئی زبردست
وزن گرا دینے کے بعد حاصل ہوا کرتی ہے

منظر (۲)

خلقت کے ایک مدتِ دراز کے بعد

خدا پہلی بار عرش کا دریچہ کھول
کر خیر آباد کرۂ ارض پر نگاہ ڈالتے ہوئے
ارشاد فرماتا ہے،

سین (۱)

یہ رباطِ حسن و خوبی، یہ بساطِ رنگ و بو
یہ سرورِ لالہ و گل، یہ سرودِ آبِ جو
یہ شگوفے، یہ ستارے، یہ بگولے، یہ حباب
یہ بیاباں، یہ بہاراں، یہ سمندر، یہ سراب
یہ ربابِ دورِ گل، یہ نغمۂ بادِ مراد
یہ خروشِ قلزم و طوفاں، یہ جوشِ ابر و باد
یہ فلک کی تازہ کاری، یہ فضا کی دلکشی
یہ گھٹا، یہ دھوپ، یہ کہرا، یہ مینہ، یہ چاندنی
یہ خنک شاداب شاخیں پھول برساتی ہوئی
ندیاں یہ بن کے اندر پیچ و خم کھاتی ہوئی
صبح کی یہ نور دوڑاتی ہوئی قدریں رواں
شام کی یہ گرد میں لپٹی ہوئی تاریکیاں
یہ قمر، یہ کہکشاں، یہ کوہ، یہ وادی، یہ بن
بن کے اندر یہ گجر آبِ رواں کا بانکپن
یہ صبح و نرم تبسم، یہ سہانے بوستاں
یہ سلونے خوشے پیچے، یہ ساون تاریکیاں
معرضِ جنبش میں یہ کھلتی ہوئی کلیوں کا رنگ
رنگ کے ہیجان میں یہ پھول بننے کی امنگ
پرفسوں یہ دشت پُراسرار یہ پست و بلند
تیرگی میں ہے حقیقت روشنی میں ارجمند
یہ شبِ مہتاب و ورد ابر و فصلِ برشگال
یہ خرامِ جو، یہ موجِ سبزہ، یہ بادِ شمال
یہ ضیائے بحر و بر، یہ جلوۂ کوہ و کمر
کس قدر ضوبار ہے یہ عالمِ شمس و قمر!

یہ کہہ کر خدا ٹھہر جاتا ہے — اور پھر
کچھ رکتی سی آواز میں کہتا ہے۔

کس قدر ضوبار ہے یہ عالمِ شمس و قمر!!

اور پھر کچھ سوچ کر دوبارہ دھیمی آواز
سے ارشاد فرماتا ہے،

کس قدر ضوبار ہے یہ عالمِ شمس و قمر!!!

یہ کہتے ہی خدا کی آنکھیں خاکدان
کے سینے میں پیوست ہو جاتی ہیں اور
وہ طرفۃ العین میں یہ معلوم کر کے کہ
سینۂ ارض کے اندر کیا تمنائیں کروٹیں لے

رہی ہے۔ پھر کہنا شروع کرتا ہے:-

خاک کی تمنّا

لے رہے ہیں کروٹوں پر کروٹیں سیل و نہار
ہاں میں سمجھا اس کرے کو ہے کسی کا انتظار
آرزو یہ کس کے نغموں کی ہے؟ یہ کیا راز ہے
خاک کا ایک ایک ذرہ گوش بر آواز ہے
وہ ثباتِ کوہساراں ہو کہ رقصِ آبِ جو
دہر کی ہر چیز کا دل ہے شہیدِ آرزو
اک جھلک سی ہو رہی ہے قلبِ موجودات میں
ایک پرتو سا ہے غلطاں سینۂ ذرات میں
یہ جو ہوتی ہے دھمک رہ رہ کے نبضِ تاک میں
اپنے ساقی کی یہ حسرت ہے بطونِ خاک میں
ایک اک تار ہے نغمے شوق کے گاتا ہوا
اشتیاقِ دید میں پلکیں سی جھپکاتا ہوا
ایک اک ساعت میں غلطاں ہے فراغِ آرزو
وقت کے سینے میں ہے روشن چراغِ آرزو
قلب کی حاجت ہے اک بے چین سینے کے لئے
یہ انگوٹھی تلملاتی ہے نگینے کے لئے

صدا کی یہ آواز سنتے ہی ذرات
بگولوں کی شکل میں آسمان کی جانب
بلند ہونے لگتے ہیں۔ پنکھڑیوں کی
جتنوں میں ایک گہرا رنگ دوڑنے
لگتا ہے۔ دریاؤں کی روانی میں
تیزی آجاتی ہے، اور درخت ایک
بارگی جھومنے لگتے ہیں۔ اور صحرا
نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

ارادۂ تخلیقِ انسان

خدا کرسی پر متمکن ہے۔ جس کے
ذہن میں انسان کا ہیولیٰ غلطیدہ ہے
سامنے کرۂ ارض کا پرتو فضا میں کانپ
رہا ہے، اور خدا اس تمنا سے بے چین
پرتو کی طرف آنکھیں اٹھا کر بڑی
گرم جوشی کے ساتھ ارشاد فرماتا ہے:

ہاں میں بخشوں گا اسے انسان سے تابندگی

کہ اتنے میں چند جھجکتے ہوئے قدموں
کی چاپ محسوس ہوتی ہے۔ خدا
ناخوش گواری کے ساتھ ادھر گردن
موڑتا ہے، اور دیکھتا ہے کہ چند
فرشتے سروں کو جھکائے اور ہاتھوں کو
جوڑے ادب اور خوف کے ساتھ بڑھتے
چلے آرہے ہیں،
جنہیں دیکھ کر خدا کہتا ہے۔

کیا ہوا، اس احتجاجی شکل سے آئے ہو کیوں؟

وا ایک نسبتاً معمر فرشتہ
آگے بڑھ کر،

فرشتوں کا اعتراض

خانہ زادوں کے دلوں پر یہ پڑا ہے عکس ابھی
خلقتِ انساں پہ مائل ہے دماغِ داوری
بارگاہِ نور میں حاصل ہو کیوں ظلمت کو بار
ہم تری تسبیح کو کیا کم ہیں اے پروردگار
اِن پہ اشکوں کی نمی ہے ان پہ سجدوں کے نشاں
یہ ہماری داڑھیاں ہیں دیکھ یہ پیشانیاں
ماسوا اس کے ضمیرِ آب و گل میں ہے جنوں
خاک پر تیری بہائے گا شقی انسان خوں
اُس کے نیزے لوٹ جائیں اور علم پیرے گڑیں
یہ اسی دُھن میں ہلا دے گا پہاڑوں کی جڑیں
ہر عمل اس کا بنے گا اک زبوں ردِّ عمل
اے خدا لاشوں سے پٹ جائیں گے یہ دشت و جبل
پھول روندے جائیں گے پودے اکھاڑے جائیں گے
سینہ ہائے بحر و بر بھنبھوڑے پھاڑے جائیں گے
کاٹ دے گی خون کے رشتوں کو تیغِ شعلہ رُو
بھائی کی تلوار سے بھائی کا ٹپکے گا لہو
حشر تک برپا رہے گا کشتِ جاں میں تخمِ شر
اور کبھی انجام سے بھی یہ نہ ہوگا بہرہ ور
پہلے تو فقرے کسے گا یہ تری آیات پر
اور ہنسے گا پھر یہ خود تیری مقدس ذات پر
دھوپ سنولا جائے گی اور چاندنی کھو جائے گی
ظلمتوں کے پالنے میں روشنی سو جائے گی

طبعِ عالی پر گرانی ہو گی بے حد و حساب
فتنۂ خوابیدہ کو رہنے بھی دے مصروفِ خواب
پھر وہی ہم عرض کرتے ہیں بچشمِ اشکبار
ہم تری تسبیح کو کیا کم ہیں اے پروردگار
اِن پہ اشکوں کی نمی ہے ان پہ سجدوں کے نشاں
یہ ہماری داڑھیاں ہیں دیکھ یہ پیشانیاں

یہ سنتے ہی خدا بگڑ کر
جواب دیتا ہے

معترض فرشتوں کو خدا کا جواب

اے کہ رہتے ہو سدا اپنی ہی آوازوں میں گم
مشورہ دینے کی خاطر مجھ کو او آئے ہو تم
تم ازلی اسرار کو پہچان سکتے ہی نہیں
جو ہے میرے علم میں تم جان سکتے ہی نہیں
ربط بھی معلوم ہے آغاز میں انجام میں
جاؤ اور لگ جاؤ جا کر اپنے اپنے کام میں

یہ سنتے ہی فرشتے شرمندگی اور
خوف کے ساتھ الٹے قدموں بھاگتے
اور عرش کی سیڑھیوں سے اترتے ہی
زمیں پر گر جاتے ہیں۔

اور خدا دوبارہ خاطر کو جمع فرما کر
فضائیں کانپتے ہوئے کرۂ ارض کے
پرتو کی جانب آنکھیں اٹھا کر کہنا
شروع کرتا ہے :

ہاں میں بخشوں گا اسے انساں سے تابندگی
اور پھر دفعتاً معترض فرشتوں کا
خیال آتے ہی زیرِ لب
یہ فرشتے بھی ہیں کتنے کم نگاہ و کم سواد!
اور پھر سربلند فضا میں کانپتے
ہوئے کرۂ ارض کے پرتو پر نگاہیں
جما کر انساں سے بلند ترین امیدیں
وابستہ کر کے کہتا ہے،
ہاں میں بخشوں گا اسے انساں سے تابندگی
کون انساں؟ نازِ مخلوقات و فخرِ زندگی
کون انساں؟ فاتحِ کونین، امیرِ آب و گِل
سینۂ آفاق کا فرزندہ و بیدار دل
نورِ گیتی، مشعلِ افلاک، شمعِ انجمن
اک مجسم کج کلاہی، اک سراپا بانکپن
ناظرِ اوجِ نگاراں، ناظمِ ابر و چمن
ناظرِ موجِ بہاراں، ناقدِ سرو و سمن
مدعائے آسمان و مقصدِ روئے زمیں
مرکزِ اضدادِ عالم، محورِ دنیا و دیں
شارحِ آیاتِ ہستی، شارعِ دینِ حیات
قاضیِ شہرِ صفات و کاتبِ دیوانِ ذات
مکتبِ نور و حرارت، درس گاہِ خیر و شر
صاحبِ ناہید و رودت، راکبِ شمس و قمر
دوربینِ خشک و تر، معیارِ نقدِ مدح و ذم
خوردبینِ آب و گِل، میزانِ جنسِ کیف و کم
شاہِ گیتی، صاحبِ آفاق، دارائے حیات
ابرِ رحمت، وارثِ فطرت، رئیسِ کائنات
اک زمیں پرورِ محقق، اک فلک پیما حکیم
اک مقیاسِ تجمل، اک رصدگاہِ عظیم
آسماں کا داور و دارا، زمیں کا کج کلاہ
بر کا آقا، بحر کا مولا، فضا کا بادشاہ
دہر کی پیدا و پنہاں طاقتوں کا شہریار
نظم کا پیغامبر، آئین کا پروردگار
طُرفہ بازی گاہِ موجودات کا اسرارِ باز
اوج کا نباض، پستی کا طبیب و چارہ ساز
برق پیما ابلقِ شام و سحر کا شہسوار
جنبشوں کا میرِ لشکر، گردشوں کا تاجدار
عرصۂ تابش کی ضو رفتار فوجوں کا نشاں
بحرِ ظلمت کی سبک رو کشتیوں کا بادباں
روشنی کا نغمہ، فطرت کا سخن، حق کا پیام
مہر و مہ کا مقتدا، سرکش عناصر کا امام
عالمِ اسباب کی محرابِ اعظم کا چراغ
پیکرِ ارض و سما کے کاسۂ سر کا دماغ
چشمِ ہستی کی بصارت، زندگی کا راز داں
خامشی کا زمزمہ، گونگے حقائق کی زباں
خونِ گل دوڑائے گا جو ان خس و خاشاک میں
نفخ کر دوں گا خود اپنی روح جس کی خاک میں

○

رباعیات

کلیاں چٹکی ہیں مسکراؤ تم بھی
ہاں باندھ رہی ہے رات جوڑا اپنا
شاخوں میں لچک ہے رمساؤ تم بھی
ماتھے سے خنک لٹیں ہٹاؤ تم بھی

اس خاک میں خوابیدہ ہے روحِ عظمت
دزدیدہ نفس آ کہ ہے یہ مرقدِ پاک
اس گور میں دفن ہے سخن کی دولت
آرام گہہ جوشؔ علیہ الرحمت

اے پھول صبا ہمیشہ مہکائے تجھے
اس نیند بھرے لوچ سے للہ نہ چل
اے چاند کبھی گھٹا نہ سنولائے تجھے
ڈرتا ہوں کہیں نظر نہ لگ جائے تجھے

اِترا کے مرے حضور گردن نہ اُٹھاؤ
الوند و ہمالہ واعد ہو تو کیا
یہ بارگہہ بلند ہے ہوش میں آؤ
کیوں سامنے اے پستہ قدو آئے ہو جاؤ

تا اہلِ نظر قبر پہ موتی برسائیں
کہتا ہے مرا وطن کہ از راہِ کرم
خوبانِ صبیح و لالہ رخ پھول چڑھائیں
حضرت اب انتقال فرما جائیں!

ہم پیشہ و ہم راز سے لڑ بیٹھے ہیں
اللہ و شہنشاہ کا کیا ذکر اے جوشؔ
دل پرور و دمساز سے لڑ بیٹھے ہیں
ہم دل برِ طناز سے لڑ بیٹھے ہیں

جلتے دل کو ٹٹول دھیرے دھیرے
برہا میں برس رہی ہے پاپی برکھا
اگنی مندر کو کھول دھیرے دھیرے
کلموئی کوئلیا بول دھیرے دھیرے

قدرت سے کرے گی عقد نسلِ نو خیز — ہوگا مرے فرزند کا دل زمزمہ ریز
شمس و قمر و نجوم و عرش و کرسی — کل میری بہو آئے گی لے کر یہ جہیز

گیت

(۱)

نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

آکاش پہ بکھرا ہوا سورج کا ہے مکھڑا
اور دھرتی پہ اترے ہوئے چہروں کا ہے دکھڑا
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی

کب ہوگا سویرا؟ کوئی اے کاش بتا دے
کس وقت تک اے گھومتے آکاش بتا دے
انسان پر انسان کی بیداد رہے گی
نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی

چہکار رہے چڑیوں کی چمن گونج رہا ہے
جھرنوں کے مدھر راگ سے بن گونج رہا ہے
پر میرا تو فریاد سے من گونج رہا ہے
کب تک مرے ہونٹوں پہ یہ فریاد رہے گی
نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی

(۲)

نگری مری برباد ہے، برباد ہے، برباد
برباد ہے، برباد!

عشرت کا اُدھر نور، اِدھر غم کا اندھیرا
ساغر کا اُدھر دَور، اِدھر خشک زباں ہے
آفت کا یہ منظر ہے، قیامت کا سماں ہے
آواز دو انصاف کو، انصاف کہاں ہے؟
ماؤں کی کہیں گونج، کہیں نالہ و فریاد
نگری مری برباد ہے، برباد ہے، برباد
برباد ہے، برباد

ہر شے میں چمکتے ہیں اُدھر لاکھ ستارے
ہر آنکھ سے بہتے ہیں اِدھر خون کے دھارے
ہنستے ہیں، چہکتے ہیں اُدھر راج دلارے
روتے ہیں بلکتے ہیں اِدھر درد کے مارے
اک بھوک سے آزاد تو سو بھوک سے ناشاد
نگری مری برباد ہے، برباد ہے برباد
برباد ہے برباد

نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

اے چاند! اُمیدوں کو مری شمع دکھا دے
ڈوبے ہوئے کھوئے ہوئے سورج کا پتہ دے
روتے ہوئے جگ بیت گیا اب تو ہنسا دے
اے میرے ہمالہ! مجھے یہ بات بتا دے
ہوگی مری نگری بھی کبھی غیر سے آزاد
نگری مری، برباد ہے، برباد ہے برباد
برباد ہے برباد

نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

ناجانے کون؟

من مندر میں آتا ہے ——— ناجانے کون؟

(۱)

جب ہوتی ہے بھور
گاتے ہیں جب مور
تو من میں جوں چور
چپکے چپکے آتا ہے ——— ناجانے کون؟
من مندر میں آتا ہے ——— ناجانے کون؟

(۲)

بڑھتے ہیں جب سائے
تاروں کو چھلکائے
تو ہردے میں ہائے
چٹکی سی لے جاتا ہے ——— ناجانے کون؟
من مندر میں آتا ہے ——— ناجانے کون؟

(۳)

جب ہوتی ہے رات
گاتی ہے برسات
جی کرتا ہے بات
جب دل میں مسکاتا ہے ——— ناجانے کون؟
من مندر میں آتا ہے ——— ناجانے کون؟

---

(۱۰)

سنبل و سلاسل

(نظمیں)

رفیقۂ حیات سے

اے مری شمعِ شبستاں، تیرے دل میں اور یہ بات
یعنی اب کم ہو چلا ہے تجھ سے میرا التفات

پڑ چلا ہے تیرے چہرے پر جو عکسِ ماہ و سال
اُس نے مجھ کو میرے دل میں کر دیا ہے پائمال

الاماں، بندے کی فطرت سے اور اتنا سوءِ ظن
اے امینِ پاک فطرت، اے رفیقِ پاک تن

تو مرے بچوں کی ماں ہے میرے گھر کی روشنی
اور بہو ہے تو مرے خلد آشیاں ماں باپ کی

تو ہے ضامن میرے ہر آغاز ہر انجام کی
تجھ پہ ہے بنیاد میری نسل میرے نام کی

رہتی ہے تو نے نہ جانے کتنے طوفانوں میں ناؤ
تیرے دل میں کس قدر ہیں میرے رومانوں کے گھاؤ

میری رنگینی کے ہاتھوں مدتوں شام و سحر
تیرے دل سے خون کی ٹپکی ہیں بوندیں کس قدر

میری شب گردی کے طوفانوں میں اے شمعِ حرم
نوح کی کشتی سے بڑھ کر تو رہی ثابت قدم

تیرے چلتوں لیکن اے شائستۂ صد احترام
میں نے کتنے توڑ ڈالے ہیں گھنی زلفوں کے دام

اور بے بنیاد ہے یہ بھی ترا وہمِ کمال
یعنی اپنے کو سمجھتا ہوں میں اب تک نوجواں

سچ ہے میں کم عقل ہوں لیکن مری شمعِ حسیں
نوجواں اپنے کو سمجھوں اس قدر احمق نہیں

وقت کے سفاک دھارے کو پکڑ سکتا ہے کون
سیلِ ماہ و سال سے دنیا میں لڑ سکتا ہے کون

وہ مہکتی رات، وہ جھپتی کہانی، ہائے ہائے
نوجوانی، نوجوانی، نوجوانی، ہائے ہائے

جا چکا ہے کاروانِ عہدِ گل دور اس قدر
اب تو اُس کی گرد بھی آتی نہیں مجھ کو نظر

نور میرا وقت کے قدموں کے نیچے سے دو نیم
مدتوں سے اب تو اپنی تیرگی میں ہوں مقیم

لیکن اس دل میں مرے پنہاں ہے اک طفلِ عجیب
دور ہے جو اوجِ تمکیں سے تلاطم سے قریب

طفل ہو کر مجھ سے نکتہ رس کو بہکاتا ہے وہ
مجھ کو پھسلا کر بُری راہوں پہ لے جاتا ہے وہ

بلبلا اٹھتا ہے شیرینی کے دونوں کے لئے
ایڑیاں اکثر رگڑتا ہے کھلونوں کے لئے

جھل جھلاتے پھول سے کپڑے منگا دو جوش خاں
لال لال آئینے، لچکے کی دو پلی ٹوپیاں
ہم نہیں کچھ جانتے اُوں اُوں ابھی لادو ہمیں
ہنستے ہوئے، بولتی گڑیاں، چہکتی بلبلیں
ناؤ میں بیٹھیں گے ریلوں میں ہوا کھائیں گے ہم
نہر پہ ناچیں گے میلے دیکھنے جائیں گے ہم
کیا تمہارا جاتا ہے، گھر کو نہیں ٹوکو نہیں
حوض میں ننگے نہائیں گے، ہمیں روکو نہیں
اپنا کرتا پھاڑ ڈالیں گے، پچھاڑیں کھائیں گے
جائیں گے ہم جائیں گے ہم اُس گلی میں جائیں گے"

عیب طفلانہ کچھ ایسا بدنما ہوتا نہیں
کوئی بچوں کی شرارت پہ خفا ہوتا نہیں

ہاں مگر اس کا یقیں کرلے جو کچھ کہتا ہوں میں
دیر تک تجھ سے کبھی غافل نہیں رہتا ہوں میں

اب بھی تاباں ہے مرے سینے میں تیرا آفتاب
اب بھی دل میں بج رہا ہے دورِ ماضی کا رباب

سینۂ ارض و سما کا وہ تلاطم یاد ہے
وہ تکلّم، وہ ترنّم، وہ تبسّم یاد ہے

اب بھی میرے سر پہ اک بدلی سی ہے چھائی ہوئی
خون میں شادی کی شہنائی ہے لہرائی ہوئی

آج بھی جوشِ طرب کی وہ روانی یاد ہے
آرسی مصحف کی وہ انجم فشانی یاد ہے

ڈوب ہی سکتا نہیں تا عمر جس کا آفتاب
تیرے رخساروں کے پردے میں ہے وہ صبحِ شباب

عطر اور اُبٹن سے تھا جو کل چمن اندر چمن
اب بھی نظروں میں ہے تیرا وہ عروسی بانکپن

یادِ ماضی سے جو سرشار ہے عرق اُس کو نہ کوس
یہ تو ہے آغاز کی بھیگی ہوئی راتوں کی اوس

آج تک ہر جلوہ میرے دل کے آئینے میں ہے
کل تھی جو بالوں پہ افشاں آج وہ سینے میں ہے

میرے سینے میں وہ افشاں اب خرامِ گنگ ہے
جس میں تاروں کی چمک، قوسِ قزح کا رنگ ہے

آئینے کے سامنے کھلتی ہیں جب زلفیں تری
اپنے سہرے کی مہک آتی ہے مجھ کو آج بھی

کیوں ہے لٹ کی اس سفیدی سے ترے دل میں کسک — یہ تو ہے دھندلے سہانے خیطِ ابیض کی جھلک
ایک مبہم سی سفیدی سے نہ ہو یوں بدگماں — یہ تو گذری چاندنی راتوں کی ہیں پرچھائیاں

راست گوئی ہے مرا ایماں کہ انساں زادہ ہوں
کل تھا جیسا، آج بھی ویسا ترا دل دادہ ہوں

(فروری سنہ ۱۹۴۴ء)

مستقبلِ ہندوستان

کچھ ایسا آج گردوں کا سماں معلوم ہوتا ہے — کہ عکسِ آتشِ رطلِ گراں معلوم ہوتا ہے
یہ جنبش کس کے لعلِ شکریں کو ہے کہ سناٹا — نشیدِ شاعرِ جادو بیاں معلوم ہوتا ہے
یہ کس نے چونک کر انگڑائی لی ہے آسمانوں پر — زمیں کا ذرہ، ذرہ پرفشاں معلوم ہوتا ہے
اٹھایا ہے یہ کس نے جھٹ پٹے کا طرفہ آئینہ — تبسم کارواں در کارواں معلوم ہوتا ہے
یہ جوڑا کس نے باندھا ہے نشیلی انکھڑیاں مل کر — فضا میں داورِ پیرِ مغاں معلوم ہوتا ہے
یہ کس کے تشقۂ رنگیں کا پرتو ہے کہ ہر ذرہ — چراغِ محفلِ روحانیاں معلوم ہوتا ہے
جھپکتی ہیں یہ کس کی مدبھری آنکھیں ستاروں میں — جہاں مستِ شرابِ ارغواں معلوم ہوتا ہے
یہ کس کمسن نے باہیں ڈال دی ہیں گرم جوشی سے — جہاں باوصفِ پیری نوجواں معلوم ہوتا ہے
یہ کس کے روئے ناشستہ کا ہے رنگِ تنک تابی — افق پر اک سنہرا سا دھواں معلوم ہوتا ہے
لٹیں جنبش میں ہیں بادِ صبا یہ کس کے ماتھے پر — یقیں کی شمع پر دودِ گماں معلوم ہوتا ہے
یہ افشاں کس نے چھڑکی ہے طلسمی شبستاں پر — کہ ہر خوشہ جواہر کی دکاں معلوم ہوتا ہے
ترانے ہیں یہ کس دنیا کے جسم آبشاروں کے — تخیل موجۂ آبِ رواں معلوم ہوتا ہے
صبا یہ کس کی زلفِ خم بہ خم کو چھیڑ آئی ہے — زمانہ داستاں در داستاں معلوم ہوتا ہے
ہوا نے یہ اڑایا ہے عبیر اکس کی نوائی کا — کہ عالم اک فسونِ کہکشاں معلوم ہوتا ہے
یہ زریں غرفۂ مشرق سے سکھڑا کس کا دمکا ہے — دھندلکا موجِ رنگِ پرنیاں معلوم ہوتا ہے
یہ کس نے بربطِ زریں اٹھایا ہے کہ اک عالم — غزل خواں، گل چکاں، گوہر فشاں معلوم ہوتا ہے
خراماں یہ ہوا ہے کون شوخ و شنگ بستاں میں — چمن رقصاں رواں جھوماں رواں معلوم ہوتا ہے

بحمداللہ کہ جوش اس صبحِ نو کی تازہ کاری میں
مجھے مستقبلِ ہندوستاں معلوم ہوتی ہے

(مارچ سنہ ۱۹۴۶ء)

اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من   اے جانِ من
اے نورِ بزمِ این و آں
اے انجمِ چرخِ مکاں
اے شمعِ محرابِ زماں
اے مشعلِ طاقِ زمن
اے جانِ من   اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من   اے جانِ من
اے صدرِ بزمِ رنگ و بو
اے صبحِ دیر و شامِ جُو
اے دلبرِ آئینہ رُو
اے خسروِ شیریں سخن
اے جانِ من   اے جانِ من

جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من   اے جانِ من
مکھڑا ترا نورِ حرم
آنکھیں تری بیت الصنم
تیرا ہر اک نقشِ قدم
نسریں، بنفشہ، نسترن
اے جانِ من   اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من   اے جانِ من
اے لعلِ بحرِ مدعا
اے دولتِ رنگ و صدا

اے جوہرِ گیتی بہا
اے گوہرِ گردوں ثمن
اے جانِ من اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من اے جانِ من
جادو نگاہ و خوش بیاں
مہتاب پارو خورفشاں
عنبر فروش و مے چکاں
گوہر جبیں و گل بدن
اے جانِ من اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من اے جانِ من
اُمڈی ہوئی انگڑائیاں
کھلتی ہوئی رعنائیاں
اُف رے تری برنائیاں
اللہ رے تیرا بانکپن

اے جانِ من اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من اے جانِ من
اے مقصدِ ناز و ادا
اے چشمۂ رقص و غنا
اے شاہدِ ابر و صبا
اے دلبرِ گنگ و جمن
اے جانِ من اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من اے جانِ من
اے بحر میں غلطاں گہر
اے نہر میں رقصاں قمر
اے دل کو برماتی نظر
اے اوس میں ڈوبی کرن
اے جانِ من اے جانِ من
جانانِ من

اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من　　اے جانِ من
آئین سے اے مہکی بنی
اے سانس لیتی چاندنی
اے رس میں ڈوبی پدمنی
اے نیند کی ماتی دلہن
اے جانِ من　　اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من　　اے جانِ من
روشن رخِ گل گوں ترا
دیکھو جسے مفتوں ترا
ہر دل پہ ہے افسوں ترا
تو بت ہے دنیا برہمن
اے جانِ من　　اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من　　اے جانِ من
بر میں شلوکا تنگ ہے
کلیوں کا جس میں رنگ ہے
ہر پھول جس سے دنگ ہے
گل ہے چراغِ یاسمن
اے جانِ من　　اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من　　اے جانِ من
اے شوخیٔ بادِ صبا
اے جنبشِ رنگِ حنا
اے آہوئے دشتِ خطا
اے دولتِ مشکِ ختن
اے جانِ من　　اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من

جانانِ من — اے جانِ من
دھومیں تری اے شعلہ خو
خانہ بخانہ کو بہ کو
خم تیرے قد کے رو برو
شمشاد و سرو و نارون
اے جانِ من — اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من — اے جانِ من
اے یارِ عالم آشنا
اے تیغِ مرہم آشنا
اے مہرِ شبنم آشنا
اے جوئے خوں، نہرِ لبن
اے جانِ من — اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من — اے جانِ من
قوسِ قزح ابروئے تو

شامِ اودھ گیسوئے تو
صبحِ بنارس روئے تو
اے ماہِ نسریں پیرہن
اے جانِ من — اے جانِ من
جانانِ من
اے جانانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من — اے جانِ من
اے بوئے گلہائے ارم
اے خوئے بادِ صبح دم
اے اوجِ عمرِ تازہ دم
اے موجِ صہبائے کہن
اے جانِ من — اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من — اے جانِ من
اے معدنِ لعل و گہر
اے مخزنِ شمس و قمر
اے معبدِ شام و سحر

اے کعبۂ سرو و سمن
اے جانِ من   اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من   اے جانِ من
انکار میں زخمِ نہاں
اقرار میں درمانِ جاں
رفتار میں آبِ رواں
رخسار میں صبحِ چمن
اے جانِ من   اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من   اے جانِ من
آواز میں نازِ نمو
انداز میں چاک و رفو
آغاز میں جام و سبو
انجام میں دار و رسن
اے جانِ من   اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من   اے جانِ من
سر پر دو شالا سُرمئی
پیکر میں جوڑا اگرئی
لب سُرخ پنڈا چمپئی
کالی لٹیں، گورا بدن
اے جانِ من   اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من   اے جانِ من
اس آیتِ انوار سے
اس مصر کے بازار سے
اس روئے گوہر بار سے
برخیز و بُرقع برفگن
اے جانِ من   اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

اے جانِ من
اے جانِ من
جانانِ من   اے جانِ من
جو دے مجھے انمول دے
تا دُور موتی رول دے
شانوں پہ اب تو کھول دے
زلفِ شکن اندر شکن
اے جانِ من   اے جانِ من
جانانِ من
اے جانِ من

رُباعیات

لیلائے سخن کو آنکھ بھر کر دیکھو
قاموس و لغات سے گذر کر دیکھو
الفاظ کے سر پہ ہیں اُڑتے معنی
الفاظ کے سینوں میں اُتر کر دیکھو

آخر کس اُمید پر کنایات و نکات
کیوں لب پہ نہ لاؤں یہ گرجتے کلمات
اُونچا نہ اگر تمہیں سنائی دیتا
میں غنچہ و شبنم کی طرح کرتا بات

غصب و غیبت کے شغل میں دن رات
ایمان کو دے چکے ہیں سو مرتبہ مات
وہ جام اُٹھانے پہ خفا ہوتے ہیں
جو لوگ اُٹھا چکے ہیں اللہ پہ ہات

اے خواب بتا یہی ہے باغِ رضواں
حوروں کا کہیں پتہ نہ غلماں کا نشاں
اک کنج میں خاموش و ملول و تنہا
بے چارے ٹہل رہے ہیں اللہ میاں

فِکر ہمارے غرفۂ دیں کو نہ تھوپ
بَل کھائیں گے مجتہد بگڑ جائیں گے پوپ
یہ کہتی چلی آتی ہیں لاکھوں عقلیں
پہنے ہوئے آبا کے پرانے کنٹوپ

غاروں کو جو ذراتِ عمل سے پاٹے
وہ صاحبِ اوج خاک کیوں کر چاٹے
قدرت کا اَزل سے ہے یہ حکمِ ناطق
جو تخم پسینہ بوئے، دریا کاٹے

چاندی کا ورق ہے یا گہربار جبیں
خونِ شعراء کا روئے گل گوں پہ ہے رنگ
ارباب قلم کے مُلک ہیں زیر نگیں
کیوں قبلۂ عالم آپ ناشر تو نہیں!

تُو، اور سپرِ مخبری و عزمِ وغا!
آنکھوں سے تری ایک شکاری کُتّا
یہ بات غلط ہے گدائے مردِ خدا
آ آ کے مجھے سونگھ رہا ہے یہ کیا؟

تیار رہوں آپ، کم نگاہی کے لیے!
میں نے حضرت سے کل جو کی تھی نیکی
آمادہ ہوں اور میری تباہی کے لئے!!
آج آیا ہوں اس کی عذر خواہی کے لئے

ابرو میں لچکتی ہے سخاوت کی کمان
یوں کرتے ہیں اعترافِ احساں کچھ لوگ
چہرہ کہتا ہے دیکھ یہ خلق کی شان
گویا محسن پہ کر رہے ہیں احسان

آنکھوں میں یہ طمطراق، رخ پہ یہ ترنگ
حالانکہ ترے رُخ پہ ہے اے خسروِ زشت
یہ چال کہ جس سے دنگ ہو موجۂ گنگ
ناداروں کے چہروں کا اُڑایا ہوا رنگ

یہ بھی ہے تمدن کی نرالی اک شان
ہاں بینک کے اس آہنی پھاٹک کو تو دیکھ
سُلطان گدا ہے، گدا ہو سُلطان
چاندی مسند نشیں ہے، لوہا درباں

گا گا کے سُنا رہے ہیں شاعر کو زبور
سُوکھے ہوئے گڑ کی ایک پُڑیا لے کر
جس میں ہے فقط شمعِ حرم شعلۂ طور
آئے ہیں شکر کے کارخانے میں حضور

ہر چند مفکر نہ محقق ہوں میں
اے ... کھلے آسمان شاہد رہنا
جولاں گہِ ہر یقینِ واثق ہوں میں
اس ٹھوس زمین کا مصدّق ہوں میں

اک فتنہ ہے ناقصوں میں کامل ہونا　　　اک قہر ہے وابستۂ منزل ہونا
تاریخ کے اوراق جو اُلٹے تو کھلا　　　اک جرم ہے احمقوں میں عاقل ہونا

عفریت، خبیث، دیو، اژدر، شیطاں　　　درویش، اقطاب، امام، مرسلِ یزداں
گیتی، گردوں، بہشت، دوزخ، اعراف　　　یہ سب ہیں مرے دل میں خروشاں تپاں

میداں راتوں کو جب کہ ہوتے ہیں سیاہ　　　ہو جاتی ہے حیرت یوں فضاؤں میں نگاہ
خود اپنے پہ ہوتا ہے گماں بعض اوقات　　　جیسے کوئی اجنبی ہے میرے ہمراہ

اک دفترِ واقعات گویا ہوں میں　　　لوحِ اشکال و ظرفِ اسما ہوں میں
ہر شخص کا نام، چہرہ، گھر یاد رہے　　　انساں نہیں حافظے کا پیپا ہوں میں

صحرا سے گذرتے ہوئے دریا نے کہا　　　قلزم مجھے دیکھے گا تو ڈر جائے گا
قلزم نے جو دیکھا تو کہا نرمی سے　　　سو جاؤ۔ بہت تھکے ہوئے ہو بیٹا

پھر درد بھرے گیت خموشی نے سنائے　　　پچھلے پہر رات کے در و بام پہ سائے
بیتے لمحے وہ تیر جوڑے ابھرے　　　بھولے چہرے وہ آ گئے ڈنک اٹھائے

اب نالہ و فریاد نہیں کرتی ہو　　　اب مجھ سے کچھ ارشاد نہیں کرتی ہو
اُس دور کو جب تمہیں تھی خود چاہ مری　　　بھولے سے بھی اب یاد نہیں کرتی ہو

ہر گام پہ ہے جنگ و جدل کی وادی　　　ہر موڑ پہ ہے امن و اماں فریادی
آہ اے عہدِ جہل و عصرِ وحشت　　　افسوس ہے اے جوش یہ صبح آزادی

(۱)

سیف و سبو

(نظمیں)

شام کا رومان

ہوائے شام جب بھرتی ہے ٹھنڈی سانس صحرا میں
مجھے ہر ایک پتی نوحہ خواں معلوم ہوتی ہے

فضائے نرم پر جس وقت چھا جاتا ہے سناٹا
مجھے جنبش میں ذرّوں کی زباں معلوم ہوتی ہے

سمٹتی ہے سفر سے جب گھنے جنگل کے سائے میں
ہوائے سرد میری ہم زباں معلوم ہوتی ہے

بلند و پست و آب و رنگ جب کچھ بھی نہیں رہتا
یہ دنیا صرف اک وہم و گماں معلوم ہوتی ہے

ٹپک پڑتا ہے جب خورشید آنسو بن کے گردوں سے
لبِ جاں پر صدائے الاماں معلوم ہوتی ہے

دلِ وادی سے اُٹھتا ہے دھواں جس وقت ہلکا سا
پہاڑوں کی بلندی سرگراں معلوم ہوتی ہے

چھپا لیتی ہے خشک و تر کو جب شام اپنے دامن میں
بشر سے رُوحِ عالم بدگماں معلوم ہوتی ہے

جھجکتا اُٹھتا ہے جب پہلا ستارہ بامِ گردوں پہ
کلیجے پر مجھے نوکِ سناں معلوم ہوتی ہے

فرازِ چرخ پر رہ رہ کے جب کوندا لپکتا ہے
اُداسی کارواں در کارواں معلوم ہوتی ہے

شفق کو دیکھتے ہی وہ محبت جس کو جگ بیتا
مرے دکھتے ہوئے دل میں جواں معلوم ہوتی ہے

اندھیرے میں لبِ ساحل جو پتے کھڑکھڑاتے ہیں
مجھے گیرائیِ فصلِ خزاں معلوم ہوتی ہے

زمین و آسماں جب ظلمتوں میں ڈوب جاتے ہیں
حیاتِ نوعِ انساں رائیگاں معلوم ہوتی ہے

شفق کے ہر نفس اڑتے ہوئے اوراقِ زریں میں
مجھے بے تابیِ عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے

دیا کچھ فاصلے پر ٹمٹما اُٹھتا ہے جب بن میں
سیاہی، روشنی کی رازداں معلوم ہوتی ہے

ریتیلی[1] ڈھال پر انگڑائی لیتا ہے اک افسانہ
ندی کے موڑ پر اک داستاں معلوم ہوتی ہے

---

[1] ریتلے سے " ریتیلی " کے عوض - ریتلی - مجھے زیادہ اچھا لگتا ہے۔

برسات کی چاندنی

چرخ پر برسے ہوئے بادل کے ٹکڑے جا بجا
چاندنی، تالاب، سناٹا، پپیہے کی صدا

دشت پر چھائے ہوئے ذوقِ جنوں کے ولولے
چاند میں معصوم بچے کے تبسم کی ادا

فصلِ سرما میں سحر کو غسل کر چکنے کے بعد
رنگ ہو جیسے کسی معشوق کا نکھرا ہوا

سینۂ امواج میں سیال چاندی کی تڑپ
طاقِ گل میں قطرۂ شبنم کا چھوٹا سا دیا

نرم شاخوں کی لچک، سرشار ساحل کا سکوت
دشت کی خوشبو، فضا کی تازگی، ٹھنڈی ہوا

جاں ستاں کلیوں کے عقدے نور سے سلجھے ہوئے
دل رُبا میداں کا دامن اوس میں ڈوبا ہوا

موج زن ہے اتصالِ ماہ و جوئے تند میں
وہ طرب کا دورِ کرب افزا کہ تھا بھولا ہوا

موسمِ باراں کی رَو میں چاند شفاف و رقیق
مینہ کے چھینٹوں سے اترے آسماں پگھلا ہوا

کانپتی لہروں سے اُٹھتے ہیں نمو کے زمزمے
جھومتے پودوں سے آتی ہے جوانی کی صدا

لرزشِ صہبا میں جھلکے جس طرح نشے کی روح
چاند ہے اس طرح قلبِ آب میں ڈوبا ہوا

تعاقب

"مرد ہو عشق سے جہاد کرو
اب مجھے بھول کر نہ یاد کرو

دل سے بیتے دنوں کی یاد مٹاؤ
نہ تو اب خود ہی روؤ نہ مجھ کو رُلاؤ

بھول جاؤ کبھی سُنی باتیں
نہ تو وہ دن ہیں اب نہ وہ راتیں

اب نہ وہ موڑ ہیں نہ وہ گلیاں
اب نہ وہ پھول ہیں نہ وہ کلیاں

اب جہاں سے گزر چکی ہوں میں
اب یہ سمجھو کہ مر چکی ہوں میں

ایک دکھیا کو اور اب نہ ستاؤ
بن پڑے تو مری گلی میں نہ آؤ

مرد ہو، عشق سے جہاد کرو
اب مجھے بھول کر نہ یاد کرو!

میرے کانوں میں میرے سینے میں — گونجتی رہتی ہیں یہ آوازیں
جس طرف جاؤں دل بلاتی ہیں — یہ مرے ساتھ ساتھ جاتی ہیں
بادِ جاں بخش سے بگولوں سے — سخت کانٹوں سے نرم پھولوں سے
یہ صدائیں برابر آتی ہیں! — دل کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں

"بھول جاؤ کہی سنی باتیں!
نہ تو وہ دن ہیں اب نہ وہ راتیں!
مرد ہو عشق سے جہاد کرو
اب مجھے بھول کر نہ یاد کرو!"

تنگ آ کر جدھر بھی جاتا ہوں — ان صداؤں کو ساتھ پاتا ہوں
صحنِ گیتی سے اوجِ گردوں سے — تابِ انجم سے، آبِ جیحوں سے
بحرِ مواج کے حبابوں سے — حکمت و شعر کی کتابوں سے
شورشوں غلغلوں، دھماکوں سے — تیز رو گاڑیوں کے پہیوں سے
شعر گوئی سے، شعر خوانی سے — ہر حقیقت سے، ہر کہانی سے
چوڑی سڑکوں سے تنگ گلیوں سے — ہلتی شاخوں سے ہلتی کلیوں سے
شورِ جلوت، سکوتِ خلوت سے — جنبشِ ضو، جمودِ ظلمت سے
معبدوں سے شراب خانوں سے — مطربِ خوش نوا کی تانوں سے
بوئے عنبر سے بادِ صرصر سے — روئے خوباں سے رنگِ مرمر سے
قصرِ منعم سے، قبرِ مفلس سے — پائے طاؤس و چشمِ نرگس سے
جانِ گوہر سے، روحِ نسریں سے — موجِ سنبل سے اوجِ پرویں سے
باغ سے، مدرسے سے جنگل سے — تپتے سورج، برستے بادل سے
یہ صدائیں برابر آتی ، ہیں — دل کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں

"بھول جاؤ کہی سنی باتیں!
نہ تو وہ دن ہیں اب نہ وہ راتیں
ایک دکھیا کو اور اب نہ ستاؤ

بن پڑے تو مری گلی میں نہ آؤ
اب جہاں سے گزر چکی ہوں میں
تم یہ سمجھو کہ مر چکی ہوں میں
مرد ہو عشق سے جہاد کرو
اب مجھے بھول کر نہ یاد کرو!!"

ہنوز

سن کہ آئینۂ آغاز ہے انجام ہنوز
دل میں نشتر سا کھٹکتا ہے ترا نام ہنوز

تیری جانب سے نہ نامہ ہے نہ دعوت نہ پیام
اور یہاں ہے خلشِ نامہ و پیغام ہنوز

ہو چکی ہے ترے گھر میں سعادت طالع
اور مرے خانۂ تاریک میں ہے شام ہنوز

تجھ میں اب ولولۂ عیش و طرب ہے بیدار
اور یہاں غم پہ مُصِر ہے دلِ ناکام ہنوز

تیرے خلوت کدۂ ناز میں ہے چنگ و رباب
اور یہاں بزمِ تمنا میں ہے کہرام ہنوز

حسبِ اوقات مقرر ہے ترا رامش و رنگ
اور یہاں ایک ہے رنگِ سحر و شام ہنوز

پختہ کاری میں گرفتار ہے اب عقل تری
اور یہاں دل ہے اسیرِ ہوسِ خام ہنوز

رنگ چہرے کا اڑا تا ہے ترا ذکر اب تک
نیند آنکھوں سے چراتا ہے ترا نام ہنوز

اب تری شمع ہے اور خلوتِ محرابِ حرم
یاں چراغاں ہے سرِ رہ گذرِ عام ہنوز

تجھ کو اک عمر ہوئی بندِ وفا سے چھوٹے
جانِ محزوں ہے یہاں مرغِ تہِ دام ہنوز

پھر سے کھوئی ہوئی توقیر کے پانے والے
دیکھ تحقیر کے شایاں ہے مرا نام ہنوز

اب ترے سر پہ نہیں ابرِ ملامت کی گرج
اور میں ہوں ہدفِ ناوکِ دشنام ہنوز

خارج از بحث ہے اب تیرا گناہِ الفت
اور محبت کا مرے دل پہ ہے الزام ہنوز

ہو چکی ہے تری ناکردہ گناہی ثابت
اور مرے جرم کا ہے غلغلۂ عام ہنوز

داد دے اے مرے نو واردِ شہرِ ناموس
جوشؔ ہے کوچہ و بازار میں بدنام ہنوز

حیّ علیٰ خیر العمل

آ ہم نشیں، نمازِ صبوحی ادا کریں — خوشبوئے عود میں درِ میخانہ وا کریں
ہاں اُٹھ کہ ہر شیشۂ گل رنگ توڑ کر — انسانیت کو دامِ خرد سے رہا کریں
باقی جو بچ رہا ہے کچھ ایمانِ خیر سے — اُس کو بھی آج پائے صنم پر فدا کریں
پودے مچل رہے ہیں گھٹاؤں میں پُر خروش — آ، ہم بھی آج حقِ جوانی ادا کریں
بہکیں قدم قدم پہ چلیں جھوم جھوم کر — اتنا تو پاسِ خاطرِ موجِ صبا کریں
ساغر میں غرق کر کے لباسِ فریب کو — پیرانِ خرقہ پوش کے حق میں دعا کریں
ہر شے ہے پائے سیلِ مستی پہ سجدہ ریز — اور ہم نمازِ جام و صراحی قضا کریں
برسات کی گھٹاؤں سے برسیں گلابیاں — اور ہم وضوئے شستشوئے دست و پا کریں
گلشن کا ذرہ ذرہ پیئے بے دھڑک شراب — اور ہم خیالِ پُرسشِ روزِ جزا کریں
بہکے ہوا، رواں ہو فضا، مست ہو گھٹا — اور ہم خرد کو راہبر و رہنما کریں
گردوں پیالہ کش ہے تو گیتی قرابہ نوش — ہم اور اس بہار میں خوفِ خدا کریں

پی پی کے جھوم جھوم کے گا گا کے مثلِ جوشؔ
آ، دھوم سے عبادتِ آب و ہوا کریں

رباعیات

برسات کا حبس ہے چمن ہے بے ہوش — شاخوں میں لچک ہے نہ ہواؤں میں خروش
آپس میں ہے بات چیت گویا موقوف — اس طرح کھڑے ہوئے ہیں پودے خاموش

پہلو میں مرے دیدۂ پرنم ہے کہ دل — معبود! یہ مقیاسِ تپِ غم ہے کہ دل
ہو ذرہ بھی کم تو بال پڑ جاتا ہے — یہ شیشۂ ناموسِ دو عالم ہے کہ دل

یہ سلسلۂ لامتناہی ہے کہ زلف — گہوارۂ بادِ صبح گاہی ہے کہ زلف
اے جانِ شباب دوشِ سیمیں پہ ترے — ڈھلکی ہوئی رات کی سیاہی ہے کہ زلف

(۱۲۷)

سرود و خروش

(نظمیں)

ماتمِ آزادی

اے ہم نفس! فسانۂ ہندوستاں نہ پوچھ — رودادِ جام بخشیِ پیرِ مغاں نہ پوچھ
بربط سے کیوں بلند ہوئی ہے فغاں نہ پوچھ — کیوں باغ پر محیط ہے ابرِ خزاں نہ پوچھ
کیا کیا نہ گل کھلے روشِ فیضِ عام سے
کانٹے پڑے زباں میں پھولوں کے نام سے

شاخیں ہوئیں دو نیم جو ٹھنڈی ہوا چلی — گم ہو گئی شمیم جو بادِ صبا چلی
انگریز نے وہ چال بہ جور و جفا چلی — برپا ہوئی برات کے گھر میں چلا چلی
خونِ چمن بہار کے آتے ہی بہہ گیا
اُترا جو طوق اور بھی دم گھٹ کے رہ گیا

جھومی گھٹا، فضا شرر آمیز ہو گئی — کھولی خوشی نے زلف غم انگیز ہو گئی
مچلی نسیمِ عقل، جنوں خیز ہو گئی — سائے میں دھوپ اور بھی کچھ تیز ہو گئی
پارا، چلی جو سرد ہوائیں تو چڑھ گیا
درماں ہوا تو دردِ جگر اور بڑھ گیا

اک دل نشیں کلی جو سرِ باغ کھل گئی — تو خاک میں لطافتِ گلزار مل گئی
پہنی قبائے نرم تو جلد اور چھل گئی — ٹھہرا جو دل تو صبر کی بنیاد ہل گئی
شبنم اُدھر گری، ورقِ گل پہ جھڑ گئی
گلزارِ زندگی پر ادھر اوس پڑ گئی

باجے بجے تو شورِ فغاں دُور تک گیا　　کشتی ملی تو، خیر سے دریا بھڑک گیا
شبنم گری، دلِ سمن و سَرو پک گیا　　بُوندیں پڑیں تو اور بھی گلشن دَہک گیا
اپنا گلا خروشِ ترنم سے پھٹ گیا
تلوار سے بچا تو رگِ گل سے کٹ گیا

دولت ملی تو اور بھی نادار ہو گئے　　صحت ہوئی نصیب تو بیمار ہو گئے
اُترا جو بار، اور گراں بار ہو گئے　　آزاد یوں ہوئے کہ گرفتار ہو گئے
کھلا جو آسماں تو زمیں تنگ ہو گئی
پَو یُوں پھٹی کہ صبحِ چمن دنگ ہو گئی

باطل ہوا جو خوف تو دل اور ڈر گیا　　بھیگیں مَسیں تو زیست کا منہ اور اُتر گیا
پایا سبو تو عمر کا پیمانہ بھر گیا　　پُرساں ہوئے مسیح تو بیمار مر گیا
نغمے چھڑے تو شورشِ بیکار بن گئے
گونجے جو راگ تیغ کی جھنکار بن گئے

چھلکے جو اعتماد کے گلزار میں طیُور　　بے اعتمادیوں کا گیا شور دُور دُور
دوڑا رُخِ فسردہ پہ جب زندگی کا نور　　دی موت نے صدا کہ "نمستے شری حضور"
"باقی رہے جگہ نہ کوئی مَوت کے لئے
لونڈی سبھا میں آئی ہے ڈُنڈوت کے لئے"

فتنے مٹے تو امن کی دَولت نہیں رہی　　انساں کی وہ قدر وہ قیمت نہیں رہی
حاصل ہوا عروج تو عزت نہیں رہی　　پائی جو حریت تو حرارت نہیں رہی
جب روزگار نرم ہوا سنگ ہو گئے
وسعت ملی تو اور بھی دل تنگ ہو گئے

چھٹکی جو چاندنی تو بڑی ظلمتوں کی شان　　بازار جب کھلا تو ہوئی بند ہر دکان
چھیڑے جو راگ سر پہ کڑکنے لگی کمان　　چھت کی لگی جو ڈاٹ تو شق ہو گیا مکان
دَرماں سے اور دل ہمہ تن درد ہو گیا
پھوٹی کرن تو صبح کا منہ زرد ہو گیا!

شادی ہوئی تو غم کے خزانے لٹا دیئے　　کچھ یوں دیئے جلائے کہ دل ہی بجھا دیئے
سہرا بندھا تو شرم کے پردے اٹھا دیئے　　مہندی لگی تو خون کے دریا بہا دیئے
دولہا بنے تو حدِّ مسرت سے بڑھ گئے
گھوڑے کے لات مار کے سولی پہ چڑھ گئے

دہکے تو سوزِ موجِ تکلم نہیں رہا　　چھلکے تو لحن و سازِ ترنم نہیں رہا!
بہکے تو رقص و رنگ و تبسم نہیں رہا　　مہکے تو بوئے گل کا تلاطم نہیں رہا!
کانپے جو تارِ دیرِ محن بولنے لگا
خیمے ہوئے جو نصب تو رَن بولنے لگا

ابھرے تو جوشِ بادہ گساراں نہیں رہا　　بادل گھرے تو رنگِ بہاراں نہیں رہا
باتیں کھلیں تو رقصِ نگاراں نہیں رہا　　بوتل کھلی تو جمعِ یاراں نہیں رہا
کوئی سبیلِ بادہ پرستی نہیں رہی
مستی کی رات آئی تو مستی نہیں رہی

جب باعثانِ قوم ظفرمند ہو گیا　　ہر برگِ نرم خاک کا پیوند ہو گیا
عاشق جو وصلِ یار سے خورسند ہو گیا　　فالج گرا دماغ پہ دل بند ہو گیا
اترا بخار عقل کو طاعون ہو گیا
پیدا ہوا لہو تو جگر خون ہو گیا

بخیہ ہوا تو اور بھی چادر ادھڑ گئی　　بندھن کھلے تو جسم کی رگ رگ جکڑ گئی
بھرنے لگے جو شہر تو بستی اجڑ گئی　　ٹوٹی رسن تو عقل میں زنجیر پڑ گئی
طاقت ملی تو کوئی توانا نہیں رہا
برسا جو مینہ تو کھیت میں دانا نہیں رہا

بارش ہوئی زمین دُندک کر اُبل گئی　　اودی گھٹا اٹھی تو ہری دوب جل گئی
ابھری حیات موت کے سانچے میں ڈھل گئی　　باہیں پڑیں گلے میں کہ تلوار چل گئی
آبِ بقا سے زہر کی لہریں ابل پڑیں
بوسے لے تو منہ سے زبانیں نکل پڑیں

دشمن گئے تو دوست بنے دشمنِ وطن　　　شبنم جو لی تو کھول گئے لالہ و سمن
سنکی ہوائے سرد تو کمہلا گیا چمن　　　خلعت کی تہہ کھلی تو برآمد ہوا کفن

نغمے چھڑے تو شورِ سرِ بام مچ گیا
چٹکی کلی تو باغ میں کہرام مچ گیا

ہر موئے زلف اینٹھ گیا، مار بن گیا　　　ہر مہر کا خطیب، جفا کار بن گیا
ہر صبح کا رسول، شبِ تار بن گیا　　　ہر لوح اک اُبلی ہوئی تلوار بن گیا

"بدلی نگاہ طور سے بے طور ہو گئے
ہم تو جوان ہوتے ہی کچھ اور ہو گئے"

سکھ نے گرو کے نام کو بٹّہ لگا دیا　　　مندر کو برہمن کے چلن نے گرا دیا
مسجد کو شیخ جی کی کرامت نے ڈھا دیا　　　مجنوں نے بڑھ کے پردۂ محمل جلا دیا

اک شوشۂ ظن کو غلغلۂ عام کر دیا
مریم کو خود مسیح نے بدنام کر دیا!

سکّوں کے انجمن میں خریدار آ گئے　　　سیٹھوں کے خاندان وفادار آ گئے
کھدّر پہن پہن کے بد اطوار آ گئے　　　در پر سفید پوش سیہ کار آ گئے

تاریکیوں کو چھوڑ کے روشن جبیں گئے
جو لوگ آسمان تھے زیرِ زمیں[1] گئے

پل بھر میں سوئے دشتِ جنوں مڑ گئی سماج　　　اپنے وطن کی شرم نہ اپنے گرو کی لاج
رسمیں بدل گئیں تہ و بالا ہوئے رواج　　　وہ گفتگو رہی نہ وہ لہجے، نہ وہ مزاج

گھر اپنا گھر گرہست ہی خود موسنے لگی
حد ہے زبان دیو پری چوسنے لگی

چلنے لگی لغت پہ چھری انتقام کی　　　چھانٹی گئیں تمام جو لفظیں[2] تھیں کام کی

---

[1] Under ground　[2] لکھنؤ میں "لفظ" کو مذکر و مؤنث دونوں طرح برتتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ میں "لفظ" کی تذکیر کو پسند کرتا ہوں، لیکن یہاں مؤنث کا مقام آ گیا ہے۔

دشمن ہی کی بات چلی اور نہ رام کی　　گُدّی سے کھنچ گئی جو زباں تھی عوام کی

حیوان بوکھلا گئے منہ کھولنے لگے

انسان بولیاں وہ نئی بولنے لگے

نسرین و گل کو شعلۂ بے باک کر دیا　　سرو و چنار کو خس و خاشاک کر دیا

چھوڑے انار، لاکھ کا گھر خاک کر دیا　　خود بوئے گل نے دامنِ گل چاک کر دیا

شعلے بھڑک کے اٹھنے لگے دل کے داغ سے

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

خائن ہوئے حریمِ امانت میں باریاب　　شیطاں ہے فرازِ ہدایت کے آفتاب

بیڑے ڈبو چکے ہیں جو بے حد و بے حساب　　اُن ظالموں کا حضرتِ الیاس ہے خطاب

وہ، جو تمام راہزنوں کا امام ہے

وہ شخص آج خضر علیہ السّلام ہے

دیتے تھے صبح و شام سزائیں جو نا سزا　　گردن پہ جن کی خون ہے مردانِ راہ کا

کل جن کی ڈپٹیوں کا نشانہ تھے رہنما　　اُن ڈپٹیوں کو ہم نے کلکٹر بنا دیا

قیدی چھٹے تو خیر سے برباد ہو گئے

جو قید کر رہے تھے وہ آزاد ہو گئے

حکام، مجرموں کے ہیں دامن سئے ہوئے　　"سی، آئی، ڈی" ہے بادۂ غفلت پیے ہوئے

داروغہ جی ہیں قول لُٹیروں کو دیئے ہوئے　　چوروں سے کوتوال ہے سازش کئے ہوئے

برٹش کے خادموں کو اچھالے ہوئے ہیں ہم

سانپوں کو آستیں میں پالے ہوئے ہیں ہم

غدار تھے جو کل وہ محبِ وطن ہیں آج　　بدخواہِ باغ ہمدمِ سرو و سمن ہیں آج

کل تک تھے جو سموم، نسیمِ چمن ہیں آج　　خسرو کے جو غلام تھے وہ کوہکن ہیں آج

لچھمن کا دل ہے شدتِ غم سے پھٹا ہوا

در پر ہے رام چندر کے راون ڈٹا ہوا

ط . ج . ز . ع

مفسد ہیں فوجِ امن کے سالار آج کل　　ڈاکو ہیں سیم و زر کے نگہ دار آج کل
زاغ و زغن ہیں مطربِ گلزار آج کل　　افسر ہیں بلبلوں کے چڑی مار آج کل
چنگیز خاں ہیں عیسیٰ دوراں بنے ہوئے
کانٹے ہیں چوبِ خیمۂ بستاں بنے ہوئے

برطانیہ کے خاص غلامانِ خانہ زاد　　دیتے تھے لاٹھیوں سے جو حبِ وطن کی داد
جن کی ہر ایک ضرب ہے اب تک سروں کو یاد　　وہ آئی سی ایس[1] اب بھی ہیں خوش وقت و بامراد
شیطان ایک رات میں انسان بن گئے
جتنے نمک حرام تھے کپتان بن گئے

سینوں سے اٹھ رہی ہے وہی بے دلی کی بھاپ　　اب بھی بغل میں بت کو دبائے ہوئے ہے پاپ
ماتھے پر اب بھی "دولتِ طاغوت"[2] کی ہے چھاپ　　بیٹے ہیں اس کے آج بھی ہم لوگ اور وہ باپ
آزادیاں ہیں بوئے غلامی لئے ہوئے
اب بھی سروں پہ تاج ہے سایہ کئے ہوئے

جھونکوں میں رقص و کیف ہے موسم میں اعتدال　　لہکا ہوا ہے باغ تو نکھرا ہوا ہلال
لیکن بایں سرور و بہ ایں کثرتِ جمال　　عشاق کی روش ہے نرالی شبِ وصال
معشوقہ ہے وفورِ حیا سے گڑی ہوئی
اغیار کے گلے میں ہیں باہیں پڑی ہوئی

اربابِ اقتدار کا اللہ رے کمال　　دیکھو تو سر بلند، ٹٹولو تو پائمال
کالوں کے عارضوں پہ ہیں گوروں کے خط و خال　　بھارت کا رنگ روپ ہے برٹش کی چال ڈھال
ہاتھوں میں پھول جیب میں ڈھیلے لئے ہوئے
ساری گرو کی شان ہیں چیلے لئے ہوئے

گو حکم ہے کہ بند خبستاں کا در نہ ہو　　جو آئے، اعتراض کسی شخص پر نہ ہو

---

[1] I.C.S.
[2] Common wealth.

قدغن ہے یہ مگر کہ لب خشک تر نہ ہو　　اندر سبھا میں لال پری کا گذر نہ ہو
روشن تھے کل جو سرخ پیالوں کے سامنے
گل آج وہ چراغ ہیں کالوں کے سامنے

وحشت روا، عناد روا، دشمنی روا　　ہل چل روا، خروش روا، سنسنی روا
رشوت روا، فساد روا، رہزنی روا　　القصہ ہر وہ شے کہ ہے ناکردنی روا
انساں کے لہو کو پیو اذن عام ہے
انگور کی شراب کا پینا حرام ہے

جن کے قلم ہیں تیغ و تبر سے لڑے ہوئے　　جن کی لڑائیوں کے ہیں جھنڈے گڑے ہوئے
حق پر ہیں جو پہاڑ کی صورت اڑے ہوئے　　ذلت کے غار میں ہیں وہ اب بھی پڑے ہوئے
شاعر ہو یا ادیب قلندر ہے آج بھی
انگریز کا غلام گورنر ہے آج بھی

وہ شاعرانِ قوم اگر اس قدر ہو معتبر　　رہتے ہیں جن کی جیب میں اسرار بحر و بر
سورج پہ جن کا ہاتھ ہے اور پاؤں چاند پر　　روٹی وہ ڈھونڈتے ہوئے پھرتے ہیں در بدر
کیا چیز ہے ادب یہ کوئی جانتا نہیں!
جانے وہ کیا جو حرف بھی پہچانتا نہیں!

وہ جن کی وسعتوں کی کوئی انتہا نہیں　　سب سے سوا انہیں کے لئے تنگ ہے زمیں
دفتر میں کوئی قید، کوئی بوریا نشیں　　وہ ابتری ہے کوئی کہیں ہے کوئی کہیں!
لوگ آئے اور گئے بھی غذا بانٹتے ہوئے
یہ رہ گئے دوات و قلم چاٹتے ہوئے

اہل حضور کو نظر آتا ہے دور بیں　　عالم کو آنکھ اٹھا کے کبھی دیکھتے نہیں
باطل نے جب بھی حق پہ چڑھائی ہے آستیں　　بیٹھی ہے آسماں کو دبوچے ہوئے زمیں
کوا ہے زمزموں کی ترازو بنا ہوا
مرغِ چمن ہے کاٹھ کا الو بنا ہوا

چھائی ہوئی ہیں زیر فلک بدحواسیاں　　آنکھیں اداس اداس تو منہ ہیں دھواں دھواں

شانے ڈھلے ہوئے ہیں تو اینٹھی ہوئی زباں　　　وہ ضعف ہے کہ منہ سے نکلتی نہیں فغاں

اک دوسرے کی شکل کو پہچانتا نہیں

میں خود ہوں کون؟ یہ بھی کوئی جانتا نہیں

خاموش ہیں طیور، چمن سرمہ در گلو　　　شاخیں فسردہ، خوشۂ انگور زرد رُو

پھولوں کو اب نہیں ہے تمنائے رنگ و بو　　　بلبل کو آشیاں میں قفس کی ہے آرزو

غارت گرِ بہار کا منہ چومنے لگے

آئیں جو آندھیاں تو چمن جھومنے لگے

سروِ سہی، نہ ساز، نہ سنبل، نہ سبزہ زار　　　بلبل نہ باغباں، نہ بہاراں نہ برگ و بار

پھول نہ جامِ جم، نہ جوانی نہ جوئے بار　　　گلشن نہ گل بدن، نہ گلابی نہ گل عذار

اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ

وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

پھر زلزلے ہیں راکبِ تمکینِ زندگی　　　بے آئینی ہے ناظمِ آئینِ زندگی

پھر حشر م بن چکے ہیں قوانینِ زندگی　　　پھر موت ہے پیامبرِ دینِ زندگی

پھر شکلِ زندگی سے ڈرے جا رہے ہیں لوگ

بس اے حیات بس کہ مرے جا رہے ہیں لوگ

فٹ پاتھ، کارخانے، ملیں، کھیت، کھیتیاں　　　گرتے ہوئے درخت، سلگتے ہوئے مکاں

بجھتے ہوئے یقین، بھڑکتے ہوئے گماں　　　ان سب سے اٹھ رہا ہے بغاوت کا پھر دھواں

شعلوں کے پیکروں سے پلٹنے کی دیر ہے

آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے کی دیر ہے

وہ تازہ انقلاب ہوا آگ پر سوار!　　　وہ سنسنائی آنچ، وہ اُڑنے لگے شرار

وہ گم ہوئے پہاڑ، وہ غلطاں ہوا غبار　　　اے بے خبر! وہ آگ لگی آگ، ہوشیار!

بڑھتا ہوا، فضا پہ قدم مارتا ہوا

بھونچال آ رہا ہے وہ پھنکارتا ہوا

(سنہ ۱۹۴۷ء)

مُناجات

یہ پچھلا پہر، یہ طلسمی سماں　　یہ بجلی کی ضو، یہ اگر کا دُھواں
اگر کے دھوئیں میں یہ رقصانِ شمیم　　مہکتی فضا میں چٹکتی نسیم
یہ شیشوں سے چھنتی بصد دلبری　　بہ سیہ تاب ضو، اگرئی روشنی
سیاہی کے اندر جھلکتے نجوم　　جہالت کی چادر میں جیسے علوم
سمٹتی سی ظلمت، چمکتی سی ضو　　ملاحت کے اندر صباحت کی رو
سکوں میں روانی، صبا میں امنگ　　سیاہی کی چادر میں گدلا سا رنگ
فضا نیند میں مسکراتی ہوئی　　صبا فرش پر رسمساتی ہوئی
ذہانت، طہارت، بشاشت، امنگ　　تقدس، تبسم، ترنم، ترنگ
سموئی فضائیں نہ ظلمت نہ نور　　نہ آوازِ مردم، نہ بانگِ طیور
مگر ایک آواز ـــ آوازِ دُور　　مرے کان میں آ رہی ہے ضرور
یہ آواز - قرنوں پہ چھائی ہوئی　　بجھی مشعلوں کو جلاتی ہوئی
کلیجے سے دل کو لگائے ہوئے　　دماغوں سے دامن بچائے ہوئے
گھرکتی، تھپکتی، لپٹتی ہوئی!　　زمانے کے اوراق الٹتی ہوئی
روایت کی شمعیں جلائے ہوئے　　درایت[1] کی مشعل بجھائے ہوئے
مچلتی، ہدایت کے ہیجان میں　　چلی آ رہی ہے مرے کان میں
اس آواز میں سوز ہے ساز ہے　　میں سمجھا کہ یہ کس کی آواز ہے
مجھے صبح آوازیوں دے گا کون؟　　نہ سمجھوں اگر میں تو سمجھے گا کون؟
وہی سوز ہے اور وہی ساز ہے　　یہ میرے بزرگوں کی آواز ہے
خدارا خموش اے زمین و زمن　　کہ آبائے بندہ ہیں گرمِ سخن!
وہ آبا کہ تھے مردمانِ کرام　　ذو الکرم و ذوالقدر و ذوالاحتشام

---

[1] اس نوعیت کا الحاد میرے نزدیک مُباح ہے۔

وہ احباب پرور، وہ اعدا نواز　　تواضع شعارانِ گردن فراز
بہ اوجِ سخا ابرِ گنجینہ بار　　بہ موجِ سخن شاعرانِ کبار
وہ شائستہ مردانِ جود و کرم　　وہ ذی جاہ اربابِ سیف و قلم
وہ مسند نشینانِ اوجِ وقار　　بہ جنگاہ نخوت، بہ بزم انکسار
وہ اربابِ فہمیدۂ جشن و حرب　　وہ اصحابِ سنجیدۂ حرف و ضرب
بہ جلوت امیر و بہ خلوت فقیر　　بہ میداں خروش و بہ ایواں صریر
بہ گلخن جلال و بہ گلشن جمال　　بہ گردابِ خنجر، بہ کشتی ہلال!
بہ کوشے یلاں رستم بے اماں　　بہ روئے ضعیفاں خسِ ناتواں
وہ آبا ہیں اس وقت گرم خروش　　کہ اے بستۂ زلف الحاد جوش
دو عالم ہیں اک صنعتِ بے عدیل　　یہ صنعت ہے صانع کی محکم دلیل
نہیں اس میں جائے چناں و چنیں　　کہ اک نقش ہے آسمان و زمیں
اگر صاحبِ فہم ہے غور کر　　کہ ہر نقش، حجت ہے نقاش پر
مجازات پیما! حقیقت بھی دیکھ　　گرفتارِ معلول! علت بھی دیکھ
حداثت کے ناظر! قدامت بھی دیکھ　　حدوث و قدم کی قرابت بھی دیکھ

عقیدت کے ایواں میں گردن جھکا
خدائے دو عالم پر ایمان لا

جو شاعر ہے تو دیکھ، آیات کو　　اِن آیاتِ آئینۂ ذات کو
یہ جتنے بھی تابندہ آیات ہیں　　یہ روئے مرلبناں حجابات ہیں
اور ان کو جو میر نشانات ہیں　　حجابات جتنے ہیں آیات ہیں
یہ سب ایک ہی اصل کے ہیں جہات　　حجابات، آیات، اسماء، صفات
حجابات، آیات، اسماء، صفات　　حکیموں کے نزدیک ہیں عین ذات
جو شاعر ہے تو دیکھ آیات کو　　ان آیاتِ آئینۂ ذات کو
یہ تابندہ شبنم، یہ رقصندہ آب　　یہ گل ریز گلشن، یہ گل گوں سحاب
یہ پہنائیٔ چرخِ نیلوفری　　یہ پر بستہ خشکی، یہ جولاں تری

یہ شاخوں پہ چڑیوں کی چہکاریاں　　　یہ فرشِ سماعت پہ گل باریاں
یہ پتوں پہ بوندوں کی شیریں کھنک　　　یہ آڑی پھواریں، یہ بانکی دھنک
یہ گوہر فشاں آبشاروں کے ساز　　　یہ آبِ رواں کا نمِ دل نواز
یہ اعلان و اظہار و کشف و ظہور　　　یہ دُرّاج و طاؤس و مُرغ و طیور
یہ ذرّات و انجم، یہ شمس و قمر　　　یہ دُرہائے تاباں یہ گل ہائے تر
یہ راتوں سے دن اور دنوں سے یہ رات　　　یہ نہروں کی لہروں میں جوئے حیات
خمِ قوس و ضو کاریٔ کہکشاں　　　قضا و قدر کی یہ انگڑائیاں
یہ جوئے خراماں، یہ بوئے ختن　　　گُل و سُنبل و نرگس و نسترن
افق پر یہ رنگیں شفق کا ظہور　　　نگارِ ازل کے تبسم کا نور
یہ بیلیں حقیقت کی زلفِ دراز　　　یہ نہریں مشیت کی اک موجِ ناز
یہ ذرّوں کی مٹھی میں سو آفتاب　　　یہ موجوں کے عقدوں میں روحِ سحاب
یہ بُوندوں میں غلطیدہ برق و چراغ　　　یہ پھولوں میں آسودہ در بستہ باغ
خیابان و بُستان و کوہ و کمر　　　یہ لولو و مرجان و لعل و گہر
جو شاعر ہے تو دیکھ —— آیات کو　　　اِن آیاتِ مجموعۂ ذات کو
محلِّ رکوع و مقامِ سجود!　　　دلائل سے بالا ہے بامِ وجود

دلائل میں پنہاں ہیں سو عیب جوش
کہ ایماں ہے ایمانِ بالغیب جوش

حکیمانہ اجداد کو دوں جواب　　　اس اخلاق کی لاؤں کس طرح تاب
بتاؤں وہ کم ہیں، ہیں میں دور ہیں　　　کسی کی ہو میری یہ ہمت نہیں!
کجا بے ادب اور کجا راہِ راست　　　"خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"
تو پھر اے خدائے زمین و زمن　　　تری سمت پھرتا ہے روئے سخن
اگر تو حقیقت میں موجود ہے　　　مجاز و حقیقت کا مقصود ہے
بناہے بلندی و پستی توئی　　　ہمہ نیست اند، آنچہ ہستی توئی!
تو یارب! بپاسِ بزرگانِ دیں　　　بطفیلِ ہدایت، بحبلِ متیں

برقصِ نسیم و برنگِ چمن — بروئے نگارانِ گل پیرہن

بنفحاتِ انفاسِ خوبانِ شہر — بلعلِ نگارینِ ترکانِ دہر

باَبروئے غلماں، برخسارِ حور — بآبِ طہور و بتابِ قصور

بنورِ نعیم و بنارِ جحیم — بارباب خلعت، باہلِ گلیم

بطغیانِ چنگ و بالوانِ گل — بآوائے بلبل، بسیمائے گل

بنطقِ سلیس و بطبعِ سلیم — بضربِ مجاہد، بحرفِ حکیم

بپیکر تراشندگانِ وثن — بسالا تبندانِ طرفِ چمن

بدین اماماں کیف و شباب — بچینِ بساطِ نگاراں بخواب

بتسبیح و تہلیلِ کرّوبیاں — بآہنگِ نیکوئے رامش گراں

بحقِ باریٔ اولیائے کرام — بطراریٔ حوریانِ خیام

بسوزِ گدایاں، بسازِ شہاں — بعشقِ برہمن، بحسنِ بتاں

بعجزِ مناجاتیانِ کہن — بکبرِ ازل بستۂ اہرمن

بصبحِ خروشِ انوارِ شب زندہ دار — بشبہائے تاریک اخترشمار

برخسارِ یوسف، بنطقِ کلیم — بعزمِ خلیل و بخلقِ عظیم

بایمائے حوائے جادوکلام — باغوائے آدم علیہ السلام

بعصیانِ پیغمبرِ اولیں — بفتحِ مبین، عدوئے مبیں

بفرمانِ حفظِ خیال و نگاہ — بمیلانِ عدوان و ذنب و گناہ

بمعتوبِ خیر و بمحبوبِ زشت — باندوہِ کعبہ، بجشنِ کنشت

بدردِ جواں مرگیٔ ابنِ پیر — بجور و جفاہائے عمرِ کبیر

بسوزِ طویلِ دلِ بیوگاں — باوقاتِ سوزیٔ محنت کشاں

بفریادِ عشاقِ محرومِ دید — بآہِ یتیمانِ مقتولِ عید

باسبابِ درد و غمِ اندیشگی — بحجتِ وجوہِ گدا پیشگی

بعشرت خروشیٔ ابنِ امیر — بعصمت فروشیٔ دختِ فقیر

بفریادِ شام و باہِ سحر — بصبرِ بادیٔ فرصتِ مختصر

بجانِ حدوث و بشانِ قدم
بنورِ مدینہ بشمعِ حرم

بزلفِ سیاہِ بُتانِ مُبین
بموئے سفیدِ بزرگانِ دین

بترتیبِ مجروحِ اُمّ الکتاب
بتاراجیٔ کشورِ بوتراب

بمکر و دغائے ظلوم و جہول
بسوگِ بتول و بمرگِ رسول

برفتارِ صد لشکرِ اشقیا
ز راہِ سقیفہ سوئے کربلا

بدلِ خستگانِ فشارِ حیات
بلبِ تشنگانِ کنارِ فرات

بپاسِ شہیدانِ بدر و حُنین
بمرگِ مسیح و بخونِ حسین

خدایا! بآہِ جگر خستگاں
الٰہی! بسوزِ دلِ شاعراں

نہ دولت، نہ قدرت، نہ تاجِ شہی
فقط روشنی، روشنی، روشنی

نہ بندے کو ذی قدر و ذی جاہ کر
بس اک ذاتِ مطلق سے آگاہ کر

نہ اورنگ و افسر نہ مُہر و عصا
مجھے علم کی بھوک ہے داورا!

"بشب ہا نشستہ دریں دیر گم
تحیر گرفت آستینم کہ قُم"

"دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار
کہ پیدا نہ شد تختۂ بر کنار"

الٰہی! مری عقلِ اسرار باز
زمانے سے ہے درپئے کشفِ راز

مری فکر کب سے ہے سرگرمِ کار
لئے اپنی جھولی میں لیل و نہار

نظر میں شریعت کو رکھے ہوئے
طریقت کے اثمار چکھے ہوئے

بساطِ فلک کو سنوارے ہوئے
رباطِ زمیں کو ابھارے ہوئے

روان و دوان سینہ تانے ہوئے
بلندی و پستی کو چھانے ہوئے

خرافات کی دھار موڑے ہوئے
ہزاروں طلسموں کو توڑے ہوئے

حکایاتِ پیشیں کو بانچے ہوئے
اساطیر کا خون جانچے ہوئے

حقائق کے موتی نکالے ہوئے
ہزاروں سمندر کھنگالے ہوئے

ہزاروں پہاڑوں پہ کوندے ہوئے
کروڑوں ستاروں کو روندے ہوئے

بقا و فنا کو جھنجوڑے ہوئے
مہ و سال کا رس نچوڑے ہوئے

جہالت کی آنکھیں نکالے ہوئے
مظاہر کو جیبوں میں ڈالے ہوئے

خم معنی کے عقدوں کو کھولے ہوئے
مژہ پر دو عالم کو تولے ہوئے

مگر اے خداوند و ربِّ جلیل
ملی مجھ کو اب تک نہ ایسی دلیل

کہ ہو جس سے آئینہ رازِ صفات
کہ ثابت ہو جس سے تری پاک ذات

ملے بلکہ مجھ کو، خطا ہو معاف
ہزاروں براہین تیرے خلاف

جو پرکھا تو "رزّاق" و "ربّ" و "جلیل"
یہ سب نام ہی نام ہیں بے دلیل

وہ رحمت وہ لیلائے کرسی نشیں
پتا اُس کا دنیا میں چلتا نہیں

ربابِ الوہیّتِ حق فسردہ شما!
بگردوں خروشاں، بگیتی خموش

فسردہ، تپیدہ، برشتہ، غمیں
کوئی تیرے "بندوں" سے بڑھ کر نہیں

کوئی خاک پر راشہ نشیں پر کوئی
کوئی آسماں پر زمیں پر کوئی

جو گیتی پہ ہے وہ بھی زار و نزار
جو گردوں پہ ہے وہ بھی حسرت شعار

نہ اونچوں کو راحت نہ نیچوں کو چین
یہاں بھی ہے ماتم وہاں بھی ہے بین

محرّم کی تمہید ہے صبحِ عید
یہ ہر لمحہ صد کربلا و یزید

ہر اک پھول گنجینۂ صد شرار
ہر اک برگ صد خنجرِ آبدار

جو دل ہے وہ سینے کا ناسور ہے
جو زندہ ہے مرنے پہ مامور ہے

سزائیں پرافشاں، جفائیں محیط
بلائیں مسلّط، وبائیں محیط

نہنگِ عفونت بہ دریائے مشک
بہ موجِ تبسم ہزاراں سرشک

ہر اک جشن کو بزمِ غم کی تلاش
دف و نے میں غلطاں لہو کی خراش

بہر خندہ طوفانِ آہ و فغاں
بہر جام غلطیدہ خونِ مغاں

لڑکپن کا دنبالہ ریش و بروت
جوانی کے پیچھے بڑھاپے کا بھوت

بڑھاپے کی خاطر کو دیو اجل
اجل سرد، بے باک، سفاک، اٹل

اور اس پر بھی سنتا ہوں میں یہ پکار
کہ تو ہے خداوند رحمت شعار

یہ کہتے ہیں دانا و عادل ہے تو
حکیم، فرح بخش و باذل ہے تو

رحیم و رفیق و رؤف و لبیب
بہ رحمت قریب و بہ دعوت مجیب

اگر میں غلط کار ہوں اور قبیح
اگر ہیں یہ رحمت کے دعوے صحیح

تو ہنستا نہیں کیوں مرے دل کا بار　　عطا مجھ کو ہوتا نہیں کیوں قرار
فقیروں سے نظریں ملاتا نہیں　　خدا ہے تو پھر کیوں خود آتا نہیں
اگر باپ ہے تو مرے ذوالجلال　　تو بیٹے کے دل کو نہ کر پائمال
جو ہو ذہن فرزند کند و علیل　　تو فرضِ پدر کیا ہے ربِّ جلیل؟
نہ ہرگز غذا و دوا دے اُسے؟　　"خطائے" مرض کی سزا دے اُسے؟
اگر عقل بندے کی ہے مضمحل　　تو میری طرف سے نہ کر سخت دل
مجھے اے نگہ دارِ چاک و رفو　　تری جستجو ہے، تری آرزو
جہاں دینِ اجداد ہے خیمہ زن　　مری فکر کا وہ نہیں اب وطن
مری عقل کب تک رہے ناصبور　　یہ مولد سے محروم مسکن سے دور
تری مرحمت کی ہے امیدوار　　الٰہی! یہ عقلِ غریب الدیار
دکھا راہِ تمکیں خدایا مجھے　　نہ ٹھکرا، نہ ٹھکرا، نہ ٹھکرا مجھے
صبوری کا اب دل کو یارا نہیں　　مرا اور کوئی سہارا نہیں!
نبوت کی شمعیں ہیں یارب خموش　　رسالت کی محراب ہے بے خروش
وہ فکر و نظر کے اشارے نہیں　　تجلّی کے اب وہ منارے نہیں
رہے شہر کے عالمانِ کرام　　انہیں دُور سے دور ہی سے سلام
نہ باتوں میں نرمی، نہ لہجے میں پیار　　نہ خُلقِ محمّد کے آئینہ دار
نہ حسنِ ہدایت، نہ حُسنِ کلام　　نہ دل میں تحمّل نہ منہ میں لگام
بمکتب جہول و بہ مسجد ظلوم　　بہ محراب صرصر، بہ منبر سموم
بہ تحریر و تقریر ضربِ شدید　　نہ علمِ قدیم و نہ علمِ جدید
فقط حج و صوم و صلوٰۃ و اذاں　　اذان و جدال و جدال و اذاں
جدال و اذاں سے نحیف و نزار　　ترے در پہ آیا ہوں پروردگار
اگر تو ہے دراصل مطلق حکیم　　تو پھر اے خدائے سمیع و علیم
دماغ آبرو پائے یوں دل میں آ　　حکیموں کے مانند محفل میں آ
جہالت کی تاریکیوں سے نکل　　اگر چشمۂ علم ہے تو اُبل

اُبل، گو بجتا، گُن گن تا اُبل — تفکر کے دریا بہاتا اُبل
تعقل کی رخشندگی میں اُبل — دلائل کی تابندگی میں اُبل
خرد رشتہ و عقل پیوند اُبل — ریاضی صداقت کے مانند اُبل
بہت ہو چکا طورِ منقول پر — نمایاں ہو اب طورِ معقول پر
بلوریں رہا مدتوں عرش پر — اب آ، ٹھوس بن کر ذرا فرش پر
نہ تل دیر ظلمت کے گل دان میں — اب آ سرخ کرنوں کی میزان میں
دکھا دے گا یہ وزن افلاک کا — قدم رکھ یہ کانٹا ہے ادراک کا
چھڑا ڈال ماتھے سے شمس و قمر — رصد گاہِ دانش میں ہو جلوہ گر
اگر تو ہے کندن تو ڈوب اور اُچھل — فراست کی بھٹی سے تپ کر نکل
کہ تا نعرہ زن ہو سکوں برملا — کہ جھک جاؤ اے منکرانِ خدا
نہ جاؤ اُدھر، کفر ہے جوئے زہر — ٹھہر جاؤ اے تیرہ بختانِ دہر
پھر آدم کے بچوں کو یکجا کروں — تعصب کو دنیا سے چلتا کروں
عداوت مٹا کر محبت بڑھاؤں — محبت، اخوت، شرافت سکھاؤں
تمام آدمی شکر و شیر ہوں — کنشت و کلیسا بغل گیر ہوں
اگر یہ حقیقت ہے پروردگار — کہ نیت پر اعمال کا ہے مدار
تو اے جانِ حق میری نیت کو دیکھ — مرے ولولوں کی طہارت کو دیکھ
مرے اشتیاقِ تبحر کو دیکھ — تجسس، تامل، تفکر کو دیکھ
مرے ذوقِ کشفِ حقیقت کو دیکھ — مری کاوشوں کی صداقت کو دیکھ
تجھے سب سے بہتر یہ معلوم ہے — کہ فدوی بہ ایں فسق معصوم ہے
اگر مجھ میں ذوقِ تعبد نہیں — تجسس ہے مولا، تمرد نہیں
میں آئینہ اندیشی و انوار میں — حقیقت سے یا رب تعلق نہیں
مرے سینۂ پاک میں متصل — دھڑکتا ہے مولا رسالت کا دل
مجھے علم دے تا کہ گم ہو ملال — مگر ہاں بطرزِ دگر ذوالجلال
مرے سر پہ انسوں کی صورت نہ چھا — خطرناک وادی سے ہرگز نہ آ!

صحیفے بغل میں دبا کر نہ آ ! — تفلسف کی شمعیں بجھا کر نہ آ
روایت سے دل کی نہ تسخیر کر — درایت کے منبر سے تقریر کر
روایت کا سلمہ ستارہ نہ ٹانک — درایت کے رنگین غرفے سے جھانک
عقیدت سے پہچان سکتا نہیں — روایات سے مان سکتا نہیں
عقیدت فریبِ خیال و حواس — روایت فروغِ ظنون و قیاس
گدازِ دل و جوشِ رقت فریب — بصیرت عقیدت مودت فریب
تعبّد، تملق، تاسف، غلط — تضرع، تورّع، تشقّف غلط
جنوں، جذب و وجدان، ذوقِ سخن — سراسر فسوں کاری اھرمن
"ازل کا تبسم، ابد کا جمال" — فریبِ روایات، وہم و خیال
"ادا سنجیٔ حُسنِ ذات و صفات" — ہمہ ذوقِ جنسی، ہمہ جسمیات
حریمِ خدائی میں ہوں پاک باز — کہاں میں، کہاں ننگِ راز و نیاز
نہ مجھ سے طلب کر سجود و رکوع — فرازِ خرد سے ہو یا رب طلوع
نہ وا کر درِ ناز و بابِ جمال — نہ دمکا ستارے، نہ چمکا ہلال
نہ لیلیٰ کے مانند محمل میں آ — نہ عشق و جوانی کی منزل میں آ
جسے عشق کہتے ہیں تلبیس ہے — یہ مردانِ اوباش کی ریس ہے
یہ وہ لفظ ہے بے وقار و لعیں — جو قرآں میں اک بار آیا نہیں
رسالت نے اس کو کیا ناپسند — مشیت نے اس کو کیا ناپسند
ترا "عشق" اور "ولولوں کا اُبھار" — یہ فحاشیٔ ذہن ہے کردگار!
ترے "وصل" کا شوق ربِّ غفور — ادب کے منافی، شرافت سے دور
بھگوتی ہے اشکوں سے جو آستیں — وہ "خواہش" کی چٹکی ہے عفت نہیں
یہ جذبہ یہ تو چسکا ہے یارِ خدا — ہوس کاریوں کے تپاں خون کا
جبھی تو نہ روتا نہ مرتا ہوں میں — ادب سے یہ درخواست کرتا ہوں میں
اگر تو ہے دراصل ربِّ غیور — تو خوش وضع و سنجیدہ ہوگا ضرور
جو یہ ہے تو راہِ متانت سے آ — مرے روبرو بابِ حکمت سے آ

جو تو داور ! وہم انساں نہیں
تو اے تہمت وہم بن جا یقیں !

یقیں ہے تو کیوں گم ہے گرداب میں
جھلک قصرِ دانش کی محراب میں

یقیں بن کے جب تک نہ آئے گا تو
تو اے وہم در پیشہ اہل ہو

رہِ کفر کی خاک چھانے گا جوش
نہ مانا ہے تجھ کو نہ مانے گا جوش
(سنہ ۱۹۵۰ء)

کھوکلے دعوے

قرنوں کے شاندار یہ دعوے کہ زندگی
اک مہرِ لایزال سے پاتی ہے روشنی

جوئے علوم و چشمۂ حکمت ہے زندگی
انصاف و عدل و رافت و رحمت ہے زندگی

ہر اک شکم ہے رزق کا وعدہ لئے ہوئے
ہر وعدہ ہے فراغتِ ایفا لئے ہوئے

دنیا نہیں بہشت ہے دار السلام ہے
اک رحمتِ تمام ہے اک فیضِ عام ہے

تقدیر کا غلط ہے کہ بیٹا ہے آدمی
قدرت شفیق باپ ہے بیٹا ہے آدمی

ارض و سما کا راج دلارا ہے آدمی
رزاقیت کی آنکھ کا تارا ہے آدمی

ایک آبشارِ جود ہے اک سیلِ مرحمت
شبنم کی طرح نرم ہے قلبِ ربوبیت

پل بھر بھی چشمِ دہر میں ہوتی ہے جب کھٹک
دل میرِ زندگی کا دھڑکتا ہے دیر تک

بھرتی ہے آہِ سرد جو لیلائے زندگی
ہوتا ہے چاک سینۂ دارائے زندگی

انسانیت کا درد ہے قدرت لئے ہوئے
شاعر کا عشق، ماں کی محبت لئے ہوئے

عشرت کی دھوم دھام ہے ہستی کی ریل پیل
ہستی کا کاروبار ہے اک مشفقانہ کھیل

پیرِ مغاں کے فیض سے چھلکے ہوئے ہیں جام
ذروں کے دل میں ثبت ہیں خورشید کے خیام

المختصر تمام یہ دعوے کہ آسماں
روندی ہوئی زمیں پر ازل سے ہے مہرباں

دن کو خروش، رات کو محبوب چہچہے
المختصر تمام یہ دعوے، یہ غلغلے

بے قدر و بے وجاہت و بے اعتبار ہیں
انساں کی انجمن میں بہت شرمسار ہیں

جھٹلا دیا ہے ان کو غمِ کائنات نے
ان سب کے منہ پہ تھوک دیا ہے حیات نے
(سنہ ۱۹۴۶ء)

(۱۳)

سموم و صبا

(منظومیں)

نگارانِ مُردہ

اے غزالانِ دشتِ سرو و نسیم[1] — اے فنا دیدہ مرد و شوقِ تسلیم!
تم میں سلمیٰ کوئی، کوئی لیلیٰ — تم ہو اور زیرِ خاک وا ویلا
وہ مہک ہو جو لعلِ خنداں میں — سر پٹکتی پھرے بیاباں میں!
جن پہ ہو نازو عشوہ کی بنیاد — وہ عناصر ہوا میں ہوں برباد!
جس پہ ہو شبنم و صبا تک بار — اُس لچک پر ہو خاک کا انبار!
جسم تلتے ہوں جن کے پھولوں میں — اُن کے ذرّے اڑیں بگولوں میں
جس میں غلطاں ہو موجِ ناز و نیاز — موت کا دوش اور وہ زلفِ دراز
لعلِ جاں بخش و ابتسامِ جمیل — ہو شگافِ قبور میں تبدیل
تم پہ مبنی تھا ذوقِ جامہ دری — گریۂ شام و نالۂ سحری
جب تمہاری نگاہ جھکتی تھی — کتنے سینوں میں سانس رکتی تھی
کتنے جی دفعتاً ٹھہرتے تھے — کتنے جیتے تھے کتنے مرتے تھے
اے نگارانِ خیمہ ہائے گلاب[2] — کعبہ ہائے مرادِ چنگ و رباب

---

[1] اسی نوعیت کے چند اشعار مدت ہوئی، کسی پرانی مثنوی میں نظر سے گذرے تھے۔ ممکن ہے اول اشعار میں کہیں کہیں اُن سے مماثلت ہو گئی ہو۔ [2] "محل" کے معنی میں اب یہ لفظ عام ہو چکا ہے اضافت کو تو اب ہندی الفاظ کے ساتھ بھی جائز کر دینا چاہئے یہ لفظ تو خیر عربی ہے۔

گلُ رُخانِ بہشتِ رعنائی — اے بتانِ حریمِ برنائی
حیف اے دخترانِ رنگِ سحاب — شاہدانِ شراب و شعر و شباب
اے گہر ہائے شبنمِ دُربار — اے صنم ہائے شاعرانِ کبار
اے نجومِ سپہرِ حسن و شباب — تم ہو اور نذرِ صرصر و سیلاب
کاش رک جائے موت کا دھارا — چڑھ کے اُترے نہ زیست کا پارا
کاش بن جائے صرف ایک گمان — آیۂ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ
کاش روئے خواص و روئے عوام — بن سکے وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَام
کاش مرنا حرام ہو جائے — زندگی کو دَوام ہو جائے!

رقص فرمائے آب و تاب کے ساتھ
زندگی دائمی شباب کے ساتھ

(سنہ ۱۹۴۵ء)

میرے بعد

نہ وہ الفاظ کے نغمے، نہ وہ معنی کا سرود — گنگ ہے مطربِ اندازِ بیاں میرے بعد
تیر دل پر وہ لگا ہے کہ پھلکتی ہی نہیں! — اَبروئے شعر کی گل ریز کماں میرے بعد
پھر اُلوہیتِ انساں کا تصور ہے خجل — پھر جبینوں پہ ہیں سجدوں کے نشاں میرے بعد
بے جھجک ہو کے اُٹھایا ہے پھر ادراک نے سر — کھل کے گونجی ہے پھر آوازِ اذاں میرے بعد
پھر حقائق سے ہیں مصروفِ تمسخر اوہام! — پھر یقیں پر متبسم ہے گماں میرے بعد
زندہ افکار کا پرتو نہ رہا ذہنوں پر — مُردہ ہے انجمنِ دیدہ وراں میرے بعد
زرد ہے چہرۂ گل رنگِ نگارِ دانش — تیرہ ہے محفلِ صاحب نظراں میرے بعد
وائے تقدیر کہ پھر عقل و جنوں کے مابین — کوئی باقی نہ رہا ربطِ نہاں میرے بعد
اپنے الفاظ کی میت کو سرِ دوش اُٹھائے — محوِ فریاد ہے سلطانِ زباں میرے بعد
کروٹیں شام سے تا صبح بدلتے ہیں نجوم — یوں دھڑکتا ہے دلِ زہرہ وشاں میرے بعد
نہ رہا کوئی اداسنجِ حسینانِ جہاں — سر بہ زانو ہیں حسینانِ جہاں میرے بعد

آخری مشتریِ جنسِ جوانی نہ رہا — بند ہے غرفۂ خوبانِ جہاں میرے بعد

پڑ گئے قفل اداؤں کے صنم خانوں میں — سرنگوں ہے عَلَمِ نازِ بتاں میرے بعد

ہو گیا قحطِ خریداریِ مے کے باعث — چشمِ عالم میں سُبک رطلِ گراں میرے بعد

چاندنی تک ہے خرابات میں دھندلی دھندلی — یوں سیہ پوش ہیں رندانِ جہاں میرے بعد

اب کسے قدر کھنکتے ہوئے پیمانوں کی — بند ہے کارگہِ شیشہ گراں میرے بعد

آخری شمعِ خرابات ہوئی ہے خاموش — اٹھ رہا ہے دلِ ساقی سے دھواں میرے بعد

اہلِ ماتم کا خرابات سے نکلا ہے جلوس — زیرِ سرکردگیِ پیرِ مغاں میرے بعد

اک اداسی ہے مہکتے ہوئے بستانوں میں — اک اندھیرا ہے سرِ آبِ رواں میرے بعد

کس کو بخشے علمِ ہمتِ گردوں شکنی؟ — چشمِ گیتی ہے بہر سو نگراں میرے بعد

حیف اے خسروئیِ کاکل و کونین و کتاب — کس کو سونپیں گے ترا طبل و نشاں میرے بعد

حیف یہ صاعقہ و صرصر و سیلاب و سموم — کس کے آغوش میں پائیں گے اماں میرے بعد

سر بہ زانو ہیں امامانِ خرابات اے جوشؔ
کون ہو قبلۂ رندانِ جہاں میرے بعد

(سنہ ۱۹۴۸ء)

وہی رفتار

زہے اقبالِ تلخی و ترشی — آج بھی سرنگوں ہے قند و نبات

اب بھی جولاں ہے قہر کا خورشید — اب بھی لرزاں ہیں مہر کے ذرات

اب بھی تاباں ہیں جور کے آثار — اب بھی دھندلے ہیں لطف کے آیات

اب بھی نامِ خدا، غرور شاں ہے — ذوقِ پیکار و کاوشِ غزوات

اب بھی حاوی ہیں علم پر اوہام — اب بھی طاری ہیں عقل پر جذبات[1]

آج کل بھی سرِ مکاتب پر — مارتا ہے حسنِ معابد لات

---

[1] اب اس قبیل کی جیبوں کو ماننا ہی پڑتا ہے

اب بھی پھٹکارتا ہے چٹیا کو — پنڈت بد نہاد و خوش اوقات
اب بھی بُنکارتا ہے مسجد میں — شیخ داڑھی پہ پھیر پھیر کے بات
"خوفِ یزداں" ہے اب بھی دل سے قریب — حبِ انساں ہے اب بھی دور کی بات
عالموں کا نہیں مقام کوئی — جاہلوں کے رفیع ہیں درجات
باغِ عالم پہ خون برسانے — اب بھی آتی ہے دھرم کی برسات
اب بھی ہے ایک سانس لیتی موت — زندہ درگور آدمی کی حیات
اب بھی ہوتی ہے دھوم سے ہر آن — شاخِ آہو پہ عاشقوں کی برات
اب بھی ہے صحنِ قصرِ آدم میں — آہ کا خیمہ، آنسوؤں کی قنات
آج بھی صدق ہے گناہِ عظیم — آج بھی حق ہے رہنِ تعزیرات
شامیانہ حسینِ اعظم کا — نصب ہے آج بھی کنارِ فرات
آج تک آدمی کی سختی سے — آدمی کو نہیں ملی ہے نجات

کس قدر رہ گئی ہے اب باقی
اے مری زندگی کی لمبی رات

(سنہ ۱۹۵۰ء)

کلکتہ

ہائیں یوں زرد، اس قدر گم سُم — سچ بتاؤ علی حسین[۱] ہو تم؟
تم وہی ہو علی حسین جو کل — بیٹھتے ہی نہ تھے کہیں اک پل؟
عطر پوشاک میں لگاتے تھے — مسکراتے تھے گُنگُناتے تھے
بمبئی کی فضا سے ہو دل تنگ؟ — اچھا اب بیچتے ہو تاش[۲] و پتنگ؟
ہائے نشتر چلا دیا تم نے — یاد کیا کیا دلا دیا تم نے؟

---

۱ میں سنہ ۱۹۲۱ء میں جب کلکتے گیا تھا تو علی حسین جو میرے ملازموں میں سے ایک خوش وضع اور زندہ دل انسان تھے، میرے ہمراہ تھے۔

۲ اب ان اضافتوں کو جاری کر دینا چاہئے۔

میرے ہمراہ اک نئی دھج سے — یاد ہے جب گئے تھے کلکتے؛
ہر نفس اک نیا ترانہ تھا — وہ سنِ[1] اکیس کا زمانہ تھا
زندگانی تھی اک نئی تصویر — سانس میں تھی شراب کی تاثیر
کھینچ کر ہم جو سانس لیتے تھے — جوئے مستی میں ناؤ کھیتے تھے
نقرئی، سرخ، سبز، فالسئی — آسماں تھا نیا، زمین نئی
سادگی میں بھی تھا انوکھا پن — چار تنکوں کی چھاؤں تھی گلشن
ٹھنڈے جھونکے جو چھیڑ کرتے تھے — دل پھسلتے تھے، سن ابھرتے تھے
سیکڑوں رنگ تھے نگاہوں میں — داستانیں تھیں شاہراہوں میں
ہر نفس یاسمن میں تُلتا تھا — ہر قدم پر دریچہ کھلتا تھا
داستانِ جنوں ہوئی تھی شروع — صبح چہروں کی ہو رہی تھی طلوع
قید سے آرزوئیں چھوٹی تھیں — کونپلیں ولولوں کی پھوٹی تھیں
غنچہ چٹکا تھا زندگانی کا — جھٹ پٹا تھا نئی جوانی کا
دھوپ میں بھی تھا ابر ساون کا — ہائے پچھلا پہر لڑکپن کا!
رخ پہ تھا آمدِ شباب کا رنگ — برگِ گل کی نمی شراب کا رنگ
نوجوانی کا روپ چھایا تھا — وقت پر سرمئی دھندلکا تھا
دل نشیں تھی ہوائے کلکتہ — نغمہ تھی ہر صدائے کلکتہ
دورِ ماضی کا وہ جواہر دُرج — ہائے وہ بارگاہِ مٹیا[2] بُرج
ہائے تختِ فنونِ لاثانی — مرکز و محورِ زباں دانی
مسندِ زرنگارِ چنگ و رباب — شمعِ گنبدِ بلور و حباب
قبرِ حسنات و مدفنِ برکات — حرمِ رقص و کعبۂ نغمات

---

[1] سنہ ۱۹۲۱ء

[2] وہ بُرج جہاں فرنگی کی رذالت، طمع اور فریب کاری نے لکھنؤ کے آخری اور فن کار و تاج دار حضرت واجد علی شاہ ۔جان عالم۔ کو قید کیا تھا۔

مرقدِ آبروئے شعر و سخن
مجلسِ تاج[1] دارِ کشورِ فن

حلقۂ گل فشاں تشفق کا
مقبرہ مرمریں تمدن کا

وہ لطافت کے کارواں کا غبار
رو کشِ خلدِ لکھنؤ کا مزار

جس کے ذرات میں مہ و پرویں
آسماں جس میں دفن ہے وہ زمیں

جس کی صرصر میں خفتہ لاکھوں باغ
گل ہوا تھا جہاں اودھ کا چراغ

سقف و ایواں میں جس کے گونجی تھی
"جانِ عالم" کی آخری ہچکی

اور وہ دل نشیں عجائب گھر
اور وہ ڈولچی کہ عقل تھی ششدر

یاد ہیں وہ رئیس[3] اور مختار[4]
اور وہ بذلہ سنجیٔ ابرار[5]

وہ لطیفوں وہ پھبتیوں کی فضا
ہائے وہ صحبتِ امیر[6] چچا

اور اُن کے وہ دل نشیں فقرے
لوٹ جاتی تھی زندگی جن سے

اور وہ نور الحسن[7] بڑے جرنیل
صاحبانِ مزاح کے سرخیل

دل لبھاتے تھے چہچہے جن کے
دور جاتے تھے قہقہے جن کے

لرزشِ جوئے شام و گردشِ جام
تنگ گلیوں میں حسن کے وہ خیام

تابشِ آسمانِ کلکتہ
ہائے وہ گل رخانِ کلکتہ

جسم وہ شعلہ ہائے جوالہ
انکھڑیوں میں وہ سحرِ بنگالہ

ساحلوں پر رواں زوالِ شام
جیسے دریا میں کشتیوں کا خرام

وہ اشارے، وہ گات، وہ تیور
اُف وہ آنکھیں وہ بال، وہ پیکر

اُف وہ لو، وہ دمک، وہ چھوٹ، وہ نور
اُف وہ کافر جوانیاں بھرپور

وہ چٹکتی حیات کی کلیاں
وہ مہک سے بھری ہوئی گلیاں

دل نشیں وہ زبان بنگالی
گول بجلوں میں ریشمی جالی

---

۱ حضرت واجد علی شاہ جانِ عالم — ۲ [illegible] — ۳ رئیس احمد خاں
۴ مختار احمد خاں — ۵ ابرار حسن خاں — ۶ امیر احمد خاں ملیح آبادی
۷ نور الحسن خاں ملیح آبادی

نغمہ و رقص کی ملاقاتیں
جیسے برکھا کی جھومتی راتیں

سارے گاما، پہ وہ تنا دِھن دِھن
وہ گرجتے بدن، کڑکتے رسن!

ہائے وہ دخترانِ آئینہ رو
بڑھیں دوشیزگی کی وہ خوشبو

برہمن میں صنم کو دیکھتی تھیں
کس تمنا سے ہم کو دیکھتی تھیں

دور رہ ہو کے پاس آتی تھیں
کس لگاوٹ سے آنکھ اٹھاتی تھیں

ہم ادھر کھنکے دمکتے سونے سے
تم اُدھر سانولے سلونے سے

ہائے کیسی اُلٹ گئی وہ بساط
حیف یہ شامِ غم وہ صبحِ نشاط

اب وہ اگلی سی آب و تاب کہاں
ہم کہاں اور وہ شباب کہاں

اب نہ خادم ہو تم نہ ہم مخدوم
ہم اِدھر زار، تم اُدھر مغموم

کل کا گل آج خارِ پہلو ہے
کل جو موتی تھا، آج آنسو ہے

وائے بر ربطِ خادم و مخدوم
پھر ملیں گے کبھی؟ یہ بھی کیا معلوم

اب کہاں سے وہ روز و شب لائیں
تم اُدھر جاؤ، ہم اِدھر جائیں

یہ ملاقات رنگ لائے گی
شب کو تا دور لے کے جائے گی

جلد یہ داغ دھو سکیں گے نہ ہم
آج کی رات سو سکیں گے نہ ہم

(سنہ ۱۹۴۷ء)

اعترافِ عجز

لوگ کہتے ہیں کہ میں ہوں شاعرِ جادو بیاں
صدرِ معنی، داورِ الفاظ، امیرِ شاعراں

اور خود میرا بھی کل تک غیر سے تھا یہ خیال
شاعری کے فن میں ہوں من جملۂ اہلِ کمال

لیکن اب آئی ہے جب اک گونہ مجھ میں پختگی
ذہن کے آئینے پر کانپا ہے عکسِ آگہی

آسماں جاگا ہے سر میں اور سینے میں زمیں
اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں

جہل کی منزل میں تھا مجھ کو غرورِ آگہی
اتنی لا محدود دنیا، اور میری شاعری

الاماں آفاق کا دل اور یہ طغیانِ سوز
اب کھلا مجھ پر کہ اک طفلِ دبستاں ہوں ہنوز

زلفِ ہستی اور اتنے بے نہایت پیچ و خم
اڑ گیا رنگِ تعلّی، کھل گیا اپنا بھرم

میرے شعروں میں فقط اک طائرانہ رنگ ہے
کچھ سیاسی رنگ ہے کچھ عاشقانہ رنگ ہے

کچھ مناظر، کچھ مباحث، کچھ مسائل، کچھ خیال
اک اچٹتا سا جمال، اک سر بہ زانو سا جلال

میرے کاخِ شاعری کی نیو میں سنگِ فتور
ایک ہفلادہ بلوغ، اک کھوکھلا سنِّ شعور

میرے قصرِ شعر میں غوغائے فکرِ ناتمام
ایک درد انگیز درماں، اک شکست آمادہ جام

گاہ سوزِ چشم و ابرو، گاہ سازِ ناؤ نوش
گاہ خلوت کی خموشی، گاہ جلوت کا خروش

چہچہے کچھ موسموں کے زمزمے کچھ جام کے
دیرِ دل میں چند مکھڑے مرمریں اصنام کے

چند زلفوں کی سیاہی چند رخساروں کی آب
گاہ حرفِ بے نوائی، گاہ شورِ انقلاب

وہ بھی کچھ جاگیردارانہ بہ قولِ ناقداں
بے سواد و بستۂ رسم و رہِ رومانیاں

وصل کے دو چار نغمے، ہجر کی اک آدھ آہ
قعر سے ناواقفیت، سطحِ دریا پر نگاہ

گاہ مرنے کے عزائم، گاہ جینے کی امنگ
بس یہی سطحی سی باتیں، بس یہی اوچھے سے رنگ

اتنی اوچھی رنگ سازی سے کھلا جاتا تھا میں
اتنی عبرت ناک سطحیت پہ اتراتا تھا میں

بے خبر تھا میں کہ دنیا راز اندر راز ہے
وہ بھی گہری خامشی ہے جس کا نام آواز ہے

جو بیاں اظہر من الشمس و چراغِ طور ہے
وہ درخشاں چیز بھی اک حلقۂ بے نور ہے

یہ سہانا بوستاں سرو و گل و شمشاد کا
ایک پل بھر کا کھلنڈرا پن ہے ابر و باد کا

ہر ترنم ہے دلِ خوں بستہ کی اک موجِ زہر
ہر تبسم ہے خراشِ سینہ کی ہلکی سی لہر

شرم، شوخی کی تھکاوٹ، عشوہ عجزِ دلبری
ناز، اک رنگیں سہارا، نازکی اک لاغری

بوسۂ گل کیا، ایک عیارانہ شوخی گرد کی
زمزمے کیا، ایک خوش فعلی ہے آہِ سرد کی

برق، بینائی پہ اک ضربِ سحابِ تیرگی
شعلۂ جوالہ، قرطاسِ کتابِ تیرگی

اس محلِ آب و گل میں یہ حیاتِ آدمی
گریہ کی صرف ایک پل بھر ہوش سے بازی گری

ابتدا و انتہا کا علم نظروں سے نہاں
ٹمٹماتا سا دیا، دو ظلمتوں کے درمیاں

جہل کا اک قہقہہ سرِ ادعائے آگہی
موت کا اک مسخرا پن ماجرائے زندگی

Romance ۵۱

روشنی بن کر اکڑتا پھر رہا ہے برملا — تہ بہ تہ تاریکیوں کا خندۂ دنداں نما
انجمن میں تخلیے ہیں، تخلیوں میں انجمن — ہر شکن میں اک گھلاوٹ، ہر گھلاوٹ میں شکن
عام معمولاتِ دنیا، واقعاتِ صبح و شام — فکرِ انسانی کے محبس، عقلِ انسانی کے دام
ہر گماں میں اک یقیں سا، ہر یقیں میں سو گماں — ناخنِ تدبیر بھی خود ایک گتھی بے اماں

روشن امیدوں کی پیشانی میں غلطاں اہرمیم
ہم سوادِ گیسوئے پُرخم، صراطِ مستقیم

ایک اک گوشے سے پیدا وسعتِ کون و مکاں — ایک اک خوشے میں پنہاں صد بہارِ جاوداں
جنگ میں پیغامِ رحمت، سنگ میں پیکِ بہار — پرنیاں میں تیغ کی باڑھ، آب میں آہن کی دھار
لیلیٰ سنجیدگی کے لب پہ سرمستی کا حرف — برف میں شعلے تپاں، شعلوں کی طراری میں برف
تخم کے سینے میں غلطاں گلستانوں کے نکات — خاک کی چٹکی میں پرافشاں تواشے کائنات
ہر کرن اک ابر، ہر تعبیر اک ژولیدہ خواب — ہر سحر اک دیوِ شب، ہر جلوہ اک بکر حجاب
ہر نمایاں نقش، اک پنہاں فریب ابصار کا — ہر گلِ شاداب، اک بہروپیا پن خار کا!
ہر خزف الماس، ہر زنجیر تارِ عنکبوت — ہر کلید اک قفل، ہر جھنکار اک جولاں سکوت
پیکرِ ہستی پہ ڈھیلا ہے مثالاً ہر کا لباس — اور میں اُس کی ذرا سی اک شکن سے روشناس
برق کی لہروں کی وسعت الحفیظ و الاماں — اور میں صرف ایک کوندے کی لپک کا رازداں
رازداں کیا، مدح خواں، اور مدح خواں بھی کم سواد — نابلد، ناداں، ناواقف، ندیدہ، نامراد

خارج از وہم و گماں ہے عمرِ لیلائے زمیں
اور اک لمحے کی پیمائش پہ بھی قادر نہیں

کیوں نہ پھر سمجھوں سُبک اپنے سخن کے رنگ کو — نطق نے الماس کے بدلے تراشا سنگ کو
لیلیٰ آفاق اُلٹتی ہی رہی پیہم نقاب — اور یہاں صورت مناظر مشقِ صہبا انقلاب
دائمی قدروں کی ہر ساعت گہر پاشی رہی — اور یہاں وقتی مسائل ہی کی عیاشی رہی
عرفہ ہائے لعل و گوہر آسماں کھولا کیا — اور میں رندِ سیہ رُو کوئلے تولا کیا!
پا رہا ہوں شاید اب اس تیرہ حلقے سے نجات — کیوں کہ اب پیشِ نظر ہیں عقدہ ہائے کائنات
کائنات اک کارگاہِ سطوت و کاخِ جلال — جلوہ گر جس کے نقائص میں بھی رُوحِ صد کمال

یہ کبھی، ابھی زمیں، یہ بیچ در بیچ آسماں
الاماں و الاماں و الاماں و الاماں!

ایک ننھا سا ستارہ، ایک ننھا سا شرارہ
یہ تزلزل، یہ تلاطم، یہ تموج، یہ فشار!

اک نفس کا تار اور یہ شورِ عصرِ جاوداں
اک کڑی اور اس میں زنجیروں کے اتنے کارواں

اک تبسم اور اتنے خونِ صانع کے ہجوم
ایک مبہم نقش اور اتنی شعاعوں کا ہجوم

ایک اک لمحے میں اتنے کاروانِ انقلاب
ایک اک ذرّے میں اتنے ماہتاب و آفتاب

یہ گرج، یہ بھق، یہ طوفاں، یہ صرصر، یہ سموم
بندگانِ چند اور اتنے خداؤں کا ہجوم!

نے کی جنبش اور اتنے حلقہ ہائے بے شمار
نے کی کروٹ اور یہ ہنگامۂ رقصِ شرار

اک صدا اور اس میں یہ لاکھوں ہوائی دائرے
جس کے شعلوں کو اگر تُن ملے تو دنیا گونج اٹھے

ایک پرتو اور فضائے بے کراں پر جست و خیز
اک دیا اور آندھیوں کی فوج سے گرمِ ستیز

ایک بوند اور ہمتِ قلزم کے ہلا دینے کا جوش
ایک گونگا خواب اور تعبیر کا اتنا خروش!

کوہ کی رفعت میں اتنی پیشتروں کے خط و خال
کاہ اور اتنے عناصر کے مساعی کا مآل!

اک ہیولا اور یہ اشکال و اسمار کا ہجوم
جہلِ مطلق کے یہ خلنے میں یہ رقصِ علوم

ہر یک ساعت، برائے نالشِ یک بامداد
اتنی سعیٔ آب و آتش، اتنی جہدِ برق و باد

ایک شبنم اور اتنے تند شعلوں کی ترنگ
ایک حرف اور اتنے پہلو، اک نوا اور اتنے رنگ

اک کلی اور اس میں صدیوں کی متاعِ رنگ و بو
صرف اک لمحے کی رنگینی اور قرنوں کا لہو!

ہر قدم پر نصب اور اسرار کے اتنے خیام
اور اس منزل میں میری شاعری میرا کلام!

جس میں رازِ آسماں ہے اور نہ اسرارِ زمیں
ایک خس، اک دانہ، اک جو، ایک ذرہ بھی نہیں

نوعِ انسانی کو جب مل جائے گی رفتارِ نور
شاعرِ اعظم کا تب ہوگا کہیں جا کر ظہور!

خاک سے پھوٹے گی جب عمرِ ابد کی روشنی
جھاڑ دے گی موت کو دامن سے جب یہ زندگی

جب قوائے بحر و بر پر آدمی ہوگا سوار
جب بنے گا بندۂ مجبور الٰہِ روزگار

جب ہماری جوتیوں کی گرد ہوگی کہکشاں
تب جنے گی نسلِ آدم شاعرِ جادو بیاں

فکر میں کامل نہ فنِ شعر میں یکتا ہوں میں
کچھ اگر ہوں تو نقیبِ شاعرِ فردا ہوں میں

(سنہ ۱۹۵۰ء)

کب تک؟

بالآخر جوشؔ صاحب قبلہ یہ رنگینیاں کب تک
رہیں گے آپ یوں آوارۂ کوئے بتاں کب تک

کمر میں چاپ ہے خم کی تو بالوں میں دھندلکا ہے
یہ ذکرِ ماہِ نو تا کے، یہ فکرِ کہکشاں کب تک

سماعت سرنگوں ہے اور بصارت پا بہ جولاں ہے
یہ سازِ مہ وشاں تا کے، یہ نازِ گل رخاں کب تک

سفینہ غرق ہونے ہی پہ ہے عمرِ دو روزہ کا
تمناؤں کی یہ موجِ نفس پر کشتیاں کب تک

چراغِ عمر گل ہونے کو ہے بادِ مخالف سے
فضائے زندگانی پر یہ زلفوں کا دھواں کب تک

کفن کی صبح طالع ہو رہی ہے بامِ ہستی پر
ارے نادان! یہ ذوقِ حریر و پرنیاں کب تک

یہ دورِ عقل میں دل داریٔ ذوقِ جنوں تا کے
زمیں کی پستیوں میں یہ غرورِ آسماں کب تک

لبوں پر ثبت ہونے ہی کو ہے اب مہرِ خاموشی
حسینوں کے فسانے، کم سِنوں کی داستاں کب تک

یہ ذوقِ حسن صیادی حرم اندر حرم تا کے
یہ مشقِ گل شکاری بوستاں در بوستاں کب تک

جھلک کر رہے ہیں نقشِ قدم عمرِ گریزاں کے
نقابِ کیف میں چہرے کی آخر جھرّیاں کب تک

وقارِ نو کو بھی ظالم! جہاں بانی کا موقع دے
ارے پیرانہ سر یہ دولتِ طبل و نشاں کب تک

دیارِ نجد میں اُترا ہے لشکر نوجوانوں کا
یہ ضدِ اے ناقۂ لیلیٰ کے بوڑھے ساربان کب تک

دُرِ شبنم پہ سر رکھے رہے گی شعلگی تا کے
اطاعت برف کی کرتی رہیں گی بجلیاں کب تک

حکومت تجھ کو حاصل ہے دیارِ چشم و ابرو کی
مگر اس دستِ شل میں یہ حکومت کی عناں کب تک

اگر یونہیں شعاعوں کی رہیں گی باغ پر نظریں!
یہ بوئے یاسمن تا کے، یہ بوئے گلستاں کب تک

امارت مے کدے کی تجھ کو حاصل ہے مبارک ہو
رہے گا اس امارت کا مگر نام و نشاں کب تک

ادھر شامِ اودھ ہے اس طرف صبحِ بنارس ہے
مگر شامِ اودھ، صبحِ بنارس کا سماں کب تک

اُفق پر سرخیاں چھائی ہوئی ہیں شامِ خاور کی
شبِ مہتاب کے دھوکے میں یہ انگڑائیاں کب تک

سموم و صرصر و سیلاب کا ہنگام آ پہونچا
شراب و شعر و شمع و شاہد و ذوقِ جواں کب تک

یہ مانا جسم میں تاب و تواں ہے رُوحِ صہبا سے
مگر یہ جام سے مانگی ہوئی تاب و تواں کب تک

چراغِ کشتہ! یہ رعنائیِ برق و شرر تا کے؟
گدائے مے کدہ! یہ سطوتِ پیرِ مغاں کب تک

کہے جائے گا تا کے شامِ رنگیں صبحِ صادق کو
ارے جھٹلائے گا یہ شورِ ناقوس و اذاں کب تک

ہوا میں رقص، شاخوں میں لچک، موجوں میں جنبش ہے
مسافر! بسترِ مخمل پہ یہ خوابِ گراں کب تک

جرس ہے نعرہ زن، پچھلا پہر ہے، زرد ہیں تارے
ابھی ہے کوچ میں تاخیر، ہا یا یہ گماں کب تک

بڑی بجا و ری ہے شاخِ گل پر آشیاں ہونا
یہی رُت ہے اگر تو شاخِ گل پر آشیاں کب تک

بڑی دولت ہے دنیا کا کسی پر مہرباں ہونا
مگر دنیا ہے یہ، دنیا رہے گی مہرباں کب تک

سوا نیزے پہ سورج آ رہا ہے کر دیں لیتا
یہ سر پر لالہ و نسریں کا آخر سائباں کب تک

فضا کی رک چلی ہے سانس طوفانوں کی ہیبت سے
یہ جشنِ کشتی و مے خانۂ آبِ رواں کب تک

ہوا میں آہٹیں ہیں آندھیوں کی سنگ باری کی
یہ شمعوں کی چمک، یہ آبگینوں کی دکاں کب تک

اُچھل زنجیرِ در کھڑکا رہی ہے عیش کے بندے
چھلکتے گل، اُبلتی مُل، کھنکتی چوڑیاں کب تک

نصیب دشمناں آفت نہ کوئی جوش آجائے
مگر آفت تو آئے گی نصیبِ دشمناں کب تک

(سنہ ۱۹۴۹ء)

پچھوکا

یہ صُبح، یہ گلزار، یہ خنکی، یہ ترائی
گردوں پہ یہ گاتے ہوئے مُرغانِ ہوا باز

کاخوں پہ یہ دہکے ہوئے الوانِ سحر تاب
شاخوں پہ یہ مہکے ہوئے گل ہائے چمن ساز

پگھلی ہوئی چاندی کی یہ پستی میں روانی
ڈھلکے ہوئے سونے کی بلندی پہ یہ پرواز

یہ کنج میں دو زہرہ جبینانِ دل آویز
جذبات کی یہ صبح، جوانی کا یہ آغاز

شوخی و شرارت سے بہم کھیل رہی ہیں
دونوں ہمہ تن عربدہ، دونوں ہمہ تن ناز

گل ریز و خوش آمیز و سمن بیز و طرب خیز
طرار و فسوں کار و جنوں بار و دل افراز

بڑھتی ہیں، جھپٹتی ہیں، لپٹتی ہیں دمادم
آپس کی لگاوٹ میں یہ قمری ہے تو وہ باز

کھلتے ہوئے وہ رنگ تو کھلتا ہوا یہ کھیل
وہ حسن کا آئینہ، یہ تفریح کا غمّاز

یہ داؤں، یہ جھپٹیں، یہ چھلانگیں، یہ طرارے
یہ پیچ، یہ ٹکراؤ، یہ کشتی، یہ تگ و تاز

باہیں کبھی گردن میں تو شانوں پہ کبھی ہات
کھنچنے میں یہ ہیجان، چمٹنے میں یہ انداز

پھر سبزۂ خوابیدہ پہ اَلْعَظَمَۃُ لِلّٰہ
دونوں کے بھرے جسم کے گرنے کی یہ آواز!

آواز، جو انسان کی رگ رگ میں اتر جائے
آواز کہ ہو جس میں درِ جذبۂ دل باز

آواز میں چھاتی کو جو توڑے وہ کچوکا
جاں بخش و جگر دوز و جہاں سوز و جہاں ساز
اللہ ری آواز!

(سنہ ۱۹۳۸ء)

رُباعیات

دکھ شعر سے بے حساب پلٹے میں نے
ہر سانس میں سو عذاب پلٹے میں نے
اُگلے جب بحرِ دل نے سو لعل و گہر
تحسین کے کچھ حباب پلٹے میں نے

ابنِ آدم کو صاحبِ عرفاں کردو
کم بخت کو اب اور نہ گمراہ کرو
"اللہ" سے انسان ہے کب کا آگاہ
انسان سے انسان کو آگاہ کرو

یاں جیسی دھوپ ہے گلابی سایا
وہ سنا ہے سحابِ ابدیت چھایا
جوش آؤ کہ منتظر ہے بزمِ ارواح
"آیا، یارانِ رفتہ! آیا، آیا"

سر گھوم رہا ہے ناؤ کھیتے کھیتے
اپنے کو فریبِ عیش دیتے دیتے
اُف جہدِ حیات! تھک گیا ہوں معبود
دم ٹوٹ چکا ہے سانس لیتے لیتے!

انفاس میں کافور کی بو رکھتا ہے
رگ رگ میں جلا ہوا لہو رکھتا ہے
دوزخ اک ناچ گھر ہے اس کے نزدیک
گھر میں جو زنِ ستیزہ خو رکھتا ہے

اب مطرب وقت کا ترانہ ہے کچھ اور
بدلی ہوئی دنیا کا فسانہ ہے کچھ اور
ہاں نائکی طبع کی روکے ہوئے باگ
شبیر حسن خاں یہ زمانہ ہے کچھ اور

یہ راز تھا کیا؟ قلبِ تپاں! کیا معلوم
یہ سحر تھا یا وہم و گماں؟ کیا معلوم
مہتاب سے اک نگاہ آئی سوئے دل
اور رُک رُک کے چلی گئی کہاں؟ کیا معلوم

دل بے کسیِ ادب پہ تھرّاتا ہے
مرطوب فضا میں دم گھٹا جاتا ہے
فردوسی و رودکی سمجھتا ہوں اُسے
مصرع بھی مرا آج جو دہراتا ہے!

اک عمر سے زہر پی رہا ہوں اے دوست
سینے کے شگاف سی رہا ہوں اے دوست
گویا سرِ کہسار تنہا پودا
یوں اپنے وطن میں جی رہا ہوں اے دوست

باقی نہیں اک شعور رکھنے والا
صہبائے کہن سال کا چکھنے والا
کیا اپنے معانی کا میں رونا روؤں
الفاظ نہیں کوئی پرکھنے والا!

کچھ دادِ جگر کاویِ دم ساز تو دو
اک رشتۂ بے پا کو اذنِ پرواز تو دو
آتے نہیں سامنے جو یارانِ قدیم
کم بخت کی آواز پر آواز تو دو

نازک ہے بہت پچھلے پہر کا ہنگام
اچھا نہیں تختہ ہائے گل پر یہ خرام
اُس دل کو نسیمِ صبح گاہی نہ ٹٹول
جس کے کھنڈروں میں سو رہے ہیں گلفام

(۱۴)

طلوعِ فکر

جب چہرۂ افق سے اٹھی سرمئی نقاب   کانپے نجوم، زرد ہوا روئے ماہ تاب
کھنکے فلک کے جام کھلے سرخیوں کے باب   اڑنے لگا عبیر، برسنے لگی شراب

رنگوں کی آب و تاب بڑھانے لگی فضا
آہستگی سے ہوش میں آنے لگی فضا

چونکی زمیں تبسمِ پنہاں لیے ہوئے   افسانۂ شباب کا عنواں لیے ہوئے
روئے خنک پہ رنگِ شبستاں لیے ہوئے   آنکھوں کے جھٹپٹے میں چراغاں لیے ہوئے

تاروں کی چھاؤں جذب کیے چہرہ بن اٹھی
گویا پری فلک سے کوئی نازنیں اٹھی

گردوں سیاہ ابر کے پارے لیے ہوئے   پاروں کی جھلملی میں شرارے لیے ہوئے
کاجل بھری انکھڑیوں کے اشارے لیے ہوئے   چلمن میں بادلوں کے کنارے لیے ہوئے

طوفاں بہا دیے ہیں عجب پیچ و تاب کے
اور موجِ پیچ و تاب میں تختے گلاب کے

بے چین ظلمتوں میں بھٹکتی ہوئی فضا   نورِ کار ضو کی سر سے ڈھلکتی ہوئی ردا
کہرے کی وادیوں سے جھلکتی ہوئی ضیا   جس طور سے کہ بھاپ کی چادر میں آئینا

گویا نقابِ جلوۂ جاناں لیے ہوئے
یا شمع ہے کوئی تہِ داماں لیے ہوئے

نوخاستہ فضاؤں میں اک طرفہ پیش و پس   بجتا ہوا ندی میں ملائم نوا جرس
کھلتی ہوئی زمیں کی کہانی بہر نفس   شبنم کے آب و رنگ میں پچھلے پہر کا رس

گل چہرہ پتیوں پہ نگینے جڑے ہوئے
گوشِ چمن میں اوس کے بندے پڑے ہوئے

ہلتی سی ٹہنیوں میں زرافشاں سے برگ و بار   اٹھتی سی چلمنوں سے جھلکتا سا روئے یار
جنباں سی تیرگی میں سلونے سے مرغزار   رقصاں سی روشنی میں سہانا سا رہگزار

دن ہے کہ رات، ایک تزلزل سا رائے میں
طفلی کا اضطراب جوانی کے سائے میں

گردوں ادھر طلائی تو اس سمت نقرئی   یہ پارہ زمردی ہے تو وہ پارہ سرمئی
اک گوشہ کتھئی ہے تو اک گوشہ پستئی   مغرب جو آگری ہے تو مشرق ہے چمپئی

کانٹے پہ دلبری کے فضائیں تلی ہوئی
تا دورِ زلف و رخ کی دکانیں کھلی ہوئی

سوئے افق بڑھی جو ٹھٹکتی ہوئی ضیا   دوشیزۂ فضا کی مسکنے لگی قبا
آہستگی سے مہرِ تنک ضو ابھر چلا   بجنے لگا خیال میں سونے کا دائرا

برسا گلال ذہن پہ، کندن خیال پر
نوبت بجی منارۂ ذوقِ جمال پر

کچھ مل گئے سے نور میں سرخی گندھی ہوئی   تھرا کے آسماں سے زمیں پر پھیل گئی
پودوں نے سر اٹھائے گلستاں نے سانس لی   سبزے پہ کسمسائی سیہ چشم روشنی

ہر پنکھڑی میں دفترِ افسانہ کھل گیا
دوشِ فضا پہ ایک صنم خانہ کھل گیا

بڑھنے لگا شکوہ سے پھر کسمساتی ضیق   رہ رہ کے کروٹیں سی بدلنے لگی شفق
کھلنے لگا فضائے خنک پر نشانِ حق   گردوں کتابِ زر کے الٹنے لگا ورق

موتی گرے زمین پہ شاخیں لچک گئیں
بوسے لئے صبا نے تو کلیاں چٹک گئیں

دل نے نویدِ آمدِ فصلِ بہار دی   موجِ صبا نے دعوتِ چنگ و ستار دی
انوار نے وہ کسوتِ نقش و نگار دی   سلمے کی آسماں سے دلائی اتار دی

بالائے چرخ، صبح کا تارا چمک اٹھا
جیسے کسی چپلاقن کا بندا جھلک اٹھا

خورشید کی جبیں جو ذرا سی چمک گئی — لیلائے تیرگی کی کلائی مُڑک گئی
پھر ایک ضو جو دُرِ شفق سے جھلک گئی — گویا شرابِ تند سے مینا درک گئی
بنتِ عنب نے ہنس کے جو گھونگٹ اٹھا دیا
مشرق نے اک شراب کا دریا بہا دیا

منہ گلستاں میں لیلیٔ شب کا اُتر گیا — بھونرا فضائے باغ سے پرواز کر گیا
ہمکی زمین، سطح سے گلستاں اُبھر گیا — بہرِ نظارہ وقتِ گریزاں ٹھہر گیا
آیا جو لالہ زار میں جھونکا نسیم کا
اُترا غنودہ کنج میں ڈولا شمیم کا

پھوٹی کرن، زمیں کی گھٹن دُور ہو گئی — شبنم کی بوند بوند جھم نور ہو گئی
دنیا تمام جلوہ گہِ طور ہو گئی — ہر پنکھڑی جوان ہوئی، حور ہو گئی
تابشِ نویدِ شرح پئے صدر ہو گئی
گویا جہاں میں صبحِ شبِ قدر ہو گئی

ٹھنڈی ہوا دلوں کو جگاتی ہوئی چلی — پچھلے پہر کے گیت سناتی ہوئی چلی
ہر خواب گاہِ ناز میں گاتی ہوئی چلی — مکھڑوں پہ کاکلوں کو ہلاتی ہوئی چلی
دودِ چراغِ کشتہ کی زلفیں بکھر گئیں
فرفے بلے، بھوؤں کی کمانیں اُتر گئیں

چونکے نگار، ذہن میں جیسے کوئی قیاس — ناشستہ عارضوں میں لیے صبح کی مٹھاس
پنڈوں کی گرم بھاپ میں باسی گلوں کی باس — آنکھوں میں رنگ، رنگ میں خوابوں کا انعکاس
خوابوں کا انعکاس، کہانی لیے ہوئے
انگڑائیوں میں کیفِ جوانی لیے ہوئے

بجتی ہوئی ہواؤں میں بہکے ہوئے بدن — آنکھوں میں فرشِ خواب کی غلطیدہ پر شکن
ڈوروں کی سرخیوں میں یمِ بادہ موج زن — پیروں پر اینڈتے ہوئے سونے کا بانکپن
روندے ہوئے تمام دوشالے پڑے ہوئے
ٹوٹے ہوئے زمیں پہ مالے پڑے ہوئے

ڈھبے لٹوں کے سلسلے جبینوں کے ماہ میں		جیسے پیچیدہ کشمکش اشتباہ میں
راتوں کے پینگ سایۂ زلف سیاہ میں		بوجھی نہ جائے جو وہ پہیلی نگاہ میں

لبِ طعنہ زن مہارت بربط نواز پر
مکھڑے وہ گیت بج نہیں سکتے جو ساز پر

اعضا کے پیچ و تاب میں خواب گراں کی رَو		انفاس مشکبار میں سوزِ نہاں کی رَو
رنگیں لبوں پر آتشِ آبِ مغاں کی رَو		آنکھوں کی سطحِ سرخ پہ بیباک داستاں کی رَو

غلطیدہ فصلِ گل کی گھٹا چشمِ ناز میں
روداد شب تموجِ زلفِ دراز میں

انگڑائیاں جو آئیں تو آنکھیں چھلک گئیں		رگ رگ میں ولولوں کی کمانیں کڑک گئیں
رخسار پر شباب کی کلیاں چٹک گئیں		جو چوڑیاں خموش پڑی تھیں کھنک گئیں

موباف میں اسیر شبِ تار ہو گئی
جوڑا بندھا تو صبح نمودار ہو گئی

موجِ نسیم تان اڑاتی ہوئی چلی		مرغانِ خوش نوا کو جگاتی ہوئی چلی
پتلی کمر کا لوچ دکھاتی ہوئی چلی		زریں چھڑا کڑے سے بجاتی ہوئی چلی

کروٹ فضا پہ لی چمنِ روزگار نے
گل مت پڑے نقاب الٹ دی بہار نے

گھر سے چلے تو گھر گئے کرنوں میں سیم تن		سونا ہوا شباب کی چاندی پہ ضو فگن
گرمی سے بڑھ گئی لب و رخسار کی پھبن		ہیرے کی تختیوں پہ مچلنے لگی کرن

ہیروں کی آب و تاب جڑاؤ جبیں روپ میں
یا چاندنی کھلی ہوئی نو عمر دھوپ میں

الوان کا جلوس چلا کوہسار سے		چھا تکا کسی نے گوشۂ سرو و چنار سے
آنے لگی ہوائے فسوں لالہ زار سے		اٹھنے لگی دھوئیں کی گھٹا جوئے یار سے

لے کے بڑھے تو نور کی فوجیں ٹھٹک گئیں
گویا ہوا پہ سیکڑوں پنکھیں جھپک گئیں

جھٹکی، مڑی، روانہ ہوئی نور کی سپاہ　　دیکھے کلس اٹھائی در و بام سے نگاہ
ماتھے پہ آسمان کے کج ہو گئی کلاہ　　دکھلا دی فضا نے سرخ شلوکے میں قرصِ ماہ
سبزے کی روح مست ہوئی جھومنے لگی
شبنم کے موتیوں کو کرن چومنے لگی

چلنے لگیں ہوائیں، چہکنے لگے طیور　　رنگیں بلندیوں پہ چھنکا دلوں کا صور
ذرات کی جبیں سے اُبلنے لگا سرور　　پر پھڑپھڑائے جاگ اٹھا خاک کا غرور
جھونکوں نے حوصلوں کو بڑھایا جو سلن پر
اُڑنے لگا زمیں کا طبق آسمان پر

صحرا و دشت و وادی و گلزار و گل چکاں　　گنگ و جمن و رنگ گہربار و مے فشاں
دراج و کلنگ و قمری و طاؤس نغمہ خواں　　ملاح و موج و قلزم و کشتی رواں دواں
ساحل کے موڑ، سرخ کمانیں لئے ہوئے
موجیں تمام منہ میں زبانیں لئے ہوئے

اوجِ فضا پہ رایتِ زرتار گاڑ کر　　نکلی ضیا افق کا گریبان پھاڑ کر
ذرے لپائے خاک نے تارے اُجاڑ کر　　انگڑائی لی حیات نے افشاں کو جھاڑ کر
مستی چھٹی، لبوں کی چمک دور تک گئی
کنگن گھما دیا تو کلائی دمک گئی

ابٹن ہوا کی سرخ پہ گیندا سے ملا　　کنگنا کلائی میں جو بندھا کھل گئی فضا
کنجوں کو دھوپ چھاؤں کا جوڑا ملا ہوا　　بدھی پڑی گلے میں تو گلزار جھوم اٹھا
اُترا گلاب و قند بجز زہ تیاسے پر
سہرا بندھا جبینِ عروسِ حیات پر

جلووں کا سیل سوئے گوکل و نار سن مڑا　　صندل کا جلوس جانبِ گنگ و جمن مڑا
ذروں کی سمت ناقۂ لیلیٰ یمن مڑا　　دریائے سو بہ قلب طرفِ حسن قلب مڑا
لے لے کیا مست نگاروں نوا کی چھاؤں میں
گھنگرو بندھے نگاہِ خوشی کے پاؤں میں

لے ہندی الفاظ کے ساتھ اگر پھوتی کراہت نہ پیدا ہو تو عطف و اضافت جائز ہے

نئی نظمیں

(غیر مطبوعہ مجموعوں سے)

کیا گُل بدنی ہے

کس درجہ فسوں کار وہ اللہ غنی ہے
کیا موجۂ تابندگی و سیم تنی ہے
انداز ہے یا جذبۂ گردوں زدنی ہے
آواز ہے یا بربطِ ایماں شکنی ہے
جنگل کی یہ رات ہے یا زُلف گھنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

یہ لَے ہے کہ کھلتی ہوئی غنچے کی کمانی
مہکا ہُوا یہ تن ہے کہ یہ رات کی رانی
لہجے کی یہ رَو ہے کہ برستا ہُوا پانی
لرزش ہیں یہ مژگاں ہے کہ پریوں کی کہانی
یہ سُرخی لب ہے کہ عقیق یمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

محراب ہے رخسار کے پرتو سے زر افشاں
زلفوں میں شب تار ہے آنکھوں میں چراغاں
مہندی کی سجاوٹ کہ ہتھیلی پہ گلستاں
یا حلقۂ عشاق میں ہے چہرۂ تاباں
یا خاتمِ تابندہ پہ ہیرے کی کنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

سینے پہ یہ پلو ہے کہ اک موجِ حیا بی — ماتھا ہے کہ اک صبح کا پرتوِ شہابی
آنکھیں ہیں کہ بہکے ہوئے دو مست شرابی — پیکر ہے کہ انسان کے سانچے میں گلابی
گیسو ہیں کہ گل بازیٔ مشکِ ختنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

کاکل ہیں دُرافشاں ہے یہ پیشانیٔ رقصاں — یا سایۂ ظلمات میں ہے چشمۂ حیواں
ہاتھوں پہ ہے یہ چہرہ کہ ہے رحل پہ قرآں — اور چہرۂ گل رنگ میں غلطاں و خروشاں
رخشندگیٔ خونِ رگِ یاسمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

عشوے ہیں کہ اک فوج کھڑی لوٹ رہی ہے — چھل بل ہے کہ چھاتی کو زمیں کوٹ رہی ہے
انگڑائی کا خم ہے کہ دھنک ٹوٹ رہی ہے — مکھڑا ہے کہ پربت پہ کرن پھوٹ رہی ہے
قامت ہے کہ برنائیٔ سروِ چمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

تن میں ہے وہ خوشبو کہ ہیں گل سر بگریباں — چہرے پہ وہ سرخی ہے کہ حیران گلستاں
وہ چال میں ہے لوچ کہ شاخیں ہیں پشیماں — اور لعلِ گہر بار پہ وہ نغمہ ہے غلطاں
وہ نغمہ کہ اک ولولۂ شعلہ زنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

گردن میں چندن ہار ہے ہاتھوں میں ہے کنگن — اٹھتے ہوئے عشوے ہیں گرجتا ہوا جوبن
جولاں ہے جوانی کہ دھندلکے میں ہے ناگن — کورا ہے جو پنڈا تو جتوں خیز ہے اُبٹن
گل رنگ شلوکا ہے قبا نار وَنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

خلوت میں وہ تسلیم ہے جلوت میں تحکم — ساحل پہ سبک موج سفینے میں تلاطم
حجرے میں خموشی ہے شبستاں میں تکلم — نیمے میں تنک آہ، خیاباں میں ترنم

آغوش میں تلوار ہے گھونگھٹ میں بنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

ہر نقش قدم پر ہے فدا تاجِ کیانی — ہر گام میں ہے چشمۂ کوثر کی روانی
ہر ایک بُنِ مُو سے اُبلتی ہے جوانی — اٹھتی ہے مسامات سے یوں بھاپ سی سہانی

گویا کوئی مہکی ہوئی چادر سی تنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

آنکھوں میں ہے یہ کفر کہ ایمان ہے میرا — عارض پہ ہے یہ خال کہ حوروں کا ہے ڈیرا
پلکوں کی ہے یہ چھاؤں کہ مستی کا سویرا — رخ پر یہ لٹیں ہیں کہ دھواں دھار اندھیرا

قامت پہ یہ مکھڑا ہے کہ نیزے کی انی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

جس طرح دھندلکے میں ہو اک رنگ سا غلطاں — جیسے کہ سحر کنج میں آہستہ خراماں
جس طرح اُڑے بام پہ زربفت کا داماں — جیسے کہ دھواں عود کا سندر میں پریشاں

رخسار پہ یوں صبح کی اعفا شکنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

اس سن میں بھی اٹھتی ہیں حسینوں پہ نگاہیں — قدموں کے تلے اب بھی جوانی کی ہیں راہیں
اب بھی یہ تمنا ہے ملیں پھول سی باہیں — اصنام کو ممکن ہے کہ ہم جوش نہ چاہیں

گھٹی میں پڑی عاشقی و برہمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

(۱۹۵۹ء)

جوشؔ ملیح آبادی

آگ

آگ یعنی سوزِ خلوت پرور و جلوت نواز   گرمیٔ ذوقِ صعود و عنصرِ گردن فراز
رنگِ مل کی کارفرما، بوئے گل کی کارساز   موجِ نور و موجِ رنگ و موجِ رقص و موجِ ناز

چاندنی راتوں میں لہروں کی روانی کا نکھار
آنچ کے مانند لہراتی جوانی کا نکھار!

آگ، دانائی، تامل، دور بینی، آگہی   آگ، جولانی، حرارت، مسکراہٹ، روشنی
آگ ہستی، سرخوشی، مستی، جوانی، زندگی   آگ، گویائی، خطابت، شاعری، پیغمبری

اولیا کی جلوہ باری انبیاء کی روشنی
گبر کا ایمان، ترسا کے خدا کی روشنی

طاہر و تابندہ و رخشندہ و شفاف زرق   زرنگف، زریں کمر، لغزیدہ پا، ژولیدہ فرق
خسروِ رفتار و جنبش، تاجدارِ غرب و شرق   دل بر تابندگی، حورِ چراغاں، بنتِ برق

نوعروسِ لالہ بار و سیلیٔ پرویں جبیں
شاہدِ شامِ ملیح و دخترِ صبحِ مبیں!

خون کی گردش میں غلطاں نبض کی رو میں رواں   تازہ صبحوں میں عیاں اجلائی راتوں میں نہاں
شمع کی ضو میں یقیں، گرداب کی رو میں گماں   آگ حرفِ اولین خطبۂ خلاقِ جہاں!

ہاں نخستیں شمعِ جاں افروز دل کے طاق کی!

سب سے پہلی مسکراہٹ لیلیٰ آفاق کی!

کُندنی شعلوں کا بربط جیسے مکھڑوں کا ساز — بادۂ باراں کا تجسّس لالہ و نسریں کا ناز

موجۂ آبِ حیات و شعلۂ آہن گداز — پاک باطن پاک جوہر پاک طینت پاک باز

سُرمئی راتوں کو زرّیں چادروں میں ڈھانپتی

ناچتی، پہلو بدلتی، سن سناتی، کانپتی

شعلہ کار و تُند و مغرور المزاج و گرم رَو — زندہ و رقصندہ و جوّالہ و غلطیدہ ضَو

شعلگی ہائے دمادم آب و تابِ نَو بہ نَو — جس میں زہرہ کی کمر کا لوچ وہ طرّارِ نو

گھومتی، گھِرتی، گرجتی، گونجتی، گاتی ہوئی

آنچ کے سنگیت میں ہر پور چٹخاتی ہوئی

آگ مطرب کا ترنّم، آگ تاروں کا گداز — آگ طوفانِ نیاز و چشمۂ طغیانِ ناز

آگ روئے رنگ پرور، آگ چشمِ نیم باز — آگ جوہر کی حیا، پرور توانائی کا راز

یہ نگارِ برق وش، ہر سوز میں ہر ساز میں

گرمئ انفاس میں ہے شعلۂ آواز میں!

آگ کی جولانیاں ہر جوہرِ محلول میں — حلقۂ مشموم میں، مشروب میں، ماکول میں

راکھ میں، پھوبل میں، ذرّوں میں، دھوئیں میں، دھول میں — برف میں، شبنم میں، یخ میں، پرنیاں میں، پھول میں

اس تپاں گردوں کرّے کے خشک و تر میں آگ ہے

دشت کے سینے میں، دریا کے جگر میں آگ ہے

آگ یعنی ہر نظر میں روشنی کے سُو خیام — الدغا جہل و کوری کا دُکھتا اذنِ عام

رویتِ اشکالِ اشیا، کا درخشاں اہتمام　　　مژدۂ تابندۂ تکمیلِ چشمِ ناتمام

اک درخشانی زمانے کی کتاب اُلٹے ہوئے

ایک چٹکی اور دو عالم کی نقاب اُلٹے ہوئے

دولتِ جیبِ نظر، سرمایۂ جانِ بخور　　　موجِ الوانِ بہاراں، اوجِ گلبانگِ طیور

سرخیٔ افسانۂ دیدار و اشراقِ ظہور　　　آبِ مہتاب، یدِ بیضا و تابِ شمعِ طور

کوہِ سینا پر خراماں بال بکھرائے ہوئے!

عشق کو بے ہوش کرنے کی قسم کھائے ہوئے

نفحِ تاب و تب کی ضامن فیضِ حدت کی کفیل　　　قعرِ دوزخ میں بلا، ایوانِ جنت میں جمیل

گاہ موجِ کینہ پرور، گاہ موجِ سلسبیل　　　غیظ میں نمرود، وقتِ ناز گلزارِ خلیل

عرصۂ پرخاش میں گرزِ گراں تولے ہوئے

حجلۂ اخلاص میں بندِ قبا کھولے ہوئے

اور سرتابی کا جب ہیجان بن جاتی ہے آگ　　　اک قیامت آفریں ہیجان بن جاتی ہے آگ

گمرہی کا آتشیں میلان بن جاتی ہے آگ　　　اژدر و عفریت کیا، شیطان بن جاتی ہے آگ

بندگی کو نذرِ استکبار کر دیتی ہے آگ

حکم دیتا ہے خدا انکار کر دیتی ہے آگ

اور جب خوش ہو تو پیغامِ بقا دیتی ہے آگ　　　زندگی کو اپنے دامن کی ہوا دیتی ہے آگ

ظلمتوں کو دولتِ نور و ضیا دیتی ہے آگ　　　سنگ کو یاقوتِ احمر کی قبا دیتی ہے آگ

اور اسے ڈھونڈو تو فرِّ سروری دیتی ہے آگ

سروری کیا چیز ہے، پیغمبری دیتی ہے آگ!

(۱۹۵۹ء)

جوش ملیح آبادی

لافانی حروف

لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں، لکھ رہی ہیں انگلیاں
ذہنِ خالق کی حکایت زندگی کی داستاں

جوت ہیرے کی جگاتے کوئلے کے انگ میں
دامنِ طرزِ بیاں کو ڈوب دیتی رنگ میں

روشنائی سے جھمکتے خال و خط کو اچھالتی
گیسو و رخسار میں نوکِ قلم کو ڈھالتی

سُرمئی سطروں پہ دوڑاتی شعاعِ دل نشیں
سنگ موسیٰ کو عطا کرتی نقوشِ مرمریں

فکر کو الواستی[1] مسطر کی جوئے سلک پر
سرخوشی میں رقص فرما کر صریرِ کلک پر

چشمۂ حیواں کو چھلکاتی رہِ ظلمات میں
صبح کے مکھڑے کو چھلکاتی اندھیری رات میں

دائروں میں بند کرتی گیسوؤں کے پیچ و خم
سسکیوں کی تھرتھراہٹ زمزموں کا زیر و بم

یخ کدے میں آتشِ ابلاغ بھڑکاتی ہوئی
دل کی پرتیں کھولتی لفظوں کو چمکاتی ہوئی

اوجِ معنی کو فروغِ کہکشاں دیتی ہوئی
بے زباں افکار کے منہ میں زباں دیتی ہوئی

ولولوں کو معرضِ تحریر میں لاتی ہوئی
بیلِ تفصیل کی ہر پور چٹخاتی ہوئی

ذہن کے دھارے کو ساحل کا سکوں دیتی ہوئی
نرم پوروں سے ادب کی کشتیاں کھیتی ہوئی

دل کے خونِ تازہ کی بوندوں کو ٹپکاتی ہوئی
روئے قرطاس و قلم پہ پھول برساتی ہوئی

---

[1] کورے برتن کو مانجھ کر استعمال کے قابل بنانا۔

ناچتی، گاتی، تھرکتی، شوخیاں کرتی ہوئی
سینۂ کاغذ میں دل کی دھڑکنیں بھرتی ہوئی

بے صدا معنی کو شیشوں کی کھنک دیتی ہوئی
ولولوں کے آسمانوں کو دھنک دیتی ہوئی

خلعتِ باطن کی زریں آستیں چنتی ہوئی
کلکِ جنباں سے تخیل کی ردا بنتی ہوئی

عارضِ قرطاس کو، نوکِ قلم سے چومتی
دوڑتی، مڑتی، ٹھٹکتی، گنگناتی، جھومتی

کانپتی میزان پر ارض و سما کو تولتی
ذہن کے عقدوں کو لرزاں ناخنوں سے کھولتی

جیب میں ڈالے سکوتِ شیب و کل بانگِ شباب
لکھ رہی ہیں داستانِ قعر و تاریخِ حباب

کھپ رہے ہیں سینۂ کاغذ میں سنداں و بلور
ڈھل رہے ہیں، دائروں میں لالہ و سرو و طیور

انگلیوں سے گر رہے ہیں، زندگی کے آبشار
خامشی میں بج رہے ہیں فکرِ جولاں کے ستار

لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں صبح و شام
موجِ گیتی کے ترانے، اوجِ گردوں کے پیام

لکھ رہی ہیں گیت، فریادیں، ترانے، چہچہے
ہچکیاں، سرگوشیاں آنسو، دعائیں، قہقہے

قہقہوں کی گونج میں پازیب جھنکاتی ہوئی
آنسوؤں کو موتیوں کے ہار پہناتی ہوئی

یوں رواں ہیں وقت کے سیلاب میں با صد وقار
نوح کی کشتی ہے گویا دوشِ طوفاں پر سوار

لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں انگلیاں
ماجرا در ماجرا و داستاں در داستاں

پھر جھکیں گی انگلیاں جس وقت معنی کے ایاغ
جل اٹھیں گے صحنِ قرطاس میں لاکھوں چراغ
مڑ گئیں سطروں کی گلیوں میں بہے گی طرفہ نہر
ساحلوں پر جگمگا اٹھیں گے آگاہی کے شہر
شمسۂ قصرِ ہنر پر جھل جھلائیں گے حروف
تاجِ سلطاں کی دمک پر مسکرائیں گے حروف
جگمگا اٹھیں گے یوں لفظوں میں دریائے عدن

شاعروں کی مفلسی شاہوں پہ ہوگی خندہ زن
حرف بن کر یوں دلِ افلاس کے دہکیں گے داغ
جھلملا جائیں گے ایوانِ امارت کے چراغ
دائروں میں رکھ چکیں گے انگلیاں جب وقتِ دام
نصب ہو جائیں گے کاغذ پر تخیل کے خیام

اور جب نم روشنائی کو سکھا دے گا سفوف　　　قصر ہائے سنگ بن جائیں گے تب نازک حروف
آئیں گے پھر لشکرِ دوراں کی زد پر یہ قصور　　　ان پہ جھپٹیں گے سنین ان کو جھنجھوڑیں گے شہور
جھونکتے ارض و سما کڑکائیں گے ان پر کماں　　　ان کو روندیں گے کروڑوں ونگڑوں کے کارواں
ان پہ بولے گا ہتھوڑا وقتِ پُر اجلال کا　　　گھن بجے گا ان پہ عالم کوبِ ماہ و سال کا
جاہلوں کی ٹولیاں ان کو گرانے آئیں گی　　　ان پہ اوچھے ناقدوں کی تیوریاں منڈلائیں گی
ان پہ گرجے گا فقیہانِ سبک سر کا خضاب　　　ان پہ کڑکے گا چھچھورے پادشاہوں کا عتاب
یہ اسائے جائیں گے تاج و کمر کی دھوپ میں　　　ان کو پھٹکیں گے مبلغ داڑھیوں کے سوپ میں
ان کو مسلیں گی بھیانک ایڑیاں کہسار کی　　　برچھیاں ان میں چبھیں گی ثابت و سیار کی

ان کو لاکھوں خیرہ سر طوفان ڈھانے آئیں گے　　　ان سے لاتعداد اندھے زلزلے ٹکرائیں گے
ان کو روندیں گی ہزاروں پلٹنیں ظلمات کی　　　ان کو کھرچیں گی کروڑوں چھینیاں لمحات کی
ان پہ برسے گی مسلسل آگ بھوبل دھول برف
پھر بھی تو دیتا رہے گا تا ابد ایک ایک حرف

پیشِ افتابِ ہنر گردن اٹھا سکتا ہے کون　　　کمترِ فن کار کو دنیا میں ڈھا سکتا ہے کون
جھینپتا ہے دیکھ کر ان کے تراوں کا جمال　　　خانقاہوں کا تجمل، بارگاہوں کا جلال
کانپتا ہے انکسارِ طبعِ شاعر کے حضور　　　بادشاہوں کا تکبر، دیوتاؤں کا غرور
متصل جھکتی ہے بہرِ دولتِ علم و یقیں　　　ان کے بابِ خاتمِ عصیاں پہ عصمت کی جبیں

اُن کے لیے مشعلیں رکھ کر بقا کے طاق میں
گونجتے رہتے ہیں پیہم گنبدِ آفاق میں

قتل ہونے پر بھی ان کا رتبہ کم ہوتا نہیں
حشر تک ان کے قلم کا سر قلم ہوتا نہیں

مانگتی ہے بھیک میں گونگی زمیں ان سے زباں
ان سے آنکھیں مانگنے آتا ہے اندھا آسماں

اُن سے ہے بینا و گویا نازنینِ کائنات
یہ نگاہِ گیتی و گردوں میں آوازِ حیات

دہر کو ہے ناز اُن کی جودتِ خلاق پر
مرحبا ان حارثانِ انفس و آفاق پر

ان کے عرشِ زندگی پر عرش برساتا ہے پھول
ان کے دروازوں کو آ کر کھٹکھٹاتے ہیں رسول

اور اُٹھ جاتے ہیں جب دنیا سے یہ اربابِ راز
دیوتا آتے ہیں پڑھنے کو جنازے کی نماز

نوعِ انسانی کبھی اُن کو بھلا سکتی نہیں
موت کی آندھی چراغ اُن کے بجھا سکتی نہیں

ہم نشیں! تاریخ شاہد ہے کہ اقطابِ سخن
باندھتے ہیں سر پہ سہرا جب پہنتے ہیں کفن

سانس رکتی ہے تو کارِ نغمہ کرتے ہیں شروع
تیرگی میں ڈوب کر قبروں سے ہوتے ہیں طلوع

نغمۂ پائندۂ گیتا و قرآں کی قسم
بول اُٹھے اک بار تو بجھتی نہیں شمعِ قلم

جھینپتی ہے تابشِ تاج و علم کی چاندنی
کھیت جب کرتی ہے شاعر کے قلم کی چاندنی

کون آئے فکر کے تاج و علم کے سامنے
کانپتی ہے تیغِ چنگیزی قلم کے سامنے

طرۂ طرفِ کُلہ پر مسکراتا ہے ادب
لرزشِ مژگاں سے تاروں کو بجھاتا ہے ادب

راکھ میں تبدیل ہو جاتی ہے شمعِ قیصر و جم
سرنگوں ہوتی نہیں قندیلِ سرکارِ قلم

موج زن ہوتا ہے جن میں خونِ خاصانِ شعور
کانپتی ہے فوجِ صرصر ان چراغوں کے حضور

اوّل اوّل آندھیوں میں سنسناتا ہے ادب
پھر انہیں اپنے چراغوں پر نچاتا ہے ادب

روز و شب کی سلطنت کو فتح کرتے ہیں حروف
قبر میں جاتا ہے شاعر اور اُبھرتے ہیں حروف

ناز کر اے دل کہ آہ وارفتوں کے درمیاں
لکھ رہی ہیں، لکھ رہی ہیں، لکھ رہی ہیں انگلیاں

(۱۹۶۰ء)

جوش ملیح آبادی

پہلا دیباچہ

باز، گل بانگ پریشاں می کنم

میرے کلام کا یہ سب سے پہلا مجموعہ ہے جو ستر رنگین و سادہ تصویروں کے ساتھ سنہ ۱۹۲۰ء میں ملیح آباد سے شائع ہوا تھا۔ یہ میرے اُن بیتے ہوئے دنوں کی سادہ و رنگین یادگار ہے جو اب کبھی واپس نہیں آسکتے۔ اس کتاب میں میرا موسم بہار سانس لے رہا ہے۔ اور میری مسیں بھیگتی ہوئی جوانی محو سرود ہے —— ہر چند اس دیباچے کی تحریر کے وقت بھی اپنے موسم بہار کے اختتام کو تسلیم نہیں کر رہا ہوں، لیکن وہ زمانہ ہی کچھ اور تھا —— عنفوانِ شباب کی کلی کے چٹکتے وقت خون میں جو چہکا لگانے والی حرارت، جذبات میں جو شدت اور شگفتگی موجود ہوتی ہے اور عقل میں ناتجربہ کاری کی بنا پر جو ایک کجروی اور خامی پائی جاتی ہے اور ان کے لطیف امتزاج سے نوجوانی کے سر پر جو ایک افسوں بدوش و افسانہ بار گھٹا سی چھائی رہتی ہے، اس کی شرح تو غیر لمبی بات ہے آگے چل کر کوئی اس موسم برق و باراں کے تصور تک کو اپنے دماغ میں اجاگر کرے تو یہ سمجھے، کہ وہ غیر معمولی انسانوں سے بھی کچھ بڑھا ہوا آدمی ہے۔

اس کتاب میں میرا نو برس کی عمر سے لے کر سنہ ۱۹۲۰ء تک کا کلام ہے۔ میں نے نو برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا —— "شعر کہنا شروع کر دیا تھا" یہ بات میں نے خلاف واقعہ اور غلط لکھی، کیوں کہ یہ کسی انسان کی مجال نہیں کہ وہ خود سے شعر کہے۔ شعر اصل میں کہا نہیں جاتا وہ تو اپنے کو کہلواتا ہے —— اس لئے صحیح طرز بیان اختیار کر کے مجھے یہ لکھنا چاہئے کہ نو برس کی عمر سے شعر نے مجھ سے اپنے کو کہلوانا شروع کر دیا تھا —— جب میرے دوسرے ہم سن بچے پتنگ اڑاتے اور گولیاں کھیلتے تھے، اس وقت کسی علیحدہ گوشے میں شعر مجھ سے اپنے کو کہلوایا کرتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ پتنگ اڑانے اور گولیاں وغیرہ کھیلنے کے فن سے میں اب تک ناواقف ہوں —— شاعری سے جب فرصت پاتا تھا تو یہ میرا محبوب ترین شغلہ تھا کہ ایک اونچی سی میز پر بیٹھ کر اپنے ہم عمر بچوں کو، جو جی میں آتا تھا، اناپ شناپ درس دیا کرتا تھا۔ درس دیتے وقت میری میز پر ایک پتلا سا بید رکھا رہتا تھا۔ اور جو بچہ توجہ کے ساتھ میرا درس نہیں سنتا تھا، اُسے میں بید سے اس بری طرح مارتا کہ بے چارا چیخیں مار کر رونے لگتا تھا۔ اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ میں کسی کند ذہن بچے کے کاندھے پر سوار ہو کر اسے اس طرح بید مار کر دوڑاتا تھا

کہ وہ قریب بے دم ہو کر گرنے لگتا تھا ــــ اور میرے مزاج کی یہ وہی بنیادی تختی ہے جو میری سیاسی خطیبانہ شاعری میں تیغ و ترش لہجہ بن کر آج بھی نمودار ہوتی رہتی ہے اور میری شاعری کا نقاد میرے لہجے کی درشتی پر چیخ چیخ اٹھتا ہے۔

میں لڑکپن میں بلا کا شعلہ خو تھا۔ غیظ و غضب کا یہ عالم تھا کہ ایک ذرا سی خلاف مزاج بات پر میرے ہر بُن مُو سے چنگاریاں نکلنے لگتی تھیں۔ ہر چند تیس فی صدی زمانے کی گردش اور ستر فی صدی تفکر اور تدبر اور محبت نے میرے مزاج کو اب اس قدر بدل دیا ہے کہ مجھے اپنی اس قلب ماہیئت پر خود حیرت ہوتی ہے ــــ پہلے صرف حیرت ہوتی تھی اور اب ایک تحسین آمیز خوش گوار حیرت کا احساس ہوتا ہے ــــ لیکن اس قلب ماہیت کے باوجود حماقت و غباوت پر مجھے آج بھی غصہ اور گاہ گاہ شدید غصہ آجاتا ہے۔ اور یہی وہ غصہ ہے جو میری سیاسی نظموں میں جیسا کہ بیان کر چکا ہوں جھلکا کرتا ہے ــــ جانتا اور خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ جس شخص میں جتنی مقدار غیظ و غضب کی ہوتی ہے اسی نسبت سے اس کی ذات میں حکمت اور بصیرت کی کمی ہوتی ہے ؎

دریائے فراواں نہ شود تیرہ بہ سنگ
عارف کہ برنجد، تنک آب است ہنوز

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں اپنی موجودہ خطیبانہ شاعری کے لہجے کی توجیہ کرنے لگا۔ لیکن 'روح ادب' کو اس سے کیا واسطہ۔

ہاں تو میں لڑکپن میں بچوں کو بید کے ذریعے سے درس دیا کرتا تھا۔ لیکن زیادہ وقت شاعری میں صرف ہوتا تھا۔ ــــ شاعری کرتے ہوئے یہ میری چوتھی پشت ہے۔ میرا لڑکا سجاد حیدر اور میری لڑکی بھی موزوں طبع ہے۔ اگر آئندہ یہ دونوں شاعری کریں گے تو ؎

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

کہنے کے بہر طور مستحق ہوں گے ــــ میرے باپ بھی شاعر تھے۔ دادا جی اور پردادا جی، جن کا تخلص گویا اور نام حسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں تھا ــــ لیکن میرے والد نے شاعری سے مجھے ہمیشہ روکا اور سختی کے ساتھ روکا ــــ

"بیٹا شاعری منحوس چیز ہے۔ اگر اس میں پڑو گے تو تباہ ہو جاؤ گے:

یہ تھا میرے باپ کا انتباہ آمیز قول، جسے وہ اکثر دہرایا کرتے تھے۔

ایک روز میں نے بڑی جسارت سے کام لے کر ڈرتے ڈرتے اپنے باپ سے سوال کیا تھا کہ "آپ اور دادا میاں بھی تو شعر کہتے ہیں، وہ تو تباہ نہیں ہوئے۔ میں کیوں تباہ ہو جاؤں گا؟"

مجھے اچھی طرح وہ وقت یاد ہے کہ میرے باپ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر میرے اس سوال کا یہ جواب دیا تھا کہ ــــ

"چار پانچ پشتوں سے ہماری جائداد لڑکوں اور لڑکیوں میں تقسیم ہوتی چلی آ رہی ہے اور بالخصوص تمہارے دادا نے اپنے چھ اور سولہ لڑکے اور لڑکیوں میں اپنے تعلقے کو جس طور سے تقسیم فرما دیا ہے اس کے یہ کھلے ہوئے معنی ہیں کہ جو جائداد میرے حصے میں آئی ہے، وہ میرے بعد تم تینوں بھائیوں اور چاروں بہنوں میں تقسیم ہونے کے بعد ہرگز اس قابل نہیں رہے گی کہ ایک شاعر کی لاابالی طبیعت اور اس کے ذوق خانماں بربادی کو برداشت کر سکے:"

چنانچہ وہی ہوا جس کا میرے باپ کو اندیشہ تھا۔

اس مجموعے کی اشاعت کے وقت میرے گرد و پیش کی دنیا اور میرے تاثرات و حالات کیا تھے؟ اس مختصر سے دیباچہ میں اس کی گنجائش نہیں نکالی جا سکتی۔ یہ داستان میں اپنی خود نوشت سوانح میں بیان کروں گا۔ جو ہنوز ضبط تحریر کی ابتدائی منزلوں سے گزر رہی ہے۔

یہاں مختصراً اتنا کہوں گا کہ مادّی حیثیت سے وہ میری انتہائی فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ گھر میں دولت پانی کی طرح بہتی پھرتی تھی، اور اسی کے دوش بدوش اقتدار و حکومت کا طنطنہ شامل حال تھا ـــــ زندگی اور زندگی کی تلخیوں سے قطعی ناواقفیت اور دردمندانِ انسانیت کے مشاہدے نیز حیات کے تلخ تجربات سے ہمیشہ بیگانگی تھی۔ البتہ ان تمام فارغ البالیوں کے باوجود، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کوئی شے رہ رہ کر میرے دل میں چبھا کرتی تھی، وہ کوئی شے تھی کیا مجھے اس کا مطلق علم نہیں تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے حسین مناظر سے خوشی اور حسنِ انسانی سے دکھ محسوس ہوا کرتا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ بات میرے دائرۂ علم سے خارج تھی۔

نیز اس زمانے میں یاد ہے بجز ایک کافی مدت تک میں نماز کا بھی نہایت سختی کے ساتھ پابند ہو گیا تھا۔ نماز کے وقت خوشبوئیں جلاتا اور کمرہ بند کر لیتا تھا، اور گھنٹوں رکوع و سجود میں کھویا ہوا رہتا تھا۔ اسی دور میں میں نے داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ چارپائی پر لیٹنا اور گوشت کھانا ترک کر دیا تھا۔ ایک مشہور سجادہ نشین کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی تھی ـــــ وہ وجد جو جیسے صوفیائے کرام تجلیات کہتے ہیں میرے قلب کو حاصل ہوئی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر میرے آنسو نکل آتے تھے، اور بالخصوص گریۂ نیم شبی اور آہِ سحری کے وقت تو ایسا محسوس ہوتا گویا میرا دل بہہ رہا ہے۔ اور میرا تمام وجود تھا سے نیلی گوں میں اتر رہا ہے۔

میں کبیر داس اور ٹیگور کی شاعری کا دلدادہ اور حافظ شیراز کا پرستار تھا۔ حافظ کے ساتھ تو مجھے اس قدر شغف تھا کہ صبح کی نماز سے بہت پیشتر اٹھ کر میں غسل کرتا، تازہ پھول شیشے کی پلیٹ میں رکھتا۔ اگر اور عود جلاتا، اور حافظ کا کلام گنگناتا اور ایک نشے کے عالم میں جھوما کرتا تھا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حافظ کی روح میرے گرد و پیش رقص کر رہی ہے۔

یہ وہی زمانہ تھا کہ میں محبت کو حیات سے برتر ایک مقدس آسمانی چیز سمجھتا، اور محبت کی تلخ شیرینیوں میں گم ہو جانے کو حیاتِ انسانی کا سب سے بڑا کارنامہ خیال کرتا تھا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود دہشت و اضطراب کے ساتھ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا تھا جیسے میرے دماغ کے اندر کوئی خطرناک کہانی لکھی رہی ہے جو کاتبِ تقدیر مجھ سے میری اس دنیائے لطافت کو چھین لے گی ـــــ چنانچہ وقت گزرتا گیا، اور کہانی کھلتی چلی گئی۔ اور کچھ مدت کے بعد مجھ میں ایک باغیانہ میلان پیدا ہو گیا، اور ترقی کرنے لگا، اور آخر کار نوبت یہ ہوئی کہ میری نمازیں ترک ہو گئیں۔ داڑھی منڈ گئی۔ گریۂ نیم شبی اور آہِ سحری کا سلسلہ ختم ہو گیا ـــــ اور اب میں اس منزل میں آ گیا جہاں ہر قدیم اعتقاد اور ہر پارینہ روایت پر اعتراض کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور اعتراضات بھی تمسخر انگیز، و اہانت آمیز ـــــ

جب میرے خیالات و اقوال کا کارواں اس راستے پر آہستہ آہستہ گامزن ہونے لگا تو میرے مرحوم باپ کو سخت اندیشہ پیدا ہو گیا کہ میں گمراہ ہو جاؤں گا۔ انہوں نے مجھے بڑی نرمی اور احتیاط کے ساتھ سمجھانا اور ایک مدت تک سمجھاتے

سنگ آکر آخر کار دھمکانا شروع کر دیا۔ مگر مجھ پر اس کا اثر کوئی نہیں ہوا اور آبائی عقائد و روایات سے میری بغاوت بڑھتی ہی چلی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے باپ نے وصیت نامہ تحریر فرما کر میرے پاس بھیج دیا کہ اگر اب بھی میں اپنی ضد پر قائم رہوں گا تو وہ اس وصیت نامے کو جس میں انہوں نے مجھے جائداد سے محروم کر کے میرے نام صرف سو روپے کا ماہانہ وظیفہ مقرر فرما لیا تھا، رجسٹر کے آہنی صندوق میں داخل کر کے میرے مستقبل کو تندارِ محرومی میں ہمیشہ کے واسطے مقفل فرما دیں گے۔

لیکن مجھ پر اس کا بھی مطلق اثر نہیں ہوا۔ اور یہ وصیت نامہ اس کے دوسرے ہی دن ملیح آباد کے ڈسٹرکٹ جج کے صندوق میں بند کر دیا گیا ——

لیکن چھ ماہ کے بعد جس وقت کہ میں اپنے کمرے میں دوپہر کے وقت ایک عجیب خواب دیکھ رہا تھا، ماما نے مجھے جگایا اور کہا:

"میاں بلا رہے ہیں!"

چنانچہ میں اپنے باپ کے پاس پہونچا۔ سر جھکائے ہوئے اور ادب کے ساتھ ——

میرے مشفق باپ نے مجھ سے کہا:

"شبیر —— !"

اور میں نے آنکھیں اٹھائیں تو دیکھا، میرے باپ کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہیں ——

"یہ دیکھو دوسرا وصیت نامہ! جس نے جائداد میں تمہارا حصہ تمہارے دونوں بھائیوں کے برابر کر دیا ہے" میرے باپ نے تھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔

مجھ پر باپ کی شفقت اور اس وقت کی حالت کا یہ اثر پڑا کہ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ کہ اتنے میں میرے باپ کی آواز پھر گونجی:

"شبیر! اس دولت، اور جائداد کی خاطر لوگ ماں باپ اور بھائی بہن تک کو مار ڈالتے ہیں۔ اور یہاں تک کہ ایمان بھی کھو دیتے ہیں، مگر تم نے اس دولت اور جائداد کی اپنے اصول کے سامنے ذرہ برابر بھی پروا نہیں کی۔ مجھے تمہاری یہ استقامت بہت پسند آئی۔ اگر تمہارا سا آدمی مجوسی بھی ہو جائے تو بھی اس کی عزت کرنی چاہیے۔"

مجھ پر باپ کی اس بے پناہ شفقت کا بہت اثر ہوا اور میرا دل باپ کے روبرو اور بھی جھک گیا۔ لیکن باغیانہ خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ——

یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ میں اس موقع پر جس کو اپنے "باغیانہ خیالات" کا لقب دے رہا ہوں، وہ اس وقت مذہب سے روگردانی اور الحاد نہیں تھا، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آبائی عقائد اور پارینہ روایات کا طلسم باقی نہیں رہا تھا اور اس کی جگہ ایک دوسرا مذہبی اثر میرا احاطہ کر چکا تھا جس کا ایک رُخ تو میرے باپ کو بہت پسند تھا لیکن دوسرے رُخ اور اس رُخ کی شدت کو وہ نہایت غیر مستحسن خیال فرماتے تھے ——

یہ تھے میرے حالات و خیالات جس وقت "روحِ ادب" عالمِ وجود میں آئی تھی۔ اور یہی وہ زمانہ تھا کہ محبت کی تیز دھار میری رگِ دل کو چھو کر رنگین ہو چکی تھی۔

جی تو یہ ساختہ چاہتا ہے کہ میں اُس اولیں واردات محبت کو، اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے تمام دیگر واقعاتِ رنگیں کو اس دیباچے میں درج کروں، اور دنیا کو یہ بتا دوں کہ حسن کی زلفوں کی کمندوں نے کتنی بے پایاں نیاز مندیوں کے بعد میرے ناز کو گرفتار کرنے کی سعادت حاصل کی تھی۔ لیکن ڈرتا ہوں، بیان کرنے سے ڈرتا ہوں۔ اپنی رسوائی سے نہیں، اپنے صیادوں کی رسوائی سے ڈرتا ہوں کہ کہیں اُن کی جبینِ ناز پہ شکنیں نہ پڑ جائیں ــــ بہرحال مجموعی حیثیت سے اس موقع پر میں صرف اس قدر کہہ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں محبت کے معاملے میں ہمیشہ خوش قسمت اور عرفی کے اس شعر کا مصداق رہا ؎

آنہا کہ آہوان حرم را کنند صید
در آرزوئے ناوک صید افگن من اند

اور یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں آنسو، آہیں اور سینہ کوبیاں بہت ہی کم ہیں۔ کیوں کہ یہ چیزیں ناکامی اور انفعالیت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور میں ان چیزوں سے شاذ ہی دوچار ہوا ہوں۔

اب آپ کو کسی قدر اندازہ ہو گیا ہو گا کہ "روح ادب" کی تصنیف کے وقت میرا کیا عالم اور کیا ماحول تھا ــــ لگے ہاتھوں اس بات کا ظاہر کر دینا بھی بہت ضروری ہے کہ اس مجموعے میں میرے استاد کی اصلاح کا ایک حرف بھی موجود نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرحوم حضرت عزیز لکھنوی کا میں شاگرد تھا۔ لیکن جب یہ کتاب مرتب ہو رہی تھی میں نے اُن کی تمام اصلاحوں کو اس سے خارج کر دیا تھا۔ تاکہ میں نے جس طور سے بھی جو کچھ کہا ہے، وہی ملک کے سامنے پیش ہو۔ اور میری انفرادیت پر حرف نہ آنے پائے ــــ اس بات سے میرے مرحوم استاد مجھ سے ناخوش بھی ہو گئے تھے۔ لیکن اگر وہ آج زندہ ہوتے تو میرے نزدیک وہ اس قدر ذہین انسان تھے کہ اب وہ میری اس گستاخی کی قدر کرتے.....

مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس مجموعے میں کہاں کہاں اغلاط پائے جاتے ہیں، اور اب میرے واسطے نہایت آسان تھا کہ میں اس کتاب کو ان اغلاط سے پاک کر دیتا، مگر چونکہ یہ امر اولاً دیانت کے خلاف ہوتا، اس لئے میں اس سے باز رہا۔ اس کے علاوہ اگر میں ایسا کرتا، تو میرے کلام کی تحقیقات کرنے والا دھوکے میں مبتلا ہو کر میری شاعری کے باب میں صحیح ترین رائے قائم کرنے میں ناکام رہتا ــــ نیز اس لحاظ سے بھی مجھے یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا کہ آثارِ قدیمہ میں ترمیم و تنسیخ کرنا ایک شدید بے رحمی ہے۔ اس مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ شاعری کی جانب ٹیگور نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ غزلیں آبائی اور ماحولی اثرات کا نتیجہ ہیں۔ اور نظموں کے باب میں مَیں وحیدالدین صاحب سلیم کا شکر گزار رہوں گا کہ اس صنفِ صحیح کی جانب سب سے پہلے انہیں بزرگوار نے مجھے توجہ دلائی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ غزل پر مرحوم ہی نے اس قدر چوٹیں ماری تھیں کہ میرے دل کو اس غیر فطری صنف سے پھیر دیا تھا ــــ آپ میری اس وقت تک کی شاعری کی عمارت کو یونہی دیکھ چکے ہیں۔ اب میں اس عمارت کی خشتِ اول کو آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ یہ خشتِ اول کج ہے یا راست ؎

اے دل نہ سنا عہدِ طرب کی باتیں　　　رنگین فسانہ ہائے شب کی باتیں
بکھری ہوئی زلف سانس مہکی مہکی　　　اے خانہ خراب ہیں یہ کب کی باتیں!

("روحِ ادب")　　　(اختر لکھنوی)

جوش ملیح آبادی

دوسرا دیباچہ

انتقاد و انتخاب تقریباً ناممکن چیز ہے۔ اس راہ میں اتنے زبردست پیچ و خم ہیں کہ منزل تو ملتی نہیں، البتہ راہ رو خود گم ہو جاتا ہے۔ اور اکثر و بیشتر اس گم شدگی کے عالم میں، جہاں کہیں ٹھنڈی چھاؤں ملتی ہے، اسی کو منزل فرض کرکے، وہیں ٹھہر جاتا ہے۔

انتقاد کی موٹی موٹی تین قسمیں ہیں:

(۱) تخیلی انتقاد۔ (جو آج کل عام ہے)

(۲) تخریبی انتقاد۔

(۳) تحقیقی انتقاد۔

اب ان پر باری باری نگاہ ڈالیے:

(۱) **تخیلی انتقاد** — یہ آج کل کا وہ مروج طرزِ نقد ہے جس میں ناقد ادیب و شاعر سے تقریباً بے نیاز ہوکر صرف اپنی جانب متوجہ رہتا ہے۔ آئینے میں اپنے خال و خد دیکھتا ہے یعنی اپنے ہی چہرے کے عکس میں شاعر کے چشم و ابرو کو پیش کرتا ہے۔

اس طرز میں ناقد اپنے ذوقِ ادب کے انتشار، اپنے ذہن کی تخلیقی قوت کے اعلان، اور اپنے نفسیات کے اظہار میں اس درجہ خود مستغرق ہو جاتا ہے کہ حقیقی انتقاد کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

ہر چند اس روش میں ایک انوکھا پن، ایک اُپج، ایک ادبی تراش خراش، ایک شاعرانہ آن بان، اور نفسیاتی تحلیل کی دلچسپی و افادیت تو ضرور پائی جاتی ہے، لیکن اس میں ادیب و شاعر بیشتر "ناشتہ پیدا، دریا نہاں" سراب عیاں، حقیقت کم اور افسانہ زیادہ پایا جاتا ہے۔

(۲) **تخریبی انتقاد** — یہ محض ادبی حاسدوں کا میدان ہے۔ اور کچھ نہیں۔ اس طرز کو صرف وہی افراد پسند اختیار کرتے ہیں جو احساسِ کمتری کی بیماری میں گرفتار رہتے ہیں۔ اور جنہیں قلق کے ساتھ اس کا احساس ہوتا ہے کہ قدرت نے انہیں قوائے تخلیق سے یکسر محروم رکھا ہے۔ اور جب وہ اربابِ تخلیق کی سرفرازیوں کو دیکھتے ہیں تو ان کے دل مسعود حوال گھٹنے

لگتا ہے، بلکہ وہ اس دھوئیں کی سیاہی سے ارباب تخلیق کا منہ کالا کرنے کی ناکام سعی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس میدان میں وہ دراز دستی بھی کرتے ہیں۔ دکھانے لگا کرتے ہیں، جو زندگی کے کسی موڑ پر خیالات و عقائد کے تصادم و اختلاف کی بنا پر کسی ادیب یا شاعر سے بگڑ جاتے ہیں۔ اور اظہار غیظ و غضب کا سب سے آسان طریقہ انہیں یہی نظر آتا ہے کہ وہ اس ادیب یا شاعر کا منہ چڑانے لگیں۔ اس کے خلاف مضمون اور رسالوں میں پروپیگنڈہ کریں۔ اس کے آرٹ کو توڑ مروڑ کر پیش کریں۔ ادب کے صحیح مسلمات کو غلط طور سے استعمال کر کے اس میں عیوب نکالیں اور یہ ثابت کریں کہ اس کے ادب و شعر میں نہ ترغمق ہے نہ پاکیزگی، وہ مخرب اخلاق ہے۔ ادب کثیف پیش کرتا ہے، اور ملک کے نوجوانوں کو خدا اور مذہب کا باغی بنا رہا ہے وغیرہ اور الفاظ میں سے اس بخش تحریک ہیں کہ اس قبیل کے حضرات آج کل انہیں الفاظ کے کھیلے اور معنی و مفہوم سمجھے بغیر لکھا اور بولا کرتے ہیں۔

(۳) **تحقیقی انتقاد** —— یہ راہ متذکرۂ بالا دونوں راہوں سے قطعی مختلف بھی ہے اور شدت کے ساتھ صعوبت انگیز بھی۔ سب سے پہلی اور شاید لاعلاج دشواری اس سلسلے میں یہ ہے کہ:

(الف) ناقد یا تو منقود کو پہلے سے پسند کرتا ہوگا یا نا پسند (جس کے بے شمار معلوم و نامعلوم اسباب ہو سکتے ہیں)

(ب) یا ناقد اگر اس کا ہم عصر و شناسا ہے تو اسے منقود سے محبت کو ہ مناسبت ہو گی یا نفرت و کدورت، یا کم سے کم اجتناب و وحشت۔ اور ان دونوں اور ان کے مماثل تمام دیگر حالات میں بے لاگ انتقاد کا پیدا ہونا امکان سے خارج ہے۔

اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری دشواری بھی جو پہلی دشواری کی طرح اغلباً ناقابل حل ہے، یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کا کلام و کردار ناقد کے عقائد و روایات کے خلاف واقع ہوا ہے تو بظاہر استبعاد ہے کہ بے تعصب ناقد بھی شاعر کے ساتھ انصاف برتنے سے قطعی طور پر قاصر رہ جائے گا۔

ان متذکرہ بالا دونوں قباحتوں کے بعد اب حقیقی انتقاد کی شرطیں ملاحظہ فرمائی جائیں۔ سب سے پہلی، اور سب سے زیادہ اہم شرط یہ ہے کہ:

ناقد شاعر کی روح کو اپنے میں جذب کر لے اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ناقد خود شاعر کا ہم خیال، ہم رنگ، اور ہم مذاق نہ ہو) اور ظاہر ہے کہ یہ صورت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ناقد:

(الف) شاعر کے ماضی و حال تا زمستقبل کے میلان، شاعر کے کلیات و نظریات، عقائد و اصول، آغاز، بلوغ و عادات، تعلیم و تربیت، محاسن و معائب، مزاج و ماحول، موروثی خصوصیات اور جغرافیائی اثرات سے کماحقہٗ واقفیت پیدا کرلے اور یہاں تک کہ خلوت و جلوت کی مسلسل و بے محابا ہم نشینی کی معرفت شاعر کے مرغوبات و معمولات پر کامل طور سے حاوی ہو جائے۔

(ب) شاعر کے زمانے کی خصوصیتوں (تقاضوں اور ادبی، معاشرتی اور سیاسی تحریکوں کو بخوبی ذہن نشین کرلے۔

(ج) تقریباً ان تمام تخیلی و عملی راستوں سے خود بھی گزرے جن سے شاعر گزرا یا گزر رہا ہے۔

(د) اور ہر نظم کے باب میں، اسے براہ راست یا کم سے کم معتبر ترین وساطت سے یہ معلوم ہو کہ اس کا پس منظر کیا تھا، اور وہ جذبے کے تموج میں لکھی گئی تھی یا تمکین میں۔

ان شرطوں میں سے اگر ایک شرط بھی رہ جائے گی، ناقد حقِ انتقاد سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے گا، اور اس کا تمام تحریری عمل ناقص، ناتمام، پیچیدہ، غلط، مبہم اور گمراہ کن ہو کر رہ جائے گا۔

یہاں تک تو ذکر تھا انتقاد کا، اب انتخاب کی طرف آیئے۔ سو یہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس راہ میں بھی ایسے ایسے ہفت خواں ہیں جن کا طے کرنا معمولی دل گردے کا کام نہیں۔

انتقاد کے باب میں جن دشواریوں اور شرطوں کا ابھی ذکر ہوا ہے تقریباً ان سب کو انتخاب پر بھی شامل کرنے کے بعد انتخاب کی مخصوص دشواریاں ملاحظہ فرمایئے، فرض کیجئے کہ انتخاب کے وقت

(۱) انتخاب کرنے والے کا موڈ خراب یا مزاج ناساز ہے۔

(۲) اس پر کوئی خاص جذبہ طاری ہے۔

(۳) رات یا دوپہر کی غذا یا موسم کی شدت ذہن پر برا اثر ڈال رہی ہے۔

(۴) یا دفعتاً کسی کرخت، غمگین یا میٹھی آواز نے اس کے نظامِ اعصاب و عملِ ذہن میں یکایک اختلال پیدا کر دیا ہے تو ان تمام حالتوں اور ان کے مماثل تمام دیگر حالات میں صحیح انتخاب ناممکن ہو کر رہ جائے گا۔

اب دُور گردانی کر کے اس پر غور فرمایئے کہ خود شاعر اپنے کلام کا انتخاب کر رہا ہے۔ سو یہ بھی کوئی کھیل نہیں ہے۔ ہرچند بظاہر یہ بہت آسان بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بھی تقریباً وہی دشواریاں اور پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسروں کے مقابلے میں، ہر شخص اور بالخصوص ہر شاعر اپنی ذات و شاعری سے اس قدر واقف ہوتا ہے کہ دوسروں کے واسطے اتنی معرفت ممکن نہیں ہے۔ لیکن انسان اتنا حیرت ناک اور پیچیدہ حیوان ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی طباع و فطین کیوں نہ ہو، ثباتِ عقل و فکر کی موجودگی میں یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ اسے اپنی ذات کی معرفتِ تام حاصل ہو چکی ہے ؎

ہمارے حال کو دنیا بھلا کیا جان سکتی ہے
بسا اوقات جب ہم خود غلط اندازہ کرتے ہیں!

اور یہ غلط اندازے دو وجوہ کی بنا پر قطعی فطری چیز ہیں، ایک وجہ تو یہ ہے کہ شدید ترین حبِ ذات کی بنا پر ہم اپنے ہر نقص و عیب پر خوش نما پردے ڈال کر خود اپنے کو فریب دیا کرتے ہیں، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی ذات سے چونکہ انتہائی قرب حاصل ہوتا ہے اس لئے یہ انتہائی قرب ہمارے واسطے اس بات کو بے حد دشوار بنا دیتا ہے کہ ہم اپنے کو اچھی طرح دیکھ اور پرکھ سکیں ؎

ہے سب سے بڑا فاصلہ قرب کا حل
اپنی خلوت سرا میں جاؤں کیوں کر!

سوا اس صورت میں یہ بہت ممکن ہے کہ،

(۱) شاعر نے اپنی ذات و شاعری کے متعلق جو رائے قائم کی ہو وہ قطعی غلط یا صحیح کم اور غلط زیادہ ہو۔

(۲) نیز انتخاب کے وقت اس کا موڈ خراب یا مزاج ناساز گار ہو۔

(۳) اس وقت اس پر کوئی خاص جذبہ شدت کے ساتھ طاری ہو۔

(۴) رات یا دوپہر کی غذا، یا موسم کی شدت ذہن پر برا اثر ڈال رہی ہو۔

(۵) ان شخصیتوں میں سے بعض یا اکثر سے اُس کے دل میں فرق آ گیا ہو، جن سے اُس کی بعض نظمیں وابستہ ہیں۔

(۶) دفعتاً کسی کرخت، غمگین یا سُریلی آواز نے نظامِ احساس و عملِ انتخاب میں اختلال پیدا کر دیا ہو۔

(۷) اچانک طور سے کوئی ایسی موروثی خصلت، یا ایسی ماحولی کیفیت قوت کے ساتھ ابھر آئی ہو، جو بعض نظموں کو اعلیٰ اور بعض کو ادنیٰ قرار دیتی ہے۔

(۸) اور وہ ماضی کے بعض عقائد و نظریات اور معمولات و مرغوبات کو ترک اور بعض دوستوں اور عزیزوں سے مایوس اور بعض محبوبوں سے دل برداشتہ ہو چکا ہو۔ اور اس میں بعض نئے خیالات پختہ ہو چکے اور بعض پختہ ہو رہے ہوں۔ بعض قدیم عادات و خیالات فنا ہو چکے ہوں، اور بعض فنا ہو رہے ہوں۔

تو ان تمام حالتوں اور ان کے مماثل تمام دیگر حالات میں خود شاعر بھی اپنا صحیح ترین انتخاب کرنے سے قاصر رہ جائے گا، اور ان تمام نظموں کو نظر انداز کر دے گا خواہ شاعرانہ حیثیت سے وہ کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہوں جو اس کے موجودہ نقطۂ نظر اور اس کی وقتی کیفیت سے اب کوئی تعلق نہیں رکھتی ہیں۔

بہرحال اس میدان کا اور چھوڑ اور اس دریا کی تھاہ نہیں مل سکتی ہے۔ اور مجبور ہو کر یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ حقیقی انتخاب و انتقاد تقریباً امکان سے خارج ہے۔ اور جب خود ادیب و شاعر اس سے بہ احسن الوجوہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تو بے چارے ناقد سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

لیکن اس کے باوصف اپنے ناشر کے پاسِ خاطر سے میں اس کام کو انجام دے رہا ہوں۔ کیوں کہ ہر نامراد مصنف اپنے بامراد ناشر کے پاسِ خاطر پر مجبور ہوا کرتا ہے۔

خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم

"خطا نمودہ ام" کی حد تک تو یہ مصرع یہاں بجا طور سے چسپاں ہو رہا ہے۔ لیکن "چشمِ آفریں دارم" کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

اب تک میری جتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، تقریباً اُن سب کا انتخاب اس میں شامل کیا گیا ہے لیکن اس کا نہایت سختی کے ساتھ اہتمام کیا گیا ہے کہ انتخاب نہایت ہی مختصر رہے۔ ظاہر ہے کہ اس انتہائی اختصار کی بنا پر سیکڑوں ایسی نظموں کو نظر انداز کر دینا پڑا ہے، جو اس مجموعے کی نظموں کے بالکل مساوی اور ہم مرتبہ و ہم وزن ہیں۔

اختصار کے باعث ہر قدم پر یہ مشکل پیش آئی ہے کہ دو مساوی حیثیت کی نظموں میں سے کس کا انتخاب کیا جائے اور ہر مرتبہ آنکھیں بند کر کے، بلا وجہ معقول، ایک کو اختیار اور ایک کو نظر انداز کر دینا پڑا ہے۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کتاب کا حجم کچھ ساڑھے چھ سو صفحے کا ہو جاتا۔ اور کاغذ کی نایابی اور گرانی کے زمانے میں اتنی ضخیم کتاب کی طباعت میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

اس انتخاب عمل کے نو پھاٹک ہیں، ان میں سے انتخاب کی خاطر میں نے ہر پھاٹک کو کھٹکھٹایا۔ بعض پھاٹک جلد کھل گئے بعض کے کھلنے میں دیر اور بعض میں بہت دیر لگی۔ اور بعض کے کھلنے میں تو لوہے لگ گئے۔ اور دو پھاٹکوں نے تو

یہاں تک ستایا کہ سیڑھی لگا کر کودنا اور انہیں اندر سے کھولنا پڑا۔

اور جب ایک ایک کرکے تمام پھاٹک کھول لیے تو دبے پاؤں ان کے احاطے میں داخل ہوا، خشک پتیاں میرے قدموں کے نیچے کراہنے اور شاخوں کے درمیان تنے ہوئے جالے میری پیشانی سے مس ہو ہو کر بجنے اور ٹوٹنے لگے۔ آگے بڑھا تو گزرے ہوئے ماہ و سال ایک ایک کرکے سامنے آنے لگے۔ بیتی ہوئی گھڑیوں نے اپنے چہروں سے آہستہ آہستہ نقابیں اٹھائیں اور بھولی بسری وارداتوں اور کہی ان کہی کہانیوں نے سرگوشیاں شروع کر دیں۔

اوہ ماضی کی سیر۔ رُوح فرسا و زہرہ گداز ماضی کی سیر۔ میں دوبارہ ان روشوں سے گزرا، ان کنجوں میں گنگنایا، ان چشموں کے سامنے رویا، ان لچکتی شاخوں کی چھاؤں میں سر جھکا کر کھڑا ہوا، ان ساحلوں پر ٹہلا، ان موڑوں پر ٹھٹکا، ان ریگستانوں میں دوڑا، ان رنگین پہاڑوں پر چڑھا، ان خلوت کدوں میں نمناک آنکھوں اور خشک ہونٹوں کے ساتھ داخل ہوا، ان کی پگھلی ہوئی شمعوں کے موم پاروں کو حسرت و عبرت کے ساتھ دیکھا، جہاں یادش بخیر میری نوعمری کھیلا کرتی تھی، جہاں میری مسیں بھیگی تھیں، جہاں طلوع و غروب کی رنگینیوں میں پہلے پہل مجھ پر الہام کے موتی اور لب و رخسار کے پھول برسے تھے، اور جہاں میری نوجوانی انگاروں سے دہکی اور پنکھڑیوں سے مہکی ہوئی نوجوانی جھوما کرتی تھی۔

میں نے اس انتخاب کی خاطر دوبارہ ان شبستانوں کو روشن، ان باغوں کو شاداب، ان آسمانوں کو پُرسحاب، ان زمینوں کو سرسبز، ان دریاؤں کو رواں، ان امنگوں کو رقصاں، ان تاروں کو لرزیدہ، ان رشتوں کو پیچیدہ، ان جلوؤں کو غلطاں اور ان رخساروں کو فروزاں کیا جو میری نوجوانی کی محبوب ترین متاع اور میری نوعمری کے تاج کے دمکتے ہوئے ہیرے تھے۔ ایسے ہیرے جن کے ہر گوشے پر صدہا کوہِ نور قربان کیے جا سکتے ہیں۔

میں نے پھر ایک بار ان سہانی صبحوں کو ذہن کے افق پر طالع کیا جو میری شباب کی شبنم آلود سبزہ زاروں پر مسکرایا کرتی تھیں۔ میں نے پھر ایک بار ان سلونی شاموں کو آواز دی جو سرخ لبوں اور سیاہ زلفوں کے سائے میں تارے چمکایا کرتی تھیں۔ میں نے دوبارہ ان دوستوں کو ذہن میں حاضر کیا جن کے قہقہوں سے میرے چہرے پر سرخی دوڑ جایا کرتی تھی۔ ان میں سے جو زندہ ہیں، ماہ و سال کی پرچھائیاں ان کے چہروں کی شادابی کو ڈھانک چکی ہیں، اور جو اس کہنہ سرا میں اب موجود نہیں ہیں ان کی پیشانیاں میرے آنسوؤں کے اندر جھلکا کرتی ہیں۔

غرض کہ اس انتقاد کے چلتوں میں نے ایک ایک کرکے ان تمام و بجھتے ہوئے ولولوں کو اپنے دُکھتے ہوئے دل میں برانگیختہ کیا جو کبھی میرے وجود پر آتش فشانی کیا کرتے تھے۔ اور اپنے دل کو دوبارہ ان مجالوں اور خیالوں، نیز ان راتوں اور وارداتوں سے ڈسوایا جن کا زہر کبھی میرے رگ و پے میں دوڑتا پھرتا تھا۔

عمر کی اس خنک و سنجیدہ منزل میں ماضی کے بھڑکتے جذبات کو جگانا اور دورِ پیشیں کے پھنکارتے ہوئے ولولوں سے اپنے کو دوبارہ ڈسوانا ایک ایسا زبردست سانحہ ہے جس کی نظیر شہدائے مجاہدانہ کارناموں کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی ؎

نکلی لبِ گل سے آہ، خوشبو بن کر — آئی سرِ نیم رسیدہ آہو بن کر
سرسے گئی دل میں ان کی تصویر لئے — شعلہ سا لپکنے لگی آنسو بن کر!

("سیف و سبو")

جوش ملیح آبادی

الفاظ اور شاعر

الفاظ کو کاغذ پر روشنائی کی لکیریں نہ سمجھو وہ تو بے جان لکیریں ہیں نہ ہوا کی گرہیں۔
الفاظ تو ذی حیات ہیں۔ انسانوں کی روحِ ذی حیات۔
الفاظ بھی آدمیوں ہی کی طرح پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ بیمار پڑتے اور تندرست ہوتے ہیں۔ بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ گوشہ نشین رہتے اور سفر کرتے ہیں۔ یہ بھی اپنے اپنے خاص مزاج، عادات، رسوم، روایات اور تاریخی واقعات رکھتے ہیں۔ ان کی دنیا میں بھی ذات پات اور مذہب و معاشرت کا رواج ہے۔ یہ بھی انجمنیں اور سوسائیٹیاں بناکر رہتے، اور ترقی کے مدارج سے انہیں بھی گذرنا پڑتا ہے۔

ان میں بھی مختلف نسلیں، خاندان اور شجرے ہوتے ہیں۔ اور ہر خاندان اپنے ہی عزیزوں اور کفو میں شادی کرتا ہے۔
الفاظ پر بھی لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے کی فضائیں آتی ہیں، ان میں بھی بعض تو ہم انسانوں کی طرح نیک نام ہوتے ہیں اور بعض بدنام۔ بعض عبائیں پہنے ہوئے دیوتاؤں کے مندروں میں رہتے ہیں، بعض دستاریں زیبِ سر کئے ہوئے درباروں میں، اور بعض ننگے پاؤں بازاروں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ بعض کے ہاتھ چومے جاتے ہیں۔ اور بعض جب دروازے پر آتے ہیں تو انہیں دھتکار دیا جاتا ہے۔

ان میں متقی و پرہیزگار بھی ہوتے ہیں اور آزاد و خراباتی بھی۔ ان میں امیر بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی۔ متوسطین کا طبقہ ان میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا رہتا ہے۔
الفاظ میں بھی ہم انسانوں کی طرح بعض الفاظ انتہا درجے کے شریف، رقیق القلب اور بردبار ہوتے ہیں اور بعض بلا وجہ کے مفسد، سفاک اور دل آزار۔ ان میں سے بعض تو باغی قسم کے ہوتے ہیں، اور بعض چپراسی ذہنیت کے۔ بعض بزم کے رسیا ہوتے ہیں اور بعض رزم کے مرد میدان۔ بعض کی کمروں پر تولانبے پرتلوں کی تلواریں لٹکی رہتی ہیں اور بعض گلے میں پھولوں کی بدھیاں، اور کانوں میں سونے کے در پہنتے ہیں۔
لیکن تمام الفاظ میں یہ ایک عجیب مشترک و عمومی خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ بے حد باہم رہنا پسند کرتے ہیں۔ ملتے تو سب سے ہیں مگر اپنے کونے دیئے ہوئے۔ معلوم نہیں یہ شرمیلے ہوتے ہیں کہ مغرور۔ مگر ان سب کی یہ عادت ہے کہ

جلد بے تکلف ہو جانے کو بہت ہی برا سمجھتے ہیں اور دیرآشنائی پر کاربند رہتے ہیں۔

آدمی کے حافظے کی کمزوری یا درس و تدریس کے شوق نے نہایت ہی گستاخی کے ساتھ انہیں لغات کی نمائشی الماریوں میں سجا دیا ہے۔ یہ ان الماریوں میں طوعاً کرہاً بیٹھے تو ہیں مگر بڑی چالاکی کے ساتھ انہوں نے اپنے چہروں پر نقابیں ڈال رکھی ہیں، تاکہ انہیں بآسانی پہچانا نہ جاسکے۔ اور مکمل خط و خال تو کبھی نمایاں ہی نہ ہوسکیں۔

جب تک کوئی اللہ کا بندہ ان کے پیچھے نہ پڑ جائے، اُن کی گلیوں کی خاک نہ چھان ڈالے، مہینوں نہیں برسوں ان سے ملے جلے نہ، اُن کی میزبانی نہ کرے، ان کے گھر مہمان نہ رہے، سالہا سال تک ان کے ساتھ نشست و برخاست نہ رکھے، ان کی غمی شادی میں شریک نہ ہو، ان سے رشتہ ناتا نہ جوڑ لے۔ اُن کی نبضوں کی رفتار، ان کے خون کی گردش، اور ان کے خاندانی و ذاتی خصوصیات کو نہ پرکھ لے، اُس وقت تک یہ مغرور یا شرمیلے الفاظ اس سے بے تکلف نہیں ہوتے۔ اور اسے اپنے مزاج کی افتاد اور اپنے اسرار سے آگاہ کرنا پسند نہیں کرتے۔

انسانوں کے بے شمار طبقوں میں سے صرف ادیبوں اور شاعروں کے دو ایسے طبقے ہیں جن سے ان کی بے تکلفانہ رسم و راہ اور مخلصانہ دوستی ہے۔

ادیبوں سے ہرچند ان کی ملاقات دوستانہ اور مخلصانہ ہوتی ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے گھر اکثر آیا جایا بھی کرتے ہیں۔ لیکن بعض نازک مزاج، اسرار پسند اور نخوت پرور، اونچے گھرانوں کے الفاظ ان سے کھل کھیلنا اور خلاملا رکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ اگر ادیبوں کے سامنے آتے بھی ہیں تو ان شوخ و شنگ لڑکیوں کی طرح جو دور سے تو خوب لگاوٹ دکھاتی ہیں لیکن جب اُن کا دامن پکڑ لینے کے لئے لپکو تو انگلیاں چٹکاتی اور ٹھینگے مارتی ہوئی اُلٹے پاؤں بھاگ جاتی ہیں۔

البتہ شاعروں کے ساتھ ان کا برتاؤ دوستوں ہی کا سا نہیں، قرابت داروں کا سا ہوتا ہے۔ وہ شاعروں سے اس طرح ملتے جلتے ہیں جیسے ایک ہی گھر کے مختلف افراد، یا ساتھ کھیلے ہوئے لنگوٹیا یار۔

شاعروں کو انہوں نے یہاں تک اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جب چاہیں اُن کے لباس تبدیل کر دیں، اُن کی لَے اور رنگ بدل دیں، اُن کا رُخ موڑ دیں، ان کے معنوں میں تنگی یا وسعت پیدا کر دیں۔ ان کے خط و خال میں کمی بیشی فرما دیں۔

شاعر سے اُن کے گھروں کی عورتیں، بلکہ کنواریاں تک پردہ نہیں کرتیں۔ وہ جب چاہے دوپہر ہو یا آدھی رات، بے دھڑک اُن کے گھروں اور خوابگاہوں میں آ جا سکتا ہے۔

شاعر کے سامنے آتے ہی ہر نسل اور ہر مزاج ان نسلوں اور مزاجوں کا جھگڑا بھول جاتے ہیں۔ ذات پات اور رنگ و مذہب کی کوئی آویزش باقی نہیں رہتی۔ وہ سب ایک ہی تھالی میں کھاتے، ایک ہی کوزے میں پیتے، اور ایک ہی جلسے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ شاعر کا مکان الفاظ کی عبادت گاہ ہے۔ جہاں ادنیٰ و اعلیٰ اور شاہ و گدا ہر قسم کے الفاظ ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں، اور صفوں میں ایسی شائستگی ہوتی ہے جیسی راگنی کے بولوں میں ہم آہنگی۔

اکثر اوقات روحانی لمحوں اور وجدانی ساعتوں میں جب کہ شاعر کے احساسات انگڑائیوں پر انگڑائیاں لینے لگتے ہیں، الفاظ کی ٹولیوں کی ٹولیاں، جن میں بوڑھے، جوان، لڑکے اور لڑکیاں سب ہی ہوتے ہیں، شاعر کے پاس ہواؤں کے دوش پر آتے ہیں، اور اس کی معنویت کے گرد حلقہ باندھ کر اس طرح ناچتے اور گاتے ہیں کہ کبھی تو ماہی سے ماہ تک تبسم ہی تبسم چھلکنے لگتا ہے اور کبھی ذروں سے لے کر ستاروں تک آنسو ہی آنسو نظر آتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی

اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت

نوع انسان کے مصلح بننے کا خیال کس قدر مضحکہ خیز خیال ہے! انسان، انسان کی اصلاح کر سکتا ہے؟ کیا یہ محض واہمہ نہیں جو صرف بہکی ہوئی ذہنیت ہی کی پیداوار ہو سکتا ہے؟

میں پوچھتا ہوں، انسان خود اپنی اصلاح بھی کر سکتا ہے؟ اور کیا یہ ایک عریاں حقیقت نہیں ہے کہ انسان خود اپنی اصلاح کے باب میں بھی قطعی بے دست و پا ہے؟ اور بے دست و پائی کے باوجود نوع انسانی کی اصلاح کے خواب دیکھنا مسخرگی نہیں تو کیا ہے؟

"تو بہ خویشتن چہ کردی، کہ بما کنی نظیری؟"

افسوس، اے مجبور و ناچار انسان! افسوس، کاش تو اپنی ہی اصلاح کر سکتا۔ لیکن ؎

او نامراد، تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

میں ارباب عقل و عمل سے دریافت کرتا ہوں کہ اس مجبوری کے باوجود اور اس بے چارگی کے باوصف ہمارا انسانوں کے مصلح بننے کا تخیل کیا عظیم الشان قدرت کی بارگاہ میں ایک احمقانہ اور ناقابل معافی گستاخی نہیں؟

انسان تو اس عظیم المرتبت کرۂ ارض کا فرزند اور اس عظمت آفریں نظام شمسی کا بچہ ہے جو سنگ ریزوں کو جواہر پاروں اور مادۂ بے حقیقت کو پیکر انسانی میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ قدرت انسان کی دایہ ہے، وقت اس کا معلم ہے۔ طلوع و غروب اس کی درس گاہیں اور ماہ و سال اس کے درجات ہیں۔ ؎

کیا وہ ؎

ماہتاب انور عنان و آفتاب اندر رکاب

قوت جو اس کارخانۂ عظیم عالم کو چلا رہی ہے اس قدر تند دستی اور رکھ رکھاؤ واقع ہوئی ہے کہ کسی مصلح کی دخل اندازی اور کسی بر خود غلط

راہبر کی گستاخی برداشت کرلے گی؟

کیا انسان، موجِ نفس پر تھرتھرانے والے حباب "انسان" کو یہ معلوم نہیں کہ اس پُرسطوت گردش کرنے والے کرۂ ارض میں جو کچھ ہو رہا ہے منشائے قدرت کے عین مطابق ہو رہا ہے؟

کیا، جو پرزہ جہاں بٹھا دیا گیا ہے، وہی اس کا بہترین مقام، اور جو حرکت اُس کی مقرر کر دی گئی ہے، وہی اس کا وظیفۂ فطری نہیں ہے؟

ہم انسانوں کے اعمال، اور اشیائے عالم کے خواص پر "خیر" و "شر" کے لیبل لگانے والے کون ہوتے ہیں؟

اک مردِ حق آگاہ نظر آتا ہے
اک کافرِ گم راہ نظر آتا ہے
اس کہنہ سرا میں ہر بد و نیک مجھے
ماموریِ الٰہ نظر آتا ہے

میں پوچھتا ہوں، اس زمین کی، جو اپنی چھاتی پر پہاڑ اٹھائے ہوئے ہے، ہر چھوٹی سے چھوٹی جنبش، اور اس آسمان کی، جو تمام عالم کو ڈھانپے ہوئے ہے ہر ادنیٰ سی حرکت، کیا ایک پوشیدہ مگر مکمل قانون سے جکڑی ہوئی نہیں ہے؟

کیا وہ تمام سفاک و رحم دل، ہولناک و دل فریب، اور ناقابلِ تصور عظیم قوتیں، جو بپھرے ہوئے آوارہ مزاج و شریر عناصر کے دہانوں میں لگامیں دیئے ہوئے ہیں، انسان کی سی زمین پر رینگنے والی مخلوق کے گھڑے ہوئے اصطلاحات "زشت" و "خوب" کے رُوبرو سرِ تسلیم خم کرنے، اور انسان کی بنائی ہوئی بے مغز سوسائٹی کی مفروضات "اوامر" و "نواہی" کے سامنے سپر انداختہ ہو جانے پر آمادہ ہو سکتی ہیں؟

کیا وقت کا پہیہ، جس کی نگرانی میں ماہ و سال کی پُرفن کمانیاں، ایک مقررہ رفتار کے ساتھ کھلتی رہتی ہیں، اتنی بعید از قیاس سرعت کے ساتھ نہیں گھوم رہا ہے کہ اس کی سبک تیلیوں کو دنیا کی سب سے بڑی خوردبین بھی نہیں دیکھ سکتی اور کیا وقت کی اس تند و تیز رو اور رکابِ روز و شب کے اس دریچے میں دنیا کا ہر سفید و سیاہ، اور عالم کا ہر خشک و تر، جس میں آدمی بھی ایک ہے، منشائے قدرت کے سانچے میں برابر ڈھلتا نہیں چلا جا رہا ہے؟

کیا ہم اس سلسلۂ عمل کو چھو سکتے ہیں؟

کیا ہمارا جذبۂ اصلاح، اس پُرہول مشینری کے نُکیلے اور گرم دندانوں کی گرفت سے انسان کو چھڑا لینے کی قوت رکھتا ہے؟

کیا ہم قدرت کے بلند اور اسرار کے گہرے میں چھپی ہوئی تربیت گاہ میں نقب لگا کر داخل ہو سکتے ہیں؟

اور کیا شہریارِ حیات یعنی وقت کے مکتبِ پنہاں سے ہم اُس کے طلاب کا اغوا کر سکتے ہیں؟

ثقلین کے درمیان کون ایسا سُورما ہے، جو خم ٹھونک کر، اور غرور سے گردن کو کج کر کے سامنے آئے، اور جواب دے "ہاں۔ میں ایسا کرتا ہوں!"

میں بہ آوازِ بلند پوچھتا ہوں، کس کی مجال ہے، اور کس میں یہ جرأت ہے کہ انسان کو آغوشِ قدرت سے چھین کر اپنی گود میں اُٹھا لے؟

اگر کوئی ایسا وقت ہے، میں اسے چیلنج دیتا ہوں، مردوں کی طرح سامنے آئے، یہ ہے بارگاہِ قدرت!

ایں است کہ دل بیدہ و خوں کردہ بسے را

بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

ہاں ایسی کوششیں کی جا چکی ہیں، دنیا ایسے صدہا ناکام تجربے دیکھے ہوئے ہے۔ دنیا کی مصلحوں کے کارنامے دنیا کی میز پر کھلے ہوئے رکھے ہیں۔

تاریخ کے بوسیدہ قصر کا دروازہ کھولیے، اس کے خاک آلودہ دفترِ پارینہ کی ورق گردانی کیجیے، اور دیکھ لیجیے کہ اکابر مصلحین کی نامرادیاں کس قدر جلی حروف میں لکھی ہوئی ہیں۔ اور ان کے نوشتوں کے سرورق کے ابھرے ہوئے الفاظ میں درج ہے ؎

السلام اے بعد ما آیندگان رفتنی

بر شما خوش باد ناخوشہائے دنیائے دنی

خدا کے مصلحین پر ان نوعِ انسانی کے محسنوں کی وقتی کامیابیوں کی پرچھائیوں پر نہ جائیے۔ ؏

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

کی کرشمہ سازیوں کو اہمیت نہ دیجیے۔ اور عقل مندوں کی طرح اس "روشنی" کو روشنی کیوں کہیے جو ؏

برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

کے مانند عارضی و ناپائیدار ہوا کرتی ہے؟

دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا ان مصلحوں نے نوعِ انسانی کی قلبِ ماہیت کر دی تھی؛ کیا یہ گروہ فطرتِ انسانی پر قابو یافتہ ہو گیا تھا؟ اور کیا ان "مصلحین" نے انسان کو قدرت کے آغوش سے چھین کر اپنے سایۂ تربیت میں لے لیا تھا؟ اور کیا اس سوال کا جواب اثبات میں دے کر ہم مجنونوں کی صف میں بیٹھنے کے قابل نہ ہو جائیں گے؟ — کیا اتنے مصلحوں اور ہادیوں کی سرگرمیوں کے باوصف دنیا آج تک اسی روش پر قائم نہیں ہے جس روش پر فطرت اسے چلا رہی ہے؟ کیا انسانیت اپنے نئے اور پرانے ہادیوں کی گرفت میں ہے؟

ہاں نوعِ بشر چیں بہ جبیں ہے اب تک

انسان "رہِ راست" پر نہیں ہے اب تک

اللہ کو ہو خبر کہ یہ "سرکش" بندہ

تھا روزِ ازل جہاں، وہیں ہے اب تک

زمانے کے ایوان اور تاریخ کی محراب میں اب تک شکست خوردہ آوازیں گونج رہی ہیں۔ ان غریب "مصلحین" کی، جو نورانی چہروں، محیر العقول قوتوں، فصیح خطبوں، مضبوط سیرتوں، مقدس ارادوں، شفا بخش کلموں، اور اپنے معتقدین کے سرفروش لشکروں کے ساتھ رشد و ہدایات کے آسمانی علم پر چوبیں لگاتے ہوئے، حیات کے افق پر، ماہتاب در بغل اور آفتاب بکف، طلوع ہوئے تھے — لیکن ؏

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

آؤ میں تمہیں مصلحین کی روح کی آوازیں سناؤں ؂

دم بھر بھی ہمیں صبر کا یارا نہ ہوا
پورا کوئی ارمان ہمارا نہ ہوا
اصلاح کی ہم نے تو بہت کی کوشش
لیکن تری حکمت کو گوارا نہ ہوا

بتایا جا چکا ہے کہ انسان فطرت کا بچہ ہے۔ اور تمام انسانی کرتوتوں سے بالاتر واقع ہے۔ بے چارے مصلحین، خدا اُن کی ہڈیوں کو محفوظ رکھے، زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتے ہیں کہ اپنی پیشانیوں سے ناکامی کا پسینہ پونچھ ڈالیں اور بس ؂

ہاں شغلِ جام و سبو جاری ہے
اب تک وہی رسمِ ہاؤ ہو جاری ہے
کھائی ہے کچھ انسان سے ٹکر ایسی
ہر دین کے ماتھے سے لہو جاری ہے

فطرت کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے! فطرت کی حکمرانی ازل سے شروع ہوئی ہے اور ابد تک جاری رہے گی ؂

گل پر ہیں نقوشِ رستہ یاری اب تک
جنباں ہے دلِ بادِ بہاری اب تک
انسان کی پیمبری کا در ہے مسدود
فطرت کی پیمبری ہے جاری اب تک

ذرا مصلحین کے پیروؤں کے دفتروں کو کھول کر دیکھئے جو روشنائی کے عوض انسانی خون سے لکھے گئے ہیں۔ انسان کی بربادی، تباہی، دردمندی، اور ہلاکت کے واقعات ایک ایک کر کے، ٹھہر ٹھہر کر ٹھیر کے ساتھ پڑھئے۔ ایک ایک سرخی اور ایک ایک مد کو جانچئے۔ ہر اجمال پر تفصیلی نظر ڈالئے، اور پھر دریافت کیجئے کہ اتنی زبردست بربادیوں کے بعد اولادِ آدم کو ملا کیا؟ میں خود کچھ عرض نہ کروں گا، آپ خود اپنی قوتِ فیصلہ اور شعور انسانیت سے پوچھئے۔ البتہ میری جانب سے اس قدر ضرور یقین دلایا جا سکتا ہے کہ اگر آپ کی قوتِ فیصلہ وہم پرست عورتوں کی طرح سہمی ہوئی نہیں ہے، تو وہ آپ کو گمراہ کن جواب دینے کی جسارت ہرگز نہ کرسکے گی۔

اور اب، جب کہ نوعِ انسانی کی اصلاح کے باب میں ہماری بے چارگی اس قدر نمایاں اور ہمارا عجز اس قدر غیر مبہم طور سے ہمارے سامنے آچکا ہے تو ہمیں اپنے دماغ کی قوتوں کو یکجا کر کے غور کرنا ہے کہ ہمارے سامنے کونسا راستہ کھلا ہوا ہے۔ سنئے، وہ

چیست یاراں طریقت! بعد ازیں تدبیرِ ما؟

کیا ہم دنیا کے سب سے بڑے مغنی حافظ شیراز کی حدیثِ از مطرب و مے گو" پر کاربند ہو کر خاموش ہو جائیں؟ بے علمی پر قناعت کرلیں؟ —— "حدیث از مطرب و مے گو" پر عمل تو کیا جا سکتا ہے، اور اس وقت بھی تندرست ذہن کے مالک عقلاء کے حلقے میں اس پر عمل ہو رہا ہے۔ لیکن اس کا دوسرا حصہ یعنی خاموش ہو جائیں اور بے علمی پر قناعت

کرلیں! قطعی طور پر ناقابلِ عمل ہے۔

انسان سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن خاموش و بے عمل کبھی نہیں ہو سکتا — حرکت اس کی زندگی ہے اور سکون موت — وہ تو روزِ ازل کی صبحِ صادق سے ؎

حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

کے ترانے گا رہا ہے۔ اور جب تک موت اسے بظاہر خاموش نہ کر دے گی، وہ یہی ترانے گاتا رہے گا۔ "بظاہر" میں اس لئے کہتا ہوں کہ کون کہہ سکتا ہے کہ ؎

خود موت بھی خواب ہے کہ بیداری ہے؟

اور جب کہ سکون و اضمحلال، اور جمود و تعطل انسان کے واسطے ناممکنات میں سے ہے تو قرینِ دانشوری یہی ہے، یا یوں کہئے ہم اس پر مجبور ہیں کہ انسان کو مصروف و مشغول ہی رہنے کا مشورہ دیں، کیوں کہ یہ مشورہ تو خود ہماری عین فطرت ہے۔

لیکن اس منزل پر کیا ہم دنیا کی سب سے بڑی، سب سے زیادہ لاینحل اور سب سے زیادہ قدیم مشکل سے دوچار نہیں ہو جاتے؟ یعنی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان اب تک، اس لمحے تک اپنی غایتِ تخلیق سے ناواقفِ محض ہے، تو پھر اس سادہ ہموار صورتِ حال میں کیا ہم اس کے سامنے واقعی کوئی ٹھوس اور حقیقی کام پیش بھی کر سکتے ہیں؟

صدیوں اور قرنوں سے اس نیلے آسمان کی پُر رعب ڈانٹ کے نیچے ؎

مقصد ما ز بہرِ چہ آراستند مرا؟

کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ "پیغمبر" خاموش ہیں۔ "صحائف" نقش بدیوار ہیں، اور فلاسفر سر بہ در گریباں — آخر کس سے دریافت کیا جائے؟ کس سے پوچھا جائے؟ کس ماں نے آج تک کسی جاننے والے کو جنا ہے؟ ہر طرف کامل خموشی، زبردست سکوت اور اتھاہ سناٹا ہے — اور غریب انسان، مشیت کا سوتیلا بیٹا انسان ؎

کہ سر بہ کوہ و بیاباں تو دادۂ مارا

کا رونا روتا ہے۔ تحقیق کی تاریک و ناہموار وادیوں میں سر پھوڑتا پھر رہا ہے۔ اور ہر منزل، ہر قدم پر ؎

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

کی دردناک چیخ اس کی زبان سے نکل جاتی ہے۔

وائے اے ذوقِ تحقیق! حیف اے دردمند انسانیت!

یہ عقلِ زبوں مار کے چھوڑے گی ہمیں\
یہ آتشِ غم جلا کے چھوڑے گی ہمیں\
یہ راز کی پیاس دل کا لہو لے گی لہو\
یہ علم کی بھوک کھا کے چھوڑے گی ہمیں

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، یا دردمند دل کی آہ، جو منہ سے نکل گئی — اب دیکھنا یہ ہے کہ جب تک علتِ ایجاد کا پتہ نہ چلے گا، جس کی امید ؎

ایں خیال است و محال است و جنوں

کی حد تک موہوم ہے، اُس وقت تک انسان اپنے زعم میں خواہ کتنا ہی ٹھوس اور سنجیدہ کام کیوں نہ ہو اختیار کرے لیکن حقیقت شناس طبیعتیں اُس "ٹھوس" اور "سنجیدہ" کام کو "شغلِ بے کاری" سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ ہم کہنے والے نے کیا سچ اور سچ کہا ہے ؎

انسان کی جس قدر بھی طرّاری ہے
بس وقت گنوانے کی بیماری ہے
افسوس کہ بے معرفتِ رازِ حیات
جینا کتنی شدید بے کاری ہے

"شغلِ بے کاری" اور خلیفۂ ارض و وارثِ کائنات انسان!
کتنا غیر مشفقانہ برتاؤ! کتنا دردناک کھیل!!

اور جب "شغلِ بے کاری" ہی کے نقطے پر ہمارے تمام اعمال کی گردش منحصر ہے تو آیئے، زندگی کو بہلانے اور بچّے کے ہاتھ میں کھلونا دینے کی خاطر دنیا کے ناقابلِ شمار مشاغل میں سے کوئی ایسا شغل کیوں نہ منتخب کریں جس پر ہم "بہترین شغل" کی مہرِ تصدیق ثبت کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟

لیکن انفرادی و اجتماعی دونوں جہتوں سے اس کا کوئی ایک 'حل' یا ایک 'جواب' بے حد دشوار معلوم ہوتا ہے — البتہ اس سلسلے میں بلا خوفِ تردید اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے میں غلطی پر ہوں کہ جن جواں بخت یا بدقسمت افراد کی سطحِ فکر کافی بلند اور جن کے ذہن کی دھار کافی باریک اور تیز واقع ہوئی ہے، ان کے واسطے کارخانۂ عالم میں تفکر و تدبر سے بہتر کوئی دوسرا مشغلہ اس وقت تک انسانی حدود و معلومات میں داخل نہیں ہوا ہے اور یہی وہ تنہا مشغلہ ہے جس سے ہم خدمتِ انسانی کی بہترین آرزوؤں کو وابستہ کر سکتے ہیں۔

اس موقع پر یہ اعتراض قدرتی طور سے پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مان لیا گیا ہے کہ انسان کی اصلاح انسان کے بس کا روگ نہیں تو پھر مشغلۂ تدبر و تفکر سے خدمتِ انسانی کی "بہترین آرزوؤں" کی وابستگی کیا معنی رکھ سکتی ہے؟

سنئے۔ میں عرض کرتا ہوں —

بات یہ ہے، اور اربابِ بصیرت عقلی اور زیادہ تر وجدانی طور پر اس سے بخوبی آگاہ ہیں، بلکہ تجربے بھی کر چکے ہیں، کہ زمانہ اپنی مسلسل و پیہم رو میں چلتے چلتے خود بخود ایک ایسے موڑ پر آجایا کرتا ہے جہاں سے توبہ تو انقلابات کے دروازے خود بخود کھلنے لگتے ہیں — اور مفکرین کے سینوں میں ان کا عکس تھرتھرانے لگتا ہے۔ یعنی زمانے کے اس موڑ کے معنی یہ ہیں کہ اب قدرت خود اصلاح یا انقلاب پر تیار ہو چکی ہے۔ اور مفکرین کو تعاون پر آمادہ کر رہی ہے۔

عوام ان انقلابی آثار و قرائن کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کی معمولی نگاہ زمانے کو مڑتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن جس طرح آلات کے ذریعے سے ستاروں کی گردش، شمس و قمر کی رفتار، موسموں کے تغیرات، قحط و بارش کے آثار، آندھیوں، طوفانوں اور زلزلوں کی آمد کا حال معلوم کر لیا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح، اور اسی انداز پر مفکرین کی بصیرت آنے والے انقلابات کا پہلے ہی مشاہدہ کر لیتی ہے۔ وہ فضا میں انقلاب کو دیکھ، اور ہوا میں انقلاب کو سونگھ لیتے ہیں جیسے ہی زمین سے خفیف بھاپ اُٹھنے لگتی ہے وہ اہلِ خرمن کو آگاہ کر دیتے ہیں کہ "برقِ خرمن سوز سے ہوشیار!" — اور جب

آنے والے انقلاب کے تیور پہچان کر وہ ان کی افتادِ مزاج کا صحیح اندازہ لگا لیتے ہیں، تو منشائے قدرت کے زیرِ سایہ ہر ممکن عجلت کے ساتھ انقلابی سرگرمیاں شروع کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور اس شدت کے ساتھ سُست رفتار زمانے کی رو میں جو انقلاب ممکن ہے، کل رونما ہوتا۔ وہ ان کے مساعی کی بدولت آج ہی پیدا ہو جاتا ہے! اور اس طور پر مفکرین زمانے کو اس کے عزائم میں مدد دے کر انسان کی بہترین خدمت انجام دیتے ہیں، اور "مصلحین" کے خطاب سے سرفراز کیے جاتے ہیں۔

اس کو اس مثال سے سمجھیے —

فرض کیجیے، زمانہ ایک مطلق العنان بادشاہ ہے اور مفکرین اس کے مزاج داں مقربین میں سے ہیں۔ بادشاہ کے دل میں جیسے ہی کوئی انقلابی یا اصلاحی جذبہ پیدا ہوتا ہے، یہ فوراً اس کے تیوروں سے پہچان جاتے ہیں۔ یا یوں کہیے: بادشاہ خود اپنے تیوروں سے انہیں بھنوا دیتا ہے، اور گروہ مفکرین ان آثار کو پاتے ہی ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس سرگرمی سے جد و جہد شروع کر دیتا ہے کہ بادشاہ کا عزم بہت ہی جلد عملی جامہ پہن لیتا ہے۔ اور وہ انقلاب جو ضمیرِ شاہ میں کب تک پہلو بدلتا رہتا، ان کی مستعدی کی بدولت جلد تر رونما ہو جاتا ہے۔

اب آپ سمجھے کہ شغلِ تدبر و تفکر سے میں نے خدمتِ انسانی کی "بہترین آرزوؤں" کو کیوں وابستہ کیا تھا؟

یہی حال آج کل ہندوستان کا ہے۔ ممکن ہے کسی کو نظر نہ آتا ہو، لیکن اربابِ نظر ہندوستان میں زمانے کو یوں مڑتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، جیسے پیچ و خم کھاتی ہوئی پٹری پر ریل مڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور اس صفائی کے ساتھ کہ گاڑی کے ڈبے سے انجن نظر آنے لگتا ہے۔ ہاں —

لاتی ہے سیرِ دگر چشمِ تماشا کے گی
ایک بار اور یہ دُنیا ابھی پلٹا لے گی

لیکن ہندوستانیو! تمہاری سماعت کو کس طرح طوفانی بجلی کی کڑک اُچک لے گئی ہے؟ کیا واقعی تم نہیں سنتے کہ — ہندوستان کی ہواؤں میں انقلاب سانس لے رہا ہے۔ سنسنا رہا ہے — راستے کے موڑ پر ہندوستان کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے؟

اور کیا تمہیں نہیں معلوم کہ جب رات کا پُراسرار سناٹا پہنائے عالم کا احاطہ کر لیتا ہے تو نامعلوم سمتوں سے "انقلاب انقلاب" کی دھیمی آوازیں صبح تک آتی رہتی ہیں۔

ہندوستانیو! تمہاری بصارت کو کس کی نظر کھا گئی ہے؟ کیا واقعی تم نہیں دیکھتے کہ ہندوستان کی دھوپ اور چاندنی میں انقلاب جھل جھلا رہا ہے!

اور اے زمین کے عجیب ترین باشندو "اہلِ ہند"! تمہاری قوتِ شامہ کو کس زہر نے سُن کر دیا ہے؟ کیا تمہاری سانس تمہیں خبر نہیں دیتی کہ ہندوستان کے گلزاروں میں انقلاب بوئے گل بن کر فضا میں پھیل رہا ہے؟

اور خدارا بتاؤ، کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ سینۂ ہندوستان میں انقلاب کا جو سُرخ شعلہ آہستہ آہستہ بھڑک رہا ہے، اسے ہوا دینا شروع کر دیا جائے؟ — انقلاب، انقلاب — ہر شے میں انقلاب — زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب — آداب و رسوم میں انقلاب — نظریات و عقائد میں انقلاب — مسلمات و کلیات میں انقلاب — سیاسیات و مذہبیات میں انقلاب

یکسر انقلاب — تمامتر انقلاب اور مکمل انقلاب :

لیکن آپ جانتے ہیں کہ ان تمام انقلابات کا سرچشمہ کہاں ہے ؟ نفسیات سے پوچھئے ، وہ جواب دے گی کہ انسان کے ذہن وخیال اور طریق فکر میں :

جب تک " ذہن وخیال " میں انقلاب نہ آئے گا کسی نوع کے انقلاب کی امید رکھنا ایک مہمل سی بات ہے۔

لیکن اس " ذہنی " انقلاب کا سرچشمہ کہاں ہے ؟ دنیا کی زندہ اور مردہ قوموں کی تاریخ سے سوال کیجئے۔ وہ جواب دے گی " قوموں کی ادبیات " میں !

اس لئے آیئے اپنی ادبیات کا جائزہ لیں اور دیکھیں ، اس مجموعے میں زندگی اور بیداری پیدا کرنے کی صلاحیت کہاں تک پائی جاتی ہے ؟

لیکن ایک ہزار بار کی دیکھی ، جانچی اور پرکھی ہوئی چیز کا جائزہ کیوں لیجئے ؟

ہمارے ادبیات میں ہے کیا ! وہی روایتی ، مصنوعی اور بے کیف بوسیدہ حسن وعشق کے چٹخارے۔ وہی ناگوار قناعت اور ترکِ دنیا کے جیائے ہوئے نوالے ، وہی ؎

اگر شہ روز را گوید شب ایں است

کی غلامانہ تعلیم ، وہی ؎

ما مقیمانِ کوئے دل داریم

کی لوریاں ، وہی ؎

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کی بزدلی ، وہی ؎

رات بھر لاشہ پڑا رکھا مسیحا نے مرا

کی کفن فروشیاں۔ وہی ؎

یاد کا سر چڑھ کے بوسے لیا

کی بوالہوسی۔ وہی ؎

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

کی کاہلانہ بے پروائیاں۔ وہی ؎

لے شب وصل غیر بھی کاٹی !

کی بے غیرتیاں۔ وہی ؎

ایسے میں کوئی چھم سے جو آجائے تو کیا ہو

کی سوقیانہ بول چال۔ وہی ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے

کی زبوں ہمتی۔ وہی ؎

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما!

کی انوم آور دوائیں۔ اور وہی ؎

بہت سعی کیجئے تو مر رہیے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

کی نسائی ناچاریاں!!

میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیجئے۔ کیا ہم ان رانڈوں کی طرح بین کرتی اور سوگوار بڑھیوں کی طرح چھاتی پیٹتی ہوئی، جھوٹے آنسوؤں کی شاعری سے طوفانی سمندروں کے تڑپتے ہوئے سینوں پر جہاز چلا سکتے ہیں؟

جس شاعری کی ہڈیاں زنداں کی زنجیروں سے کھرچ کھرچ کر نکالی جاتی ہوں، جس کی سفید آنکھیں ہمیشہ چھت سے لگی رہتی ہوں، جو حقیقی حسن و عشق کی چاشنی سے بیگانہ ہو، جو اس زندگی اور اس کے تمام بے شمار پہلوؤں کے مطالعے اور اس عظیم الشان کرۂ ارض کے مشاہدے سے قاصر ہو، جس کے آشیاں پر آئے دن بجلیاں گرا کرتی ہوں، جسے ہر بازاری آدمی اگر وہ رقیب کی صورت سے نمودار ہوا ہے، دھکے دے کر بزم سے نکال سکتا ہو، جو دل کا جنازہ ہتھیلی پر لئے پھرتی ہو، جس کی سانس سے شگفتگی کا چہرہ اتر جاتا ہو، جس کا ہر روز "عشرۂ محرم" اور جس کی ہر شب "شبِ شہادت" کے مانند ہو، جس کی تھرتھرائی ہوئی آواز ایسی ہو گویا آندھی کے وقت ٹوٹی ہوئی قبروں کے روزنوں سے ہوا گذر رہی ہو۔ کیا ایسی فاقوں کی ماری، اونگھتی، بلبلاتی، تھرتھراتی، گڑگڑاتی، کانپتی، روتی، پیٹتی، چیختی، چلاتی، سسکتی، بسورتی، بلکتی اور لنگڑاتی ہوئی شاعری کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہم زندگی کے پُرہول و ناہموار میدانوں کے طے کرنے کا تصور بھی کر سکتے ہیں ـ؟

ایک بار نہیں، ہزاروں مرتبہ طویل راتوں کے سکوت اور سناٹوں میں میں نے اردو شاعری کا مطالعہ کیا۔ میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے اساتذہ کے سینے کھول کر دیکھے۔ میں نے پوری دیانت کے ساتھ اپنے شعراء کی نبضوں پہ ہاتھ رکھ کر ان کی ضربات کا شمار کیا۔ لیکن افسوس کہ مجھے ان کے اندر زندگی ــــ شعلہ فشاں زندگی ــــ آگ اور بجلی سے کھیلنے والی زندگی ــــ گرجتی، گونجتی، ہر قدم پہ چھلکتی اور ابھرتی ہوئی سرخ خون والی زندگی کا کہیں نام و نشان تک نہ ملا۔

ہمارے کلیات، دواوین، ناول اور افسانے، زمہریر کے کرّے ہیں، جہاں حیات کا خون جم جاتا ہے اور ولولوں کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں۔

کہاں تک روؤں، کس کس بات کا ماتم کروں!؟ ذرا اپنے شعرائے کرام کے تخلص ہی ملاحظہ فرما لیجئے، اور کسی ماہرِ نفسیات سے دریافت فرمائیے کہ یہ تخلص کس نوع کی ذہنیت پیش کرتے ہیں؟

آپ جانتے ہیں، اس کا جواب کیا ہوگا؟

وہ غیر مشتبہ الفاظ میں بتا دے گا کہ اس نوع کے تخلص صرف وہی لوگ پسند یا اختیار کر سکتے ہیں جن کے ولولوں کی کمریں ٹوٹ چکی ہیں، اور جن کی ہمتوں کے سنگے ڈھل چکے ہیں۔

سنئے اور عبرت کے کانوں سے سنئے،

مجروح، خستہ، ملول، مسکین، درد، سوز، ذرہ، نخچیر، داغ، افسوس، حزیں، مغموم، بے دم، بسمل، کشتہ، الم، اشک، آہ، قلق اور یاس، وغیرہ!

اور لگے ہاتھوں ان شعراء کے کلام سے متاثر ہونے والے ادیبوں کے ان سابقوں کو بھی ملاحظہ فرمایئے، جو وہ بالعموم خطوں میں اپنے ناموں کے ساتھ لکھتے ہیں۔

ناچیز، ذلیل، حقیر، فقیر، احقر، رسوا، کمترین، فدوی، عبدِ ذلیل، ہیچ میرز، بندۂ بے نوا، کمترین خلائق، اذل مخلوق، احقر العباد، عاجز، ہیچداں، گناہگار، عاصی، پرمعاصی، اور روسیاہ وغیرہ!

کیا آپ اپنے شاعروں اور ادیبوں کی پست ذہنیت کے سمجھنے کے لئے اس سے زیادہ کسی ثبوت یا شہادت کے طلب گار ہیں؟

مختصر صاف صاف کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ ہمارا ادب کمزور ہے، علیل ہے، خوابیدہ ہے، مقلد ہے، نقال ہے، غیر فطری ہے، بے روح ہے، مدقوق کی طرح زرد، مبروص کی طرح داغ دار، مفلوج کی طرح اپاہج، اور سڑی ہوئی لاش کی طرح متعفن ہے؟

ہاں میں آپ کے سامنے شاعری ہی کے کیمپ سے آیا ہوں۔ نہ میں داغ دار ہوں، نہ خدانخواستہ مغرب زدہ — ایسا معلوم تو ضرور ہوتا ہے کہ کچھ شعر کہتا اور سمجھا جاتا بھی ہوں۔ میری طرف سے اس وہم میں نہ پڑیئے کہ میری نظریں اپنی شاعری کے ان عمر آفریں اور نازک پہلوؤں پر نہیں ہیں جو دلوں میں اُتر جاتے ہیں، لیکن آپ کو غالباً ایک شاعر کی زبان سے یہ سن کر بہت استعجاب ہوگا کہ میں سردست اپنی قوم میں یہ دیکھنا نہیں چاہتا کہ دل، دماغ پر غلبہ حاصل کئے رہے۔

دل ایشیا کا بہت پرانا اور ہر دل عزیز فرماں روا ہے لیکن حالات موجودہ کی حکمرانی اور سیاسی پیچیدگیوں اور عصر حاضر کے مقتضیات پر نگاہ کرتے ہوئے میں ایشیا کے اس شریف اور بوڑھے تاجدار کی خدمت میں عرض کروں گا کہ براہ کرم خسروانہ تھوڑے دن کے لئے تاج و تخت سے اپنی دست برداری کا اعلان کر دے۔

ہر چند یہ مشورہ دیتے ہوئے — دل و ابدل رہبیت — کے مطابق خود میرا دل بھی درد محسوس کرتا ہے۔ لیکن زندگی کی ضرورتیں جب سر پہ آ جاتی ہیں تو اُن کے قدموں پہ دل و جان دونوں کو نچھاور کر دینا پڑتا ہے۔ اور اس وقت ہندوستانی زندگی کی ضرورتیں جان و دل ہی کی قربانی کے لئے مچلی ہوئی ہیں۔

میں حیران ہوں کیا آپ واقعی نہیں دیکھتے کہ ہندوستان ننگا اور بھوکا ہے، دانے دانے کو ترس رہا ہے؟

کیا آپ کے علم میں یہ بات تک نہیں آئی ہے کہ اکثر و بیشتر ہندوستانی مائیں بھوک سے تنگ آ کر اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے ذبح کر ڈالتی ہیں؟

کیا آپ کو نہیں معلوم ہے کہ ہر سال آپ کے کتنے گریجویٹ بیٹے بے روزگاری سے گھبرا کر زہر کھا لیتے ہیں؟

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ آپ کی عورتیں مدقوق، بیمار، اور فنِ تربیتِ اولاد سے قطعی بیگانہ ہیں؟

کیا آپ کو نظر نہیں آتا ہے کہ آپ کے نوجوانوں کے چہرے مُتے ہوئے ہیں، جن پر خون کی ایک چھینٹ بھی نہیں؟

اور کیا واقعی آپ کو اس حقیقت کبریٰ کی اس لمحے تک خبر نہیں کہ دوسری قومیں تو اجنبی اور غیر ملک میں بھی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں، اور آپ ہیں کہ خود اپنے وطن، بلکہ اپنے گھر کے اندر اور اپنے بال بچوں کے سامنے جانوروں سے زیادہ حقیر و ذلیل ہیں!

کیا یہ سچ ہے کہ آپ کو شرم نہیں آتی؟

کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ کی خودداری کا معیار عبرت ناک حد تک پست ہے؟

اور کیا یہ خبر صحیح دی گئی ہے کہ آپ —

باور دیا بازو، بسیج در ما مطلب

برعمل پیرا ہو کر ان تمام تذلیلوں اور توہینوں سے مصالحت فرما چکے ہیں؟ خیر، یہ صحیح ہو یا غلط — میں ایک مدت سے سنتا چلا آرہا ہوں کہ ہر قوم کے ادیب اور شاعر انتہا درجے کے حساس، خوددار، اور غیور ہوا کرتے ہیں۔ اگر میرے ہندوستان میں بھی یہی ہے تو میں اپنے شاعروں اور ادیبوں کے سامنے دو زانو ہو کر گڑگڑاؤں گا کہ خدارا اپنے ادب میں عظیم انقلاب پیدا کر کے جندگی ڈوبتی ہوئی کشتی کو خونی گرداب کے خون آشام دانتوں سے چھڑا لیجئے، ورنہ کشتی ڈوب جائے گی، اور شباب و محبت کا واسطہ اپنے ادبیات میں حیات و بیداری کا خون دوڑا دیجئے، اور وطن عزیز کے لئے دلوں کی طرح دھڑکتے ہوئے زندہ الفاظ کو جوڑ کر ایک نیا باب البند تیار کیجئے۔ جس کی سنہری اور بلند محراب کے نیچے سے زندہ کر دینے والے انقلابات کے نقرئی جلوس فوج در فوج اور قطار در قطار ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔

یاد رکھئے، ایک صحیح جنبشِ قلم ستر ہزار برہنہ تلواروں کے مقابلے میں زیادہ کارآمد آلۂ جنگ ہے۔

میں آخری بار پھر یہی کہوں گا کہ جو کچھ کہنا ہے جلدی کہئے، جو کچھ کرنا ہے جلدی کیجئے۔ ورنہ ؎

کی گئی ناوقت قربانی تو پھر کیا فائدہ؟
سر سے اونچا ہو گیا پانی تو پھر کیا فائدہ؟

شاعری جہاں آپ بیتی ہے وہاں جگ بیتی بھی ہے۔ شاعری اگر داخلی ہے تو خارجی بھی ہے۔ اس لئے اگر ہم شاعری کو حیات کی مصوری اور زمانے کی تاریخ نویسی کا لقب دیں تو دراصل یہ حقیقت سے بعید نہ ہوگا۔

میرے نزدیک شاعر ہے وہ شخص جو سب سے زیادہ حساس ہو۔ اس کے جذبات شدت کے ساتھ سریع الاشتعال ہوں اور وہ اپنے احساسات، اور جذبات کو بہترین الفاظ میں ادا کر دینے کی قوت بھی رکھتا ہو۔

شاعر کی طبیعت یہ ہے کہ وہ کائنات کے ہر ذرے، حیات کے ہر تیور، حواس و ماورائے حواس کے ہر پہلو، احساسات کے ہر رُخ اور جذبات کی ہر ادا کا مطالعہ کرتا ہے اس سے متاثر ہوتا ہے اور ان تاثرات کو موزوں ترین جامۂ الفاظ پہنانے کی صلاحیت و قدرت بھی رکھتا ہے۔

جوش

جوش ملیح آبادی

الا! صاحبِ عالم

صاحبِ عالم، تم نے مجھ سے بڑی دغا کی، مجھ پر بڑا قہر ڈھایا، خود سدھار گئے، اور مجھے اس بیگانہ دنیا میں چھوڑ دیا کہ سر پٹکتا پھروں۔

میری اس منزلِ عمر میں، جب کہ نئے احباب کا پیدا ہونا امکان سے خارج ہو چکا ہے، میری کشتیٔ حیات کے بادبان کھول دیئے جا چکے ہیں، اور حال

جرسِ فریاد می دارد کہ بربندید محمل ہا

کی صبح طلوع ہونے والی ہے، تمہارا روپوش ہو جانا بالکل ایک ایسا ہی سانحہ ہے جیسے اندھیری رات کے وقت کوئی دوست اپنے رفیقِ سفر کو بھیانک جنگل میں چھوڑ کر یکایک روپوش ہو جائے۔

پیارے، تم میرے لڑکپن کے دوست تھے، اس وقت کے دوست جب کہ ہمارے چہروں پر وہ رنگ تھا جیسے گلابی جاڑوں کی ہلکی پھلکی سنہری دھوپ۔ ہمارے سروں پر ہمارے والدین کا گھنا سایہ جھوم رہا تھا۔ ہمارے سینوں میں فوارے چھوٹا کرتے تھے۔ ہماری رفتار و گفتار سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی کمانی کھل رہی ہے۔ کوئی کلی کھل رہی ہے یا رات کی تاریکی میں آتش بازی چھوٹ رہی ہے۔

ہم تم لکھنؤ کی اُس دل نشیں وکٹوریہ اسٹریٹ پر رہتے تھے جو آج کے "مرحوم" اور کل کے "زندہ" لکھنؤ کے بالوں کی سیدھی مانگ اور اربابِ کمال و اہلِ جمال کی محبوب گذرگاہ تھی۔

کیوں صاحبِ عالم، وہ زمانہ کس قدر میٹھا، رسیلا، چٹکیلا اور سُہانا تھا۔ راہ گلی میں جب تمہارا بوٹا سا قد میری جانب ایک موج کے مانند بڑھتا تھا، اور قریب آ کر تم اپنے چھریرے چھوٹے ہاتھوں سے جب مصافحہ کر کے مسکراتے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی جادو کے جزیرے میں پہونچ گیا ہوں۔ اور اسی طرح جب میں اپنا چھریرا قد لئے تمہاری طرف بڑھتا، اپنی لانبی لانبی پلکیں اٹھا کر تمہاری طرف دیکھتا، اور اپنی جرنیلی ٹوپی کو کج کر کے تمہیں [illegible] سلام کرتا تھا تو اس وقت تم شادمانی کی موج میں گھرے ہوئے نظر آتے تھے۔

اس کے بعد زمانے کے انقلاب نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ فراق کی ایک بلند و طویل دیوار ہمارے درمیان

کھڑی کر دی اور ایک زمانہ ہو گیا کہ ہم ایک دوسرے سے قطعی بے خبر رہے ۔

لیکن زمانے نے جب بہت دن کے بعد دوسری کروٹ لی تو زندگی کے اس خوش گوار موڑ پر ہم پھر ایک دوسرے کے سامنے آگئے ۔ لیکن اس موقع پر ہم نے ایک دوسرے کو کسی قدر جھجھک کے ساتھ دیکھا اور یہ اس لیے ہوا کہ اس طویل زمانہ مفارقت میں تم حرم کی جانب بڑھ چلے گئے ، میں دیر کی طرف مڑ چلا تھا ۔ تم میں ادبی پیشوائی کی شان اور مجھ میں رندگی کی آن پیدا ہو چکی تھی ۔ تمہارے سر پر عبادت گاہوں کا سایہ تھا ، اور میرے شانوں پر نگار خانوں کی زلفیں کھل رہی تھیں ۔ تمہاری جیب میں تسبیح تھی ، میرے دوش پر زنار ، تمہارے ہاتھ میں تھا ظرف وضو ، اور میرے ہاتھ میں تھا زرین سبو ۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ہم نے اس وقت بھی ایک دوسرے کو بڑے پیار اور چاہ کے ساتھ دیکھا تھا ۔ لیکن ہمارے درمیان ہجرت کی پیدا کردہ جھجھک کا پردہ پڑا ہوا تھا اور اس وقت ہم آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے :

بدلی نگاہ ، طور سے بے طور ہو گئے
تم تو جوان ہوتے ہی کچھ اور ہو گئے !

صاحب عالم ، میں رند آدمی ہوں ، میرا یہ فرض تھا کہ میں اس جھجھک اور اس کھنچاؤ کا پردہ چاک کر کے آگے بڑھتا ، اور تمہیں گلے سے لگا کر کہتا :

حریف بزم تو بودم چو ماہ نو بودی
کنوں کہ ماہ تمامی نظر دریغ مدار

مگر داد دیتا ہوں میں تمہیں کہ تم اس جھجھک کو ٹھکرا کر آگے بڑھے ۔ مجھے گلے سے لگایا ، اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تم کچھ یوں مسکرائے کہ میرے ولولوں کی وہ دھار جو کند ہوتی سی معلوم ہو رہی تھی ، پھر تیز ہو گئی ۔

تمہاری ، اے دوست ، یہ آن دیکھ کر زندگی میں پہلی بار مجھے یہ چیز ممکن نظر آنے لگی کہ متقی و پرہیزگار کے سے بے توفیق آدمی کے سینے میں بھی انسانیت کا دل دھڑک سکتا ہے ۔ ارباب رکوع و سجود کے مخصوص حلقوں میں بھی رندوں کی سی طہارت پائی جا سکتی ہے ؂

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

جلیل القدر صاحب عالم ، تمہاری موجودگی میں مجلس کی مجال تھی کہ شاہد حق کے موقع پر بھی بادہ و ساغر کا نام زبان پر لا سکتا ۔ یہ تمہاری عظمت زہد کی کچھ ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ تمہارے قدموں کی چاپ سنتے ہی اور تو اور میرزا جعفر حسین کا سا منہ پھٹ رند بے باک بھی اپنے ساز و مینا کو جھٹ خانے میں کھٹ سے بند کر دیتا ، اور سانس روک کر کھڑا ہو جاتا تھا ۔

لیکن جب میں دوبارہ لکھنؤ پہونچا تو تمام شہر یہ دیکھ کر انگشت بدنداں ہو کر رہ گیا کہ میرے جشن کے جلسوں میں کتنے روزانہ آتے ، جا ناغہ آتے ۔ حاجی غلام حسین اور مولوی ثاقب حسین صاحب کے سے ارباب تقویٰ و طہارت اور علی عباس حسینی اور احتشام حسین کے سے افسردہ وجود سنجیدہ ارباب قلم نوری صاحب اور حکیم محمود لکھنوی ، اور مجاز و مصطفیٰ علی کے غل غپاڑوں کی گونج میں اس وقت بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ شریک صحبت رہتے تھے ، جب تک کہ ہماری صحبتوں کا شعلہ بھڑک کر خاکستر بن جاتا تھا ۔

اور اُس وقت تو اہلِ محلہ و اربابِ شہر کو دیوانہ ہو جانے کی حد تک حیرت ہو گئی، جب مہاراجہ سر مرزا جعفر حسین کے گھر والی رنگین محفلیں خود تمہارے گھر میں بھی جمنے لگیں۔ اور تمہارے مکان کا وہ کشادہ ہال جو تکبیر کی آوازوں سے معمور رہتا تھا نغمہ ہائے مستانہ کا گہوارہ بن گیا۔

اب تو شہر بھر میں غلغلے ہونے لگے کہ بیچارے حکیم صاحب نے بھی اپنے پیرِ مغاں کے ہاتھ پر بیعت کر کے رندی اختیار فرمالی، اور ہر چند کہ تم نے اپنی عزت و شہرت کو برباد ہوتے دیکھا، لیکن کوئی پروا نہیں کی، تم نے اپنی شخصیت کو مجھ پر قربان کر دیا اور رسوا کرنے والوں کے آوازوں پر تم ہمیشہ ہنس ہنس کر کہتے رہے ؎

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم، با خلق و عالم کار نیست

صاحبِ عالم شخصیت و شہرت دنیا کی وہ سب سے بڑی پونجی ہے کہ آدمی جان دے دیتا ہے مگر اس سے دست بردار نہیں ہوتا۔ لیکن تم نے مجھ پر یہ دولتِ بیدار بھی لٹا دی ؎

آواز دو کہ جنسِ دو عالم کو تم نے
قربان یک تبسمِ جانانہ کر دیا!

میرے دوست تم نے، میری خاطر، اس قدر زبردست قربانی اس لئے کی کہ تم مجھے اپنے انا کا ایک جزو سمجھتے تھے، اور تم مجھے اپنے شہرِ ذات کا تاج محل خیال کرتے تھے۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تم میرے مقابلے میں بمراتب اعلیٰ و ارفع اوصاف کے حامل تھے، اور یہ بات میرے واسطے فخر کا باعث تھی کہ میں تمہارے پہلو میں بیٹھا تھا۔ اور تمہاری طرف دیکھا ہوئے دیتی جانب اشارہ کر کے کہا کرتا تھا ؎

ترے ستارہ طلعت کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

پیارے دوست، تمہیں اس دنیا سے گئے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا ہے، اس لئے تمہیں یاد ہوگا کہ تم ترقی پسند جماعت سے بالعموم اور میری دوست شکن شاعری سے بالخصوص کس قدر برہم ہو، ویسے ناراضگی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ تم نے میرے خلاف بہت سی نظمیں بھی کہی تھیں، یعنی تمہاری شاعری کا آغاز میری مذمت سے ہوا تھا، اگر میں نہ ہوتا تو تم شاعر بن ہی نہیں سکتے تھے۔ اور یہ میری مذمت کی عطا کردہ مشاقی ہی تھی، جس کے بل بوتے پر تم نے مدحِ اہلِ بیت میں ایسے زبردست و لافانی قصیدے کہے گویا اردو زبان میں خاقانی، عرفی اور قاآنی کی روح زمزمہ سرائی کر رہی ہے۔

ہائے کس قدر خوش نصیب تھی میری وہ مذمت جو مدحتِ آلِ رسول میں تبدیل ہو گئی۔

تمہیں یاد ہوگا، تمہارے مطلب کی بات ہے کہ ایک روز تمہارے قصائد سن کر میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ بھائی تمہارے سخن کی ریل پلیٹ فارم سے جب ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ریلتی ہے تو آگے جا کر اس کی رفتار کیا قیامت ڈھائے گی۔ تو یہ سن کر تم ہنسی کے مارے لوٹنے لگے تھے۔

اے یارِ جانی، یہ ایک عجیب ماجرا ہے کہ میں تمہاری موت کے وقت تمہارے پاس موجود تھا۔ مرنے سے کوئی دس پندرہ منٹ پیشتر جب تم گھر سے حسبِ معمول مسکراتے ہوئے باہر آئے تھے، تو شاید میری روح کو علم ہو گیا تھا کہ اب تم ہمارے

والے ہو۔ میں تمہیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ تمہیں، خوب بھینچ کر کلیجے سے لگایا تھا، اور تمہارے داہنے رخسار کو چوم لیا تھا ——— ہائے مجھ بدبخت و نامراد کو کیا معلوم تھا کہ یہ ہیکل جو اس وقت میرے آغوش میں ہے، کل قبر کے گوشے میں ہوگا۔ اور یہ رخسار جسے میں چوم رہا ہوں، تھوڑی ہی دیر میں اس پر موت کی سفیدی دوڑ جائے گی۔

میرے آخری اور رخصتی بوسے کو اس وقت تک اپنے رخسار میں محفوظ رکھنا صاحب عالم، جس وقت تک کہ میں تمہارے پاس آ کر تمہارے دوسرے رخسار کو بھی نہ چوم لوں۔

صاحب عالم یہ دنیا میری آنکھوں میں اب ایک قبر ہے۔ میں کیا کروں ——— تمہیں کہاں ڈھونڈوں، تمہیں کدھر پاؤں؛ میں تمہیں عالم خیال میں اپنی یہ نظم سُناتا ہوں، جس کا نام ہے "اپنا مرثیہ"۔ ہر چند اس میں صرف دو تین شعروں میں براہِ راست تمہیں یاد کیا ہے، مگر یہ پوری نظم اُگی ہے اُن آنسوؤں سے جو میں نے تمہاری یاد میں بہائے ہیں۔

اگر تم رخصت نہ ہو جاتے تو اپنی زندگی کی یہ تمام بھولی ہوئی بدبختیاں مجھے کبھی یاد نہ آتیں جو اس نظم میں سمٹ کر آگئی ہیں۔ اس لئے اے یارِ دیرینہ اسے میرا اور اپنا، دونوں کا مرثیہ سمجھو، میں عالم اجسام میں رو رہا ہوں، تم عالم ارواح میں آنسو بہاؤ ——— اور بن پڑے تو اے یار جانی اب بہت جلد، بہت ہی جلد مجھے اپنے پاس بلوا لو۔ میری اداسی پر ترس کھاؤ ـــ

پس از معشوق جینا عشق کو بدنام کرنا ہے
خدا مجنوں کو بخشے، مر گیا، اور ہم کو مرنا ہے!

تمہارے بے پناہ خلوص سے مجھے یقین ہے کہ تم نے میری منظوم امانتیں سرکار اہل بیت تک ضرور پہنچا دی ہوں گی۔

اچھا سلام! (غیر مطبوعہ۔ بشکریہ قمر عباس پسر حکیم صاحب عالم)

یہ کتنی تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستان اس شدت کے ساتھ مُردہ پرست واقع ہوا ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ وہ اپنے ہر صاحب کمال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ او نامراد، جب تک تو زندہ رہنے کا جرم سے، جائے گا۔ میں تجھے چین سے نہیں رہنے دوں گا۔ اور جب تو ایک سعادت مند فرزند کی طرح مر کر میری حسرت نکال دے گا تو میں اغیار کی دست وبرد سے بچا کھچا اپنا تمام و کمال سونا تیری "لوح مزار" پر چڑھا دوں گا۔ مبارک ہیں ناقدرشناس و مُردہ پرست ہندوستان کے وہ اہلِ کمال جو مر چکے ہیں، اور صد حیف ہے اُن بدبختوں پر۔ جو اس دشمنِ کمال سرزمین پر زندہ ہیں اور مرنے کی آرزو میں جی رہے ہیں۔

جوش

تراشے

جوش ملیح آبادی کالموں میں

ایک کھلا خط

ممکن، مناسب سمجھئے اور گنجائش بھی دیکھئے تو
براہ کرم یہ مراسلہ شائع کردیجئے۔ ورنہ بیرنگ
واپس فرما دیجئے۔ میں وصول کرلوں گا۔

نیازمند: جوش
سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی

اس صدی کی سنجیدہ ترین آواز

پندرہویں جنوری سنہ ۱۹۵۶ء کے روزنامہ "جنگ" میں "فکری اِدارے" کی سرخی سے جو شذرہ شائع ہوا ہے۔ اس نے راقم الحروف کو ایک ایسی زبردست لیکن غیر متوقع مسرت سے دوچار کردیا جو "انشراحِ دل" کی سی اوچھی پونجی میں نہیں "انشراحِ دماغ" کی سی دولت بیدار میں پائی جاتی ہے۔ اندھی تقلید نے جس کی آنکھیں پھوڑ ڈالی ہیں اور اوہام فاسدنے جس کو ڈس لیا ہے اس نابینا، زہرآلود اور چلتی ہوئی سوسائٹی کی محراب کے نیچے ایسی حکیمانہ و توانا آواز کا سنائی دینا انتہائی مسرت انگیز اور اسی کے ساتھ ساتھ انتہائی حیرت ناک واقعہ بھی ہے۔ اس لئے کہ ؎

مارا از یں گیاہ ضعیف ایں گماں نہ بود

پاکستان کے ہر شہری کا بالعموم اور ہر دانش مآب کا بالخصوص یہ سب سے اہم فریضہ ہے کہ وہ اس صدی کی اس سب سے بڑی آواز سے آواز ملا کر اس تجویز کی زبردست تائید کرے کہ پاکستان کے ہر خطے ہر قریے ہر گوشے میں جلد سے جلد فکری اداروں کو قائم کرکے تفکر و تدبر کے اس عظیم انسان ساز و حیات نواز کارخانے کو قائم کردیا جائے، جو دنیا کی بہت سی قوموں کو توانائی ذہن و ترقی مادی کی نعمتوں سے مالامال کرچکا ہے۔ اور جس کے قیام میں جو توفیقوں کے نعرہ ہائے عجز و ناکامی اب تک سنگِ راہ بنے ہوئے ہیں

کس سے دہائی دی جائے کہ ہماری دقیقہ سنجی کی چھت پر کائی جمی ہوئی ہے۔ ہمارے دیدہ وری کے صحن میں گھر گھر گھانس کھڑی ہوئی ہے۔ اور بے روزگاری کی زد میں آکر ہماری قوتِ فکر کی پسلیاں ابھر آئی ہیں۔ اوہام کی گلیوں میں درندگی بھیک مانگتی پھر رہی ہے۔ اور ہماری ذہانت بے کاری میں گرفتار ہو کر جرائم کی تاریکیوں کے اندر نقب زنی و قتل کے آلات لئے ہوئے گھومتی پھر رہی ہے۔ اور کس کان سے کر دہائی دی جائے کہ ہماری عقل پر ٹھلکنڈا لا اور ہماری فراست پر شب خون مارا جا چکا ہے ہماری فکر و نظر کی جلتی ہوئی بستیوں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ ہماری حقائق سنجیوں کے بلند مناروں کو ڈھا دیا گیا ہے۔ ہماری کھوپڑیوں کے گنبدوں کی صرف کھڑکیاں ہی بند نہیں کر دی گئی ہیں، ان کے روشن دانوں کو بھی چوپٹ کیا گیا ہے۔ ہمارے منطقی کانٹوں کو جن میں ذروں سے لے کر ستاروں تک کو تُلا کرتے تھے، افسانہ و افسوں کی بھٹیوں میں جھونک کر گلا دیا گیا ہے۔ ہمارے براہین و دلائل کے قلعوں کے نیچے اوہام و روایت کی وحشی فوجیں ایک مدت دراز سے محاصرہ کئے ہوئے پڑی ہیں۔ جہاں معقولات کی رسد نہیں پہنچنے دی جا رہی ہے۔ اور ہم نامرادوں کے کانوں تک لاؤڈ اسپیکروں کی معرفت نیم وحشیوں کے یہ نعرے بڑے منظم تسلسل کے ساتھ پہنچائے جا رہے ہیں کہ

> منطق کا استعمال شیاطین کے ہتھیاروں سے مشق ہے
> استنباط و استقرا جو کافروں کے تجربات ذہنیت کی پیداوار
> ہے۔ جادۂ فکر پر قدم رکھنا طاغوتی طریق سے ملی روش ہے
> اور ریاضی سے الفت رکھنی اُن طلاح اوباشوں کی میراث ہے

ہم سے بڑے ہی مرشدانہ انداز میں انگلی اٹھا اٹھا کر کہا جا رہا ہے۔ اور کہنے والے یہ کہتے ہوئے کبھی تھکتے ہوئے نظر نہیں آتے

> اپنے حواس کے تمام غرفے نرچ کچا کر بند کر لو۔ اور صرف ایک غرفہ، یاد رکھو، صرف ایک غرفہ، کھلا رہنے دو جسے کان کہتے ہیں اور وہ اس لئے کہ ہم جو کچھ کہیں اسے کان کھول کر سنو۔ اور سنتے ہی اس قدر جلد مان لو کہ ایک سیکنڈ کے دس ہزارویں حصے سے زیادہ وقت نہ لگنے پائے۔ سن لو اور مان لو۔ غور کئے بغیر مان لو اس لئے کہ غور کرنا حرام ہے۔ اور اس قدر حرام کہ وہ شخص بھی جو لحم خنزیر سے اپنا پیٹ بھرتا ہے اس قدر معتوب، اس درجہ مغضوب، اور اس حد کا مبغوض نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جس قدر کہ وہ روسیاہ جو غور و فکر کے ارتکاب کی جسارت کرتا ہے۔

اور اسی متصل و مسلسل تعلیم و تلقین کا یہ اثر ہے کہ ہم کارخانۂ عالم پر جس وقت تنقیدانہ نظر ڈالنے کا نام بھی سنتے ہیں تو کسی یکایک نازل ہو جانے والے عذاب کے خوف سے لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔

صد حیف کہ اپنے "سروں" کو معزول کر کے ہم نے اپنے "کانوں" کو راہنمائی کا منصب عطا فرمایا ہے۔ عقل کی کسی مار کر جذباتیت و مجذوبیت کو گلے لگایا ہے۔ اور "کھوپڑی" پہ پاؤں رکھ کر "چھاتی" کو ہم نے سر پر بٹھا لیا ہے۔ اور اپنی اس روش کے

چلتوں اُن اقوام کے سامنے جو زندگی کے فرق پر تسخیر قوانین کائنات کا تاج رکھنے کی فکر میں سرگرداں ہیں۔ آج ہم جاہلوں، بیماروں، بھوکوں، ننگوں، بھگوڑوں، اور بھک منگوں کی طرح سر جھکائے ہوئے کھڑے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح کائنات ہم سے مایوس ہو چکی ہے اور زندگی نے ہم سے دست برداری کا فیصلہ کیا ہے۔ اور بے شک یہ ایسی مایوسی و دست برداری کا نتیجہ ہے کہ ہم ان حیات و نظم کائنات کا وہ معجزہ نما جو صرف تفکر کی لو سے پگھل کر کھل سکتا ہے۔ ہم اسے موہومات کے تاگوں اور ترکی ٹوپیوں کے پھندوں سے کھولنے کی سعی فرما رہے ہیں

پس، جس نے پہلے نہ سنا ہو وہ اب سن لے کہ جس وقت تک کہ ہم اپنے کھانے کی نوک مزاج کے سانچے میں نہیں ڈھال لیں گے آگاہی و دیدہ وری کے بغض سے توبہ نہیں کر لیں گے۔ کھوپڑی سے غور کرنے کے عوض جذباتی سے فیصلے کرتے رہیں گے، سماعت کے میدان میں کبڈی کھیلنے اور عقل کا نام سن کر دو لتیاں جھاڑتے رہیں گے، اس وقت تک زندگی ہم سے منہ موڑے رہے گی اور ہماری اس موت کی گذری ہوئی زندگی کے مردہ تاریک افق پر دینی و مادی توانائی کی صبح سعادت کبھی طلوع نہیں ہوگی۔ اور ہم اپنے وجود کی بھیانک رات کے پشتارے کو سروں پر لادے ہوئے تاریک ماحول میں ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔ اور آخرکار ان ظلمات کے پاتال میں ہمیشہ کے واسطے گم ہو کر رہ جائیں گے، جو ہماری ہی طرح کی بے شمار امتوں کو ہم سے قبل کھا چکی ہے۔ اور بستی کی سوگوار فضا میں نوحہ کی سی تھرتھراہٹ ہے۔ شاید کچھ اُداس روحیں نہ جانے کس برباد ہو جانے والے قافلے کو دیکھ کر میر کا یہ شعر بڑے سوز و گداز کے ساتھ گنگنا رہی ہیں ؎

تھا جن کو تیرے عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

خدا نہ کرے یہ اشارہ ہماری ہی طرف ہو۔
جھکی ہے جس طرف بجلی
— وہ میرا آشیاں کیوں ہو

(جوش مرحوم)
روزنامہ جنگ، کراچی - ۲۳ جنوری ۵۶ء

جوش۔ قومی آواز کی نظر میں

(ایک اداریہ)

جوش صاحب آج کل ہندوستان آئے ہوئے ہیں۔ اُن کا شمار اردو کے چوٹی کے شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ غالباً اسی حیثیت سے اُن کی دہلی اور لکھنؤ میں خوب آؤ بھگت ہو رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی جوش اور ہندوستانی جوش میں کوئی فرق نہیں۔ کاش ہم اس موقع پر خاموش رہ سکتے، لیکن افسوس ایسا ممکن نہیں ہے۔ ہم بعض خیالوں، اصولوں، نظریوں اور جذبات کو مسلسل سراہتے رہے ہیں۔ اگر اس وقت خاموش رہیں گے تو ان کے ساتھ بے وفائی کے مرتکب ہوں گے۔

جوش صاحب کی ہستی وہ تھی جس کی تقسیم اور آزادی کے بعد ہندوستانی حکومت نے بہت قدر و منزلت کی تھی۔ اُن کو بہت اونچا عہدہ دیا تھا، اور موقع بے موقع اُن کے ساتھ خاص رعایتیں کی جاتی تھیں — جوش صاحب رسالہ "آج کل" کے ایڈیٹر تھے لیکن حسب عادت اس کے کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ اس پر بھی اُن سے کوئی باز پرس نہیں کی جاتی تھی — وزیر اعظم کی مہربانیوں کے دروازے ان کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ اور یہ جا سفارشیں بھی کرتے تھے، تو کوئی بھی کچھ نہیں کہتا تھا — ان سب باتوں پر طرفہ ظلم یہ ہوا کہ جوش صاحب کو خطاب دیا گیا۔ اور اگر جوش صاحب پاکستان نہ جاتے تو اس بات کا بھی امکان تھا کہ "آج کل" سے ریٹائر ہونے کے بعد اُن کو راجیہ سبھا میں نامزد کر دیا جاتا، اور حکومت ان کے خاندان والوں کا خاص خیال بھی رکھتی۔

لیکن جوش صاحب ان سب چیزوں سے فائدہ اُٹھا رہے تھے، اُس زمانے میں ہوا کچھ دوسری طرف چلی اور پاکستان کے بعض عہدے داروں نے ان سے زیادہ روپیہ دینے کے وعدے کر لیے، جوش صاحب کو ان وعدوں نے بدل دیا اور وہ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔

اب ذرا سوچنے والی بات یہ ہے کہ اُن کے اس فعل کی ضرب کس کس پر پڑی؟ ظاہر ہے کہ دو گروہوں پر اس کی زبردست چوٹ پڑی: ایک اردو والوں کا گروہ اور دوسرے مسلمان — جوش صاحب نے اپنے اس فعل سے ایک طرح سے یہ اعلان کر دیا کہ یہ دونوں گروہ بھروسے کے قابل نہیں۔ اس طرح ان دونوں کو رسوا کر دیا اور وہ بھی بہت بری طرح خوب ڈھلنے میں — یہ واضح رہے کہ جوش صاحب بہت سوجھ بوجھ کے انسان ہیں۔ معاملات کو خوب سمجھتے ہیں۔ اس لئے اُن کو جاتے وقت اس بات کا خوب احساس ہوگا کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ اور اس کے نتائج کیا ہوں گے؟ اور کس کس کو بھگتنا پڑے گا؟ — لیکن اس پر بھی چلے گئے۔ اُن کو اس سے کیا غرض کہ ان کی وجہ سے دوسروں کی کتنی ذلت ہوگی، اور دوسروں پر کیا بیتے گی۔ اُن کو تو اپنی آمدنی سے مطلب۔

پاکستان جانے والوں میں ایک جماعت تو وہ ہے جو دو نیشن نظریہ کے تحت گئی ہے، اور دوسری وہ جو خاص مجبوریوں کے اندر گئی ہے۔ ان دونوں کو ہم قابل معافی سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بالکل ہی دوسرے حالات کے اندر گئے۔ مثلاً وہ لوگ ہیں، جو فوری ترقی پر ترجیح دے گئے۔ جیسے چودھری خلیق الزماں جو حکومت ہند سے ہوائی جہاز لے کر ہندوستان اور پاکستان میں مفاہمت کرانے کے لئے گئے تھے یا مولانا سلیمان ندوی جو اسی قسم کے وفد کے ممبر بن کر گئے تھے۔ ان دونوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا معاملہ ٹھیک کیا اور پھر وہیں بس گئے۔

جوش صاحب بھی ان ہی لوگوں کی صف میں آتے ہیں بلکہ کچھ زیادہ ۔ کیوں کہ ان کو سرکاری عنایات ان دونوں سے زیادہ مل چکیں، اور انہوں نے بھی ان دونوں سے بڑھ چڑھ کر قوم پروری اور سوشلزم اور سامراج دشمنی اور فرقہ واریت دشمنی اور ایک قومی نظریہ کی تبلیغ کی تھی ۔

آج کل جوش صاحب کی قدر لگ بھگ اس انداز سے ہو رہی ہے جیسے پہلے ہوتی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا پہلے کے جوش اور اب کے جوش میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ لطف یہ ہے کہ قدر کرنے والے اسی دونوں گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کو جوش صاحب نے اپنے فعل سے ذلیل کیا ۔

کہا جا رہا ہے کہ جوش صاحب اب پھر ہندوستان کی قومیت حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خبر صحیح ہو ۔ کیوں کہ پاکستان کے حالات اب جوش صاحب کے لئے، اب پہلے کے ایسے نفع بخش نہیں رہے، اور وہاں کے مقابل میں یہاں مواقع اب زیادہ ہیں ۔

سوال یہ ہے کہ کیا ان کے دوست حضرات اور مسلمان اس بات کو پسند کریں گے کہ جوش صاحب کو ہندوستانی قومیت مل جائے !

اس کا جواب دینے سے پہلے وہ سوچ لیں کہ ان کی آمد سے ان کی صفوں پر کیسی نظریں پڑیں گی ۔ یقینی طور پر جوش صاحب کے ہاتھوں یہ دوسری چوٹ ہوگی، اور اس چوٹ سے زیادہ شدید ہوگی جو انہوں نے پاکستان جا کر پہنچائی ہے ۔

اس لئے ہم حکومت ہند سے کہے دیتے ہیں کہ حکومت کو مسلمانوں اور ان کے دوستوں کے حق میں کانٹے نہ بونا چاہئے ۔ اور جوش صاحب کو ہندوستان واپس آنے کی زحمت نہ دینا چاہئے ۔

(فروری ۱۹۶۱ء)

جوش ملیح آبادی نے ہندوستانی شہریت حاصل کرنے کی درخواست نہیں دی

چند ماہ پہلے شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی ہندوستان تشریف لائے تھے ۔ اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں آپ نے بڑے مشاعروں میں شرکت فرمائی ۔ ۲۴ اپریل کو لوک سبھا میں اس سلسلے میں مختلف سوالات کئے گئے چونکہ ہندوستان میں عام طور پر یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ حضرت جوش نے ہندوستانی شہریت حاصل کرنے کی درخواست دی ہے ۔

جناب داتار نے اس خبر کی تردید کی اور کہا کہ "جوش ملیح آبادی نے ابھی کوئی درخواست نہیں دی !"

نیابتِ بابائے اردو

تیسری ستمبر ۱۹۶۱ء کو جنگ میں "ناخدائے اردو کو پکارو" کی سرخی سے ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں بابائے اردو کی نیابت کے واسطے نیاز صاحب فتح پوری کا نام پیش کیا گیا ہے۔ اور مجھ ناچیز کے بارے میں یہ اظہارِ خیال کیا گیا ہے کہ چونکہ میں پہلے ہی سے ایک اہم کام کر رہا ہوں۔ اس لئے اس سلسلے میں میرا نام پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اس موقع پر میں اپنا یہ فرض سمجھتا ہوں کہ جو امر میرے نزدیک حق ہے اس کا اعلان کر دوں۔ اور وہ امر حق یہ ہے کہ اگر میں اس فرہنگ نویسی میں مصروف نہ بھی ہوتا اور اس بیکاری کے عالم میں بھی بابائے اردو کی نیابت کے سلسلے میں میرا اور نیاز صاحب کا نام دوش بدوش پیش کیا جاتا تو میں پوری ذمہ داری اور کامل دیانت شعاری کے ساتھ اپنے نام پر نیاز صاحب کے نام کو ترجیح اور نمبر اول ترجیح دیتا، اور اس بنا پر ترجیح دیتا کہ میرے نزدیک حضرت نیاز کی ذات میں جو تنظیم و تجربہ کاری اور جو علمی و ادبی شہریاری پائی جاتی ہے اُس پر نگاہ کر کے، بابائے اردو کی نیابت کے واسطے اُن سے بہتر اور کوئی نام پیش نہیں کیا جا سکتا۔

آخر میں دبی زبان سے اس امر پر بھی روشنی ڈال دینا چاہتا ہوں کہ اگر اس مسئلے میں ہم اپنی رسوائے زمانہ تعصب کاری، اپنی شرمناک سیاست بازی اور اپنی تاریخی مجرمانہ تنگ دلی سے کام لے کر کسی روشن اقتدار و تاریک استعداد کو مولوی صاحب مرحوم کی مسند پر بٹھا دینے کا ارتکاب کریں گے تو انجمن ترقی اردو، سرمایۂ زبانِ اردو کو دفن کر کے بابائے اردو کو معنوی حیثیت سے قتل کر ڈالیں گے۔

من آنچہ شرط بلاغ است، با تو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر، خواہ ملال

جوش (ملیح آبادی)
(روزنامہ "جنگ" کراچی - ۹ ستمبر ۱۹۶۱ء)

آج غالب پوجا جا رہا ہے، کل جب وہ زندہ تھا تو اسی دہلی میں اکثر و بیشتر آدھ پاؤ گوشت اور پاؤ بھر شراب کے لئے ترستا رہتا تھا۔

آج غالب کے دیوان کو ہندوستان کی آسمانی کتاب کہا جاتا ہے، کل جب وہ زندہ تھا تو اسی دہلی میں اسے مہمل گو کا خطاب دیا گیا تھا اور اسے بعض جگہ "گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی" کہنا پڑا تھا۔

آج ملک کے بڑے بڑے دولت مند اس کے مزار کی زیارت کے واسطے آتے ہیں۔ کل جب وہ زندہ تھا تو اسے خود امراء کے دروازوں پر جانا پڑتا تھا۔

جوش

مجتبیٰ حسین

جوشِ اعظم

صہبا صاحب۔ تسلیم۔

مدت ہوئی آپ کا خط ملا تھا۔ اُس وقت میں میعادی بخار میں مبتلا تھا۔ اب اچھا ہوں۔ مگر میعادی بخار کے ختم ہو جانے کے بعد بھی ایک اور میعاد ہوتی ہے ـــــ سنبھلنے کی، جب آدمی ٹانک استعمال کرتا ہے، وٹامن کھاتا ہے۔ ٹھیک وقت پر سوتا، اور ٹھیک وقت پر جاگتا ہے۔ اور اگر توفیق ہوئی تو تبدیلِ آب و ہوا کی غرض سے دوسرے مقام پر چلا جاتا ہے۔ میں ابھی اسی میعاد کے زیرِ سایہ زندگی گزار رہا ہوں۔ باہر جانے کی استطاعت سے نہیں، لہٰذا کراچی ہی کو مرکزِ صحت سمجھے ہوئے ہوں، اور کراچی میں قدر صحت افزا مقام ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ بہرصورت کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جسمانی لحاظ سے ابھی تک سنبھلا نہیں ہوں۔ ذہنی طور پر پریشان ہوں، اور یہ پریشانی زندگی کے ساتھ ہے۔ اسی لئے جوش صاحب پر کوئی ایسا مضمون جو ان کی شاعری کی عظمت کے شایانِ شان ہو لکھنے سے قاصر ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے آپ سے ندامت تو ہے ہی، اپنے آپ سے بھی ہے۔ میں جوش صاحب پر مضمون تو کیا، ایک پوری کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ کتاب کا خاکہ مدت سے ذہن میں ہے مگر اُس کو کاغذ پر منتقل کرنے کی نوبت اب تک نہیں آئی۔ میرا خیال ہے کہ جوش صاحب کی شاعری کو ایک مضمون کے ذریعے سے گرفت میں لانے کی کوشش، خواہ وہ مضمون کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو، زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک مضمون میں زیادہ سے زیادہ ان کی شاعری کے کسی ایک پہلو سے بحث کی جا سکتی ہے ـــ وہ بھی ادھوری، کیونکہ یہ پہلو اُس وقت تک پوری طرح واضح نہیں کیا جا سکتا جب تک ان کی شاعری کے دوسرے پہلوؤں سے ربط دے کر اسے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش نہ کی جائے۔

بات دراصل یہ ہے کہ جوش صاحب کی شاعری اردو کے بہت سے دوسرے شاعروں کے برعکس ایک خطِ مستقیم پر نہیں چلتی کہ آسانی سے اس کے فکری رخ اور ادبی محاسن کا احاطہ کر لیا جائے اور ایک یا دو مضمونوں کے ذریعے اس کے مجموعی تاثر اور کیفیت کو متعین کر کے پیش کر دیا جائے۔ بعض دوسرے اردو شعراء کے ہاں یہ حال نہیں ہے۔ مثال کے طور پر میر صاحب کی شاعری کو لیجئے۔ اُن کی عشقیہ شاعری کے رخ کو آسانی سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس شاعری کی دردمندی، جذباتی شائستگی اور ادب آموزی اردو شاعری کی دولتِ گراں مایہ ہے۔ اس کا غم ذاتی ہے، جو بلند کائناتی احساس رکھتا ہے، وہ انسانی دکھوں کے لئے بنا ہے۔ مگر ان تمام امور سے جو ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑی ہیں ایک متعینہ حد کے اندر آسانی سے بحث ـــ

کی جا سکتی ہے۔ پھر تیر صاحب کی شاعری کے ادبی محاسن، لہجے کی مختلف جہتوں اور فنی تکمیل پر بھی جتنی چاہئے بحث کر لیجئے۔ مگر یہ تمام بحث بھی ایک ہی سمت میں ہوگی۔ نظیر اکبر آبادی کو دیکھئے۔ موضوعات کی بہتات کے باوجود وہ ایک سیدھے راستے پر چلتے ہیں ــــ اور ان کا لب و لہجہ بھی ایک ہی "گروٹ" رکھتا ہے۔ کوئی بھی منظر ہو، کوئی بھی محل و مقام ہو نظیر ہمیں وہاں ایک ہی لباس میں ملیں گے ــــ یہ گیروا لباس ہے ہر ہنگامے میں شامل اور ہر ہنگامے سے جدا۔ بلکہ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظیر اپنی شاعری میں خود تماشا اور تماشائی دونوں ہیں، اور یہی ان کے لب و لہجے کی بھی کیفیت ہے جو بے لاگ بھی ہے اور جس میں لگاوٹ بھی ہے۔ اقبال کی شاعری کو سامنے رکھئے۔ وہ ہمارے بزرگ ترین شاعروں میں ہیں۔ ان پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔ لیکن اپنی تمام بزرگی کے باوجود اقبال کی شاعری کا فکری رخ متعین کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آتی ــــ اقبال اور رومی، اقبال اور نطشے، اقبال اور برگساں، اقبال اور گوئٹے، اقبال کا نظریۂ خودی، یہ تمام موضوعات بڑے وسیع ہیں لیکن یہ سب کے سب اقبال کی فکر کے تحت ہی موضوع بحث بن سکتے ہیں۔ اقبال کی فکر کی ایک واضح اور متعین اساس ہے۔ اس اساس کو دریافت کرنے اور سمجھنے کے بعد اس کی روشنی میں ان مختلف مسائل سے بحث کی جا سکتی ہے جنہیں اقبال کی شاعری سمیٹتی رہی ہے۔ ایک مرتبہ اس اساس کو سمجھ لیجئے اور ان عناصر کو جان لیجئے جن سے اقبال کی فکر تشکیل پاتی ہے۔ پھر آسانی سے آپ اقبال اور مذہب، اقبال اور تصوف، اقبال اور اشتراکیت کے ابواب قائم کر کے حسب توفیق لکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد اقبال کے ادبی محاسن پر شرح و بسط سے بحث کی جا سکتی ہے۔ انیس کے مرثیوں کو دیکھئے، موضوع واضح ہے اور فنی محاسن بھی واضح ہیں۔ صرف غالب ہی ایک ایسے شاعر ہیں جن کی فکر کے تعین میں دشواری ہوگی۔ وہ بڑی پیچ در پیچ ہے۔ اس میں مسائل تصوف بھی ملتے ہیں اور مسائل تصوف سے گریز بھی ہے۔ جبریہ اور قدریہ دونوں انداز پائے جاتے ہیں۔ تشکیک اور یقین دونوں موڈ موجود ہیں ــــ زندگی کا حوصلہ بھی ہے اور زندگی سے مایوسی بھی ہے۔ عشق بھی ہے اور فلسفۂ عشق بھی۔ دردمندی اور انا کی بھی پائی جاتی ہے، طنز اور ظرافت بھی ملتی ہے۔ لہجے کی بھی یہی کیفیت ہے ــــ یہ لہجہ کبھی خالص عشقیہ غزل بن کر ابھرتا ہے کبھی واسوخت تک پہنچ جاتا ہے۔ کبھی اس میں ہلاکی سپردگی ملتی ہے اور کبھی غضب کی انانیت۔ کبھی یہ مرہم بن جاتا ہے کبھی زخم ــــ اتنی متنوع اور ہمہ گیر شاعری غالب کی ہے کہ اس کا احاطہ قطعیت کے ساتھ ممکن نہیں۔ پھر بھی خدا بھلا کرے "تنگنائے غزل" کا جس نے بڑے جتن سے کوزے میں دریا کو بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یوں بہت سے خوردہ نویسوں کو یہ موقع ہاتھ آگیا کہ وہ ایک آدھ مضمون لکھ کر اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھیں کہ انہوں نے غالب پر بحث ختم کر دی ہے۔ حالانکہ مرزا کی شاعری اسی زلف کی طرح ہے جس کے بارے میں انہوں نے خود پوچھا ہے ؎

کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بخم کیا ہے؟

بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ جوش صاحب کی شاعری ایسی نہیں ہے کہ اسے آسانی سے ایک مضمون میں "نمٹا" کر لیا جائے۔ سیاسی، منظریہ، عریانی، عشقیہ، تہذیبی، طنزیہ، ہر قسم کی شاعری ان کے ہاں آپ کو مل جائے گی۔ اسی طرح ان کا اسلوب بھی مختلف مقامات پر مختلف انداز گفتگو کا حامل ہوگا۔ کہیں اس میں انتہائی شکوہ اور جلالت ہوگی، کہیں انتہائی...... سادگی اور اپنائیت، کہیں یہ تلخ اور درشت ہوگا، کہیں میٹھا اور نرم، کہیں یہ سرشار اور بدمست ہوگا، کہیں سنجیدہ اور تپا تلا، کبھی اس میں طنز ملے گا، کبھی دردمندی۔ کبھی اس میں فارسی ترکیبوں کی سجاوٹ اور رنگینی

ہوگی، کبھی بندی شیدوں کی معصومیت اور طہارت ہوگی۔ پھر اس میں جدید و قدیم تصورات اور نئے اور پرانے الفاظ اس بے تکلفی اور یگانگت سے ایک دوسرے کے پہلو میں ملیں گے کہ آپ کو پوری اردو شاعری ہی نہیں پوری فارسی شاعری اور ہماری تہذیبی زندگی کے مختلف مراحل کو دیکھنا ہوگا، تاکہ اس شاعری کے حسن سے پوری طرح واقف ہو سکیں۔

اب آپ خیال کیجئے۔ کہ جوش صاحب پر صرف ایک مضمون کیسے لکھا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری پر مختلف کتابیں البتہ لکھی جا سکتی ہیں۔ ان کی منظریہ شاعری، ان کی سیاسی شاعری، ان کی خمریاتی شاعری، ان کی عشقیہ شاعری وغیرہ وغیرہ صرف اُن کی رباعیات کو سامنے رکھ لیجئے اور اندازہ لگائیے کہ ان پر کیا کچھ اور کتنا کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ ہماری پوری اردو اور پوری فارسی شاعری میں مجموعی طور پر اتنی اور اتنی اچھی رباعیات نہیں لکھی گئی ہیں جتنی ہمیں جوش صاحب کے یہاں ملتی ہیں۔ اور یہ بھی دیکھئے کہ رباعی کو انہوں نے اپنے شعور نواز قلم سے کیا کچھ نہیں بنا دیا ہے ——— منظر، افسانہ، غزل، نظم، مکالمہ، ان کی وہ بے پناہ قوت جو طویل نظموں تک کی حدیں توڑ کر نکل جاتی ہے، جب ان چار مصرعوں میں مقید ہو جاتی ہے تو فن کی معراج بن جاتی ہے ——— چوتھا مصرعہ اُس بھرپور طاقت کے ساتھ آتا ہے جو رباعی کے فنی تکمیل کا اعجاز بھی جاتی ہے ——— آپ اس مصرعے کی آواز دیر تک کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس کرتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں قصداً مثالیں دینے سے گریز کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ جوش صاحب کی شاعری کے سلسلے میں اب مثالیں دے کر سمجھانا دوسرے کو بے خبر سمجھ لینا ہے۔ اور جو ان کی شاعری کو اب بھی مثالوں کے ذریعے سمجھنا چاہتا ہے، اُسے چاہئے کہ ادب و شاعری کو چھوڑ کر کسی اور مفید چیز کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ ان کی شاعری پر بحث کرتے وقت اگر مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر دو دو مثالیں بھی دی جائیں تو ایک مجموعہ آسانی سے تیار ہو جائے گا۔ ظاہری بات ہے کہ اس کی گنجائش نہ آپ نکال سکتے ہیں نہ میں۔ اُن کی ایک کتاب میں جتنی نظمیں ہیں صرف انہیں کے عنوانات اگر پیش نظر رکھ لئے جائیں تو آدمی کا دم نکل جاتا ہے ——— کتنے وسیع پیمانے پر ان کی فکر کام کرتی ہے ——— اُن کی شاعری میں ایک عجیب و غریب "آنکھ" ہمیں ملتی ہے ——— جو ہر چیز کو دیکھتی رہتی ہے ——— دور ہو یا نزدیک ہو، اہم ہو یا غیر اہم ہو، خوب صورت ہو یا بدصورت ہو ——— یہ آنکھ کبھی بند ہی نہیں ہوتی ——— "قافلۂ حیات" تیز رفتاری سے گذرتا رہتا ہے۔ اور ہر چند اس آنکھ کو "قافلۂ حیات" سے تیز رفتاری کی شکایت ہے مگر پھر بھی جس طرح اس نے اسے دیکھا ہے اردو شاعری میں کم ہی کسی نے دیکھا ہوگا۔

چونکہ جوش صاحب کی شاعری بڑی پہلو دار، بڑی متنوع اور ہمہ گیر ہے۔ اسے مختصر سی تنقید میں سمیٹنا، اس کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنا، اس کے مختلف ادبی محاسن سے بحث کرنا از حد دشوار ہے۔ غالباً اسی لئے بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ جوش صاحب کی شاعری مختلف خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور ان میں آپس میں کوئی ربط نہیں ہے۔ یاد ش بخیر، فیض صاحب نے رسالہ "آج کل" میں جب وہ غیر منقسم ہندوستان میں دلّی سے نکلتا تھا، جوش صاحب پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے یہی دکھانا چاہا تھا کہ جوش صاحب کی شاعری میں کہیں رندی ہے، کہیں سیاست ہے، کہیں شبابیات کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اس لئے ان کی شاعری ان کے خیال میں مختلف خانوں میں بٹی ہے اور ان کی شخصیت غالباً مربوط نہیں ہے۔ فیض صاحب شاید شاعری کے متنوع ہونے اور خانے میں بٹے ہونے کو ایک ہی سمجھ بیٹھے۔ اور یوں انہیں سہو ہوا۔ بات یہ ہے کہ جوش صاحب کی شاعری اتنی Staggering، مبہوت کر دینے والی چیز ہے کہ آدمی اپنے خیالات کو مجتمع نہیں کر پاتا۔ اور اپنی آسانی کی خاطر خانوں میں سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ درحقیقت اس امر پر

مزید بحث کی ضرورت نہیں ہے کہ اقبال نے اگر شکوہ لکھا تو وہ جواب شکوہ بھی لکھ سکتے تھے۔ شیکسپیئر نے اگر المیہ ڈرامے لکھے تو طربیہ ڈرامے بھی اسی کے لکھے ہوئے ہیں۔ جس گوئٹے نے عشقیہ جذبات میں شرابور چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھی ہیں، اُسی نے فاؤسٹ بھی لکھا ہے ــــ اور ہمارے نظیر اکبر آبادی نے "ریچھ کا بچہ" بھی لکھا ہے اور "بنجارہ نامہ" بھی ــــ جس طرح اس میں شک کرنے کی کوئی بات نہیں ہے کہ جوش صاحب نے خمریاتی نظمیں بھی کہی ہیں اور سیاسی بھی، منظریہ بھی اور عشقیہ بھی، اسی طرح اس میں بھی بلا وجہ شک نہ کرنا چاہیے کہ یہ ساری نظمیں ایک ہی شخص نے لکھی ہیں جسے جوش کہا جاتا ہے۔ فیض صاحب کی دقت سمجھ میں آجاتی ہے۔ ان کے پیش نظر غالباً ایسی نظمیں تھیں جو مختصر ہوتی ہیں اور جن کی عمر بھی نسبتاً چھوٹی ہوتی ہے۔ ان نظموں میں بیشتر زیادہ وسعت اور تنوع کی گنجائش نہیں ہوتی اور فکری رُخ اور شاعرانہ شخصیت کی ایک سیدھی لکیر کھنچی نظر آتی ہے۔ لہٰذا اس میں مربوط اور غیر مربوط شخصیت کا فرق اور امتیاز ہی بے سود ہے۔ آج کل کے مختصر صفحات میں انہوں نے بڑے زور سے جوش صاحب کی اس شاعری کو جو ایک پوری نصف صدی پر محیط ہے سمجھانا چاہا تھا اور اسی لئے غالباً انہوں نے خانوں والی تکنیک نکالی تھی۔

چنانچہ صہبا صاحب۔ جب آپ نے مجھ سے جوش صاحب پر مضمون کی فرمائش کی تو میں گھبا گیا۔ بیماری میں مبتلا تھا اور کچھ اسی قسم کے ششش و پنج میں گرفتار تھا۔ اب جب آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں جو مضمون کا بدل تو نہیں ہے مگر مضمون نما ضرور ہے۔ میں اپنی ذمہ داری کچھ کم محسوس کرتا ہوں۔ اس لئے کہ خط کی زبان تنقیدی یا قانونی نہیں ہوتی۔ یہاں میں آسانی سے جوش صاحب کے مختلف پہلوؤں پر اشارے کرتا ہوا گزر سکتا ہوں۔ آپ اسے خیانت کہیں گے مگر یہ خیانت آپ سے نہیں ہے، اپنے خیالات سے ہے۔ میں شعر و شاعری پر لکھتے ہوئے اس تن آسانی کا قائل نہیں ہوں مگر میں آپ سے پھر عرض کروں گا کہ جوش صاحب پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں مضمون نہیں۔

جوش صاحب کی شاعری نہ صرف پوری اردو شاعری بلکہ پوری فارسی شاعری کے بہترین اور بزرگ ترین روایات کی حامل ہے۔ اگر ہم فردوسی، خاقانی، حافظ، عرفی، نظیری، قاآنی، سودا، نظیر اکبر آبادی، غالب، انیس اور دوسرے شعراء کے انداز بیان، عصری روایات، فنی خصوصیات اور تہذیبی فضا سے واقف نہیں ہیں تو جوش صاحب کی شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ ہماری سمجھ اور ہماری پسند سے باہر ہو جائے گا۔ اور جب ہم ان تمام عناصر سے نابلد ہو کر اردو شاعری کو پرکھنے بیٹھیں گے تو نتیجہ معلوم۔ جوش صاحب کی شاعری میں وہ تمام چیزیں مجموعی طور پر ایک چیلنج کے ساتھ پائی جاتی ہیں جو اردو اور ایک حد تک فارسی کے تمام بڑے شعراء کے یہاں علیحدہ علیحدہ پائی جاتی ہیں۔ ساقی نامہ، قصیدہ، رباعی، مرثیہ، مثنوی، قطعات، ان تمام اصناف پر جوش صاحب نے کوئی خاص اہتمام کے ساتھ علیحدہ علیحدہ نہیں لکھا ہے۔ مگر ان تمام اصناف کا رنگ اور انداز بیان ان کی اکثر نظموں میں مل جائے گا ــ اور بہتر سے بہتر طور پر اسے ذہن میں رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے بغیر اردو شاعری کا اصل مزاج ہم نہیں پا سکیں گے۔ اسی کے بعد آگے بڑھئے اور نئے زمانے میں آجائیے ــــ جہاں ماضی مٹ رہا ہے اور مستقبل اُبھر رہا ہے۔ جاگیری دور کی اقدار ختم ہو رہی ہیں، اور نیم صنعتی دور کی اقدار انتہائی کرب کے ساتھ وضع ہو رہی ہیں۔ اس دوراہے پر کھڑے ہوئے جتنے چہرے ہیں وہ آپ کو جوش صاحب کی شاعری میں نظر آجائیں گے ــــ ان میں ایسے چہرے بھی ہیں جو کبھی ظریف تھے، ہنس مکھ تھے، بے فکر تھے، جن کے رنگ جاگیرداری اور زمینداری کے نشے سے چمک رہے تھے۔ مگر اب اُداس

اور ویران ہیں ۔ اب ان پر افلاس کی تاریکی ہے ۔ ان میں ایسے نوجوان چہرے بھی نظر آئیں گے، جن میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ ہے ۔ ان میں کبھی کسی ماں کا چہرہ نظر آئے گا ۔ کبھی کسی بھائی کا ۔ کبھی کسی بہن کا ۔ کبھی کسی کسان کا ۔ کبھی کسی مزدور کا، کبھی ایسی محبوبہ کا جس کی سیاہ زلفیں دیکھ کے

• تو کہے میلائے شب آمادۂ پرواز ہے

اور کبھی ایسی محبوبہ کا چہرہ نظر آئے گا جس کی زلفیں سنہری ہیں، اور جس سے "سونے کا آبشار" گر رہا ہے ـــــ غرضکہ نئے پرانے، ہر قسم کے چہرے نظر آئیں گے ۔ ان کی شاعری اس غیر منقسم ہندوستان کا ایک جیتا جاگتا، منہ بولتا مرقع ہے، جو آزادی کی راہ پر تیزی سے بڑھ رہا تھا ۔ بالزک کے ناولوں کی طرح جو فرانسیسی معاشرے پر دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں، اس شاعری میں بھی آپ کو وہ تمام کردار مل جائیں گے ۔ جو ہندوستان کی عظیم اور تاریخی سماجی ناٹک میں اپنا پارٹ ادا کر رہے تھے ۔ یہاں آپ کو کمپنی کی حکومت کے "گرگے"، شہنشاہ معظم، گورنر، آئی ۔ سی ۔ ایس، پولیس کے افسر، صاحبان، ساہوکار، مل والے، طوائف، مسخرے، لفنگے، ایچے، شہدے، بھوکے کسان، تھکے ہارے مزدور، سرپھرے باغی نوجوان، سیاسی پارٹیوں کے افراد، واعظ، زاہد، عورتیں، بچے، بوڑھی اور بدصورت عورتیں، ادھیڑ اور مالدار عورتیں، حسین اور نوجوان عورتیں، جامن والی، مہترانی، رانی، ہر کردار مل جائے گا ۔ اور آپ کو معلوم ہوگا کہ ہماری شاعری واقعی کتنی بڑی، کتنی وسیع، کتنی جاندار، دلکش اور تنومند ہے ـــــ اور اسے دنیا کی عظیم شاعری کے سامنے شرمانے کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔

ادب اگر تہذیب اور معاشرے کا آئینہ دار اور ناقد ہوتا ہے تو جوش صاحب کی شاعری اس کی ایک نہایت اعلیٰ مثال ہے ۔ اس سلسلے میں ایک اور طرف بھی توجہ کرتے چلئے ـــــ

فرض کیجئے آپ سے سوال کیا جائے کہ اردو ادب میں وہ سرزمین کہاں دکھائی دیتی ہے جس نے اسے "اگایا" ہے ۔ تو آپ کیا جواب دیں گے؟ مجھے معلوم ہے چند ادھر ادھر کی باتیں کرکے لوگ گذر جائیں گے ۔ مثلاً ہماری شاعری بالعموم درباری شاعری رہی ہے ۔ اسی لئے غزل سے آگے نہیں بڑھ سکی ۔ اس کے علاوہ ہمارا مزاج کچھ ایسا تھا کہ ہم خارجیت سے زیادہ داخلیت کی طرف مائل رہے ۔ اور ہم نے متصوفیانہ شاعری کی بلند تر تعبیرات پیش کی ہیں ۔ اور اسی کے آئینے میں زندگی کو دیکھا ہے ۔ مزید برآں ہماری شاعری کا ایک پہلو فکری بھی ہے اور فکری شاعری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ واقعاتی و تشبیہاتی یا بیانیہ ہو ۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح بھی ہو سکتی ہیں ۔ سوال اپنی شاعری کی بلندی کے منکر ہونے کا نہیں ہے، بلکہ اپنی شاعری کے اس پہلو کو دیکھنے کا ہے جس میں گوشت پوست کے آدمی بستے ہیں ـــــ لیکن یہ پہلو کمزور ہے ـــــ بہت کمزور ہے ـــ بات نظیر اکبرآبادی سے آگے نہیں بڑھتی ـــ اور نظیر اپنی تمام خوبیوں کے باوجود قصباتی زندگی سے آگے نہیں بڑھتے ـــــ ایسی صورت میں ہم ہندی اور سنسکرت کے شاعروں کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں جن کی شاعری میں یہاں کی دھرتی بسی ہوئی ہے ـــــ کالیداس، والمیکی، تلسی، کبیر ۔ ان کی شاعری ارضی، شاعری ہے جس میں اس سرزمین کے پھول کھلے ہوئے ہیں ـــــ یہی پھول ہمیں جوش صاحب کی شاعری میں کھلے ملتے ہیں ـــــ بیلا، چمیلی، جوہی، کیتکی، گلاب، موتیا، ـــــ اور ان کے علاوہ دور تک باغوں کی قطار رہتی ہے ۔ جس میں آم کے درخت میں بور آگئے ہیں ۔ اور پوری فضا مہک رہی ہے، اودی سیاہ، بہت گھنگھور گھٹا

گھری ہوئی، ینچے مور ناچ رہے ہیں۔ کوئل کوک رہی ہے، پپیہے بول رہے ہیں، جھولے پڑے ہوئے ہیں، کہ ان کا منڈول پر بل نے کے نکلے ہیں، کہار نیم کے نیچے ڈولی رکھ کر گا رہے ہیں، بہوؤں کو سسرال میں مائکے کی یاد ستا رہی ہے۔ بحر کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ پانی ہے کہ برستا جاتا ہے۔ جی ہے کہ امڈا آتا ہے۔ دریا —— امڈے ہوئے ہیں —— شام کے اندھیرے بڑھتے چلے آ رہے ہیں —— دور تک پھیلے ہوئے جنگلوں میں جگنو چمک رہے ہیں —— اور ریل سینہ تانے ہوئے ——

جہل کے سینے پہ زلفِ علم لہراتی ہوئی

ان جنگلوں سے گذرتی ہوئی چلی جا رہی ہے —— اس پورے ہندوستان کو اپنے قوی شانوں پر اٹھائے ہوئے جوش کی شاعری ہمارے ادب میں —— "اہرام مصر" کی طرح کھڑی ہوئی ہے۔

ان کی نظموں کو پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک عظیم قوت کے روبرو ہیں —— یہ قوت کیا ہے۔ کہاں سے آئی ہے۔ اس کا کوئی نام ہم متعین کر سکتے ہیں یا نہیں؟ —— یہ تمام سوالات ہمیں سراسیمہ کر دیتے ہیں —— اور ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ قوت نطق ہے —— جس کے پیچھے قدیم اور اساسی جذبات کارفرما ہیں —— ان جذبات کو اب تک کوئی زنجیر گرفتار نہیں کر پائی ہے۔ یہ ہر زنجیر کو توڑ کر نکل جاتے ہیں —— جوش صاحب کے اسی نطق نے ان کی نظموں کو کہیں کہیں پر فنی تکمیل تک پہونچنے نہیں دیا ہے —— وہ بات جہاں ختم ہو جانی چاہئے اس سے آگے بھی بڑھا دیتے ہیں۔ یا جتنے لفظوں میں ختم ہو جانی چاہئے اس سے زیادہ لفظ استعمال کر جاتے ہیں۔ مگر یہی بات تو بڑے شاعر کے یہاں پائی جاتی ہے —— کم کوئی بہت کم شاعروں کو بڑا بنا سکی ہے۔ جوش صاحب نے جتنے اور جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں کسی اور شاعر کو شاید یہ جرأت نہیں ہوئی۔ وہ اس معاملے میں بجر ذخار ہیں۔ لیکن کثیر العیالی کی طرح کثیر الفاظی بھی وبال جان بن جاتی ہے۔

جوش صاحب لفظوں پر عاشق ہیں، لو، کون شاعر ہوگا جسے لفظوں سے عشق نہ ہو۔ لیکن بڑا شاعر عشق کو فن بھی بنا دیتا ہے —— جوش صاحب اس فن سے پوری طرح واقف ہیں۔ لیکن جہاں وہ صرف عاشق نظر آتے ہیں وہاں ان کی شاعری اور بیان سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ یہ اُن کی شاعری کا کمزور پہلو بھی ہے اور توانا بھی۔ جب لفظ انہیں بہالے جاتے ہیں تو وہ بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی نظمیں رواں دواں ہونے کے باوصف اُس زمین کو چھوڑ دیتی ہیں جو ان کی شاعری کی سب سے بڑی قوت ہے۔ اسی لئے بعض حضرات سے زیادہ پڑھے لکھے لوگ ان کی شاعری کو فکر سے خالی بتاتے ہیں۔ حالانکہ ایسی شاعری جیسی جوش صاحب نے کی ہے فکر کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ جوش صاحب کی شاعری میں کوئی مخصوص فکری سمت نہیں پائی جاتی۔ اور اسی لئے ان کی شاعری پر مختصر بحث بہت مشکل ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں۔ یہ بھی سچ ہے کہ کوئی ایسی فکر جس کا ڈانڈا مابعد الطبیعاتی فکر سے مل جائے اُن کے ہاں نہیں —— لیکن فکر سے خالی ہو کر کوئی شاعر ایسی جیتی جاگتی تصویریں نہیں پیش کر سکے گا جو ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

فردوسی کے شاہنامے میں کون سی فکر ملتی ہے؟ سفید دیو، رخش اور سیمرغ وغیرہ میں کون سی فکر کارفرما ہے؟ شاہنامے کے اُن مشہور حصوں میں، جہاں رزمیہ مناظر پیش کئے گئے ہیں کون سی فکر موجود ہے؟ شاید ان حصوں میں

نہیں ہے جن معنوں میں ہم "فکر" کا لفظ استعمال کرتے ہیں —— فردوسی کی فکر تہذیبی فکر ہے —— اس کے کردار ایران کے تہذیبی کردار ہیں —— یہ کردار آدمی بھی ہیں اور علامتیں بھی ہیں —— یہی تہذیبی فکر جوش صاحب کے کلام میں ہے —— جو مابعدالطبیعاتی مسائل میں نہیں بلکہ اس برصغیر کے وسیع سینے پر چلتے پھرتے، لڑتے، جھگڑتے، عشق کرتے اور پھانسیوں کے تختے پر چڑھتے ہوئے آدمیوں کی شکل میں ملتی ہے ——

شاعری یوں بھی کی جاتی ہے کہ آدمی ایک خیال ہے اور شاعری یوں بھی کی جاتی ہے کہ خیال خود آدمی ہے — جوش صاحب کے یہاں مؤخرالذکر قسم کی شاعری ہے۔ وہ تصویروں میں سوچتے ہیں۔ اور استعاروں میں باتیں کرتے ہیں کوئی بھی خیال ہو، کیسا ہی نازک، باریک، لطیف، غیر محسوس ہو، اسے محسوس بنا دیتے ہیں —— ان کا انداز بیان ہر چیز کو مجسم بنا دینے پر قادر ہے۔ غالباً اردو کے کسی اور شاعر میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ اسی چیز نے ان کے کلام میں ڈرامائی عنصر بھی پیدا کر دیا ہے —— جو لفظوں کے سہارے ایک منظم ڈرامائی کیفیت سے ابھرتا ہے —— یہاں پہنچ کر الفاظ ان کی توانائی بن جاتے ہیں —— کبھی وہ الفاظ کو آہستہ روی سکھاتے ہیں —— اور یوں ایک (Suspense) استفاریہ پیدا کر دیتے ہیں —— کبھی وہ تیزی کے ساتھ ان الفاظ کو حرکت میں لاتے ہیں اور یوں ایک نظم میں ایک مخصوص Tempo روانی اور زور کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ "تعاقب" اُن کی ایک نظم ہے۔ اس میں الفاظ سے انہوں نے حیرت انگیز کام لیا ہے —— ہر لفظ پوری تیزی کے ساتھ تعاقب کرتا نظر آتا ہے۔ اور اپنی تیز روی سے ایک ڈرامائی تاثر پیدا کر دیتا ہے۔ جوش صاحب کے کلام میں عظیم الشان مجسمے کھڑے ہیں۔ جنہیں انہوں نے بڑی خوب صورتی سے الفاظ سے تراشا ہے —— ان مجسموں میں پورا ہندوستان ڈھل گیا ہے۔ اسی لئے ان کی فکر پورے ہندوستان کی فکر ہے —— اور ان کے کلام میں کسی ایک فکر کی تلاش بے سود ہے۔

صبا صاحب! اُن لوگوں سے کہئے جو جوش صاحب کی فکری شاعری کا رخ متعین کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں کہ آدمی کا سامنا کریں اور زیادہ متفکر نہ ہوں۔ سب سے بڑی فکر یہی ہے۔ بعض لوگوں نے بتایا ہے کہ جوش صاحب کے یہاں جو کچھ فکر ہے وہ ایک خاص قسم کی لذتیت کی شکل میں ابھرتی ہے۔ چلئے مان لیا۔ جوش صاحب کے ہاں لذتیت ہے۔ اچھا ان کی سیاسی شاعری میں بھی لذتیت ہے؟ یہ بھی یاد رکھئے کہ ایسی نظمیں جو سیاست سے متعلق ہیں اُن کے یہاں کم تعداد میں نہیں ہیں: جو ایسی شاعری کے بارے میں کیا فرمان ہے؟ غالباً ایسی نظمیں پھیکی اور غیر شاعرانہ ہیں۔ اور ان میں سیاسی پختگی موجود نہیں ہے۔ جہاں تک پھیکی اور غیر شاعرانہ ہونے کا تعلق ہے اس کا ایک پہلو تو لفظ اور بیان سے متعلق ہے۔ دوسرا وہی سیاسی پختگی یا فکر کی پختگی سے ملتا ہے۔ لفظ و بیان کے ضمن میں ان نظموں کو پھیکا کہنے کے لئے غالباً کیا یقیناً بڑی قادرالکلامی کی ضرورت ہے۔ رہ گیا سیاسی پختگی والا معاملہ؟ اس میں پوچھنے کی بات یہ ہے کہ ملک پر کوئی بیرونی طاقت قابض ہو تو کس قسم کی فکر سے کام لیا جائے؟ اس موقع پر کیا کہنا چاہئے، اور کس طرح سوچنا چاہئے، شاعر کا رویہ کیا ہونا چاہئے؟ غالباً وہی ہونا چاہئے جو جوش صاحب کا تھا —— اور جوش صاحب کی فکر صرف غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف ہی نہیں تھی —— کچھ اس سے بھی آگے تھی۔ ان کی فکر عالمگیر انسانی برادری کی فکر سے جا کر مل جاتی ہے۔ اچھا اسے بھی چھوڑئیے۔ اُن کی منظریہ نظموں میں

سیاسی نظموں والی عدم پختگی نہیں ملتی ؟ شاید نہیں — اب انہیں کہاں کھپائیے گا ؟

اسی طرح سوچتے چلے جائیے اور آپ کی فکر کو کسی منزل پر قرار نہ آسکے گا۔ اور آپ یہ طے نہ کر پائیں گے کہ جوش صاحب کی شاعری کے لئے کون سا نام تجویز کیا جائے ؟ — اسے فکر کے کس پیمانے سے ناپیں — ان کی شاعری میں آخر کون سی چیز پائی جاتی ہے ؟ — لذتیت، مزاج، الحاد، مذہبیت، سیاست، رندی، ہوس، سرمستی، لاابالی پن، جوانی کی دیوانگی، توانائی، دردمندی، انسانیت — آخر کیا پایا جاتا ہے ؟ اور آپ الجھ کر رہ جائیے گا۔ جوش صاحب کی شاعری میں غالباً یہ تمام عناصر کم و بیش پائے جاتے ہیں — اور یہی چیز ان کی شاعری کو ایک بہت بڑی شخصیت عطا کرتی ہے — اس میں شک نہیں کہ یہ عناصر بعض اوقات آپس میں دست و گریباں بھی ہیں۔ یہ کبھی کبھی متضاد رجحانات کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ مگر ہر بڑے شاعر کے کلام میں یہ متضاد عناصر ملتے ہیں۔ ہم جس سماج میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ متضاد اور متصادم عناصر سے مل کر بنا ہے۔ اس معاشرے کی اجتماعی فکر انہیں عناصر سے ترتیب پاتی ہے۔ جوش صاحب کی فکر اس پورے نظامِ زندگی کی ترجمانی کرتی ہے جس کی وہ بیک وقت پروردہ اور نکتہ چیں ہے۔ وہ یک طرفہ اور یک رُخی نہیں ہے — وہ ہمہ گیر ہے — وہ شاعری فکر ہے جو معاشرت کے ہلکے سے ہلکے ارتعاش کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کے کہنے کا انداز کچھ ایسا ہے کہ بڑی سے بڑی بات اولیں طور پر شعر معلوم ہوتی ہے بعد میں کچھ اور — جوش صاحب کے کلام میں اہم ترین بات یہ ہے کہ ان کی فکر بے روح نہیں ہے — وہ زندہ ہے اور زندہ آدمیوں کی فکر ہے۔ جو ہر لمحہ بدل رہے ہیں، اور نوبہ نو تغیرات کا ساتھ دے رہے ہیں — اردو کے کم شاعر ہیں جنہوں نے اتنی مدت سے کہنے کے باوجود اپنے کلام کی قوت کو برقرار رکھا ہے، بلکہ بڑھاتے بھی رہے ہیں۔ جوش صاحب کی شاعری میں بڑا دم ہے۔ اس نے جدید فکر سے آنکھ کبھی نہیں چرائی۔ زبان و بیان کے جتنے تجربے، الفاظ کو نئے زاویوں اور نئی معنویت سے صرف کرنے، اور مصرعوں کو ترو تازہ بنانے کی جتنی مثالیں جوش صاحب کے کلام میں ملتی ہیں وہ ہمارے پچھلے دور کی شاعری تو کیا، موجودہ دور میں بھی مفقود ہے۔ یہ تجربات جرأت فکر کے بغیر ممکن نہیں۔

جوش صاحب کی شاعری ایک طرف تو ہماری شاعری کی اعلیٰ ترین روایات کی حامل ہے۔ دوسری طرف نئے عہد کی بت شکنی کا تیز و تند جذبہ لئے ہوئے ہے — یہ بڑی نڈر، سرکش اور بے باک شاعری ہے۔ یہ سامنے آکر وار کرنے کی قائل ہے۔ کمیں گاہ میں دبک کر یا منہ پر نقاب ڈال کر حریف پر حملہ نہیں کرتی۔ اسی لئے بعض حضرات کی طبعِ نازک پر یہ شاعری گراں بھی گذر سکتی ہے۔ مگر ہمیں ان حضرات کی طرف توجہ کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی ان لوگوں کی طرف جو کارزارِ حیات میں پابرہنہ مصروفِ گیر و دار ہیں۔ جوش صاحب کی شاعری اس آدمی کے گیت گاتی ہے جو آج ایک ہاتھ پر آفتاب، دوسرے پر ماہتاب لئے مشرق و مغرب میں اُبھر رہا ہے۔

"میری کتابِ حیات" ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جہاں سے چاہو ورق اُلٹ لو۔ میری کتاب میں کوئی "بابُ الاسرار" موجود نہیں ہے"

جوش

ڈاکٹر محمد حسن

جوش کی شاعری

جوش نشاطِ زیست، سرمستیِ احساس اور شوکتِ الفاظ کے شاعر ہیں۔

وہ شاعروں کی اس نسل کے شاعر ہیں جس نے سودا، غالب، نظیر، آتش، انیس اور اقبال کو جنم دیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ جدید ہوتے ہوئے بھی قدیم ہیں۔ باغی ہوتے ہوئے بھی روایت دوست، اور انقلابی ہونے کے باوجود بھی ماضی پسند ہیں۔ جوش میں وہ جمال و جلال، نفاست و لطافت، شوکت و عظمت موجود ہے جو جاگیردارانہ تمدن کے دورِ شباب کی یادگار ہے۔ انہوں نے جاگیرداری سے بہت کچھ لیا ہے۔ محاسن بھی، معائب بھی۔

محاسن کے سلسلے میں ان کے آراستہ تخیل، نکھرے ہوئے احساسِ جمال اور مرصع کار جذبۂ سرمستی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری لکھنؤ کے دبستان کے تمام ادبی گناہوں کا خوبصورت تاوان اور حسین تلافی ہے۔ خارجیت، تلذذ اور معنی آفرینی نے لکھنؤ کو بدنام کیا۔ جوش نے انہی گناہوں کو آرٹ کی سطح تک پہونچا دیا۔ جوش کی تخلیقی صلاحیتیں اس لئے مردافگن ہے۔ نشاط کی کلیاں اور احساس سے پھول کھلانے کی قدرت رکھتی ہیں۔

جوش انیسویں صدی کے آخری چند سال میں پیدا ہوئے۔ ملیح آباد کے پٹھانوں کے اس معزز گھرانے میں پیدا ہوئے جس کو فقیر محمد خاں گویا جیسے قابل جنرل اور معروف شاعر اور ادیب کے نام سے نسبت تھی اور شرافتِ نسبی پر غالب کی طرح وہ ہمیشہ فخر کرتے رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں قومیت، آزادی اور انصاف کی آوازیں کانوں تک آنے لگی تھیں۔ بیسویں صدی کے ابتدائی ۲۵ سال میں یہ آوازیں اور بھی زیادہ بااثر ہو گئیں۔ اسی زمانے میں لکھنؤ کی تہذیبی بساط درہم برہم ہوئی۔ اودھ پنچ اور سرشار کے اثرات ماند ہونے لگے۔ لکھنؤ کے تمدنی مرکز سے ٹوٹ کر ادھر ادھر کے قصبات میں مشرقی تمدن کے آخری نمونے لطیف جلوے دکھانے لگے تھے۔ پھر ملیح آباد کی قصباتی فضا، آم کے باغوں کی مہکتی ہوئی بھینی بھینی بو، کچے راستے، جھونپڑے اور درخت سبھی کچھ جوش کی شاعری میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔

جوش عزیز لکھنوی کے شاگرد تھے۔ وہ عزیز نہ بن سکے۔ البتہ انہوں نے عزیز سے شوکتِ الفاظ اور فکر کی جھنکار، یا یوں کہئے کہ فکر کی اہمیت کا احساس تو لے لیا، مگر ان کی شاعری کی گراں باری، تصنع اور نا ملائمت سے دامن بچا لیا۔ اس واسطے سے جوش کا لکھنؤ اسکول سے بڑا گہرا رشتہ قائم ہوا، یہ صرف معنی آفرینی، پرتکلف رعایتِ لفظی اور رقابت بیان ہی کی شکل میں

ظاہر نہیں ہوا، بلکہ خارجیت، منظر کشی، تشبیہ و استعارے، محاکات اور تمثیلوں میں (Images) بھی لکھنؤ کا مذاق سخن جگہ جگہ جھلکتا نظر آتا ہے۔

جوش نے لکھنؤ کی شائستگی اور رچاؤ کو نئے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اس مرصع کاری اور آراستگی کا دامن محدود نہیں ہے۔ اس میں مینا کاری اور ریزہ چینی کا اسلوب نہیں ہے۔ انہوں نے اس رچاؤ کا اظہار عصر حاضر کے ساز و سنتور میں کیا ہے۔ جوش آراستگی کے قائل ضرور ہیں مگر یہ آراستگی فن کاری کی ہے صناع کی نہیں۔ ان کے ہاں تشبیہ تمثیل اور محاکات کا ایک دل نواز طوفان ہے جو محض تصنع نہیں ہے بلکہ حسن کی متلاشی مصور کی بے قرار روح کی اڑان ہے۔ جو حسن کے ایک منظر سے دوسرے منظر تک اڑتی چلی جاتی ہے۔ ان کا تخیل مسافر جیالا ہے جو ہزار عشوۂ حسن کی جھلکیوں سے مطمئن نہیں ہوتا۔ اور نئے رنگ محلوں کی تلاش میں ہمیشہ محو سفر رہتا ہے۔

جوش نے جاگیردارانہ دور کے لکھنؤ سے شوکت تخیل اور امارت احساس لی ہے اور اسے بیسویں صدی کے سماجی اور فکری تقاضوں سے بہت کچھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کوشش کی کامیابی مشروط اور محدود تھی۔ جوش بیسویں صدی کی نوجوان نسل کے ایک فرد نہیں تھے، وہ گزرے ہوئے تمدن کی شمعوں کی روشنی ساتھ لائے تھے۔ اسی لئے جوش نے بیسویں صدی کے مسائل میں سے اکثر کو پرانے شاعرانہ اسلوب میں سمونے کی کوشش کی۔

جوش نے اس وقت شاعری کے کوچے میں قدم رکھا تھا جب لکھنؤ اسکول کے آخری دور کی شمعیں بھی جھلملانے لگی تھیں۔ انجمن معیار کا آخری دور تھا۔ سوز و گداز کی کمی اور خارجیت کی افراط کا احساس خود لکھنؤ کی شعراء کو ہونے لگا تھا اور اس کمی کو پورا کرنے کے لئے کبھی میر اور غالب کی تقلید سے اور کبھی قبر، میت، موت وغیرہ کے ذکر سے پیدا شدہ ماتمی فضا سے کام لیا جانے لگا تھا۔ یگانہ کی آواز بھی اسی زمانے میں ابھری تھی۔ جوش نے اس زمانے میں بڑی طمطراق کی غزلیں کہی ہیں۔ جن میں سجاوٹ بھی ہے فن کاری بھی اور شوکت تخیل بھی۔

دوسری طرف یہ دور حالی اور آزاد کی نظم نگاری کی تحریک کے فوراً بعد کا دور تھا۔ اسی دور میں وہ نسل ابھری تھی جو سرسید اور ان کے رفقاء کے برخلاف صرف مغربیت سے متاثر نہیں تھی بلکہ اس کا براہ راست مطالعہ کرنے لگی تھی اور اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ انگریزی شاعری محض اخلاقیات، نیچرل مضامین اور قوم پرستی کے وعظ سے عبارت نہیں ہے۔ اس میں بیاتی حسن کی فراوانی بھی ہے اور فرد کا دکھ درد بھی ہے۔ اس نسل کے نوجوان انگریزی شاعری کو وکٹورین دور کی شاعری کے ہم معنی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انہوں نے رومانوی شاعروں کا بھی مطالعہ کیا تھا، اور آسکر وائلڈ وغیرہ تک بھی ان کی رسائی ہونے لگی تھی۔ خود ہندوستان میں رابندرناتھ ٹیگور کی ماورائیت میں ڈوبی اور رومانوی دھند میں کھوئی ہوئی آواز ابھرنے لگی تھی۔ ان اثرات سے اردو میں بھی ایک ایسا گروہ پیدا ہونے لگا تھا،

---

[1] قواعد کے اعتبار سے رومانی ہونا چاہئے۔ مگر رومانی کا لفظ عام طور پر عشق و عاشقی کے معاملات کے لئے وقف ہو چکا ہے اس لئے اس سے امتیاز پیدا کرنے کے لئے رومانوی کا لفظ اختراع کرنا پڑتا ہے۔ اس سے مراد یورپ کی اس تحریک سے متاثر حضرات کا ذکر کرنا ہے جو کلاسیکی انداز فکر سے بغاوت، جذباتیت، افسردگی، ماضی پرستی اور انفرادیت پسندی کے رجحان کے نمائندے کہے جاتے ہیں۔

جو نظم کو محض اخلاقیات، قومیت اور خشک مضامین تک محدود نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس میں رومانوی اسلوب کا سا ابال تھا، اور وہ پرانی قصیدہ اور اندازِ نظر کے سلاسل توڑ کر اس نئی صنف میں نئے تجربے کرنا چاہتا تھا۔ اقبال اپنی فلسفیانہ گہرائی اور بینائی کی وجہ سے نظم کو نئی رفعتوں سے آشنا کرا رہے تھے۔ ہندوستانی سیاست میں نیا جوش ابل رہا تھا۔ یہاں کی معاشرت، سماجی تصورات، اقدار میں ہلچل سی معلوم ہوتی تھی۔ نوجوان مذہب تک کی گرفت سے آزاد ہوتے جا رہے تھے۔ آزاد خیالی اور تشکیک، انفرادی خود اعتمادی اور عقلیت پسندی کا دور دورہ تھا۔ دنیا میں عوام کی پکار تھی۔ روس میں مزدوروں کی حکومت قائم ہو چکی تھی، اور نوآبادیوں میں بھی آزادی اور حریت کی نئی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

جوش کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے چھوٹے دائرے میں رہنے سے انکار کیا۔ اور ذاتی اور نجی مسائل میں الجھے رہنے یا غزل کی روایتی بندشوں میں محدود رہنے کے بجائے انہوں نے فکر کی نئی شمع روشن کی۔ گو اس روشنی کو انہوں نے مختلف آتش کدوں سے حاصل کیا تھا، مگر شمع ان کی اپنی تھی۔ ان کے ہاں مربوط اور عمیق فلسفہ فکر نہیں ہے مگر قومی اور آفاقی مسائل سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت ان میں موجود ہے۔ اور اس ہمت کو وہ محض ذہنی جناتک نہیں رہنے دیتے بلکہ اسے شعر کے پرکیف اور دل نواز سانچے میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ فلسفی بننا نسبتاً آسان ہے۔ مگر چھوٹے موٹے خیال کو بھی جذبے کی نرم آنچ سے شعر کے سانچے میں ڈھالنا بہت دشوار ہے۔

جوش کی افتادِ طبع کو سمجھنے کے لئے ان کے اس رومانوی پہلو کو سمجھنا ضروری ہے۔ جوش کے اندر بغاوت کا وہی جذبہ موجود ہے جس کا عکس بائرن، شیلی، اور کیٹس کے ہاں نمایاں ہوا تھا۔ وہ بت شکنی کے قائل ہیں۔ مذہب اور خدا کے بارے میں ان کے تصورات بلاشبہ غیر روایتی ہیں۔ خیر و شر کے بارے میں بھی انہوں نے جگہ جگہ بغاوت آمیز اشارے کئے ہیں، جن میں سب سے زیادہ مرتب تصور "جھنکتی ہوئی پتی" میں ملتا ہے۔ قوت اور حیات انہیں عزیز ہیں۔ جوانی اور جوش کے وہ پرستار ہیں۔ رومانیت کو کسی نے (cult of energy) کہا ہی ہے۔ ماضی سے انہیں لگاؤ ہے۔ پرانے ایوانوں میں مومی شمعیں جلا کر وہ پرانی یادوں میں محو ہو جاتے ہیں۔ نسلی افتخار ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ انفرادیت پسندی اور کسی حد تک خود پرستی کا اظہار ان کی شاعری اور شخصیت سے ہوتا رہتا ہے۔ ایک بے نام غم سے لگاؤ، ڈرامائی حد تک جذباتیت کا وفور، رمحفل کی قصیدہ نگاری کے باوجود) اور صرف کار تخیل بھی ان کے ہاں موجود ہے۔ اور یہی وہ عناصر ہیں جو رومانوی شعراء کا امتیاز قرار دیئے جاتے ہیں۔ عورت دوستی اور آزادی پسندی بھی رومانوی شعراء ہی کی طرح ان کے کلام کی خصوصیات میں شامل ہیں۔

رومانویت کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ اس کی ابتدا روسو کے اس جملے سے ہوئی تھی:

"انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن
جہاں دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے!"

اور یہاں انسان کی آزادی سے روسو کی مراد اس کی جذباتی آزادی ہے۔ جوش اس اعتبار سے روسو کے ہم نوا ہیں۔ جوش کے نزدیک انسانی زندگی فرد کی جذباتی آسودگی سے عبارت ہے۔ اور تمام قوانین و ضوابط — خواہ وہ مذہبی ہوں یا اخلاقی، سیاسی ہوں یا سماجی، ان کا جواز صرف اس قدر ہے کہ وہ ہر فرد کے جذباتی اظہار اور تکمیل میں معاون ثابت ہوں۔ اور اس راستے کی رکاوٹوں کو دور کر دیں۔ ان کے نزدیک زندگی محض نشاطِ زیست سے عبارت

ہے۔ اس نشاطِ زیست کو بھی انہوں نے انفرادی تصور کیا ہے۔ اس لحاظ سے جوش کے ہاں قومیت، وطن دوستی اور انسان دوستی کے سارے سرچشمے ان کی اپنی ذات سے پھوٹتے ہیں۔ اسی نشاطِ زیست سے پھوٹتے ہیں۔ اسی جذباتی آسودگی کی تلاش سے برآمد ہوتے ہیں جو ان کے نزدیک حیات کا ما حصل ہے

رومانویت بھی دو دھاری تلوار ہے۔ مارکس نے شیلی اور بائرن کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ،

"اگر شیلی زندہ رہتا تو بہت بڑا انقلابی
ہوتا۔ اگر بائرن زندہ رہتا تو شاید بہت بڑا
آمریت پسند ہوتا!"

یہ دونوں رومانوی شاعر تھے۔ لیکن دونوں کی افتادِ طبع ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھی۔ جوش بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ جوش کی رومانویت، انارکزم یا مزاج تک پہونچتی ہے۔ انارکزم کا ترجمہ نراجیت کرنا پڑتا ہے۔ مگر انارکزم سے نفسی نفسی یا انتشار محض مراد نہیں ہے۔ پرنس کروپاٹکن سے ہربرٹ ریڈ تک مختلف مفکر اور مصنف ایسے گذرے ہیں جنہوں نے ایک ایسے دور کا خواب دیکھا تھا جب افراد بغیر کسی قانونی یا ریاستی (یا مذہبی اور اجتماعی) شکنجے کے۔ نیک نفسی اور آزادی کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ اگر ان کا کوئی رہنما ہوگا تو ان کا نفس۔ اگر ان کا کوئی محتسب ہوگا تو ان کا ضمیر اس وقت انسان کو مکمل جذباتی آسودگی نصیب ہوگی۔ اور قانون اور اداروں کا تابع ہونے کے بجائے قانون اور ادارے اس کے تابع ہوں گے۔

جوش فکری اعتبار سے انارکزم کے قریب ہے جا سکتے ہیں۔ جوش کے ہاں انقلاب اور آزادی کا تصور اسی لئے تخریبی زیادہ ہے کہ وہ زنجیروں اور زندانوں کی شکست کے خواب دیکھتے ہیں۔ نئی پابندیوں کا تصور نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک آزادی نئی ضرورتوں اور حد بندیوں کے احساس کا نام نہیں ہے۔ بلکہ تمام حد بندیوں کے ٹوٹ جانے کا نام ہے۔ اسی لئے ان کا تصورِ انقلاب عملی نہیں نظریاتی بلکہ آدرش وادی ہے۔ انہوں نے آزادی کے بعد کے ہندوستان کے لئے اپنے ذہن میں بھی کوئی نظام مرتب نہیں کیا تھا۔ کوئی مثبت خاکہ نہیں بنایا تھا۔ (یہ اور بات ہے کہ اس دور کے ہمارے سیاسی رہنماؤں میں سے بھی اکثر نے اس قسم کا خاکہ مرتب نہیں کیا تھا)۔ اِن کا تصورِ انقلاب سائنٹفک عملی اور محض سیاسی نہیں تھا۔ جذباتی تھا۔ ان کے نزدیک آزادی کے بعد کا ہندوستان بہشت کا نقشہ تھا جس میں سارے مسائل حل ہو چکے ہوں گے۔ اور روئے زمین سے ناانصافی، عدم مساوات، غربت، جہالت، بیماری تعصب اور جذباتی ناآسودگی کے جذام از مٹ چکے ہوں گے۔

جوش کو "شاعرِ انقلاب" کہا جاتا ہے کسی حد تک یہ بات صحیح بھی ہے۔ انہوں نے ایسے وقت میں آزادی کے نغمے الاپے اور نعرے بلند کئے جب برطانوی استبداد اس قسم کی باتیں کرنے والے کے لئے عرصۂ حیات تنگ کر دیتا تھا۔ میں نے ایک سے زیادہ اہم اور بلند مرتبہ سیاسی رہنماؤں کو یہ اعتراف کرتے سنا ہے کہ وہ پہلی بار جوش کی نظم سن کر یا اس سے متاثر ہو کر سیاست اور قومی آزادی کی لڑائی میں شامل ہوئے۔ ان کی انقلابی شاعری میں نذر الاسلام کی سی گھن گرج موجود ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود جوش کا تصورِ انقلاب سیاسی سے زیادہ جذباتی ہے۔
انقلاب ان کے نزدیک تمام جذباتی نا آسودگیوں کو دور کرنے والا اسم اعظم ہے۔ ان کے لئے سیاسی غلامی کا

اندھیرا بھی اس انقلاب سے ختم نہیں ہوگا، بلکہ انسانی ذہن کی نابلوغت، اس کا کچا پن، اور اس کی نامرادی بھی اس سے دور ہوگی۔

عرفی نے اللہ تعالیٰ سے شکایت کی تھی کہ — تو آسمانوں کی اس بزم میں اتنی گنجائش بھی نہیں ہے کہ ایک ذرہ حالت مستی میں مجھ بھر کر اپنی آستین پھیلا سکے — جوش کے ہاں انقلاب اس ذرے کی جی بھر کر آستین پھیلانے کی وسعت کا نام ہے۔ جب شباب اور مستی ہر قسم کے قیود اور ضابطوں سے بے نیاز ہو کر ذات کو تکمیل دے سکیں۔ یہی آزادی ہے۔ یہی تکمیل ذات ہے اور یہی نشاطِ زیست کی آخری منزل — !!

آزادی دراصل جوش کی ذات کی توسیع (Projection) ہے۔ اس میں انسان اور انسانیت کی تکمیل کی تمنا جلوہ گر ہے اور اس تکمیل کا تصور جوش کے نزدیک بہت کچھ داخلی اور انفعالی ہے۔ انفرادی جذبے کی پوری شدت کے ساتھ تکمیل ہی ان کے نزدیک آزادی ہے۔ ان کے تصورِ انقلاب میں تندی اور تلخی ہے۔ اسی لئے بعض نقادوں نے انہیں انقلاب کا مغنی کہنے سے احتراز کیا ہے۔ یہ دراصل بے انصافی کی بات ہے۔ جوش کی انقلابی شاعری کا زمانہ وہ تھا جب ہندوستانی سیاست میں انقلاب کا تصور نیا نویلا تھا۔ اس وقت تک مصلحت پسندی اور آئین پرستی کے گن گانے والوں کی آوازیں مدھم نہیں ہوئی تھیں۔ سیاست میں لبرل ازم اور ماڈریٹس (Moderates) کا بھی دور دورہ تھا۔ اس وقت آزادی اور انقلاب کے تصور کا بہت کچھ منفی اور تخریبی ہونا لازمی سا تھا۔ جوش اور جذباتی سرمستی کے تصور کے دلدادہ رومانوی شاعر کے لئے یہ کچھ قدرتی سی بات بھی تھی۔

فطرت پرستی اور قدرتی مناظر کی دلدادگی کا میلان بھی اسی سرچشمے سے پیدا ہوا ہے۔ فطرت کا وہ تصور جوش نے نہیں اپنایا جو ورڈز ورتھ کے نام سے منسوب ہے بلکہ فطرت اور قدرتی وجود کو جوش نے جبلت اور فطری خواہشات سے زیادہ انفرادی جذبات اور خواہشات کی تکمیل کے مرادف سمجھا ہے۔ حسن فطرت کو وہ اپنے جذبات کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ یہ فطرت بھی ان کی ذات کی توسیع (Projection) ہی کا نام ہے۔

اس کے باوجود یہ بات تسلیم کرنی چاہئے کہ فطری مناظر کی جو پرکیف اور پرجوش عکاسی ان کے ہاں ملتی ہے اس کی نظیریں ہمارے ادب میں بہت کم ہیں۔ فطرت کے ان کے ہاں محض سادہ ورق نہیں ہیں بلکہ بولتی گاتی ہوئی حقیقت ہے جو رموز و نکات کھولتی چلی جاتی ہے۔ جذبات کو جگاتی ہے۔ خیالات کو جنم دیتی ہے۔ افکار و احساس کے نرجانے کتنے گل ہائے شگفتہ کو کھلاتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ فطرت منفی وجود نہیں ہے جسے بیدار کرنے کے لئے انسانی کاوش و جستجو، عمل اور جد و جہد کی ضرورت ہے۔ جوش کے یہاں فطرت ایک مثبت وجود ہے جو اضافی نہیں محتاجِ نظر بھی نہیں۔ مگر اس کے گرم مس اور حیات آفریں نفس میں وہ شادابی ہے جو مردوں میں جان، جذبات میں ولولہ پیدا کر دے۔ اور اہل نظر کو "ثبوت حق" بہم پہنچا دے۔

یہی اثباتی اور انفرادی کیفیت اُن کے تصورِ حسن و عشق کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ یہ عشق ہماری شاعری کا پرانا موضوع ہے۔ لیکن اس جذبے کا رشتہ حسن کا مرہونِ منت رہا ہے۔ اور اسے عموماً دوسرے ثانوی حیثیت حاصل رہی ہے۔ جوش کے ہاں عشق سرنگوں نہیں۔ ثانوی حیثیت پر قانع بھی نہیں ہے۔ جوش کا مقصود محض

عمل ہے۔ اور یہ عشق نشاطِ زیست کا ایک بہانہ بن کر سامنے آتا ہے جس طرح اقبال نے شاہین کی زبانی کبوتر کے لہو کے بجائے کبوتر پر جھپٹنے میں ساری لذت ڈھونڈ نکالی تھی۔ اسی طرح جوش کا محبوب حسن بجائے عشق کی تب و تاب ہی ہے۔ اس تب و تاب سے وہ ہمیشہ اپنا سینہ روشن اور اپنے انفاس کو مہک دار رکھنا چاہتے ہیں۔ محبوب کا تصور صرف انہیں اسی حد تک عزیز ہے جب تک اس تب و تاب کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے جذبے اور ولولے سے عشق کیا ہے۔ اس کی "مردانگی" سے بھی گذرے ہیں۔ اور نیم برہنگی سے بھی۔ لیکن یہ ہنگامۂ رنگیں کا ایک بہانہ ہی تھا۔ اس پردے میں بھی وہ اپنے شدید جذباتی لمحوں میں۔ کسی حسینہ کی نہیں، صرف اپنی ہی پرستش کر رہے تھے۔ اسی جذبۂ سرمستی کے پیچھے دوڑ رہے تھے جو احساسِ جمال اور ذوقِ نظر کی رنگینیاں حاصل کر کے ہوش ربا ہو گیا تھا۔ ان کے عشق میں سمندروں کا سینہ خاموش جلال و استقلال نہیں ہے پہاڑوں، جھرنوں کی تیزی اور ابال ہے۔ جو کبھی ایک راستے کا پابند نہیں رہتا۔ بلکہ خود اپنی سرمستی سے ناچتا گاتا ہوا ہر لمحہ نئے راستے اور نئے میدان تلاش کرتا ہوا گذر جاتا ہے۔

جوش کا عشق کیف گداز سے تقریباً خالی ہے۔ لیکن وہ بے لذت اور پھیکا پایا: اری عشق نہیں ہے۔ اس میں نشاط کیف کی وہ بے شمار تصویریں اور تمثال (Images) ہیں جن سے اردو شاعری اب تک خالی تھی۔ وصل وہ تھا کہ ہمارے شاعروں نے شاعری کی کیفیت کے لئے سمِ قاتل سمجھا تھا۔ میر صاحب نے جرأت کو یہی مشورہ دیا تھا کہ...

> اپنی چوما چاٹی کر لیا کرو۔ رہی
> شاعری، تو وہ آپ کے بس کی نہیں"

داغ سے لوگوں نے مزے دار شاعری کا مزا تو چکھا، مگر اس کو اعلیٰ منصب کبھی نہیں دیا۔

جوش کی شاعری میں .... آلودگی اور لذتیت سے خالی نہیں ہے کہ جوش کبھی اس کا شکار نہیں ہوئے۔ وہ داغ جرأت اور انشا نہیں ہے۔ نظیر اکبرآبادی کے کوچے سے ہو کر نکل گئے۔ ساقی کو سرمستی میں کھلا ڈلا پن تھا۔ ایک ایسے شخص کا عیش و نشاط تھا جو محبت میں بوس و کنار کو نہ چوری چھپے جرم کی طرح کرتا ہے اور نہ اس میں گندگی اور عیاشی کا تلذذ پیدا کرتا ہے، بلکہ غلط عام گنتی یا احساسِ جرم سے بیزار ہے جو زندگی کی ہزار جلوہ رنگینیوں کا ایک جزو سمجھ کر اس سے بھی لطف لیتا ہے۔ اس کے بعد جنس کی لذت محبت کا کیف بھی ہوا۔ یہ برتنے ال کا ایک چھوٹا سا ہے۔ جس میں نہ کوئی گندگی ہے نہ عیاشی۔

جوش کے ہاں آلودگی ہے۔ مگر ان کی شاعری پر اس کا تسلط نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ جوش نے محبوب کے تصور کے ساتھ عشق کے تصور میں بھی جاگیردارانہ عناصر کو اختیار کیا ہے۔ اسی لئے اپنے تمام جدید اور انقلابی تصورات کے باوجود جوش نے عورت کے قدیم مشرقی تصور ہی کو عزیز رکھا ہے۔ اور اس سے تجاوز روا نہیں رکھا۔

مجاز مرحوم راوی تھے کہ:

> "نیا ادب" اور "کلیم" کے دفتر میں ایک جاپانی گوریلا سپاہی عورت کی
> تصویر لگی ہوئی تھی۔ عورت یونی فارم میں تھی۔ اور کارتوسوں کی پیٹی ڈالے ہوئے تھی
> جوش جب بھی دفتر جاتے تھے اس تصویر کو الٹ دیا کرتے تھے کہ عورت کا یہ روپ

اُن کی جمالیاتی حس، کو مجروح کرتا تھا۔

"فکر و نشاط" میں مشرقی اور مغربی عورتوں کی جو تصویر انہوں نے کھینچی ہے وہ بھی اس کا ثبوت ہے۔ جوش نے جاگیردارانہ تمدن کے اس عقیدے کو صحیح تسلیم کیا ہے کہ عورت کی حیثیت ضمنی ہے۔ وہ مرد کے لئے ذریعۂ نشاط اور اس کے بچوں کی ماں پہلے ہے اور سب کچھ بعد میں۔

محبوب کا بھی یہی تصور جوش کے پیش نظر رہتا ہے۔ اسے باحیا، شاید پردہ نشیں بھی، حسین، عشوہ طراز ہونا چاہیے مگر اس کا منصب محض مرد (یا عاشق) کے لئے سرمایۂ نشاط بننا ہی ہے۔ اس کی فضیلت اسی میں ہے کہ جب وہ خانقاہ میں معصومیت کے ساتھ چہرے سے نقاب الٹ دے تو فاضلوں کو علم و فضل بھول جائے۔ زاہد کے ہاتھ سے تسبیحیں چھوٹ جائیں۔ اور صوفیاء کے ہونٹوں میں ضرب لا الہٰ دب کر ٹوٹ جائے۔ وہ عورت کو جد و حیات میں صف بہ صف اور شانہ بہ شانہ جگہ دینے کو تیار نہیں۔ اس کے لئے جگہ خلوت خانے ہی میں ہے۔ اور اس کے لئے جہد حیات کی جلتی دھوپ نہیں بلکہ پھولوں کی مہک اور چاندنی کا نرم اُجالا ہے۔ اس کے لئے وہ تمام نزاکتیں اور لطافتیں ہیں جو بند نامۂ سلام سیاں مجاز میں راتوں کے لئے وقف کی گئی ہیں۔

اس طرح گویا جوش کا محبوب فرماں روا نہیں، تابع فرمان ہے۔ وہ مقصود نہیں ذریعہ ہے۔ وہ منزل نہیں راستہ ہے۔ اصل منزل تو عشق کی تب و تاب ہے۔ اصل محبوب تو جوش محبت ہے۔ اسی لئے کہیں بھی جوش کے ہاں عشق کا درجہ محبوب سے نیچے نہیں ہونے پایا ہے۔ ہر جگہ انہوں نے عشق کا وقار قائم رکھا ہے۔ ان کی کلاہ ہمیشہ کج رہی ہے اور کوچۂ خوباں میں بھی وہ وجاہت کے ساتھ جانے جانے کے منہ کا ذکر بھی کرتے رہے ہیں۔

اس ضمن میں جوش کی خمریات کا تذکرہ بھی آ جاتا ہے۔ جوش نے شراب کو بھی Idealise آدرش بنا دیا ہے۔ شراب کو یوں تو اردو شاعری کے ہر دور میں مقبولیت حاصل رہی۔ اس کا چرچا ہر دیوان میں ہوتا رہا۔ پھر جوش سے پہلے آتش خمریات کو ایک موضوع کی حیثیت سے اپنا چکے تھے۔ اور ریاض نے سے اپنا سرمایۂ شاعری ہی بنا لیا۔ خود جوش کے ہم عصروں اور اُن کے بعد کی نسل نے شراب کو زندگی بنا لیا۔ مجاز سے زیادہ شراب کس نے پی ہوگی! اختر شیرانی اور مجاز اسی کی نذر ہو گئے۔ مگر جوش نے خمریات کو جس انداز سے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے، اس کی کیفیت نرالی ہے۔

غالب نے شراب کو غم گیتی کا جواب کہا تھا۔ جوش نے اسے نشاطِ زیست کا ایک جز و لاینفک بنا لیا ہے۔ انہیں شراب میں دوہری کیفیت ملی ہے۔ ایک طرف تو شراب کے خلاف عام نفرت کی فضا میں شراب کو اپنانا بغاوت اور بت شکنی کے جذبے کو تسکین بخشتا ہے۔ دوسری طرف نشاطِ زیست کا وہ احساس پیدا ہوتا ہے، جو شکوک اور پابندیوں (Inhibitions) سے بے نیاز ہے۔

شراب نوشی کے لئے جوش کو معذرت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اسے ایک شاعرانہ کیفیت سمجھ کر اختیار کرتے ہیں— اس کے بغیر انہیں وہ ولولہ، وہ تب و تاب، وہ جرأت پرواز، اور وہ افسانہ و افسوں کی کیفیت حاصل نہیں ہوتی— شاعری کو ماہرین نفسیات نے افسوں (Myth) قرار دیا ہے جو حقیقت سے بہ مراحل دور ہے۔ وہ حقیقت کو افسانوی شکل دے کر اس طرح پیش کرتی ہے کہ اس کی نقل پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ اس افسوں کو پیدا کرنے کے لئے

حقیقت کا ایک غیر حقیقی احساس ہوتا ہے۔ ایسے لمحوں میں انسان اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات پر بھی غیر ہو کر خارجی نقطۂ نظر (Objective) ڈالتا ہے۔ اپنے تجربات کی بھی اس طرح پڑتال کرتا ہے جیسے وہ کسی اور پر گذرے ہوں۔ کیونکہ اُس کو اپنے ذاتی مشاہدات اور تجربات میں عمومی پہلو دیکھنے ہوتے ہیں۔ ان حقیقتوں کا سراغ لگانا ہوتا ہے جو محض اُس کی ہی نہیں بلکہ عام ہیں۔ اسی عمل کو ایلیٹ نے غیر شخصیت Depersonalisation کا عمل کہا ہے۔ حقیقت کے اس افسوں طراز تصور کے سلسلے میں شراب کا نشہ مدد دیتا ہے۔

جوش کے تجربات میں یہی افسوں طراز Mythical کیفیت نمایاں ہے۔ اُن کے ہاں صرف پل من مزید کے نعرے یا زہد و اتقا کا مذاق اڑانا ہی سب کچھ نہیں ہے۔ وہ ان کیفیات کو بیان کرتے ہیں جو شراب ذہن پر طاری کرتی ہے۔ "چند جرعے" اس اعتبار سے اُن کی نمائندہ نظم ہے۔ اس اعتبار سے اُن کی خمریات اردو شاعری میں نرالی کیفیت رکھتی ہیں۔

ان تمام موضوعات پر لکھتے ہوئے جوش کے یہاں شدت کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ گہرائی کا بہت کم۔ اُن کے ہاں توانائی ہے جو بجلی کی طرح پڑھنے والے کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔ مگر وہ خاموشی و دیر میں اثر کرنے والی اور دیر تک رہنے والی چنگاریاں نہیں ہیں۔

جوش دنیا کے تجربات سے اثر قبول کرتے ہیں۔ شدت سے ہیجانات اور احساسات کا شکار ہوتے ہیں۔ مگر ان کے ہاں اقبال کی سی فلسفیانہ گہرائی نہیں ہے۔ ان کا اگر کوئی مذہب ہے تو انسان دوستی اور رومانویت، جو ساری زنجیروں کو گلا دیتی ہے۔ جو انسان کے گلے سے سارے طوق اتار کر پھینکنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اور نشاطِ زیست سے والہانہ مست اور سرشار ہو کر زندگی گذارنے کی تمنائی ہے۔

اردو شاعری میں جب بلند آہنگ شاعری کا غلغلہ ختم ہوا تو جوش کی مزدوروں اور کسانوں سے ہمدردی — اور انقلاب دوستی کا بھی مضحکہ اڑایا جانے لگا۔ ان کی ترقی پسندی کو بھی مشکوک نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ مگر یہ دراصل تصویر کا صرف ایک پہلو ہے۔

جوش کا دور برق و رعد ہی کا دور تھا۔ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، اور مولانا محمد علی کی آتش فشانیوں کا دور تھا جوش نے اپنے رومانوی افتادِ طبع کی بنا پر ہی برق و رعد کو اختیار کیا۔ قوت و جرأت کو اپنایا۔ ان سے شدت کے ساتھ نرم روی اور جوش کے ساتھ ملائمت کی توقع بے کار ہے۔ کسان اور مزدور کی حمایت کرتے ہوئے یقیناً وہ کسان اور مزدور کی سطح تک نہیں اُترے۔ اُن کی شاعری کا بڑا حصہ کسانوں اور مزدوروں کے لئے "ناقابلِ فہم ہوگا۔ لیکن کسان اور مزدور کی حمایت انہوں نے فیشن کے طور پر نہیں کی۔ وہ دراصل انہیں بھی عام انسان کی سطح پر لا کر اس کے جذباتی وجود کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اور اسے بھی نشاطِ زیست کی وہی سہولتیں بخشنا چاہتے ہیں۔ اس کے عملی مسائل سے انہیں کوئی غرض نہیں، یہ سچ ہے کہ ان کے یہاں کسان اور مزدور کا ایک آدرش وادی (Idealistic) تصور موجود ہے جو حقیقت سے بہر اصل دور ہے۔ اور انقلاب کی طرح انہوں نے کسان اور مزدور کو بقول شخصے اردو شاعری کے روایتی محبوب کی طرح ثنا و صفت کا سزاوار سمجھا ہے۔ مگر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ مزدور کی سطح تک اُترنے کو آمادہ نہیں ہیں۔ بلکہ مزدوروں اور کسانوں تک جاگیردارانہ تمدن کی برکتیں لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ زندگی کو خوب صورت بنانا چاہتے ہیں — اور اس

خوب صورتی کو پوری انسانیت کے لئے عام کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ خوب صورتی نکہتِ گل کی طرح آوارہ اور عام ہو اور اس نشاط میں سبھی انسان برابر کے شریک ہوں۔

پہلے کہا جا چکا ہے کہ جوش کے ہاں شدت زیادہ ہے اور گہرائی کم ہے اسی وجہ سے وہ اس فلسفیانہ نتیجے کو پیش کرتے وقت شدت اور سرمستی سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ جوش کے پاس وہ ضبط و احتیاط نہیں ہے جو فلسفیانہ مزاج کے لئے ضروری ہے۔ مگر اس کے مقابلے میں وہ رنگینی اور سرشاری موجود ہے جس سے فلسفی محروم ہوتے ہیں۔ اس سرشاری (Abandon) کی مثالیں اردو ادب میں شاذ ہی ملیں گی۔

یہاں تک نشاطِ زیست کا ذکر تھا، اب مستیٔ احساس پر غور کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ جوش نے اسی کی بدولت تخیل کے تخلیقی عمل تک رسائی حاصل کی ہے۔ اور خشک سے خشک مضامین میں شعریت اور جمالیاتی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ "احساس" کا لفظ ہمارے ہاں کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اولین 'ہیجان' کے معنی میں بھی، ارتعاش کے معنوں میں بھی، اور اسی کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی جذبے کی ابتدائی شکل کے لئے بھی اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ جوش کے ہاں احساس داخلیت کے عرفانِ خارج کا ذریعہ ہے۔ یہی ذات اور کائنات کی سرحد ہے۔ خودی اور ماورائے خودی، فرد اور اجتماع، انا اور غیر انا کی درمیانی لکیر ہے۔ احساس کی یہی کیفیت فکر کی پہلی سیڑھی ہے۔ اسی کے ہیجانات اور ارتعاشات کو شعور یکجا کرتا ہے اور ان احساسات کے ہزاروں اجزاء میں سے متعلقہ اجزاء چن کر اسے ایک کیفیت یا جذبے میں ڈھال دیتا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ احساس ابتدائی ہیجان یا ارتعاش سے شروع ہو کر شعور، تخیل اور عقل کی آمیزش سے جذبے کی شکل اختیار کرتا ہے۔

جوش کے یہاں ابتدائی ارتعاش اور ہیجانات تخیل کے شہپر دل پر پرواز کرتے آتے ہیں۔ جوش کے یہاں جذبے سے فلسفیانہ علیحدگی اور غیر شخصی خارجیت (objectivity) نہیں ہے۔ وہ اس میں شامل ہیں۔ آلودہ ہیں اس سے مسحور اور مخمور ہیں۔ اس فلسفیانہ علیحدگی اور غیر شخصی خارجیت کی نمائندہ مثال اقبال کی "مسجد قرطبہ" میں ملتی ہے۔ جوش کا سرمست تخیل رنگ و آہنگ کے طوفان سے دامن نہیں بچا تا اسی سے ڈوب کر رنگ ریاں مناتا ہے۔

تخلیقی تخیل کی بحث جوش کی نظموں کی تکنیک تک لے آتی ہے۔ ہمارے ہاں غزل میں تخیل کی کارفرمائی بالکل جداگانہ طرز پر ہوئی ہے۔ اس میں چند تابیروں کے لئے چند نادر مماثلتیں، چند لطیف تضاد یا چند دل نواز تمثیلیں ایک شعر کے مختصر سے پیمانے میں سموئی جاتی ہیں؛ غزل میں سارا تعمیری احساس صرف ایک شعر کے پیمانے تک محدود ہوتا ہے اور چونکہ اس کے مضامین اور سرمایۂ الفاظ دونوں بڑی حد تک ایمائی اور روایتی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس میں تخیل کی کارفرمائی صرف ایک متعین دائرے تک ہو سکتی ہے۔ اس سے آگے بڑھنے پر نازک خیالی، ایہام اور بال کی کھال نکالنے تک پہونچ سکتی ہے۔

نظم میں تخیل کا عمل بالکل مختلف ہے۔ غزل میں شاعر تجربے اور مشاہدے سے تعمیم تک پہونچتا ہے۔ اور مشاہدے کے اس مظہر کو ایمائی انداز میں اشاروں سے بیان کر دیتا ہے۔ یہ نظم میں اس منزل سے آگے بڑھ کر اسے تجربے اور مشاہدے سے حاصل کردہ تعمیم کو دوبارہ تجربے کی شکل دینا پڑتی ہے۔ اور اسے کبھی واقعے کی شکل میں، کبھی تاثر کی شکل میں، کبھی سلسلۂ تاثرات کی شکل میں، اور کبھی کبھار بیانیہ ٹکڑوں اور پلاٹ یا صورتِ حال کی شکل میں بھی اسے بیان

کرنا ہوتا ہے۔

جس طرح غزل میں کسی لفظ کو زائد نہیں ہونا چاہئے اسی طرح نظم کے ہر مصرعے اور ہر شعر کو اگلے مصرعے اور اگلے شعر سے اس طرح پیوست ہونا چاہئے کہ اگر اس شعر یا مصرعے کو نکال دیا جائے تو پوری نظم کے مجموعی تاثر میں کمی واقع ہو جائے۔ نظم کا نشوونما (Vertical) ہوتا ہے۔ اسی لئے نظم میں تخیل کی کارفرمائی کی نوعیت بھی دائروں سے نہیں مختلف زاویوں سے ہوتی ہے۔ غزل میں شعر کا نشوونما افقی (Horizontal) ہوتا ہے۔ اسی لئے اس میں تخیل کی کارفرمائی بھی اُفقی یا ایک مصرعے سے شروع ہو کر دوسرے مصرعے تک رہتی ہے۔

ہمارے ہاں نظم نگاری کا رواج ہوا تو شروع میں کسی ایک تاثر کو مسلسل بیان کرنے ہی کو نظم کی تکنیک سمجھا گیا۔ اس کے مربوط اور مرتب ہونے کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔ اقبال کی نظموں میں البتہ نظم کے ربط اور ترتیب کا احساس قائم رہا ہے۔ لیکن ان میں بھی بعض جگہ خطیبانہ لب و لہجہ کی وجہ سے تکرار اور غیر ضروری تفصیل نگاری کا عیب پیدا ہو گیا ہے۔ جوش بنیادی طور پر نظم نگار شاعر ہیں۔ اور وہ ایک خیال، تاثر یا کیفیت کو یہ مراحل بیان کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ نظم نگاری کے ابتدائی دور ہی میں آزاد اور حالی سے لے کر چکبست تک کی نظموں میں شاعر تخیل کو کسی ایک مرکزی نقطے کے اردگرد گھمانے پھرانے کی روایت قائم ہو چکی تھی۔ مثلاً اگر "برکھا رُت" پر نظم لکھی جائے تو شروع میں بیانیہ حصہ ہوگا جس میں برسات کے موسم کا بیان، اس کی کیفیات، بادلوں کا جھومنا، بوندوں کا چھم چھم برسنا، ہواؤں کا مند مند چلنا بیان کیا جاتا تھا۔ پھر برسات کا اثر مختلف گروہوں پر کیا پڑتا ہے؟ کس طرح نباتات ان سے ہرے ہوتے ہیں؟ اور جمادات میں نرالا حسن آجاتا ہے۔ یہ سب بیان کیا جاتا تھا۔ گویا نظم کو منظوم مضمون (Essay) کی حیثیت حاصل تھی۔ جس کی باقاعدہ منصوبہ بندی (Planning) کی جا سکتی تھی۔

جوش نے نظم کا رُخ اخلاقیات، مناظرِ قدرت کے تقریباً جغرافیائی بیان اور ذہنیت کے "نصابی" قسم کے مضامین کی طرف سے موڑ دیا۔ اقبال کے سوا اور کوئی شاعر نظم کو اس قدر زندہ اور تابناک صنف کے طور پر استعمال نہیں کر پایا تھا۔ جوش نے اسے تخیل کی نئی پرواز اور جذبے کی نئی قوت سے آشنا کیا۔ چونکہ یہ کام رومانوی انداز طبع کے پس منظر میں ہوا تھا، لہٰذا لازمی طور پر اس نئی سمت پر انفرادیت اور اظہارِ ذات کا ٹھپہ لگتا تھا۔ جوش نے نظم کو اقبال کی طرح پہلی بار اظہارِ ذات کا کارگر ذریعہ بنایا تھا۔ اسے نہ فیشن کے طور پر اختیار کیا تھا نہ محض حصولِ ثواب کی خاطر۔ نظم اُن کی اپنی آواز بن گئی اور اس کے ارتقاء نے ان کی شاعری میں ایک انوکھی بلند آہنگی پیدا کر دی جو غزل کے ذریعے ممکن نہ تھی۔

جوش چونکہ نظم کو نئی زندگی اور تابناکی سے آشنا کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے بلند آہنگی پیدا کرنے کے لئے خطابت کا راستہ اختیار کیا۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ نرم روی اور افسردہ مزاجی کے ذریعے تازگی اور شگفتگی اور تابناکی پیدا کرنا اُن کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ وہ ناکامیوں سے کام لینے کا ہنر نہیں جانتے تھے۔ وہ مینا کاری کے عادی نہ تھے۔ اسی لئے انہوں نے قدِ آدم تصویریں اپنی موئے قلم کی بے باکانہ لرزشوں سے بنانا شروع کیں۔ اس طرح اُن کی نظم صرف اظہارِ ذات کا ذریعہ نہیں رہی۔ پرجوش اظہارِ ذات کا پرجوش ذریعہ بن گئی۔

خطابت کا لب و لہجہ اختیار کرنے کے لئے پیغمبرانہ سطوت درکار ہوتی ہے۔ نہیں تو نثر مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔ جوش

نے خطابت کی گھن گرج کو شاعری میں کامیابی سے منتقل کیا۔ ان کے ہاں پیغمبرانہ جمال تو پیدا نہ ہو سکا۔ ہاں عبرانی جلال ضرور آ گیا۔ اُن کی خوبی اس معاملے میں نہایت درجہ اعلیٰ ہے۔ وہ اپنے مخاطبوں کو اپنے سے کچھ نچلی سطح ہی پر رکھتے ہیں، اور انہیں بشارت دینے سے پہلے ان کو عبرتناک انجام سے ڈراتے ہیں۔ مگر یہ بات اُن کی صرف سیاسی نظموں کے لئے صحیح ہے۔ یہ کسی حد تک ناگزیر بھی تھا۔

سیاست جوش کا میدان نہیں تھا، وہ صرف مظلومین سے جذباتی ہمدردی کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ سیاست کے ہاتھ میں غلط یا صحیح سماجی انصاف اور مساوات، بہبودی اور آسودگی کے لامحدود ذرائع دے دیئے گئے ہیں۔ اس لئے سماجی انصاف کی آواز بلند کرنے والے کو سیاست کے میدان میں بھی کچھ قدم آگے بڑھانے پڑتے ہیں۔ جوش سیاسی آدمی نہیں تھے۔ وہ کبھی سیاسی کارکن نہیں رہے۔ ان کے نغموں سے لوگوں نے سیاست کی طرف توجہ کرنا سیکھا۔ ان کی نظموں نے نوجوانوں کا خون گرمایا، اور انہیں آزادی کے لئے سر بکف ہونے کا درس دیا لیکن خود وہ کبھی سیاست کے میدان میں سر بکف نہیں ہوئے۔ بقول علامہ اقبال :

شاعر قوم کا قوال ہے، وہ پوری قوم کو وجد میں
لے آتا ہے مگر خود اسے کبھی وجد نہیں آتا۔

جوش کی سیاست سے دلچسپی آلودگی کبھی نہیں بنی۔ اسی لئے ان میں خطیب کی گھن گرج تو ہے طوفان کے پیچھے دیکھنے والے کی بصیرت اور عرفان نہیں ہے۔ وہ مزدوروں، کسانوں، غریب عوام کے ہمدرد تو ہیں لیکن ان کے شانہ بشانہ جدوجہد زندگی میں شریک ہونے سے جو کس بل آتا ہے اس کا ان کے ہاں پتہ نہیں۔ وہ عوام کے امارت پسند دوست ہیں۔ اور جب جوش نے شاعری شروع کی تھی، اُس وقت یہ دوستی بھی خاصی مہنگی اور خطرناک تھی۔ مختصر یہ کہ جوش نے نظموں میں شعریت، بلند آہنگی اور خطابت سے برقرار رکھی۔ اور خطابت کا ایک ہنر یہ بھی ہے کہ بات بار بار نرالے انداز سے دہرائی جائے — اُس وقت تک دہرائی جائے کہ وہ سننے والے کے ذہن میں نقش ہو جائے۔ اور اس کا ذہن اس ارتعاش پیہم سے مضطرب ہو اُٹھے۔ سکّے بٹھانے کی طرح آزمودہ کار خطیب بھی تکرار کے شیدائی ہوتے ہیں۔ اسی لئے جوش کی نظموں میں تخیل کی کارفرمائی پیہم رواں اور برابر آگے بڑھنے کی بجائے دائروں میں ہوتی ہے۔ وہ بار بار نئی تشبیہیں ڈھونڈتے ہیں۔ اس بات کو نئے نئے پیرائے اختیار کر کے کئی مرتبہ کہتے ہیں۔ یہ اسلوب نظم کو غزل مسلسل کے قریب کر دیتا ہے۔ ان کے لگاتار کئی اشعار ایسے ہوتے ہیں جنہیں نکال دینے پر بھی نظم کی سالمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان کی نظموں کا ارتقا تدریجی نہیں ہوتا بلکہ مکرر ہوتا ہے۔ اور آخری شعر عام طور پر اس تکرار کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہوتا ہے اور تکمیل نظم کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تکنیک خالص نظم کی تکنیک نہیں ہے۔ اس پر غزل کی مہر موجود ہے۔

یہی مہر جوش کی تراکیب، تشبیہ اور تمثیل پر بھی اکثر جگہ نظر آ جاتی ہے۔ نظم میں بھی وہ غزل کے فن (Cadence)، کو جگہ جگہ برت جاتے ہیں۔ اکثر نظموں کی آرائش وہ غزل کی تلمیحوں، تمثیلوں اور ترکیبوں سے کرتے ہیں۔ نظم کی خشکی اور سپاٹ پن کو دور کرنے کے لئے بھی وہ غزل ہی کی فضا، الفاظ اور بندشوں کو برتتے ہیں جس کی نمایاں مثال فریب ستی میں موجود ہے۔ وہ زمین سے پھوٹتے ہوئے بیج کے چہرے پر دھوپ کی نقاب دیکھتے ہیں جو جمہور کے چہرے پر دکھتے آتے ہیں۔ اور دونوں کی کوششیں ایک ہی سانچے میں کرتے ہیں۔ فطرت کا نقشہ کھینچتے وقت بھی وہ فردوس فطرت کے نظر

جھکانے اور زلفیں سنوارنے کا ذکر ضرور کریں گے۔ اسی طرح جہاں انہوں نے ان پرانی علامتوں میں نئی وسعت اور انوکھی رنگینی پیدا کر دی وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جوش تک آتے آتے نظم پر غزل کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

یہی کیفیت ان کی تشبیہوں اور تمثیلوں میں بھی موجود ہے۔ جوش کو شوکت الفاظ کا شہنشاہ کہا جا سکتا ہے۔ سارے شاعری کے پورے سرمائے میں شاید ہی کسی شاعر نے اتنی تشبیہیں، استعارے اور Images استعمال کی ہوں۔ پھر ان تشبیہوں میں ندرت اور تازگی ہے اور ان میں سے اکثر مشاہدے کی نہایت لطیف استعمال سے پیدا ہوئی ہیں۔ ان تشبیہوں میں سے اکثر مرکب اور حسی ہیں۔ یعنی ایک مرئی چیز کو دوسری مرئی چیز سے تشبیہ دینے کے بجائے جوش نے حسیات اور کیفیات سے تشبیہیں دی ہیں۔ اس کی نمائندہ مثالیں ان کی رباعیوں میں کثرت سے ملیں گی۔ چہرے کی ملاحت کو کسوٹی پر سونے کے رنگ سے تشبیہ دینا یا آواز کی کھنک کو چینی پر اشرفی کی جھنکار کہنا بالکل نادر تشبیہیں ہیں۔ اسی طرح جوش سے قبل Images کو اتنے بڑے پیمانے پر ایک آدھ کے سوا کسی شاعر نے استعمال نہیں کیا تھا۔ جوش نے پورے تمدن کی بڑی نازک اور نمائندہ زاویوں سے تصویر کھینچی ہیں۔

ان کی نظموں میں جو حسی تاثرات بکھرے ہوتے ہیں۔ ہماری تہذیبی زندگی کے 'Sense Responses' اور زاویے یہاں ملتے ہیں۔ حلقے بناتے ہوئے بندروں کی قطار، جھم جھم میں کبھی دائرے والوں کو گت شروع کرنے کی صدائیں دی جا رہی ہیں۔ کبھی ساقی سے رند بلا نوش کون و مکاں کو اپنے شانے پر رکھ دینے کی تائید کر رہا ہے کہیں محبوب تعارف میں لجا رہے ہیں۔ کہیں شب وصل کے آخری پہر عاشق کے زانو پر محبوب تھک کر سو رہا ہے اور سو جانے والے قمر سے اس کے رکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کہیں انگڑائی لینے میں نازک بدن نازنینوں کی جلد مسکی جاتی ہے کہیں رات گئے پھول شبنم میں نہا رہے ہیں اور خود ساغر سے بغل گیر تسلیم عرض کر رہی ہے۔ کہیں محبوب کے سرہانے سے سینے پر جو شب گوں سایہ پڑ گیا ہے وہ نیند میں اٹھلاتے ہوئے ہے۔ کہیں بارش کی بھیگی ہوئی ہواؤں میں کوئی برہا بجا رہا ہے۔ کہیں کوئی بے نوش عکس و قمر کو قدم بڑھاتے ہوئے آنے کا حکم دے رہا ہے۔ غرض 'Images' کا ایک جہان ہے جو یہاں آباد ہے حسین تاثر پاروں کا ایک گلستاں ہے جو مہکا ہوا ہے۔

تکنیک کے اعتبار سے جوش کی نظمیں کسی بند نہیں ہے۔ انہوں نے مختلف تجربے بھی کئے ہیں۔ مثلاً مکالموں میں نظمیں لکھنا یا 'ماتم' 'یا جنگل کی شہزادی' اس اعتبار سے نئی ہیں۔ انہوں نے نظم کے قدیم بیانیہ تصور سے آگے بڑھ کر سہ سمتی (Three dimensional) اثرات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور فلم کے مونتاج (Montage) کے طریقہ کو اپنایا ہے جس میں مکالمہ، مناظر اور واقعات کے تسلسل کے ساتھ مل کر ایک پورا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ جوش کی نظمیں جامع اور باضابطہ طور پر مربوط نہیں کہی جا سکتیں۔ لیکن ان میں 'فکر و نشاط' اور 'ماتم و رنگ' کا وہ طوفان ہے جو پھٹ پڑنے کے لئے بے قرار ہے۔ پھر جوش نے اپنی نظموں میں ایک معیار قائم رکھا ہے۔ ان کی بعض نظمیں صف دوم کی تو ہو سکتی ہیں لیکن بالکل پھیکی اور بے جان نظمیں ان کے یہاں نہیں ہیں، ان کے ہاں پست نہایت پست نہیں ہے۔

اب ان کے 'Diction' یا اسلوب پر غور کیجئے۔ اسلوب بیان کے بارے میں جوش کا عجیب و غریب نظریہ ان کی مشہور نظم 'تقاضے' میں موجود ہے۔ وہ احساس کو ایک نیم متصوفانہ اور پر اسرار Semi mystical and mystical عمل سمجھتے ہیں۔ جو کچھ دل پر طاری ہوتی ہے وہ کیفیت ان کے نزدیک من و عن الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ اول تو اس کیفیت میں خود ایسے اجزا ہوتے ہیں جو ناقابل اظہار ہیں، اور دوسرے الفاظ

چونکہ لکھے پڑھے ہوتے ہیں اور ترسیل کا ذریعہ ہونے کے باعث مختلف معنی اور تصور کا اظہار کرتے ہیں۔ اس لئے — کسی ایک فرد کے منفرد اور مخصوص جذبات کو من وعن بیان کرنا ان کے بس میں نہیں ہے۔ اور اگر کسی صورت میں وہ بیان کر بھی دیں تو بھی یہ خدشہ باقی رہتا ہے کہ سننے یا پڑھنے والا اپنے طور پر انہیں الفاظ سے کوئی دوسرے معنی یا تصور تو اخذ نہیں کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں جوش کے نزدیک شعر کا صرف جزوی عرفان ممکن ہے۔ اور وہ بھی ان الفاظ کے ذریعے جن سے خالی سیپی کی طرح جوہر معنی پرواز کر چکا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تصور اگر کلیتہً قابل قبول ہو تو تنقید شعر تو کیا خود ترسیل جذبات کا عمل نا ممکن ہو جائے۔ لیکن اس سے جوش کے ذہن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جوش نے الفاظ اور تراکیب سے بہت کام لئے ہیں۔ لیکن کبھی انہیں اپنے اوپر غالب نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنی آواز سننا پسند کرتے ہیں۔ اپنی آواز کی گھن گرج بلندی اور جھنکار انہیں بھلی لگتی ہے۔ لیکن الفاظ پر زبردست قدرت کے باوجود وہ کبھی الفاظ کے جادو میں اسیر نہیں ہوتے۔ جوش کہیں کہیں کیفیات کی شکل میں سوچتے ہیں۔ لیکن اکثر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ قارئین اور اپنے مخاطب طبقے پر تاثر کی شکل میں سوچتے ہیں۔ وہ ایک مجلس کے ذاکر یا خطیب کی طرح اپنے مجمع کے چہرے کے ہر اتار چڑھاؤ پر نظر رکھتے ہیں۔ اس لئے جوش کا سارا زور ترسیل پر صرف ہوتا ہے۔

اس قدر متنوع اور اتنے متفرق الفاظ اردو شاعری میں شاید ہی کسی شاعر نے استعمال کئے ہوں جتنے جوش نے کئے ہیں۔ سودا، نظیر اور انیس ہمارے ان شعراء میں ہیں جن کے ہاں لفظیات کے زبردست ذخیرے ملتے ہیں۔ لیکن جوش کے ہاں لفظیات کہیں زیادہ ہیں۔

شاعری کی سرحدوں کی توسیع کرنے کا ایک وسیلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اسے روزمرہ کی زبان سے قریب لایا جائے۔ اور اس کے دامن کو لفظیات کے ذخائر سے مالا مال کر دیا جائے۔ اس اعتبار سے جوش کی قدرت بیان بے پناہ اور بے مثال ہے۔ "وقت کی آواز" خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ خالص سیاسی اور صحافتی موضوع پر اتنی طویل نظم عورتوں کی ٹھیٹ زبان میں لکھنا اور اسے چھچھورے پن یا سوقیانہ پن سے بچائے رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔

جوش کے ہاں الفاظ کی شوکت و جبروت سودا کے بعد ہمارے تمام تر شعراء سے زیادہ ہے۔ ان کے الفاظ گونجتے گرجتے، ناچتے اور وجد کرتے لگتے ہیں۔

جوش کے ہاں الفاظ رنگ، فضا اور کیفیت کی علامتیں بن کر آتے ہیں۔

جوش نے ہندی کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں۔ عورتوں کی زبان کے الفاظ اور محاوروں میں پوری نظم لکھی ہے۔ ہر پیشے اور ہر طبقے کی زبان سے عام فہم اور موزوں الفاظ چن لئے ہیں۔ فارسی تراکیب سے بڑے پیمانے پر استفادہ کیا ہے۔ اور ان میں وہ شوکت و جبروت پیدا کر دی ہے جو اس قبیل کے الفاظ کے بغیر ممکن نہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر نظم اپنی مخصوص لفظیات اپنے ہمراہ لاتی ہے۔ یہ بات بڑی حد تک ٹھیک ہے۔ جوش نے پرانے لفظوں کو بھی اپنے ندرت تخیل، اور انوکھے پن سے تازگی اور شگفتگی بخش دی ہے۔

ان کے ہاں الفاظ یقیناً "گنجینۂ معنی کا طلسم" نہیں لیکن رنگ و آہنگ کے جہان کی کلید ضرور ہیں۔ وہ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ" سے باندھنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ لطیف سے لطیف، نازک سے نازک اور غیر مرئی سے غیر مرئی کیفیت کو بھی وہ الفاظ کے ذریعے مجسم اور مرئی بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ جوش کی قدرت بیان سے اندازہ ہوتا ہے جیسے

ابہام غیر ضروری ہے۔ اور تجزیہ ایک ناممکن ہے۔ "موسیقی کا جزیرہ" اور "آمادگی" میرٹھ جیسی نیم سوریلسٹ (surrealistic) نظمیں بھی انہوں نے بڑی وضاحت اور صفائی سے لکھی ہیں۔

جوش کی شاعری کا تذکرہ اُن کی رباعیات اور غزلوں کا ذکر کئے بغیر ختم نہیں ہو سکتا۔ رباعی کو جوش نے نئی زندگی اور نئی انفرادیت بخش دی۔ ابھی تک اردو شاعری میں رُباعی لونڈی باندی تھی، کبھی کبھی منہ کا مزا بدلنے کے لئے اس کی طرف توجہ ہو جایا کرتی تھی، جوش نے رباعی کا ایک منفرد کردار متعین کر دیا۔ رباعی کے چھوٹے سے پیمانے میں بھی انہوں نے لا تعداد مضامین باندھے ہیں۔ خمریات اور بزم مے کشی کی نہایت دل نواز تصویریں ان میں موجود ہیں۔ مشاہدات اور تاثرات، شیخ و زاہد سے چھیڑ چھاڑ، زندگی کے حقائق، عشق و عاشقی کے رموز، توصیف حسن و دل بری۔ غرض جوش کی رباعیاں ایک ایسا آئینہ خانہ ہیں جو طرح طرح کے عکسوں سے آباد ہے۔ انہوں نے مکالموں میں بھی رباعیاں لکھی ہیں۔ کبھی کبھی صرف متکلم کا ذکر حذف کرکے نئی تکنیک پیدا کر دی ہے۔ عام طور پر اُن کی رباعیاں تیسرے مصرعے سے نیا موڑ لیتی ہیں اور چوتھے مصرعے میں نقطۂ عروج یا Climax پر پہونچ جاتی ہیں۔ اس کی بہترین مثال "غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے" والی رباعی میں ملتی ہے۔ غرض کہ اس چھوٹی سی رُباعی کے سانچے میں بھی جوش نے اپنی شاعری کا سارا جلوہ صد رنگ سمو دیا ہے۔ اور اس سیمابی سے رُباعی جی اٹھی ہے۔

غزلوں میں بھی جوش نے تازگیٔ احساس کو برقرار رکھنے کی کوشش کی، مگر اس کوچے میں وہ اپنا منفرد رنگ پیدا نہ کر سکے۔ انہوں نے حافظ اور نظیری کی متعدد غزلوں کو اردو میں اپنا لیا ہے۔ پوری پوری غزلوں کے مضامین، قافیہ، اور ردیف کے ساتھ اپنا لئے ہیں۔ مثلاً حافظ کی مشہور غزل کا قافیہ ردیف "مشغلہ بود، مشعلہ بود" ہے۔ اسے "مشغلہ تھا۔ مشعلہ تھا" بنا کر جوش نے اپنا لیا ہے۔ حافظ کی غزل کا ایک مصرعہ "مگر تبسم ساقی نمی کند تقصیر" کو جوش نے من و عن "مگر تبسم ساقی خطا نہیں کرتا" کی شکل میں ترجمہ کرکے اپنا لیا ہے۔ ان غزلوں کا حسن ہے تو یہی کہ یہ روایتی روپ رنگ کے بجائے ایک نئی تابناکی اور حرارت سے معمور ہیں۔

غرض جوش کی شاعری ایک ایسا ہشت پہلو نگینہ ہے جس کی تابناکی سے شاعری کے بہت سے گوشے روشن ہوئے ہیں۔ جوش کا خروش و جلال آزادی کے بعد والے دور میں شاید بہت مقبول نہ ہو مگر ان کی شاعری میں جو دل دھڑکتا ہوا دریچہ چمکتا ہوا گردش کرتا ہے وہ زمانے تک سینوں کو گرماتا رہے گا۔ جوش کے لئے یہی فخر کچھ کم نہیں ہے کہ انہوں نے رنگ و آہنگ کی ایسی دنیا بنائی جس نے پورے اردو ادب کو نئے موڑ سے آشنا کیا۔ جوش اس اعتبار سے ہندو پاک کے تمام شعرا میں اکیلے شاعر ہیں جس کو ادبی تاریخ میں ایک نئے باب کے اضافہ کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ٹیگور اور اقبال کے بعد وہ ہمارے دور کی سب سے زیادہ دیو قامت اور بلند آہنگ شخصیت ہیں۔

جوش کو خراج عقیدت دراصل ایک عہد، ایک ادارے کو خراج عقیدت پیش کرنے کے مترادف ہے۔ جوش خود ایک عہد ہیں جو لکھنؤ کے آخری دور سے شروع ہوا۔ اور بیسویں صدی کی بڑی تحریکوں اور نمائندہ افکار کو سمیٹتا ہوا چلا آرہا ہے۔ جوش خود ایک ادارہ ہے جس نے اردو شاعری میں ایک چونچال پن، سرمستی اور حریت فکر کی روایت قائم کی۔ ان کا اسلوب زندگی مقبول ہوا۔ ان کے طرز نگارش کو نوجوانوں نے اپنایا۔ ان کی سرمستی، نشاط اور زندگی سے جی بھر کر رس نچوڑ لینے کی تمنا ابھی سے ہماری

(باقی صفحہ ۵۵۰ پر)

* صاحبِ جشن و نگار (۱۹۳۲ء)

* جوش کی ایک نادر تصویر حیدرآبادی لباس میں (

* [illegible] (۱۹۴۴ء)

اپنے ھی سے گفتگو کرتا ھوں میں

پروفیسر انجم اعظمی

نصف صدی اور جوش

زندگی کی پیچیدہ راہوں پر انسانی روح کی مسلسل پکار کا دوسرا نام شاعری ہے جو ماضی کی تمام تر روایات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ایک نئے آہنگ کی شکل میں آنے والے زمانے کے خواب دکھلاتی ہے۔ یہ پکار جب حرف بن جاتی ہے تو اس آئینے میں زندگی کے اندرونی رشتوں کے خدوخال پوری طرح نظر آنے لگتے ہیں، اور شاعری انسانی تاریخ کی کڑیوں کو ملاتی ہوئی زندگی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ مختلف ادوار اور مختلف قوموں کا مزاج بن کر سامنے آتی ہے۔ اس اعتبار سے اگر ہم جوش کی شاعری کا مطالعہ کریں تو کہنا پڑتا ہے کہ اُن کی شاعری برصغیر پاک و ہند کی نصف صدی کا مزاج ہے۔

ان کا پہلا مجموعۂ کلام "روحِ ادب" سنہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ پہلی جنگ عظیم سے کچھ قبل ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ اسی زمانے میں اردو کے جدید شعراء مجاز، فیض، سردار، مخدوم اور راشد پیدا ہوئے۔ شبلی، حالی اور اکبر الہ آبادی اپنی زندگی کی آخری منزلوں میں تھے۔ اقبال یورپ سے لوٹ آئے تھے اور نوجوان شاعر کی حیثیت سے ہندوستان کے ادبی حلقوں میں متعارف ہو چکے تھے۔ ان کی حیثیت جوش کے پیش رو کی ہے۔ یگانہ، حسرت، فانی، اصغر، جگر اور فراق کا شمار جوش کے ہم عصروں میں ہوتا ہے۔ ان میں حالی انیسویں صدی کی آواز ہیں۔ البتہ شبلی کی سیاسی و ملی شاعری کا زمانہ خاص طور پر بیسویں صدی کا ابتدائی دور یعنی سنہ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۴ء تک ہے۔ دوسرے لفظوں میں بیسویں صدی کی اردو شاعری کا آغاز شبلی کی سیاسی و ملی شاعری سے ہوتا ہے۔ جس کی اہمیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ اس نے اردو کے دو بڑے شعراء اقبال اور جوش پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

اقبال کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یورپ کے دوران قیام میں مغربی مفکرین اور یورپی تہذیب کے مطالعہ نے ان کے اندر وطنی شاعری سے گریز اور ملی شاعری کا آدرش پیدا کیا۔ لیکن اس سلسلے میں ان تاریخی حالات اور شخصیتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جن سے شعوری اور غیر شعوری طور پر اقبال کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ ترکوں کی سیاسی زندگی اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک شدید جذباتی مسئلہ بن گئی تھی۔ شبلی نے جنگ بلقان سے متعلق ایک جان گداز نظم لکھی تھی جس کے لہجے کی بازگشت ہمیں اقبال کی کئی نظموں میں ملتی ہے۔

یہاں یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ شبلی کسی معمولی شخصیت کے آدمی نہیں تھے، اقبال کو ان سے جو عقیدت تھی وہ کوئی

ڈھکی چھپی بات نہیں۔ شبلی کی سیاسی، ملی اور علمی افکار کا تاثر انہیں بہرحال قبول کرنا تھا۔ البتہ اقبال اور جوش میں یہاں یہ فرق ہے کہ اقبال نے شبلی کے لہجے کے علاوہ ان کے ملی رجحانات کو بھی اپنایا جو بعد کو ان کی شاعری میں ایک فلسفۂ حیات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور جوش کو شبلی کے مذہب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ انہوں نے شبلی کی شخصیت کے رنگین پہلوؤں اور سیاسی شاعری کی روایات کو برتا، اور ملک کی قومی، سیاسی، جنسی زندگی کے بے شمار پہلوؤں پر بے باکانہ قلم اٹھایا جن سے بیسویں صدی کا نصف اول عبارت ہے۔

جوش کے سلسلے میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ ان کے سارے ہم عصر یگانہ، حسرت، فانی، اصغر، جگر اور فراق غزل گو شاعر ہیں جنہیں اپنی مقبولیت اور شہرت کے سلسلے میں وہ دشواریاں درپیش نہیں تھیں جن سے جوش ملیح آبادی کو سابقہ پڑا۔ حالی نے غزل کی مخالفت کی تھی تو اس کے پس منظر میں دو باتیں تھیں۔ اول تو حالی قوم کی اصلاح کی طرف مائل تھے، دوسرے غالب جیسے بڑے غزل گو کے بعد غزل کے ارتقاء کا وقتی طور پر رک جانا لازمی تھا۔ کیوں کہ غزل میں نئی راہ نکالنے کے لئے بہرحال کچھ وقت اور فاصلہ درکار تھا جو حالی کو میسر نہ تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہماری تہذیبی زندگی میں غزل کی مقبولیت اور پسندیدگی کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ لہٰذا ایک حد فاصل کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حسرت اور ان کے ہم عصروں کے یہاں تجدید غزل اور غزل کی ایک نئی شکل کی تخلیق کے امکانات پیدا ہو گئے۔

لیکن جوش کے لئے یہ دشواری تھی کہ وہ ایک ایسے زمانے میں اپنے لئے راستہ ہموار کر رہے تھے جب اقبال کو ہندوستان کے طول و عرض میں شہرت حاصل ہو چکی تھی، اور وہ بھی کوئی معمولی شہرت نہ تھی۔ ان کی حیثیت شاعر کے بجائے مسلمانوں کے قومی و ملی لیڈر کی ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ "روح ادب" کی اشاعت کے فوراً بعد ہی اردو شاعری میں جوش کا منفرد لہجہ جگہ پا چکا تھا۔ جس سے انکار صرف ان لوگوں کے لئے ممکن ہے جو حقیقت سے آنکھیں چرانے کے عادی ہیں۔ بہرحال اردو ادب میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اوروں کی طرح جوش کی بھی بعض تعصبات کی وجہ سے سخت مخالفت کی گئی۔ نیاز فتح پوری نے "نگار" کو ان کے خلاف مستقل ایک محاذ بنا رکھا تھا۔ لیکن قابل غور بات تو یہ ہے کہ جوش میں وہ کون سا نیا پن تھا جس نے اقبال کی موجودگی میں اُن کی اہمیت منوالی۔ اگر اقبال روایت پرست یا کلاسیکل شعراء کے مقلد ہوتے، تو جوش کے لئے کوئی دشواری نہ تھی، لیکن اقبال جدید ترین رجحانات کے اہم شاعر تھے۔ ایسی صورت میں جوش نے اقبال سے الگ راہ نہ نکالی ہوتی تو ان کے لئے شاعری میں مستقل جگہ ہرگز نہ پیدا ہوتی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال اور جوش کے اندر مابہ الامتیاز کہاں کہاں ہے اور اس کی سطح کیا ہے۔

اقبال کا شمار بیسویں صدی کے بڑے شعراء میں ہوتا ہے۔ "مسجد قرطبہ" کا شاعر کوئی معمولی شاعر نہیں تھا۔ اُن کا لہجہ اپنی بلند آہنگی کی وجہ سے اردو شاعری میں ایک زبردست اضافہ ہے۔ لیکن اقبال نے جنسی، عشقیہ اور نفسیاتی شاعری بھول کر بھی نہیں کی۔ دوسرے ان کی ملی فکر بھی اوریجنل نہیں ہے۔ بلکہ قرآن و حدیث سے اخذ کی گئی ہے۔ اس میں برگساں، اور نطشے کے افکار شامل ہیں اور مولانا روم کے حرکی تصوف کا عکس ملتا ہے۔ انہوں نے فلسفۂ خودی کی تعمیر کے سلسلے میں اردو شاعری کو نئی علامات اور نئے استعارے ضرور دیئے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی کوئی نیا فلسفۂ حیات نہیں دیا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال بعض مسائل میں اُلجھ گئے۔ نطشے کے فلسفے نے ان پر چند منفی اثرات مرتب کئے، جن سے انہیں نجات نہ مل سکی۔ جس وجہ سے کہ وہ مسولینی کی شخصیت میں رومتہ الکبریٰ کا جلال دیکھتے ہیں۔ حالانکہ مسولینی نے سسلی کے مسلمانوں کا بے دریغ

قتلِ عام کرایا تھا۔ اور اقبال جیسے محبِ قوم سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ مسولینی جیسے شخص پر نظم لکھے گا۔ اس سے
ان کی سیاسی و ملی فکر میں جھول نظر آنے لگتا ہے۔ یہ جھول سب سے پہلے جوش کو نظر آیا ہوگا۔ کیوں کہ اقبال اُن کے پیشرو تھے، اور
اپنا راستہ ہموار کرنے کے لئے انہیں اقبال کے فن پر کڑی تنقیدی نظر ڈالنی پڑتی جس نے سب سے پہلے انہیں اقبال کی فکر سے منحرف
کر دیا ہوگا۔ کیوں کہ اس کا رخ ماضی کی طرف ہے، اور جوش کی نگاہ اپنے دور کے جینی، سیاسی اور سماجی زندگی کے اتار چڑھاؤ پر
بھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی قوم کے مسائل کا شاعر تھا، اور قوم کے دل و دماغ کی تاریخ لکھ رہا تھا۔ ملک کی غلامی سے برسرِ پیکار ہونے کی وجہ
سے اس کا سیاسی شعور اقبال سے گہرا تھا۔ بعض لوگ جوش کی سیاسی شاعری کو ہنگامی قرار دیتے ہیں۔ میں نے ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے
کی کوشش کی ہے اُن میں بیشتر تغزل کے مارے ہوئے ہیں، اور خارجی شاعری کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے جس سلیقہ اور تربیت کی ضرورت
ہے اس سے قطعی طور پر محروم ہیں۔ جوش نے مولانا ظفر علی خاں کی طرح سیاسی موضوعات پر صحافتی نظمیں نہیں لکھی ہیں۔ جن کا موضوع
صرف "آج" ہوتا ہے۔ کل سے ان کا کوئی رشتہ نہیں جوڑا جا سکتا۔ بلکہ اُن کی شاعری کی فنی قدروں کو اگر تھوڑی دیر کے لئے نظرانداز
کر دیا جائے تو بھی ان کے سیاسی مسلک کی بنیاد اُن کا وہ سیاسی نقطۂ نظر ہے جو اس عہد کے ردِ عمل کے علاوہ قومی زندگی کے لئے
نئی تعبیرات بھی رکھتا تھا۔ جس کا ایک عکس ہمیں پریم چند کے ناولوں اور افسانوں میں ملتا ہے۔ لیکن پریم چند گاندھی ازم، اصلاح
پرستی اور جینیت پسندی سے کبھی دامن نہ چھڑا سکے۔ جس نے بالآخر اُن کے فن کو متضاد عناصر کا مجموعہ بنا دیا۔ پریم چند سے چند
قدم آگے تک نذر الاسلام کے قومی نغموں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ لیکن آزادی کے بعد جو نئے مسائل پیدا ہوئے اُن کا ساتھ وہ بھی
نہ دے سکے، اور تھک ہار کر بیٹھ رہے۔ ان کے ذہن نے زندگی کے ناموافق حالات سے گھبرا کر جنون کے عالم میں پناہ ڈھونڈلی،
اور اُن کا دل ایک نامکمل دنیا کی چوکھٹ پر سر پٹک کر رہ گیا۔ جوش کے یہاں اس کے برخلاف زندگی کی ہر منزل میں ارتقاء کی نئی
کڑیاں ملتی ہیں۔ وہ زندگی کی رفتار کے ساتھ ساتھ مسلسل ارتقاء پذیر رہے۔ جس سے اُن کی فکر کی گہرائی اور وسعت کا اندازہ
ہوتا ہے جو ہر نئے موڑ پر نئے افکار سے اپنا رشتہ جوڑتی، اور ہر باطل کو ڈھاتی ہوئی اپنا سفر طے کرتی رہی۔ جس سے جوش کی
عقلیت پسندی کی ایک واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اُن کی مختصر اور طویل نظموں، اور رباعیات میں جو عاشقانہ لے، جنسی
موضوعات، سیاسی شعور اور دہریت کا خمیر ملتا ہے، انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا جوش کے ساتھ زبردست ناانصافی ہوگی —
ان کی تہہ میں جوش کی عقلیت پسندی کارفرما ہے۔ اس عقلیت پسندی نے جوش کو زندگی کی مثبت اقدار اور ادب کی زندہ روایات
میں ہم آہنگی کی بے پایاں اور مسلسل تلاش و جستجو کی طرف مائل کیا۔ جس نے ایک طرف ہمارے ادب میں بہ اعتبارِ کیفیت و کمیت
اضافہ کیا تو دوسری جانب ادب اور سائنس کی رقیبانہ چشمک کو مٹا دیا۔ انہیں ایک دوسرے کا حریف قرار دینے کے بجائے زندگی کی
ترقی میں ممد و معاون ثابت کیا۔ اور ہمیں اس حقیقت سے دوچار کیا کہ کوئی دور صرف سائنس یا صرف ادب کا نہیں ہوتا — بلکہ
زندگی کی رفتار تیز کرنے میں ان سب کا یکساں حصہ ہے۔ اور ان سب کے پیچھے یہی عقلیت پسندی کارفرما رہی ہے۔ اسی نے
جوش کو ایک بنتے ہوئے ترقی پذیر معاشرے کا بڑا شاعر بنایا ہے۔ اور اُن کی شاعری کو یہ عظمت بخشی ہے جس کا لہو آج ہمارے
معاشرے کی رگوں میں گردش کر رہا ہے۔ اگر میں اس کی تھوڑی سی وضاحت اور کر دوں تو بہتر ہوگا، کہ جوش ہماری قوم کی ایک
بنتی ہوئی تہذیب کا شاعر ہے جس کے امکانات ہماری قوم کے اندر پوشیدہ ہیں۔ جوش کی شاعری اقبال کی طرح مصفا اور مجلیٰ نہیں
ہے، بلکہ زندگی کی پیچیدہ راہوں کی نشان دہی کرتی رہی ہے۔ لیکن زندگی کسی صراطِ مستقیم کا نام نہیں۔ یہاں اصل رہبری کا
حقدار بہرحال وہی ہو سکتا ہے جو تاریک اور اندھیری راہوں پر بھی رہنمائی کر سکتا ہو۔ اور تاریکی میں کھو جانے والوں کو دوبارہ کھینچ کر

روشنی کی طرف لا سکتا ہو۔ اگر کوئی شاعر ایسا نہیں کرتا تو بعض اوقات صرف ناظم بن کر رہ جاتا ہے۔ اور اس کی ساری کوششیں انہیں تعصبات کو ہوا دینے لگتی ہیں، جن کے خلاف اس نے ساری زندگی جدوجہد کی۔ شاعری کا یہی جدلیاتی عمل جوش کو بڑا شاعر بناتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سنہ ۱۹۳۵ء کے قریب جب تازہ دم ادیبوں نے بغاوت کی ٹھانی اور اردو ادب کو نئی راہوں پر ڈالنا چاہا تو پریم چند اور مولوی عبدالحق کے ساتھ ساتھ جوش نے بھی اُن کی حمایت کی، اور نہ صرف حمایت کی، بلکہ اپنی فکر کی ایک مہمیز بھی دی جس نے عملی اور ذہنی سفر میں انہیں ان نوجوان شعراء کا قافلہ سالار بنا دیا۔ علامہ اقبال بھی اُس وقت زندہ تھے لیکن وہ ان نوجوان شعراء کا ساتھ نہ دے سکے۔ اُن کے انتقال سے کچھ عرصے پہلے ہی ان کی شاعری زوال کی طرف جانے لگی تھی۔ اور ان کی فکر زندگی کی نئی تبدیلیوں سے سمجھوتہ نہیں کر پائی تھی۔ جس کا ثبوت علامہ اقبال کے آخری مجموعے "ارمغانِ حجاز" کی نظمیں ہیں۔ جن میں وہ تاب و توانائی نہیں ہے جو "بالِ جبریل" کی نظموں میں ہے۔ یہ ایک بڑے شاعر کی شکست تھی جو آنے والے شعراء کے لئے میدان خالی کر رہا تھا۔ البتہ سنہ ۳۹ء میں جوش کی معرکہ آرا نظم "حرفِ آخر" کی اشاعت نے اس کا ثبوت فراہم کر دیا تھا کہ وہ زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار اور نئی نسل کے تازہ ترین افکار و آدار کو اپنا کر نئی زندگی پا چکے تھے۔ اور ان کی شاعری میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس ذیل میں فیض کے اس مضمون کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو جوش کی شاعری کے خلاف لکھا گیا تھا۔ فیض غنائی شاعر ہیں۔ اگر انہیں اپنی غنائی شاعری کے حدود کا صحیح اندازہ ہے تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ جوش کی شاعری کا محاسبہ اُن کے لئے کتنا مشکل کام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جوش کی شاعری کو صحیح طور پر پرکھ نہ سکے۔ اُن کے مضمون سے جوش کی شاعری کے متعلق کم اور فیض کے محدود شعری نقطۂ نظر سے بہتر طور پر آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ ورنہ جوش نے نئی امیجری (Imagery) نئے علائم و رموز اور نئے امکانات کی شاعری کی۔ جس نے نئے شعراء کو گہرے طور پر متاثر کیا اور اس کا حصہ ان کی تربیت میں دوسرے تمام شعراء سے کہیں زیادہ ہے۔

سنہ ۳۹ء میں جب جوش کی "حرفِ آخر" شائع ہوئی تو کچھ لوگوں نے اسے جوش کی بہترین نظم کہہ کر بات ٹال دی اور بعض نے یہ کہا کہ جوش کے پاس "حرفِ آخر" کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ حالانکہ یہ دونوں رائیں سہل پسندی کا نتیجہ ہیں، ورنہ "حرفِ آخر" جوش کے شعری ارتقاء کی ایک اہم کڑی ہے۔ اور ایک ایسے موڑ کا پتہ دیتی ہے جہاں پہونچ کر جوش کا فن بہت اونچا اٹھتا ہے اور ان کی پختگی کی وہ منزل سامنے آتی ہے جہاں اُن کی شخصیت، ماحول، حیات و کائنات کے تمام مسائل اور زندگی کی اعلیٰ اقدار ایک آہنگ میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ "حرفِ آخر" اردو شاعری کی چند بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ لیکن یہ نظم ابھی تک نامکمل ہے۔ بائیس سال کے بعد بھی اس کی تکمیل نہیں ہو سکی ہے۔ کیوں کہ اسے جوش ملیح آبادی اسی انداز میں لکھ رہے ہیں جس طرح گوئٹے نے "فاؤسٹ" لکھا تھا۔ یہ نظم اُن کی زندگی کا شاہکار ہوگی اور شاید اردو شاعری کا بھی شاہکار ہو۔ لیکن فی الحال اسے جوش کی شاعری کے امکانات سے تعبیر کیجئے۔ البتہ اس نظم کی تکمیل کے لئے جوش ملیح آبادی کو شب و روز جس کاوشِ پنہاں سے واسطہ ہے۔ اس نے اُن کی جودتِ طبع اور تازگیٔ فکر کو آج بھی برقرار رکھا ہے انہوں نے نوجوان شعراء کے قافلہ سالار کی حیثیت سے سنہ ۳۵ء سے تقسیمِ ہند تک مسلسل قومی مسائل پر زبردست نظمیں کہیں، اور تقسیمِ ہند کے بعد سے آج تک، غلامی کے بداثرات، زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار، زمان و مکاں کے نئے تصورات، سرد جنگ، اور تسخیرِ کائنات کے جذبے پر نظمیں فن کی تخلیق جاری رکھی، اور یہ سب کچھ ایسے دور میں کیا ہے جب نوجوان فن کاروں نے واماندگیٔ شوق کے پہنے تراشے، ادب میں جمود کا نعرہ بلند کیا، آزادی کی دولت میں حصہ بٹانے کی غرض سے ادب کے

بجائے دوسرے آئیڈیل بنائے، کامیاب ہوئے تو ادب و شعر سے منحرف ہو کر میش کیا۔ ناکام ہوئے تو ذہنی پراگندگی کا شکار ہو گئے۔ چند ایک جوان سے الگ ہو کے اپنی پونجی سمیٹتے رہے۔ ان میں اضافہ کرنے کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا۔ زندگی کی تلخی یا عیش پسندی کے مزے میں ان کا مزاج ایسا بگڑا کہ ادب کی جانچ پرکھ کے سارے اصول ٹوٹ گئے۔ البتہ جب اپنی چھوٹی پونجی پر نگاہ ڈالی، اور اس کی مفاقت کا فطری سوال ذہن میں اُبھرا تو جوش کی عظمت سے انکار کرنا ہی اپنے حق میں بہتر جانا۔ ان چھوٹی پونجی والوں ہی کی یلغار کا نتیجہ ہے کہ جوش کے چند ساتھی بھی ان کے پاکستان آنے پر غم زدہ ہیں۔ ان کے خیال میں اس سے جوش کی شہرت کو نقصان پہنچا ہے۔ حالانکہ جوش کا پاکستان آنا سو فی صدی ان کا ذاتی مسئلہ ہے۔ اس کا ان کے فن سے کوئی تعلق نہیں۔ فن کار جس شہر، جس ملک، اور دنیا کے جس گوشے میں ہوتا ہے وہیں اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے۔ جوش کا فن ہندوستان میں عظیم تھا، اور پاکستان میں مسلسل ترقی پذیر ہے۔ البتہ اب یہ بات ہمارے لئے قابلِ فخر ہے کہ برصغیر پاک و ہند کا سب سے بڑا شاعر ہمارے ملک میں ہے اور اس کی شاعری ہمارے قومی ادب کا ایک گراں بہا سرمایہ ہے۔

ایک دفعہ میرے ایک دوست فرما رہے تھے کہ جوش نے جاگیردار گھرانے میں پیدا ہو کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ پھر انہوں نے اس بیکراں زندگی کے مفہوم کو چند اصطلاحوں میں اس طرح بیان کر دیا کہ میں ان کی فہم و فراست پر حیران رہ گیا، اور ان سے یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ یہ غلطی ہم میں سے ہر فرد نے کی ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی گھرانے میں پیدا ہوا ہے۔ البتہ جوش نے جس طرح فن کو برتا اور زندگی کا مطالعہ جس بلندی سے کیا وہاں تک ہم میں سے کسی کی رسائی اب تک نہیں ہو سکی ہے۔ اور شاید جوش نے سب سے بڑی غلطی یہی کی ہے کہ وہ ہم میں سے ہر ایک سے بلند ترین مقام پر موجود ہے۔ وہ آج تنہا ہمارے بغض و حسد کا شکار ہے۔ ممکن ہے جوش کو یہ راز معلوم ہو کہ جب زمانہ اعتدال پر آ جائے گا، لوگ روایت کا احترام کرنا سیکھ لیں گے۔ اور مثبت اقدار کو پنپنے اور پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا تو اس کی حیثیت بدل جائے گی ــ اور وہ بغض و حسد کا شکار ہونے کے بجائے نئی نسلوں کا سب سے بڑا معمار تسلیم کیا جائے گا۔ جوش جاگیردار گھرانے میں ضرور پیدا ہوا، لیکن اس کی شاعری ہماری قومی زندگی کی کوکھ سے پیدا ہوئی۔ وہ ایٹمک سے کے اس دور میں سائنس کے جدید ترین انکشافات، کائنات سے متعلق نئے سوالات اور نئے انسان کے شعور کی غماز ہے۔ یہ شاعری انسانی روح کی وہ پکار ہے جو اپنی تسکین کے لئے فردا کا ایک واضح تصور رکھتی ہے۔ یہ صرف ایک سسکی ــ ایک یاس انگیز کراہ یا بے معنی ضم کی چیخ نہیں ہے، بلکہ نئے خوابوں کی تعبیر کی طرف ایک کھلا ہوا اشارہ ہے اور ایک ایسا رمز ہے جو امروز و فردا کو ایک ہی آئینہ میں بے نقاب کر رہا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس صدی کے نئے شاعر جوش ہی کی شاعری سے اپنے چراغ روشن کریں گے اور اگر اپنے چراغ کی لو تیز کرنی ہوگی تو اسی سے روغن حاصل کرنا ہوگا۔

جوش نے اپنے فنی ارتقا اور ریاض کی نصف صدی مکمل کر لی ہے۔ وہ رباعی کے بھی ایک بڑے شاعر ہیں۔ یگانہ اور فراق بھی رباعی کے معمولی شاعر نہیں ہیں۔ انہوں نے اس صنف میں انیس اور حالی کی طرح صرف منہ کا مزا بدلنے کے لئے طبع آزمائی نہیں کی ہے۔ لیکن جوش کا درجہ ان سے بہت بلند ہے۔ ان کی رباعیات کا ہر انتخاب خیام کی رباعیوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اگر ان کا دوسرا کلام علیحدہ کر کے صرف اُن کی رباعیوں ہی پر گفتگو کی جائے تو بھی وہ خیام سے بڑے شاعر ہیں۔ لیکن جوش صرف رباعی کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کی نظموں کے کئی ضخیم دیوان ہمارے سامنے ہیں۔ جو انہیں اردو

کے بڑے سے بڑے نظم گو شاعر کا حریف بنا دیتے ہیں۔ علامہ اقبال نے نہ جانے کس مصلحت کے پیش نظر اردو چھوڑ فارسی کی طرف توجہ کی۔ ان کی شاعرانہ عظمت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کے بہترین شعری سرمائے کا بڑا حصہ اردو کے بجائے فارسی میں ہے۔ جب کہ جوشؔ کی ساری عظمت اُن کی اردو شاعری میں سمٹ آئی ہے۔ اور مختلف زبانوں میں تقسیم ہونے سے بچ گئی ہے۔ غزل گوئی کے جوشؔ بظاہر سخت مخالف ہیں، لیکن غزل مسلسل کو فروغ دینے میں ان کا جتنا بڑا ہاتھ ہے اور کسی شاعر کا نہیں ہے۔ ان غزلوں کا نشاطیہ رنگ اُن کی امتیازی خصوصیت ہے جو حافظؔ کے گہرے مطالعے اور ان کی شخصیت کی خوش آہنگی کے سبب سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ فردوسیؔ، سوداؔ، نظیرؔ اکبرآبادی، غالبؔ، انیسؔ، اقبالؔ اور حافظؔ کی شعری روایت کے سب سے بڑے وارث ہیں۔ اور غالبؔ کی شاعری کے بعد ان کا کلام ہماری سب سے بڑی میراث ہے۔ پنڈت دتاتریہ کیفی نے ٹیگور کی موجودگی میں جب یہ کہا تھا کہ جوشؔ کے ہوتے ہوئے ہم دنیا کے ادب کے سامنے اپنا سر نیچا نہیں کر سکتے تو انہوں نے ایک عظیم شاعر کا سچا احترام کیا تھا۔ آج اس بات کو دہرانے کی ضرورت یوں محسوس ہوتی ہے کہ ہمیں بھی بہر حال ایک بڑے شاعر کے احترام کا سلیقہ آنا چاہئے۔ جوشؔ ابھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ جن کی شاعری کی شش جہت اس ایٹمی دور کے تصور کائنات سے مکمل ہو چکی ہے۔ لیکن مشاہدے اور ادراک کی نئی منزلوں تک پہونچنے سے انہیں کون روک سکتا ہے۔

میں نے فی الحال گذری ہوئی نصف صدی کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جو جوشؔ کی شاعرانہ عظمت سے عبارت ہے۔

جوشؔ کی شاعری

(صفحہ ۲۶۵ سے آگے)

نئی نسل کو ملی۔ جوشؔ کی شاعری نشاط، عزیمت اور حریت جذبات کی انجیل ہے۔ اس کے ایک ایک مصرعے میں ایک گزرتے ہوئے انسان کی روح رقص فرما ہے، جو دنیا میں انصاف، تکمیل جذبات اور آزادی پانے کے لئے مضطرب ہے۔

یقیناً جوشؔ کے زمانے سے اردو نظم کا کارواں کافی آگے بڑھ گیا ہے۔ نظموں کی تکنیک زیادہ پیچیدہ اور زیادہ فکری ہو گئی ہے۔ لیکن آج بھی ہماری نسل کو جوشؔ سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ مشاہدے کی اتنی قوت، لطیف سے لطیف کیفیت تک پہونچنے کی صلاحیت، الفاظ کی جادوگری، مستی اور کھلنڈراپن، قوت اور جبروت، انصاف پرستی، عوام بلکہ مظلوم دوستی اور ہر قسم کے شکنجوں سے بغاوت کی آواز بلند کی جرأت۔ یہ سب باتیں جوشؔ کو صد آفریں بنانے کے لئے کافی ہیں۔ اور ان کی یہ جگمگاتی، جاگتی شاعری ہمیشہ سکون، نشاط اور بصیرت کے ابدی نزانے بکھیرتی رہے گی۔

پروفیسر حنیف فوق

جوش کا آہنگ شاعری

اردو ہند اسلامی تہذیب کا گہوارہ رہی ہے۔ اس میں مقامی عناصر اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ انہیں بیرونی عناصر سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ اردو ادب میں اگر ایک طرف عرب کی روایات کی پرچھائیں پڑتی ہے تو دوسری طرف عجمی تصورات کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے لیکن اس کی ساخت، اس کا مزاج اور اس کی اصل ہندی ہے۔ اردو ادب کی زمین ہندی ہے۔ لیکن فضا میں تیرتے ہوئے بادلوں میں چھپی ہوئی بجلیوں کا سلسلہ دور دراز ملکوں سے جا ملتا ہے۔ اردو ادب ہماری معاشرت کے کتنے ہی طریقوں، یہاں کے بسنے والوں کی ان گنت آرزوؤں، میل جول کے ہزاروں ناطوں اور محبت کے بے شمار جلوؤں کی آئینہ داری کرتا ہے۔ یہ ایک ایسے پھول کی مانند ہے جس کی خوشبو ہر حال میں کیف آور ہے۔ اس کے پیار کے بولوں میں من موہ لینے کی حیرت انگیز طاقت ہے۔ چنانچہ دکنی، گجری، ریختہ، ہندوی یا ہندی کے مختلف رنگوں میں ڈھل کر بھی اردو کی موہنی اپنا کام کرتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ اردو ادب نے فکری طور پر سماج کے تاریخی ارتقا کا ساتھ دیا ہے۔ اسی تاریخی ارتقاء کی ایک منزل جوش کی شاعری بھی ہے۔

اردو کے موجودہ شاعروں میں جوش اپنی خلاقانہ صلاحیت اور موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کا زمانہ کئی نسلوں پر محیط ہے۔ اس لئے ان کی شاعری میں زندگی کے گوناگوں تجربات کا عکس ملتا ہے۔ شاعر کی شخصی زندگی کے تاثرات اور اس کے عہد کی اجتماعی زندگی کی تحریکات دونوں اہم ہیں۔ اور دونوں کی ہم آہنگی ہمیں جوش کی شاعری میں ملتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کا مزاج شاعرانہ اجتماعی زندگی کی ہلچل کی اپنے انداز سے تعبیر کرتا ہے۔ جوش کا دور سیاسی بیداری اور اجتماعی جدوجہد کا دور تھا۔ اس اجتماعی آرزومندی اور سیاسی ولولہ انگیزی کی جھلک ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ جسے ان کے نسلی مزاج نے جلا دے کر شمشیر کی تیزی بخشی ہے۔ جوش کی شاعری کا یہ لہجہ ان کے آبائی مزاج کی بھی غمازی کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری میں جذبات کی فراوانی ملتی ہے۔ لیکن جذبات کی تنظیم سے اسے زیادہ سروکار ہے۔ کیوں کہ یہ تنظیم فکر کی روشنی اور جدوجہد کی گرمی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے جوش کی شاعری مالامال ہے ...... وہ شخصی ضابطۂ حیات ...... یا آدرش جو کسی نامکمل فکر یا جدوجہد کا نتیجہ ہو ان کے یہاں نہیں ملتا۔ اسی لئے جوش کی شاعری متضاد اور متنوع پہلوؤں کی ترجمان بن گئی ہے ...... جوش کی شاعرانہ عظمت

اس امر میں ہے کہ ان کی شاعری کا ہر پہلو کیف و رنگینی کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کے پھیلے ہوئے سلسلوں سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری اپنے دور کی ایک اہم تہذیبی منزل کہی جا سکتی ہے۔ جہاں سے آگے بڑھنے کے بے شمار راستے نکل آئے ہیں۔ لیکن اس منزل تک پہونچے بغیر تہذیب کے لئے اپنے ارتقائی سفر کو جاری رکھنا مشکل تھا۔

فطرت ایمرسن کے قول کے مطابق اپنے سارے مظاہر تصویری زبان میں شاعر کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ پیکر تراشی اور اصنام سازی صرف مذہب کی خصوصیت ہی نہیں، شاعری بھی اصنامِ ذہنی کا سہارا لیتی ہے۔ شاعرانہ تخیل کا عمل ذہنی تجرید کو تجسیم کا روپ دیتا ہے۔ شاعری تمثیل، استعارہ، کنایہ، موازنہ، تشبیہ اور علامت کے پردے میں اپنے تخیلاتی عمل کی وضاحت کرتی اور محسوس کو غیر محسوس سے ربط بخشتی ہے۔ اردو میں فطرت نگاری کی تحریک دراصل حقیقت پسندی کی ایک شکل تھی۔ کیوں کہ شعراء پہلی بار اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر خارجی حقائق کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ نظیر اکبرآبادی نے فطرت اور مظاہرِ فطرت کو ہیئت اجتماعی سے جو رابطہ بخشا تھا وہ مثنویوں یا مرثیوں میں فطرت کے اس تصور سے مختلف تھا۔ جس کے تحت اسے افراد و واقعات کے درمیان صرف پس منظر کے طور پر پیش کیا جاتا رہا تھا۔ حالی اور آزاد نے فطرت کے خاکوں میں اجتماعی دلچسپیوں اور انفرادی کیفیتوں کے رنگ بھرے تھے۔ جوش کے عہد تک اردو کے شاعروں نے فطرت نگاری کی روایات کو کافی آگے بڑھا دیا تھا۔ لیکن اب تک فطرت کے شکوہ و جمال کا نقش پوری طرح ابھرنے نہیں پایا تھا۔ اس کے لئے ایک ایسے ذہن کی ضرورت تھی جو اپنے دور کے اضطراب و سرشاری کے ساتھ فطرت کے جمالیاتی شکوہ کو پیش کر سکے۔ جوش کی شاعری میں فطرت کا جمالیاتی شکوہ اس لئے بھرپور انداز سے ابھرا ہوا ہے کہ جوش نے اپنے ذہن کا دروازہ اپنے دور کے اضطراب و سرشاری کی ابھاری ہوئی لہروں کے لئے بند نہیں کر لیا تھا۔ ان کے لئے فطرت کسی مقید حسن کا نام نہیں، بلکہ ایسی تحریک کا نام ہے جو زندگی کے اضطراب پر حاوی ہونا چاہتی ہے اور سرشار کیفیتوں کے ذریعے زندگی کے درد کا درماں چاہتی ہے۔

دردِ زندگی کے درماں کے لئے جوش نے فطرت کے خزانوں کی دریافت کی ہے۔ جوش کے ابتدائی فطرت نگاری کے خاکوں شلاً "مناظرِ سحر" میں میرانیس کے مرثیوں کا چہرہ جھلک دکھاتا ہے۔ لیکن جلد ہی فطرت کو صاحب کتاب مان کر وہ اس صحیفۂ زریں کے اسرار کو اپنے طور پر حل کرنے لگے ہیں۔ ان کا ذہن فطرت کی تعبیر کے لئے نت نئے تخیلاتی پیکر تراشتا اور نئے نئے استعاروں کا سہارا لیتا ہے۔ بقول میکس ملر استعارے کے بغیر انسان کی ذہنی زندگی میں کوئی ترقی ممکن نہیں۔ اس اعتبار سے کہ جوش نے استعاروں کے پیکر تراش کر فطرت کے حسن کو تخیل کی شوکت سے آراستہ کیا ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری نے فطرت کی رنگینی و معنویت میں اضافہ کر کے شاعرانہ تجربہ کو نئے جمالیاتی عناصر سے آشنا کیا ہے۔

اس کے علاوہ فطرت کے متعلق جوش کی شاعرانہ تصویریں تخیلاتی رنگ اور ذہنی مناسبت کا آہنگ لئے ہوئے ہیں جوش کی نظم "فاختہ کی آواز" شیلے کے اسکائی لارک کی ذہنی تشبیہات کی یاد تازہ کرتی ہے۔

سب سے قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ دوسرے شاعروں سے بہت زیادہ جوش نے فطرت کے بیان میں فنائی حسن کے دل آویز خطوط تلاش کئے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان کے یہاں فطرت مقصود بالذات نہیں اور ان کی شاعری

منظرِ فطرت سے وہی کچھ اخذ کرتی ہے جس کے لئے ان کا ذہن پہلے سے تیار ہے۔ جوش کا بیان کبھی انسان اور فطرت کے درمیان جذباتی رابطہ قائم کرتا ہے اور کبھی فطرت سے اثر قبول کرکے ارتفاعِ جذبات کی بنیاد رکھتا ہے۔ "ساون کے مہینے، برسات کی چاندنی، موجِ باراں، شبِ ماہ، بہار کی دوپہر، پہلی گھٹا، برسات کی شفق، بھیگی رات، برسات کی شام، بہار کا ترانہ، گھٹائیں، شام کی بزم آرائیاں، آدھی رات، بدلی کا چاند، البیلی صبح اور نغمۂ سحر وغیرہ بار بار ان کے کلام میں متنوع انداز سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔

یہی نہیں، ان کی نظم "جنگل کی شہزادی" میں اگر نسوانی حسن کی قصیدہ خوانی ملتی ہے تو اس نسوانی حسن کا پس منظر یعنی فطرت کی سادگی کا جمال بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسی پس منظر میں جنگل کی شہزادی کی وہ تصویر اُبھرتی ہے جس کی دل آویزی میں کلام نہیں۔ اس پس منظر کو الگ کر لیجئے تو رعنائی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ اس نظم میں حسن کی معصومیت اور فطرت کی ازلی خوب صورتی کے دل کش امتزاج کی جھلک ملتی ہے۔ شاعر صرف زمزموں کی دیوی کا پجاری بننے کا خواہش مند نہیں، بلکہ اس کی یہ آرزو بھی ہے کہ ؎

یہ بن، یہ گل، یہ چشمے، مجھ سے قریب ہوتے
شاعر کے زیرِ فرماں یہ سب رقیب ہوتے

فطرت سے قرب کی یہ آرزو جوش کے شاعرانہ احساسات کے تاروں کو چھیڑتی رہتی ہے۔ اس کے زیرِ اثر کبھی وہ لمحۂ حاضر کو تاجِ زر پہناتے ہیں اور کبھی جادو کی سرزمینوں کی سیر کرتے ہیں۔ "ذی حیات مناظر" میں وہ جیتی جاگتی فطرت کی عکاسی کرتے ہیں۔

ایک اور نظم "بھری برسات کی روح" میں فطرت کے مظاہر جوش کو ذی روح نظر آتے ہیں۔ اس نظم کی آسیبی فضا (جھاڑیوں کے اندر سے کسی کا بار بار گھورتے محسوس ہونا) ایک اجنبی اور نامانوس لیکن خیال آفریں کیفیت رکھتی ہے، اور اس کا اختتام حد درجہ دلکش ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

مجھ سے ملنے آئی ہے رتھ میں اندھیری رات کی
ہو نہ ہو یہ روحِ مضطرب بھری برسات کی

شاعر کے تخیل کے ذریعے فطرت کو جیتے جاگتے محسوس کرنے کی طاقت نے جوش کی زبان کو استعاراتی بنا دیا ہے۔ جہاں تک تشبیہات کا تعلق ہے وہ دو غیر متعلق چیزوں میں وجہ ربط کی جستجو کرتے ہیں۔ اور ان کا شاعرانہ کمال اس امر میں ظاہر ہوتا ہے کہ دو متقابل کی چیزوں میں ان کی انفرادی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے بھی وہ لطافتِ تشبیہ پیدا کرسکتے ہیں۔ ان کی زبان بھی تشبیہ یا استعارہ کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ یہاں تک کہ بعض نظموں کے عنوان مثلاً "سینہ کا بادل" اور "آواز کی سیڑھیاں" بھی اس رنگ سے خالی نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جوش فطرت کے نگارخانے میں ذہنی تصویروں کی پرستش کے کس حد تک شائق ہیں۔

جوش کی فطرت نگاری کا مطالعہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے مشاہدۂ فطرت سے شاعرانہ کیفیتوں کا اکتساب کرکے خود فطرت کو اپنے ذہنی جلال و جمال کا مظہر بنا دیا ہے۔ جوش کی اس نوع کی شاعری نہ فطرت کو محض ذہنی پیکر کے روپ میں دیکھتی ہے، اور نہ بے لاگ خارجی انداز اختیار کرتی ہے۔ بلکہ خارجی حسن اور داخلی کیفیتوں کے امتزاج سے کا

نے کہ انہوں نے فطرت کو اس دور کے مزاج سے ہم آہنگ کیا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ذہنی طور پر باشعور طبقہ اپنی روایات کے ساتھ ساتھ نئے تاثرات قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو رہا تھا۔

جوش بعض اوقات پے در پے ذہنی تصویروں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ رنگ و بو کی ایک مجموعی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ ان کی فطرت سے متعلق نظموں میں کہیں کہیں کیفیت سے زیادہ بناوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ اور ذہنی تصویروں کے مجموعے میں سلیقۂ انتخاب کی کمی —— کھٹکتی ہے۔ بعض اوقات جوش کے یہاں تشبیہات یا استعارات فطرت کی کسی ذہنی تصویر کو پیش کرنے کے بجائے ذہنی تصنع کی نمائندگی کرتے ہیں۔

جوش فطرت کے فنکارانہ حسن کا شاعر ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نظموں کی تعمیر میں جو کمی رہ جاتی ہے اسے وہ اپنی تصویری شعریت سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جوش کی فطرت سے متعلق نظموں میں جگہ جگہ لمحاتِ بہار کے نشانات قدم ملتے اور رنگ و بو کے جوئے چھلکتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ ان کے شاعرانہ تخیل کی برق تابی فطرت کو فکر کے کسی منظم سلسلہ کا پابند نہیں کر سکی، لیکن اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ وہ اجزا کے حسن کو بالتفصیل پیش کرنے پر قادر ہیں۔ ان کے شاعرانہ شاہدے کی آگ میں پگھل کر فطرت حسین تر قالب میں ڈھلی ہے۔ اور ان کے نظارہ کی گرمی نے اسے شاعرانہ تخلیق کا سوز و ساز عطا کیا ہے۔

جوش نے عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پہچاننے کے باوجود لمحۂ حاضر کو دل دیا ہے۔ اور اس میں انہیں کسی فکری تضاد کا احساس نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ایک طرف ان کی شخصیت پیچیدہ اور مکمل شخصیت ہے اور دوسری طرف ان کی شاعرانہ تاثر پذیری نے مختلف سرچشموں سے فیض حاصل کیا ہے۔ ان کے لئے خیامیت، رندی و سرمستی کا جواز بن گئی تو حافظ کی ماورائی تصوریت نے ان کی شعر و ادب کے ماورائی تصور تک رہنمائی .... کی ہے۔ وہ حافظ کی تصور پرستی کو نئے دور کے تقاضوں میں زندگی کا لائحہ عمل نہیں بنا سکے تھے۔ لیکن عالم ریو دگی انہیں اپنے فن کا سنبھالے نظر ضرور معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے قوت و حیات کی مادی اقدار کا قائل ہونے کے باوجود وہ اپنے فن کو شعور کی مادی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بلکہ مادیت میں جمال روحانیت کا ایک نیا باب وا کرتے ہیں۔

جوش اپنی ایک نظم میں نقادوں سے خطاب کرتے ہوئے اشعار کو خالی پیمانے قرار دیتے ہیں۔ جس کی ایک تاویل تو یہ ہو سکتی ہے کہ شاعر کی آرزوئے اظہار آسودہ نہیں ہوئی۔ اور اسی لئے وہ عاجزیٔ اظہار کا اعلان کرتا ہے۔ لیکن یہ تاویل اس وقت غلط ہو جاتی ہے جب وہ شاعری کو عالمِ محسوسات سے ماورا ٹھہراتے ہیں۔ اور لامحدود کو محدود کرنے کی خواہش ہی کو سرے سے ناقص قرار دیتے ہیں۔ فن کی عاجزی کے اس تصور میں بھی جوش کے ذہن کی متضاد کیفیتیں جھلکتی ہیں —— نقادِ فن سے شکایت دراصل اپنی بڑائی کا اظہار ہے۔ وہ اپنی شاعری کو تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اس لئے فن کے اس تصور میں ان کی انانیت فکری سہارا ڈھونڈتی ہے۔ انانیت کی یہ لے جوش کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ لیکن بڑی بات یہ ہے کہ جوش کی انانیت صحت اور نشاط کا علم بردار ہے۔

جوش کی شاعری میں توانائی کی لہریں اس لئے دوڑ رہی ہیں کہ وہ ایک اعتبار سے اپنے دور کی اجتماعی قوت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ اجتماعی قوت ایک طرف ان تمام بندشوں کو توڑ دینا چاہتی ہے جو سیاسی طور سے اس پر عائد کی گئی ہیں۔ اور دوسری طرف زندگی سے لطف اندوزی کی راہ میں حائل ہونے والی سماجی بندشوں کو بھی ختم کرنے کے

آواز ذہنی توانائیوں کا سوز اور زمینی سچائیوں کا کرب لئے ہوئے نہیں ہے۔ چنانچہ شاعرانہ حرف و حکایت کے باوجود جوش کی شاعری میں عاشقانہ واردات کی کمی نظر آتی ہے۔ ان کا جذبۂ عشق جسم کے عرفان سے عبارت ہے۔ اس میں ایک بھرپور شخصیت دوسری بھرپور شخصیت کے جسم اور ذہن کی دریافتوں کے سارے مراحل طے نہیں کرتی۔ اس کے برخلاف ان کا جذبہ دروں جنسی کشش اور جسمانی قرب کی جمالیاتی منزل ہی میں قیام کر لیتا ہے۔ اور محبوب کی شخصیت کے سارے پیچ و خم ایک والہانہ کیفیت میں گم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری محبوب سے زیادہ عاشق کی خواہش وصال سے تعلق رکھتی ہے۔

جوش کی شاعری میں جوانی کی سرمستی نے جو نغمے چھیڑے ہیں، ان کی نوع آفرینی سے کائنات کی دلکشی کا جو نقش ابھرتا ہے وہ جاذب نظر ضرور ہوتا ہے۔ خصوصی "برسات" میں جوانی کی ترنگیں فطرت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ جوش کی شاعرانہ نظر نے عالمِ خارجی کے کیف و کم سے جوانی کی امنگوں کے اثبات کا کام لیا ہے۔
وہ کہتے ہیں ؎

شاخوں میں چھما چھم ہے فضاؤں میں روانی
بہتی ہوئی جھنکار، مچلتا ہوا پانی
بھونرے ہیں کہ اڑتی ہے کہانی پہ کہانی
بھیگے ہوئے پودوں کی یہ چھنتی ہوئی خوشبو
اے دولتِ پہلو
ہاں تان اڑا تان قسم پارہ دگل رو
اے دولتِ پہلو

اس نظم میں شاعر کے حواس خمسہ پوری طرح بیدار اور زندگی کی لذتوں سے سرشار نظر آتے ہیں۔ شاعر کا ذہن رنگینیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ جہاں تک منظر نگاری کا تعلق ہے جوش نظیر اکبر آبادی سے بھی کافی متاثر ہوئے ہیں لیکن اس نظم میں نظیر کی حقیقت پسندی صرف

"دبکے ہوئے چھجوں کے تلے تو ابچے والے"

جیسے مصرعوں میں جھلک دکھاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جوش نے "موجوں کی آنکھیں" اور "ہواؤں کی زبانیں" پیش کر کے فطرت کو جیتی جاگتی قوت بنا دیا ہے۔ لیکن اس نوع کی تعبیر فطرت سے زیادہ شباب کی امنگوں کو پیش کرتی ہیں۔ چنانچہ — "پیرِ مغاں دیکھ" "اے جانِ من جاناں سن" اور "کیا گھبدلی ہے" جیسی نظموں میں جوانی کی لہریں امڈی ہوئی ملتی ہیں۔ کہیں کہیں جذبات کی کمی کو الفاظ کی بہتات سے چھپایا بھی گیا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اصوات کی جھنکار نے فن کارانہ طور پر جوانی کے آہنگ کو تیز تر کر دیا ہے۔

اس طرح کی پرشباب نظموں کا دوسرا رخ وہ ہے جہاں جنسی کشش کے کھیل کو شاعرانہ پیکر عطا کیا گیا ہے۔ جوش کے خمریات کو بھی ان کی جوانی کے ولولوں کا مظہر ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ ان کے یہاں شرابِ جوانی کے گرم خون کا

سیال روپ بن گئی ہے۔ جہاں تک جنسی کشش کے کھیل کا تعلق ہے جوش کا ذہن نسوانی حسن کی اداؤں سے اس طرح متاثر ہوتا ہے جیسے بجلی بادلوں کو چیر کر گذر جاتی ہے۔ اس کی تابانی نظروں کو خیرہ کر دیتی ہے لیکن وہ ذہنی افق پر مستقل روشنی کا دائرہ نہیں بناتی۔ پھر بھی چند لمحوں کی یہ تابانی شاعری کے روپ میں ڈھل کر جمالیاتی مسرت کا سامان فراہم کر دیتی ہے۔ چنانچہ "یہ کون اٹھا ہے شرماتا"، "اٹھتی جوانی" اور "نیچی نگاہیں" جیسی نظمیں محاکات کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔ "اشکِ اولیں" میں یہ شعر

گلے پر ہمدمِ طفلی کے تیغِ خوں فشاں پھیری
ذرا سا مسکرا کر شرح ہونٹوں پر زباں پھیری

جمالیاتی تاثر کے ساتھ ایک ایسی کہانی کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے نقوش جوش کی شاعری میں اُبھرنے نہیں پائے۔ اس کی وجہ ان کی تلون مزاجی ہو یا آسودگی، دونوں صورتوں میں یہ دھندلی پرچھائیں ایک ایسی داستان کا پتہ دیتی ہے جو اگر مکمل ہونے پاتی تو اردو کی عاشقانہ شاعری کی روایت میں اضافہ کا سبب بن جاتی۔ "رفیقۂ حیات" سے خطاب کرتے ہوئے جوش نے اپنی حسن پرستی اور بے راہ روی کا جواز تلاش کیا ہے۔ لیکن ان کے دلائل میں تجزیاتی گہرائی اور خلوص کی صداقت نہیں ہے۔

اس کے برخلاف اپنی ایک دوسری نظم میں "شریکِ زندگی" کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے "درد لیشانہ مے خواری" کا تقابل سماجی برائیوں سے کیا ہے۔ اور یہ تقابل اپنی بنیادی سچائی کی وجہ سے قابلِ قبول ہے — اس تقابل کی جھلک راشد کی ایک نظم میں بھی ملتی ہے۔ لیکن جوش کا پس منظر زیادہ وسیع ہے۔ جوش نے محدود سطح پر جنسی جذبے کو جمالیاتی آب و تاب بخشی ہے۔ چنانچہ "گنگا کے گھاٹ پر"، "مالن"، "جامن والیاں" اور "جوانی کا تقاضا" جیسی نظمیں جنسی کشش کی بے باک ترجمانی کرتی ہیں۔ "کوہستانِ دکن کی عورتیں" میں یہ کشش نئے تصویری پیکروں کی تعبیر کرتی ہے۔ اور آخری شعر شاعرانہ انکشاف اور ڈرامائی تضاد کا رنگ لئے ہوئے ہے۔

بہ حیثیتِ مجموعی جوش کی پر شباب شاعری نے ہمیں مصنوعی اخلاق سے فطری اخلاق کی طرف مائل کیا ہے، اس شاعری کا مثبت پہلو یہ ہے کہ مروجہ اقدار سے بغاوت کر کے اس نے ملائیت کے جبر اور شریعت کی سخت گیری کو اپنا نشانۂ طنز بنایا ہے۔ یہ طنز شاید نئے اخلاقی رابطوں کی تلاش میں ہماری معاونت کر سکے۔ جوش کا بلوغیانہ مزاج شباب کی اُمنگوں کے پیشِ نظر انسانی تاریخ کی نئی تاویل کرتا ہے۔
وہ کہتے ہیں:

ہاں بایں عظمتِ آیات و احادیثِ جناب
دشتِ خوباں میں ہے شوخی کی عناں کیا کہنا
کب سے ہے نطق رسالت پہ رواں حکمِ شراب
وہی ہلچل ہے سرکوئے مغاں کیا کہنا
للہ الحمد کہ خود حکمِ خدا کے باوصف
ہے وہی گرمیِ بازارِ بتاں کیا کہنا

یہ بغاوت اجڑے ہوئے ذہن کی پیداوار ہے۔ کیوں کہ ان میں سماجی رابطوں کا فریب کھلتا ہے لیکن ایسے سماج میں جہاں محبت شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہو رکے ہوئے جذبات یوں امڈ پڑتے ہیں کہ سماجی تنظیم کے لئے قائم کی ہوئی بندشوں کو بھی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ سماج میں فطری جذبات پر غیر فطری بندشیں عائد نہ کی جائیں۔ جوش کی حیثیت کو بھی ایسے سماج میں جہاں مسرت کی تلاش گناہ قرار دے دی گئی ہو خیرالعمل بن جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جوش کی ایسی نظمیں بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئیں جہاں انہوں نے شریعت کے اجارہ داروں کے قول و عمل کے تضاد کو بے نقاب کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شریعت کے مقابلے میں آزادیٔ خیال کی روایت اردو اور فارسی شاعری میں قدامت کا درجہ رکھتی ہے۔ جوش نے اس سلسلہ میں کسی تازگیٔ فکر کا ثبوت نہیں دیا۔ لیکن ان کی کھینچی ہوئی تصویریں (”فتنۂ خانقاہ“ ”مولوی“ ”شیخ کی مناجات“ اور ”مقامِ شیخ“ جیسی نظموں میں) گہرے طنز کی حامل ہیں۔ اس لحاظ سے جوش نے آزادیٔ خیال کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ لیکن جوش کی عشرت پسندی میں کبھی کبھی آبائی امارت کا غرور بھی جھلکنے لگتا ہے۔ اور بعض اوقات ان کی نظمیں جاگیردارانہ ماحول میں پلے ہوئے شخص کی عیاشی کی داستانیں بن جاتی ہیں۔ اس طرح کی نظموں میں وہ کسی روایت کے خلاف بغاوت نہیں کرتے بلکہ جاگیردارانہ سماج کی روایت کا استحکام کرتے ہیں۔

وہ سماج کے منفی پہلوؤں کی نفی کرنے کے بجائے ان کا اثبات چاہتے نظر آتے ہیں۔ جب تک خون گرم ہے وہ ”فتوحات“ کے خواہاں رہتے ہیں۔ اور جب یہ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے تو وہ ”بہر رنگ عورت خطرناک ہے“ کا درس دینے لگتے ہیں۔ عورت کی رفاقت کا وہ تصور جو آج کے شاعروں کے یہاں گل کاریاں کر رہا ہے ان کے یہاں نہیں ملتا۔ صحیح رفیقانہ احساس سے ان کی شاعری کا دامن خالی ہے۔ ان کی نظم ”سراب“ کا موضوع کوئی ایک عورت نہیں۔ (کیوں کہ اگر ان کی عمر نے آگے کی طرف جست لگائی ہے تو وہ کیسے سن کی ایک منزل پر قیام کر سکتی تھی) بلکہ نفسِ جنس ہے جو ان کی پیرانہ سالی کے باوجود ان کی خواہشات کی آسودگی نہیں کرتی۔ یہ نظم شاعرانہ اعتبار سے کمزور ہے۔ لیکن جوش کے مزاج کی تفہیم میں مدد کر سکتی ہے۔

نظیر نے بڑھاپے کی برائیاں بیان کی ہیں، لیکن اس کا بیان واقعاتی رنگ لئے ہوئے ہے۔ اس کے برخلاف جوش کی نا آسودگی انہیں صرف صنفِ نازک ہی سے برگشتہ نہیں کرتی، بلکہ محبت کی تہذیبی طاقت کے بھی وہ منکر نظر آنے لگتے ہیں۔ [illegible] ہوتا ہے کہ اپنی ساری خواہش کے باوجود نظیر کا انسانی قد جوش سے بہت بلند ہے [illegible] کہ جوش کی شاعری کا [illegible] آہنگ جوانی کی سرشاریوں سے عبارت ہے۔ اگر جوانی کے ولولوں کو رخصت دے دیجئے تو ان کے ایوانِ شاعری میں اداسی چھا جاتی ہے بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو شاعری میں شباب کی ترنگوں کے سب سے بڑے قصیدہ نگار، وصاف اور ترجمان جوش ہی ہیں۔

جوش نے ایک طرف نظیر اکبرآبادی کا اثر قبول کیا ہے تو دوسری طرف آتش کے مردانہ پندار کا صنم کدہ بھی انہیں دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ لیکن نظیر کے مقابلے میں جوش کی شاعری انسانی قدر و قیمت کے اعتبار سے کمتر ہے۔ جوش کے ”آدمی نامہ“ اور نظیر کے ”آدمی نامہ“ کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یہ فرق واضح ہو جاتا ہے۔ نظیر کی نظم میں زندگی کی سنگین حقیقت نے لفظوں کے قالب میں ڈھلنا چاہا ہے تو جوش لفظوں کے ذریعہ حقیقت کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔

جوش کی "دانے والے آدمی" اور "بیت بڑا ہے کار" دونوں اپنے اپنے طور پر کامیاب نظمیں ہیں۔ لیکن ان کا نیظر کی اسی نوع کی نظموں سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کے متضاد پہلوؤں کی المناکی کا نظیر نے جس ہمہ گیر انداز سے احاطہ کیا ہے وہ انداز جوش کے یہاں نہیں۔ جوش کے یہاں لفظوں کے پیچ و خم میں الجھنے کی کیفیت پائی جاتی ہے، اور نظیر لفظوں کے ذریعے براہ راست حقیقت سے روشناس کرا دیتا ہے۔ اس سچی سچائی کی گونج اور انسانی زندگی کے حزنیہ کی تھرتھراہٹ جس طور پر نظیر کی نظموں میں بیان واقعہ کا انداز لئے ہونے کے باوجود محسوس ہوتی ہے وہ جوش کی نظموں میں شاعرانہ آرائش کے باوصف نہیں ملتی۔ یہاں آ کر ان کا سردانہ پندار جوش کی شاعری میں اجتماعی میلان اختیار کر کے دو آتشہ ہو گیا ہے۔

جوش کی شاعری لکھنؤ کے جنازہ، خمریات اور نسیت کی روایت سے (جس کے نقوش ان کے ابتدائی مجموعہ کلام "روح ادب" میں مل جاتے ہیں) دامن چھڑا کر اس منزل تک پہونچی تھی کہ ؎

مرے غرور کے ماتھے پہ آ چلی ہے شکن
بدل رہی ہے تو بدلے ہوا زمانے کی

زمانے کی ہوا نے بدل کر جوش کے رنگ طبیعت کو نکھار دیا۔ اور ان کا انفرادی غرور اجتماعی خود اعتمادی کے قالب میں ڈھل کر وسیع تر شاعرانہ صداقتوں کا حامل بن گیا۔

جوش نے روح عصر حاضر اور ہندوستان کی خدمت میں اپنی شاعری کا صحیفہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو سازشیت کے ساتھ ساتھ طبلِ جنگ بھی قرار دیا ہے اور ان کا دعویٰ بڑی حد تک صحیح ہے لیکن یہ طبلِ جنگ جوش کا بجایا ہوا نہیں۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا بجایا ہوا ہے۔ اس طبلِ جنگ کی گونج ہمیں ضرور جوش کی شاعری میں ملتی ہے۔

جوش بہت خوب صورتی سے کہتے ہیں ؎

خواب کو جذبۂ بیدار دیئے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیئے دیتا ہوں

جوش کی باغیانہ عزم میں ڈھلی نظموں میں عرابی شاعری کا رجزیہ آہنگ ملتا ہے۔ لیکن ہندوستانی احساسات کی روایت کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا ہے۔ چنانچہ "پیرانِ محکم" میں جہاں مسرت سے جنگ کرنے والے غازیوں کی قسم کھائی گئی ہے جن کے زخم اپنی تلوار کی برش سے بڑھتے ہیں، وہاں رام، لچھمن اور ارجن کو بھی فراموش نہیں کیا گیا ہے۔ "بغاوت" اور "نعرۂ شباب" دونوں میں بجلی کی تیزی اور تلوار کی کاٹ ملتی ہے۔ جوش نے اپنے عصر کی روح کو اس آب و تاب سے پیش کیا ہے کہ مستقبل کی آہٹ سنائی دینے لگتی ہے۔

"شکست زنداں کے خواب" میں ایک پورے دور کی آرزوؤں کی پیغمبرانہ صداقت کے ساتھ ترجمانی کی گئی ہے۔ "وطن" (جس کا فٹ نوٹ وطنیت پر اقبال کے فٹ نوٹ سے بہت ملتا ہے معلوم نہیں یہ توارد اتفاقی ہے یا دانستہ) زنداں کا گیت، مقتل کانپور، ایک شہید وطن کی یاد میں، غدار، اور اسی انداز کی متعدد نظمیں ہندوستانی قومیت کی تحریک آزادی کو پیش کرتی ہیں۔ چکبست نے ہندوستانی قومیت کے جس تصور کو پیش کیا تھا،

جوش کی شاعری اس سے متاثر لیکن اس کی زیادہ باغیانہ اور ارتقائی شکل ہے۔ جوش نے برطانوی سامراج سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اور ان کی آواز برابر ظلم و استبداد کے خلاف اٹھتی رہی۔ ان کا ذہن کبھی برطانوی سازش کا شکار نہیں ہوا۔ ان کی شاعری نے کمپنی کے عہد حکومت اور ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد کے بعض ایسے گوشوں کو محفوظ کر لیا جن کا قومی حافظہ میں محفوظ رہنا ضروری تھا۔ ان کی شاعری کو نظر انداز کر دیجئے تو ہمارے شعری ادب میں جد و جہد آزادی کے نشانات مدھم پڑنے لگتے ہیں۔ وہ صرف قائم شدہ نظام کی تخریب کا پرچم ہی بلند نہیں کرتے بلکہ نئے میلان کا اعلان بھی کرتے۔ اور نظام نو کا خواب بھی دیکھتے ہیں۔ لیکن ان کی شاعری میں باغیانہ تخیلات کی بنیاد جذباتی ہے فکری نہیں۔

وہ ہندوستانی قومیت کی جنگِ آزادی کے علم بردار ہیں۔ لیکن یہ جنگِ آزادی کا وہ دور تھا جب اس جد و جہد کی معاشی اور طبقاتی لہریں ابھرنے نہیں پائی تھیں۔ جذباتی طور سے ایک غیر قوم سے اپنا وطن آزاد کرانے کی جد و جہد میں سب شریک تھے۔ لیکن جد و جہد کی صورتوں میں ابھی اختلافات رونما نہیں ہوئے تھے۔ جوش کی انقلابی شاعری کا بڑا سرمایہ اسی دور کی پیداوار ہے۔ اور ان کے شاعرانہ مزاج کی تعمیر اسی آب و گل سے ہوئی ہے۔ اسی لئے راون کے عمل اور ابو سفیان کے گھر دونوں کو ایک خانے میں رکھ کر جوش لنکا کی طرف آگ کو بڑھتے ہوئے، اور خونِ ہاشمی کو صرصرو سیلاب سہتے ہوئے دکھاتے ہیں۔

ان کی شاعری میں نعروں کا انداز بھی ملتا ہے۔ لیکن یہ نعرے شاعرانہ کیفیت سے خالی نہیں۔ کبھی کبھی قوموں کی زندگی میں نعروں کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور جوش کی شاعری اس وقتی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ جوش کی انقلابی شاعری آزادی کی عمومی تحریک کی نمائندہ ہونے کے باوجود نچلے طبقوں سے خصوصی لگاؤ رکھتی ہے کیونکہ بغاوت کو فروغ انہیں کٹیاؤں میں حاصل ہوتا ہے۔ جہاں چراغ ہی نہیں جلتا۔ اگر کانگریس کا نام پنڈول تھا (وفادارانِ ازلی کا پیغام) تو اس کا آتش گیر مادہ عوام ہی تھے۔

جوش کی شاعری میں جگہ جگہ سیاسی اثرات کی جھلک ملتی ہے۔ کہیں وہ جبری فوجی بھرتی کے نظام میں خونی بینڈ کے ذریعے جنگ کی ہلاکت آفرینی کو پیش کرتے ہیں اور کہیں "وفاق" اور "حلفِ وفاداری" پر طنز کے نشتر چلاتے ہیں۔ لیکن "وفاق" اور "حلف وفاداری" تک سیاسی جد و جہد نے جو طویل مسافت طے کی ہے، اس کی منزلوں کا شعور ہمیں جوش کی شاعری میں نہیں ملتا۔ کیوں کہ جوش کی انقلابی شاعری کسی براہِ راست جد و جہد کی پیداوار نہیں ہے۔ جد و جہد کی منزلوں کے کچھ نشانات "نوخیزانِ کمیونسٹ پارٹی سے" اور "وقت کی آواز" میں نظر آتے ہیں، لیگ، کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی کے سیاسی لائحہ عمل کی جوش نے خوب صورت شاعرانہ تعبیر کی ہے۔ ان نظموں سے سراغ ملتا ہے کہ ہندوستان میں آزادی کی جد و جہد کس پیچ و خم سے گذر رہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جوش نے ترقی پسند رجحانات کا ساتھ دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کوشش کو انقلابی جد و جہد کی بصیرت نہیں حاصل ہو سکی۔

ان کے وہی انقلابی نغمے قابلِ قدر ہیں جن میں مجموعی توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ بل پاکستان کے متعلق قصیدہ نگاری ان کی ذہنی ہمدردی کے نقوش تو واضح کرتی ہے۔ لیکن یہ تصویر جامد رہتی ہے، متحرک نہیں بننے پاتی۔

نئی دنیا کا جمالیاتی تصور جوش کی شاعری میں ابھرنے نہیں پاتا۔ اور نہ اس تصور کے لئے دل و جاں کی بازی لگا دینے کے آثار ملتے ہیں۔ جوش زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکے۔ یہ ان کی شاعرانہ محرومی ہے کہ آزادی، فسادات اور تقسیم کے بعد کے مسائل پر بھی جوش نے قلم اٹھایا ہے، اور روایتی انداز بیان کے باوجود تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ "رشوت خواروں کی اپیل" میں جوش کے طنز کا وار بہت نکیلا اور بھرپور ہے۔ لیکن ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز آج کا نہیں۔ اس لئے جوش کی انقلابی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں یہ امر ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس کے حدود اور امکانات کیا ہیں، اور وہ دو عالموں کے درمیان کس عبوری موڑ کی ترجمانی کرتی ہے۔

جوش کی شاعری کو آج کی جدوجہد اور آج کے شعور کے معیار سے جانچنا غلط ہوگا۔ کیوں کہ وہ اپنا تاریخی فرض انجام دے چکی ہے۔ اس شاعری نے جدوجہد کی نئی منزلوں کی نشان دہی کی ہے۔ اور کئی خوب صورت اور باقی رہ جانے والے کارنامے اس کی یادگار ہیں۔ جوش کی نظموں میں خطابت کا انداز پایا جاتا ہے۔ لیکن ان کا خطیبانہ لہجہ سپاٹ اور بے اثر نہیں ہوتا۔ دراصل جوش کی انقلابی شاعری کے خط و خال کی تابناکی ایسے ماحول کی متقاضی ہے جس کے خلاف جوش کا ذہن پوری قوت سے پھٹ پڑے۔ لیکن یہ ذہنی بغاوت براہ راست جدوجہد کی سرچشموں سے توانائی حاصل نہیں کرنے پاتی۔ اور اس کی فکری اساس کمزور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ برطانوی استبداد نے جوش کے باغیانہ ذہن کو آگ برسانے کا موقع شعلہ کیا تھا۔ یہ روح احتجاج اور یہ سیشہ ایام کی آگ جوش کی انقلابی شاعری کا سرمایہ ہے۔ جس سے کام لے کر انھوں نے حیات پرور ترانے چھیڑے ہیں۔

جوش کی شاعری میں مسلمہ عقائد و روایات کے خلاف بغاوت بہت کچھ ان کی شیعیت کی کارفرمائی ہے۔ ان کی شاعری کے تفصیلی مطالعہ کے بغیر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جوش کے شیعی رجحانات وقتی مصلحتوں یا منفعتوں کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ان کے کلام کے داخلی شواہد اس نقطۂ نظر کو باطل کر دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں جگہ جگہ مذہب سے بیزاری کے باوجود شیعیت کی جذباتی ترجمانی ملتی ہے۔ رندی اور شیعیت کی باہمی مفاہمت کا تصور جوش سے پہلے غالب پیش کر چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

برلب یاعلی سرائے بادہ روانہ کردہ ایم
مشرب حق گزیدہ ایم عیش مغانہ کردہ ایم

عرب میں شیعیت ایک سیاسی تحریک کے طور پر شروع ہوئی تھی جس کا مقصد حضرت علی کی طاقت کا استحکام تھا۔ لیکن جلد ہی اس تحریک نے معتقدات اور جذبات کے لحاظ سے مذہبیت کو نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ اس تحریک میں عربوں سے زیادہ غیر عربوں کی شمولیت نے نئے اثرات کے دروازے کھول دیئے۔ مختلف علاقوں میں مختلف رجحانات وقتاً فوقتاً اس تحریک پر اثر انداز ہوتے رہے۔ لیکن بنیادی طور پر آغاز سے اب تک یہ تحریک اسلامی تاریخ کے ماضی و حال کے خلاف احتجاج کی صورت رہی ہے۔ اور بر سر اقتدار اسلامی طبقے کے مسلمات اور اس سے زیادہ اس کی سیاسی قوت کے خلاف ایک نوع کی ذہنی بغاوت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جوش نے اپنی نظم "حسین اور انقلاب" میں اسی بغاوت کے نقوش اجاگر کئے ہیں۔ وہ شیخ و شاب اور قوم کے شباب کو ذہنوں

برخلاف کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایسی اکثریت کے خلاف مردِ حق کی تنہا آواز کی اہمیت ظاہر کرتے ہیں۔ پھر خصوصیت سے جب حکومت کا سامنا ہو اس وقت ثبات دکھلانے کو مَردوں کا کام قرار دیتے ہیں۔ اور حق و باطل کی کش مکش کو ابدی ٹھہراتے ہیں۔ یہ واقعۂ کربلا کی انقلابی تعبیر ہے۔

اسی طرح شیعی معتقدات کے اہم عنصر یعنی حضرت علیؓ کی امامت مطلق کا اعتراف بھی جوش کی شاعری میں کئی جگہ ملتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے حیدری ہونے کا نعرہ لگاتے ہیں، بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ؎

جوشؔ ہم ادنیٰ غلامانِ علیؑ مرتضیٰؓ
تمکنت سے پیش آتے ہیں جہانبانی کے ساتھ

ذاکروں سے خطاب کرتے ہوئے جوش نے واقعۂ کربلا کے حربی نقوش واضح کیے ہیں۔ اس سے اس واقعہ کی مظلومیت کے پہلو کی نفی نہیں ہوتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی تعبیر میں اختیاری جد و جہد پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن یہ پہلو بھی نیا نہیں، اور اسلامی مورخین نے اسے بالوضاحت بیان کیا ہے۔

جوش نے اپنی حال کی شاعری میں ان معتقدات کی نمایاں طور پر ترجمانی کی ہے۔ لیکن یہ رجحانات ان کی شاعری میں ابتدا ہی سے ملتے ہیں۔ اور ان کی شاعری کے محرکات میں ان معتقدات کو بھی اہمیت حاصل رہی ہے جوش پر قلم اٹھاتے ہوئے کوئی دیانت دار نقاد جوش کی باغیانہ شاعری کے تب و تاب اور معتقدات کی جذباتی صورتوں کے باہمی تعلق کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لیکن اس جذباتی بنیاد کے ہوتے ہوئے بھی جوش کی شاعرانہ شخصیت حقیقی انقلابی کردار کے قالب میں ڈھلنے نہیں پائی ہے۔ کیوں کہ جوش کا تعلق انقلاب کی سماجی بنیادوں سے اتنا گہرا نہیں جتنا وہ اس کے جذباتی روپ اور تحریک صورت کے شیدا نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ان معتقدات کو تاریخ کے دھاروں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے یہاں تخریب کی آرزو تعمیر کے حسن کے مقابلے میں نمایاں رہتی ہے۔

جوش کا سرمایۂ کلام اتنا وافر ہے کہ آسانی سے اس کی موضوعات کے اعتبار سے تقسیم نہیں ہو سکتی۔ کوئی نہ کوئی شاعرانہ لطافت، کوئی نہ کوئی مشاہدے کی تازگی، کوئی نہ کوئی بیان کی ندرت، اور کوئی نہ کوئی فکر کا گوشہ ایسا مل جاتا ہے جسے ہم موضوعات کے خانوں میں بانٹنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ جوش کا سریع التاثیر ذہن شاعری کے دریچوں سے حیات و کائنات کا انفرادی جائزہ بھی لیتا رہا ہے۔ نرمی اور دل سوزی جوش کے کلام کی بنیادی خصوصیت نہیں، لیکن "پیا بن ناگن کالی رات" میں یہ نرمی اور دل سوزی نظم کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی اور پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔ جہاں جوش نے دیہات کے مناظر پیش کئے ہیں یا خالص ہندی معاشرت کی ترجمانی کی ہے وہاں ان کی گرج دار آواز بھی گیتوں کے آہنگ میں ڈھل گئی ہے۔ اس نظم میں ہندی عورت کی اپنے پردیسی ساجن کے لئے برہا کے جذبات کی جو عکاسی کی گئی ہے۔ وہ لطافت و طہارت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ یہاں مشاہدے کی تازگی اور جذبات کی گھلاوٹ کا امتزاج ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

بادلوں سے ہلال کو جھانکو
اپنا خنجر میان میں رکھ لو

سیج سونی ہے اور برستی رات
باؤلی ہو گئی ہے کیا برسات

پہلے شعر میں تشبیہ کی جنسی رمزیت بھی قابلِ تعریف ہے۔ "انگیٹھی" میں جوش نے ایک بھولی بسری معاشرت کی جو خواب آلود ترجمانی کی ہے، اس کی دل آویزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ "ناقابلِ تسخیر" میں جوش نے ایک انوکھے جذبے کی ترجمانی کی ہے۔ جس کی نامانوسیت بجائے خود دلکشی رکھتی ہے۔ "گرمی اور دیہاتی بازار" میں ایک مخصوص فضا اور اس کے متعلقات بڑی خوبی سے پیش کئے گئے ہیں۔ ان کی تشبیہات خارجی ماحول کو بھی ذہنی مناسبت دیتی ہیں۔ مثلاً

سر پہ کافر دھوپ جیسے روح پر عکسِ گناہ
تیز کرنیں جیسے بوڑھے سودخواروں کی نگاہ

دیہاتی مناظر کو پیش کرنے کے سلسلے میں ان کی سب سے قابلِ ذکر نظم "پیش گوئی" ہے جس میں زندگی کے ایک معمولی ٹکڑے میں شاعر نے معنویت کا رنگ اس طرح بھرا ہے کہ یہ معمولی ٹکڑا حیاتِ گذراں پر ایک غیر معمولی نقد و تبصرے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اگر یہ نظم نہ ہوتی تو کھیتوں کے "نکائے جانے" کے تصور سے اردو شاعری کا خزانہ خالی رہ جاتا۔

پھر شاعر نے صرف مشاہدے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ زندگی کے شعور کو بروئے کار لا کر اس ننھی سی لڑکی کے حال کی جھلک کے ساتھ ساتھ مستقبل کی ذہنی تصویر بھی پیش کی ہے۔ وہ جیسے مائکے کے ویرانے شب کو افسانہ سنانے گی مستقبل میں سو

نہ تو جاگے گی اور نہ سوئے گی
دیر تک سر جھکا کے روئے گی

موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے اردو شاعری میں جو تغیرات رونما ہوئے ہیں اس کے اثرات جوش کی شاعری میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ان تغیرات کے پس پردہ جو سماجی حقیقتیں ہیں جوش کا ذہن ان کا ادراک کرنے سے قاصر رہا ہے۔ پھر بھی کہیں کہیں (شاذ و معدوم کی حد تک) ان اثرات کی پرچھائیں پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ ان کی دو نظمیں "قعا منب" اور "تو اگر واپس نہ آتی" بحر ہیئت "ناک سے" نظم نگاری کے جدید انداز سے کافی قریب معلوم ہوتی ہیں۔ ان نظموں میں خطیبانہ لہجے کے بجائے ایک داخلی ربط اور نفسیاتی تسلسل کا پتہ چلتا ہے۔ جو اپنے موضوع سے ہم آہنگ ہے۔

"تو اگر واپس نہ آتی" کی وافنیت کا پرتو "نیا المرت" اور "فارغ بحر کی خدمت میں" بھی نظر آتا ہے لیکن مؤخرالذکر دونوں نظمیں جوش کی الفاظ پرستی کا شکار ہو گئی ہیں۔ اس کے برخلاف "مہاجن" اور "مفلس" میں جوش کی تشبیہات اور ذہنی تصاویر الفاظ کی ریل پیل کے بغیر تاثر کا نقش چھوڑ جاتی ہیں۔

جوش اظہار کے وسیلوں پر بے پناہ قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ قدرت ان کی فکری بے راہ روی کا انکشاف بھی کرتی ہے۔ بعض اوقات پہلے شعر میں جو بات کہی گئی ہے ساری نظم اس کے اعادہ یا تکرار پر مبنی ہوتی ہے۔ پھر ایک

نظم میں جو بات بیان ہوئی ہے وہی بات مختلف پیرایوں میں بار بار کہی جاتی ہے۔ اس لئے مجموعی طور پر ان کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو اپنے حجم کے باوجود فکری پہلوؤں کے اعتبار سے کم مقداری کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کم مقداری ان کے شاعرانہ اعتبار پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

جوش ادھر ہیئت پرستی کا شکار بھی ہو گئے ہیں۔ وہ نظم کے موضوع سے زیادہ اس کی مصنوعی ساخت پر اپنی توجہ صرف کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ فکری تضاد جو ان کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ موضوع اور ہیئت کو بھی دو الگ الگ اکائیوں میں بانٹ دیتا ہے۔ حالانکہ شاعرانہ عظمت موضوع اور ہیئت کی ہم آہنگی میں ہے۔ جوش کی شاعری میں موضوع اور ہیئت کی مغائرت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اور یہی ان کی ہیئت پرستی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

ان کی نظموں میں لفظوں سے کھیلنے کا رجحان حال میں زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ شاعر کے پاس اب کہنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ اور وہ لفظوں کی بیساکھیوں کے سہارے چلنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ جوش اپنی جدید "کیلوس" اور "کاوشِ کیمونس" میں الجھ کر عصرِ رواں کی نئی آوازوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ نئی نسل سے مایوس نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ یہ ان کے لفظوں کے جھوٹ کو پہچان لیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جوش قاموس کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ بات کم نہیں۔ لیکن شاعری قاموس کے سہارے نہیں چل سکتی۔ نئی نسل اگر جوش کی بڑائی کو تسلیم کرتی ہے، تو ان کی شاعرانہ محرومیوں پر بھی کڑی نظر ڈالتی ہے۔

جوش کی شاعری بڑی خوبیوں اور بڑی کمزوریوں کی شاعری ہے۔ بہرحال ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اردو شاعری میں "شکستِ زنداں کا خواب" دیکھنے والے جوش ہی ہیں۔ ان کی حیثیت پیش رو کی ہے۔ اور انہوں نے نئی نسل کو اظہار کا وسیع سرمایہ عطا کیا ہے۔ شاید ان کی نسلِ تازہ سے مایوسی بھی ان کی پوری نہ ہونے والی بلند توقعات کا نتیجہ ہو۔

جوش کی آواز اردو شاعری کے ایوان میں ایک عرصے سے گونجی ہوئی ہے۔ اس آواز نے دورِ حاضر کے شعرا پر واضح نقوش چھوڑے ہیں۔ موجودہ شاعروں میں کم و بیش سب کے یہاں جوش کے اثرات دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں دو شاعروں کا نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ مجاز نے نئے دور کے تقاضوں کے ساتھ جوش کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ لیکن مجاز کی شاعری خود اپنا آہنگ بھی رکھتی ہے۔ اس شاعری نے جوش کی روایت سے صرف صالح عناصر کا اکتساب کر کے اسے دورِ حاضر کا لہجہ عطا کیا ہے۔

اس کے برخلاف رئیس امروہوی کی شاعری نے جوش کی روایت کے کمزور پہلو کا انتخاب کیا ہے۔ اس لئے ان کی شاعری لفظوں کی کاریگری سے عبارت ہے۔ ان کو شاعر سے زیادہ مشاق موزوں گو کہنا درست ہوگا۔

یہ دو مثالیں جوش کی شاعرانہ روایت کی عظمت کو ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کمزور پہلو کی وضاحت بھی کرتی ہیں۔ اگر نظر بیدار اور شعور پختہ کار نہ ہو، تو جوش کی پیروی خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ شاعروں کے لئے جوش کی روایت صدائے جرس بھی ہے اور خطرے کی گھنٹی بھی۔ آج نئی نسل کا بڑا کام یہ ہے کہ وہ جوش کے شاعرانہ آہنگ کی توانائی کو جذب کر کے زندگی کی نئی تفہیم کا فرض انجام دے سکے۔

جوش کے شاعرانہ تخیلات بدلتی ہوئی زندگی کے پس منظر میں کیا معنویت رکھتے ہیں؟ اس کی دریافت بھی جدید نسل کے سر ہے۔

(باقی صفحہ ۵۸۸ پر)

مصطفیٰ زیدی

اے جوش میں افغان ہوں حسب نسب جسم
حسب نسب طبع ہوں منجملہ سادات

(وقائق)

جوش ملیح آبادی کی شاعری اور شخصیت کی داستان اردو شاعری اور ہندوستانی تہذیب کے عروج و زوال کی داستان ہے۔ اردو شاعری سے میری مراد ان تمام اشعار سے نہیں جو انشائے سے لے کر ابن انشا تک کہے گئے۔ بلکہ اردو شاعری کے اس سرمائے سے ہے جس میں ایک روایت اور ایک تسلسل کا نشان ملتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی تہذیب سے میری مراد وہ ثقافت ہے جس پر ابھی وجودیت اور تجرید کی پرچھائیاں نہ پڑی تھیں، اور جو مغل سلطنت کے زوال کے باوجود، انگریزی حکومت کے دوران میں بھی، اپنی قدیم آب و تاب محفوظ رکھ سکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں نے استقرار حاصل کرنے کے بعد خود اپنے حق میں اس بات کو ضروری اور مناسب سمجھا کہ اس ثقافت سے بالواسطہ جھگڑا مول نہ لیں۔ اسی لئے انگریزی زبان اور رسم الخط اور عیسائی مدرسوں کے باوجود ہم لوگ فارسی اور اردو سے یکسر منحرف نہیں ہوئے۔

دنیا کے اکثر ملکوں نے اس دو سو سال کے عرصے میں جس رفتار کا مظاہرہ کیا، اس کے مقابلے میں ہم پس ماندہ رہے۔ لیکن بہ عجلت، یا بہ تاخیر، ان تمام تحریکات کا کچھ نہ کچھ ردِّ عمل ہمارے یہاں بھی ہوتا رہا۔ چنانچہ ڈاروِن اور کارل مارکس اور ریلوے انجن کی آواز ہم تک بھی پہونچی۔ یورپ میں ان آوازوں نے بڑی بڑی لہریں پیدا کی تھیں۔ ہمارے یہاں اتنی بڑی لہریں تو نہیں اٹھیں، لیکن ثقافت کی سطح پر ارتعاش ضرور ہوا۔ اُس وقت ہمارا ذہنی معیار کچھ ایسا تھا کہ ہم میں سے بیشتر آدمیوں نے اس ارتعاش کو طوفان، اور اس ہلچل کو بغاوت سمجھ لیا — اور جوش ملیح آبادی شاعرِ انقلاب کہے جانے لگے۔

اس انقلاب سے ہماری مراد کوئی بین الاقوامی تبدیلی یا انسان کا چاند کو مسخر کرنا نہ تھا۔ بلکہ صرف انگریزوں کی حکومت سے بیزاری کا اعلان تھا۔ اس کے مقابلے میں اگر فرانس کے انقلاب یا سوویت انقلاب یا انگلستان کے

غیر خونی انقلاب ہی کی داستانیں پڑھی جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہمارے نظریۂ انقلاب اور ان ملکوں کے نظریۂ انقلاب میں کتنا بنیادی فرق تھا۔ وہاں سوال محض ایک حکومت کی تبدیلی کا نہ تھا، بلکہ ایک معاشرے، ایک آئیڈیالوجی اور ایک پوری ثقافت کی تبدیلی کا تھا۔ یہاں ہم صرف اسی بات سے خوش ہونے لگے تھے کہ ہوم رول ملنے والا ہے، اور دو کانگریسی اور ایک مسلم لیگی ارباب حکومت میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہ نظریہ ماسوائے چند بائیں نظر عاملوں، اور لیڈروں کے، سب کا تھا۔ اس میں اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کے طلبا اور پروفیسر، تاجر، دستکار، اردو پڑھنے والے، سب شامل تھے۔

جوش کے انقلاب نے ہمیں اسی لئے اپنی طرف فوراً متوجہ کر لیا کہ جس نظریے کو ہم "بہت بڑی بغاوت" سمجھتے تھے، اسے جوش نے بلند آواز، بلند آہنگ اور شعری شدت کے ساتھ بیان کرنا شروع کر دیا تھا ـــــ اور اس طرح یہ ہوا کہ جوش خود اپنے آپ کو "انقلاب" کا "پیغمبر" اور اپنے کلام کو "صحیفہ" سمجھنے لگے ؎

اے روحِ عصرِ حاضرِ ہندوستانِ نو
لایا ہے اک صحیفۂ سخن داں ترے لئے
اس مصحفِ عظیم کی اشعری وسعتیں
ہر گرد ہے شکن یہ داماں ترے لئے

(تمہید)

خواب کو جذبۂ بیدار دیئے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیئے دیتا ہوں

"ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" وہ نظم تھی، جس نے بائرن کی چائلڈ ہیرالڈ (Childe Harold) کی طرح اپنے مصنف کو رات ہی رات میں مشہور کر دیا۔ اس نظم میں بھی کسی نظریے کا اعلان نہ تھا، بلکہ تاریخی پس منظر کے ساتھ یہ کہا گیا تھا کہ اے فرنگی بھیڑیو! تم جرمن نازیوں کے "گرگِ دہن آلود" ہونے کا کس منہ سے تذکرہ کرتے ہو جب کہ تمہاری اپنی تاریخ میں "وارن ہیسٹنگز" اور "ڈائر" کے نام موجود ہیں۔

لکھنؤ اور ملیح آباد کے نواب زادوں کی صحبت میں غالباً اس سے بڑی بغاوت جوش کے لئے ممکن بھی نہ تھی۔ اسی پر اس زمانے میں یہ افواہیں گشت کرنے لگی تھیں کہ جوش صاحب گرفتار ہو گئے۔ اور جوش صاحب نے "ہٹلر اعظم" کے عنوان سے ایک معرکہ آرا نظم لکھی ہے۔ جو عنقریب "کلیم" میں شائع ہونے والی ہے۔ جو لوگ "کلیم" کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے رہے ہیں انہیں معلوم ہوگا کہ "کلیم" کے ایک شمارے میں جوش ملیح آبادی کے نام کے نیچے ایک عنوان "تلاشی" چھپا تھا۔ اور نیچے نظم نہ تھی، بلکہ یہ اعلان تھا کہ پریس نے یہ نظم چھاپنے سے انکار کر دیا ہے۔

ان نظموں کی کامیابی کی وجہ متذکرہ بالا امور اور ملک کی سیاسی فضا کے علاوہ یہ تھی کہ بنیادی طور پر جوش کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایک "نظریہ" میں لگن کے علاوہ اس کے تمام پہلو بھی کھنگال ڈالیں۔ وہ شعری محاسن و معائب پہچان سکتے تھے۔ بغاوت کو گھن گرج کے ساتھ پیش کر سکتے تھے۔ اور یہ غلط ہے کہ مدھم اور شبنمی لہجے میں اس کا ذکر ان کے لئے ناممکن تھا۔ جوش کے نقادوں نے ان کے ساتھ بڑی بے انصافی یہی کی ہے کہ ان سے کہا اس

کمالِ فن کا اعتراف نہیں کیا۔ یہ اشعار سنئے ؎

بلقیس سے کہو کہ سرِ بارگاہِ ناز
پریاں کھڑی ہیں تختِ سلیماں لیے ہوئے
(زنداں کا گیت)

قزّاق کرنے کو جو کہتے ہیں زمانے والے
سکراتے ہیں تری ناؤ چلانے والے
(وطن)

کس لیے اب یہ نہیں روتی کہ بیٹے کی جبیں
باپ کے ماتھے کی سی تابندگی رکھتی نہیں
(شریکِ زندگی سے خطاب)

جوش کے لیے جہاں یہ ممکن تھا کہ وہ اپنی آواز میں بندوق کی تاثیر بھر دیتے، وہیں یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنے لحن میں ڈھلتی ہوئی شاموں کے سائے پھیلا دیتے۔ لیکن کسی آئیڈیالوجی سے جذباتی اور غیر جذباتی دونوں اقسام کی محبت بیک وقت ان کے لیے ممکن نہ تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ۴۶ء — ۴۷ء تک جوش ملیح آبادی جو نئے شعراء کے امام اور نئی نسل کے ہیرو تھے یکایک بوڑھے اور قدیم معلوم ہونے لگے۔

اس نئی نسل کا ایمان ابھی ایمان مستحکم نہ تھا۔ جوش کے وہ مقلد شعراء جن سے خود شعر کے مستقبل کو امیدیں ہونے لگی تھیں پھلجھڑیوں کی طرح چمک چمک کر بجھ گئے۔ ان میں ایک طرف تو ہنگامی نمود کی خواہش تھی اور دوسری طرف جذبہ کی ناپختگی تھی۔

نتیجتاً میر سپاہ ناشناس لشکریاں شکستہ صف کا معاملہ ہوا، اور شدید ردِ عمل کے طور پر جوش کے جو محاسن تھے وہ بھی معائب نظر آنے لگے۔ میرے عزیز خلیل الرحمٰن اعظمی کا جو مضمون جوش پر ہے بلیغ اور جامع ہونے کے باوجود اسی ردِ عمل کی غمازی کرتا ہے۔ صرف فیض احمد فیض نے اس بحران کے زمانے میں بھی جوش کے بنیادی سیاسی افکار کا جائزہ دیانت داری سے لیا تھا۔ فیض نے جو کچھ کہا تھا اس کا اعتراف خود جوش نے کیا ہے ؎

میرے شعروں میں فقط اک طائرانہ رنگ ہے
کچھ سیاسی رنگ ہے کچھ عاشقانہ رنگ ہے
چند زلفوں کی سیاہی چند رخساروں کی آب
گاہ حرفِ بے نوائی گاہ غورِ انقلاب
وہ بھی کچھ جاگیر دارانہ بقولِ ناقداں
بے سواد و بستۂ رسم و رہِ رومانیاں
بے خبر تھا میں کہ دنیا راز اندر راز ہے

وہ بھی گہری خامشی ہے جس کا نام آواز ہے
پا رہا ہوں شاید اب اس تیرہ حلقے سے نجات
کیونکہ اب پیشِ نظر ہیں عقدہ ہائے کائنات
ایک منا سا ستارہ ایک ننھا سا شرار
یہ تزلزل، یہ تلاطم، یہ تموج، یہ فشار
(اعترافِ عجز)

لیکن سیاست کے کھوکھلے پن کے ردِ عمل کے طور پر اگر "کائنات کی تسخیر" کا نسخہ استعمال کیا جائے تو ذہنی صحت کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔ اس کائنات میں بھی جوش نے "منے سے ستارے" کی ماہیت سمجھنے سے قبل ہی "خدا" کو اپنا حریف اور مدِ مقابل بنا لیا —— اور ایک ایسی ذہنی جنگ مرتب کی جس میں ایک طرف دنیا بھر کے مولوی اور راہب اور برہمن تھے اور دوسری طرف وہ تن تنہا تھے۔ ان کے بقول اس جنگ میں مادی فتح خدا کو اور روحانی فتح انہیں نصیب ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو امام حسین جیسا مظلوم اور ہر مولوی کو یزید سمجھنے لگے۔

فارسی میں قاآنی اور عرفی اور اردو میں انیس اور سودا کا جو مخصوص طریقۂ اظہار تھا وہ جوش کو ورثہ میں ملا تھا، اس ورثے میں شوکت و طمطراق کے علاوہ طنز، استہزاء کی بے پناہ قوت بھی تھی۔ اس ذہنی جنگ میں جس حد تک ممکن ہوا، جوش نے اپنی اس صلاحیت سے کام لیا۔ سب سے پہلے انہوں نے "ایہا الناس" کو مخاطب کیا ؎

اے مردِ خدا نفس کو اپنے پہچان
انسان یقین ہے اور اللہ گمان
میری بیعت کے واسطے ہاتھ بڑھا
پڑھ کلمۂ لا الٰہ الا انسان

پھر اپنے حریف کے لشکریوں کی تفصیل بیان کی ؎

اپنے جسمِ عقائد پہ نہیں وہ گہنے
اب کوئی مجاور نہیں بائیں دہنے
بے چارے پڑے پھرتے ہیں ملا مارے
ٹوٹے جوتے پھٹی عبائیں پہنے

پھر جنگ اور مناظرے کا سماں پیش کیا ہے ؎

تحقیق و تجسس نہ دلیل و برہان
پھر بھی مذہب پہ مر رہے ہیں انسان
اب دین کی جھولی میں دھرا ہی کیا ہے
کچھ ضابطے، کچھ صحیفے، کھوکھلا ایماں

پھر اس جنگ میں اپنی شکست اس طرح تسلیم کی ہے ؎

اس سے "حقا کہ بنائے لا الٰہ ہست حسین" کے علاوہ اور کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ افسانہ نگار یا شاعر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ہر کہانی یا ہر شعر سے کسی اخلاقی اصول کا سبق دے یا کوئی بات "ثابت" کرے۔ محض محسوسات کی تجسیم سے بلند شاعری وجود میں آسکتی ہے۔ اور اگر "ثابت" ہی کرنا ہے تو اس کے لئے حکیم کا طریق کار اختیار کرنا چاہئے نہ کہ مداری کا۔ (مثلاً "ترکِ مذہب" کی بات تو درکنار، جوش کا یہی MOCK - HEROIC لہجہ اُس وقت بھی برقرار رہا ہے، جب انہوں نے صنف غزل کو لغو اور لچر "ثابت" کرنے کی کوشش کی ہے)

طویل نظم "حرفِ آخر" کے ابتدائی حصوں میں جوش نے حکیم کا مسلک اختیار کیا بھی، لیکن اسی "ثابت" کرنے کی دھن کی وجہ سے وہ اس مسلک کو آخیر تک ریاضی کے ساتھ قائم نہ رہ سکے۔ تخلیق سے پیشتر سینۂ عدم میں وجود کے پیچ و تاب کی نزاکت کا اظہار جوش ہی کے لئے نہیں، بلکہ ساری اردو شاعری کے لئے قابل فخر ہے۔ اس طویل نظم میں جوش نے جب تک مروجہ مذہب کے افکار و ہدایات کو نظم کیا ہے، تب تک وہ بلند ترین شعری پرواز سے نیچے نہیں اترے لیکن منظر ۵ کے وسط سے ہی پرواز کی تھکن ظاہر ہونے لگتی ہے۔ ابتدائی مناظر کے اکثر مصرعے اور شعر کے ٹکڑے تو قرآن حکیم کی آیات کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتے ہیں ؎

بارگاہِ نور میں حامل ہو کیوں ظلمت کو بار　　وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ
ہم تری تسبیح کو کیا کم ہیں اے پروردگار　　نُقَدِّسُ لَكَ ۵ البقر۔ منزل ۱ ع ۳

لیلیٰ اسرار کو پہچان سکتے ہی نہیں　　قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا
جو ہے میرے علم میں تم جان سکتے ہی نہیں　　تَعْلَمُونَ ۔ البقر۔ منزل ۱۔ ع ۳

"ابلیس غرور سے گردن کو کج کئے ہوئے..."　　إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ
وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۵

یہ نظم ابھی تک کہیں مکمل شائع نہیں ہوئی۔ اس کے کچھ حصے "رامش و رنگ" میں، کچھ ماہنامہ "آج کل" میں؟ اور کچھ ماہ نامہ "ساقی" میں چھپے ہیں۔ کہیں کہیں یہ بھی ہے کہ جوش صاحب نے اپنی پرانی نظموں، غزلوں کے ٹکڑے جابجا چسپاں کر کے نظم کا تسلسل برقرار رکھا ہے۔ مثلاً: "حوروں کا ترانۂ مبارک باد" اس نظم سے تقریباً دس سال قبل ایک غزل کی صورت میں شائع ہوا تھا، اور مندرجۂ ذیل دو شعر جواب نظم میں شامل نہیں، اُس وقت غزل میں شامل تھے ؎

گدائے رہ نشین و بے نوا کو
غرورِ صحبتِ سلطاں مبارک
جنابِ جوش کو یہ کامرانی
بہ فیضِ سرپرستِ درویشاں مبارک

منظر ۱۴ میں ابلیس کا نعرہ "جنون و حکمت" میں علیحدہ رباعی کی شکل میں شائع ہو چکا ہے ؎

خرد کو گم کردہ راہ کر کے چھوڑا

حوا کو بھی تباہ کر کے چھوڑا
کیا کیا نہ کئے حضور والا نے جتن
آدم نے مگر گناہ کر کے چھوڑا

اصل رباعی میں تیسرا مصرع ذرا سے اختلاف کے ساتھ یوں تھا۔ ؎
کیا کیا نہ کئے خدا نے جنت میں جتن

میں نے ابھی ابھی محسوسات کی تجسیم کا ذکر کیا ہے۔ اس نوع کی شاعری میں جوش ملیح آبادی کا اردو ہی میں نہیں، بلکہ ساری دنیا کے ادب میں کوئی حریف نہیں۔ ڈرامائی کیفیات، نازک سے نازک آبگینے میں تیز سے تیز شراب کو ڈھال دینا جوش کے اختیار میں ہے۔ اسی نظم کے منظر ۱۳ میں خالص جنسی ہیجان کو جس خوب صورتی سے جوش نے نظم کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے ؎

بازو یہ نرم نرم یہ گوری کلائیاں
یہ تن بدن میں آنچ کی لہریں رواں دواں
بیداریوں کو اپنے جلو میں لئے ہوئے
کیسی یہ نیند سی ہے احاطہ کئے ہوئے
آنکھوں سے ایک بھاپ سی اٹھتی ہے گرم گرم
پنڈلی کے پھیکے پن میں ہے کیسے مزے کا درد
رگ رگ میں خون لیتا ہے تھم تھم کے چٹکیاں
رخ سے لٹوں کے چھوتے ہی اٹھتا ہے اک دھواں
پیدا ہوئی ہے بات یہ شاید بہت بری
پہلو سے زلف مس ہو تو آتی ہے جھرجھری
سیال ہو رہی ہوں سنبھلتا نہیں بدن
معبود میری اوس کو پی لے کوئی کرن

"پہلو سے زلف مس ہو تو آتی ہے جھرجھری" کی کیفیت کو جوش سے کم درجے کا کوئی شاعر بیان کرے تو یا وہ سپاٹ ہو کر رہ جائے گا یا فحش اور ابتذال کے دائرے میں آجائے گا۔

جنسی جذبے کے بارے میں جوش کے کلام میں کوئی TABOO نہیں ہے۔ "روح جذبات" ان کا پہلا اور واحد مجموعۂ کلام ہے جس میں انہوں نے محبت میں روحانیت کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن اس مجموعے میں بھی بعض اشعار ایسے ہیں جن کا کوئی روحانی ترجمہ ممکن نہیں۔ مثلاً ؎

زلفیں رخوں نے ذبح کیا دل کو ریل پر
مرنے کو اور جاییئے پنجاب میل پر

رفتہ رفتہ انہوں نے نہ صرف روحانیت کا دعویٰ ترک کر دیا، بلکہ محرکاتِ عشق سے روحانی عمل کو یکسر خارج کر دیا ؎

مگر یہ اب پول کھل چکا ہے
کہ عشق ہیجان جسم کا ہے
نہ عشق اعلیٰ نہ عشق احسن
فقط اک اعصاب کی ہے اینٹھن

(سراب)

یہ ظاہر اعصاب کی اینٹھن کی شاعری سے بڑی توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں، اور بڑے بڑے قادر الکلام شاعر مثلاً فراق گورکھپوری، اس ضمن میں اپنے دامن کو چھینٹوں سے نہ بچا سکے۔ لیکن جوش کا کلام، روڈن (Rodin) اور ہنری مور (Henry moore) کے سنگ مرمر کے برہنہ مجسموں کی طرح دودھ میں دھلا ہوا اور آلودگی سے پاک ہے۔ اس میں جنس ہے، کسک ہے، واقع اور جرأت کے مقامات بھی ہیں، معاملہ بندی بھی ہے، لیکن لذتیت نہیں بلکہ جمال ہے۔ یہ کسک کتنی شدید ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ جس حسن نے یہ کسک پیدا کی ہے وہ کتنا قابل پرستش ہوگا۔ جوش کے کلام میں اس جمال کی جھلکیاں ہیں لیکن ان کا کلام سنگار رس کا کلام نہیں جیسا کہ "روپ" کی رباعیاں ہیں۔

جوش کے یہاں حسن سے زیادہ اہمیت اس عشق کو دی گئی ہے جو حسن کی ذات سے ہے، اور یہاں وہ اپنے ہیرو خود بنے ہیں۔ اُن کی محبت غالب کی محبت کی طرح ہے جو مار کر رکھ دیتی ہے۔ لیکن غالب کی محبت میں جو کائناتی شعور اور ژرف بینی تھی وہ جوش کے یہاں نہیں ہے — اور نہ محبت کے وہ سوانگ ہیں جو غالب کی غزلوں میں رچے ہوئے ہیں، یہ محبت ایک سادہ کار انسان مرد کی محبت ہے۔ اس میں حوصلہ، امنگ اور مردانگی ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس امنگ کا سنگ و آہن کی طرح گراں ہونا عیب معلوم ہونے لگتا ہے۔ پچھلے پانچ چھ سال کے کلام میں سپاٹ پن کی جو ملائم سی بکھیر جوش کے یہاں ملتی ہے وہ اپنے ماہ و سال کی رفتار سے ہے۔ اس بات سے ہے کہ "ہو گئے مضمحل قویٰ غالبؔ" اس کی سب سے اچھی مثال ان کی نظم "ژالہ باریاں" ہے جس کے چند شعر سنتے چلیے ؎

کل تک یہ جشن تھے کہ مرے در پہ رات کو
رکتی تھیں گیسوؤں سے مہکتی سواریاں
اور یہ بھی دھن تھی کہ مرے اشتیاق میں
آتی تھیں بیاہیوں سے زیادہ کنواریاں
دیتا تھا قرض ماہ رخوں کو سرور شعر
اور اس کی آڑ میں تھیں بڑی سود خواریاں
اب بے دلی کے دشت میں بنتا ہوں عارضی
کل تتلیوں کے رنگ میں چنتا تھا دھاریاں
سب سے زیادہ خوف ہے اس بات کا مجھے
دم توڑ دیں کہیں نہ مری وضع داریاں

مجھ کو بھی ایک روز بالآخر ڈبو نہ دیں
مجھ سے شفیقہ شبیر کی یہ غم گساریاں

(ژالہ باریاں)

اِسی خیال کو وہ بار بار دہراتے ہیں، کبھی نظموں میں، کبھی رباعیوں میں، کبھی مثنویوں میں۔ رباعیوں میں جوش نے ایک ہی خیال پر مسلسل رباعیاں لکھی ہیں۔ اور ہیرے کے ہر رُخ کو چمکایا ہے۔ بنیادی تصور یہی ہے کہ جوانی کا کس نکل جانے کے بعد چونکہ محبت میں حدت نہیں رہ جاتی اس لئے زندگی موت سے سرد تر بن جاتی ہے ۔

کب راکھ پہ گرتے ہیں زمانے والے
شعلوں سے ہیں لاکھ لو لگانے والے
بوڑھا ہو کر وفات پاتا ہے جو عشق
ملتے نہیں اس کی لاش اٹھانے والے

ایک خیال کو مسلسل اور طرح طرح نظم کر سکنے کی قوت نے جوش کے مجموعوں کی تعداد میں تو اضافہ کر دیا لیکن بنیادی مضمون بیشتر ایک ہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں کوئی موضوع نیا نہیں ہے لیکن جوش کے عام موضوعات وہ تھے جو اس سے قبل سیکڑوں نظموں اور ادبیات کے عام موضوعات بن چکے تھے۔ قاآنی کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے۔ جوش نے بھی مناظرِ قدرت، مناظرِ کوہ، دریا، پہاڑ، چشموں، گھٹاؤں اور ساونوں کا تذکرہ اسی ٹھاٹ سے کیا ہے جیسا کہ

"نسیم خلدمی وزد مگر ز جوئبارہا"

میں ہے۔ اُن کی نظم:

"بادل اٹھے ہیں دل کے دل"

اسی طرح گوبجتی، برستی، آگے بڑھتی ہے۔ جیسے دربار کے عام قصیدے ہوا کرتے تھے۔ اس سے محض جوش کی قادر الکلامی کا نہیں بلکہ اس مخصوص ذہنی فضا کا پتہ چلتا ہے جس سے ان کے مزاج کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس مزاج پر لکھنؤ کی آب و ہوا کا اثر بھی ہے اور خاندانی نشو و نما کا بھی۔

اپنے "فلسفۂ زندگی" پر جو تقریر انہوں نے دہلی ریڈیو سے نشر کی تھی اُسے پڑھئے تو ہر چند اس میں انہوں نے اپنے خاندان، وراثت اور ماحول کا کہیں ذکر بھی نہیں کیا، لیکن اُس کے ایک ایک لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ جوش ملیح آبادی کی پشت پر شبیر حسن خاں بول رہے ہیں:

"ابھی ہمیں بڑے بڑے معرکے سر کرنا ہیں لیکن ..... ہمیں اپنے کو اس قدر تھکانا بھی نہیں ہے کہ چاروں کام کرنے کے بعد ہمارے قوائے عمل و ذہن اور ہماری صحت برباد ہو جائے۔ ہمیں بے شک ...... ایک جانباز سپاہی کی طرح پوری کاوش اور سرگرمی سے کام کرنا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہر روز چند گھنٹے رجائیوں کی سی زندگی بھی بسر کرنا ہے ...... دن کے وقت ہم ایڑی چوٹی کا پسینہ بہائیں گے، اور رات کو جب.......

ستاروں کی خنک روشنی ہمارا احاطہ کرے گی تو ہم بچوں کی طرح خوشیاں
منائیں گے"

اسی بات کو جو سات سال بعد جوش نے اس طرح نظم کیا ہے ؎

دن بہادر کا بان، بیر کا رتھ
رات چمپا کلی، انگوٹھی، نتھ

(پندنامہ برائے بیاں مجاز۔۔۔)

جوش موضوعات کی تنگی اور بیان کے ابلاغ کو کمزوری نہیں بلکہ ہنر جانتے ہیں، بلکہ ان کو نئی نسل سے شکوہ یہی ہے کہ یہ نسل :

شاعری میں بیان ہے سب کچھ

کی ڈاکٹرن (doctrine) کو غلط سمجھتی ہے۔ انگریزی شعراء میں بھی فلسفہ پوپ اور اس کے بعد بائرن کا تھا۔ بائرن کے یہاں بھی بیان ہی بیان ہے۔ لیکن بائرن نے کہیں کہیں عمیق بصیرت کی نشانیاں بھی دی ہیں، مثلاً دنیا کے متعلق اس کا یہی ایک مصرع،

Don Juan saw that
microcosm on stilts

جوش کے یہاں بھی اس بصیرت کا امکان تھا، اگر وہ خدا اور مولوی کے جھگڑے میں نہ پڑ گئے ہوتے۔ یا اگر ان کے یہاں ذاتی عمل کم از کم اتنا بھی ہوتا جتنا بائرن نے یونان کے بارے میں دکھایا تھا۔ جلال وجمال، رحم و انصاف، عدل و معدلت، عصمت و رحمت، ہر موضوع پر انہوں نے ایک طرف "خدا" کو اور ایک طرف "شبیر حسن خاں" کو مقابلے میں کھڑا کر دیا ہے ؎

دارائے دو عالم کو نہیں فرصتِ رحمت
شبیر حسن خاں کو یہ معلوم نہیں ہے

(ذلالعلی)

میں جوش کی ذات کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں، اس کا ذکر کسی اسکیچ میں کروں گا۔ یہاں یہ بات ضمناً یوں آگئی ہے کہ جوش نے ناقد سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ ؎

وہ داغِ سینۂ شاعر کو دیکھ سکتے کاش
جو لوگ شعر کے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

(غزل سنہ ۱۹۲۵ء)

اس فلسفے کا نتیجہ ظاہر ہے۔ جس طرح بائرن تمام انگریزی رومانی شاعری سے علیحدہ اور تنہا رہ گئے تھے اسی طرح جوش یکایک نئی نسل سے علیحدہ ہو کر تنہا رہ گئے۔

جوش کے یہاں بیان کی وسعت اور ایک طرز کے مضمون کو سو رنگ سے بندھا ہوا دیکھ کر اکثر لوگ خیال کرتے

ہیں کہ جوش اپنی قادر الکلامی کی وجہ سے جس رفتار سے لکھنا چاہتے ہیں لکھتے ہیں، اور الفاظ ان کے آگے سر بہ کف رہتے ہیں۔ یہ بات نہ صرف یہ کہ جوش کے لئے درست نہیں بلکہ کسی شاعر کے لئے بھی درست نہیں ہو سکتی۔ جوش اپنے اشعار کو نکھارنے اور سنوارنے، اور ایک ایک لفظ کی پرکھ پر ویسی ہی محنت کرتے ہیں جیسی فرانسیسی ناول نگار فلابیئر کے بارے میں مشہور ہے۔

مثلاً یہ رباعی ؎

اپنے میں جو تنویر نہیں پاتے ہیں
احباب کی روشنی کو سنولاتے ہیں
خود اپنی نگاہوں میں جو ہوتے ہیں ذلیل
دیکھا ہے کہ غیبت پہ اتر آتے ہیں

مسودے کے ایک صفحے کا عکس ملاحظہ ہو:

جن کے نزدیک سرخوشی ہے لاخون
بھاتی ہے انہیں نفس کشی کی بھون
یہ سوختہ سرگرم نگہ لیب بھڑنے میں بھول
کھا جاتے لگے وہ میں ناک سے خون

———

اپنے میں سو دل کشی نہیں پاتے ہیں
اپنے میں جو روشنی نہیں پاتے ہیں
اپنے میں جو تنویر نہیں پاتے ہیں
احباب کے چہروں احباب کی روشنی کو سنولاتے ہیں
خود اپنی نگاہوں میں جو ہوتے ہیں ذلیل
دیکھا ہے کہ غیبت پہ اتر آتے ہیں

اس میں صرف لفظ "تنویر" کی تلاش میں انہوں نے کتنی محنت کی ہے [illegible] جن لوگوں نے ان کے مسودے دیکھے ہیں، ان کی نظر سے اکثر ایک ایک مصرعے کے کئی کئی متبادل [illegible] گزرے ہوں گے۔ جن کو جوش نے وقت صرف کرکے بڑی محنت سے ڈکشنری میں سے تلاش کیا ہے۔ بقول فلابیئر انگریزی میں ایک معنی کے لئے صرف ایک ہی لفظ ہوتا ہے۔ اور ان تمام الفاظ کی فہرست میں سے جوش کی نظر بھی اسی ایک لفظ کو ڈھونڈتی ہے۔

انگریزی میں کلمہ تعریف کے استعمال کا ایک بہتر بہدف طریقہ ہے۔ مثال کے طور پر اگر اردو میں آپ "سفید" رنگ کے لئے دوسرے الفاظ تلاش کریں تو یقین ہے الفاظ کے لیے لغت خاموش ہو جائے گی۔ انگریزی میں اس ایک رنگ کے برعکس کو مماثلت کے ساتھ پیش کرنا چاہئے تو سیکڑوں الفاظ نکل آئیں گے۔ مثلاً 'snow - white'

[illegible] — [illegible] وغیرہ وغیرہ۔ جوش نے انگریزی کے اس نسخے کو اردو میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش محض "رنگوں" کے لئے محدود نہیں، بلکہ جذبے کی مختلف کیفیتوں کا آئینہ دار ہے۔ مثلاً ع

جولیس سیزر کی خوں آلودہ حیرت کی قسم

اور کوائف ذہن میں خود رحمیاں

مجاز مرحوم کی طبیعت کو وہ "آب صفت" کہا کرتے تھے۔ اور تشریح اس کی یہ تھی کہ اگر پانی میں آپ چھری ڈالئے تو پانی فوراً جگہ دے دیتا ہے لیکن چھری ہٹاتے ہی پھر ویسے کا ویسا ہو جاتا ہے۔ مجاز کو کثرت شراب کی ممانعت کرتے رہئے تو چپ بیٹھے رہتے ہیں اور سنے جاتے ہیں، اور جہاں نصیحت ختم ہوئی وہ فوراً میخانے کا رخ کرتے ہیں

ایک ماحول کی بھرپور عکاسی کے لئے وہ، کثرت سے یہ بھی کرتے ہیں کہ اس منظر سے متعلق جتنے احساسات ہیں انہیں ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں۔

ناقوس، گلے، بلیے، تماشے، جلوس، اذاں
بنوٹ، گتکا، پینترے، بانا، تبر، نشاں
ملاحیاں، جھکاتیاں، آوازے، اوکھیاں

غل شور، دھینگا مشتیاں، لٹھ، بونگا، مار دھاڑ
گلیاؤ، الام کاف، دھما چوکڑی، لتاڑ
پتھراؤ، داؤں پیچ، اچھل کود، دھر پچھاڑ

(وقت کی آواز)

مروجہ زبان، علاقائی زبان، اور روزمرہ سے وہ بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے کلام میں Dialect بھی ہے اور [illegible] بھی۔ عورتوں کی بول چال پر بھی انہیں ویسی ہی مہارت ہے جیسی مردانے پر ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ خود ان کا گرد و پیش ان کے بچپن کے لکھنؤ کا ماحول ہے لیکن اس میں ساتھ ہی ساتھ ان کا ریاض اور ناقابل یقین مشقت بھی شامل ہے۔

جس طرح ہماری زندگی سے یہ مشقت علیحدہ ہوتی جا رہی ہے
اسی طرح ہماری شاعری سے بھی۔ جدید تیز رفتاری کے سیاق و
سباق میں ممکن ہے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے لیکن
ہماری روایتی تہذیب کی کڑیاں اسی طرح ایک دوسرے سے ٹوٹتی
جا رہی ہیں۔

جوش صاحب واحد شاعر ہیں جنہوں نے اب تک اس زنجیر کو وابستہ و پیوستہ رکھا ہے اور ہماری نسل میں دوسرا کوئی شاعر نہیں جو اس خانہ زنجیر کو بکھرا ہونے سے بچا سکے۔

فضیل جعفری

جوش بحیثیت تخلیقی نثر نگار

جوش ملیح آبادی کے شارحین و ناقدین ہمیشہ ان کی شاعرانہ عظمتوں کو ہی معرض بحث میں لاتے ہیں، اور ان کے فلسفیانہ و نثری ادب پاروں کو حدودِ بحث و تنقید سے خارج سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے پڑھے لکھے لوگ بھی آج تک اس حقیقت سے ناآشنا ہیں کہ جوش صاحب نثر میں بھی ایک مخصوص فلسفیانہ اور منفرد طرزِ تحریر کے مالک ہیں۔ انہوں نے مختلف ادبی، سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی مسائل سے متعلق موضوعات پر اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے۔ مثال کے طور پر الفاظ کی بحث لے لیجئے۔

عوام 'الفاظ' کو روشنائی کی سیدھی ٹیڑھی لکیروں اور بے جان خاکوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ واٹسن، ویلز، ہکسلے، ابوالعباد مکی، اور انشا اللہ خاں انشا جیسے ملکی و غیر ملکی مفکرینِ ادب نے اپنے اپنے ڈھنگ سے الفاظ اور ادبا و شعرا سے الفاظ کے تعلق کی بابت بحثیں کی ہیں۔ لیکن اس موضوع پر جوش نے جس انداز سے اظہارِ خیال کیا ہے وہ دوسروں کی بہ نسبت کہیں زیادہ دلچسپ، اچھوتا اور نیا پن لئے ہوئے ہے۔ وہ الفاظ کو بے جان لکیریں نہیں، بلکہ انسانوں کے مانند ذی حیات اور ذی روح سمجھتے ہیں۔ الفاظ بھی انسان کی طرح پیدا ہوتے جیتے اور مرتے ہیں، بیمار پڑتے اور تندرست ہوتے ہیں۔ بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ یہ بھی دوسرے جانداروں کی طرح اپنے اپنے خاص مزاج عادات، رسوم، روایات اور تاریخی واقعات رکھتے ہیں۔ الفاظ کی دنیا میں بھی ذات پات اور مذہب و معاشرت کا رواج ہے۔ ان میں بھی مختلف خاندان، نسلیں اور شجرے ہوتے ہیں، یہ بھی انسانوں کی طرح نیک نام اور بدنام ہوتے ہیں۔ پاک اور ناپاک ہوتے ہیں۔ بہادر اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔ مہذب اور جاہل ہوتے ہیں۔

ابوالعباد مکی نے 'الفاظ' کو 'محبوبہ ہرجائی' اور 'عشوہ انداماں بازاری' جیسے القاب عطا کئے ہیں۔ لیکن جوش کا نظریہ اس سے قطعی مختلف ہے۔ ان کے نزدیک الفاظ میں غرور کی حدود تک پہنچ جانے والی شرم و حیا پائی جاتی ہے۔ یہ کسی سے بھی جلد بے تکلف نہیں ہوتے۔ جب تک برسوں ان سے میل جول نہ رکھا جائے۔ یہ کسی کو اپنے مزاج کی افتاد اور اپنے اسرار و رموز سے آگاہ نہیں کرتے۔

جوش کا خیال ہے کہ انسانوں کے بے شمار طبقوں میں سے صرف ادیبوں اور شاعروں کے دو ایسے طبقے ہیں جن سے

الفاظ کی بے تکلفانہ رسم و راہ اور مخلصانہ دوستی ہوتی ہے۔ اور یہاں بھی جوش نے ایک نکتہ یہ پیدا کیا ہے کہ اگرچہ الفاظ ادیبوں سے کافی حد تک بے تکلف ہوتے ہیں، لیکن بعض نازک مزاج، اسرار پسند اور ذرا پردہ دار اونچے گھرانوں کے الفاظ ان سے کھل کھیلنا اور غلط ملط رکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ ادیبوں کے سامنے اگر آتے بھی ہیں تو ان کا فرادا مستِ شباب شوخ و شنگ لڑکیوں کی طرح جو دور سے تو خوب لگاوٹ دکھاتی ہیں، لیکن جیسے ہی ان کا دامن پکڑنے کے لئے لپکو، انگلیاں چٹخاتی، ادائیں دکھاتی، اور ہنستی گاتی اُلٹے پاؤں بھاگ جاتی ہیں۔ لیکن شاعروں کے ساتھ ان الفاظ کا تعلق بہت ہی گہرا اور گھریلو ہوتا ہے۔ شاعر ان سے اس حد تک بے تکلف ہوتے ہیں کہ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں انہیں چھیڑیں، گدگدائیں، ان کے لباس تبدیل کردیں، اُن کی لے اور رنگ بدل دیں، ان کے مفہوم میں اتار چڑھاؤ اور تنگی یا وسعت پیدا کر دیں، اور ان کے خدوخال کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیں۔

جوش صاحب کے الفاظ میں، "شاعر سے ان کے گھروں کی عورتیں بلکہ کنواریاں تک پردہ نہیں کرتیں۔ وہ جب چاہے دوپہر ہو یا آدھی رات، ان کے گھروں اور خوابگاہوں میں آجا سکتا ہے"

مندرجہ بالا سطور میں الفاظ کے تعلق سے یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ انسانوں کی طرح ان میں بھی مختلف رنگ و نسل، ذات پات، مزاج اور مذہب کا وجود ہوتا ہے۔ لیکن شاعر کی بارگاہ میں پہونچ کر یہ الفاظ ہر قسم کی آپسی تفریق کو بھول جاتے ہیں یہاں وہ سب ایک ہی تھالی میں کھاتے، ایک ہی کوزے میں پیتے، اور ایک ہی سطح میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے لمحات میں جب کہ شاعر پر وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے، اور اس کے احساسات انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ تو الفاظ کی ٹولیوں کی ٹولیاں جن میں بوڑھے، جوان، لڑکے اور لڑکیاں سبھی ہوتے ہیں، جھولے کے دوش پر آتے ہیں، اور شاعر کے سازِ تخیل کی تھاپ پر جی کھول کر رقص کرتے اور اس کی روح کو مسرور کرتے ہیں۔

الفاظ کے بعد شعر و ادب کی باری آتی ہے، شاعری کیا ہے؟ یہ ایک انتہائی پیچیدہ طویل اور متنازعہ مسئلہ ہے۔ اس موضوع پر دنیا کی مختلف زبانوں کے مختلف مدرسہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے دانش وروں نے مختلف انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

افلاطون موجودات کو عالمِ مثال کی نقل اور شاعری کو اس نقل کی نقل گردانتے ہوئے اسے مطلق حقیقت کے ادراک کے راستے کی اہم رکاوٹ سمجھتا ہے۔ اور شاعری کو فریب کاری اور جذباتی عیاشی کے مترادف قرار دیتا ہے

رسکن شاعری کو اخلاق باختگی کا نمونہ تصور نہیں کرتا۔ بلکہ اسے ایک نہایت اخلاق آموز اور اخلاق آمیز شئے سمجھتا ہے۔

پیٹرو واگے شاعری کو جذبات کی زیادتی اور اس کے ابال سے پیدا ہونے والا فاسد مادہ کہتا ہے اور علامہ اقبال و مولانائے روم اسے پیغمبری کا درجہ عطا کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ہر صاحبِ عقل و نظر نے اپنے اپنے تجربات اور ذہنی اپج کے مطابق شاعری کی تفسیر بیان کی ہے۔ اس موضوع پر جوش نے بھی قلم اٹھایا ہے اور عظیم المرتبت شاعر ہونے کے ناطے وہ شاعری کی روح کی گہرائیوں میں اترتے چلے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے جس فلسفیانہ انداز میں بحث کی ہے اور جو نکات نکالے ہیں وہ یقیناً منفرد ہیں۔

شاعری کے متعلق ان کا خیال ہے کہ زندگی میں آئے دن انسان کے ذہن، دماغ، اور دل پر جو اثرات پڑا کرتے ہیں وہ شعوری و غیر شعوری طور پر انسان کے اقوال، افکار اور افعال کو مختلف سانچوں میں ضرورت کے مطابق ڈھالتے رہتے ہیں

لیکن جب یہی اثرات کسی شاعر کے قلب پر پہنچتے ہیں تو ان کی کیفیت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ ہر وہ اثر جو شاعر کا دل قبول کرتا ہے اس کے دل و دماغ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جنبش کرنے لگتا ہے اور اس کے خون میں شامل ہو کر ہر بُنِ مُو میں سرایت کر جاتا ہے۔ اور اس وقت تک تڑپتا اور مچلتا رہتا ہے جب تک کہ وہ مناسب الفاظ اور موزوں بحر میں شعر بن کر شاعر کے قلم سے ٹپک نہیں پڑتا۔

جوش کے نظریہ کے مطابق شاعری آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ داخلی جذبات کی ترجمان بھی ہے اور خارجی عناصر کی نمائندہ بھی۔ غرض کہ مجموعی طور پر ان کے نزدیک شاعری حیات کی مصوری اور زمانے کی تاریخ نویسی دونوں ہے۔ اسی طرح ان کی نگاہوں میں حقیقی شاعر وہ ہے جو کائنات کے ہر ذرے، حیات کے ہر تیور، حواس و ماورائے حواس کے ہر پہلو، احساسات کے ہر رُخ اور جذبات کی ہر ادا کا مطالعہ کرتا ہے، اس سے متاثر ہوتا ہے اور ان تاثرات کو موزوں ترین جامۂ الفاظ پہنانے کی پوری صلاحیت و قدرت رکھتا ہے۔

اکثر اہلِ فکر و نظر نے اس بات پر بے جا زور دیا ہے کہ شاعر اور ادیب کو اپنی فطرت اور پسند کے لحاظ سے کسی ایک بڑے موضوع کا انتخاب کر لینا چاہئے۔ اور پھر اسی موضوع کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کے لئے کوشش کرتے رہنا چاہئے لیکن جوش کا فلسفہ دوسروں سے مختلف ہے۔ انہوں نے مختلف طریقوں سے یہ بات واضح کی ہے اور کہا ہے کہ شاعر یا ادیب کسی ایک موضوع، کسی ایک مقصد، کسی ایک تعلیم، کسی ایک فلسفے یا حیات کے کسی ایک رُخ کے اندر قید ہو کر نہیں رہ سکتا۔ وہ ہر آن نئی وادیوں کی سیر کیا کرتا ہے۔ وہ تو ہواؤں کی طرح آوارہ، ابر کی طرح بے پروا خرام، تصورات کی طرح بے قید و بند اور ایتھر کی طرح آزاد ہوتا ہے۔

جوش کا عقیدہ ہے کہ شاعر و ادیب ایک منزل پر نہ ٹھیرنے کے لئے مجبور ہیں۔ کیونکہ ان کے ذمے ہزاروں انواع و اقسام کے فرائض ہوتے ہیں۔ وہ کبھی سورج بن کر ساری دنیا کو روشنی پہنچاتے ہیں اور کبھی چاند بن کر کائنات کو ایک نرم ٹھنڈک سے ہم آغوش کرتے ہیں۔

ادب اور مقصدیت کی بحث بھی بہت پرانی ہے۔ اور اب تک مختلف صورتوں میں استعمال ہوتی ہے۔ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ تھا کہ وہ ادب کو مقصد بالذات سمجھتا رہا ہے۔ ایسے مفکروں میں وکٹر کزن، گاٹئیر، ریناں، والٹر پیٹر، ظہیری، ناسخ اور حکیم مومن خاں مومن وغیرہ پیش پیش ہیں۔

اس کے برخلاف مفکرین کا ایک گروہ اب بھی ہے جو ادب کو مختلف اقسام کے مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ جوش ادب کو انواع و اقسام کے انقلابات لانے کا زبردست ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ادب رسوم، نظریات، معتقدات، اصلاحات، کلیات، ادبیات، سیاسیات، غرض کہ ہر میدان میں اپنا انقلاب لانے کا ضامن بن سکتا ہے۔

جوش کا ایمان ہے کہ:

"ایک صحیح جنبشِ قلم سینکڑوں ہزار چست تلواروں میں
کے مقابلے میں زیادہ کارآمد آلۂ جنگ ہے"

جوش نے جنبشِ قلم کے صحیح ہونے پر زیادہ زور دیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک انقلاب لانے والا ادب وہ نہیں ہے جو اکثر و بیشتر اردو میں پایا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

والا بزدل ادب،

رات بھر لاشہ پڑا رکھا مسیحا نے مرا

کا کفن فروش ادب،

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

کا کاہل ادب،

ایسے میں کوئی مجسم سے جو آجائے تو کیا ہو

کا سوفیانہ بول چال والا ادب،

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے

کا زبوں ہمت ادب،

ہمت سہی کیجئے تو مر رہیے میسر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور رہے

کا فنائی ناچاریوں والا ادب زندگی کے کسی شعبے میں انقلاب لانا تو کیا، انقلاب لانے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ وہ شاعری یا وہ ادب جس کی بیڑیاں زنداں کی زنجیروں سے کھڑ کھڑ کر نکالی جاتی ہوں، جو حقیقی حسن و عشق کی باشنی سے بیگانہ ہو، جو زندگی، اور اس کے تمام بے شمار پہلوؤں کے معانی اور اس عظیم انسان کو اس کے مشاہدے سے قاصر ہو جس کے آشیاں پر کئی دن بجلیاں گرا کرتی ہوں۔ ایسا فاقوں کا مارا، اونگھتا، بلبلاتا، تھرتھراتا، گڑگڑاتا، روتا، پیٹتا، چیختا، چلاتا، سسکتا، بسورتا، بیٹھتا، اور لنگڑاتا ہوا ادب انسانی زندگی میں کسی بھی طرح کا تعمیری انقلاب لانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ انقلاب وہ ادب لا سکتا ہے جس کے اندر شعلہ فشاں زندگی، آگ اور بجلی سے کھیلنے والی زندگی، گرجتی، گونجتی، ہر قدم پر مچلتی اور ابھرتی ہوئی سرخ خون والی زندگی موجود ہو۔ ایسا ادب تخلیق کرنے کے لئے ہمیں پہلے اپنے ذہنوں میں انقلاب لانا پڑے گا۔ اور ماضی پرستی سے خود کو چھڑانا ہو گا۔ کیوں کہ جوش کے خیال میں ماضی کا ادب اور خصوصاً اردو ادب کمزور ہے، جعلی ہے، مقلد ہے، غیر فطری ہے، بے روح ہے، مدقوق کی طرح زرد، مبروص کی طرح داغ دار، مفلوج کی طرح اپاہج، اور سڑی ہوئی لاش کی طرح متعفن ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ماضی کے ادب کے بارے میں جوش صاحب کے ان خیالات سے متفق نہ ہوں، اور ممکن ہے اس میں کچھ مبالغے کی جھلکیاں ملیں۔ لیکن ایمان کی بات تو یہی ہے کہ ہمیں اپنے ادب کو زندگی کے حقائق سے قریب تر کرنا ہو گا۔ اسے تلخیٔ گردشِ ایام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کے قابل بنانا ہو گا۔ ادب کو حقیقت شناس اور رازِ حیات سے آگاہ ہونا پڑے گا اور اسی وقت ادب اس قابل ہو سکے گا کہ وہ زندگی میں انقلاب لا سکے۔

مندرجہ بالا فلسفیانہ مباحث سے قارئین نے یہ سمجھ لیا ہو گا کہ جوش کے فکری نظریات روایات سے زیادہ حقائق سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہر جگہ جبلت اور وجدان کے مقابلے میں عقل پر زیادہ زور دیا ہے۔

جوش نے اپنے مختلف مضامین میں روزمرہ کی زندگی میں جذبات سے زیادہ عقل کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ زندگی کے تمام قابلِ توجہ عظیم اور اہم مسائل میں ڈھلے ڈھلائے اصولوں کے انبادوں سے الگ ہٹ کر اور زمانۂ ماضی میں

آباؤ اجداد کی قائم کردہ روایات نظر انداز کر کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ہر انسان کو عقل سے کام لے کر اشیاء کا جائزہ لینا اور ان کے متعلق فیصلہ کرنا چاہیئے۔

جوش کا نظریہ ہے کہ "اچھے اور بڑے لوگ وہ ہیں جو اپنے عہد کی نبض دیکھنا، اور اپنے عصر کے قلب کی ضربیں شمار کرنا جانتے ہیں:"

"وہ کہتے ہیں کہ جب تک انسانی دماغوں پر تقلید و اوہام کی برف جمی ہوئی ہے اور ذہنی فضا میں بوسیدہ روایات کا غلیظ دھواں گھٹا ہوا ہے، اور انسانی نفوس کے گرد قدامت پرستی کی کائی سے ڈھکی ہوئی سر بفلک دیواریں کھڑی ہیں، انسان ترقی نہیں کر سکتا:"

عقل کے متعلق بحث کرتے ہوئے ایک مضمون میں جوش ایشیائی اقوام کو یوں مخاطب کرتے ہیں "یاد رکھو جب تک کسی قوم یا جماعت کی عقل کھلی ہوئی فضا میں سانس نہیں لے سکتی، اس وقت تک اس کے سر پر زندگی کا آفتاب نہیں چمک سکتا" اسی مضمون میں آگے چل کر وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"جب کسی قوم کے برے دن آتے ہیں تو وہ عقل کی باتوں پر عمل کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ اور جب قدرت کو یہ منظور ہوتا ہے کہ کوئی جماعت حد سے بدتر ہو جائے تو اس کے افراد کی ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ عقل کی باتوں پر عمل کرنا تو کجا عقل کی باتوں سے دور بھاگنے لگتے ہیں:"

جوش نے "نشہ اور بنی نوع انسان" جیسے اہم سماجی مسئلے پر بھی نہایت ہی فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے، اور ہمارے سامنے بالکل نئے اور انوکھے نظریے پیش کئے ہیں۔ ہمارے سماج میں لفظ "نشہ" برا سمجھا جاتا ہے۔ اخلاقی اور مذہبی کتب میں نشہ آور اشیاء سے پرہیز کرنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ لیکن جوش نشے کو اس درجہ ناگزیر شے بتاتے ہیں کہ انسان اس کے بغیر جی ہی نہیں سکتا ——— جوش کا خیال ہے کہ نشہ ہر اس کیفیت کو کہتے ہیں جو خون کی رفتار کو تیز کر کے جذبات میں ایک گرمی اور ابھار پیدا کر دے۔ اور سنجیدگی و بے کیفی کو سرور و نشاط کے سانچے میں ڈھال دے۔

ان کا خیال ہے کہ صرف شراب، افیون، گانجہ وغیرہ ہی نشے سے منسوب نہیں کئے جا سکتے بلکہ نظر غائر سے دیکھنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے ذرے ذرے پر نشے کی مہریں ثبت ہیں۔ حقہ، سگریٹ، سگار، تمباکو، پان، چائے، قہوہ، فنون لطیفہ، کھیل کود، سیر و سفر، پھولوں کی خوشبو، ہوا کی سنسناہٹ، مہر و ماہ کی تابندگی، تصورات کی سرخوشی، حسین شکلوں اور منظروں کا نظارہ، بچوں کو پیار کرنا، بچھڑے ہوؤں سے ہم آغوش ہونا، اپنی تعریف سن کر مسرت محسوس کرنا، پرانے قصوں کو دہرانا اور دلچسپ حکایات سننا، غرض کہ وہ کون سی ایسی شے ہے جس میں نشہ نہیں پایا جاتا؟

جوش کا خیال ہے کہ نوع انسان کو زندگی کی ہر منزل اور ہر قدم پر نشے کی شدید ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ وہ دنیا میں کسی نہ کسی نشے کا ایسا خوگر ہوتا ہے کہ اس کے بغیر اس کا جینا محال ہے۔ جوش نے اپنے فلسفیانہ انداز میں یہ ثابت کیا ہے کہ انسان ازلی شرابی اور ابدی قدح خوار واقع ہوا ہے، اور نشہ ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جسے اپنا کر حیات انسانی کا ٹوٹا ہوا سفینہ حوادث کے ہولناک طوفانی سمندروں میں سرشاری و مستی کے ساتھ کھیتا ہوا ساحل مراد تک پہنچ جاتا ہے۔
جوش نے بحیثیت مجموعی نشے کو ایک ایسی خنک چھاؤں سے تعبیر کیا ہے جہاں پہنچ کر درماندہ انسانیت بھی نیند سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ جوش کے یہ نظریات فلسفیانہ، انوکھے، اور دلچسپ ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن دنیا کے بیشتر پڑھے لکھے اور صاحب فہم لوگوں کے لئے یہ نظریات حد درجہ تشویش ناک اور ناقابل قبول ہیں۔ شراب، افیون، گانجہ، بھنگ وغیرہ مسکرات پر مذہبی، اخلاقی، اور حکومتی امتناع صرف اس لئے نہیں عائد کیا گیا کہ ان میں کسی طرح کا سرور ہوتا ہے بلکہ اس کے ظاہری عملی نتائج اور اس کے ذریعے لائی گئی عام تباہیوں و بربادیوں کی وجہ سے امتناع عائد ہوتا ہے۔ جوش کے خیالات کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ چونکہ وہ خود شراب کے عادی رہے ہیں اور انہیں نہ صرف یہ معلوم تھا کہ سماج ان کی اس عادت کو برا سمجھتا ہے۔ بلکہ خود ان کا ضمیر بھی یقیناً انہیں کچوکے دیتا رہا ہوگا۔ اس لئے انہوں نے ان خیالات کے ذریعے اپنے آپ کو مطمئن کرنے اور اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ بچوں کو پیار کرنے یا حسین شکلوں اور نظروں کا نظارہ کرنے سے انسان کو جو سرور ملتا ہے، وہ روح میں پالیدگی، اور تازگی پیدا کرتا ہے۔ برخلاف اس کے شراب یا افیون کے استعمال کے بعد انسان اپنا ذہنی توازن برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اور ذہنی توازن بگڑ جانے کی صورت میں اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی عقل سلیم سے اسی طرح کام لے سکتا ہے جیسے ایک عام آدمی ان مسکرات کا استعمال کئے بغیر لیتا ہے۔

جوش کا خود عقیدہ ہے کہ انسان کو کسی بھی قدم اور کسی بھی موڑ پر عقل کا دامن نہ چھوڑنا چاہئے۔ اور جب یہ مسلّمہ مسئلہ ہے کہ شراب اور اسی قبیل کی دوسری سکر آگیں اشیاء انسانی ذہن کے توازن کو بگاڑ دیتی ہیں۔ تو نہ ہی ان کے جائز قرار دینے پر اصرار کرنا ٹھیک اور نہ ہی ان کا فنونِ لطیفہ وغیرہ سے تقابل کرنا درست ہے۔

جوش نے ان چند موضوعات کے علاوہ بھی بہت سارے اہم موضوعات پر اپنے مخصوص طرز میں بہت کچھ لکھا ہے۔ یہاں ان سب کا جائزہ لینا اور ان پر بحث کرنا ممکن نہیں ہے۔ امید ہے کہ اردو ادب کے ممتاز اور سربرآوردہ نقاد اس طرف ضرور متوجہ ہوں گے، اور جوش کے علمی، ادبی اور فلسفیانہ نثری افکار سے اردو داں طبقے کو زیادہ تفصیل سے روشناس کرائیں گے۔

جوش کا آہنگ شاعری (صفحہ ۵۷۰ سے آگے)

بہرحال اردو شاعری کو جوش نے جو سرمایہ عطا کیا ہے وہ زر خالص تو نہیں، لیکن اس میں سونے کے ذرات کی تابانی جگہ جگہ ملتی ہے۔ جوش کی شاعرانہ شخصیت کو ان کے دور کے تضادات نے منقسم شخصیت بنا دیا۔ اس لئے ان کے تخیلات میں شعلہ و شبنم دونوں کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔

جوش کی شاعری میں لفظوں کا چلتا جادو بعض اوقات ان کے مفہوم پر حاوی ہو جاتا ہے۔ لیکن لفظوں کے بھید دریافت کرنے کے لئے جوش کی شاعری کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ہماری معاشرت کے جن رنگوں کی ترجمان یہ شاعری ہے ان میں رنگوں سے تاریخ و تہذیب کے تحرک کی آراستگی ہوئی ہے۔ ان رنگوں کی آبیاری میں بیرونی تحریکات اور بین الاقوامی

تک جب عالمگیر انسانی تہذیب کی بنیادیں استوار ہوں گی تو جوش کی شاعری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا کیونکہ اس نے اردو شاعری کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا ہے۔

نریش کمار شاد

جوش صاحب کی اصلاحیں

اکتوبر سنہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔

میں ماہنامہ "آج کل" کے دفتر اولڈ سیکریٹریٹ دہلی میں اپنے مجموعۂ کلام "آہٹیں" کا مسودہ لے کر حضرت جوش ملیح آبادی کی خدمت میں پہنچا، اور التماس کی کہ وہ اس کے متعلق اظہارِ خیال فرمائیں، اور ساتھ ہی تاکید بھی کر دی کہ کتاب کی کتابت چونکہ ہو چکی ہے، اس لئے وہ اپنی پہلی فرصت میں توجہ کریں۔ جوش صاحب نے اپنی روایتی وضع داری اور خصوصی مروت سے کام لیتے ہوئے — "جی ہاں" "جی ہاں" — کہہ کر اثبات میں سر ہلایا، اور مسودہ مجھ سے لے کر اپنے میز کی دراز میں رکھ دیا۔

میں نے سوچا تھا کہ اس سلسلے میں یاد دہانی کے لئے کم از کم ایک بار پھر جوش صاحب کے پاس جانا پڑے گا، لیکن تیسرے ہی دن انہوں نے خود مجھے اپنے دفتر میں بلا بھیجا، اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میز کی دراز سے مسودہ نکال کر میرے حوالے کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

"تمہارا مجموعہ میں نے شروع سے آخر تک پڑھ لیا ہے۔ بلاشبہ تم خوب لکھتے ہو، اور جو کچھ محسوس کرتے ہو حرف بحرف وہی لکھ دیتے ہو۔"

اتنا کہہ کر پنسل سے لکھے ہوئے مختصر سے پیش لفظ کو بھی میری طرف بڑھا دیا، اور اس سے پہلے کہ میں شکریہ ادا کرنے کے لئے کچھ کہوں، کہنے لگے:

"تمہاری شاعری کے متعلق میں نے اپنی رائے تو لکھ دی ہے لیکن تمہارے چند شعروں میں کہیں کہیں ترمیم بھی کر دی ہے۔ یہ ترامیم اگر تمہیں واقعی مناسب معلوم ہوں تو اپنا لینا۔"

میں خوب کہتا ہوں یا نہیں، لیکن جوش صاحب نے میرے کلام کی داد نہایت خوب الفاظ میں دی تھی۔ اس حوصلہ افزا تحسین کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"نریش کمار شاد کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دل نے بری طرح چوٹ کھائی ہے جس میں صرف محبت ہی نہیں اس مکروہ نظامِ سرمایہ داری کو بھی بڑا دخل ہے۔ اور نریش کمار شاد کے معاشقے کی یہ بڑی جوان بختی ہے کہ ان پر غمِ جاناں و غمِ دوراں دونوں نے سازش کر کے ایسا بھرپور وار کیا کہ ان کی شاعری کے تمام تار وقت سے پہلے ہی بڑی شدت کے ساتھ جھن جھنا اٹھے۔"

چند دن جب میں نے جوش صاحب کی اصلاحوں پر غور کیا تو محسوس کیا کہ ان کی ہر ترمیم کی تہ میں زبان و فن کی کوئی نہ کوئی رمز پوشیدہ ہے، اور قابلِ قدر بات یہ تھی کہ ایک لفظ کی ترمیم کرتے ہوئے بھی انہوں نے شعر کے نفسِ مضمون اور میرے بنیادی میلان پر ذرا سا حرف نہیں آنے دیا تھا۔ جوش صاحب کی بے پناہ قوتِ نظم، غیر معمولی فنی معلومات اور الفاظ کی مزاج دانی کا تو میں پہلے ہی سے معترف تھا لیکن اس وقت سے مجھے اس حقیقت کا بھی قائل ہونا پڑا کہ جوش صاحب ایک اعلیٰ پایہ کے سخن ور ہی نہیں مصلحِ سخن بھی ہیں۔ ممکن ہے میری اس بات کو محض جوش صاحب سے میری عقیدت پر محمول کیا جائے لیکن عقیدت کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی ہے۔ اور اس کے ثبوت کے لئے میں جوش صاحب کی ان اصلاحوں کی مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔

میرا شعر تھا ؎

جلوؤں کی کائنات میں تھی ساری کائنات
آگے بڑھا نہ تنگ نظر اپنی ذات سے

جوش صاحب نے داد کا نشان لگانے کے ساتھ ساتھ مصرعۂ اولیٰ میں "ساری" کی بجائے "جملہ" لکھ دیا۔ گویا ؎

جلوؤں کی کائنات میں تھی جملہ کائنات

"ساری" کی "ی" دب رہی تھی، اور اس خرابی کو دور کرنے کے لئے جوش صاحب کو یہاں "ساری" کا ہم معنی لفظ رکھنا پڑا۔ اردو لفظ کے کسی حرف کا دبنا جوش صاحب کی سماعت پر بہت گراں گزرتا ہے۔ اس سے ان کے ہم نشیں بخوبی واقف ہیں، اور ان کے ایک خاص الخاص ہم نوالہ و ہم پیالہ کے بقول جوش صاحب کی یہ نزاکت مرض کی حد تک پہونچی ہوئی ہے۔

میرا شعر تھا ؎

بارہا پردۂ مسرت میں
تیرے غم نے مجھے پکارا ہے

جوش صاحب نے پہلے مصرع میں صرف ایک لفظ "میں" کو "سے" میں تبدیل کر دیا۔

بارہا پردۂ مسرت سے

ظاہر ہے کہ اس مقام پر "میں" خلافِ روزمرہ اور اس کی بجائے "سے" فصیح اور با محاورہ ہے۔

میرا شعر تھا ؎

تیرے خرامِ ناز کی آئی ہے جب بھی یاد
چلنے لگیں ہوائیں چھلکنے لگی شراب

جوش صاحب نے دونوں مصرعوں میں معمولی سی ترمیم کے بعد شعر کو اس صورت میں تبدیل کر دیا ؎

تیرے خرامِ ناز کی جب یاد آ گئی
چلنے لگی نسیم چھلکنے لگی شراب

میرے پہلے مصرعے میں "آئی ہے" اور دوسرے مصرعے میں "چلنے لگیں" اور "چھلکنے لگی" یعنی افعال کا فرق تھا۔ ایک جگہ ماضی قریب اور دوسری جگہ ماضی مطلق۔ جوش صاحب نے اس سقم کو رفع کرنے کے ساتھ ساتھ مصرعۂ ثانی میں "ہوائیں" کی

جگہ "نسیم" کہہ کر شعر کی جمالیاتی اہمیت کو بھی چار چاند لگا دیئے۔ ویسے بھی "خرام ناز" کی رعایت سے "ہوائیں" کے مقابلے میں "نسیم" کا لفظ زیادہ مناسب اور موزوں معلوم ہوتا ہے۔

میرا شعر تھا ؎

دلِ تباہ نے سینچے تھے آنسوؤں سے جو داغ
تمہاری بزمِ طرب کے وہ بن گئے ہیں چراغ

جوش صاحب نے پہلے مصرعے میں "تباہ" کی بجائے "شکستہ" بنا دیا ؏

دلِ شکستہ نے سینچے تھے آنسوؤں سے جو داغ

"تباہ" کی بہ نسبت "شکستہ" آنسوؤں کی رعایت سے فی الواقع زیادہ برمحل ہے

میرا شعر تھا ؎

بھٹک سکے تو بھٹک جادۂ محبت میں
سفر ہو سہل تو پھر لطفِ جستجو کیا ہے

مصرعۂ اولیٰ میں "بھٹک" کی تکرار اصولِ فصاحت کے منافی تھی۔ جوش صاحب نے شعر کی معنویت کو برقرار رکھتے ہوئے پہلے مصرعے کو یوں تبدیل کر دیا۔ ؏

جو بن پڑے تو بھٹک جادۂ محبت میں

"جو بن پڑے" کا ٹکڑا رکھ دینے سے مضمون جتنا بامحاورہ اور فصیح ہو گیا اسے اہلِ نظر بخوبی محسوس کر سکتے تھے۔

اسی غزل میں میرا ایک اور شعر تھا ؎

نگاہ و دل میں اگر مستیِ شباب نہیں
یہ چاندرات، یہ پیمانہ و سبو کیا ہے

"چاندرات" کا ٹکڑا یہاں قریب القیاس اور محض تکلف معلوم ہوتا تھا۔ جوش صاحب نے اس تکلف کو دور کرنے کے لئے اس کی جگہ "رقص و رنگ" کے الفاظ رکھ دیئے۔ ؏

یہ رقص و رنگ، یہ پیمانہ و سبو کیا ہے

ایسا کرنے سے جوش صاحب نے صرف ایک نقص ہی کو دور نہیں کیا، بلکہ ایک ہی خاندان کے الفاظ خوش اسلوبی سے ایک جگہ جمع کر کے مصرعے کو بے تکلف اور پرکیف بھی بنا دیا۔

میرا شعر تھا ؎

چہروں کی روشنی ہوں دلوں کا غبار ہوں
آئینۂ نشاط و غمِ روزگار ہوں

جوش صاحب نے شعر میں صرف "چہروں" کو "آنکھوں" میں بدل کر شعریت کا چہرہ نکھار دیا۔ ؏

آنکھوں کی روشنی ہوں دلوں کا غبار ہوں

"روشنی" کا تعلق چہرے سے زیادہ آنکھوں سے ہے اور پھر "آئینے" کی رعایت سے بھی "آنکھ" کا لفظ کہیں زیادہ مناسب

معلوم ہوتا ہے۔ "چہروں کی روشنی" کہنے میں بھی اگرچہ کوئی قباحت نہیں۔ لیکن حسن "آنکھوں کی روشنی" کہنے ہی میں ہے۔

میرا شعر تھا ؎

دلوں کا سوز ہے میرے حسیں ترانوں میں
میں وہ شرار ہوں جس پہ ردائے شبنم ہے

جوش صاحب نے مصرعۂ اولیٰ میں یوں ترمیم فرمادی۔

جہانِ سوز ہے میرے خنک ترانوں میں

"دلوں کا سوز" کہنے کے بدلے "جہانِ سوز" کہنے سے معنوی طور پر شعر میں زیادہ وسعت پیدا ہوگئی۔ میرے مصرع میں "حسیں" محض بھرتی کا لفظ تھا۔ حشو قبیح نہ سہی حشو ملیح ضرور تھا۔ اسے "خنک" میں تبدیل کرکے جوش صاحب نے شعر میں لفظی مناسبت کا حسن بھی پیدا کردیا۔

میرا شعر تھا ؎

جب موج میں آتے ہیں شناور کے عزائم
طوفان کی موجوں سے ابھرتے ہیں کنارے

شعر میں "موج" کی تکرار اگر معیوب نہیں تو بے کیف ضرور تھی۔ جوش صاحب نے دوسرے مصرع کو ان الفاظ میں ڈھال کر۔

بپھرے ہوئے طوفاں سے ابھرتے ہیں کنارے

شعر کو پرکیف بھی بنا دیا اور مضمون میں شدت بھی پیدا کردی۔

میرا شعر تھا ؎

بے نواؤں کو میسر ہیں کہاں جام و سبو
بجلیاں چمکیں تو کیا ابر رواں آیا تو کیا

جوش صاحب نے دوسرے مصرع میں صرف اتنا تصرف کیا۔ ط

کوئلیں کوکیں تو کیا ابر رواں آیا تو کیا

یعنی "بجلیاں چمکیں" کی بجائے "کوئلیں کوکیں" لکھ دیا۔ اپنے مصرع میں بجلیوں اور ابر رواں کا ذکر میں نے طربیہ ماحول پیدا کرنے کی غرض سے کیا تھا۔ لیکن بجلیوں کا چمکنا طربیہ کیفیت کے اظہار کی علامت نہیں ہے۔ کم سے کم اردو کی غزلیہ شاعری کی روایات اس کے قطعی برعکس ہے۔ نیز مصرعۂ اولیٰ میں "بے نواؤں" سے لفظی مناسبت پیدا کرنے کے لئے بھی بجلیوں کے چمکنے کی نسبت "کوئلوں کا کوکنا" زیادہ دل کش معلوم ہوتا ہے۔

میرا شعر تھا ؎

حیات ہے کہ مسلسل سفر کا عالم ہے
ہر ایک سانس میں آہوئے ناز کا رم ہے

جوش صاحب نے مصرعۂ ثانی میں "آہوئے ناز" کو کاٹ کر "وحشیٔ غزالہ" لکھ دیا۔

ہر ایک سانس میں وحشیٔ غزالہ کا رم ہے

"آہوئے ناز" کی ترکیب ہیں ممکن ہے جوش صاحب کے مذاق شعری کی لطافت پہ بار گزری ہو۔ علاوہ ازیں مصرعۂ اولیٰ میں چونکہ "حیات" کا لفظ ہے، اور حیات مؤنث ہے اس لئے مصرعۂ ثانی میں وہ شاعرانہ مزاج "آہو" پر "غزالہ" ہی کو ترجیح دے گا جس میں جوش صاحب کے مزاج کی رضا بھی ہو اور تہذیب بھی۔ کیوں کہ آہو مذکر ہے اور غزالہ مؤنث۔

میرا شعر تھا ؎

کوئی الم کا نشانہ، کوئی خوشی کا شکار
کسی کو راس ابھی آیا ہے زندگی کا شعار

جوش صاحب نے پہلے مصرعے کو قلم زد کرتے ہوئے خاص اپنے رنگ میں یہ مصرع لکھ دیا۔ ؎

کوئی تعب سے تنگ جاں کوئی طرب سے فگار

معنویت میں ذرا بھی فرق نہیں پڑا۔ لیکن جوش صاحب نے اسی مفہوم کا نیا مصرع کہہ کر شعر کے آہنگ اور شکوہ میں غیر معمولی اضافہ کر دیا۔

میری کسی نظم کا ایک شعر تھا ؎

ریتیلے ذرّوں کی جھلسی ہوئی تابانی سے
جگمگاتے ہوئے تاروں کی توقع کی تھی

جوش صاحب نے پہلے مصرع کو اس طرح بنا دیا ؎

سُرخ ذرّات کی جھلسی ہوئی تابانی سے!

"ریتیلے" کا لفظ شاید جوش صاحب کے لئے ناقابل قبول ہوگا۔ غالباً اہل زباں ان معنی میں "ریتیلے" بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ "ریتیلا ذرّہ" بھی محل نظر ہے۔ کیوں کہ ریت بجائے خود ذرّہ یا ذرّوں کا مرکب ہے۔

میری ایک اور نظم کا شعر تھا ؎

اکھڑی سانسوں کا آسرا لے کر
عالم نو سے کیوں اُلجھتے ہو

جوش صاحب نے مضمون میں زیادہ شعریت اور رمزیت پیدا کرنے کی غرض سے پورے شعر کو یوں تبدیل کر دیا ؎

کہنہ تانوں کا آسرا لے کر
نغمۂ نو سے کیوں اُلجھتے ہو

یہ ایک چھوٹی سی مثال اس اعتبار سے خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ جوش صاحب زبان و بیان کی نزاکتوں اور لطافتوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں اور ہر خیال کو مناسب ترین الفاظ عطا کرنے میں انہیں کتنی قدرت حاصل ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ جوش صاحب شاعر انقلاب نہیں ہیں۔ وہ انقلاب کے صحیح تصور سے ناواقف ہیں۔ انقلاب سے ان کی وابستگی بہت حد تک جذباتی اور کسی حد تک کھوکھلی بھی ہے۔ اس کے علاوہ تکرار خیال اور بے جا طوالت کی وجہ سے ان کی زیادہ تر نظموں کی تعمیر بھی غیر مربوط ہو جاتی ہے۔ خطابت کی فراوانی بھی ان کے مجموعی تاثر کو اکثر کمزور کر دیتی ہے۔ لیکن الفاظ پر انہیں جو حیرت انگیز دسترس اور اظہار پر جو غیر معمولی قدرت حاصل ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔

اثر لکھنوی

شاعرِ فطرت جوش

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جوش کی شاعری جو کبھی "تمام رامش و نغمہ تمام نکہت و رنگ" تھی اب انحطاط پذیر ہے وہ فضا رندی و رندی ہے جہاں قوس قزح انگڑائیاں لیتی تھی اور رنگینیوں کی بارش ہوتی تھی۔ میں صرف یاد دیرینہ تازہ کروں گا اس وقت ان کی نظموں کا وہ مجموعہ زیر نظر ہے جس کا عنوان ہے "شاعر کی راتیں"۔ جیسا نام سے ظاہر ہے اس میں شب سے مختلف مناظر و کیفیات کی مصوری ہے۔ جوش فطرت کے شاعر ہیں، ان کے کلام میں آبشاروں کا جوش و خروش و ترنم ہے۔ دریا کی روانی، موجوں کا تلاطم اور بادِ سحر کی نرمی و سبک روی ہے۔ ان کی شاعری میں وہی بے ترتیبی میں ترتیب اور تنوع میں ہم آہنگی ہے جو فطرت کا طرۂ امتیاز ہے۔ فطرت کی طرح وہ بھی اپنے آرٹ کے مرتب کردہ قوانین کے سوا کسی انسان کے ساختہ آئین یا رسم و رواج کے پابند نہیں۔ فطرت الٰہ سے جو کچھ کہتی ہے اسی کی زبان میں وہ باوازِ بلند اس کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اس کی پروا نہیں کرتے کہ کوئی خوش ہوگا یا ناراض۔ ان کی ایک نظم "ذاکر سے خطاب" نے ایک خاص طبقے میں مخالفت کا طوفان بپا کر دیا۔ یہ بات ناممکن تھی، اگر انہوں نے قوم کی دکھتی ہوئی رگ پر چٹکی نہ لی ہوتی۔ اودھ پنچ (سابق) میں کسی ظریف نے ایک شعر میں اس نزاع پر بڑا شگفتہ تبصرہ کیا ہے ؎

جوش تیری نظم "ذاکر سے خطاب"
چوہے کی داڑھی کا تنکا ہو گیا

لوگ کہتے ہیں کہ اس نظم میں جوش کا لہجہ بہت درشت ہے، لہٰذا ان کا منشا فوت ہو گیا۔ اور اصلاح پر آمادگی کے بجائے ایک خاص طبقہ مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔ یہ حضرات بھول جاتے ہیں کہ جوش واعظ نہیں شاعر ہیں۔ یعنی اپنی دلی کیفیات و جذبات نظم کرتے ہیں۔ اس سے قطعاً بحث نہیں کہ لوگ سبق لیں گے یا اور زیادہ گمراہ ہو جائیں گے۔ اسی طرح ان کی نظموں میں جو تصویریں رندی و سرمستی کی ہیں ان کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ ہر شخص اسی میں شرابور ہو جائے۔ (آپ کا جی چاہے تو شورابور کی جگہ شرابور پڑھئے۔ اثر)۔

یہ نظمیں آرٹ کے مکمل نمونے ہیں، اور آرٹ اخلاق سے ہمیشہ بے نیاز رہا ہے۔ اور رہے گا۔ آرٹ میں درسِ اخلاقیات کی تلاش یا شاعر سے یہ توقع رکھنا کہ وہ سوسائٹی کے مقرر کردہ اصول کی تبلیغ کرے گا بالکل ایسا ہے جیسا دریا سے امید رکھنا کہ

ہماری مرضی کے موافق اپنا دھارا بدلتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ شاعر اخلاقی نظام سے بغاوت کے باوجود فطرت کی خلاف ورزی کو گناہِ عظیم سمجھتا ہے۔ وہ شاعر ہے یعنی عاشق ہے مگر بوالہوس نہیں۔ وہ حسن کے ہر منظر کا عورت ہو کہ شاخِ گل پرستار ہے، مگر صرف دور سے، تاکہ نشاطِ دل و دماغ کا سامان مہیا ہو۔ حظِ نفس میں عورت کو شریکِ کار بنانا جہاں تک شاعری اور آرٹ کا تعلق ہے، اس کے نزدیک سب سے زیادہ سنگین اور بہیمانہ جرم ہے۔

جوش کی نظمیں اول سے آخر تک پڑھ جائیے۔ جتنے ساغر ہیں شعر کی حیثیت سے بہشتِ نظر اور ترنمِ الفاظ و شستگیٔ تراکیب کے اعتبار سے فردوسِ گوش اور حلاوت و عذوبت کے لحاظ سے بادۂ کوثر کے چھلکتے ہوئے جام ہیں۔ مگر ان میں آلودگیٔ نفس کا شائبہ نہیں، اور یہی ایک فطری شاعر کی پہچان ہے۔ وہ ایک حسین عورت کی شوخی اور چنچل ادائیں نظم کرتا ہے مگر اس کی شاعری خواہشاتِ نفسانی کی بھٹی میں ایندھن کا کام نہیں دیتی۔ تاہم جادو کے زور سے ان اداؤں کو اس قدر دلکش بنا دیتی ہے کہ ہر ادا بجائے خود ایک نظورۂ نازنیں کا پیکر اختیار کر لیتی ہے۔ اور دعوتِ نظر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب عورت کی جگہ ادا مجسم ہو جائے تو انسانی فطرت نہیں جانتی کہ سیرابیٔ دل و دماغ کے سوا اور کس طرح لذت یاب ہو اور یہ عکس ہوتا ہے شاعر کی فطرت آشنا طبیعت کا، جو چیزوں کے بدلے ان حقائق کا انکشاف کرتی ہے جو ان چیزوں میں پنہاں ہیں۔ شے دراصل وہ نہیں جو کلوار کی گدی سے بکتی ہے بلکہ اس حقیقت کا نام ہے جو پردۂ ساغر و مینا سے چھلکتی رہتی ہے۔ نشہ شراب میں نہیں بلکہ پینے والے کے دل میں ہوتا ہے۔ ورنہ مے خوار کیوں نہیں کہہ سکتا کہ

صہبا کی موج عصمتِ ثریا سے ہے بلند
پائے سبو پہ جوش کن آفریں ہے آج

شاعر کی راتیں "میں متعدد نظمیں" کس کا نام ہے "عنبریں رات" کسی کا "مست رات" کسی کا کچھ کسی کا کچھ۔ ہر نظم اپنی جگہ ایک شاہکار ہے اور مبسوط مضمون کا تقاضا کرتی ہے۔ انتخاب دشوار ہے۔ لہٰذا میں بلا کسی امتیاز کے کتاب کھولتا ہوں۔ لیجیے صاحب ایک طرف "اندھیری رات" ہے اور دوسری طرف "بے چین رات"۔ انہیں پر کچھ لکھوں گا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ قرعۂ فال ان نظموں پر نکلا، جن میں جوش نے اپنے معمول کے خلاف فارسی ترکیبیں بہت کم استعمال کی ہیں۔ خیر پہلے "بے چین رات" کو لیجیے:

خواب میں دیکھ کر رخِ زیبا
آنکھ میری کھلی تو کیا دیکھا
گھر ہے تاریک اجاڑ تنگ خموش
نبضیں چھوٹی ہوئی اڑے ہوئے ہوش

ایک غیر فطری شاعر گھر کے تاریک اجاڑ، تنگ اور خموش یا سنسان ہونے کی وجہ معشوق کی عدم موجودگی کو قرار دیتا مگر جوش فطرت کا ہمراز شاعر ہے۔ "آن" کے نہ ہونے کو نبضیں چھوٹنے اور ہوش اڑنے کا سبب اور ان اسباب کو گھر کی تنگی و ویرانی کی علت بتاتا ہے۔ آنکھ کھلنے کے بعد مکان کا یہ نقشہ دیکھا، ورنہ اس سے پیشتر یہی مکان روشن، کشادہ اور پرفضا تھا، ایک "آن" کے نہ ہونے سے شاعر کا خوابِ نوشیں آنکھ کھلتے ہی بھیانک حقیقت سے بدل گیا جس نے امیدوں اور آرزوؤں پر پانی پھیر دیا، اور اس کیفیتِ قلب نے مکان کی بھی کایا پلٹ دی۔

پھانس سی فرش کی ہر ایک شکن
لب پہ خشکی، دماغ میں اُلجھن
ہر طرف کانپتا ہے عکسِ اجل
دل میں طوفان، روح میں ہلچل

یہاں بھی وہی سچے شاعر کی فطرت اپنے جوہر دکھا رہی ہے۔ بستر کی شکن میں پھانس کی سی خلش ہے جو دماغ کی اُلجھن بڑھا رہی ہے۔ بستر کی شکن اور دماغی اُلجھن کے ربطِ معنوی پر غور کیجیے، اُدھر تشنگیٔ شوق کی غماز ہونٹوں کی خشکی ہے۔ کاش یہ شکنیں کسی مستِ شباب کے انگڑائی لینے کے سونے کی شاہد ہوتیں، اور خارِ خشکی کا بیہودگی و خلش کے عوض عطا ہیں بے ہوشی، برگِ گل و رگِ گلدستۂ گل کا ساماں ہوتا

"ہر طرف کانپتا ہے عکسِ اجل"

گو انگریزی کا مرہونِ منت معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ میرے کان اس جملے سے آشنا ہیں،

"The shadow of death flitting
about the room".

تاہم ترجمے میں حسن و لطافت ہے اور اس لحاظ سے اردو میں ایک اضافہ ہے اور لفظ "کانپنا" نے تو دوسرے مصرع میں دل کے طوفان اور روح کی ہلچل کو جس خوبی سے نمایاں کیا ہے تعریف سے مستغنی ہے

لے رہی ہے عجب طرح لہریں
ایک نرم آنچ سی کلیجے میں!

البتہ یہ جگر کا اظہار شاید اس سے بہتر مشکل ہے۔ وہ اُلجھن، وہ گرمی، وہ سنسنی، وہ متواتر دل کا دھڑکنا اور ڈوبنا۔ ان سب کیفیتوں کو "نرم آنچ کا عجب طرح لہریں لینا" کہہ کر پیش کر دینا شاعری کا اعجاز ہے۔ ایسے ہی مقامات ہیں جہاں موسیقی و مصوری و مجسمہ سازی و سنگ تراشی شاعری کے سامنے سپرانداز ہو جاتی ہیں۔ ہندی کا ایک محاورہ ہے جو میں نے عورتوں کی زبانی سنا ہے وہ بھی اس کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔ مگر یہ لطافت کہاں: "دل رانگ رانگ ہوا جاتا ہے" عجب نہیں کہ جوش کے تحت الشعور میں بھی کارفرما ہو اور شعر میں اسی کا ارتقاع ہو۔

اس کے بعد کا شعر ہے ؎

دل ہے آنسو کی طرح سے سیال
اور بہت دور ہے زبان وصال

"طرح سے" کی بجائے صرف "طرح" فصیح سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا پہلا مصرع اس طرح بہتر ہوتا۔ ؏
"صورتِ اشک دل بھی ہے سیال"

پھر یہ شعر ہیں ؎

ہل گیا دل کچھ یوں دھڑکا
اسی ہلچل میں ہو گیا تڑکا

مرغ بولے فضا پہ چھلکا نور
صحنِ گلشن میں چہچہائے طیور
یوں صدائیں ہواؤں پر کھیلیں
میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں

جس کرب و اضطراب کی مصوری کی گئی، طلوعِ سحر نے اس کا طلسم توڑ دیا۔ لیکن دل کی شکستگی و برشتگی اب اس حد کو پہونچ چکی تھی کہ خفیف سے خفیف تیز بھی ایذا رساں و ناقابلِ برداشت تھا۔ اس تیز نے تسکین کیسی، دل پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ پاش پاش ہونے کا اندیشہ تھا۔ گویا اجل سامنے کانپ رہا تھا۔ دل کو نرم آنچ نے بریاں سے کربیاں تک گداختہ کیا تھا کہ اشک سیال بنا دیا تھا تاہم اس بسمل پر ہاتھ نہ رکھا۔ بلکہ جو گذری گذرنے دی۔ مگر خوش آئند صدائیں انتہائے حزن میں ایسی دل خراش ثابت ہوئیں کہ ؎

میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں

نیچرل شاعری کا مفہوم یہی ہے۔ نیچر کی ترجمانی نہ کہ بھونڈی نقالی۔

دوسری نظم جو انتخاب کی گئی "اندھیری رات" ہے۔ یہ اس طرح شروع ہوتی ہے۔ ؎

تیرگی پر ہول صحرائے اماں، بادل سیاہ
ایک میں اور یہ اندھیری رات کی خونی سپاہ
گھاٹیاں تاریک، راہیں گم، ہوائیں ناصبور
روح فرسا طاقتوں کی حکمرانی دور دور
ابر پیچ و تاب میں، ہیجان میں آبِ رواں
آسماں بپھرا ہوا، جیسی زمیں ہیں کف در دہاں
جھینگروں کی تان، بادل کی گرج، پانی کا شور
مینڈکوں کے راگ، بجلی کی کڑک، نالوں کا زور

ان اشعار سے برسات کی اندھیری بھیانک رات کا سماں آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ ساسیات لفظی کی خوبیوں کی شرح ترک کرتا ہوں۔ اس کے بعد ایسے منظر سے خصوصاً صحرا میں متاثر ہوکر واہمہ جو صورت گری کرتا ہے، اس کا بیان ہے ؎

کون ہے الجھی ہوئی شاخوں کے اندر بے قرار
کون مجھ کو گھورتا ہے جھاڑیوں سے بار بار

اس شعر نے برسات کی اندھیری رات کو ایک خوں خوار درندہ بنا دیا جو گویا الجھی ہوئی شاخوں میں پھنس کر رہ گیا ہے اور توڑ چھوڑ کر روند کر چل کر نکلنا چاہتا ہے اور اس حالت میں بھی ہجراں رسیدہ عاشق کو اپنی شعلہ بار آنکھوں سے گھور رہا ہے۔ واہمہ صورت گری کے علاوہ آواز بھی پیدا کرتا ہے ؎

کون یہ آواز دیتا ہے کہ آتا کیوں نہیں
پردہ ہائے محملِ ظلمت اٹھاتا کیوں نہیں

ہاں ایک اعتادہ کو نذا سا دلِ سرشار میں
اب یہ سمجھا کون ہے ان پردہ ہائے تار میں
مجھ سے ملنے آئی ہے رتھ میں اندھیری رات کی
ہونہ ہو یہ روحِ مضطر ہے بھری برسات کی

اندھیری رات کو رتھ کہنا اور بھری برسات کی روحِ مضطر کو "کالی دیوی" کی طرح اس رتھ میں سوار کرنا تخیل کا ــــ وہ آفریں کرشمہ ہے۔ انشراکبر جس کی سواری کے جلو میں پر ہول تیرگی، بے اماں صحرا، سیاہ بادل، تاریک گھاٹیاں، پرپیچ راہیں، نامسعود ہوائیں، روح فرسا طاقتیں، بپھرا ہوا آسمان، اگیل اور چھچھوندی لگی کف در دہاں زمیں، بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، پانی کا شور، مینڈکوں کے ناشتے، جھینگروں کی نفیریاں، اور نالوں کے ڈھول ہوں وہ رات کیسی مہیب و آسیب زدہ ہوگی، مگر آہ وہ دل کیسا ہوگا جس سے ملنے کو یہ روحِ مضطر صحرا نورد ہے تاکہ اس کی مصیبتوں کے مقابل اس بھیانک روح کو اپنے آلام ہیچ معلوم ہوں اور ایک گونہ تسکین ہو۔

جوش کے ساتھ نا انصافی ہوگی۔ اگر مضمون اسی جگہ ختم کر دیا جائے۔ کیوں کہ اتفاق سے دونوں نظمیں ایسی ہیں جو دل پر وحشت طاری کرتی ہیں۔ خصوصاً "اندھیری رات" ــــ آئیے ایک ایسی رات کی سیر کریں جہاں "زلفِ شب عنبر فشاں" ہے اور بساطِ رنگ و بو آراستہ ہے۔ ایسی متعدد نظمیں ہیں، ایک تو اتنی مشہور ہے کہ محفلوں میں گائی جاتی ہے (شباب تھا، جواب تھا وغیرہ)۔ اُسے عمداً چھوڑے دیتا ہوں، اور دوسری نظم لیتا ہوں جس کا عنوان ہے :

"ماز و نیاز کی رات!"

نہ جانے رات کو کیا سے کدے میں مشغلہ تھا
کہ ہر نفس میں قیامت کا جوش و ولولہ تھا
بساطِ خاک سے تا اوجِ ثابت و سیار
شمیم کاکلِ عنبر فشاں کا سلسلہ تھا
ترانہ ریز تھی نبضِ حیات کی جنبش
ضمیرِ شب میں وہ پنہاں خروش و ولولہ تھا
تپاں تھا دائرۂ عیش رخ و عالمِ ارواح
نیاز و ناز میں کیا جانے کیا معاملہ تھا
کبھی ہلال چمکتا تھا اور کبھی خنجر
میانِ حسن و محبت عجیب مرحلہ تھا
ادھر تھی لرزشِ صہبا، ادھر خرامِ حبیب
نرالی بحث چھڑی تھی، نیا مقابلہ تھا
زباں پہ آئیں تو ہر لفظ سے ہو ٹپکے
ہر ایک سانس میں ان وادیوں کا قافلہ تھا

(باقی صفحہ ۶۱۳ پر)

لطیف الدین احمد اکبرآبادی

سخن ہائے گفتنی

نہ صرف ہماری دنیائے شاعری میں بلکہ ہماری کتاب معاشرت میں بھی یہ باب "اعتذار" جلی حروف میں لکھا جاتا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ بعض وقت اس پر تصنع ادارے سے واقعی خدمت بھی لی جا سکتی ہے۔ شعر و سخن کے باب میں مجھے اپنی قدر و قیمت کے متعلق کسی قسم کا مغالطہ نہیں ہے۔ لیکن جناب جوش ملیح آبادی کے اس مجموعے "نقش و نگار" کی تقریظ لکھنے پر مجھے جناب سردار روپ سنگھ صاحب رئیس و جاگیردار ریاست دھول پور کے اصرار کے سامنے سپر ڈال دینا پڑی۔ کیوں کہ وہ میرا کوئی عذر سننے کے لئے تیار نہ تھے۔

سردار صاحب حضرت جوش کے نہایت مخلص دوستوں اور سچے قدر دانوں میں سے ہیں۔ اور اس مجموعے کی تدوین و اشاعت انہیں کی قدر دانیٔ سخن اور محبت کی مرہونِ توجہ ہے۔ اسی رشتے سے سردار صاحب مجھے بھی نظر لطف و کرم سے دیکھتے ہیں۔ سردار صاحب کے خلق و مروت نے مجھے سو سال پیشتر کا ہندوستان یاد دلا دیا، جس کے قصے اب تاریخ کی کتابوں ہی میں نظر آتے ہیں، کہ فلاں میر صاحب، فلاں رائے صاحب کے بغیر رہ نہ سکتے تھے۔ فلاں خاں صاحب سے فلاں پنڈت جی کی دانت کاٹی روٹی تھی۔ اور فلاں بادشاہ نے اس قدر دان کو نوازا۔ فلاں راجہ نے اس شاعر کو سرفرازا۔ تاریخ کا اپنے آپ کو دہرانا ایک عام مقولہ ہے۔ مگر مجھ پر اس کی صداقت سردار صاحب سے متعارف ہونے کے بعد ثابت ہوئی۔

جوش کی شاعری پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے خاندانی حالات اور خود ان کے مزاج طبیعت کا مختصر سا خاکہ پیش کر دیا جائے، کیوں کہ کسی شاعر کے کلام پر نظر ڈالنے میں ان حالات کا علم معاونت کرتا ہے اور اس کے عادات و اطوار کا علم ہونا از بس ضروری ہوتا ہے۔

شبیر حسن خاں جوش ملیح آباد ضلع لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ اُن کے بڑے جد محمد بلند خاں ہندوستان آئے اور دربار اودھ میں اتنا رسوخ بڑھا کہ ان کے صاحبزادے فقیر محمد خاں گویا افواج اودھ کے رسالدار ہوئے اور حسام الدولہ تہور جنگ کے خطابات پائے۔ فقیر محمد خاں گویا تخلص، ناسخ کے شاگرد اور صاحب دیوان تھے۔ ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ مؤلف آب حیات نے ان کا ذکر کیا ہے۔ گو کہ تذکرے میں یہ بات اہم اور قابل لحاظ ہے کہ ایک پشت میں ایک

تازہ ولایت افغان اسی پائے کا شاعر بن جاتا ہے! ظاہر ہے کہ کسی زبان کی شاعری میں استادی کا مرتبہ حاصل کرلینا اسی صورت میں ممکن ہے کہ زبان پر کامل دسترس ہو جانے کے ساتھ اس شخص کی ذہنیت و مزاج بھی بالکل ویسا ہی بن جائے۔ رسالدار فقیر محمد خاں کے سوانح حیات مرتب کئے جانے کے لئے یہ تنہا خصوصیت سب سے بڑی سفارش ہے کہ نہایت قلیل مدت میں ان کو زبان پر ایسا عبور حاصل ہو گیا۔ ماحول میں گھل مل جانے کی صلاحیت و قابلیت کی یہ ایک نادر و فقید مثال ہے اور جوش صاحب جناب گویا کا تذکرہ مرتب کرکے نہ صرف اپنے خاندان کی خدمت کریں گے بلکہ طبع و مزاج انسانی پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے بھی ایک نادر شے مہیا کردیں گے۔

نواب فقیر محمد خاں کے بیٹے نواب محمد احمد خاں احمد تعلقہ دار کسنڈی اور نواب بشیر احمد خاں بشیر یعنی جوش کے دادا اور والد بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جوش نے شعر کی فضا میں آنکھ کھولی۔ اور شاعری کی گود میں پلے بڑھے! اور ایسی صورت میں ان کا نو سال کی عمر سے شعر گوئی اختیار کرلینا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ فارسی اردو شاعری میں ایسی مثالیں نایاب بھی نہیں ہیں۔ غرض جوش کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب لکھنؤ کی فضا و ماحول شعر سے بسا ہوا تھا۔

صحیح استعداد شعری اور شاعری سے فطری لگاؤ ہونے کے باعث جوش کو چار سال کی شاگردی میں محسوس ہو گیا کہ جناب عزیز لکھنوی (مرحوم) کی استادی کا میدان ان کی جولانیٔ طبع کے لئے تنگ ہے۔ اس لئے بارہ تیرہ سال کی عمر تک تو اصلاح لی، لیکن پھر سروش غیبی اور ذوق و وجدان کی رہبری کو کافی سمجھا۔

تعلیمی اعتبار سے جوش نے گھر پر اردو فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں، اور پھر انگریزی کے لئے سیتا پور اسکول، جوبلی اسکول لکھنؤ کے علاوہ سینٹ پیٹرز کالج آگرہ، اور علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے اور پڑھتے رہے لیکن تکمیل کہیں کسی بات کی نہ کرسکے۔ یہ شاید ممکن بھی نہ تھا۔ جوش کے مزاج میں ہمیشہ سے ایک والہیت سی ہے۔ اور طبیعت کا انداز سخت لاابالیانہ ہے

سنہ ۱۹۲۴ء میں جوش سرکار نظام میں دارالترجمہ سے متعلق ہو گئے اور سنہ ۱۹۳۴ء میں ناظر ادب (لٹریری سنسر) کے عہدے سے الگ ہوئے۔ زمانۂ قیام حیدرآباد میں مدراس یونیورسٹی کے اعلیٰ درجوں کے ممتحن بھی مقرر ہوا کئے خود بقول جوش یہ حیرت ہے کہ دس سال تک انہوں نے حیدرآباد کو کس طرح برداشت کیا۔ اور اس سے بڑی حیرت یہ ہے کہ حیدرآباد نے ان کو کیونکر گوارا کیا۔ لیکن جہاں تک جوش کی شاعری کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ حیدرآباد کی علمی صحبتیں جوش کے جوہر قابل کو ابھارنے اور ان میں بالغ نظری پیدا کرنے کا سبب بن گئیں۔

جوش کی شاعری کی ابتداء تقلید سے ہوئی۔ جب ان کے اشعار میں تصوف کی جھلک زیادہ ہوتی تھی۔ ان کے اس عہد کے کلام کا ایک مجموعہ "روح ادب" کے نام سے سنہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ جوش اس وقت بھی اس قدر مقبول شاعر تھے کہ قلیل مدت میں اس مجموعے کی تمام جلدیں ختم ہو گئیں، اور اسی وقت سے نایاب ہے۔ اس مجموعے میں ایسا کلام بھی بہت ہے جو جوش کی آئندہ شاعری کی عظمت و بلندی کا نشان دیتا ہے۔ جوش کی شاعری کا اصل آغاز اس وقت سے سمجھنا چاہئے جب سے انہوں نے روایات و مفروضات کی قید و بند سے اپنی گلو خلاصی کی اور مصنوعی کیفیات کے بیان کو ترک کرکے محض واردات قلب اور مشاہدہ و تجربے کے اثرات کو موضوع نظم قرار دیا۔ جوش کے مجموعۂ کلام میں یوں تو آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے محبت کے بیان میں نفسیات کو سمویا ہے۔ عشق کے ذکر کو فلسفے سے سنوارا ہے۔ لیکن اسی

نوع کی چیزیں تو کم و بیش دیگر شعرا کے یہاں بھی حسن و خوبی کے ساتھ نظم ہوئی ہیں ۔ جوش کی شاعرانہ انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے انسانی ابتلاء و مصائب کو دل سے دیکھا ہے جو مخلصانہ ہمدردی سے لبریز تھا ۔ کہ ایک صادق القلب شاعر کی تعریف یہی ہے ۔ حیات انسانی کا پر الم نغمہ جوش نے ایسی دلدوز آواز میں سنایا ۔ اور قلب کی ان گہرائیوں سے نکالا ہے ۔ جس کی مثال اُن سے پہلے صرف نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں ملتی ہے ۔ راقم الحروف کے عقیدے میں صداقت احساس و بیان میں نظیر جوش کا پیشرو ہے ۔

جوش حلیم الطبع اور غیر منظم مزاج کے انسان ہیں ۔ مذاق شعری نے ان کے دل سے تحقیر و تنفر کے جذبے کو اس حد تک نکال پھینکا ہے کہ ان کو " دشمن کے بدی کرنے پر شرم آجاتی ہے ! " لیکن جب ان کے جذبۂ خودداری کو صدمہ پہونچتا ہے تو وہ دل آزاری کی بھی پرواہ نہیں کرتے ۔ اقبال کا ایک مصرعہ ہے ؎

" ہم نفس فرزند آدم را کجا ست ؟ "

اس میں بالکل مبالغہ نہیں کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کو کامل طور پر سمجھ لینا ناممکن ہے ۔ لیکن جو لوگ جوش کو قریب سے جانتے ہیں ۔ ان کو احساس ہے کہ رندانہ مسلک ہونے کے باوجود جوش کی روح کس قدر معصوم ہے ! عصمت دراصل نفس کے داغ دار ہوجانے کا نام ہے ۔ جوش اصطلاح صوفیا میں سچے رند ہیں ۔ جوش کی بے نفسی اس سے ظاہر ہے کہ اس عالمگیر شہرت و عزت کے باوجود دوسرے شعراء کی طرح کلام سنانے میں تکلف و تصنع روا نہیں رکھتے ۔ داو کے پیچھے پڑنے کا رکیک جذبہ ان میں کبھی پیدا نہیں ہوتا ۔ مزاج میں فیاضی اس قدر اور دل استغنا پسند رکھتے ہیں کہ آبائی دیسے اور جائیداد کا بہت بڑا حصہ عزیزوں کو دے بیٹھے ۔ بیرچشمی ترکے میں ملی ہے اور شرافت و مروت کا احساس اُن کی نظم " اترے ہوئے چہرے " سے بخوبی ظاہر ہوجاتا ہے ۔

جوش سخت زود آشنا ہیں اور آزادہ روی کلیہ عالم ہے کہ نئے پرانے احباب میں فرق مراتب کم رکھتے ہیں یا یہ کہئے کہ رکھ نہیں سکتے ۔ لاابالی پن کا یہ حال ہے کہ ان کے دوستوں کو ان کے متعلق بعض وقت " آنکھ سے دور دل سے دور " کا شبہ ہونے لگتا ہے ۔ میرے خیال میں یہ تمام باتیں ان کی فطانت (Genius) پر دلالت کرتی ہیں ۔

اعتقاداً جوش نے اوائل عمر میں شیعہ مسلک اختیار کرلیا تھا ، اور مردم شماری کے دفتر میں اب بھی شیعہ ہی سمجھے جاتے ہوں گے ۔ لیکن اب ان کا مذہب وہی سمجھنا چاہیے جو تمام اہل نظر و حکمت کا ہوتا ہے ، یعنی انسانی ہمدردی ! جوش نے اپنے متعلق اپنی نظم " پروگرام " میں سب کچھ کہہ دیا ہے ۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر دیوان حافظ سے ایک انسانی پیکر تیار کیا جائے تو وہ بالکل جوش ہوں گے ۔ بشرطیکہ اس میں " چوں پیر شدی " والا شعر نکال دیا جائے ۔ جوش کے عقیدے میں یہ شعر حافظ کی تعلیم سے متناقض ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کسی روز زمانہ خود جوش سے ایسا ہی شعر نہ لکھوا دے گا ؟

شعر کے باب میں جوش کا نظریہ اُن کے اُس مقالے سے ثابت ہے ۔ جو اُن کے ماہنامے " کلیم " کے پہلے نمبر میں " غزل گوئی " کے عنوان پر نکلا ہے ۔ غزل پر جوش کو جو اعتراض ہے ؛ ایک بڑی حد تک میں ان کا ہم خیال ہوں لیکن یہاں مجھے ان سے اختلاف ہے کہ غزل کا کوئی شعر فطری نہیں ہوتا ۔ مگر اس بحث کو چھیڑنے کا یہ محل نہیں ۔

اس خیال کی صداقت مسلمہ ہے کہ کسی قوم میں شعر و ادب کا عروج اس وقت ہوتا ہے جب وہ قوم تہذیب و تمدن کے منتہائے کمال پر ہوتی ہے اور اس کے قوائے عمل رو بہ اضمحلال ہونے لگتے ہیں کیوں کہ ترقی تمدن کا نتیجہ عیش و تمول ہے

اور عیش و تمول وہ چیز ہے جو قوموں کے قوائے عمل کو مضمحل کر دیتا ہے۔

اردو شعر کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری شاعری پروان ہی اس وقت چڑھی جب ہندستان میں مسلمانوں کا تمدن روبانحطاط تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس میں غیر معمولی ترقی بھی ہوئی۔ اگر مستثنیات سے قطع نظر کر لی جائے اور کثرت پر رائے قائم کرنے کا اصول صحیح سمجھا جائے تو پھر ہمارا یہ توقع کرنا کہ ہماری شاعری میں اخلاقی پستیوں کے سوا بھی کچھ مل سکتا ہے۔ محال عقلی کی آرزو کرنا ہے۔ جس شاعری کے آغاز میں جعفر زٹلی کا نام ملے جس کے عہد عروج میں رنگین و جان صاحب جلوہ آرائے بزم ہوں۔ اس پر نقد و جرح کرنا بھی لاحاصل ہے۔ لیکن بہر صورت عمل و ردِ عمل کا قانون غالب، مومن کو پیدا کرکے رہا۔ ایک نے اردو شعر کو سنجیدہ و متین اور مشاہدہ تفکر کے نتائج کا حامل بنایا، اور دوسرے نے بتایا کہ فطری احساسات اور صحیح جذبات کی نقاشی ہو بہو ہو تو شعر کیا چیز بن جاتا ہے!

الحاصل، نوعِ انسان کا ارتقاء منشائے قدرت ہے اور تہذیب و تمدن، ارتقاء کا ناگزیر نتیجہ۔ دنیا کی تمام قوموں کے عروج و زوال کا راز ان کی تہذیب و اخلاق کی بلندی و پستی میں مرکوز ہے، اور تمدن و اخلاق کی بلندی و پستی ایک فطری دور و تسلسل ہے! اس لئے اگر ایک قوم کے ذہنی ارتقاء کا ثبوت اس کے ادب و شعر سے ملتا ہے تو ادب و شعر ہی اس قوم کی پستی و بلندی کا آئینہ دار ہوتا ہے!

جنگ عظیم کے زمانے میں کسی اخبار میں میری نظر سے ایک مضمون گذرا تھا۔ اس کی غایت تصنیف یہ تھی کہ موجودہ جرمنی اپنے شعراء کی ساختہ پرداختہ ہے۔ اس خیال میں اگر کچھ صداقت ہے تو اس سے انکار ممکن نہیں کہ ادبار زدہ قوم میں ایسے شعراء کا پیدا ہونا مستلزم ہے جو اسے ذلت و نکبت کے گڑھے سے نکال کر پھر بام ترقی پر پہونچا دیں۔

تاریخ ہند پر نظر رکھنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں کہ اٹھارہویں صدی عیسوی اختلال قومی، بالخصوص مسلمانوں کے انتہائی تنزل کا عہد گذرا ہے۔ اس پستی و ادبار کی تصویر عہد ناسخ و امانت کی شاعری میں نظر آسکتی ہے۔ لیکن انسان نواز فطرت کا جذبۂ غیرت و حمیت زیادہ مدت تک خوابیدہ نہ رہ سکتا تھا، یا دوسرے لفظوں میں ردِ عمل کے قانون کو بر سر عمل ہونا ہی تھا۔ چنانچہ حالی کی ہستی رونما ہوئی۔ حالی نے ہمیں بتایا کہ ہمارے اسلاف کی شان کیا تھی، اور ہمارا

"وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر"

ہمارے روشن ماضی کو ایک ایرغلیظ کی طرح کیونکر گندہ و تاریک کئے ہوئے ہے!

"ہر کسے را بہر کارے ساختند" ایک سچا مقولہ ہے۔ اور فطرت الٰہیہ تقسیم کار کے اصول پر شدت و سختی کے ساتھ عمل کرتی ہے۔ حالی کو قدرت نے صرف اسی خدمت کے لئے مامور کیا تھا۔ اس کے بعد کا کام اکبر کے سپرد ہوا کہ اپنے شعر کا آئینہ دکھا کر ہمیں اپنے خط و خال سے شناسا کر دے۔ اکبر نے ہمیں دکھایا کہ ہم اپنی صورت کو جس قدر حسین سمجھ رہے ہیں، وہ اتنی ہی مکروہ ہے۔ ماضی و حال کے یہ مرقعے پیش ہو چکنے کے بعد اقبال کا فرض یہ ٹھیرا کہ خودی کی مشعل جلا کر مستقبل کا راستہ روشن کر دے۔

اب ارتقاء کی روح کو اس کا بھی متقاضی ہونا چاہئے کہ حالی کی نوحہ خوانی، اکبر کی آئینہ برداری اور اقبال کی مشعل نمائی کے بعد کوئی ایسی ہستی منظر عام پر رونما ہو جو نئی نسلوں کو اسلاف کی شرافتِ نفس و خود داری بھی یاد دلائے۔ اخلاف کی ناتراشیدگی و بد قوامگی کا بھی احساس کرائے۔ اور اعتماد نفس و حرکت و عمل کی حرص بھی دلائے..... یعنی حیات کی بشارت دے!

مسئلہ ارتقاء جس طرح حیات کے ہر پہلو اور ہر اسلوب میں جاری و ساری ہے، اس کے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اسی کا سختی کے ساتھ معتقد ہوں کہ افضل سے افضل تر پیدا ہوتا رہے گا۔ اسی لئے میں ارتقاء کی ہر کڑی کو اپنی جگہ اہم ترین باور کرتا ہوں، اس لئے میرا یہ خیال کہ حالی، اکبر اور اقبال کی شاعری کا ارتقاء جوش کے ہر شعر میں نظر آیا ہے میرے اسی عقیدے کا نتیجہ ہے! کیوں کہ جوش کی شاعری میں مجھے زندگی نظر آتی ہے جو اُن کے پیشروں کے یہاں نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی! جوش کا کلام غزلیہ و نشاطیہ ہو یا طنزیہ و المیہ، رندانہ و شاعرانہ ہو یا مصلحانہ و حکیمانہ۔ شروع سے آخر تک حرکت و حیات سے مملو دکھائی دیتا ہے!

یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ ماضی قریب کے ادبیات سے ذاتی تاثرات الگ نہیں کئے جا سکتے۔ اور عصری ادبیات سے نہ صرف ذاتی تاثرات وابستہ ہوتے ہیں بلکہ اس میں جذبات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے حالی و اکبر کی شاعری سے جو ہمارا قریب ترین ماضی ہے اور اقبال کے شعر کے متعلق جو قطعیتاً عصری ہے اس نوع کی گفتگو کرنا ایک نازک مسئلے سے بحث کرنا اور بڑی جسارت ہے! چنانچہ میں خالی الذہن نہیں کہ میرے اس اظہار خیال پر بعض پیشانیوں پر شکنیں آجائیں گی، بعض بدنوں میں جھرجھری پیدا ہوگی۔ اور بعض مبارک زبانوں سے کچھ کلمے بھی ادا ہو جائیں گے! لیکن میں بصد معذرت عرض کروں گا کہ اس وقت میرا روئے سخن شخصیت پرستوں سے نہیں ہے۔ میرے مخاطب صرف وہ لوگ ہیں، جن کی نظر بالغ ہے، اور ارتقائے شعر و ادب کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ ایک شاعر کے کلام کے عام اثرات بھی دیکھ سکتے ہیں۔

پچھلے سال لاہور کے ایک عظیم الشان ادبی اجتماع میں جس کو شاعر مشرق، ڈاکٹر ٹیگور اور بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو کی شرکت کا فخر حاصل تھا، مجھے معلوم ہوا تھا کہ صدر بزم محترمی پنڈت برج موہن دتاتریہ صاحب کیفی نے جوش کے تعارف میں یہ بھی فرمایا تھا کہ جوش کی شاعری نے ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ آنکھیں نیچی کئے بغیر اپنی شاعری کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں۔

جوش کی اس خوش بختی سے مجھے خوشی ہے کہ اُن کو اپنی زندگی میں ایسی داد و تحسین نصیب ہوئی لیکن بہرحال داد و تحسین اور خاص کر عصری داد و تحسین ناقابل اعتبار شے ہے۔ ذوق اور داغ کا قبول عام ہمارے سامنے کی بات ہے۔ اسی طرح غالب کا مردود ہونا بھی میرے خیال میں .... شعر کی قدر داد و تحسین سے نہیں۔ بلکہ اس کے استفادے سے ثابت و قائم ہوتی ہے۔ اور استفادے سے میرا مفہوم وہ انقلاب و اثر ہے جو کسی شاعر کا کلام لوگوں کے خیالات و احساسات میں پیدا کر دیتا ہے۔

میں نے کسی دوسرے مضمون میں اپنے عقیدۂ شعری کو اس طرح بیان کیا ہے کہ "جس طرح اصل مذہب ایک ہے، اسی طرح اصل شاعری بھی ایک ہے۔ اور جس طرح تہذیب و اخلاق کے لئے مذہب کی ضرورت ہے اسی طرح تہذیب نفس کے لئے شعر کی حاجت ہے!" اسی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ شاعر کا رونما ہونا اور شعر کا صورت پذیر ہونا انسانی فطرت کی ایک اہم ضرورت ہے! یہ بالکل ممکن ہے کہ مہابھارت، ایلیڈ، اور شاہنامے کی سی کتابیں ایک مدت تک یا کبھی بھی وجود میں نہ آئیں، لیکن جذباتی شاعری اس وقت تک نشو و نما و صورت نما ہوتی رہے گی جب تک انسانی سینوں میں جذبات ابھرتے رہیں گے۔ اور جس وقت تک ہم میں احساس باقی ہے ہم شعر سننے اور سر دھننے پر مجبور ہیں۔ اناتول فرانس کے

بقول ہماری مسرتیں غیر منظم اور ہمارے الم مبہم ہوتے ہیں۔ وہ چیز شعر ہے جو ہماری مسرت و الم کو مرتب اور منور کر دیتی اور ان کو زبان عطا کرتی ہے! شعر درحقیقت روح انسان کی آواز ہے۔ شعر کے ذریعے ہمیں اپنی خوشی و غم کا شعور ہو جاتا ہے!

شعر و شاعری کے بیان میں میں نے کہیں پڑھا ہے کہ لباس خیال کو زندگی کے قامت پر موزوں کر دینا شاعری ہے۔ کوئی شک نہیں کہ شاعری کی یہ ایک جامع تعریف ہے۔ لیکن شعر کی ایک حیثیت تو صوری ہے دوسری معنوی، اور یہ تعریف روح شعر پر منطبق نہیں ہوتی۔ شعر اسی صورت میں علوئے مقصود کو پہونچتا اور کامیاب ہوتا ہے۔ جب اس میں شعری صداقت (Poetic Truth) اور شعری حسن (Poetic Beauty) بھی ہوتا ہے۔ اور یہ باتیں لباس خیال کو زندگی کے قامت پر موزوں کر دینے کے علاوہ ہیں۔ صداقت اور حسن شعری کے لئے اعلیٰ درجے کی سنجیدگی لازم ہے۔ اور یہ بات کامل خلوص بیان (Sincerety) سے پیدا ہوتی ہے جو ایک وہبی جوہر ہے! شعر میں خلوص بیان اور تاثیر کلام لازم و ملزوم ہیں!

جوش کے کلام پر فنی اعتبار سے نظر ڈالنا تو کسی واقف فن کا کام ہے، میں صرف اُن کے شاعرانہ احساسات اور ان کے شعر کی کیفیات و اثرات کے متعلق کچھ اشارے کروں گا۔ شعر کے باب میں اوپر کی سطروں میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے میرے خیال میں جوش ایک کامیاب شاعر ہیں۔ وہ صحیح معنی میں شاعرانہ دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ قدرت نے نہ صرف ان کو ملکۂ شاعری سے بہرہ ور کیا ہے، بلکہ ان کے یہاں وہ خلوص بیان جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے۔ شعر میں جس جوش و خروش کو ضروری عنصر قرار دیا گیا ہے، جوش کے کلام میں وہ بھی بدرجۂ غایت موجود ہے۔ ان کے شعر میں وہ سچائی ہے جو اُن کے فلسفے کو ابھار دیتی ہے۔ وہ ترنم ہے جس میں ضعف نہیں ہوتا۔ جوش کی رندی کفر و الحاد کی حد تک ہے۔ لیکن اس کفر و الحاد میں نیکی و پاک نفسی شامل ہے! کیوں کہ مذہب کی روح، محبت و احترام انسانیت ہے، اور اس کی جوش کے یہاں کمی نہیں!

مرجائیت، جوش کے مذہب سے خارج ہے۔ اُن کو "قنوطی" کہا جا سکتا ہے۔ لیکن دراصل وہ امید کو بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ زندگی میں "ہم آہنگی" (Harmony) دیکھتے ہیں اس لئے زندگی کے ساتھ نغمہ سرا ہو جاتے ہیں۔ یعنی زندگی ہی کا اثر لا دیتے ہیں۔ وہ اگر "غم روزگار" سے متاثر ہوتے ہیں، شکایتاً نہیں، بلکہ اس کو بھی حیات کی ہم آہنگیوں ہی میں باور کر کے متاثر ہوتے اور بیان کر دیتے ہیں۔ "مطالعہ و نظر" کے عنوان سے جو مختلف اشعار اس مجموعے میں شامل ہیں، اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:—

کوئی دھوپ آگ برساتی ہے جب گلزار عالم پر
تحمل لوکا ہوتا ہے سبزے کے تغیّر میں

یونہیں خوں ریز خوں آشام تلواروں کو ہنستی کی
مرا دل تولتا ہے تیری رحمت کے تصور میں

صناعت کے باب میں یہ نکتہ اہم ترین و نادر ترین خصوصیت ہے کہ صانع کو فطری رہنا چاہئے۔ جوش ایک سچے اور فطری شاعر ہیں، اس لئے کہ وہ ایک سچے اور فطری انسان ہیں۔ ان کی شاعری کا مرتبہ اس وجہ سے بہت بلند ہو جاتا ہے کہ ان کے کلام اور اُن کی زندگی میں مطابقت ہے۔ اور سادگی اور سچائی ہر جگہ اور ہر وقت نظر آتی ہے۔ یہی چیز شعر کی صورت

میں ڈھل کر تاثیر بن جاتی ہے۔ جس کے سبب سے شعر دل میں اتر جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جوشؔ کے شعر کے اس درجہ دلنشین و دلآویز ہونے کا راز یہی ہے۔

جوشؔ معمولی باتوں اور دقیق مسائل، سادہ حسیات اور پیچیدہ جذبات کی نقاشی جس طرح کر جاتے ہیں، اس سے اس بات کا اندازہ بہ آسانی ہو جاتا ہے کہ ان کو زبان پر کتنی قدرت حاصل ہے۔ نظم کا کیسا ملکہ ہے۔ اور ان کا ادراک و احساس کتنا صحیح و نازک ہے!

شعر سے متعلق ایک نازک حقیقت یہ بھی ہے کہ ایک شاعر جس درجہ ثقیف (Cultured) ہوگا اتنا ہی بلند و نازک شعر کہہ سکے گا۔ ورنہ دیگر تمام اوصاف سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اگر اس میں ثقافت (Culture) کی کمی ہے تو اس کا شعر اس علو کو حاصل نہ کر سکے گا جو ایک عمدہ شعر کے لئے ضروری ہے۔ جوشؔ کے کلام سے ان کی ثقافت کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور جہاں تک شعر و ثقافت کا تعلق ہے، شعر فہمی کے لئے بھی ثقافت اتنی ہی ضروری ہے جتنی شعر گوئی کے لئے۔

غزل کے مقبول عام ہونے اور دیوانوں کی ردیف وار ترتیب نے ہمیں دو باتوں سے محروم کر دیا: ایک تو یہ کہ ہم اپنے شعراء کے کلام سے ان کے کردار و سیرت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اور دوسرے یہ کہ ان کی شاعری اور اس طرح ان کے ذہنی ارتقاء کے مدارج مرتب نہیں کئے جا سکتے۔ جوشؔ کی شاعری اُن کے کردار و سیرت کا آئینہ ہے، اور اگر کسی سبب سے ان کے حالات زندگی ناپید ہو جائیں اور کلام محفوظ رہے تو آئندہ کسی کے لئے بھی ان کے کلام سے ان کا تذکرہ مرتب کر لینا دشوار نہ ہوگا۔ ان کے مجموعۂ کلام سے ان کے ارتقائے ذہنی کو بھی بہ سہولت پڑھا جا سکتا ہے۔

شکر ہے اب ہمارے شعراء اگر ردیف وار دیوان مرتب کرتے ہیں تو تاریخ کا التزام بھی کرنے لگے ہیں۔ کاش ان کے کلام اور زندگی میں مطابقت بھی رونما ہونے لگے۔

المختصر، ایک حقیقی شاعر کے لئے جس چشم بینا اور جس دل آگاہ کی ضرورت ہے، قدرت نے جوشؔ کو وہ آنکھ اور وہ دل عطا فرما دیا ہے۔ اس مجموعے میں جو دراصل ان کے کلیات کا ایک باب ہے۔ جوشؔ کے ہمہ گیر مشاہدے اور نزاکت حسیات کا وافر ثبوت ملتا ہے۔

شعر و شاعری کے باب میں مختلف و متنوع نظریے جاری و ساری ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ شعر میں زبان و خیال دونوں جہت سے "نعومت" (نرم و نازک ہونا) یا بالفاظ دیگر اس میں روانی اور گھلاوٹ ہونا چاہئے۔ جوشؔ کے یہاں نعومت شعری کی کمی ہے۔ اس کا ایک بین سبب تو ان کا نسلی مزاج کہا جا سکتا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ جذبات میں یہ کیفیت محبت کی فنا دگی اور خودی کی نفی سے پیدا ہوتی ہے، اور پھر وہ جذبات اپنے اظہار کے لئے ویسے ہی نرم و نازک اسلوب و الفاظ انتخاب کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ خصوصیت "زندگی" کے منافی ہے، جوشؔ جس کے علم بردار ہیں! اس کیلئے اس قسم کی نعومت جوشؔ کے شعر میں ڈھونڈھنا غلطی ہے۔

یہاں تک جو اشارات کئے گئے ہیں رواج عام کے مطابق ان کو مثالوں سے ثابت کرنا دشوار ہے۔ کیونکہ ان کا تعلق بیشتر وجدان و سلامتی ذوق سے ہے۔ ان نتائج پہ پہونچنے کا ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ جوشؔ کے کلام کا غائر مطالعہ کیا جائے اور اس سے جو اثرات مرتب ہوں اُن کے ذریعے سے رائے قائم کی جائے۔

جوش کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے والا اس نتیجہ پر ضرور پہونچے گا کہ انہوں نے حافظ شیراز کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور ان میں حافظ کا رنگ رچ گیا ہے۔ جوش نے روایتی غزل کہنا تو ایک مدت سے ترک کر دیا ہے۔ لیکن وہ غزل مسلسل یا قطعہ کہئے کہ ایک ردیف قافیے میں نظم لکھتے ہیں۔ ہماری شاعری اگرچہ دو سو سال سے فارسی کی تقلید کر رہی ہے مگر کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایک حافظ یا سعدی پیدا نہ ہو سکا! لیکن آج جوش کی ان غزلوں یا نظموں کو سن کر محسوس ہونے لگتا ہے کہ بلبل شیراز اردو میں نغمہ سرا ہے۔ وہی جوش و خروش ہے اور وہی انداز بیان، وہی دل نشینی ہے اور وہی طرز کلام۔ اس ضمن میں میرے دوست حضرت جگر مراد آبادی میرے خیال سے بالکل متفق ہیں۔ مگر اُن کی رائے میں جوش کے یہاں حافظ کی روحانیت نظر نہیں آتی۔ اور میں جگر صاحب کی رائے تسلیم کرنے کو آمادہ ہوں۔ کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ یہ شے فراوانیٔ تفکر کے باعث خود جوش کے اندر موجود نہیں

غرض جوش کی اس قسم کی نظمیں کافی تعداد میں ہیں جو ایک مجلد میں "بادۂ سرجوش" کے نام سے شائع ہو رہی ہیں، لیکن اس مجموعے میں بھی "یہ نظر کس کے لئے ہے" اور "یوم بہار" وغیرہ چند نظمیں اسی نوع کی شامل ہیں۔ "یوم بہار" کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؂

شکر خدا کہ طرۂ طرف کلاہ دوست
مشعل فروز تہ بیں روحانیاں ہے آج
پھر چہرۂ بشر پہ ہے رنگ الوہیت
پھر فرش خاک پر سر کروبیاں ہے آج
رندوں کے ساتھ روح دو عالم ہے رقص میں
یوم طواف کعبۂ رطل گراں ہے آج
ہر آرزو کے فرق پہ کج ہے کلاہ ناز
"عین الیقیں" بہشت کا وہم و گماں ہے آج
ہر خشک و تر میں گونج رہی ہیں حکایتیں
ہر ذرۂ حقیر کے منہ میں زباں ہے آج
رہ رہ کے اڑ رہا ہے مسیح و خضر کا رنگ
کیا جانے کس لباس میں عمر رواں ہے آج

میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جوش کی شاعری خود ان پر گزری ہوئی کیفیتوں کا مرقع ہے۔ لیکن اس خصوصیت کے باعث اُن کی نظموں کا آخری ایک دو شعر جو بادی بیان پر مشتمل یعنی خود شاعر کے کسی ذاتی واقعے سے متعلق ہوتا ہے، قاری یا سامعین کے لئے ایک امتحان ثابت ہوتا ہے۔ نظم کی شاعرانہ کیفیات و تخیلات سننے یا پڑھنے والے کو عالم خیال میں جس بلندی پر پہونچا دیتے ہیں، یہ آخری شعر دفعتاً اسے پستی کی طرف لے آنا چاہتا ہے۔

مثلاً اس مجموعے میں آپ ایک نظم "جامن والیاں" دیکھیں گے۔ برسات کا موسم عام طور پر وجد آفریں ہے۔ لیکن ایک پرستار فطرت کے لئے تو برسات کے مناظر خدا جانے کیا قیامت ہوتے ہیں۔ ہمارا شاعر فطرت پرست اپنے ساتھ ہمیں بھی

محو منظر کرلیتا ہے۔ پہلے بند میں بھونرے کو شعر

روح پھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی

اور

بہہ رہی ہیں ندیاں ساون کے نغموں کی طرح

کی نادر اور حسین تشبیہوں سے قطع نظر ہمارا تصور برسات کا ایک منظر دیکھتا ہے۔ جس کے افق پر چند دہقانی عورتیں نظر آتی ہیں۔ دوسرے بند میں ایسے منظر کو جو اکثر ہماری نظروں سے گذرتا اور قابلِ التفات نہیں ہوتا، ہمارا شاعر ایک شہ پارۂ صناعت بنا کر پیش کرتا ہے۔ اور ہمارا خیال بھی۔ انگڑائی کی صورت۔ میں بلندی کی طرف چلا جاتا ہے۔ لیکن آخری بند کا آخری مصرع

جوشؔ ان فصلوں میں اکثر اپنی رسوائی ہوئی

ہماری قوت متصورہ کو مادیت کی طرف لے آتا ہے، اور ہم ایک صدمہ سا محسوس کرتے ہیں۔

جوشؔ کے محاکات

میرے خیال میں باعتبار محاکات جوشؔ اس وقت اس لئے فرد ہیں کہ وہ کسی تصویر کے پیش کرنے میں چند ایسے پہلو چن لیتے ہیں کہ پورا مرقع اپنے جزئیات و ماحول کے ساتھ سامنے آ جاتا ہے۔ اس مجموعے میں ایسی نظمیں کم ہیں۔ لیکن دو ایک مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

"جمنا کے کنارے" کا ایک مرقع ملاحظہ ہو:

افسوں بہ نگاہ و زلف بر دوش
غرفے میں کھڑی ہوئی ہے خاموش
فردوس کے دریچے ہوئے باز
ٹیکے ہوئے کہنیاں بصد ناز
رنگین کلائیوں کو جوڑے
چہرے کو ہتھیلیوں پہ رکھے
گل دان میں پھول ہنس رہا ہے
قرآں ہے کہ رحل پہ دھرا ہے

"نظارۂ ماضی" ایک دوسری نظم ہے۔ اس کی ایک تصویر دیکھئے:

ڈھلوی چند عصر کی جب ہو گئیں
جھونکے ہیں نسیم کے معطر
خاموش ندی پہ ہے دھواں سا
سبزے پہ ہے دھوپ کا گماں سا
کیا مست ہوائیں آ رہی ہیں

کوکو کی صدائیں آرہی ہیں

"کوہستان دکن کی عورت" ایک اور نظم ہے۔ اس کو پڑھئے اور تصور قائم کیجئے۔ جو صورتیں سامنے آئیں گی وہ وہی ہوں گی جو دکن میں چلتی پھرتی دیکھی جاتی ہیں۔ اس نظم میں تناسب الفاظ اور ان کے برمحل استعمال کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔

جوش کے خمریات

اُردو ذخیرۂ اشعار میں اس موضوع پر بہت کافی انتخاب مل جائے گا۔ اور نہایت عمدہ شعر آپ کے سامنے آئیں گے۔ جس میں ریاضؔ خیرآبادی (مرحوم) کا نام سرفہرست ہوگا۔ لیکن جوشؔ کے خمریات کے سامنے وہ سب ایسے معلوم ہوں گے جیسے شراب کے مقابلے میں پانی۔ اپنی تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جوشؔ کا اس قسم کا کلام مجھے حافظ و خیام سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس ذیل میں میں اُن کی نظم "چند جرعے" کی طرف توجہ دلاؤں گا جو جوشؔ کے خمریات میں بھی اپنی نوع کی ایک ہی نظم ہے۔ اس میں انہوں نے مے نوشی کی کیفیات کے درجے نظم کئے ہیں۔ جس کے باعث وہ خاص طور پر قابلِ لحاظ اور خصوصیت لئے ہوئے ہے۔

پہلے جرعے میں ہمارے شاعر کے دل میں کوئی کروٹ سی لیتا ہے۔ اور پھر ؂

یہ کس کی سُن رہی ہے روح آہٹ
رگوں میں ہے مزے کی سنسناہٹ
زہے رفتارِ خونِ زندگانی
بغیر اسبابِ شادی شادمانی
سخن کی داد خود سے پا رہا ہوں
کلی کی طرح کھلتا جا رہا ہوں

اس کیفیت میں اُسے ایک آواز آتی ہے کہ "بدمستی بہ از زہد ریائی" تو وہ پھر ساغر اٹھا لیتا ہے۔ اور دوسرے جرعے میں ؂

رگ و پے میں ہے غلطاں نوجوانی
ہر اک لمحہ ہے عمرِ جاودانی
گراں زنجیرِ دانش گل رہی ہے
متانت کی جوانی ڈھل رہی ہے
یہ کیسی سرخوشی ہے آج ساقی
صراحی میں ہے دیکھ تو کہ باقی!

پھر وہی آواز آتی ہے۔ اور وہ پھر تیسرا جرعہ کہ "زہد ریائی" کو غرق کرنا چاہتا ہے ؂

ندی ساون کی چڑھتی آرہی ہے
سوئے میخانہ بڑھتی آرہی ہے
سرِ میخانہ حوریں آرہی ہیں
نگاہیں رام رس ٹپکا رہی ہیں

فنا کی بیڑیاں پھر گل رہی ہیں
بقا کی مشعلیں پھر جل رہی ہیں
بڑھا جاتا ہوں دریا ہو کہ وادی
مبارک دولتِ خود اعتمادی

دوسرے جرعے میں "گراں زنجیرِ دانش" گلی، اور تیسرے میں "فنا کی بیڑیاں" گل گئیں۔ شاعر کو پھر آواز آئی اور خود اعتمادی پیدا ہو جانے کے بعد اس نے تعمیل میں پھر ساغر بھر لیا، تو ؎

عجب شاہانہ کیفیت ہے طاری
ستاروں پر ہے میرا حکم جاری
مجازی صورتوں پر ہے بحالی
حقائق ہو چکے ہیں لاابالی!
چھلکتی ہیں بتوں کی بالیاں سی
فضا پر بج رہی ہیں تالیاں سی
جوانی روح میں اٹھلا رہی ہے
نظر پر کاکلیں بکھرا رہی ہے

جب ہستی کے امتیاز بھی مٹ چکتے ہیں، تو پھر وہی آواز آتی ہے، اور پھر تعمیل کی جاتی ہے۔ اور پانچویں جرعے میں ؎

تعالی اللہ شانِ خود نمائی
بھرا ہے خاک میں زورِ خدائی
ہتھیلی پر لئے ہوں گلستاں کو
کہاں کا گلستاں سارے جہاں کو
جبینِ حال پر ہے نقشِ ماضی
کوئی حد بھی ہے ان بدمستیوں کی
مجھے ارض و سما سے کد نہیں ہے
وگرنہ مستیوں کی حد نہیں ہے!

یہاں تک کہ مستی کے اندر نہ صرف "زہد ریائی" بلکہ "خودی" بھی غرق کر دی جاتی ہے!

جوش کی وطنیت

وطن پرستی کا جذبہ جوش کی برترین خصوصیات ہے۔ اور ان کی وطن پرستی انسانیت پرستی کے ذیل میں ہے۔ حریت یا آزادی ایک ایسا لفظ ہے جس کی صحیح تعریف کرنے میں دنیا اس وقت تک ڈانواڈول ہے۔
اسلام کا درس حریت۔ حریتِ فکر میں مرکوز ہے۔ اور جوش اسی کے مبلغ ہیں۔ ان کا اس قسم کا کلام ایک مجموعے میں "آتش کدہ"

کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ لیکن اس مجموعے میں جو چند نظمیں "غریب الوطن" اور "الوداع" وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے دیکھنے سے بھی جوش کے جذبۂ وطنیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جوش کی ریا دشمنی

مکر و ریا، جو آج کل ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے اور جس کی وجہ سے مذہبی تقدس ہمارا مال تجارت بن گیا ہے۔ جوش اُس کے سخت ترین دشمن ہیں۔ اس موضوع پر ان کی متعدد نظمیں ہیں، اور اس مجموعے میں بھی "جواب" "اس شب کا دنیا میں نہیں ہے" اور "وقت مروت" وغیرہ کے پڑھنے سے ان کے احساسات کا پتہ ملتا ہے۔

جوش کے شبابیات

شبابیات کو جوش کا مخصوص موضوع سخن سمجھنا چاہئے۔ کیوں کہ اس بحث پر وہ اپنے حقیقی رنگ و مذاق میں پوری طرح پر نمایاں ہو سکتے ہیں۔ اور زندگی کا تحرک بھی اسی عنوان کے تحت بہتر طریق پر ظاہر ہو سکتا ہے۔ اس مجموعے میں ان کی متعدد نظمیں ہیں۔ مگر میں یہاں ان کی ایک نظم بعنوان "جوانی" کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ جو انہوں نے نظیر اکبر آبادی کے اتباع پر نظیر ہی کی بحر میں لکھی ہے۔ جوانی کی شرح اس سے بہتر و بلند تر شاعری میں تصور نہیں کی جا سکتی۔ ٹیپ کے مصرعے پڑھ کر وجد کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔

جوش کی زبان

جوش کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی زبان سے گفتگو کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جوش کی شاعری دو جداگانہ قسم کی زبانوں میں منقسم ہے۔ ایک تو وہ جو فارسیت لئے ہوئے ہے اور "بوم بہار" وغیرہ قسم کی نظموں میں نظر آتی ہے۔ دوسری وہ جو "یہ کون اٹھا ہے شرماتا" کے ذیل کی نظموں میں ملتی ہے۔ بعض جگہ یہ دونوں انداز ملے جلے ہیں۔ لیکن ایک خصوصیت دونوں رنگوں میں مشترک ملے گی اور وہ توازن لفظی کی خصوصیت ہے کہ موسیقی و ترنم کہیں زائل نہیں ہو پاتا۔ تناسب لفظی کے اعتبار سے ان نظموں میں جو فارسی آمیز زبان میں لکھی گئی ہیں "دہریت" کی جھلک آجاتی ہے اور بعض جگہ اغلاق پیدا ہو کر تناسب کو زائل کر دیتا ہے۔ لیکن بالعموم جوش کے یہاں تناسب لفظی پایا جاتا ہے، اور اس مجموعے میں ان کی نظم "کوہستان دکن کی عورت" مثالاً پیش کی جا سکتی ہے۔

مگر میری نظر میں جوش کی لسانی خصوصیت وہاں نمایاں ہوتی ہے، جہاں وہ ٹھیٹ ہندی لفظ اور محاورے استعمال کرتے ہیں۔ ان کا یہ استعمال اس قدر حسین اور اس درجہ دل نشین ہوتا ہے کہ انسان جھومنے لگتا ہے۔ جوش کا ایسا کلام پڑھ کر یقین ہونے لگتا ہے کہ زبان کی گھلاوٹ جس چیز کا نام ہے اردو میں عربی فارسی عنصر بڑھ جانے سے نہیں بلکہ ہندی شامل کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ جوش کی تقلید دوسری خصوصیات کے علاوہ اس ذیل میں بھی کی جا رہی ہے، اور خیال ہوتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب عربی، فارسی الفاظ کی "درآمد" بند ہو جائے۔

اس مجموعے کی پہلی نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں:

رخ پہ سرخی آنکھ میں جادو	بھینی بھینی بر میں خوشبو
بانکی چتون سمٹے ابرو	نیچی نظریں بکھرے گیسو
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

نیند کی لہریں گنگا جمنی	جلد کے نیچے ہلکی ہلکی
آنچل ڈھلکا کاسنی ساری	ہلکی ہندی دھندلی بیندی
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

ڈوبا ہوا رخ تابانی میں	انوارِ سحر پیشانی میں
یا آبِ گہر طغیانی میں	یا چاند کا ٹکڑا پانی میں
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

رخسار پہ موجِ رنگینی	کچھ چاندی کچھ چینی
آنکھوں میں نقوشِ خود بینی	مکھڑے پہ سحر کی شیرینی
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

میں سمجھتا ہوں کہ اردو زبان کی اصلی صورت ان بندوں میں جھلکتی ہے۔ اور اس وقت جو رجحان نظر آرہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ پچاس برس گذرنے سے پہلے یہی زبان مقبولِ عام ہوگی۔

اس بحث میں ایک اور بات سامنے آجاتی ہے جو میرے تو علم میں ہے لیکن ہر اس شخص کو بھی محسوس ہو سکتی ہے جو جوش کا کلام ذرا توجہ سے پڑھے گا۔ اور وہ یہ ہے کہ جوش کو اپنے کلام پر نظرِ ثانی کرنے کی عادت نہیں۔ غالباً وہ اس کو شاعرانہ دیانت کا مقتضا سمجھتے ہیں، یا اپنے شعر کو قا طبعاً فطری رکھنے کی خاطر ترمیم و تنسیخ روا نہیں رکھتے۔ لیکن میں اس کو بھی اُن کی طبیعت کی بے نظمی اور مزاج کی بے ضابطگی سے تعبیر کرتا ہوں جو فطنت (genius) کا اولین خاصہ ہے۔ مگر ان کی اس عادت کے باعث ان کے یہاں کہیں کہیں تسلسلِ بیان و خیال زائل ہو جاتا ہے۔ جو محض اشعار کے تقدم و تاخر سے رفع ہو سکتا ہے۔

مثلاً اُن کی یہی نظم لے لیجئے جس کے چند بند اوپر نقل کئے ہیں۔ پہلے بند میں کچھ جاگنے اور کچھ سونے کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ پھر دوسرے بند سے لے کر چھٹے بند تک محض تشبیہات و تاثرات بیان ہوئے ہیں۔ مگر ساتویں بند میں پھر

سرخ پپوٹے نیند سے بوجھل

آیا ہے۔ اور آٹھواں بند یہ ہے:

کچھ جاگ رہی کچھ سوتی ہے	ہر جنبش صبا منہ دھوتی ہے
نا شستہ رخ یا موتی ہے	انگڑائی سے جز بز ہوتی ہے
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

تسلسلِ بیان چاہتا ہے کہ جب پہلے بند میں

دیر کا جاگا نیند کا ماتا

لکھا گیا ہے تو اس کے بعد آٹھواں بند، پھر ساتواں اور نواں بند آنا چاہیے جس کا ایک مصرع ہے

چہرہ پھیکا نیند کے مارے

اور غالباً اُن کی اسی عادت کا نتیجہ ہے کہ بعض وقت کوئی ایسا لفظ بھی بندھ جاتا ہے جو تناسب سے باہر ہوتا ہے، اسی نظم کے تیسرے مصرعے میں "دُھوم مچاتا" نظم ہوا ہے جو اپنی جگہ کیسا ہی شاعرانہ ٹکڑا ہو لیکن نظم کی ساری فضا اور تمام کیفیات اس لفظ کے مفہوم سے متنافر ہیں۔ اور وہ نظم کے پرسکون ماحول میں شور و غوغا کا عنصر معلوم ہوتا ہے۔ جو خوش گوار نہیں۔

جوش کی اسی بے خیالی کا نتیجہ ہے کہ "شاعر کی نماز" کے پہلے مصرعے میں لفظ "سحر" نظم ہوا ہے۔ حالانکہ اگر وقت کا تعین یا بیان ناگزیر تھا تو وہ وقت شام کا ہونا چاہیے تھا۔ یہ ایک ایسی فروگذاشت ہے جسے "زمان و مکاں" کا اصول گوارا نہیں کر سکتا۔

اسی طرح "اٹھتی جوانی" کا یہ مصرع

خیال کی زد پہ ذوق باری

بھی توجہ طلب ہے۔

الغرض، جوش ایک فطرت نگار (Poet of nature) شاعر ہیں۔ اور ان کا کلام ضروری خصوصیات شعری کا حامل ہے۔ لیکن اگر فنون لطیفہ کی اس تعریف کو مانا جائے کہ صناعت کا مصرف ہمارے اندر احساس نشاط پیدا کرنا اور ہماری روح کے شرف کو اُبھارنا ہے۔ تو جوش کی شاعری اس وقت کامیاب ترین شاعری ہے!

جوش کا فلسفہ یا مسلک

جوش کا مسلک متعین کرنا انتہائی دشوار کام ہے۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ وہ "لذتیت" پر گامزن ہیں۔ لیکن اس سے غافل معلوم نہیں ہوتے کہ "لذت" ہے کیا شے؟ "جوانی کی رات" ان کی نہایت مترنم نظموں میں سے ایک ہے، جو کیفیات "وصل" کا صناعانہ مرقع ہے۔ اس کا آخری شعر ملاحظہ ہو۔

گنبدِ قصرِ عیش میں گونج رہی تھی یہ صدا
رات نہ تھی وہ عیش کی جوش ترا شباب تھا

جوش کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے بعض خیالات کو عقیدے کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔ مثلاً یہ خیال کہ ہماری ساری مصیبتیں یادِ ماضی کے باعث ہیں۔ اور جو شے ہمیں ماضی کی یاد دلائے وہی ہمارے رنج کا موجب ہوتی ہے، جیسے "نظارۂ ماضی" کا یہ شعر:

پڑتا ہے اثر نہ جانے کیوں کر
کوئل کی صدا کا حافظے پر

اس خیال کو جوش نے متعدد جگہ مختلف و دل پذیر پیرایوں میں لکھا ہے۔ اسی طرح "عمرِ رواں" کا موضوع بھی جوش کو بہت محبوب ہے۔ اور بار بار متنوع اور دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ اُن کی نظم "کل رات کو" میں ملاحظہ ہو،

کس پائے کا شعر کہہ دیا ہے ؎

وقت کے ہاتھوں پہ روشن تھیں ابد کی مشعلیں
ایسی اک منزل میں تھی عمرِ رواں کل رات کو

یا یوم بہار کا یہ شعر ؎

رہ رہ کے اُڑ رہا ہے مسیح و خضر کا رنگ
کیا جانے کس لباس میں عمرِ رواں ہے آج

چونکہ انتخابِ شعر کا مسئلہ سخت قابلِ بحث اور قطعاً ذوقی چیز ہے۔ اس لئے میں کوئی انتخاب پیش نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے علاوہ جوش کے کلام میں نفسِ انتخاب مجروح بھی ہوتی ہے۔ اس لئے میں اربابِ ذوق و نظر سے صرف اتنا کہوں گا کہ آپ اس مجموعے میں بہت کچھ سامانِ کیف و لذت پائیں گے جو اُن کے ضخیم مجموعے کا ایک مختصر سا حصہ ہے۔ اور جیسے مشتے نمونہ از خروارے چند سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔

(ماخوذ از نقش و نگار)

شاعرِ فطرت جوش

(صفحہ ۵۹۸ سے آگے)

دل و نگاہ میں تھی کچھ لطیف گفت و شنید
نہ جانے شکر تھا ہمدم کہ شکوہ و گلہ تھا
لرز رہے تھے شگوفے تڑپ رہے تھے نجوم
چھڑا ہوا نہیں معلوم کون مسئلہ تھا
نگاہِ یار کی یوں اُٹھ رہی تھی جھک جھک کر
زمین رقص میں تھی آسماں پہ زلزلہ تھا
ہزار شکر ذرا بھی کمی نہ کی اے جوش
اگرچہ دیکھنے میں یار تنگ حوصلہ تھا

جیسا ابتدا میں عرض کر چکا ہے یہ تذکرہ معمولی سے تذکرہ نہیں، ورنہ ان لطیف اشاروں کے بجائے گالیوں کی بوچھاڑ اور ابتذال و عریانی و بے حیائی کی نمائش ہوتی۔ اس کے برعکس یہاں عاشق و معشوق، دو مجسم روحیں ہیں مادی آویزش اور جنسی کشاکش سے بیزار جو لطف راز و نیاز اور لذتِ آسودگی سے بہرہ مند ہیں۔ اور کائنات عرش سے لے کر فرش تک اُن کے معصوم روحانی اہتزاز کے زیرِ اثر رنگ رلیاں منا رہی ہے۔

جمیل مظہری

سالارِ کارواں سے

سلام تجھ پہ ہو اے میرِ کاروانِ ادب — ہے آج قافلۂ وقت تیز پا تجھ سے

ہو جس مقام پہ بھی "فکرِ نو" مگر تاریخ — کہے گی یہ کہ: کھُلا اس کا راستہ تجھ سے

یہ وہ سفر ہے ہوئی جس کی انتہا تجھ پر — یہ وہ سفر ہے ہوئی جس کی ابتدا تجھ سے

نوائے وقت کو آہنگِ نَو دیا تُو نے — گلوئے ساز نے پائی نئی صَدا تجھ سے

زلالِ فکر طلاے کشوں کو جام بجام — کھلا شرابِ معانی کا مے کدہ تجھ سے

مجاز اور حقیقت میں ربط تھا لیکن — ہُوا دراز روابط کا سلسلہ تجھ سے

شریعتوں کے لباس کہن ہوئے صد چاک — حقیقتوں نے پہن لی نئی قبا تجھ سے

چمن کی رُوح میں اک شعلگی سی دوڑ گئی — ہوا سکوتِ گلستاں جو ہم نَوا تجھ سے

عرقِ جبینِ خزاں سے کچھ اس طرح ٹپکا — کہ نوکِ خار ہوئی شبنم آشنا تجھ سے

اگرچہ سُست ہے آہنگِ انقلاب مگر

ہنوز رقص میں ہے روحِ ارتقا تجھ سے

نئے وطن کی فضائیں ہوں سازگار تجھے — یہ پوچھتے ہیں ترے ذوق آشنا تجھ سے

سلام کیا نہیں کہتی ہے اہلِ طوفاں کا — یہ عافیت گہِ ساحل خنک ہوا تجھ سے
ہیں انگلیاں بھی وہی تار بھی وہی لیکن — ہے تیرے ساز کی آواز کیوں خفا تجھ سے
جو دل کہ تھا جرسِ کاروانِ آزادی — دیارِ داب میں رُوٹھا ہوا ہے کیا تجھ سے
کبھی تھی شام کو تو نے اذانِ بیداری — یہ کیا کہ صبح کو لوری سُنے فضا تجھ سے
یہ آج کیا ہے کہ ہر دورِ بے خروشی میں — سُنی تھی وقت نے تکبیر کی صدا تجھ سے

جبینِ فتح کی سُرخی گواہ ہے اِس کی
بندھی تھی جنگ سے اُلجھی ہوئی ہوا تجھ سے

عقیدت آج ادا کر رہی ہے رسمِ سجود — ہے وقت یہ کہ محبت کرے گلہ تجھ سے
یہ کھینچ رہا ہے تو وہ جھک رہا ہے تیرے حضور — دل و دماغ میں ہے آج معرکہ تجھ سے
بجا کہ تجھ سے ملی نبضِ عہد کو سُرعت — بجا کہ چونک اُٹھی رُوحِ ایشیا تجھ سے
بجا کہ تیرا تبسّم مُبشرِ فطرت ہے — دلِ بہار کی گرہیں ہوئی ہیں وا تجھ سے
سُنا ہے یہ بھی کہ کرتا ہے جھک کے سرگوشی — بشوق کنگرۂ عرشِ کبریا تجھ سے
نسیمِ صبح کو کہتی ہے تجھ سے رازِ چمن — ستارے رات کو کرتے ہیں مشورہ تجھ سے
یہ سب بھی مگر اے قرض دارِ جنسِ وفا — ہُوا نہ اہلِ محبّت کا حق ادا تجھ سے
بجا کہ تو ہے زباں دانِ دردِ دل لیکن — سخن جمیلؔ کو ہے جوشِ بے وفا تجھ سے

کہ خامشی ہے گلہ اور تُو نہیں سُنتا
کراہتی ہے وفا اور تو نہیں سُنتا

رئیس امروہوی

جوش علیہ السلام

نیرنگیاں یہ جوش علیہ السلام کی
مُرشد ہے اور پیرِ خراباتیاں بھی تھا

کافر تھا ۔۔ اور سجدہ گہِ اہلِ دل رہا — منکر ہے اور قبلہ گہِ عارفاں بھی تھا
جو بایزیدِ طائفۂ قدسیاں ہے آج — وہ شبلیٔ قبیلۂ رامش گراں بھی تھا
جو رازدارِ خلوتِ روحانیاں ہے آج — وہ نکتہ سنجِ انجمنِ مُلحداں بھی تھا
ہاں ۔ یہ فروغِ دیدۂ انسانیت کبھی — چشم و چراغِ دودۂ افغانیاں بھی تھا
نوری تھا اور ہم نفسِ خاکیانِ خاک — خاکی ہے اور ہم نظرِ نوریاں بھی تھا
سچ ہے کہ یہ ابوالبشرِ دانشِ بشر — دانش فروشِ مدرسۂ ابن وآں بھی تھا
سچ ہے کہ یہ مدرسِ دانش گہِ یقیں — ابجد نویسِ مکتبِ وہم و گماں بھی تھا
زیرِ قدم ہے طرۂ تاجِ کیانیاں — کہنے کو سر پہ طرۂ تاجِ کیاں بھی تھا
زیبِ بدن ہے جامۂ فقر و قلندری — کہنے کو بر میں خلعتِ ساسانیاں بھی تھا
جس پادشاہِ شعر میں اب ہے نیازِ فقر — اُس بندۂ فقیر میں نازِ شہاں بھی تھا

یہ غازیِ جہادِ رُخ و زلفِ مہ وشاں
مردِ نبردِ بوس و کنارِ بُتاں بھی تھا[1]

جس کے مزاج میں رمِ آہو کی شوخیاں ‏ ‏ شیرِ گرسنہ سینۂ آہواں بھی تھا

شب زندہ دارِ تکیۂ اربابِ حق سہی ‏ ‏ اک پہلوانِ بسترِ سیمیں بَراں بھی تھا

جو آج اپنے عشق کا موضوع بن گیا ‏ ‏ وہ واضعِ جمالِ پری پیکراں بھی تھا

جو آج اپنی فکر کی مخلوق بن گیا ‏ ‏ وہ خالقِ تفکرِ لفظ و بیاں بھی تھا

خود جس پہ جس کی صنعتِ شعری کو ناز ہے ‏ ‏ وہ صانعِ تصوّرِ صنعت گراں بھی تھا

پیرِ طریقِ اہلِ طریقت ہے جو بزرگ ‏ ‏ یادش بخیر، بزمِ ہوس میں جواں بھی تھا

خضرِ سُبک خرامِ سخن ہے جو نرم رَو ‏ ‏ یادش بخیر ساقیِ رطلِ گراں بھی تھا

اے شاہدانِ عہدِ بہاراں ادب کرو ‏ ‏ گلچیں جو بن گیا وہ کبھی گلستاں بھی تھا

دستِ طلب میں شاخِ چمن کی لچک بھی تھی ‏ ‏ موجِ نفس پہ نکہتِ گل کا گماں بھی تھا

وہ آج جس کی پُشت پہ ہے دو جہاں کا بار ‏ ‏ سروِ سہی خیلِ صنوبر قداں بھی تھا

وہ جس کے لیے شہد و شکر کی ہیں بارشیں ‏ ‏ خود شاملِ قبیلۂ شکّر لباں بھی تھا

القصہ ارضِ شعر ہی زیرِ نگیں نہ تھی
یہ بادشاہِ کشورِ ہندوستاں بھی تھا

---

[1] اسی زمین، بحر اور قافیے میں حضرت جوش کی نظم ملاحظہ طلب ہے۔ جس کی ردیف ہے "بھی ہے"

رئیس امروہوی

جوش اور ترکِ مے؟

(ایک خبرِ وحشت اثر سے متاثر ہو کر)

مے حریفِ جوشِ رنداں ہے؛ یہ کیا سنتا ہوں میں؟
جوش صاحب اور ترکِ مے؟ یہ کیا سنتا ہوں میں؟

جام سے جمشید خود بیزار؟ کس نے کہہ دیا؟
خُم سے افلاطون کو انکار؟ کس نے کہہ دیا؟

مے کدہ مردودِ رندانِ جہاں؟ ممکن نہیں!
مے حریفِ مشربِ پیرِ مغاں؟ ممکن نہیں!

ساغرِ زہرِ اجل سقراط خالی چھوڑ دے؟
آئینے کو جوشِ وحشت میں سکندر توڑ دے؟

کاسۂ زہد و قناعت بزمِ کیکاؤس میں؟
معرکہ برپا قرابادین و جالینوس میں؟

فرِّ فرہنگ اور فکرِ فاریابی کا عتاب؟
بوعلی سینا کو "قانونِ شفا" سے اجتناب؟

علم کا پیمانہ اور پیماں شکن لقمان سے؟
ارشمیدس اور نفرت آلۂ و میزان سے؟

شعلۂ جوّالہ اور زرتشت سے گرمِ مصاف؟
موبد و مزدک کو مہر و مہرگاں سے اختلاف؟

دادِ دانش کی عدو دانش پژوہی کی یہ قسم!
سامری اور منکرِ نیرنگ و افسون و طلسم؟

خسرو پرویز اور شیریں سے اتنا تلخ کام!
محفلِ افراسیابی بندشِ مینا و جام؟

رُود کی، طنبور و نے کو۔ بار بد، مضراب کو؟
پھینک دے جھنجھلا کے فیثا غورث اصطرلاب کو؟

اپنی فردوسِ عدن، کُھلنے لگے شداد کو؟
مُو قلم سے وحشت و بیگانگی بہزاد کو؟

بادۂ و ساقی میں مہجوری، فقط بہتان ہے
مانی و ارژنگ میں دُوری، خدا کی شان ہے؟

عرصۂ پیکار میں پُرخاش جُو وسر گراں
رخش و رستم، سام و ساطور اور کاؤس و کماں؟

لوگ کہتے ہیں تو کہنے دیجیے - کیا کیجیے
جوش صاحب اور توبہ؟ توبہ توبہ کیجیے

غنچۂ رعنا، ادائے کج کلاہی چھوڑ دے؟
پھول اور شبنم سے غسلِ صبح گاہی چھوڑ دے؟

لالۂ صحرا سے بادِ نرم و نازک کو عناد؟
چاند کی کرنوں میں اور رمی کی لہروں میں فساد؟

نور و نکہت سے گریزاں نوعروسانِ چمن؟
مشکِ نافے سے بدک جائیں غزالانِ ختن؟

ناظمِ آبِ حیات اور نوشدارو سے اجل!
شہد سے سر کہ جبیں، سلطانِ افواجِ عسل!

پیکرِ انوار آزردہ شعاعِ نور سے؟
باغبانِ تاک برہم شیرۂ انگور سے؟

طائروں کو جوئبارِ دشت و صحرا سے گریز؟
ماہیِ قلزم نشیں کو موجِ دریا سے گریز؟

اپنی مرضی سے صدف موتی اگلنا چھوڑ دے؟
جوش کھا کر قدرتی چشمہ اُبلنا چھوڑ دے؟

بازگشت کوہ سے منکر صدائے کوہسار!
اپنا ہیجان و تلاطم ضبط کر لے آبشار؟

زندگی میں پیش و پس یارانِ سادہ کا اصول
ہر چہ بادا باد ہے مردانِ بادہ کا اصول

جوش جیسا عارفِ مے ؟ حیف بر احوالِ مے
تارکِ آئینِ مستی ؟ تائبِ اشغالِ مے

جوش جس کی گرم جوشی، گرمیِ بزمِ سخن ؟ — جس سے دورِ جامِ صہبا۔ انجمن در انجمن
جس نے اہلِ خمر کو سکھلائے آدابِ سُرور — جس نے بخشا مسلکِ رندی کو اک تازہ شعور
ماند جس کے نطق کی تابش سے شعلے کی لپک — جس کی فکرِ تازہ میں انگور زاروں کی مہک

دُخترِ رز جس کی کنیزِ زر خریدہ بن رہی
جس کے پیمانے میں ہر مے ناکشیدہ ہی رہی

کیف بن کر جو فضائے لدن پر چھا گیا
جن کو رَم کرتے، اُسی کی بزم میں دیکھا گیا

جوش جیسا خسروِ اقلیمِ ہوش و آگہی ! — اور مے خانے کی دریوزہ گری ! اچھی کہی ؟
جوش پر الزامِ جام و بادہ اے اربابِ ہوش ! — مے پرستی اور عارف ؟ جرعہ نوشی اور جوش ؟
جس کے ہاتھوں میں فروغِ علم و دانش کا علم ! — جانبِ مے خانہ، اُٹھیں ایسے مرشد کے قدم ؟
جوش جیسا نرم خو و نرم خواب و نرم خیز — اور اک آبِ کشیدہ، گرم و تلخ و تند و تیز ؟
جوش سا شکر بیاں اور جوش سا شیریں سخن ! — اور اک زہرِ ہلاہل، فتنۂ کام و دہن ؟
جوش ! یعنی سلسبیل آشام و کوثر نوش جوش — اور اک دُردِ مقطّر شعلہ ناک و شعلہ پوش ؟
جوش ! جس کا نطق شیریں موجِ شہد و انگبیں — اور اک شورابۂ پُرشور و تلخی آفریں ؟
جوش سا مردِ وسیع المشرب و شستہ مذاق — اور اک مشروبِ شدت خیز و شر آمیز و شاق ؟
جوش اک نغمہ گرِ الہام۔ جیتا جاگتا ! — جوش اپنا حافظ و خیام۔ جیتا جاگتا !

عین مستی میں بھی، علم و آگہی کی شان ہے
جوش کی بادہ پرستی، جوش پر بہتان ہے

الطاف مشہدی

ایک افسوسناک خبر سُن کر!

جوش، اے مینارِ عظمت، جوش اے عالی مقام
تیری رندانہ شرافت قابلِ صد احترام
اے محبِ آدمیت تیری کیا ہی بات ہے
مے کدے میں رہ کے بھی تو زندگی کے سات ہے
تیرے ساغر سے اُبھرتے ہیں مہ و مہر و شہاب
تیرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب
خالقِ عزم و بغاوت، صاحبِ حُسن و شراب
ناز تجھ پر کر رہی ہے سر زمینِ انقلاب
دیکھتا ہے زندگی تو موت کے آزار میں
زلزلے آرام کرتے ہیں ترے اشعار میں
کس صداقت سے تو انساں کو یہ دیتا ہے صدا
اُٹھ نہیں سکتی اگر تلوار تو ساغر اُٹھا!
لوچ آجاتا ہے جب تیرے سخن کی چال میں
داغ دُھلتے ہیں دلوں کے آتشِ سیال میں

اے فصاحت کے مسیحا اے بلاغت کے امام
حشر تک تاریخ دہراتی رہے گی تیرا نام

اے حکیمِ زندگی، اے صاحبِ قلب و نظر
اُڑ رہی ہے اک خبر بام و در و ماحول پر
لوگ کہتے ہیں کہ ترکِ مے پہ آخر تُل گیا
جوش بھی اوہام کی پہنائیوں میں گھل گیا
ہم کہ ہیں تیرے تقدس کی قسم کھائے ہوئے
پھر رہے ہیں مے کدے میں آج شرمائے ہوئے
ہم کہ ہیں تیری شریعت تیرے مذہب کے اسیر
بارگاہِ مے کدہ کے صاحبِ عرفاں فقیر!
آنکھ اُٹھ سکتی نہیں زہد و ریا کے سامنے
کون سا منہ لے کے جائیں گے خدا کے سامنے
ہم کہ کرتے ہیں محبت سے ترے فن کو سلام
تُو کہ تجھ سے شکوہ کرتے ہیں نگارِ خوش کلام
جام و مینا سرنگوں ہیں مے کدہ ویران ہے
اے فرشتے لوٹ کر آجا کہ تو انسان ہے
کس قدر الزام ہے تیرے مقدس نام پر
دخترِ رز آنسو بہاتی ہے ترے انجام پر

اس سے بہتر تھا ترا مرنا کہ تُو زندہ نہیں!
ساغرِ صہبا ترا افسوس تابندہ نہیں!

قمر ہاشمی

مرثیۂ جوش

(جوش کو خود اس کے قلم سے مرحوم لکھتے ہوئے دیکھ کر)

ملک میں اک چراغ تھا نہ رہا
کیا عالی دماغ تھا نہ رہا

شاعرِ نغمہ گو ادیبِ شہیر
خوش بیاں، خوش مقال و خوش تقریر

چل بسا ہائے رند خوش اوقات
موت سے پہلے مرگیا ہیہات

اے شہنشاہ معنی و فرہنگ
اے شہنشاہِ شاعری اورنگ

درسِ ذوقِ حیات کس سے لیں؟
شاعرِ انقلاب کس کو کہیں؟

کس سے سیکھیں گے شاعری کے ڈھنگ؟
قوم کو کون دے گا تیغ و تفنگ؟

تیرا ہر شعر تھا حیات بدوش
تیرا ہر نعرہ اک نوائے سروش

کتنے زندہ تھے تیرے احساسات
زندگی پر تھے کتنے احسانات

تھا شعورِ حیات تیری اساس
موت کھاتی تھی تجھ سے خوف و ہراس

موت کی ان دنوں ہے افزونی
رات گر چوگنی تو دن دُونی

پہلے تاثیرؔ، پھر گئے سیمابؔ
زندگی کھا رہی ہے پیچ و تاب

تاجورؔ جا چکے تھے مُلکِ عدم
آرزو کا بھی ہو چُکا ماتم

لوگ منٹو کو رو رہے تھے کل
کھا گئی لو مجازؔ کو بھی اَجل

قاضی عبدالغفّار کر گئے رحلت
اور یگانہؔ بھی ہو گئے رخصت

آہ۔ کس کس کی موت کو روئیں
کیوں نہ تھوڑا سا زہر کھا سوئیں

کون تھا تجھ پہ جو نہ مَرتا تھا
ایشیا سارا ناز کرتا تھا

اصغرؔ و فانیؔ و حفیظؔ و جگرؔ
حسرتؔ و آرزوؔ، فراقؔ و اثرؔ

لوگ جو جا ہیں اُن کو ٹھہرائیں
جوشؔ سا دوسرا تو لے آئیں

ہم نے سب کا مقام دیکھا ہے
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے

جوشؔ کی شاعری سے کیا نسبت؟
موت کو زندگی سے کیا نسبت؟

سحر انصاری

بنامِ جوش ملیح آبادی

ایک مبہم اور کائناتی فکر سے زار و نزار
ایک جاں اور اس میں لرزاں کائناتِ انتشار

ایک چہرہ جس پہ افکارِ جہاں کی جھریاں
اور آنکھیں ساعتِ احساسِ غم کی سوئیاں

گنبدِ ادراک میں جادو جگاتا اک دماغ
ظلمتِ لاانتہائے رنج میں تنہا چراغ

جسم کے گودام میں روحانیت کے حادثے
زیست میں آتش فشاں کہسار کے سو سلسلے

صانعِ تیغِ فراست، قلب کا فولادِ نرم
وقفِ لالہ کاریٔ ہستی، رگوں کا خونِ گرم

فکر پر تسخیرِ مہر و ماہ کا ردِّ عمل
ذہن میں اندیشہ ہائے یورش و جنگ و جدل

اک مفکر، اک ہنرور، ایک شاعر کا یہ حال
جسمِ فانی! ایک روحِ جاوداں کا یہ مآل!

شہرِ احساسات میں آب و ہوا کمیاب ہے
حرف و صوت و لفظ و معنی کی غذا کمیاب ہے

گرگ صورت گوسفندانِ شرافت کے قریب
مار سیرت دوستانِ زشت طینت کے قریب

کور چشموں کی نظر فرسا جسارت کے حضور
بد سرشتوں کی پراگندہ شرارت کے حضور

علم و فن کے پست قد سوداگروں کے درمیاں
سنگ دل، فولاد باطن پتھروں کے درمیاں

دیکھتا ہوں جب تجھے اے خسروِ ملکِ سخن!
خوں رلاتی ہے مجھے ناقدریٔ اربابِ فن

ادیب سُہیل

...خندہ بر لب اِک چراغ

ایک شاعر
اک مفکّر، اک رسول
جس سے ہے آیاتِ فکر و شعر کا ہر دم نزول
جس پہ وا رہتا ہے کارِ معنیٰ صد رنگ کا بابِ قبول
جس سے آگے دو قدم کا فاصلہ، اقلیمِ فن کا عرض و طول

صرصر و طوفاں کے رُخ پر خندہ بر لب اک چراغ
جس سے بہرہ ور ہوئی آدھی صدی
اور اس کی گود کے پروردہ ماہ و سال، لمحے، ساعتیں
ذہن و دل کرتے رہے ہیں جس سے حاصل ـــــ
روشنی، بالیدگی کی نعمتیں

فن ـــ بلند اقدار و احساسات کا اک آئینہ
گامزن ہے بندگی سے کبریائی تک کاسفر کرتا ہوا اک مرحلہ

حلقۂ محدود و کم مایہ کو ٹھکراتا ہوا وسعت بدوش اک سلسلہ
ایسی ہر تحریک ہر انداز سے دامن کشاں
جس میں آجائے نظر رنگ اور عقائد کے تعصب کا ذرا بھی شائبہ

اک تغیر آفریں ادراک کی جوئے رواں
جس کی پونجی جرأتِ بے باک، سیلِ بے عناں
جس کے آگے حرفِ بے معنی ہر اک سنگِ گراں

ایسا اک آہنگ جس کی تال پر مشعل بدست
رقص کرتا ہے رگِ جاں میں لہو کا کارواں
رُوح کی پژمردگی میں موجۂ تاب و تواں

ایسا اک طائر اقامت گاہ جس کی خاکداں
رہتا ہے لیکن فضا میں پرفشاں
عالمِ پرواز میں تسخیرِ کائنات کا جذبہ نہاں

ایسا اک پندار کا ہے گلستاں
جو برائے دوستاں، گل ریز اور عنبر فشاں
اور حریفانِ جفا جُو کے لئے ہر شاخ پر ہنستے ہوئے گل
شعلہ ہائے بے اماں
ہر کلی نوکِ سناں، ہر برگِ گل تیغ تپاں!

جلیل حشمی

نذرِ جوش

جس کے گیت ہیں کھا جو رہا ہو کلا کی شوخ زبان
بول بول میں جس کے جھومیں تھرکیں نرتکیاں

جس کی بانی چاندرات میں کھلتی ہوئی کلی
جیسے بانکی نار چوستی ہو مصری کی ڈلی

جیسے گلی میں ہلکی آہٹ ، جیسے بھرا بہار
جیسے تاج کی سندرتا، جیسے رادھا کا پیار

جیسے سل کو چیرتا جھرنا، جیسے ندی کا شور
جیسے کالی رات میں جگنو، جیسے چھوٹتی بھور

جیسے کلائی میں بجتے گجرے، جیسے دبی مسکان
جیسے پنگھٹ پر گگری چھلکاتی نار جوان

جیسے کسی کو چھیڑتے بانکے کی آنکھوں کا رنگ
جیسے اپنے آپ سے جھینپتی بالی کا انگ انگ

جیسے چنریا میں اٹھتے جوبن کو چھپاتا ہات
جیسے جواہر کی دکاں میں دیوالی کی رات

جیسے کھٹی والیوں کے جھرمٹ میں شوخ کنہائی
جیسے بنجارے کے ہاتھ میں گوری گوری کلائی

جیسے میٹھی لوری کی دُھن، جیسے رَن کا گیت
جیسے برہن کے آنگن میں پُنر ملن کا گیت

جیسے امراجنتا کی دیواریں چِترچِتر
جیسے سونے کی لنکا میں لکشمی کا مندر

جیسے لڑاکے دیوتاؤں کے تیز رتھوں کا شور
جیسے جنم جنم کے پاپی کی پھٹتی ہوئی گور

جیسے کسی باغی کی گردن، جیسے شہید کا نام
جیسے اُبھرتی ہوئی تلواریں جیسے بجتی نیام

جیسے رَن میں لاشیں رَوند کے بڑھتا ہوا سوار
جیسے سرنگا پٹم کی گلیوں میں ٹیپوؔ کی للکار

جیسے ٹوٹتی بجلی کا کڑکا، جیسے بھونچال
جیسے جھما جھم تیغ سے جھن جھن جھنکتی بھاری ڈھال

جیسے چٹانوں سے ٹکراتے دھارے کا کس بل
جیسے گرجتا، برستا، اُڑتا، مڑتا ہُوا بادل

جس کی کلا کے رُوپ انوکھے جوشؔ ہے جس کا نام
خشمی جی اُس امر کوی سے کہیو مرا سلام

تابش اسلم

جوش

نصف صدی سے

تیری آوازوں کا جادو پھیل رہا ہے
قریہ قریہ، نگری نگری، منزل منزل، محفل محفل
تیری آوازیں کہ جن میں لالہ و گل کی مہکاریں ہیں
تیری آوازیں کہ جن میں زنجیروں کی جھنکاریں ہیں
تیری آوازیں کہ جن میں شعلے بھی ہیں شبنم بھی ہے
تیری آوازیں کہ جن میں لاکھوں خون اگلتے بے بس انسانوں کا ماتم بھی ہے

تو وہ مغنی
جس کے سر دلبوں پر خوشیوں کے البیلے گیت ہیں لیکن
جس کا دل زخموں سے بھرا ہے

تو وہ مطرب
جو اپنے ہی ساز کے شعلوں میں جل جل کر راکھ ہوا ہے

تو وہ شاعر
جس نے اپنے سارے دکھ اور درد بھلا کر
دنیا بھر کے غم اپنائے
جس نے اپنے دل کے خوں سے
پت جھڑ کی ویراں راتوں میں دیپ جلائے

تو وہ شاعر
جس کے شعروں میں کرنوں کی شندر تلپ ہے

تو وہ شاعر
جو انساں کے دل اور روح میں زندہ ہے اور زندہ رہے گا!

شہید الاسلام سید

شاعرِ شعلہ و شبنم

شاعرِ شعلہ و شبنم، ترے شیریں نغمے
آج تک گونج رہے ہیں لبِ پژمردہ میں
پھر خموشی پہ تسلط ہے تکلم تیرا
پھر تجھے ڈھونڈ رہی ہے مری بے تاب نظر

شاعرِ آتش و آہن، تری یادوں کی مہک
دل کے آئینے میں چپ چاپ اتر آئی ہے
دستکیں دیتی ہیں آ آ کے سہانی یادیں
پھر یہ معصوم نظر تیری تماشائی ہے

تو سدا خوابِ حقیقت کا طلب گار رہا
تو نے بجھتے ہوئے فانوس شرربار کئے
تیری تخئیل کی لَو سے کئی جادو جاگے
کئی اجڑے ہوئے گلشن گل و گلزار کئے

اے مغنّی! ترے نغمات کی پُرسوز الاپ
تیرے صد رنگ خیالوں کی امیں ہے اب تک
وہ تصور کی تراشی ہوئی آن جانِ فغا
کسی دوشیزہ کے ہونٹوں سے حسیں ہے اب تک

پیغامات، تاثرات

جی۔ اے۔ مدنی

جوش ملیح آبادی عہد جدید کے شعراء میں اپنے بے مثال اسلوبِ ادا، شکوہ الفاظ اور موضوعاتِ نظم کے لحاظ سے اردو شعر کی دنیا میں اہم اور ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔ جدتِ بیان، تازگیٔ فکر، الفاظ کے خوب صورت استعمال، گہری معنویت اور زندگی کی حقیقی ترجمانی کے سبب جوش کی شاعری اُس ادبی اور ذہنی بیداری کا زندہ ثبوت ہے جس کی بنیاد کم و بیش ایک صدی قبل مرزا غالب اور ان کے ادبی رفقائے ڈالی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلی ایک صدی نہ صرف ہماری تعلیمی، معاشرتی، فکری اور عملی زندگی میں طوفان خیز ثابت ہوئی ہے بلکہ اس نے قوم کی ادبی و شعری روایات کو بھی انقلابی رنگ و روپ عطا کیا ہے۔ جوش ملیح آبادی اُسی ذہنی اور ادبی انقلاب کے نقیب و ترجمان ہیں۔ میں مدیر افکار، کراچی، کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے جوش کی زندگی، شاعری، شخصیت اور ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے "افکار" کے "جوش نمبر" کی ترتیب و اشاعت کا فیصلہ کیا۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ خاص نمبر ہر اعتبار سے جوش کی ادبی اور شاعرانہ حیثیت کے شایانِ شان ہوگا۔

ممتاز حسن

جوش کم و بیش چار سال سے ترقیٔ اردو بورڈ میں میرے رفیقِ کار ہیں۔ بہت ہی پیارے اور تقریباً معصوم انسان ہیں۔ اپنے متعلق لوگوں میں غلط فہمیاں پیدا کر دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ اور بعض اوقات تو ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ ان پر فرقۂ ملامتیہ کے صوفی ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اُن کی اس قسم کی کوششوں کا واحد علاج یہ ہے کہ انہیں کچھ عرصہ قریب سے دیکھا جائے۔ میں نے ان سے ملے بغیر جو کچھ سن رکھا تھا، انہیں اس سے سو فی صدی بہتر پایا۔

اُن کی شاعرانہ عظمت کا میں "روحِ ادب" کے زمانے سے قائل ہوں۔ ایک چیز جو اکثر آنکھوں سے اوجھل رہتی ہے اُن کی حیرت انگیز زبان دانی ہے۔ وہ اردو لغت کے خزانچی ہیں۔ اور اردو ادب کی تاریخ میں انشا، نظیر اکبرآبادی اور ایک آدھ اور بڑے آدمی کو چھوڑ کر اس حیثیت سے جوش کا ہم پایہ کم ملے گا۔

ترقیٔ اردو بورڈ میں جوش نے اب تک جو کام کیا ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، البتہ اُن کی فرض شناسی اور محنت کی عادت، بلکہ کہنا چاہیے کہ کام کی لت، ایسی چیزیں ہیں کہ ان کا اعتراف نہ کرنا بڑی بے انصافی ہوگی۔

میں سمجھتا ہوں کہ رسالہ "افکار" نے "جوش نمبر" پیش کرکے زبان اور ادب کی قابلِ قدر خدمت کی ہے۔ میں اس کوشش کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

سیّد ہاشم رضا

تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں کہ اس کش مکش کے باوجود جس میں تم آج کل مبتلا ہو تم نے "جوش نمبر" کے نکالنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان کی شاعری کا مرتبہ بہت بلند ہے، اور وہ خوش نصیب ہیں کہ اُن کی زندگی میں ان کی قدر دانی ہو رہی ہے، یہ عزت تو عموماً مرنے کے بعد ہی ملتی ہے۔ خدا تمہاری محنت کی لاج رکھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی

جوش ملیح آبادی کو ان کی کم عمری کے زمانے سے جانتا ہوں۔ بڑے ہونہار ذہین تھے۔ مذہبی رنگ میں اس وقت اچھا شعر کہتا تھا۔ بزرگوں سے عقیدت تھا بر حد علم تک پہنچی ہوئی ہیں۔ پھر ایک اور کروٹ لی۔ لکھنؤ کی بری صحبتوں میں پڑ کر "شبیر احمد خاں" سے "شبیر حسن خاں" ہو گئے۔ شرافت کے جوہر اس وقت بھی تھے، اب بھی ہیں۔ شاعر بہت اچھے ہیں۔ ندرت تشبیہات تو اُن کا حصہ ہے، زبان پر عبور حاصل ہے۔ کم سے کم، ایک نعتیہ نظم تو بے مثل کہی ہے، اور وہ میں نے ان سے بار بار فرمائش کرکے سُنی ہے۔ لیکن اس روشن پہلو کے ساتھ ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ اس کی طرف سے کیسے آنکھیں بند کر لوں۔ فسق کی جھلک ہم میں سے کس میں نہیں؟ لیکن اس فسق پر علانیہ فخر کرنا، اور اسے مسلمانوں کے دل جلانے کے لئے پیش کرتے رہنا، بڑا ہی تکلیف دہ ہے۔ اور اس سے بڑھ کر شعراً گستاخیاں اور بے ادبیاں، جن میں بجائے کسی گہری حقیقت کے، تمام تر سطحیت ہی ہوتی ہے۔ دلی اور مخلصانہ دعا ہے کہ اپنی زندگی ہی میں اس نامعقولیت سے توبہ نصیب ہو جائے۔ اور ان شاء اللہ ان کی طبعی شرافت سے توقع بھی ایسی کی ہے۔

والسلام

عبدالماجد

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

عزیز محترم:

آپ کی فرمائش کی تعمیل میں چند سطریں رواروی میں لکھ کر ملفوف کر رہا ہوں۔ جوش صاحب سے جو قدیمی نیاز حاصل ہے اس کا تقاضا کچھ اور تھا۔ ع

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

بہر صورت یہ عریضہ گویا اقرار ہے اُس خلوص کا جو مجھے جوش صاحب نیز آپ کی ذات سے ہے۔

نیازمند

اختر حسین (رائے پوری)

یہ دور ایام کی ستم ظریفی ہے کہ اردو شاعری میں جوش ملیح آبادی کے صحیح مرتبہ کا تعین ہنوز نہیں ہو سکا۔ یوں تو اُن کے کلام کی عظمت مسلم ہے جس کا اقرار حلیف و حریف مدت سے کرتے آئے ہیں۔ میر انیس کے بعد کسی اور شاعر نے اردو لغت کا ایسا ہوش ربا طلسم کھڑا نہیں کیا۔ اور ہم عصروں میں بہت کم کو زبان و بیان کی ندرت کے ساتھ فکر و احساس کی ایسی وسعت نصیب ہوئی۔

یہ بھی مبالغہ نہیں کہ دونوں جنگوں کے درمیانی وقفے میں جس نسل کی نشو و نما ہوئی اس کے نیم رومانی نیم انقلابی حوالوں کی ترجمانی اردو میں اس شیوہ بیان سے بہتر کوئی نہیں کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ جوش کے کلام میں اس بحرانی دور کے شور و شغب کے ساتھ اس کی رجائیت اور سرمستی کی کیفیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ جوش ایک مخصوص فلسفۂ زندگی کے قائل ہیں۔ وہ ماحول کو عقل کی کسوٹی پر کستے ہیں۔ اور افسوس ہے کہ آج بھی بعض حلقوں میں یہ رویہ غیر مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی حیثیت غیر متقلد شاعروں کے پیشوا کی ہے۔

وہ ایک ایسے تہذیبی ورثے کی امین ہیں جو اپنی خوبیوں کے باوجود اس تہذیبی خلا سے بہر صورت بہتر تھا جس میں آج ہم آپ سانس لے رہے ہیں۔ انہوں نے صرف زمانے کی آنکھیں ہی نہیں دیکھیں، بلکہ زمانے سے آنکھیں بھی ملائی ہیں اور اسی لئے ان کی نگاہ میں بے باکی اور ان کے لہجے میں صداقت ہے۔

ہمارے نفوس میں جوش اب بھی شاعرِ شباب ہیں، خواہ وہ گذری ہوئی جوانی کا کتنا ہی ماتم کریں۔

ان کی رنگا رنگ شخصیت کے متعلق کیا کیا جائے؛ استادِ فن ہیں اور پیرِ مغاں بھی۔ ان کی سادگی میں ایک عجیب بانکپن ہے اور ایسے اس طبیعت کے لوگ کہاں ملیں گے۔

کاش جوش صاحب کو بادۂ ناب کے ساتھ آبِ حیواں بھی مل جائے کہ وہ رہتی دنیا تک سلامت رہیں۔ یوں اُن کا کلام تو جاوداں ہے ہی۔

کرشن چندر

جوش نوجوان زبان کے شاعر رہے ہیں۔ اُن کے لہجے میں وہی للکار ہے جو ہنگامی شاعری میں نذرل اسلام کے حصے میں آئی ہے۔ اُن کے رومان میں نوجوانوں کا سا جوش ہے۔ اور بغاوت میں اسی طرح کا خروش ہے۔ اس برصغیر میں انہوں نے اُس وقت حریت، صداقت اور آزادی کا علم بلند کیا، جب دوسرے لوگ انگریزوں کی شان میں قصیدے کہتے تھے۔ جوش کی رومانی شاعری نے روایت پسند سماج کی صفیں توڑ دیں۔ اور اپنی باغی شاعری سے ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔ اور آج بھی جوش کا ذہن اتنا ہی باغی، اتنا ہی نوجوان، اتنا ہی شاداب ہے جتنا آج سے ایک ربع صدی پہلے تھا۔ زندگی کے تلخ و تند تجربوں نے جوش کی شاعری کے قوا مضمحل نہیں کئے ہیں۔ بلکہ اُن میں آبِ حیات چھلکایا ہے۔ اور جوش کو زندگی کے گہرے درد اور کرب سے آشنا کیا ہے۔

جوش کو زبان اور فن پر کامل دسترس حاصل ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جوش ایسا قادر الکلام شاعر صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ میرے بزرگ رفیق اور شفیق دوست ہیں۔ اور میں اُن کے لاکھوں پرستاروں میں سے ایک ہوں۔ اور ہر لحظہ اُن کی درازیٔ عمر کے لئے دعاگو ہوں۔

احمد ندیم قاسمی

برادرِ عزیز۔ سلام شوق

گرامی نامہ بہت دنوں سے میرے سامنے ہے۔ مگر اس دوران میں اندھا دھند مصروفیت رہی۔ پھر کوئی تین بار گاؤں جانا پڑا، اور یوں جب بھی واپس آیا۔ پہلے سے زیادہ مصروف ہو گیا۔ نہ جانے آپ کیا سوچتے ہوں گے۔

حضرت جوش کے لئے میرے دل میں بہت محبت اور عقیدت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان پر بہت سا لکھوں، مگر اول تو پیشہ ور نقاد نہیں ہوں، دوسرے آپ نے ایسے وقت پر مجھے اطلاع دی کہ میں کوئی مفصل چیز نہ لکھ سکا۔ ایک پیغام بھیج رہا ہوں، اسے قبول فرمائیے اور مجھے اس کی رسید سے مطلع کر دیجئے۔

خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔

مخلص: ندیم

جوش کی زندگی میں (خدا کرے وہ ابھی مدتوں زندہ رہیں) آپ نے "افکار" کا "جوش نمبر" نکال کر ایک مدیر و شاعر کی حیثیت سے اپنی ایک اہم ــــ ذمہ داری پوری کی ہے۔ اقبال کی زندگی ہی میں صاحب "نیرنگِ خیال" نے "اقبال نمبر" نکالا تھا اس نے ایک خوب صورت روایت کا آغاز کیا تھا۔ جوش ایسا بڑا شاعر بھی اسی بھرپور محبت و عقیدت کا مستحق ہے۔ اور آپ نے اس روایت کو آگے بڑھا کر علم و فن کی کوئی کم خدمت نہیں کی۔

جوش کی انقلابی شاعری اور شبابی شاعری پر نقادوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔ مگر نئے جوش

کے کلام میں جو خصوصیت سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ جوش نے گونگے لفظوں کو زبان دی ہے۔ اس نے اظہار کے ایسے سانچے تیار کئے ہیں کہ صرف ایک سچا اور بڑا شاعر ہی ایسا کرنے پر قادر ہو سکتا ہے۔ جوش روایتی شعلوں سے عمر بھر چونکی لڑتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں وہ تازگی و توانائی کا نقیب ہے۔ روایت اگر اس کے موضوع اور اسلوب کا ساتھ دے سکی ہے تو جوش نے اسے برتنے میں تعصب سے کام نہیں لیا۔ (اس کی بیشتر نظموں میں غزل کی ہیئت، غزل کی متعدد لوازم کے ساتھ استعمال کی گئی ہے) لیکن جہاں روایت (چاہے وہ فکر و خیال کی ہو، چاہے الفاظ و تراکیب کی) اس کے اظہار میں حائل ہونے لگی ہے۔ وہاں جوش نے اس کا سر قلم کر دیا ہے۔ لطف ..... یہ ہے کہ اس طرح اردو شاعری گھاٹے میں نہیں رہی، بلکہ نئے لفظوں، ان لفظوں میں معانی کی نئی پرتوں، اظہار کے نئے تیوروں اور ابلاغ کے نئے اسلوبوں سے مالا مال ہوئی ہے۔

گذشتہ ربع صدی میں ہمارے بیشتر نقادوں نے (تمام نقادوں نے نہیں) اردو شاعروں کی تنقید کے لئے دو پیمانے تراشے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اگر شاعر کے پاس کوئی "پیغام" نہیں ہے تو وہ گردن زدنی ہے۔ دوسرا گروہ (جو دراصل "جدید تر" گروہ ہے اور عنقریب "جدید ترین" گروہ کے لئے جگہ خالی کرنے والا ہے) ولی سے لے کر جوش بلکہ حفیظ و فیض تک کی اردو شاعری کو بے کار اور بے معنی قرار دیتا ہے۔ یوں ان دونوں گروہوں کے نزدیک جوش بس "یونہی سا" شاعر ہے۔

پہلے گروہ کو یہ سوچنے کی توفیق حاصل نہیں کہ بڑے شاعر کے پاس پیغام نہیں ہوتا، ایک اسلوب حیات، ایک طرز زندگی ہوتا ہے۔ اور اسلوب حیات صرف پیغام نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ انسان میں، اس کے معاشرے میں، اس کی تاریخ میں اس کے رشتوں، میلانوں اور مصروفیتوں میں حسن و جمال کی تلاش (جو دراصل حقیقت کی تلاش ہے) ایک اسلوب حیات ہے۔ پیغام نہیں ہے۔ پیغام کا مفہوم محدود کر دیا گیا ہے اور حسن و جمال قطعی لامحدود ہیں۔ محدود ہوں گے تو شاعری مر جائے گی، اور صرف "روشن دانوں کے فائدے" باقی رہ جائیں گے۔ جوش حسن و جمال، توازن و تناسب اور تازگی و توانائی کا شاعر ہے۔ اور اگر اس کے ہاں کوئی منضبط پیغام نہیں ہے۔ (اگرچہ یار لوگ اس کے کلام میں سے بھی پیغام نکال لیں گے) تو خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہے ورنہ ایک بڑا شاعر ہم سے چھن جاتا اور ایک بڑا واعظ اس کی جگہ لے لیتا۔ انسان کو یقیناً بڑے واعظوں کی بھی ضرورت ہے مگر یہاں بحث بڑے شاعروں سے ہے۔

نقادوں کے جدید تر گروہ کا المیہ یہ ہے کہ خود ان کے ممدوحین یعنی جدید تر شعراء کا کلام ہی ان کے نظریۂ تنقید کی نفی کر دیتا ہے۔ اگر ولی، میر، غالب، اقبال اور جوش اردو شاعری کو وہ کچھ نہ دیتے جو انہوں نے دیا ہے تو آج ہمارے جدید تر شعراء اظہار کی لکنت کا شکار ہوتے۔ ممکن ہے یہ شعراء بھی فیشن کے مطابق جوش کو "یونہی سا" شاعر قرار دے کر اپنی انانیت کو تھپک لیتے ہوں۔ لیکن اگر وہ تنہائی میں، دیانت داری کے ساتھ، انانیت کے شکنجے کو طاق پر رکھ کر اپنے ہی کلام پر غور کریں اور اپنی ہی آواز کو کان لگا کر سنیں تو انہیں محسوس ہوگا کہ ان کے کم سے کم آدھے کلام میں جوش بول رہا ہے اور جوش کا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

میں خود کو ایک ایسا شاعر سمجھتا ہوں جس کے پاس کہنے کے لئے چند ایسی باتیں ہیں جو سراسر اس کی اپنی ہیں اور جو یہ باتیں کہتے ہوئے کوشش کرتا ہے کہ سراسر اپنے انداز میں کہے۔ اس کے باوجود مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اردو شعراء میں سے غالب، اقبال اور جوش سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اس اعتراف کو اخلاقی جرأت کا بلند آہنگ نام دے کر میں اپنے آپ کو فریب نہیں دوں گا۔ البتہ اسے اظہار حقیقت ضرور کہوں گا۔ اور فنکار سب کچھ کر سکتا ہے مگر حقیقت کے اظہار میں بخل سے کام نہیں لے سکتا۔

پیر حسام الدین راشدی

محترمی جناب صہبا صاحب۔ السلام علیکم
فارسی کے مشہور شاعر صائب تبریزی کا ایک شعر ہے سہ

بے اجل، یاد کسے خلق بہ نیکی نکند
مرگ، ایں طائفہ را، بر سر انصاف آرد

آپ نے مردہ پرست قوم میں رہ کر، ایک زندہ صاحب علم و فن۔ یعنی اردو کے لافانی اور خوش نوا شاعر حضرت جوش کے بارے میں، خاص نمبر، نکالنے کا ارادہ کرکے، اس شعر کے مفہوم کو قطعی غلط ثابت کر دیا۔ جس کے لئے میری طرف سے کیا: پوری اردو دنیا کی جانب سے آپ ہزار تحسین و آفریں کے مستحق ہیں۔
ہاں! ایک بات البتہ غور کے قابل ہے۔ حضرت جوش اپنے آپ کو برسوں سے "مرحوم" لکھ رہے ہیں۔ کیا آپ کی طرف سے "بر سر انصاف آنا"، کہیں اسی لفظ کا نتیجہ تو نہیں؟ حالات نیز گرد و پیش کو نظر میں رکھ کر آپ خود غور فرمائیں گا۔ اگر واقعی ایسا ہے تو صائب کا شعر تو اب بھی اپنی جگہ اٹل ہے۔ والسلام۔

مولانا رازق الخیری

صہبا صاحب۔ السلام علیکم۔
جوش صاحب کی بعض نظمیں جو حضرات پسند نہیں کرتے جوش کی شاعرانہ عظمت سے وہ بھی انکار نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جوش ہمارے مایۂ صد ناز و افتخار شاعر ہیں۔ ان کی بعض نظمیں جذبات نگاری اور مناظر کشی کے اعتبار سے لاجواب ہیں اور بے مثل اور دنیا کے بہترین ادب میں ان کا شمار کیا جائے گا۔
حضرت جوش الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ مشرق کے بہت کم شعرا کے کلام میں الفاظ کا اتنا زبردست ذخیرہ ملے گا جتنا جوش صاحب کی نظموں میں ہے۔ الفاظ سے جوش نے جادوگری کی ہے۔ اگر لفظ حسین ادب کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے تو یہ کہنا غلط نہیں کہ جوش کی نظموں میں حسن و جمال کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ جوش کا ادب میں کیا درجہ اور ہماری زبان میں کیا مقام ہے؟ ہم ابھی تک اچھی طرح نہیں سمجھے۔ ہم مردہ پرست ہیں۔ زندگی میں کس کی قدر کی جو جوش کی قدر کریں گے؟ پھر عصبیت اور تعصب نے بھی تو ہمارے ذوق کو مجروح کر رکھا ہے۔ مستقبل فیصلہ کرے گا کہ جوش نے اردو ادب کو کس قدر مالا مال کیا ہے۔
افکار کا جوش نمبر یا نج ساڑھے پانچ سو صفحوں کا شائع کرنا اردو رسائل کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے۔ زندہ ادیبوں میں سب سے پہلے رسالہ "ساقی" نے سنہ ۳۴ء کے لگ بھگ "چغتائی نمبر" شائع کیا تھا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ سب مضامین خود مرحوم مرزا عظیم بیگ چغتائی کے لکھے ہوئے تھے۔ ہاں مولوی عبدالحق مرحوم کے متعلق کسی پرچے نے کوئی خاص نمبر شائع کیا تھا۔ مگر ادبی رسالوں میں افکار پہلا پرچہ ہے جو اردو کے ایک عظیم المرتبت زندہ شاعر کے متعلق ایک مخصوص نمبر شائع کر رہا ہے۔ اتنے ضخیم نمبر کے لئے مضامین اور وہ بھی سطحی نہیں معیاری، تحقیقی، تنقیدی حاصل کرنے

میں آپ نے جو سخت محنت اور کوشش کی ہوگی، ان مضامین کی کتابت کرانے میں جو پاپڑ بیلنے پڑے اور طباعت وغیرہ کے سلسلے میں پریس جو بھاگ دوڑ کرنی پڑی ہوگی، اس محنت، مشقت، ان مشکلات اور پریشانیوں کا تو وہی اور صرف وہی مدیرانِ رسائل اندازہ کرسکتے ہیں جنہوں نے خود ایسے ضخیم نمبر شائع کئے ہیں۔ آپ ہی کا حوصلہ ہے کہ افکار کا جوش نمبر شائع کر رہے ہیں۔ صد آفریں ہے آپ کی ہمت پر۔

عبدالخالق عبدالرزاق

مکرمی صہبا صاحب تسلیم۔

مجھے یہ معلوم کرکے بے حد مسرت ہوئی کہ آپ نے "افکار" کا جوش نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس اشاعت خاص کے ذریعے حضرت جوش ملیح آبادی کی شاعری اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کا جو موقع آپ نے فراہم کیا ہے یہ غالباً زندہ پرستی کی قابل قدر مثال ہوگی۔ اور میں آپ کو اس مبارک اقدام پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

اپنے مشاہیر کی حوصلہ افزائی کرنا زندہ قوموں کا شیوہ ہوتا ہے۔ لیکن افسوس ہمارے ہاں زندگی میں ان کی قدر نہیں کی جاتی۔ کاش ہم لوگ اپنی روش کو بدلیں اور مردہ پرستی کے بجائے زندہ پرستی اپنا شعار بنائیں۔

آپ نے جوش صاحب کے بارے میں کچھ لکھنے کے لئے فرمایا ہے۔ حیران ہوں کہ میں کیا لکھوں؟ — جوش کو بحیثیت شاعر کے سمجھنا اور اس پر اظہار خیال کرنا میرا منصب نہیں ہے۔ کیونکہ ؎

اک محلے میں تھا ہمارا گھر
اس میں رہتے تھے ایک سوداگر

اور میں اسی سوداگر برادری کا ایک فرد ٹھہرا۔ اس لئے جوش صاحب کی شاعری پر کچھ لکھنا ایک بساطی کی بساط سے قطعی باہر ہے۔

جوش صاحب میرے دوست ہیں اور میں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اور بحیثیت انسان کے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں۔ ان کی طبیعت میں بے پناہ جوش و ولولہ ہے۔ بے باکی و بے ساختگی ان کے کردار کی اہم خصوصیات ہیں۔ مخالف سے مخالف اور نہایت ناساعد حالات کا مقابلہ پامردی سے کرنا ان کی زندگی کا ایک مشغلہ بن گیا ہے۔ پھر سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ ایسے غیور اور وضعدار انسان ہیں جن پر غالب کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر ز موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

جوش صاحب کے بارے میں ان ہی چند تاثرات پر اکتفا کرتا ہوں۔

عبدالحفیظ خاں

انگریزی شاعر KEAT نے بڑی عارفانہ بات کہی ہے 'Beauty is truth, truth is beauty'

جشن جوش کے سلسلہ میں

ایک یادگار

ادبی شام

اردو کے عظیم المرتبت شاعر حضرت **جوش** ملیح آبادی کی ۶۵ ویں سالگرہ کے موقع پر کراچی کے مختلف اداروں اور افراد نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ اس جشن جوش کے سلسلے میں یہاں کراچی کے دانشوروں نے متعدد تقاریب منعقد کیں جن میں اردو ادب کے مشہور و معروف مجلہ **افکار** کراچی نے ضخیم و عظیم جوش نمبر بھی پیش کیا۔ افکار کے مدیر جناب صہبا لکھنوی نے اپنے محدود ذرائع و وسائل کے باوجود جس محنت شاقہ سے ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل جوش نمبر شائع کیا ہے۔ اسے کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جو نمبر کی ضخامت اسکے معنوی حسن کے پس منظر میں ان کے حالات، عزم و استقلال اور ادبی خدمات سے واقف ہیں۔ افکار اردو ہی نہیں ایشیائی زبانوں میں پہلا ماہنامہ ہے جس نے کسی ادبی شخصیت کی عظمت کا اس کی زندگی میں بھرپور اعتراف کیا ہے۔ اور ایک نئی روایت کا آغاز کر کے مردہ پرستی کی قدیم روایت پر کاری ضرب لگائی ہے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ افکار کراچی نے ایک قدیم مذموم رجحان کو ختم کرنے کیلئے جو قدم اٹھایا ہے اسکے نتیجہ میں آئندہ ادبی شخصیتوں کو افراد اور ادبی پرچوں کی ناقدری

☆ ☆ ☆

دائیں سے بائیں: سید محمد تقی، شاہد احمد دہلوی، ماہر القادری، حضرت جوش، [illegible] صدیقی، صہبا لکھنوی، [illegible] دہلوی
کیمرہ کی طرف پشت کئے ہوئے دائیں جانب ابراہیم جلیس، اور بائیں جانب عالمگیر ...

حسن ہی حقیقت ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ ہر حقیقت حسن ہے۔ جوش کی حسن کاریاں یہ محسوس کراتی ہیں کہ خدا حسن ہے۔ انسانی پیکرِ حسن کا ایک دریچہ ہے جس میں سے حسنِ ازل جھانکتا ہے۔ جمنا کے کنارے والی رنگین کلائیوں کو جوڑے فردوس کے دروازے تک پہونچا دیتی ہے۔ اُس کا بھگوان جیسا سندر مکھڑا۔ کنول پھول ہے، قرآن صفت ہے، خدا نما ہے۔ جوش حسن کا رسیا ہے ''دایۂ حسیناں بھی۔ مشتریٔ حسن بھی ہے اور مصورِ حسن بھی۔ حسن ساز بھی، خدا طلب اور خدا نما بھی۔ حسن کاری اس کی غماز ہے۔ ع

دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگری

مہدی علی سلجوق

''جوش نمبر'' نکال کر آپ نے ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ خدا آپ کو اور افکار کو اور آپ کے کاموں کو زندہ رکھے۔ آمین۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

سنہ ۱۹۲۹ء کے ابتدا میں جب علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم نے مدراس، میسور، بنگلور اور حیدرآباد دکن میں لیکچر دینے کا سفر اختیار کیا تو راقم الحروف بحیثیت مصاحب ہمراہ تھا۔ یہ ایک طویل اور بہت دلچسپ داستان ہے۔ مگر یہاں مختصراً عنوان بالا کے تحت محض اسی قدر عرض ہے کہ جب ہم لوگ علامہ مرحوم کی معیت میں ۱۲ رجنوری سنہ ۲۹ء کی صبح کو بذریعہ ریل بنگلور سے سکندرآباد (حیدرآباد دکن) ریلوے اسٹیشن پر پہونچے تو عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور دیگر حکام نے علامہ کا بہت شاندار استقبال کیا۔ اور آپ کو شاہی مہمان کی حیثیت سے ولا ڈاوسٹا پیلس میں ٹھہرایا گیا۔ قیام کے دوسرے روز شام کو جو اصحاب ڈاکٹر صاحب سے ملنے آئے ان میں خاص کر یہ حضرات قابلِ ذکر ہیں:
مرحوم مولانا عبداللہ عمادی، مرحوم سید ابراہیم ندوی، ڈاکٹر عبدالحق مرحوم پروفیسر عربی عثمانیہ یونیورسٹی، ......
ڈاکٹر مظفر الدین قریشی مرحوم اور جناب شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی۔ یہ سب حضرات دیر تک مختلف امور پر گفتگو کرتے رہے۔

حضرت جوش نے نہایت مودبانہ انداز میں علامہ سے اپنے مکان پر چلنے کی دعوت کے لئے درخواست کی جسے علامہ نے نہایت اصرار کے بعد قبول فرمالیا۔

حضرت جوش کا حیدرآباد سے تعارف کرانے میں علامہ اقبال کا ہاتھ تھا۔ حضرت جوش راقم کے خیال میں اقبال کو دعوت دے کر سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ویسے حضرت جوش کو ایک شاعر کی حیثیت سے بھی یہ حق حاصل تھا کہ اپنے ایک ہم عصر و بلندپایہ شاعر کو اپنے ہاں دعوت دے کر افتخار حاصل کرتے۔ اگرچہ دونوں کے میدانِ شعر شعر و شاعری میں بُعد ہے۔

چنانچہ اگلے روز علامہ اقبال بعض احباب کے ساتھ جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا حضرت جوش کے مکان پر تشریف لے گئے۔

حضرت جوش نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق جائے کا نہایت سلیقے سے انتظام کیا تھا، اور اپنے خاص خاص احباب کو بھی مدعو کیا تھا۔

اس دعوت میں حضرت جوش نے ہر چند کوشش کی کہ علامہ اقبال اپنا کلام سنائیں۔ مگر انہوں نے معذرت کی۔ ہاں جوش صاحب نے اپنا کلام بستہ جستہ پیش کیا۔ اگرچہ یہ اجتماع کچھ دیر ہی رہا مگر نہایت پر لطف اور یادگار تھا۔

حضرت جوش اس زمانے میں دارالترجمہ میں ناظر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اور تراجم کی زبان کو درست کرتے تھے۔ وہیں دوران قیام حیدرآباد ہمیں علم ہوا کہ حضرت علامہ اقبال نے جناب جوش کو قبل ملازمت حیدرآباد دکن ایک تعارف نامہ بنام مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت پیشکار مدارالمہام و صدر اعظم حیدرآباد دکن لکھ کر دیا تھا جو حسن اتفاق سے آج بھی محفوظ ہے۔ اس خط میں علامہ اقبال لکھتے ہیں:

لاہور۔

۱۴ر جنوری ۲۴ء

سرکار والاتبار تسلیم۔

نوروز کارڈ کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ میں یکم جنوری سے ۹ر جنوری تک لاہور سے باہر تھا۔ نواب صاحب کرنال (پنجاب) کے مقدمات کی خاطر اتنے روز پنجاب سے باہر پھرنا پڑا۔ وہاں سے واپس آیا تو سرکار عالی کا نوروز کارڈ ملا جو حقیقت میں نصف ملاقات تھا۔ سرکار اور صاحبزادگان والاتبار کی تصویریں نہایت صاف اور ستھری ہیں مصور کا فن قابل داد ہے۔

یہ خط شبیر حسن صاحب جوش ملیح آبادی (لکھنؤ) کی معرفی کے لئے لکھتا ہوں۔ یہ نوجوان نہایت قابل اور ہونہار شاعر ہیں۔ میں نے ان کی تصانیف کو ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا ہے۔ ذاتی خداداد قابلیت کے علاوہ لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے ہیں جو اثر و رسوخ کے ساتھ لٹریری شہرت بھی رکھتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ سرکار ان کے حال پر.... نظر عنایت فرمائیں گے۔ اور اگر ان کو کسی امر میں سرکار عالی کے مشورے کی ضرورت ہوگی تو اس سے دریغ نہ فرمائیں گے۔

سرکار والا کی شرفا پروری کے اعتماد پر اس درخواست کی جرأت کی گئی ہے۔ امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

مفصل عریضہ انشاء اللہ پھر لکھوں گا۔

مخلص: محمد اقبال۔ لاہور

(منقول از "شاد و اقبال" مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ص ۱۰۹)

اس کے بعد جوش صاحب سے دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں اکثر ملاقات ہوئی، اور ہمیشہ آپ کو زنگین مزاج اور خوش وضع ہی پایا۔

مجھے جون سنہ ۱۹۴۰ء سے اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء تک پونا، دکن کالج میں بوجہ ملازمت قیام کا اتفاق ہوا۔ اور اُن دنوں یہ مقام بعض فلم کمپنیوں کی وجہ سے بھی زیادہ مشہور ہوگیا تھا جن میں خاص طور پر شالیمار پکچرز قابل ذکر ہے۔ اس کے مالک ڈبلیو زیڈ احمد نے فنونِ لطیفہ اور ادب سے گہری دلچسپی کے باعث بعض چیدہ چیدہ اہل قلم، شعراء اور فن کاروں کو جمع کر رکھا تھا جو بجائے خود ایک داستان ہے۔

سنہ ۱۹۴۵ء کا ذکر ہے کہ ڈبلیو زیڈ احمد مشہور قصہ پرتھوی راج اور سنجوگتا کو فلما رہے تھے، اور اس کے لئے خاص تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چنانچہ راقم نے بھی ان کی دعوت پر پرتھوی راج چوہان اور سلطان شہاب الدین غوری سے متعلق جو تاریخی پس منظر تھا، مہیا کیا۔ اس تصویر کے گانے جوش صاحب لکھنے کے لئے وہاں موجود تھے۔ وہ اس تصویر سے قبل ڈبلیو زیڈ احمد کی مشہور تصاویر "من کی جیت" اور "ایک رات" کے لئے گانے لکھ چکے تھے۔ اور یہ فلم اپنی بہت سی خوبیوں کے علاوہ اپنے گانوں کی وجہ سے بھی ملک بھر سے خراج تحسین حاصل کر چکی تھی۔ اور بعض گانے اس وقت تک ہندوستان کے گلی کوچوں میں زبان زد خاص و عام تھے۔

چنانچہ حضرت جوش نے سنجوگتا کے لئے گانے لکھے۔ جس کے فوراً بعد ڈبلیو زیڈ احمد نے "میرابائی" فلمانے کا اعلان کیا اس میں تمام تر بھجن تھے۔ پھر بھی حضرت جوش کے گانے اس میں کام آئے۔

اسی اثنا میں اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان ظہور میں آگیا، اور ہم لوگ ہجرت کر کے وطن آگئے۔ اور حضرت جوش ہندوستان ہی میں رہے۔ حتیٰ کہ حضرت جوش بھی کافی عرصے بعد ہجرت کر کے پاکستان تشریف لے آئے۔

جوش صاحب سے جب بھی ملنے کا اتفاق ہوا، انہیں ہمیشہ ہشاش بشاش پایا۔ انسان ان کی صحبت میں کبھی اداس نہیں رہ سکتا۔ بعض اوقات وہ بالکل ایک معصوم بچے کی طرح نظر آتے ہیں۔ آپ کا ہر کلمہ اردو زبان کی سند ہوتا ہے، آپ کو زبان پر خاص قدرت حاصل ہے۔

ابھی ۱۰ ر اکتوبر ۱۹۶۱ء کو میں اپنے محترم و عزیز دوست پیر حسام الدین راشدی اور دیگر احباب کی معیت میں جوش صاحب کے دولت کدے پر ان سے ملا۔ ان دنوں آپ کی طبیعت ناساز تھی۔ پھر بھی بڑی محبت سے ملے اور تازہ کلام سے بھی نوازا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عرصۂ دراز تک سلامت رکھے۔

پاکستان رائٹرس گلڈ

جناب جوش ملیح آبادی اردو کے اکابر ادبا میں شمار ہوتے ہیں، اور یقیناً اس کے اہل ہیں کہ ثقافتی ادارے ان کے نام اور کام کی توقیر بڑھانے کے لئے نہ صرف خاص شمارے نکالیں بلکہ خصوصی اجلاس بھی منعقد کریں، اور ہر ممکن طریقے سے عوام و خواص کو جناب جوش کی شخصیت اور ان کے ادب سے تفصیلی طور پر متعارف کرائیں۔ ادارۂ "افکار" کا یہ فیصلہ قابلِ صد ستائش ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ نمبر جوش صاحب کی شایانِ شان مرتب کیا جائے گا۔

نذرانے عذرانے

سجاد انصاری

دسمبر سنہ ۱۹۲۰ء کے معارف میں مولوی عبدالماجد صاحب مؤلف "فلسفۂ جذبات" نے اس تصنیف (محرابِ ادب) پر تنقید فرمائی ہے،

> دنیا میں جتنے الہامی شاعر ہوئے ہیں، سب اپنا اپنا ایک مستقل پیام لے کر دنیا میں اس کی تبلیغ کے لئے آئے تھے۔ حافظ، عمر خیام، ٹیگور، اکبر وغیرہ کل پیمبران سخن اپنے اپنے پیام (فلسفۂ حیات) کو دنیا کے کانوں تک پہونچا چکے ہیں۔ جوش کے الہامی شاعر ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ ایک مستقل پیام کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں۔

مجھ میں اس قدر صبر و تحمل نہیں کہ حافظ، عمر خیام، اور غالب کے ایسے پیمبرانِ سخن کے مقابلے میں جوش کی پیمبری کا ذکر سنوں، اور اس کے خلاف نہایت شائستہ خیالی کے ساتھ منطقی دلائل پیش کروں۔ شاعری پر تنقید کے لئے صرف ۔۔۔ ذوقِ صحیح کی ضرورت ہے۔ "فلسفۂ خشک" "فلسفۂ تر" کی صحیح تنقید نہیں کر سکتا۔ یہی باعث ہے کہ مؤلف "فلسفۂ جذبات" رموزِ شاعری سے نا آشنا رہتا ہے۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

جوش کی شاعری نے ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ آنکھیں نیچی کئے بغیر اپنی شاعری کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں۔

جگر مراد آبادی

ہماری شاعری اگرچہ دو سو سال سے فارسی کی تقلید کر رہی ہے۔ مگر کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایک حافظ یا سعدی نہ پیدا ہو سکا۔ لیکن آج جوش کی غزلوں یا نظموں کو سن کر محسوس ہونے لگتا ہے کہ بلبلِ شیراز اردو میں نغمہ سرا ہے

وہی جوش و خروش ہے وہی اندازِ بیان۔ وہی دل نشینی ہے اور وہی طرزِ کلام۔ لیکن ان کے یہاں حافظ کی روحانیت نظر نہیں آتی۔

نجم آفندی

"جوش نمبر" کی اطلاع میرے لئے بڑی مسرت کا باعث ہوئی۔ موصوف میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ اگرچہ طبیعتوں میں اختلاف ہے۔ لیکن شاعری وہ شئے مشترک ہے جس کی وجہ سے وہ محبوب ہیں۔ میں آج کل مریض و فریش ہوں۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل پوری طرح نہیں کر سکتا۔ ایک قطعہ پیش کر رہا ہوں جس سے معلوم ہو سکے گا، یہ انہیں کتنا یاد کرتا ہوں اور کتنا عزیز رکھتا ہوں ؎

حلقہ میں لیا حسن کے آغوش نے جس کو
ڈرتے ہوئے دیکھا دلِ باہوش نے جس کو
وہ بھی حصہ ہے ہمارا شترا کا
"شہرِ لب و رخسار" کہا جوش نے جس کو

سید اختر علی تلہری

آپ کا یہ عزم قابلِ صد ستائش ہے۔ خدا آپ کو اس مقصد میں کامیاب کرے۔ جوش کو نظر انداز کر دینے کی کوششوں کا لگاتار سلسلہ جاری ہے۔ میں ادبیات میں ان باتوں کو بہت ناپسند کرتا ہوں۔ مگر اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے ادیب اس گناہ کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ اپنے دوستوں کو ضرورت سے زیادہ جا و بے جا طریقوں سے ابھارنا اور ان لوگوں کو جن سے ذرا بھی رنجش ہے نظر انداز کرنے کی سعی کرنا انہوں نے اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ اس کے مظاہرے برابر رسائل اور اخبارات میں نظر آتے رہتے ہیں۔

امام اکبر آبادی

شاعری نے آپ کو جوش کے نام سے مشہور کیا، اور شاعری کے شباب نے شاعرِ انقلاب کے درجے تک پہونچا کر دم لیا۔ جوش کی شاعری میں ایسے اشعار بے شمار ہیں جنہوں نے بوڑھوں کو جوان بنا دیا۔ یہ وہ شاعری ہے جو عرب کے شعرا کا شغلہ تھی۔ جوش کے کلام میں شروع سے آخر تک کسی گوشے میں حسرت و یاس، نا امیدی و ہراس نظر نہیں آتی، بلکہ شوکتِ الفاظ، شانِ خودداری، دلیری، شجاعت اور سطوت کارفرما ہے۔ جو بیمار دلوں کے لئے مسیحائی کا کام کرتی ہے، جوش کا پیام اقبال کی طرح اسلامیات کے دائرے میں محدود نہیں ہے بلکہ یہ تمام انسانوں کو حصولِ آزادی کی طرف آواز دیتا ہے۔

فراق گورکھپوری

"جوش نمبر" کے بارے میں آپ کا خط ملا۔ عموماً علیل رہتا ہوں، پھر ایک پورا مقالہ لکھنے کی سکت بھی اپنے اندر نہیں پاتا

جوش کو میں "شاعرِ اعظم" مانتا ہوں، اور اپنا جگری دوست بھی سمجھتا ہوں۔ لیکن بہت سے نہایت ناخوشگوار اثرات بھی انہوں نے مجھ پر پیدا کر دیئے ہیں۔ اور یہ اثرات اندازاً ۱۶ یا ۱۷ برس سے اب تک پیدا ہوتے چلے ہیں۔ ان سب کی مدلل وضاحت کر دوں تو میرا یہ مضمون بھی میرے دوست جوش کے حق میں شاید اچھا نہ ثابت ہو۔ ایک بار پھر جوش کی غیر معمولی قادر الکلامی کا اعتراف کرتا ہوں، اور یہ اعتراف بالکل رسمی نہیں ہے۔ (۲۳ مارچ ۶۱ء)

سجاد ظہیر

جب وہ (جوش) جلسے میں موجود ہوتے تھے تو جو کوئی بھی کچھ پڑھتا تھا یا بولتا بھی تھا، اسے یہی خدشہ لگا رہتا تھا، کہ کہیں زبان، محاورے یا تلفظ کی کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی۔ زیر و زبر کی ذرا سی بھی غلطی یا لفظ کے غلط استعمال سے فوراً اُن کے ماتھے پر بل پڑ جاتا تھا۔ اور اگر وہ فوراً نہ بھی ٹوکتے، تو ایسی صورت بنا لیتے تھے جیسے انہیں کوئی جسمانی چوٹ لگ گئی ہے۔

ایک بار وہ میرے یہاں آئے تو دورانِ گفتگو میں نے اُن سے پوچھا:

"آپ پُونا سے کب تشریف لائے؟"

بجائے اس کے کہ وہ میرے سوال کا جواب دیں وہ رضیہ کی طرف ایک بارگی مڑ کر پوچھنے لگے "یہاں کہیں زہر ملے گا؟ مجھے تھوڑا سا منگا دو۔ ہم تو اب زہر کھا لیں گے۔"

رضیہ اور میں حیران ہو کر ان کا منہ تکنے لگے کہ آخر ہم سے ایسی کون سی گستاخی ہوئی جس پر اتنے ناراض ہو گئے۔

رضیہ نے پوچھا "کیا بات ہوئی جوش صاحب؟"

میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ "یہ حضرت اردو کے ادیب ہیں، اور تم اردو کی عالم فاضل ہو۔ جب تمہارے گھر میں بھی یہ سنوں کہ "آپ پُونا سے کب آئے؟" تو بتاؤ کہ اب میں زہر نہ کھاؤں تو اور کیا کروں؟ "گھوڑا کی دُم" بھی بولا کرو!"[1]

---

[1] 'پُونا' اور 'پُونے' کی یہ بحث یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ اتفاق سے اس واقعہ کے چند روز بعد مولانا ابوالکلام آزاد بمبئی تشریف لائے، اور میں جوش صاحب کے ہمراہ ان کی قدم بوسی کے لئے گیا۔

دورانِ گفتگو میں مولانا نے بھی پُونا کا استعمال اسی طرح کیا، جس پر جوش صاحب نے مجھے ٹوکا تھا۔ اب میں جوش صاحب کی طرف فاتحانہ انداز میں دیکھ کر مسکرانے لگا۔

مولانا نے دریافت کیا کہ "کیا بات ہے؟"

میں نے اُن کو سارا واقعہ سنایا۔

مولانا ہنسے اور انہوں نے فتویٰ دیا کہ "پُونا یا پُونے دونوں طرح سے اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

جوش صاحب بھی مولانا کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ اس وقت تو کچھ نہیں بولے۔ لیکن باہر نکل کر مجھ سے کہا۔

"مولانا غلطی پر ہیں۔"

ہم جوش صاحب سے کبھی کبھی معذرت کرتے کہ آپ زبان کے معاملے میں بہت سخت گیر واقع ہوئے ہیں ۔ وہ ہمیں جواب دیتے :

"تم لوگ جب انگریزی بولتے ہو تو گرامر کا بہت خیال رکھتے ہو۔ مثلاً کبھی یہ نہیں کہتے کہ آج Fifth یا Sixth جنوری ہے ۔ ہمیشہ ففتھ یا سکستھ جنوری کہتے ہو۔ پھر جب اردو بولتے ہو تو اس کے قواعد کا کیوں خیال نہیں رکھتے۔ پانچ یا چھ جنوری کیوں کہتے ہو؟ پانچویں یا چھٹی جنوری کیوں نہیں کہتے؟ جو صحیح ہے ۔ اپنی زبان نے کیا قصور کیا ہے کہ اسے غلط بولا جائے؟

ہم لاجواب ہو کر کہتے کہ زبان میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں، اور اتنی سختی کرنے سے اس کی ترقی رک جائے گی۔

اس پر وہ کہتے کہ غلطیوں کو عام کرنے کے معنی ترقی نہیں ۔ نئے لفظ ضرور گڑھے جائیں ۔ نئے محاورے استعمال کئے جائیں ۔ نئے خیالات کے استعمال کے لئے نئی ترکیبیں بنائی جائیں لیکن زبان کے قواعد و ضوابط اور اس کے مزاج کو ملحوظ خاطر رکھ کر ۔ ورنہ زبان بنے گی نہیں بلکہ بگڑے گی۔

زبان کی صحت پر جوش صاحب کا اصرار ترقی پسند مصنفین کے لئے بہت مفید اور ضروری تھا ۔ مطالب کو ادا کرنے کے لئے الفاظ اور محاورات کا ٹھیک انتخاب شعر میں (اور ادب میں عام طور سے) مضمون اور خیال اور ان کی مخصوص فضا اور مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے لفظوں کے صرف، مطالب و معنی کا ہی نہیں، بلکہ ان کی روایتوں اور علاقوں کا خیال رکھنا، کلام کی تاثیر اور تکمیل کی ایک لازمی شرط ہے ۔ اس قسم کی صلاحیت کا پیدا ہونا ادیب کی فطری ذہانت پر ایک حد تک مبنی ہے ۔ دوسری طرف اس کے ذوق سلیم کی تربیت، اساتذہ اور مستند زبان دانوں کے کلام کے مسلسل مطالعہ اور علم، نیز اپنی زبان بولنے والوں کے مختلف طبقوں اور گروہوں کے روزمرہ کے سننے اور اس کی واقفیت سے ہی ہو سکتا ہے ۔ اور ان طریقوں سے حاصل کیا ہوا ادبی ادراک، لکھنے کی مشق اور مہارت کے ذریعے سے ہی پختہ ہو سکتا ہے ۔

تاہم جوش صاحب کی تنقید صحیح ہوتے ہوئے بھی اور ان کی مسلّم انقلاب دوستی کے باوجود ہم میں سے بعض کو نامکمل معلوم ہوتی تھی ۔ اور ان میں قدامت پرستی کا رنگ نظر آتا تھا ۔ جس طرح ان کے کلام میں کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ ترقی پسند خیالات کے ہوتے ہوئے، نوابی ٹھاٹ سے ملبوس ہیں ۔ اور ان کی فکر جمہور کی طرف دار ہوتے ہوئے، بھی محنت کشوں کی سانس کی گرمی اور ان کے خون کی حرارت نہیں رکھتی ۔ ان کا دل عوام کے لئے دھڑکتا ہے، لیکن عوام کا نہیں ہے ۔ اس طرح سے ان کی تنقید کسی استاد کی طرح زبان کی فروگذاشتوں سے تو ہمیں مطلع کر دیتی ہے ۔ لیکن ترقی پسند ادیبوں کے سامنے نئے عہد نئے ماحول سے مطابقت رکھتے ہوئے اور نئے کاموں کو انجام دینے کے لئے جدید ادبی تخلیق کے جو پیچیدہ مسائل ہیں، ان پر روشنی نہیں ڈالتی ۔

کلیم الدین احمد

جوش کی شاعری عصر حاضر کی فضا میں سانس لیتی ہے ۔ وہ حسن و عشق کی داستان پارینہ سے کنارہ کش ہوتے ہیں اور انقلابی شاعری کے جوہر چمکاتے ہیں ۔ اپنی شاعری کا مقصد وہ ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں ؎

قوم کو جذبۂ بیدار دیئے دیتا ہوں　　قوم کے ہاتھ میں تلوار دیئے دیتا ہوں

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب　　　　میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

آل احمد سرور

(۱)

مکرمی صہبا صاحب تسلیم

نومبر کے آخر میں آپ کا خط ملا تھا۔ "جوش نمبر" کا خیال اچھا ہے۔ گو ان پر معروضی نظر آسان نہیں۔ آپ جانتے ہیں میں کتنے ضروری اور غیر ضروری کاموں میں گھرا رہتا ہوں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ نمبر کب تک شائع ہوگا؟ اگر فروری میں شائع ہو رہا ہے تو میں کچھ نہ لکھ سکوں گا۔ آخر جنوری میں انجمن کی کل ہند کانفرنس ہو رہی ہے۔ اور شروع فروری میں کچھ ادبی قرضے اتارنے ہیں۔ ہاں اگر آخر فروری تک گنجائش ہو تو کچھ لکھ سکتا ہوں۔

آپ بڑا مفید کام کر رہے ہیں۔ "افکار" اِدھر کچھ دنوں سے نہیں دیکھا۔ پہلے تو برابر آتا تھا۔ کتابیں بھی آپ کے یہاں سے بہت اچھی اچھی نکلی ہیں۔

بھائی، مردہ پرستی کی طرح زندہ پرستی بھی اچھی نہیں۔ ہاں دونوں کے ساتھ انصاف ضروری ہے۔ آپ کا "جوش نمبر" نکالنا اس لحاظ سے اچھا ہے کہ ہم ان لوگوں کی قدر کریں جو ابھی خدا کے فضل سے ہمارے درمیان ہیں اور محض اس وجہ سے انہیں نظرانداز نہ کریں کہ وہ ابھی موت کے دروازے سے نہیں گذرے۔ جوش کا کارنامہ اتنا وسیع ہے اور اس کی عمر ایسی ہے کہ اب اس کے متعلق تفصیل سے اظہار خیال ہو سکتا ہے۔ اور ہونا چاہئے۔ اِدھر اُن کی کئی بڑی جاندار چیزیں دیکھیں۔

(۴ر جنوری ۱۹۶۱ء)

(۲)

صہبا صاحب تسلیم

آپ کا ۲۸ر مئی کا خط ملا۔ مجھے افسوس ہے کہ "جوش نمبر" کے لئے میں مضمون نہ لکھ سکوں گا۔ اِدھر میری صحت اچھی نہیں ہے۔ اور کئی ضروری کام بھی مکمل کرنے ہیں۔ امید ہے کہ آپ میری معذرت قبول فرمائیں گے۔ ۲۳ر جون ۶۱ء

(۳)

برادرم صہبا صاحب

خط ملا۔ آپ غلط سمجھے۔ میں نے کسی مصلحت یا مجبوری کی وجہ سے نہیں، بلکہ مصروفیت اور خرابیٔ صحت کی بنا پر عذر کیا تھا۔

بہرحال آپ کا اصرار ہے تو ایک خط کی صورت میں جوش کی شخصیت اور شاعری کے متعلق اپنے تاثرات لکھ دوں گا۔ یقین جانئے اس وقت ایسے کاموں میں گھرا ہوا ہوں کہ اس کے لئے بھی بڑی مشکل سے وقت نکلے گا۔ علیگڑھ کی تاریخ ادب اردو کی تیاری اب آخری منزل پر ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ اور اسی میں لگا ہوا ہوں۔

امید ہے کہ شروع جولائی میں کچھ بھیج سکوں گا۔

(۲۰ جون سنہ ۱۹۶۱ء)

ممتاز حسین

صہبا بھائی۔ میں معذرت خواہ ہوں، بلکہ یوں کہئے کہ نادم ہوں اس موقعے پر کوئی مضمون نہ لکھ سکا۔ اس میں میری کاہلی کو نہیں بلکہ میری چند ناگزیر مشغولیتوں کو دخل تھا۔ اور اب وقت اس قدر کم رہ گیا ہے کہ میں آپ سے مزید

وقت کی درخواست بھی نہیں کرسکتا۔ بہرحال اس کام میں دل وجان کے ساتھ آپ کے ساتھ ہوں، اور کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔

جوش صاحب کی جو ادبی خدمات ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ دو چار لفظوں میں اس کے بارے میں کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ تاہم چونکہ آپ کا اصرار ہے اس لئے چند ایک باتیں وہ بھی نہایت ہی عمومی قسم کی لکھ رہا ہوں۔

جوش صاحب ایک قادر الکلام شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عہد آفریں شاعر بھی ہیں۔ دَورِ حاضر کی ہر وہ آواز جو جگانے اور بیدار کرنے کی ہے، جو آزادی، مساوات، انسان دوستی اور عقل پسندی کی ہے وہ جوش صاحب کی آواز سے ایک نسبت رکھتی ہے۔ جوش صاحب کے بغیر ادبی کارواں بن ہی نہیں سکتا۔

جوش صاحب کی شاعری میں جو تنوع، وسعت اور گیرائی ہے وہ اُن کی آواز کو اور بھی گراں مایہ کر دیتی ہے زندگی کی کون سی ایسی لذت، تڑپ اور آرزو ہوگی جسے انہوں نے اسیر حرف نہ کیا ہو۔ اور اس کوشش میں کون سا ایسا لفظ ہوگا جو ان کے اعجاز قلم سے جی نہ اٹھا ہو۔ جس اطمینان اور اعتماد صحت کے ساتھ الفاظ ان کے مصرعوں میں اپنی جگہ بناتے ہیں۔ ویسا اطمینان اور اعتماد تو کسی اور کے یہاں کم ہی نظر آتا ہے۔ اقلیم حرف وصوت پر ان کی جو فرماں روائی ہے وہ کسی اور کے یہاں کہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔

جوش صاحب کی ۶۵ ویں سالگرہ کے موقعے پر آپ جو یہ تحفہ اردو کے ادیبوں کی طرف سے ان کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس سے آپ کی زندہ پروری کا ثبوت ملتا ہے۔ خدا جوش صاحب کو عمر نوح عطا کرے۔ آپ اس کام میں جس قربانی سے کام لے رہے ہیں اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

لطیف الدین احمد اکبر آبادی

کرم فرمائے بندہ۔

والا نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری کا ممنون ہوں۔

افکار کا "جوش نمبر" نکلنا مبارک ہو۔ قدرت نے یہ سہرا آپ کے سر باندھنے کے لئے محفوظ کر رکھا تھا۔

جوش کے متعلق میں اپنے تاثرات "سخنہائے گفتنی" کے عنوان سے لکھ چکا ہوں جو اُن کے پہلے[1] مجموعے "نقش ونگار" کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ لکھنے کے لئے میرے پاس اور کچھ ہے نہیں۔ البتہ جو کچھ لکھ چکا ہوں اس میں کچھ ترمیم کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ اس لئے اپنے مجموعہ مضامین پر نظر ثانی کرتے وقت اس مضمون میں میں نے ترمیم کی بھی ہے۔

اب اگر جوش کی شاعری سے متعلق کچھ لکھ سکتا ہوں تو وہ یہ ہوگا کہ ان کی شاعری میں انسان دوستی یا انسانیت پرستی کا جزو معض مکرر رہا ہے۔ اس سلسلے کہ پاکستان کی وطنیت انہوں نے "بچوں کے کلچر" کا تحفظ کرنے کی خاطر اختیار کی۔ باقی پانچ کروڑ جنہیں وہ یہاں چھوڑ گئے، انسان نہ تھے اور نہ ان کے بچوں کے کلچر کی حفاظت ضروری

---

[1] دوسرا مجموعہ۔ ص

تھی - یہی نہیں، بلکہ یہ بھی انہوں نے اپنے اس فعل و عمل سے پانچ کروڑ انسانوں کو ناقابلِ اعتبار بنا دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی انسان دشمنی دوسری نہیں ہو سکتی۔

بہرحال جن لوگوں کے آپ نے نام لکھے ہیں کہ وہ اس نمبر کے لئے مضامین لکھ رہے ہیں، اس بات کی ضمانت ہے کہ آپ کا نمبر یقیناً کامیاب ہوگا۔ جوش نے بہرحال اردو شعر و ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ اس کا اعتراف ہی نہیں تحقیق بھی ہونا ضروری ہے۔

امید کہ میری معذوری کو سمجھ کر آپ مجھے قابلِ معافی سمجھیں گے۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔ (۹ اپریل ۶۱ء)

پروفیسر اختر انصاری (دہلوی)

حضرت جوش ملیح آبادی سے متعلق "افکار" کا نمبر شائع کرنے کا خیال بہت اچھا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں جوش کے متعلق بہت غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں اور بعض غیر ذمہ دار، مرقع پرست اور دریدہ دہن نقادوں نے اس سلسلے میں لوگوں کو گمراہ کرنے کی خوب خوب کوشش کی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس شرارت آمیز پروپیگنڈے کا ازالہ کیا جائے۔ اور جوش کی حقیقی شاعرانہ عظمت کا نقش دلوں پر بٹھایا جائے۔ افکار کا یہ خاص نمبر وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرے گا۔ اور جدید اردو شاعری کی حقیقی خدمت کے مترادف ہوگا۔

جوش کی شاعری بیسویں صدی کے اردو ادب کے کئی دوروں پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ وقت اور حالات کی رفتار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی رہی ہے۔ اور ہندوستان کے ذہین اور نوجوان طبقے کے بدلتے ہوئے سیاسی تصورات کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہی ہے۔

جوش اپنی شاعری کے پہلے دور میں ایک غنائی اور رومانی شاعر تھے اور جذباتی، محاکاتی اور منظری نظمیں لکھتے تھے اس وقت وہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو بھی جذباتی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔

ان کی شاعری کا دوسرا دور وہ تھا جس میں انہوں نے سماجی تعصبات، رسمی عقائد اور سیاسی استبداد کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اس دور کی نظموں میں بھی جذباتی جوش زیادہ ہے اور عقلی شعور کم۔

شاعری کا تیسرا اور موجودہ دور ان کے انقلابی نظریوں کی پختگی کا دور ہے۔ اگر ناظر بصیرت سے کام لے، اور تعصب سے آزاد ہو کر دیکھے تو ان کی اس دور کی نظموں میں ایک مخصوص نقطۂ نظر اور ایک واضح نظریۂ حیات کی کارفرمائی صاف طور پر نظر آتی ہے۔ انہوں نے سماجی ارتقا کے اصولوں کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ ان کا پیغام موجودہ دور کے اہم میلانات سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ (۵ مارچ ۱۹۶۱ء)

عزیز احمد

ان کی تشبیہات و استعارات میں ایک متلاطم سیال کا سا اُبال اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ ان استعارات کی جدت اور متحرک اور زلزلہ خیز ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ ایسی نظموں میں ان کی پُرشوکت روانی، ان کے وزن، ان کے الفاظ، بے محابا ترتیب، ان کے جذبات کی خود سری میں انقلاب کے آہنی قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔

سردار جعفری

جوش براہِ راست سیدھی سادی ایجی ٹیشنل شاعری سے برطانوی شہنشاہیت کے خلاف قوم کو ابھارتے ہیں۔ ان تمام رجعت پرست اداروں کا پول کھولتے ہیں جن کی وجہ سے آزادی کی تحریک کمزور ہوتی ہے، اور شہنشاہیت اور جاگیرداری کو سہارا ملتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ جہالت، توہم پرستی، مذہبی جنون، روایتی اخلاق کی زنجیروں کو توڑنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور ان راستوں اور لغزشوں کو سراہتے ہیں جنہیں صدیوں کے جبر، ظلم اور تشدد بھی نہ مٹا سکے۔ وہ اپنی وطنی اور قومی نظموں میں ہمارے ملک کے شام و سحر، اس کے پہاڑوں، دریاؤں، جاڑوں، گرمیوں اور برساتوں کا حسن بیان کرتے ہیں۔ اور یہاں کے باشندوں کی قوت، صلابت، حسن اور نزاکت کو شعر کا جامہ پہناتے ہیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر ہندوستان سے اور اپنی قوم سے، اپنے تہذیب و تمدن سے، اپنے ادب اور فن سے ہماری نسبت بڑھ جاتی ہے۔ یہ جوش کا کارنامہ ہے جس نے ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔ اور انہیں اپنے دور کا سب سے بڑا اور مقبول شاعر بنا دیتا ہے۔ ترقی پسند شاعر جوش کے اس ورثے کو لے کر ہی شاعری کر رہے ہیں۔

اختر اورینوی

جوش کے آرٹ میں موسیقی، مصوری و صنم سازی کے مکمل و نامکمل جلوے ملتے ہیں۔ شاعر الفاظ کی وساطت سے چھوٹے اور بڑے سانچوں میں اپنی فن کاری کے نمونے پیش کرتا ہے۔ جوش کا مزاج سودا سے مشابہت رکھتا ہے۔ دونوں شاعروں کے فن کا آہنگ بلند اور آنچ تیز ہے۔ جوش کی صناعی میں مصوری کا کامیاب اظہار بہت ہی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی قلم کاری نازک اور نفیس ہوتی ہے۔

میاں بشیر احمد

(۱) کاش میرے پاس اتنا وقت اور توانائی ہوتی کہ میں کچھ لکھ سکتا۔ معذور ہوں۔ لہذا معاف فرمائیے۔ (۲۹ نومبر ۶۲)

(۲) والانامہ ملا۔ پڑھ کر تھوڑی دیر کے لئے غیرت کے جذبات اٹھے، اور شرمندگی ہوئی کہ آپ کی دعوت پر کہ — جوش نمبر کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں، لبیک نہ کہہ سکا۔ مشکل یہ آپڑی ہے کہ کچھ عرصے سے اور خصوصاً میری صحت کچھ زیادہ گر گئی ہے۔ بلڈ پریشر اور کم خوابی کی شکایات بھی ہیں۔ اور میں واقعی مجبور ہوں کہ کوئی کام کی چیز نہیں لکھ سکتا۔ اگر محض تعریف کے چار جملے لکھ کر بھیج دوں تو مجھے اور جوش صاحب اور پبلک کو بھی رنج ہوگا کہ یہ کیسی حماقت ہے۔ ازراہِ کرم مجھے معذور سمجھئے۔

حد درجہ نادم ہوں اور معافی کا خواستگار۔　　(۵ دسمبر ۶۲ء)

اسرائیل احمد خاں

جوش ان شعراء میں سے ہیں جن کی عظمت پر عہدِ حاضر کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ادبی دنیا نے ہنوز

اُن کی طرف کانی اعتنا نہیں کیا ہے۔

عصمت چغتائی

جوش صاحب زندگی میں بھی ویسے ہی جاق و چوبند اور گرجدار نظر آتے ہیں جیسے اپنی شاعری میں۔

ہاجرہ مسرور

محترم بھائی

جوش نمبر کے لئے کیا لکھوں۔ شاعری پر میرا لکھنا چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ اور پھر جوش پر! جوش جسے میں نے چھوٹی سی عمر میں اپنے ایک بزرگ سے سبقاً پڑھا، اور جنہیں پڑھتے ہوئے آج بھی اسی طرح مرعوب ہوتی ہوں، جیسے اس چھوٹی عمر میں — وہی ان کی شخصیت — ان سے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں رہا — ایک بار مقامی کالج کے ڈائس پر آکھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو نہیں، مگر میں نے انہیں دیکھا اور بار بار — وہ جوش تھے، وہی جوش جنہیں دیکھنے کی آرزو تھی۔ ان کو ویسا ہی ہونا چاہیے تھا جیسے وہ تھے — بس۔ (۱۷ر فروری ۱۹۶۱ء)

صفیہ اختر

جوش صاحب کی بے تکلفی کی محفلیں ایک انوکھا لطف رکھتی ہیں۔ ان کی شخصیت میں غیر معمولی کشش اور ان کے ہر انداز میں زندگی کی ایسی رو ہے جو افسردہ دلوں میں بھی امنگ پیدا کر دیتی ہے۔ ان کی کشش کا راز وہی ہے جو ایک بے خبر معصوم بچے کی کشش کا ہوتا ہے۔ بچہ اپنی ذات سے زیادہ کسی میں مبتلا نہیں ہوتا، لیکن پھر بھی لوگ خود بخود اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور اس کی من موہنی باتوں سے کیف و سرور محسوس کرتے ہیں۔ اس کی معصوم اور بے خبر آلودہ مسکراہٹ میں اپنی کھوئی ہوئی زندگی کی جھلک پاتے ہیں۔

جوش کی شخصیت social tact سے بری ہوتے ہوئے بھی ایک مقناطیسی اثر رکھتی ہے۔ دل اُن کی طرف کھنچتا ہے اور اہل محفل کی محبت آمیز نگاہوں کا عکس ان کی آنکھوں میں ایک دائمی مسکراہٹ بن کر جذب ہوتا نظر آتا ہے۔

شوکت تھانوی

جوش نہایت دلچسپ مگر نہایت خطرناک دوست ہیں۔ خطرے پیدا کر کے اُن سے کھیلنا اور دوسرے کو خطرے میں مبتلا کر کے اس سے لطف لینا آپ کا خاص مشغلہ ہے۔ یوں تو اس وقت بہت سے واقعات یاد آ رہے ہیں، مگر مشتے نمونہ از خروارے۔ کانپور کا واقعہ پیش کرتا ہوں۔

جوش، رفیع احمد خاں، سراج لکھنوی، قدیر لکھنوی، نشتر سنبھلوی، اور میں، یہ چھ آدمی گنگا کے کنارے پہونچے۔ ایک کشتی کرایہ پر لی اور بوٹنگ شروع کر دی۔

یکایک کشتی جیسے ہی دھارے پر پہونچی۔ آپ ایک دم کھڑے ہو گئے۔ کشتی کے ایک کنارے پر ایک پیر اور دوسرے پر

دوسرا رکھ لیا ۔ اور اب مُصر ہیں کہ "ڈگمگ ڈولے نیا" کی نرت دکھاؤں گا۔
سب نے منع کیا ۔ خوشامدیں کیں۔
انہوں نے کہا: سلام کرو۔
سلام کئے۔
کہنے لگے: ہاتھ جوڑو۔
ہاتھ جوڑ لئے۔
ارشاد ہوا کہ: اس وقت تم سب کی زندگی میرے اشاروں پر ہے۔
عرض کیا: بجا ارشاد فرماتے ہیں صاحب۔
مگر ان تمام باتوں کے باوجود پیروں کو ایسی حرکت دیتے رہے کہ ناؤ واقعی ہچکولے کھانے لگی ۔ یہاں تک کہ خود ملاح نے کہا کہ: صاحب ڈوب جائے گی ناؤ۔
کہنے لگے: یہی تو میں چاہتا ہوں۔
ہر ایک جسم میں خون منجمد اور چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں ۔ آخر نشتر سندیلوی نے نہایت غصہ سے ڈانٹا غصہ پر آپ اور مشتعل ہوئے اور ناؤ کو اس بری طرح زیر و زبر کیا کہ ہم سب نے کلمہ پڑھ کر آنکھیں بند کر لیں اور نشتر سندیلوی جوش کے قدموں پر گر پڑے۔
خدا خدا کر کے یہ طوفان تھما ۔ جوش کی تفریح اور ہم سب کے نزع کا عالم ختم ہوا ۔ اب یہ واقعہ محض مذاق معلوم ہوتا ہے لیکن اس مذاق کے حادثہ بن جانے میں دیر ہی کیا تھی۔

عابد رضا بیدار

جوش نے اردو ادب کو نیا آہنگ دیا ہے ۔ نوجوانوں کو جرأت اور ہمت سے سچی بات اچھے ڈھنگ سے کہنا سکھائی ہے ۔ بہت سے ایسے بت توڑے ہیں جن کی بت شکنی کے لئے بھی دل چاہئے۔

پروفیسر وقار عظیم

جہاں تک الفاظ برتنے کا تعلق ہے جوش اس دور کے واحد شاعر ہیں جنہوں نے اپنے کلام میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں ۔ ان کی انقلابی نظموں میں بھی شوکتِ الفاظ اور لہجے کی دھوم دھام سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ الفاظ کی گھن گرج سے اپنی نظموں کو ولولہ انگیز بنانے کا قرینہ وہ خوب جانتے ہیں ۔ اردو شاعری میں جوش کی ان نظموں کو بھی ایک قابلِ ذکر مقام حاصل ہے ۔ لیکن وہ غزل ہو، نظم ہو یا رباعی، جہاں جہاں جوش نے تغزل کی چاشنی کو برقرار رکھا ہے اور روایات کے رچاؤ سے کام لیا ہے وہاں وہاں انہوں نے اپنے قاری کے قلب و ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے ۔ جہاں بھی انہوں نے حسن و عشق کی وارداتی کیفیات کو مسلکِ غزل میں پرو دیا ہے وہ شاعرانہ کمال کا نمونہ پیش کر گئے ہیں۔

صغیرہ نسیم

دورِ جدید میں جوش کی اہمیت اس لئے بھی بہت زیادہ ہے کہ وہ اپنی شاعری کے ہر دور میں ادب پر چھائے رہے، اور دو متضاد چیزوں کو باہم ملاتے رہے۔ رومانی، قومی اور اشتراکی شاعری سب میں ان کا باغیانہ رنگ قائم ہے۔ وہ جدید اردو شاعری کے میدان میں بڑی وسعت کے ساتھ پھیلے ہوئے ہیں۔ اس عرصے میں اکثر شاعر ابھرے اور ختم بھی ہو گئے۔ کچھ اپنی منزل سے ہٹ کر راستے ہی میں گم ہو گئے۔ لیکن جوش آگے ہی قدم بڑھاتے رہے۔ اور ہر دور میں دوسروں سے آگے رہے۔ سچائی کو انہوں نے کبھی نہیں چھوڑا، اور وہ سچائی چاہے خود ان کے واسطے نقصان دہ رہی ہو، لیکن سماج کے لئے اچھی ثابت ہوئی۔ جوش نے ہر ایک سے اپنی ہم نوائی کرائی۔ کبھی نرمی سے لیکن زیادہ تر سختی سے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ فن پر ہمیشہ محنت کرتے رہے۔ انہوں نے ترقی پسندی کو اپنے لئے بہتر سمجھا۔

غزل کا بھی جوش کی شاعری میں ایک خاص مقام ہے۔ اپنی غزل کے لئے خود ان کا یہ خیال ہے ؎

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
اسلوبِ سخن نیا نکالا ہم نے!

مگر ان کا یہ دعویٰ بالکل صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیوں کہ نہ تو وہ غزل کو اس کی روایات سے الگ کر سکے، اور نہ غزل میں کوئی نیا اسلوب نکال سکے۔ ان کی رندی و سرمستی میں ریاست کی شان ہے جس میں مستی سے زیادہ بدمستی ہے۔ غزل میں جوش کا وہ تخیل بھی نہیں نظر آتا جس نے نظموں میں ایک نیا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ پرانی تراکیب مثلاً حسنِ مجاز، غارت گرِ ایماں، شمیم عنبر فشاں، گلشن بکف، ہجر و وصال، کاکلِ پیچاں اور گل افشاں وغیرہ سے کوئی نیا رنگ اور رس نہیں پیدا ہو سکتا، بلکہ اکثر تو سچے جذبات بھی ان مصنوعی اور خوبصورت تراکیب کے باوجود مبالغہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ حالانکہ جوش کی نظم کو دیکھ کر یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ ان کو الفاظ یا تراکیب پر قدرت نہیں حاصل ہے۔ مگر نظموں کی طرح غزلوں میں جوش کے یہاں ندرت نہیں دکھائی دیتی۔ ان کی غزلوں میں دل کی سرشاری اور حسن کی لطافت انگیز مستیاں ملتی ہیں۔ شباب کے جذبۂ و کیف اور مستی و بے خودی کو انہوں نے بارہا پیش کیا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ان کے شباب کے مرقعے اردو شاعری میں اپنی مثال نہیں رکھتے ؎

اُٹھا ساغر کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زہد و ریائی

جوش کا حقیقی کمالِ شعر گوئی نظم کے میدان میں ظاہر ہوا ہے۔ وہ نئی اور دل آویز تشبیہات کا استعمال بڑے مشاقانہ انداز میں کرتے ہیں ؎

یہ سایۂ کاکل میں ہے پیشانیٔ رخشاں
یا ظلمتِ الحاد میں ہے مشعلِ ایماں
یہ ساعد ہے یا پیرہنِ یوسفِ کنعاں
ہاتھوں پہ یہ رخسار ہیں یا رحل پہ قرآں

لب ہیں کہ خمِ چشمۂ شیریں سخنی ہے
کیا گُل بدنی، گُل بدنی، گُل بدنی ہے

جوش نے مذہب، خدا، مقصدِ حیات، جبر و اختیار، جنون و حکمت اور بے شمار موضوعات و مسائل پر طبع آزمائی کی ہے اردو شاعری میں ہی نہیں، دنیا کی کسی بھی زبان میں اس لحاظ سے ان کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ خود اپنے متعلق وہ کہتے ہیں ؂

کہنے کو تو ایک بات کہتا ہوں میں
ہر فلسفۂ حیات کہتا ہوں میں
جب میری زباں سے ہیں "نکلتے ندیم"
اس پر زے میں "کائنات" کہتا ہوں میں

"کائنات" اس شاعرانہ جذبے کا نام ہے جو شاعری کو حدوں سے نکال کر لامحدود بنا تا ہے۔ جہاں انسان اپنی جگہ پر منفرد اور اکیلا نہیں رہتا، بلکہ اس کا غم اس کی خوشی، اس کا درد، اس کا سکھ غرض کہ اس کے تخیل اور افکار تک کائناتی اور آفاقی بن جاتے ہیں۔ اور یہی آفاقیت جوش کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

صاحبزادہ علی اختر

جس طرح اردو شاعری غالب و میر کی غزلوں، اور انیس و دبیر کے مرثیوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتی بالکل اسی طرح نہ صرف دورِ حاضرہ بلکہ مستقبل بھی جوش کی گراں قدر رباعیوں کی اہمیت سے روگردانی نہ کرے گا۔ سرمایۂ ادب کے لئے یہ کلمۂ فخر ہے کہ جوش کی رباعیوں کی تعداد محض انگلیوں پر شمار نہیں کی جا سکتی، بلکہ گنتی ایک دو سے ہزاروں تک پہونچ چکی ہے چونکہ دوسری اصنافِ سخن کی بہ نسبت ہمارے شعرائے رباعی کی طرف کم ہی توجہ دی ہے اس لئے ہمارے یہاں بدقسمتی سے اس صنف میں مردِ میدان بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔

جوش نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے سفر کے لئے جو شاہراہ چُنی اس میں آبلہ پائی کا احتمال نہیں بلکہ یقین تھا۔ اور یہ بھی ؂

کچھ ترے حسن کا کرشمہ ہے کچھ مری طبع کی روانی

کے مصداق کچھ تو اس انقلاب آفریں دور کا اثر تھا، اور کچھ جوش کے ذہن میں "کھٹکتی ہوئی کمان" (دیباچہ روحِ ادب) کی کرشمہ سازی!

یہ تو تھا جنگ کے انقلاب کا تاثر، لیکن حقیقتاً ماننا پڑے گا کہ بعض اوقات چھوٹے چھوٹے واقعات اور حادثے بہت اہم بن جاتے ہیں۔ اور اکثر ان واقعوں اور حادثوں کی شدت فن کاروں کے نظریات فکر کو ہی بدل دیتی ہے ——— فرانس کے والٹیر (VOLTAIRE) کی مثال سامنے ہے جو لزبن کے زلزلے کی تباہ کاری سے اس حد تک متاثر ہوا تھا کہ اس کا اعتقاد صدیوں کے OPTIMISM کے نظریے سے یکسر اٹھ گیا۔ اور اس نے دل برداشتہ ہو کر روسو کے استدلال پر ایک طنزیہ لکھ مارا، اس کے تاثر کی شدت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے ولیم شیکسپیر کے شہرۂ آفاق المیہ ——— ہیملٹ (HAMLET) کو ایک بے ڈھنگی اور جہالت آمیز تصنیف گردانا ہے۔ اور اس کے نزدیک ڈانٹے کی ڈوائن کامیڈی کی لوگ

محض اس لئے تعریف کرتے ہیں کہ اس کو سمجھ نہیں پاتے۔ ہر زمانے میں تحقیق کاروں کے ذہن بلور کی طرح نازک رہے ہیں اور فطرت کے اس فلسفہ کی روشنی میں جوش نے معاشرے کی پستی سے متاثر ہو کر جو رباعیاں لکھی ہیں وہ اس کی ترجمان ہیں۔

رُباعی کا احترام ایک مستقل صنفِ سخن کی حیثیت سے ہوتا ہے اور ہوتا رہا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اساتذہ نے نہ جانے کیوں اسے زیادہ وسعت نہ دی۔ فارسی میں جس کو نام خدا اردو کی قبلہ گاہی کا فخر حاصل ہے، اکثر شعرا نے اس صنفِ شعر کو ثانوی حیثیت دے رکھی ہے۔ رباعیوں کے میدان میں خیام کا کوئی دوسرا ہم عصر یا ہم سر نظر نہیں آتا۔ گو کہ جلال الدین رومی کی رباعیاں بھی فنی اعتبار سے کمتر درجے کی نہیں لیکن عمر خیام "رباعیوں کا شاعر" ہی کے لقب سے شہرت پا گیا۔ حالانکہ عمر خیام محض ایک رباعی نگار شاعر نہ تھا، بلکہ خسرو کے دربار میں ستارہ شناسی اور ریاضی کی مہارت اس کے منصب کو بلند کئے ہوئے تھی۔ لیکن یورپ کے مستشرقین نے غریب خیام کی کچھ ایسی مٹی پلید کی کہ اس نام کے ساتھ ہی ایک ایسے شخص کا ہیولا قاری کے ذہن میں آتا ہے جس کے ایک ہاتھ میں جام دوسرے میں قلم ہے۔ بلکہ فی زمانہ خیام شراب اور عیش کوشی کا SYMBOL بن گیا ہے۔ رباعی کی صنف کی حد تک حکیم عمر خیام نیشاپوری کی شہرت روایت کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے۔

عمر خیام کا ذکر یہاں اس لئے بھی مقصود تھا کہ جوش کی رباعیاں اکثر و بیشتر خیام کے اندازِ فکر سے ملتی جلتی ہیں۔ خیام نے شراب کو معرفت اور اور فلسفۂ حیات کی عقدہ کشائی سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس فلسفے کی تقلید جوش کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ یہاں میرا مطلب کسی طرح بھی خیام اور جوش کا موازنہ کرنا نہیں۔ کیوں کہ میں سرسری تقریظ یا موازنے کو ایک GENIUS کی تخلیقی قوتوں کا خاکہ اڑانا خیال کرتا ہوں۔ اکثر اہل الرائے کسی شاعر کے کلام کو پرکھتے وقت زمانے کے بُعد کو بروئے کار نہیں لاتے۔

جوش کے فن رباعی نگاری کی عظمت اور بلندی میں جمالیاتی باریکیوں کی ان گنت حکایتیں ہیں۔ وہ قدما سے ایک دم مختلف ہیں۔ جوش کا اندازِ نظر اور زاویۂ فکر اس روایتی فکر سے بالکل جدا ہے۔ جس نے زمیں دار اور جاگیر دار خاندانوں کو متصرگم نامی میں گرا دیا۔ جوش کی فلسفیانہ موشگافیوں اور جمالیاتی اسلوبِ بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دماغ میں اس جاگیر دارانہ خون کی آمیزش ہے۔ اس کے بغیر اتنے لطیف بلکہ لطیف ترین احساسات کی ترجمانی سیلاب زدہ دریا سے گزرنے کے مترادف تھا لیکن جوش کی فنکارانہ مہارت نے یہ دریا اس طرح عبور کیا کہ ناخدا کو ع

داماں تر مکن ہشیار باش!

[illegible] رباعیاں [illegible] جمالیات کی چاشنی سے بھری پڑی ہیں۔

[illegible] سے کیا۔ چونکہ یہ مشاہدے حقیقت تھے، اس لئے اُن کا ناگوار خاطر ہونا اغلب تھا۔ [illegible] ۔ پھر بھلا جوش کی رباعیاں کیوں نہ کڑوی لگتیں۔ ہم ان رباعیوں کے ذریعہ اجمالی کی تفصیل اور اشارات کی تفسیر سے جوش کے مافی الضمیر تک بآسانی پہونچ سکتے ہیں ـــــ جوش کی جو رباعیاں عوام میں سب سے زیادہ مقبول ہوئیں، یا صاف صاف یوں کہا جائے کہ جن رباعیوں کی تخلیق پر جوش کو سب سے زیادہ ہدفِ لعن و طعن بنایا گیا وہ فلسفۂ الوہیت پر ایک طنز کی صورت اور جذبۂ خودی سے عبارت ہیں۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبال)

ترتیب

صہبا لکھنوی	٦٦١	اشاریہ کے بعد
انور مقبول	٦٦٢	جشن جوش

پیغامات

ڈاکٹر انصاری شمیل	٦٦٤	ڈاکٹر سید عبداللہ
کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	[illegible]	سید ہاشمی فرید آبادی
پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی	٦٦٦	ڈاکٹر عبد السلام خورشید
مجتبیٰ حسین	٦٦٧	جوش صاحب
جوش ملیح آبادی	٦٦٩	کچھ اپنے بارے میں
ابراہیم جلیس	٦٧١	محفل
بشیر احمد بشیر	٦٧٧	تبرکات
فقیر محمد گویا	٦٧٨	”

جائزے

جوش ملیح آبادی	٦٧٩	ضرب شاہد لفرق شاہدیانہ
پروفیسر سید وقار عظیم	٧٠٤	جوش کی غزل
معاصرین و مبصرین	٧٢٣	جوش نمبر

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی • دفتر: رابسن روڈ، کراچی،
طابع: مشہور آفسٹ پریس کراچی،

اشاریہ کے بعد

'جوش نمبر' کا دوسرا ایڈیشن اضافے کے ساتھ حاضرِ خدمت ہے۔ نئے مضامین تصاویر اور جشنِ جوش کی تفصیلات کی شمولیت کے بعد اب یہ نمبر پہلے سے زیادہ وقیع اور جامع ہو گیا ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے "حرفِ آخر" کی حیثیت رکھتا ہے کہ خود جوش صاحب نے اسے "تاریخی دستاویز" قرار دے کر ہماری پُرخلوص مساعی کی قدر و اہمیت بڑھا دی ہے۔ اس حقیقت کا بلا امتیاز اور بلا خوفِ تردید سبھی کو اعتراف ہے کہ 'جوش نمبر' نے زندہ دوستی، قدر شناسی، اور اعترافِ کمال کی نئی روایت کی داغ بیل ڈالی۔ افکار کے اس انقلابی اور جرأت مندانہ اقدام سے پاکستان کی ادبی عظمت اور اردو رسالوں کی تاریخ میں جس نئے باب کا اضافہ ہوا وہ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ ساری اردو دنیا کے لئے باعثِ صد افتخار ہے۔ کیونکہ دنیا کی کسی بھی زبان میں کسی زندہ ادیب یا شاعر پر اتنا عظیم و ضخیم اور...... دستاویزی نمبر آج تک شائع نہیں ہوا۔

دوسرا ایڈیشن انتہائی صبر آزما اور جاں گسل مرحلوں سے گزرنے کے بعد قدرے تاخیر سے پیش کیا جا رہا ہے۔ جس کا ہمیں افسوس ہے۔ کاش ناساز حالات مالی اور فنی مشکلات پر ہم جلد قابو پا سکتے! بہرحال خوشی اس بات کی ہے کہ ملک اور بیرونِ ملک کے ان گنت افکار دوستوں کے شدید مطالبے کو دیر سویر ہم نے پورا کر دیا۔ مجاز نمبر کے بعد جوش نمبر کی دوبارہ اشاعت اس بات کی بھی غماز ہے کہ ملک میں اچھے ادب کے ساتھ ساتھ دنیائے ادب کی سر برآوردہ اور گراں مایہ شخصیتوں سے محبت اور ان کے فن کی قدردانی کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ 'جوش نمبر' کا پہلا ایڈیشن شائع ہونے کے بعد صرف دس دن میں ختم ہو گیا تھا۔ زبان و ادب کی وسعت اور ترقی کے لئے یہ فالِ نیک ہے۔

آخر میں ہم اُن تمام افکار دوستوں، ہمدردوں، رفیقوں اور معاصرین کے علاوہ ملک اور بیرونِ ملک کے صاحبانِ علم و ادب کے خلوصِ دل سے ممنون ہیں جنہوں نے جوش نمبر کو پسند فرماتے ہوئے گراں قدر آراء کا اظہار فرمایا اور ہماری حوصلہ افزائی کی۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ افکار زندہ دوستی کی نئی روایت کو نہ صرف قائم رکھے گا بلکہ آگے بھی بڑھائے گا۔ جوش نمبر کے بعد ہم حفیظ نمبر ترتیب دے رہے ہیں۔ اس کے بعد فیض نمبر، کرشن چندر نمبر، عبدالرحمٰن چغتائی نمبر اور جسیم الدین نمبر ہمارے اشاعتی پروگرام میں شامل ہیں۔ افکار آپ کی توقعات کو ہمیشہ پورا کرے گا ان شاء اللہ۔

[signature]
۳ ـــ ۱۲ ـــ ۶۲ء

انور مقبول

جشنِ جوش

اتوار کی شام تھی اور نومبر ۱۹۶۱ء کی پانچویں تاریخ۔ گارڈن ایسٹ کراچی کی ایک حسین و آراستہ کوٹھی گلمرگ میں ایک ہزار سے زائد ادیبوں کا اجتماع تھا۔ کوٹھی کے سرسبز لان کے قریب حاضرین کے لئے نشستوں کا انتظام تھا۔ اور برآمدے کے فرش پر انجمن دانشورانِ ادب۔ اور اس تاریخی اجتماع — جشن جوش — کے منتظمین بیٹھے تھے۔ ابر آلود شام اور خنک ہواؤں کے کیف آگیں ماحول میں اس صدی کے عظیم ..... شاعر جوش ملیح آبادی کا استقبال کیا گیا۔ جوش صاحب اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جشن گاہ میں تشریف لے آئے۔ اس یادگار موقع پر ماہنامہ افکار کے مدیر صہبا لکھنوی ایک عظیم ادبی دستاویز "جوش نمبر" پیش کرنے والے تھے۔ جشن گاہ کے ایک گوشے میں جوش صاحب کی کتابوں، تصویروں، قلمی نمائوں، خطوں اور افکار کے "جوش نمبر" کی نمائش کا انتظام بڑے سلیقے سے کیا گیا تھا۔

انجمن دانشورانِ ادب کے سکریٹری تنزیل الرحمن نے جشن کے انعقاد کا مقصد بیان کیا، اور اس یادگار تقریب کی صدارت کے لئے راجہ صاحب محمود آباد کا نام پیش کیا۔ راجہ صاحب اور جوش صاحب صدارت کی مسند پر ایک ساتھ بیٹھ گئے۔ اور پروگرام کا آغاز تلاوتِ قرآنِ پاک سے ہوا۔ جس کے بعد انجمن دانشورانِ ادب کے صدر شیخ عبدالخالق نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ جس میں موصوف نے جوش صاحب کی شاعرانہ عظمت اور نصف صدی پر محیط ان کی گراں مایہ ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس عظیم شاعر کا خیر مقدم کیا۔ خطبۂ استقبالیہ کے بعد جوش صاحب کے دوستوں اور عقیدت مندوں نے انہیں پھولوں کے

ہار پہنائے اور پُرخلوص تحائف پیش کئے۔ صہبا لکھنوی نے بڑی عقیدت اور خلوص کے ساتھ افکار کا ضخیم اور دیدہ زیب جوش نمبر پیش کیا، جو یقیناً جوش صاحب کی ۶۵ ویں سال گرہ کے شایانِ شان تحفہ تھا۔

اس کے بعد پاک و ہند اور یورپ و دیگر مشرقی ممالک کی ادبی شخصیتوں اور یونی ورسٹی کے پروفیسروں کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے جو جشنِ جوش کے سلسلے میں موصول ہوئے تھے تہنیتی پیغامات ارسال کرنے والوں میں ڈاکٹر امماری شمل (پروفیسر مذہبیات بون یونی ورسٹی جرمنی) ریاض الرحمٰن شیروانی (صدر شعبۂ عربی و اسلامیات مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) کنور مہندر سنگھ بیدی، تلوک چند محروم، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر سید عبدالسلام خورشید اور صوفی غلام مصطفٰے تبسم کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان پیغامات میں جوش صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف اور جشنِ جوش کے انعقاد پر مسرت کا اظہار کیا گیا تھا۔ پروفیسر آلِ احمد سرور نے فون پر جوش صاحب کو اُن کی ۶۵ ویں سال گرہ پر مبارک باد دی۔

پیغامات کے بعد رئیس امروہوی، قمر ہاشمی، سحر انصاری اور سندھی شاعر رشید احمد لاشاری نے جوش صاحب کی خدمت میں منظوم نذرانے پیش کئے جنھیں حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ جوش صاحب چہرے پر معصومانہ تبسم لئے اس تقریب کے ہر پہلو کو بڑی دل چسپی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ان کی شاعرانہ عظمت ان کی فراخ پیشانی پر نمایاں تھی۔ حاضرین کے چہرے بھی مسرت اور عقیدت سے دمک رہے تھے۔

ملک کے مشہور نقاد مجتبیٰ حسین نے اپنے مخصوص انداز میں ایک اہم اور فکر انگیز مقالہ "جوش صاحب" پیش کیا اور کہا کہ آج کا دن ہماری تاریخ کا ایک اہم دن ہے اور یہ توقع ظاہر کی کہ جوش صاحب نئی نسل کی ان امیدوں کو پورا کریں گے جو اس نے ان سے وابستہ کر رکھی ہیں — آخر میں جوش صاحب نے جوابی مقالہ پڑھا، اور جشن کے انعقاد پر منتظمین کے جذبات کا شکریہ ادا کیا۔ اور اپنی نظم "اعترافِ عجز" یہ کہہ کر سنائی کہ میں اس نظم کے ذریعے یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ خود اپنی شاعری کے بارے میں میری حقیقی رائے کیا ہے؟ نظم بے حد موثر اور فکر انگیز تھی۔

کوٹھی کے سرسبز لان پر عصرانے کا انتظام کیا گیا تھا، اس لئے تقریب کے اختتام کے بعد حاضرین نے میزوں کی جانب رُخ کیا۔ اور یہ تاریخی جشن تقریباً دو گھنٹے کی دل چسپ اور یادگار کارروائی کے بعد نہایت خوش اسلوبی سے اختتام پذیر ہوا۔

پیغامات

۵ نومبر ۷۱ء کو جشنِ جوش کے موقع پر جو پیغامات موصول ہوئے، ان میں سے چند یہ ہیں:

ڈاکٹر انماری شیمل، جرمنی

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صید زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہین شہ لولاک ہے تو

۶۵ سالگرہ مبارک باد!

Annemarie Schimmel

ڈاکٹر سیّد عبداللہ۔ لاہور

جشن جوش۔ کے سلسلے میں آپ نے یاد فرمایا۔ اس عزت افزائی کے لئے آپ کا بہت ممنون ہوں۔ منصبی مصروفیات کے باعث اس تقریب میں شرکت سے معذور ہوں۔ میرے نزدیک انجمن دانش وران ادب کی یہ تحریک مستحق مبارک باد ہے اور میں اس تقریب کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر - سنگرور

شاعرِ انقلاب قبلہ جوش ملیح آبادی کی پینسٹھویں (کاش قبلہ جوش کو اس ضمن میں غلط فہمی میں رکھا جاتا) سال گرہ کے موقع پر انجمن دانش وران ادب نے جشنِ جوش کا اہتمام کرکے واقعی اپنی دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔ قبلہ جوش جہاں ایک ہمہ گیر شاعری کے خالق ہیں وہاں وہ ایک محبوب شخصیت کے مالک بھی ہیں۔ اور ایک بے بدل رفیق بھی۔ اُنہیں خدا تعالےٰ نے (سُنا ہے کہ اب آپ خدا کے قائل بھی ہو چکے ہیں) جہاں خوش شکل بنایا ہے۔ وہاں خوش گفتاری، خوش وقتی اور خوش صحبتی کی توفیق بھی عطا فرمائی ہے۔ جہاں وہ ایک مُسلّم مفکر ہیں، وہاں ایک حاضر جواب بذلہ سنج بھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ شاعری کا تعلق صرف دل سے ہوتا ہے۔ قبلہ جوش نے یہ ثابت کر دیا کہ دماغ کا دخل بھی شاعری میں اتنا ہی ہے، جتنا دل کا۔ اور اگر کوئی شعر دل اور دماغ دونوں کی مشترکہ تخلیق ہو، تو سونے پر سہاگہ ہوتا ہے۔ قبلہ جوش کی تمام تر شاعری اس دعوے کا زندہ ثبوت ہے۔ قبلہ جوش کے مخالف اکثر حسد اور رشک کی آگ میں جل کر راکھ ہو چکے ہیں، اور جو باقی ہیں اُن کا انجام بھی دور نہیں! آج ہمیں شاید اس امر کا احساس نہ ہو۔ لیکن ایک وقت ایسا آئے گا کہ ہماری آئندہ نسلیں فخر کے ساتھ کہہ ..... سکیں گی کہ ہمارے فلاں بزرگ جوش ایسی عظیم شخصیت کے ہم عصر تھے۔

میری یہ دعا ہے کہ آپ آئندہ سال قبلہ جوش کی چھیاسٹھویں اور اُس سے اگلے سال اُن کی نرسیٹھویں سال گرہ منائیں۔ اس سے یقیناً جوش صاحب کے قلب و جگر کو راحت ملے گی۔ اور یہی ہمارا مدعا ہونا چاہیے۔

سید ہاشمی فرید آبادی - لاہور

انجمن دانشورانِ ادب کی طرف سے حضرت جوش کی
یہ قدر افزائی نہایت تحسین کے قابل ہے۔ خود جوش صاحب کو
میری دلی مبارک باد پہنچا دیجیے

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی ۔ علی گڑھ

جشن جوش میں شرکت کی دعوت کا دلی شکریہ قبول کیجئے۔ اگر راہ میں موانع حائل نہ ہوتے تو شرکت کی مسرت ضرور حاصل کرتا۔

ہمارے ہاں عام طور پر دستور ہے کہ کسی عظیم سیاسی، علمی یا ادبی شخصیت کو خراج اُس کی وفات کے بعد ہی پیش کیا جاتا ہے۔ آپ نے یہ روایت توڑ کر میرے خیال سے ایک اچھی "بدعت" کا آغاز کیا ہے۔ جس کے لئے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

جوش نے اردو شاعری کو ایک نئی لے اور نیا آہنگ عطا کیا ہے۔ انہیں زبان پر جو قدرت حاصل ہے اور ان کے لہجے میں جو تازگی اور مردانگی ہے، وہ اردو کے بہت کم شاعروں کے حصے میں آئی ہے۔

آپ نے اپنے دعوت نامے میں انہیں "شاعرِ انقلاب" لکھا ہے اور عام طور پر وہ اسی لقب سے جانے جاتے ہیں۔ لیکن یہ جوش کی شاعری کا صرف ایک پہلو ہے۔ شاعرِ انقلاب ہونے کے ساتھ۔ بلکہ اس سے زیادہ وہ شاعرِ رومان ہیں اور ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ پہلو ہمیں نظر انداز نہیں کرنا چاہئے، ورنہ ہمارا تجزیہ ادھورا رہ جائے گا۔

خدا کرے جوش صاحب اردو شاعری اور ادب کی خدمت کے لئے طویل عرصے تک زندہ و سلامت رہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ لاہور

جشن جوش میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ افسوس، فاصلہ اتنا ہے کہ آنا مشکل ہے۔ شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی برصغیر پاک و ہند کے وہ عظیم المرتبت شاعر ہیں۔ جنہوں نے اپنی پرجوش، انقلابی اور خیال افروز شاعری سے جنگِ آزادی میں حصہ لینے والوں کے اذہان کو متاثر کیا۔ میری طرف سے انہیں پینسٹھویں سالگرہ پر ہدیۂ تبریک پیش کیجئے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ انہیں عمر دراز عطا کرے، تاکہ وہ ملک اور قوم کی بیش از بیش خدمات انجام دے سکیں۔

حضرت جوش سے میرے والد مرحوم مولانا عبدالمجید سالک کے دوستانہ مراسم تھے۔ والد ہمیشہ ان کے فن کے مدّاح رہے۔

مجتبیٰ حسین

جوش صاحب

۵ر نومبر ۱۹۶ء کو انجمن دانشورانِ ادب کے زیر اہتمام "جشنِ جوش" کے موقع پر پڑھا گیا۔

جناب صدر و حاضرین جلسہ

آج ہم لوگ جوش ملیح آبادی کی پینسٹھویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ یہ بڑی خوشی اور فخر کی بات ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ ہم روایت پرستی کے ساتھ ساتھ روایت شکنی کی طرف بھی مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے ہم شاعر کی شخصیت اور اس کے کلام کی قدر اس کی زندگی میں کم ہی کرتے تھے۔ مگر اب اس کی زندگی ہی میں اس کی شخصیت اور اس کے کلام کی قدر کرنے کی توفیق ہم میں پیدا ہوتی جا رہی ہے اور فخر کی بات یہ ہے کہ ہم جس شاعر کی سالگرہ منا رہے ہیں۔ وہ اردو ادب کیلئے واقعی فخر کا باعث ہے۔ اس لحاظ سے یہ دن ہماری ادبی تاریخ میں بڑا اہم اور یادگار بن گیا ہے۔ مستقبل میں ہمارا ادبی مورخ یقیناً اس دن کا تذکرہ کرے گا جب چند حوصلہ مند اور ادب دوست حضرات نے مردہ پرستی کی فرسودہ روایت سے ہٹ کر زندہ پرستی کی روایت کو بھی آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے جس ادبی شخصیت کا انتخاب کیا تھا وہ یقیناً اس قابل تھی کہ اس کی سالگرہ کا جشن منایا جائے۔ ہماری ادبی تاریخ اس دن کو یاد رکھے گی۔ اس لئے نہیں کہ آج انجمن دانشورانِ ادب کے اراکین منا رہے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ یوم جوش منا رہے ہیں۔ ادب میں سارا سوال یہی ہے کہ ہمارا قدم صحیح ادبی سمت اٹھ رہا ہے یا نہیں ... اگر ایسا نہیں ہے تو پھر "زندہ پرستی" کی یہ روایت بھی "آبروئے شیوۂ اہل نظر" کے حق میں ایک دن یقیناً خطرہ بن جائے گی۔ اگر مردہ پرستی کی روایت مردہ پرست زندہ کی مصداق تھی تو زندہ پرستی کی روایت "زندہ پرست مردہ" کی مصداق بن جائے گی۔ لہٰذا ہمیں شاعروں اور ادیبوں کی سالگرہ مناتے وقت اس پہلو کی طرف سے بہت محتاط رہنا چاہیئے ورنہ جہالت [illegible] ہے وہ مردہ پرستی کی صورت میں بھی ممکن اور موجود ہے کہ شاعر یا ادیب کی حقیقی اور صحیح قدر دانی اس کی زندگی میں غالباً اتنی ممکن نہیں جتنی اس کے بعد۔ بڑا شاعر کبھی مرتا نہیں وہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے دل اور دماغ میں محفوظ رہتا ہے۔ ان کی اجتماعی زندگی کے ساتھ پھیلتا اور بڑھتا رہتا ہے اور اس کی شاعری کا حسن معاشرتی ارتقا کے ساتھ نکھرتا جاتا ہے۔ افراد مرجاتے ہیں۔ معاشرہ زندہ رہتا ہے۔ بڑا شاعر معاشرے کا ذہن ہوتا ہے اس کی تہذیب کا حسن ہوتا ہے اس لئے وہ کبھی نہیں مرتا۔ اس کے قدر داں چند نقادانِ فن اور درد مندانِ ادب ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ بے شمار بے نام قاری ہوتے ہیں جو ہر عہد میں اس کے کلام کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ وہ اس کے کلام کو کبھی باسی نہیں ہونے دیتے۔ اسی لئے شاعر کا کلام ہی شاعر کی سالگرہ ہے۔

آج جب ہم جوش کا جشن سالگرہ منا رہے ہیں تو اس بات کو یاد رکھنا نہایت ضروری اور اہم ہے کہ ان کا کلام ترقی۔ سالگرہ کے حدود اور ماہ و سال کی زنجیروں کو توڑ کر ہمارے ادب کی لازوال دولت بن چکا ہے۔ اب ان کے کلام پر جتنا حق حال کا ہے اتنا ہی مستقبل کا۔ اس پینسٹھ سال تک پہنچتے پہنچتے جوش نے ہمیں کیا دیا۔ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھئے ہم کتنے پر آشوب اور ہنگامہ خیز دور سے گذر کر یہاں تک آئے ہیں۔ اس دور کی پشت پر سلطنت مغلیہ کا زوال، غیر ملکی تسلط، غدر کی تباہ کاریاں اور ایک پورے معاشرے کا انحطاط ہے۔ پھر اسی معاشرے میں از سر نو ضبط و تنظیم پیدا کرنے کی کوششیں، سیاسی تحریکیں، قومی شعور کی بیداری اور آزادی کی جد و جہد ملتی ہے یہاں تک کہ یہ جد و جہد اس برصغیر کو آزاد کرا کے دم لیتی ہے۔ جوش کی شاعری بھی تقریباً انہی منزلوں سے گزری ہے۔ اور اسی آزادی کی دلدادہ و شیدا رہی ہے۔ ہماری تقریباً پچاس سال کی گذشتہ زندگی کا ہر پیچ و خم جوش کی شاعری میں مل جائے گا ہمارے ادب کی ایک پوری نسل ان کی جیتی جاگتی شاعری کے سائے میں پرورش پا کر ابھری ہے۔ اس نسل نے ان سے جبر و تشدد کے خلاف بغاوت کرنا سیکھا۔ بت شکنی سیکھی، توہم دشمنی اور عقل دوستی سیکھی۔ غلامی سے نفرت کرنا سیکھا۔ ایک وسیع تر انسانی برادری کی جستجو سیکھی۔ جرأت گفتار حاصل کی۔ حسین مستقبل کے خواب اور محبت کی جیتی جاگتی دنیا حاصل کی۔ جوش نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"حقوق رہبریٔ مخلصانہ یاد کرو"

ان کے بعد کی نسل کے ادیب و شاعر ان کے حقوق کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔ اس بات کو بھول جانے کے معنی اپنی ادبی تاریخ سے انکار ہوگا لیکن ادیبوں اور شاعروں کی نئی نسل بھی ان پر کچھ حق رکھتی ہے۔ اس یادگار موقع پر اگر ہم نے اس طرف ان کو متوجہ نہ کیا تو یہ ہماری بڑی کوتاہی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم جشن جوش محض فیشن کے طور پر منا رہے ہیں۔ اور جوش کی عظیم شاعرانہ قوتوں کی طرف سے دانستہ و نادانستہ چشم پوشی کر رہے ہیں۔ جوش کا کام ختم ہو گیا ہے۔ نئے ادیب اور شاعر ان کی رہبریٔ مخلصانہ کے آج بھی مستحق ہیں۔ وہ صرف اپنے اس حق کا مطالبہ کرتے ہیں کہ جو دنیا جوش نے اپنی شاعری کے ذریعے سے ہمیں دی ہے۔ اس کے دروازے ہم پر بند نہ کریں۔ ان کی شاعری کی وسیع دنیا دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصے میں تاجدار، ساہوکار اور سماج کے اجارہ دار رہتے ہیں۔ دوسرے حصے میں ستم رسیدہ، نادار اور بیکاروں کی آبادی ہے۔ ایک حصے میں عالی شان عمارتیں ہیں۔ دوسرے حصے میں تاریک کھولیاں ہیں ایک طرف زر و سیم اور دولت بہتی ہے۔ دوسری طرف شدید بے زری اور بلند حوصلگی ہے۔ خیر و شر کے اس عظیم ٹکراؤ سے جوش کی شاعری تشکیل پاتی ہے۔ اور ان کی آواز یونانی ڈراموں کی غیبی آوازوں کی طرح ہمیں خیر کی فتح کا مژدہ سناتی ہے۔ نئے ادیب اور شاعر صرف یہ چاہتے ہیں کہ جوش کی نڈر اور بے باک آواز ہمیں برابر یہ مژدہ سناتی رہے اور ان دو قسم کے افراد کے درمیان جو حد فاصل انہوں نے کھینچ دی ہے وہ مٹنے نہ پائے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ دو یکسر مختلف اور متضاد حصے ایک سے نظر آنے لگیں۔ بڑے شاعر کا کلام ہماری توقعات کو پورا ہی نہیں کرتا۔ بڑھاتا بھی ہے۔ شاعر بوڑھا ہوتا جاتا ہے اس کی شاعری جوان ہوتی جاتی ہے۔ اس کی نظر وسیع تر ہوتی جاتی ہے اور اسی لحاظ سے اس کی شاعری کی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں۔ جوش کی شاعری کی ذمہ داری اتنی ہی بڑی ہے جتنا بڑا یہ عہد ہے۔ انہوں نے جس نوع کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے غالباً اردو شاعری میں کسی اور شاعر نے اتنی جرأت کے ساتھ یہ ذمہ داری اپنے سر نہیں لی۔ یہ ذمہ داری انسانیت کی حمایت کرنے کی ہے اور انسان کے ساتھ ساتھ ترقی کی راہوں پر آگے بڑھتے رہنے کی ہے وہ اب پینسٹھ سال کے ہو گئے۔ خدا انہیں عمر دراز عطا کرے۔ ہمیں ان کی موجودگی بہت بڑی تقویت کا باعث ہے۔ ہم ان کی بالغ نظری سے اپنی تاریک راہوں کے لئے نئی شعلیں فروزاں کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ان سے اور روشنی اور روشنی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی

کچھ اپنے بارے میں

درنومبر ۱۹۶۲ء کو انجمن دانشورانِ
ادب کے زیرِ اہتمام "جشنِ جوش" کے
موقع پر پڑھا گیا۔

خواتین و حضرات۔ سب سے پہلے میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انسان میں دو بڑی فطری کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ پہلی کمزوری تو یہ ہے کہ وہ اپنی مذمت سے برافروختہ ہو جاتا ہے اور دوسری کمزوری یہ ہے کہ اپنی تعریف سن کر اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔

جہاں تک پہلی کمزوری کی بات ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اس کمزوری پر کامل طور سے قابو پا چکا ہوں۔

سامعین کرام اس مغالطے میں نہ پڑ جائیں کہ میں اس پردے میں اپنی بلندیٔ اخلاق یا درویش صفتی کا اعلان کر رہا ہوں۔

اس لئے کہ اس مسئلے پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اپنی مذمت سن کر برافروختہ نہ ہونے میں نہ روحانیت ہی کا عنصر ہوتا ہے نہ شرافت و درویشی کا۔ بلکہ اس کا براہِ راست رابطہ ہوتا ہے اس چیز سے جس کو صحت عقلی کہا جاتا ہے

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب میں نے اس امر پر غور کیا کہ اپنی مذمت سن کر انسان کو غصہ کیوں آ جاتا ہے تو میں اس نکتہ تک پہنچا کہ چونکہ بے نہایت حبِ ذات کی بنا پر اس دنیا کا ہر شخص، بلا استثنا اپنے باب میں اسی بات کا یقین رکھتا ہے کہ اس کی شخصیت بے عیب و کامل ہے اور اس کی محبوب ذات میں ایک عالم گیر کشش موجود ہے کہ ہر نا اہل آدمی، خواہ وہ کسی فطرت کسی ماحول اور کسی مزاج ہی کا کیوں نہ ہو۔ اس سے محبت کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے

چنانچہ اس یقینِ محکم اور عقیدۂ کامل کی موجودگی میں جب وہ کسی کی زبان یا قلم سے اپنی مذمت سنتا یا پڑھتا ہے تو اس تصور شکن حادثۂ عظیم سے متاثر ہو کر وہ یکایک مشتعل و برافروختہ ہو کر الف ہونے لگتا ہے

آپ بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ برافروختگی کس قدر مہمل بنیاد پر قائم ہوتی ہے اس لئے کہ اس کرۂ ارض پر آج تک کوئی ایک فرد بھی ایسا پیدا نہیں ہوا ہے جس کو بے عیب یا مردِ کامل کہا جا سکے اور نہ اس آسمان کی ڈاٹ کے نیچے کوئی ایسی عام نہ

کشش رکھنے والی شخصیت ہی معرض وجود میں آئی ہے جس کی طرف اپنے تمام خارجی و داخلی اختلافات کو یکسر فراموش کر کے ہر شخص اس کو اپنے آغوش میں لے لیتا۔ چنانچہ جس وقت یہ بات سمجھ میں آگئی تو اس وقت اپنی مذمت سے ناخوشی کا جذبۂ احمقانہ فوراً میرے دل سے نکل کر وہاں چلا گیا جہاں سے وہ اب کبھی واپس نہ آسکے گا۔

اس مختصر سی تفصیل کو سن کر آپ خود اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں نے اپنی مذمت سے ناخوشی پیدا کرنے والے جذبے پر اپنی قابو یافتگی کا جو اظہار کیا ہے اس کا شرافت، انسانیت، روحانیت و درویشی سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔ بلکہ اس کی سرحد ملی ہوئی ہے اس چیز سے جس کو عقل کی صحت اور قوت فیصلہ کی معتدل و متوازن کارکردگی کا نام دیا جاتا ہے۔

اب رہی انسان کی یہ دوسری فطری کمزوری کہ وہ اپنی مدح سے کس قدر بشاش ہو جاتا ہے، سو اس کے باب میں بھی نہایت راست گفتاری کے ساتھ عرض کروں گا کہ اب میری طبیعت کا یہ عالم ہے کہ جب کوئی میرے منہ پر میری تعریف کرتا ہے تو میری جان پر بن جاتی ہے اور اس کی تعریف کی روشنی میں جب اپنے اعمال نفس کا منظر دکھائی دیتا ہے تو میں شرم سے آپ آپ ہو کر رہ جاتا ہوں ——

سو بندہ پرور اس صورت حال کا بھی شرافت نفس یا علوئے کردار سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ چیز بھی مبنی ہے اس چیز پر جس کو عقل کی صحت اور قوت فیصلہ کا توازن کہا جاتا ہے۔

حضرات ہم اہل ایشیا بالعموم اور ہم ارباب ہند و پاک بالخصوص بے جا فروتنی اور غیر معتدل انکساری کے امراض میں ایک مدت سے مبتلا ہیں۔

لیکن بے جا فروتنی اور غیر معتدل انکساری سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے، میں نے جو کچھ آپ کی خدمت عرض کیا ہے — ایک راست گفتار انسان کی حیثیت سے عرض کیا ہے

آپ کو یاد فرمانا چاہیے کہ اس خیال سے کہ آج میں اس جشن میں وہ بنیادی چیز کا جس کو دولہا کہتے ہیں، میں بے نہایت کرب کے ساتھ آیا اور ایک پٹھان کی حیثیت سے اپنے منہ پر مصنوعی برقع ڈال کر آپ کے روبرو نگاہیں اٹھا رہا ہوں

لیکن اس بے پایاں موذی شرمندگی کے باوجود میں انجمن دانشوران کے بانی شیخ عبدالخالق صاحب اور اسی کے ساتھ ساتھ تمام شرکائے بزم کا شکریہ اور بے کراں شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ تمام حضرات نے ایک میرے سے ذرہ حقیر کو آفتاب کے مانند چمکا دیا ہے۔

لیکن میرا یہ شکریہ حضرت امیر خسرو کے اس لمحۂ تشکر سے وابستہ ہے جب کہ انہوں نے دردناک شرافت کے جذبۂ مرکب کے ساتھ یہ کہا تھا کہ ۔

من درویش را کشتی بغمزہ
کرم کردی، الٰہی زندہ باشی

آخر میں اپنی ایک نظم "اعتراف عجز"[1] پیش کرتا ہوں۔ اس نظم کے پیش کرنے میں نہ تو جذبۂ شعر خوانی ہی کا تموج ہے نہ اخذ داد ہی کی تمنا بلکہ یہ نظم سنا کر میں آپ کو اس امر سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ خود اپنی شاعری کے بارے میں میری حقیقی رائے کیا ہے۔

---

[1] یہ نظم انتخاب کلام میں صفحہ ۴۶۸ پر ملاحظہ فرمائیے۔ (ص)

ابراہیم جلیس

محفل

(جشنِ جوش سے جوش نمبر تک)

بڑے اور مشہور رہنما یا فن کار مثلاً ادیب شاعر مصور وغیرہ کی "زندگی" اتنی بڑی نہیں ہوتی جتنی کہ اس کی "موت" بڑی ہوتی ہے۔
ہم لوگ بڑے آدمیوں کی زندگیوں کو اتنا یاد نہیں رکھتے جتنا کہ اس کی موت کو۔
مثال کے طور پر آپ کسی سے پوچھیں
"علامہ اقبال کی تاریخ وفات کیا ہے؟"
تو وہ بغیر سوچے کھٹ سے جواب دے گا۔
"۲۱ ر اپریل!"
لیکن اگر آپ اسی شخص سے علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش پوچھیں تو وہ کھسیانا ہو کر سر کھجانا شروع کر دے گا۔
گویا اپنے معاشرے میں فن کار صحیح معنی میں اسی دن پیدا ہوتا ہے جس دن وہ مرجاتا ہے۔

جب تک فن کار زندہ رہتا ہے ہم آپ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ وہ مرے تو ہم اس کو خراج عقیدت پیش کریں۔
فن کار کی زندگی میں ہم اسے کرائے پر مکان دینا تک گوارا نہیں کرتے لیکن جب وہ مرجاتا ہے تو ہم اس کی لاش پر سنگ مرمر جیسے قیمتی پتھروں کا مقبرہ تعمیر کر دیتے ہیں۔
اس کی زندگی کے اندھیرے میں ہم مٹی کے تیل کا ایک دیا تک نہیں جلاتے مگر اس کی قبر پر چراغاں کر دیتے ہیں۔
اس کی زندگی میں ہم بھول کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتے لیکن اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر پھول چڑھانے ضرور پہنچ جاتے ہیں ——!

ہم پر "مردہ پرستی" کا اتہام بڑا عام ہے، اور غالباً نئی نسل جو ہر پرانی غلط قدر کو مٹانے کا عزم لے کر نکلی ہے وہ فن کار کی زندگی

کی زندگی ہی میں قدر کی نئی قدر کو رواج دینا چاہتی ہے

ہمارے ملک میں بہت کم خوش نصیب فن کار ایسے گذرے ہیں جنہیں ان کی زندگی ہی میں خراج عقیدت پیش کیا گیا جو درحقیقت اُن کی موت کے بعد پیش کیا جاتا ہے ۔

انہی چند خوش نصیب فن کاروں میں شاعر حضرت جوش ملیح آبادی بھی ہیں جن کی ۶۵ ویں سالگرہ کا جشن کل شام کراچی میں بڑے جوش و خروش اور بڑے اہتمام سے منایا گیا ۔ کراچی کے تقریباً سارے بڑے ادیب و شاعر جوش کو ان کی زندگی ہی میں خراج عقیدت پیش کرنے جمع تھے ۔

جوش بہ حیثیت شخص بڑی متنازعہ فیہ شخصیت ہیں ۔ پاکستان (اور ہندوستان میں بھی) جہاں اُن کے لاکھوں کروڑوں مداح ہیں وہاں اُن کے مخالفین بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں ۔ چنانچہ اس جشن میں شخص جوش کے مخالفین کو دیکھ کر یہ راز ضرور فاش ہو گیا کہ "شاعر جوش" کا کوئی بھی مخالف نہیں ہے ۔

جوش کے اردگرد ان کے مخالفین کی موجودگی زبانِ خموشی سے یہ کہہ رہی تھی کہ

"جوش بلاشبہ اردو کی اعلیٰ شاعری کا ۶۵ سالہ زندہ مجسمہ ہے !"

ہمیں شبیر حسن خاں سے مطلب ہی کیا ۔۔۔ شاعر کا ذکر ہو تو سیاست سے کیا سروکار ۔۔۔ ؟

ہماری نظروں کو تو صرف اس منظر سے فرحت ہو رہی تھی کہ

"شاعر کی زندگی ہی میں اُس کے فن کو خراج عقیدت پیش کیا جا رہا ہے ! "

جوش کی زندگی ہی میں ماہنامہ "افکار" کا "جوش نمبر" شائع ہو گیا ہے ۔

شاعر کی قبر پر نہیں، بلکہ اُس کے جیتے جاگتے جسم پر پھول اور شالے دوشالے چڑھائے جا رہے ہیں ۔

ہم نے فن کاروں کے "جلسہ ہائے تعزیت" تو بہت دیکھے ہیں، لیکن فن کار کا "جلسۂ تہنیت" پہلی بار دیکھا تھا !

"جوش مجموعۂ اضداد ہیں !"

جب تک جوش زندہ ہیں وہ مجموعۂ اضداد ہی رہیں گے ۔۔۔ شاعر انقلاب جوش ۔۔۔ شاعر اسلام جوش ۔۔۔ ہندوستانی جوش ۔۔۔ پاکستانی جوش ۔۔۔ ترقی پسند جوش ۔۔۔ رجعت پسند جوش ۔

متضاد شخصیتوں کے اس ہجوم میں "شاعر جوش" کبھی کبھی جیسے گم ہو کر رہ جاتا ہے ۔ مگر سب سے زیادہ دلچسپ مجموعۂ اضداد یہ ہے کہ :

جوش کا جسم فانی ہے ۔

اور اس جسم میں پرورش پانے والی اعلیٰ شاعری غیر فانی ہے !

جوش کے فانی جسم کے ساتھ ساتھ جہاں ہندوستانی جوش، پاکستانی جوش، رجعت پسند جوش، ترقی پسند جوش، سب دنیا سے اُٹھ جائیں گے وہاں اُردو ادب سے "شکوہِ الفاظ" بھی اٹھ جائے گا ۔

اسی لئے ہم جوش کے جسم کی درازی عمر کی دعا مانگتے ہیں کہ اس جسم میں اردو کا شکوہِ الفاظ اور اعلیٰ شاعری کا نہایت قیمتی سرمایہ محفوظ ہے۔

جوش کا جسم اس صندوقچی کی طرح ہے جس میں اردو ادب کے بڑے ہی قیمتی ہیرے اور موتی رکھے ہوئے ہیں۔

اور یہ سارے ہیرے شبیر حسن خاں نے "عالمِ فکر" کی آنال پاتال چھان چھان کر جمع کئے ہیں۔ اور جب تک شبیر حسن خاں زندہ رہے گا اردو ادب کے خزانے کو عالمِ فکر کی ساری دولتوں سے بھرتا رہے گا

اسی لئے جوش کی بجائے شبیر حسن خاں کی درازی عمر کی دعا مانگنی چاہئے۔

شبیر حسن خاں کی شمعِ زندگی کی لو جتنی تیز ہوتی جائے گی اردو ادب کا ایوان بھی اتنی ہی تیزی سے جگمگاتا رہے گا۔

(بشکریہ "جنگ")

کان پر رکھ کر قلم نکلے!

(نامہ نگار خصوصی)

قبل از مرگ برسی

۵ نومبر کو کراچی کے ایک سیٹھ صاحب کی کوٹھی کے لان میں جو یوم منایا گیا وہ اس قسم کے سارے ایام سے بالکل مختلف تھا، جو عموماً مرنے کے بعد منائے جاتے ہیں۔ اور پہلی دفعہ یہ واقعہ دیکھنے میں آیا کہ ایک بہت ہی بھاری بھرکم شخصیت کو جو کرسی پر بیٹھا کر اس پر ہار پھول ڈال کر اور شال دوشالے اوڑھا کر اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا دن منایا جا رہا ہے۔ اور وہ شخصیت یہ تماشا دیکھ دیکھ کر حیران ہے کہ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

مردہ پرستی کے خلاف جہاد کا نعرہ بھی اسی روز پہلی دفعہ سننے میں آیا۔

یہ بات سچ پوچھئے تو بڑی اچھی معلوم ہوئی کہ کسی بزرگ و برتر شخصیت کا یوم منانا ہو تو اس کے مرنے اور پھر ایک سال مزید گذرنے کا انتظار کیوں کیا جائے؟ اس کی زندگی ہی میں یہ کارِ خیر کیوں نہ انجام دے لیا جائے تاکہ ہمیں بھی خوشی ہو، وہ بھی خوش ہو، اور اس کا خدا بھی خوش ہو جائے!

واعظِ تنگ نظر اور جوش

جس شخصیت کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ جناب جوش ملیح آبادی کی شخصیت ہے جس کے بہت سے دشمن بھی ہیں اور بہت سے دوست بھی۔

اُن کی شخصیت بہت عرصے سے متنازعہ چلی آرہی ہے۔

نوائے وقت، جیسے اخبارات اور اسی گروہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو آج تک اسی بات پر اعتراض ہے کہ جوش صاحب پاکستان کیوں چلے آئے؟ اور اگر چلے آئے تھے تو واپس جانے کا نام کیوں نہیں لیتے؟

کچھ لوگ انہیں کافر، زندیق اور دہریہ کہہ کر اپنے آپ کو خوش کر لیتے ہیں

بعض لوگوں سے کچھ اور نہیں بن پڑتا تو ان کی شاعری کو صرف الفاظی جادوگری کہہ کر خود کو تسکین دے لیتے ہیں کہ تنقید کا فرض ادا کر دیا۔

مگر اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو جوش صاحب کی عزت کرتے ہیں اور ان سے محبت بھی۔ وہ انہیں بہت بڑا شاعر ہی نہیں بہت بڑا انسان بھی سمجھتے ہیں!

ایسے ہی لوگوں نے مل کر ۵ / نومبر کو اُن کا جشن منایا تھا۔

اس کا اہتمام سیٹھ عبدالغنی لون عبدالرزاق نے کیا تھا۔ علاوہ سوہن والے نہیں بلکہ سگریٹ والے عبدالخالق نے — جنہوں نے "دانشورانِ ادب" کے نام سے ایک انجمن بھی اپنی سرپرستی میں قائم کر رکھی ہے۔

جوش علیہ السلام

تو صاحبو! اس سرد شام کو ادھی "گلبرگ" کے سبزہ زار میں میں نے یہ دیکھا کہ شہر کا ہر بڑا ادیب و شاعر اور ہر چھوٹا ادیب و شاعر (بخاری، عالی اور جمالی کو چھوڑ کر) موجود ہے۔

ایک کونے میں چھوٹے سے صہبا لکھنوی، موٹا سا "افکار" بغل میں دابے جوش صاحب کی تحریروں، تصویروں اور خاکوں کی نمائش لگائے ہوئے ہیں، تو دوسری جانب بابا ذہین شاہ تاجی جیسے بزرگ اپنے عقیدت مندوں سمیت چبوترے پر تشریف رکھتے ہیں چبوترہ کچھ زیادہ بڑے دانشوروں کے لئے مخصوص تھا جس پر کچھ چھوٹے دانش ور بھی چڑھ کر بیٹھ گئے تھے تاکہ انہیں بھی کم سے کم جشن کے اختتام تک بڑا سمجھا جاتا رہے۔

جوش صاحب کو اس چبوترے پر رکھی ہوئی ایک چوکی پر اس طرح سجایا گیا تھا کہ اُن کا رُخ اس ہال کے سامنے رہے جس کے اندر خواتین جمع تھیں۔ اور انہیں خواتین کے سامنے رخ کر کے ایک دانش ور نے "جوش علیہ السلام" کے عنوان سے قصیدہ عرض کرتے ہوئے جب یہ مصرع پڑھا

"جو پہلوانِ بستر بھی تنہا نہ تھا کل"

تو عورتوں کا پتہ نہیں، مگر سردی میں مردوں کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔

چبوترے کے اُوپر اور چبوترے کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے اور اطراف میں کھڑے ہوئے افراد کی تعداد مل ملا کر ہزار کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ جن لوگوں کو دعوت نامے بھیجے گئے تھے وہ تو خیر آ ہی گئے تھے، مگر بہت سے ایسے لوگ بھی شریک تھے جنہیں مدعو نہیں کیا گیا تھا، بلکہ جوش صاحب سے محبت کا جذبہ انہیں کھینچ لایا تھا۔

جگہ تنگ تھی، مرد ماں بسیار تھے، اور چائے اندک تھی۔ چائے تو ویسے بھی تھوڑی رہنی چاہیئے۔ مہمان کتنے ہی کم بلائے جاتے۔ کیوں کہ جوش کی زندگی میں جوش کے سامنے جوش کے مرثیے سننے کے بعد چائے کی خواہش جو پہلے ایک پیالی کے برابر تھی، چار پیالیوں کے برابر جا پہونچی تھی۔

ہاں صاحب! واقعی مرثیے پڑھے گئے۔ آپ اسے گپ نہ سمجھئے۔ ایک صاحب نے جن کا ذکر میں نے ابھی کیا "جوش علیہ السلام" کے عنوان سے مرثیہ ہی پڑھا تھا۔ جسے میں غلطی سے قصیدہ لکھ گیا ہوں۔

ایک اور صاحب نے جو نظم سنائی، اُس کا عنوان تھا "جوش مرحوم"

جوش کے جشن کے موقع پر یہ مرثیے سُن کر جب میں نے ذرا منہ بنایا تو میرے برابر بیٹھے ہوئے ریاض فرشوری کہنے لگے:

"تم سمجھے نہیں بھائی، یہ طنز ہے طنز!"

اور میں اُن کے سمجھانے سے سمجھ گیا کہ یہ طنز ہے۔

اور بہت جلد اس کا طنزیہ نتیجہ نکال لیا کہ ہم جوش کی ۶۵ ویں سالگرہ کا جشن منانے نہیں بلکہ خدا نہ کرے، خدا نہ کرے اُنہیں دفنانے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

(میری تو دعا ہے کہ جوش بابائے اردو سے دگنی عمر پائیں!)

اس جشن کی صدارت کے لئے بہت عرصے پہلے راجہ محمود آباد کو آمادہ کرلیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب انہوں نے اس کی منظوری دی ہوگی تو منتظمین نے اپنے تئیں قطعی طور پر یہ سمجھ لیا ہوگا کہ راجہ صاحب جب زحمت کریں گے تو صدارت ہی کے لئے کریں گے۔ مگر عین موقع پر راجہ صاحب منتظمین کو طرح دے گئے۔

جب ایک بارِش ساؤنڈ بوتھ شخص نے مائکروفون پر رسمی طور سے راجہ صاحب کو جوش صاحب کے ہم پہلو چوکی پر بیٹھ کر اس جشن کی صدارت کے لئے مدعو کیا،

تو چڑھنے کو تو راجہ صاحب بدقت تمام چبوترے پر چڑھ گئے۔ مگر نحیف معذرت بھرے لہجے میں اعلان کیا کہ:

"میں صدارت کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ میں اس جشن میں مہمان خصوصی بننا پسند کروں گا۔"

اتنا سُن کر میرے دل میں خیال آیا کہ اب وہ یہ کہیں گے:

"کہئے حاضرین و منتظمین! منظور ہے؟ نہیں منظور تو پھر سلام علیکم!"

مگر انہوں نے ایسا نہیں کہا۔ بلکہ راجہ صاحب اور حاضرین نے نظروں ہی نظروں میں کچھ ایسا خفیہ سمجھوتہ کرلیا کہ پتہ ہی نہیں چل سکا کہ کیا ہوا ـــ

پلک جھپکی تو راجہ صاحب اس چوکی پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے متمکن نظر آئے۔ بس اس کے سوا "دانش وران ادب" نے انہیں کچھ کرنے اور کہنے ہی نہیں دیا۔

تو صاحب اس جشن میں جوش کے اب تک زندہ رہنے پر اظہار مسرت اور ان سے اظہار عقیدت کے طور پر نہ صرف انہیں پھولوں اور زری گوٹے کے ہار پہنائے گئے، بلکہ چند ریشمی دوشالے بھی اوڑھائے گئے،

اور جوش صاحب اخلاقاً مسکرا مسکرا کر اپنی یہ درگت بنواتے رہے ـــ کرتے بھی کیا بے چارے۔ آن پھنسے کا معاملہ تھا ـــ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

ایک خطبہ، دو مرثیے، دو مقالے

اظہار عقیدت و مسرت میں جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی، وہ ایک عدد خطبہ استقبالیہ دو مرثیوں، ایک مقالے اور چند پیغامات سے پوری کردی گئی۔

ان میں کام کی چیز مقالہ ہی تھا، جسے مجتبیٰ حسین لکھ کر لائے تھے۔ اس کو مقالہ کہنا تو زیادتی ہوگی، آپ اسے مضمونچہ سمجھ لیجئے۔ اس میں وہ ساری باتیں بے دھڑک کہہ دی گئی تھیں جو وہاں سنجیدہ اور متین حضرات اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے تھے۔ دبے لفظوں میں مجتبیٰ حسین نے اس قسم کے جشن کی طرف بھی اشارہ کردیا تھا۔

مطلب اُن کے کہنے کا یہ تھا کہ:

"جوش کی شاعری اور شخصیت ان رسومات سے بہت بالا ہے۔ نہ کوئی ایسا پیمانہ ایجاد کیا جاسکتا ہے جس سے ان کی شاعری کی قدر و قیمت پرکھی جاسکے اور نہ ایسا ترازو بنایا جاسکتا ہے جس میں اُن کی شخصیت کو تولا جاسکے!"

یہ باتیں بڑی دل لگتی اور خدا لگتی تھیں، اس لئے خاصے حاضرین و سامعین و ناظرین نے واہ واہ، سبحان اللہ وغیرہ کہا۔

آخر میں جناب جوش نے جو کچھ نثر میں کہا وہی اپنی نظم "اعترافِ عجز" میں کہہ دیا۔ اُن کی باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ میری زندگی کا آغاز تو اب ہوا ہے، اور کائنات کے اسرار اب ۷۵ سال کی عمر کو پہونچ کر مجھ پر منکشف ہونے شروع ہوئے ہیں۔ مگر ان اسرار کو بیان کرنے کے لئے میں اب بھی خود کو عاجز پاتا ہوں!

واضح رہے کہ یہ نظم "پہلوان بستر بیمیں تناں" نے نہیں کہی تھی، بلکہ اس شاعر نے کہی تھی جو تعریف و توصیف کے موجودہ جھوٹے معیاروں سے بہت بلند ہے۔ جس کے حضور میں کون و مکاں کا ایک ایک ذرہ اس انتظار میں سر جھکائے حاضر رہتا ہے کہ کب اُس کی نظر التفات اُس پر پڑتی ہے اور کب وہ ہم سر آفتاب بنتا ہے"۔

جوش صاحب کا "افکار نمبر"

اس "جشن جوش" میں ایک خاص چیز دیکھنے میں آئی۔ یہ وہی صاحب تھے جو داڑھی لگائے کوٹ پتلون اپنے جسم پر ڈالے اعلانچی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

اس بار پھر اعلانچی نے بڑی تفصیل کے ساتھ میاں جوش کو بے ہوش کیا، اور انہیں بار بار ہوش میں لا کر بے ہوش کرتا رہا۔

صہبا لکھنوی جب سنہری ہار اور اسٹینڈرڈ ڈکشنری جیسا موٹا رسالہ جوش کو نذر کرنے کے لئے آگے بڑھے تو اس نقیب نے آؤ اور تاؤ دونوں کو دیکھے بغیر یہ کہہ دیا ---

"اس پُرمسرت موقع پر جناب صہبا لکھنوی نے ماہنامہ جوش کا "افکار نمبر" نکالا ہے"

اور یہ سنتے ہی ماہنامہ جوش کا "افکار نمبر" صہبا کے ہاتھ میں تھرتھرایا اور جوش صاحب کی گود میں سربسجود ہو گیا!

ان جدید مولانا کو دیکھ کر اور سُن کر سامنے کی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے:

"بھائی اسے ساتھ لے چلو یہ تو ڈبیا میں بند کر کے رکھنے کی چیز ہے"۔

جب شام اچھی طرح تاریک ہو گئی تو یہ جشن ختم ہوا۔

اور لوگ بھاگ چائے کی میزوں پر پل پڑے!

اُس وقت کچھ ایسی آپا دھاپی مچی کہ جوش صاحب وہیں چوکی پر بیٹھے رہ گئے۔

ایک ایک گھونٹ چائے کا پی کر تماشائیوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دولہا غائب تھا۔ شاید اُسے رونمائی کے لئے زنان خانے میں بُلا لیا گیا ہوگا!

(بشکریہ "نمکدان")

حقیقت

ابن انشا نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بُلایا۔ بولے "اکرام ادیب صاحب سے کہو۔ افکار کا ٹیلی فون نمبر چاہئے"۔

عزیز گل چپراسی "بہت اچھا" کہہ کر چلا گیا۔ اور اتنی دیر تک غائب رہا کہ ابن انشا سمجھے، اُس نے کلرک کا دفتر چھوڑ کر کہیں اور ملازمت کر لی ہے۔

آخر کافی انتظار کے بعد عزیز گل آیا۔ کہنے لگا "اکرام صاحب کہتے ہیں کہ دفتر میں تو "افکار" کا صرف ایک ہی نمبر ہے۔ جوش نمبر!"

(بشکریہ "نمکدان")

تبرّکات

جوش کے اب و جد میں سبھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ ذیل میں جوش کے والد نواب بشیر احمد خاں بشیر اور پردادا نواب فقیر محمد خاں گویا کے چند منتخب اشعار ہم بطور تبرک پیش کر رہے ہیں۔ کوشش کے باوجود ہمیں جوش کے دادا نواب محمد احمد خاں احمد کا کلام دستیاب نہ ہو سکا حتی کہ جوش صاحب کے پاس بھی اُن کا دیوان محفوظ نہیں۔ (ص،)

نواب بشیر احمد خاں بشیر

آج ہم اُن کو دیکھ آئے بشیر — واقعیٔ دیکھنے کی صُورت ہے!

بُرا ہو دل کا یہ کم بخت آہ کر بیٹھا — قریب تھا کہ وہ کچھ مجھ سے گفتگو کرتے

دَم اُن کے سامنے نکلے دعا یہ مانگوں گا — ذرا مجھے مرے احباب قبلہ رو کرتے

کوئے گریاں قریبِ تُربت ہے — زندگی پھر تری ضرورت ہے!

آمادہ ہو جو سوزِ نہاں کے بیان پر — انگارا خود اُٹھا کے میں رکھ لوں زبان پر

چھوڑو خدا ہی پر کہ وہاں ہوگا فیصلہ — میرے بیان پر نہ تمہارے بیان پر

اب تم بھی مہرباں ہو تو جی خوش نہیں رہوں

دل بجھ گیا، کچھ ایسی بلا آئی جان پر

نوابؔ فقیر محمد گویا

کوئی مجھ سا دیوانہ پیدا نہ ہوگا
ہُوا بھی تو پھر ایسا رُسوا نہ ہوگا

آپ سے جب گذر گئے پہنچے
یاد ہے راستہ ترے گھر کا

نہ اُسے لا سکے تو مر گئے آپ
جبر اور اختیار کو دیکھا

موت آئی مگر نہ یار آیا
اثر انتظار کو دیکھا

اٹھا جو بزم سے ساقی پکڑ لیا دامن
میں آج دستِ سبُو کا نیاز مند ہوا

چشمِ جاناں کو دلِ زار نے سونے نہ دیا
رات بیمار کو بیمار نے سونے نہ دیا

اگر آنکھیں ہمیں دی ہیں خدا نے
کبھی اس بُت کو دکھلایا تو ہوتا

ہر روش خاک اڑاتی ہے صبا میرے بعد
ہو گئی اور ہی گلشن کی ہوا میرے بعد

دعائیں مانگی ہیں مدتوں تک جُھکا کے سر ہاتھ اٹھا اٹھا کر
ہوا ہوں تب میں بُتوں کا بندہ، خدا خدا کر، خدا خدا کر!

تو نے نظروں سے گرایا کیا ہمیں
سب کی نظروں سے گرے جاتے ہیں ہم

ناتوانی یاں پہ پرواز ہے
رنگِ رُخ کے ساتھ اڑ جاتے ہیں ہم

دیکھئے اب شامِ غربت کیا دکھائے
رخصت اے صبحِ وطن جاتے ہیں ہم

جو ہمیں بھول گیا ہے ظالم
اُس کو ہم یاد کیا کرتے ہیں

نہ ہوگا کوئی مجھ سا محوِ تصور
جسے دیکھتا ہوں، سمجھتا ہوں تُو ہے

نہیں بچتا ہے بیمارِ محبت
سُنا ہے ہم نے گویا کی زبانی

نہ آسماں کے ہوئے اور نہ ہم زمیں کے ہوئے
جو تیرے دل سے گرے ہم نہ پھر کہیں کے ہوئے

ہیں سبکدوش و صدا قیدِ الم سے آزاد
کب گرفتارِ قفس مرغِ نظر ہوتا ہے؟

ہوں وہ مجرم، کانپتا ہے خوف سے سارا بدن
ہاتھ اُٹھاتے شرم آتی ہے دُعا کے واسطے

جوش ملیح آبادی

ضربِ شاہد بفرقِ شاہد باز

میں اس قدر بے پایاں طور پر مصروف رہتا ہوں اور آپ کو شاید انتی شدید مصروفیت کا یقین مشکل سے آئے گا کہ میں آج تک "جوش نمبر" کے تمام مضامین کے مطالعے کیلئے وقت نہ نکال سکا۔ میں نے اب تک جو مضامین پڑھے ہیں اُن پر نگاہ کر کے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بعض حضرات نے جو میری مدح سرائی کی ہے اس میں بھی بربنائے محبت مبالغہ ہے اور جن لوگوں نے مضامین کے پردے میں میری مذمت کی ہے اُس میں غلو بھی ہے اور غلط بیانی بھی۔ میرے نزدیک "افکار" کا یہ نمبر میرے باب میں ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جو آئندہ نسلوں کی بیشمار وجوہ رہنمائی کر سکے گی۔ اور اس سلسلے میں صہبا صاحب کا یہ اقدام اولیں ادبیات اردو کی تاریخ میں تا قیامت دائم و قائم رہے گا۔ البتہ شاہد احمد دہلوی صاحب کے مضمون کے بارے میں میں نے اظہار خیال کر دیا ہے اب رہا میرے دوست ماہر القادری صاحب کا مضمون، تو اس پر ایک مشفقانہ تبسم کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

جوش ۲۰ ۴ ۶۲ء

میرے ہم قلم بھائی شاہد احمد صاحب دہلوی نے، خدا انہیں خوش رکھے اور نیکی کی توفیق دے، "افکار" کے "جوش نمبر" میں ایک طویل مضمون، کس جی سے کہوں کہ میرے خلاف اور بڑا ل ہجے کی حد تک میرے خلاف لکھا ہے۔

شاہد صاحب، پھوپھی زاد بھائی ہیں میرے محبوب دوست ڈاکٹر کرنل اشرف الحق مرحوم کے۔ شرفا کا دستور ہے، کہ وہ دوست کے بیٹے کو اپنا بیٹا، اور دوست کے بھائی کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں، اس لیے میں شاہد میاں کو بھی اپنا چھوٹا بھائی خیال کرتا تھا، اور مجھے اُن سے یہ توقع تھی کہ وہ بھی مجھے اپنا بڑا بھائی خیال کریں گے۔

لیکن جب اُن کا مضمون پڑھا، تو میری خوش عقیدگی کا شیشہ چور چور ہو کر رہ گیا۔

لیکن یہ خیال کر کے ہم نے اپنی ہستی کو شایانِ مبارک باد سمجھا کہ چلو خوش عقیدگی کا شیشہ چور چور ہو گیا۔ تو کیا ہوا۔ یہ کیا کم ہے کہ مجھ پر اپنے دل کی بھڑاس نکال کر میرے بھائی نے اپنے سینے میں وہ متاعِ جمع کر لی جس کو آسودگیٔ خاطر کہا جاتا ہے۔

سرِ دوستاں سلامت، کہ تو خنجر آزمائی!

لیکن سوال یہ ہے کہ شاہد صاحب نے میری ذات سے اُن عیوب کو وابستہ کرنے کی ناکام سعی کیوں کی ہے، جو قطعی طور پر "سماعی" اختراعی اور فرضی ہیں، اور جن کا تخم میری زمینِ فطرت پر کبھی اُگ ہی نہیں سکتا ہے۔

حیرت اس بات پر ہے کہ انہوں نے اس زرّیں موقع سے فائدہ اٹھا کر، میرے اُن باوَن باوَن گز کا قامت رکھنے والے عیوب کو پیش کیوں نہیں فرمایا جو حقیقی ہیں اور اس قدر نمایاں کہ ارضِ پاکستان و ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں کے بازاروں اور چوراہوں پر منہ میں گلوریاں دبائے، اینڈتے، بررتے، گن گناتے اور گاتے پھرتے رہتے ہیں؟

افسوس چشمِ شوخِ تو، گوہر شناس نیست!

بات یہ ہے، اسے میری جواں بختی سمجھئے یا بدقسمتی، اس کو میرا ہنر خیال فرمایئے یا بے ہنری کہ ایک مدتِ دراز سے میں اپنی نااہلی کے باوجود، شہرت و نموداری، اپنی درایت نوازی و روایت بے زاری، اور اعلائے کلمۂ حق کی منزل میں اپنی رسوائے عالم برہنہ گفتاری کے باعث اپنی محبوب و جذباتی قوم کا ایک محسود، معتوب، مغضوب، مبغوض اور مردود انسان ہوں، اور اسی بنیاد پر میرے خلاف اب تک کئی ہزار مضامین رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور جہاں کہیں بھی دو آدمی سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں وہاں سبّ و شتم کا ہدف بن جانے کی خاطر میں لازماً تیسرا آدمی ہوتا ہوں۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ میں نے ان مخالفہ مضمونوں، اور ان معاندِ غیبتوں کے جواب کا آج تک ارتکاب نہیں کیا ہے۔

ناملائم مطبوعہ حروف اور ناروا منطوق الفاظ نے میری آنکھوں اور میرے کانوں کو ہزاروں بار ڈسا اور بری طرح ڈسا ہے۔ لیکن میری تنہائیاں اس کی گواہی دیں گی کہ میں نے ایک بار بھی اُف تک نہیں کی ہے۔ اور میں نے اپنے اوہام گزیدہ کم زوری کے لمحات میں اپنی قوم کے حق میں بارہا یہ دعا مانگی ہے کہ اے میرے اللہ میری قوم کو جذبات سے ہٹا کر فکر کی جانب مائل فرما دے اس لئے کہ فکر ہی اس عالمِ کون و فساد کی بہترین متاع ہے۔

توانا بود، ہر کہ دانا بود!

چناں چہ اپنی اس سنتِ جاریہ کے مطابق میں شاہد میاں کے اس مضمون کو بھی پی جاتا، اور ہرگز جواب نہ دیتا کہ خاموشی ہی بہترین جواب ہوا کرتی ہے۔

لیکن، مرتا کیا نہ کرتا، احباب نے ضد کی، آنکھیں نکال نکال کر ضد کی کہ میں اس مضمون کا جواب دوں اور ضرور دوں۔

انہوں نے مجھ سے کہا کہ چوں کہ یہ مضمون "جوش نمبر" میں شائع ہوا ہے، اور چوں کہ یہ نمبر، میرے بعد، ایک تاریخی دستاویز کی سی اہمیت حاصل کرنے والا ہے، اس لئے اگر اس کے جواب میں حسبِ عادت خاموشی اختیار کی گئی تو آئندہ نسلیں اس گمراہی کا صیدِ زبوں ہو کر رہ جائیں گی کہ اس "معاندانہ" مضمون میں جو کچھ "دروغ بافی" اور "تہمت تراشی" کی گئی ہے وہ حرف بحرف صحیح اور باوَن تولے پاؤ رتی صداقت پر مبنی ہے۔

مجھ کو احباب کی اس بات میں وزن معلوم ہوا، اور میں آخر کار، کراہت کے ساتھ، جواب دینے پر آمادہ ہو گیا۔ چناں چہ سب سے پہلے نگاہ پڑی اس مضمون کی سرخی پر ——

اس مضمون کی سُرخی

اس مضمون کی سُرخی ہے: "جوش ملیح آبادی، دیدہ و شنیدہ"۔

اس سرخی میں "دیدہ" کے ساتھ "شنیدہ" کس مصلحت سے آمیختہ کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے اس نکتے کا سمجھ لینا اس لئے بہت ضروری ہے کہ یہی اس مضمون کی کنجی ہے۔

صرف شاہد صاحب ہی نہیں، تمام ادبی دنیا، اس سے واقف ہے کہ شاہد صاحب میرے دوستوں اور میرے ہم نشینوں کے زمرے میں کبھی رہے ہی نہیں ہیں، اور میرے اُن کے مابین صرف ایک بار کے علاوہ ہمیشہ اس قدر طویل فاصلے رہے ہیں کہ مجھے ان کا ہم شہری نہیں ہم صوبہ رہنے کا بھی فخر کبھی حاصل نہیں رہا ہے۔

اس صورت حال میں شاہد صاحب کے امکان ہی میں یہ بات نہیں تھی کہ وہ ایک شاہدِ عینی کی حیثیت سے میرے "دیدہ" واقعات پر روشنی ڈال سکتے۔ لیکن چوں کہ شاہد صاحب، دو اسباب کی بنا پر، جن کا ذکر آگے آئے گا، میرے خلاف مضمون نویسی پر کمربستہ ہو چکے تھے، اس لئے اپنے جذبۂ غیظ و غضب کی نکاسی کے واسطے انہیں اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر ہی نہیں آیا اور نہ آ سکتا ہی تھا کہ وہ اپنے تہی دست "دیدہ" میں ایک مالا مالِ افترا، "شنیدہ" کا اضافہ کریں۔ اور "سُنا ہے" کی آڑ لے کر مجھ پر وہ کیچڑ نکال لیں جس کو بھڑاس کہا جاتا ہے۔

اندھے کی داد نہ فریاد، اندھا مار بیٹھے گا!

اس "سُنا ہے، سُنا ہے" کی آڑ میں، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، ایک تو یہ فائدہ ہے کہ ہر قسم کی ذمہ داری سے علیحدہ رہتے ہوئے وہ میرے متعلق جدل میں آئے بے تکلف لکھتے چلے جائیں، اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر اُن کے بیان کردہ "واقعات" میں سے چند یا تمام، "واقعات" تہمت کاری و دروغ بافی ثابت ہو جائیں تو وہ "دروغ برگردن راوی" کا نعرہ لگا کر بھاگ کھڑے ہوں۔

نوعِ انسانی کی یہ بڑی بدبختی ہے کہ نیت کی خالصیت و آمیختگی، یعنی اُس کے کھوٹے کھرے پن کے جانچنے کا کوئی آلہ اب تک ایجاد نہیں ہوا ہے۔ پھر بھی انسان کی ژرف نگاہی و دراکی نے یہ ایک منطقی آلہ ایجاد کر لیا ہے کہ جب کسی تقریر یا تحریر کی نیت معلوم کرنے کا مرحلہ آ جاتا ہے تو مقرر و کاتب کے الفاظ و حروف اور لہجے کو درایت و دلیل کے کانٹے پر تول اور تحقیق و تدقیق کے گز سے ناپ کر اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ:

(الف) تقریر یا تحریر میں تناقض تو موجود نہیں ہے۔

(ب) تقریر یا تحریر میں گمنام راویوں سے مدد لی گئی ہے یا معروف راویوں کی وساطت سے واقعات کو بیان کیا گیا ہے نیز جن معروف راویوں کے نام لئے گئے ہیں وہ علمِ رجال کی کسوٹی پر صادق القول بھی ثابت ہوتے ہیں کہ نہیں اور ان کی روایتوں کی پشت پر کوئی قرینۂ عقل، کوئی محکم دلیل اور کوئی ناقابلِ ابطال ثبوت بھی ہے کہ نہیں۔

(ج) اور اسی کے ساتھ ساتھ اس امر پر بھی گہری نگاہ ڈالی جاتی ہے کہ مقرر یا کاتب نے اپنی تقریر یا تحریر میں کسی ابلاغی ضرورت کے بغیر شائستہ اسلوب و الفاظ کو دانستہ ترک و نظر انداز کر کے ناشائستہ اسالیب و الفاظ سے تو کام نہیں لیا ہے، اور اپنی آواز یا لہجۂ تحریر کے رشتے میں غیظ و عناد کے آتشیں حلقوں یا سوقیانہ زبان کے جھوٹے موتیوں کو تو پرو نہیں دیا ہے۔

اور ــ جب یہ تمام سلسلۂ عمل پایۂ تکمیل کو پہونچ جاتا ہے تو مقرر و کاتب کے باب میں، آسانی کے ساتھ، یہ رائے قائم کی

جاتی ہے کہ مفرد و کاتب کی نیت خیر پر مبنی ہے یا شر پر، اور وہ راست گفتار ہے یا دروغ باف۔

متذکرۂ بالا امور کو نگاہ میں رکھ کر اگر آپ شاہد صاحب کے مضمون " دیدہ و شنیدہ " کا مطالعہ فرمائیں گے تو آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا کہ یہ عمارت " خشت راست " پر تعمیر کی گئی ہے یا " خشت کج " پر، اس میں نیک نیتی کار فرما ہے کہ بدنیتی۔ اور یہ مضمون راست گفتاری کا گنجینہ ہے یا غلط گوئیوں کا پشتارہ۔

اب آئیے شاہد صاحب کے مضمون کی طرف۔

میری بلانوشی و مفت خوری

(الف) " بلانوشی "

شاہد میاں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

" جوش صاحب بلا نوش تھے، جو کچھ مل جائے چڑھا جاتے تھے "

کسی کی بلانوشی پر اس کے ہم پیالہ و ہم نوالہ احباب ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔ اور چونکہ شاہد صاحب جیسا کہ خود ان کو اعتراف ہے، میرے ہم پیالہ تو کیا، کبھی اور کسی منزل عمر میں بھی میرے ہم نشیں بھی نہیں رہے ہیں، اور چونکہ میری " بلا نوشی " کو کسی " راوی " کی زبان سے نہیں، بلکہ انھوں نے اپنے براہِ راست " علم " سے بیان فرمایا ہے۔ اس لئے، زحمت تو ضرور ہوگی، لیکن شاہد صاحب صرف اس قدر بتا دیں کہ انہیں میری " بلا نوشی " کا علم کیوں کر ہو گیا۔ اور میری یہ " بلا نوشی " کسی مکاشفے یا کسی مراقبے کی پیداوار ہے یا جذبۂ عناد کے شکم مبارک سے پیدا ہوئی ہے ؟

ہر چند شاہد صاحب نے اس سلسلے میں کسی " راوی " کا سہارا نہیں لیا ہے، لیکن حسنِ ظن کے تقاضے سے یہ فرض کر لیجئے کہ انہوں نے میرے خلاف صدہا روایتوں کے مانند کسی " راوی " سے میری " بلا نوشی " کا ماجرا بھی " سنا " ہوگا۔

اگر ایسا ہے تو مہربانی فرما کر اس " راوی " یا اُن " راویوں " کے اسمائے مبارک سے آگاہ فرما دیں، تاکہ اُن سے دریافت کیا جا سکے کہ میری " بلا نوشی " کا ان کے پاس کیا ثبوت ہے۔ وہ شاہد عینی ہیں، یا انہوں نے بھی شاہد صاحب کی طرح صرف " سنا " ہے۔

اس کے علاوہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ صرف وہی چیز — روایت بنتی ہے جس کا خارج میں کوئی وجود ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یارانِ طریقت مبالغے سے کام لے کر اُس چیز کو، جو کا سانپ اور رائی کا پربت بنا دیا کرتے ہیں لیکن جب سرے سے رسی اور رائی دونوں مفقود ہوں تو سانپ اور پربت کا بنا لینا ایک شرمناک دلیری کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

دور کیوں جائیے خود شاہد صاحب کے مضمون میں میری بلا نوشی کا ابطال ملاحظہ فرمائیے :

وہ خیر سے فرماتے ہیں کہ میں گھڑی سامنے رکھ کر " پانچ چھ " پیگ پیتا ہوں "۔

ہر چند یہ جو میرے " پانچ چھ پیگ " لکھے گئے ہیں، وہ شاہد میاں کی غلط شماری یا مبالغے کا نتیجہ ہیں، اس لئے کہ میں عمر کی ہر منزل میں بڑی سختی کے ساتھ معتدل نوشی یعنی چار جامی رہا ہوں۔ لیکن شاہد صاحب کی غلط گنتی یا مبالغے ہی کو صحیح مان لیجئے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص اس قدر محتاط ہو کہ وقت کی طوالت اور شراب کی مقدار پر حاوی رہنے کی خاطر گھڑی سامنے رکھ کر چار پیگ نہ سہی پانچ چھ پیگ بھی پیتا ہو، کیا ایسے شخص کو " بلا نوش " کا خطاب دیا جا سکتا ہے ؟

شاہد صاحب کے علم میں اضافہ کرنے کی خاطر یہ بھی عرض کر دوں کہ اصطلاح میں اُس بلا کے پینے والے کو " بلا نوش " کہتے ہیں جو

دن رات شراب پیتا، اور بوتلوں پہ بوتلیں خالی کرتا چلا جاتا ہے۔

جن حضرات نے میرا وہ مطبوعہ "پند نامہ" پڑھا ہوگا جس میں مجاز مرحوم کو بلا نوشی سے مجتنب رہنے کی میں نے تقریباً سوڈیڑھ سو شعر میں شدید تاکید اور بلانوشی کی زبردست تضحیک کی ہے، وہ اس بات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ایسا شخص جو دوسروں کو بلانوشی سے دور رہنے کی شدت کے ساتھ نصیحت، اور بلانوشی کی بے پناہ مذمت کرتا ہو، وہ خود بلانوشی میں مبتلا ہو کر ع

توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کم تر می کنند

کی شرمناک مثال کیوں کر پیش کر سکتا ہے؟

اب رہا میرے متعلق شاہد صاحب کا میرے ہم نشین نہ ہونے کے باوجود یہ علم غیب کے مرتبے کا ارشادِ عالی کہ -

"جو بھی مل جائے چڑھا جاتے تھے"

سو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ شاہد صاحب نے اس ارشاد کی وساطت سے اس بات کے کہنے کی تمہید اٹھائی ہے کہ میں ڈاکٹر اشرف الحق صاحب کی صحبت میں ٹھرا پیا کرتا تھا۔

(ب) چنانچہ یہ تمہید اٹھا کر کہ "جو بھی مل جائے چڑھا جاتے تھے" کے فوراً بعد شاہد صاحب فرماتے ہیں

"انہیں (جوش کو) جب بھی فرصت ملی، شام کو ڈاکٹر صاحب کے ہاں (یہاں) پہنچ جاتے، قدح اور مدحت کی ملتی تھی، اس لئے گلاس پہ گلاس چڑھائے جاتے تھے۔ شروع شروع میں تو یہ دستور چلتا رہا، مگر جب مہنگا پڑنے لگا تو ڈاکٹر صاحب کے رشتے ہرن ہونے لگے۔ ایک دن شہر گئے وایک ولایتی بوتل بھی لائے اور دیسی ٹھرے کی بھی (یعنی مجھ کو پلانے کی خاطر)

اس میں دو پہلو خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں

پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی مالی حالت بہت اچھی تھی، اور اُن کی دریا دلی و عالی ظرفی کا تو یہ عالم تھا کہ لوگوں کو مار مار کر کھلاتے پلاتے رہتے۔

اور وہ ایسے اوچھے نہیں تھے کہ کسی کے بار بار جانے سے اُن کا نشہ ہرن ہو جاتا۔

(شاہد صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ انہوں نے "نشے ہرن ہو گئے" لکھ کر لسانی اور معنوی دو غلطیاں کی ہیں۔ لسانی غلطی تو یہ ہے کہ اہلِ زبان "نشہ ہرن ہونا" کہتے ہیں، اور معنوی غلطی یہ کی ہے کہ اپنے اُس بڑے بھائی پر جو مرحوم ہو جانے کے باعث ان کے بیان کی تکذیب سے قاصر ہے، ایک زبردست تہمت لگائی ہے اور اس کو چھچھورا اور کم ظرف بھی ثابت کر دیا ہے)

اسی کے ساتھ ساتھ شاہد صاحب نے مجھے مفت کی شراب پینے والا تحریر فرمایا ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ "مفت کی" وہ پینے میں جن کی جیب میں خاک اڑتی ہے۔ اور جن کی غیرت مفلوج ہوا کرتی ہے، اور جو ٹٹ پونجئے خاندانوں یا سود خوار ملّاؤں یا غاصب حاکموں کے بھو علمائے کرام کے گھر میں جنم لیتے اور وہیں تربیت بھی پاتے ہیں۔

اپنی زبان سے اپنی بڑائی کرنا کم ظرفی ہے۔ لیکن ضرورت کے تقاضے سے مجبور ہو کر مجھے یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ میں اودھ کے ایک نہایت مقتدر تعلقہ دار خاندان کا فرد ہوں۔ میرے خاندان کی خودداری، شجاعت، دولت، حکومت اور سخاوت کا تذکرہ اودھ کی تاریخوں میں پھیلا، بکھرا اور ستاروں کے مانند چھٹکا ہوا ہے جس کا جی چاہے میرے جد بزرگ حسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں بہادر کو یا گورنر خیر آباد و سپہ سالار سلطنت اودھ کے حالات کا مطالعہ کر لے۔

اس کے علاوہ خود مجھ کو ایک بڑی جائیداد وراثت میں ملی تھی اور میں بھی "رئیس ملیح آباد" کہا جاتا تھا!

یہ میں نے اس لئے مجبوراً قلم بند کر دیا تا کہ میرا شمار ان لوگوں میں نہ ہو جو خود تو مفلس ہوتے ہیں لیکن "پدرم سلطان بود" کے سہارے اپنا وقار قائم کر کے ؎

گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ
ذرۂ آفتاب تابانیم

کا نعرہ بلند کرتے ہیں اور بڑے گھرانوں کی عزت کرنے والے رئیسوں کے ٹکڑوں پر پلتے اور مونچھوں پر تاؤ دیتے پھرتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس دور ارزانی کو دیکھتے ہوئے حیدرآباد میں میری تنخواہ بہت معقول تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ملیح آباد کی بچی کھچی جائیداد سے بھی ہر شش ماہی پر میرے پاس اس قدر روپیہ آجایا کرتا تھا کہ "مفت کی شراب پینے کا میرے خادم تک تصور نہیں کر سکتے تھے۔

اور یہ بھی تو سوچئے کہ اس زمانے میں ولایتی شراب کی یہ اوقات تھی کہ اس کی ایک پوری بوتل صرف ساڑھے آٹھ روپے میں ملا کرتی تھی اور ڈھائی تین تین سو ماہانہ کی آمدنی والے تک ولایتی شراب ہی پیا کرتے تھے۔

شاہد صاحب کا حافظہ اچھا نہیں ہے۔ ایک طرف تو وہ مجھ کو مفت خورا ثابت کرتے ہیں اور دوسری طرف اس مضمون میں یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"جوش صاحب کو واہ واہ کرنے والے گھیرے رہتے تھے۔ دن بھر چائے، شربت، پان، سگریٹ سے تواضع ہوتی۔ ادھر سورج غروب ہوا ادھر جوش صاحب پیمانہ بکف طلوع ہوئے۔ مفت خوروں کو بھی چسکی لگانے کا موقع ملا"۔

ذرا انصاف کیجئے کہ وہ شخص جس کے وہاں خود شاہد صاحب کے بقول رات دن دربار لگا رہتا ہو۔ جس کے گرد "واہ واہ کرنے والے" جمع رہتے ہوں۔ جو دن بھر چائے شربت، پان اور سگریٹ سے اور ہر رات کو شراب سے "مفت خوروں کی تواضع کیا کرتا ہو وہ خود مفت خورا کیوں کر ہو سکتا ہے۔

آدمی کو ایسی بات زبان سے نکالنا چاہئے کہ عقل مند نہ سہی کم سے کم احمق ہی اس کو باور کر لیں۔ ع

با سخن سنجیدہ گو اے مرد عاقل یا خموش

حیدرآباد سے میرے اخراج کی مدت

شاہد صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

"جوش صاحب کو چوبیس گھنٹے کے اندر ممالک محروسہ سے نکل جانے کا حکم ہوا تھا، یہ بارہ گھنٹے ہی میں وہاں سے نکل گئے"۔

افسوس کہ شاہد صاحب نے یہاں بھی غلط بیانی سے کام لیا ہے۔

میرے اخراج کو چوبیس گھنٹوں کی ہول جول سے نہیں بلکہ پندرہ دن کی سکون آمیز میعاد سے وابستہ کیا گیا تھا، اور وہ اس لئے کیا گیا تھا تا کہ میں اس دو ہفتے کی مدت میں اپنی "غلطی" کو محسوس کروں۔ اور نظام کی خواہش کے مطابق ان سے معافی مانگ لوں (اپنی "غلطی" کو آگے چل کر بیان کروں گا)

اگر شاہد احمد صاحب حیدرآباد دکن کے سرکاری ریکارڈ خانے کے محافظ سے بذریعہ مراسلت دریافت فرما لیتے تو اس مغالطے میں گرفتار نہ ہوتے۔ لیکن انہوں نے اس مسئلے میں تحقیق کی زحمت اس لئے گوارا نہیں فرمائی کہ وہ خود قارئین کو مغالطے میں گرفتار

کر کے اپنے نزدیک میرا ہلکا پن ظاہر کرنا چاہتے تھے۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!

جمعیت اسلامیہ کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی جو سکندر آباد اسٹیشن پر مجھے رخصت کرنے آئے تھے ان سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ میں حیدر آباد سے بارہ گھنٹے کے اندر بھاگ کھڑا ہوا تھا یا پورے پندرھویں دن وہاں سے روانہ ہوا تھا۔

دربارِ معظّم جاہ

شاہد صاحب نے اس موقع پر تو قلم ہی توڑ دیا ہے۔ اور ایسی "طلسم ہوش ربا" قسم کی غلط بیانی سے کام لیا ہے کہ یہ سوچ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ آدمی مرتبۂ انسانیت سے اس قدر بھی گر سکتا ہے۔

ملاحظہ ہو "ساقی" کے مدیر مولوی نذیر احمد صاحب کے پوتے موسیقی کے ماہر اور دہلی کے باشندے میاں شاہد احمد صاحب یوں گوہر افشانی فرما رہے ہیں:

"دراصل نظام کے منجھلے صاحبزادے معظم جاہ کے شبینہ دربار میں جوش کا عمل دخل ضرورت سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اس دربار کے واقعات سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ شرکا "دربارِ حرام پور" اس کے آگے گرد تھا۔

جوش اس دربار کے حاضر باش تھے۔

میں نے حیدر آباد کے ثقہ راویوں سے سنا ہے کہ معظم جاہ کے اشارے پر کل حاضر باش ننگے ناچنے لگتے تھے اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا تھا لکھا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی نیا پنچھی وہ نہیں کرتا؟ کرتا تو پیش خدمتوں؟ کو حکم ہوتا کہ "آپ کو بنا لاؤ" وہ اس غریب کو اٹھا لے جاتے اور پچھاڑ کر اتنی پلاتے کہ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ پھر اسے دربار میں برہنہ کر کے پیش کیا جاتا اور اسے اوندھا کر کے، جلتی ہوئی موم بتی لگا دی جاتی"!

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ط

اس موقع پر بھی "سنا ہے" کی آڑ لے کر شاہد صاحب نے بے رسی کے سانپ کو پھنکارتے اور بے رائی کے پربت کو آسمان سے باتیں کرتے دکھا دیا ہے۔

شاہد صاحب کے "ثقہ راوی" خود ان کے ذہن مبارک کی پیداوار ہیں۔ اس لئے کہ اس کرۂ ارض پر مجھ سے زیادہ اس امر سے کوئی واقف نہیں کہ شاہ زادے کے دربار میں اتنی بے پایاں بے ہودگیاں تو بڑی چیز ہیں کوئی ادنےٰ سی بے ہودگی بھی نہیں ہوا کرتی تھی اور ظاہر ہے کہ جو بات کبھی وقوع میں آتی ہی نہیں اس کی "روایت" بھی نہیں بنا کرتی، اور جس معدوم بات کی روایت نہیں بنا کرتی اس کا کوئی راوی بھی نہیں ہوتا۔ اور جو کبھی واقع نہ ہونے والی بات کسی "راوی" کو بیدہ بنا کر بیان کی جاتی ہے وہ "راوی" خود اس بیان کرنے والے کا فرزندِ معنوی ہوا کرتا ہے۔

اور بفرضِ محال شاہد صاحب کے "ثقہ راویوں" کو جیتا جاگتا سچ مچ کا انسان مان بھی لیا جائے تو یقیناً وہ ایسے لوگ ہوں گے جن کی ماؤں نے اُن سے یہ کہا ہوگا کہ بیٹا مر جانا مگر پوری زندگی میں کبھی ایک بار بھی سچ نہ بولنا۔ اگر بھولے سے بھی سچ بولو گے تو ہم تمہیں دودھ نہیں بخشیں گے!

معظم جاہ کے دربار کی شائستگی کا میں ہی تنہا شاہد نہیں ہوں، اُس دربار کے چار معتبر حاضر باش گواہوں کے نام پیش کر رہا ہوں

جو لفضلہ اس وقت زندہ بشیات عقل ہوش زندہ اور بڑی نیک نامی کے مرکز ہیں جن سے قسم دے کر یہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ شاہد صاحب نے دربار معظم جاہ کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ سچ ہے یا جھوٹ؟ اگر شاہد صاحب اپنی سچائی کو ثابت کرنے کے واسطے اپنے کسی آدمی کو دکن بھیجنا چاہیں تو میں ٹکٹ اور زادِ راہ پیش کردوں گا۔

(الف) حضرت نجم آفندی، جو اس قدر دیندار و پابند وضع بزرگ ہیں کہ قہقہہ مارنے کو بھی خلاف شرع سمجھتے ہیں۔

(ب) نواب قدرت نواز جنگ بہادر، جو ایک بڑے پائے کے جاگیردار اور معظم جاہ کے حقیقی ماموں بھی ہیں۔

(ج) حضرت مولانا ماہر القادری جو "فاران" کے سے دینی پرچے کے مدیر ہیں اور جماعت اسلامیہ کے رکن مخصوص ہیں۔

(د) اور نواب شہید یار جنگ بہادر جو تقریباً ہر سال روضۂ امام پر حاضری دیتے، شبانہ روز نوحے اور مرثیے کہتے اور صوم و صلوٰۃ کے سختی کے ساتھ پابند ہیں۔ (سلسلۂ عقوں یہ بھی بتا دوں کہ اس دربار کے حاضر باشوں میں نواب ناصر نواز مدظلہ مرحوم کے سے بہتر سال کے پابند وضع بزرگ حضرت فانی مرحوم کے سے خود دار و غم پرست شاعر، اور شاہد صاحب کے بقول علی اختر مرحوم کے سے سادھو سنت کے انسان بھی شامل تھے۔ اور ان مرنے والے یادگار آدمیوں کو بھی شاہد صاحب نے محض اس لئے ننگا نچا دینے میں شرم محسوس نہیں کی کہ وہ اس وقت زندہ نہیں ہیں، خاک پر کو ننگا ناچ نچوا دینے پر مُصر ہیں) ع

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔

دکن سے میری علتِ اخراج

شاہد صاحب دربار معظم جاہ کی فرضی بے ہودگیاں بیان کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

"ان بے ہودگیوں کی اطلاع عالی جاہ کو پہونچتی رہتی تھی لیکن وہ شفقت پدری میں مرے جاتے تھے۔ بیٹے سے تو کچھ نہ کہتے اس کے حاضر باشوں کی ناک میں لگ جاتے۔ چنانچہ طویلے کی بلا بندر کے سر، جوش پر نزلہ گرانے کا انہیں بہانہ ہاتھ آ گیا"۔

اس عبارت سے چار باتوں کا پتا چلتا ہے۔

(الف) پہلے یہ پتہ چلتا ہے کہ معظم جاہ کے دربار میں سب حاضر باشوں کو ننگا نچانے اور پس و پیش کرنے والوں کو اوندھا کر کے اُن کے جلتی ستی لگوا دینے کا مشغلہ ایک محبوب اور تواتر کے ساتھ پیش آنے والا مشغلۂ شبینہ تھا۔ اور ان "بے ہودگیوں" کی اطلاع عالی جاہ کو بھی پہونچتی رہتی تھی۔

(ب) دوسرے یہ پتا چلتا ہے کہ نظام تمام نارمل باپوں سے بمراحل بلند تر ایک شفیق باپ ہیں جو اپنے بیٹوں کی شرم ناک "بے ہودگیوں" کو برابر سنتے رہنے کے باوجود "شفقت پدری میں مرے جاتے تھے" اور بیٹے سے کوئی باز پرس نہیں کرتے تھے۔

(ج) تیسرے یہ پتا چلتا ہے کہ نظام جب کسی کو سزا دینا چاہتے تھے تو عام فرماں رواؤں کے مزاج و رواج کے برعکس وہ براہِ راست سزا نہیں دیتے تھے، بلکہ ایک حیلہ ساز اور ڈرپوک انسان کی طرح اس شخص کو سزا دینے کے سلسلے بہانے اور مواقع تلاش کرتے۔ اس کی تاک میں لگ جاتے اور کمین گاہ میں دبک کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔

(د) اور چوتھی بات یہ ہے کہ جوش چوں کہ دربار معظم جاہ کے "طویلے" کا سب سے بڑا فعال "بندر" تھا، اس لئے "طویلے کی بلا بندر" کے سر گئی۔ اور وہ بھی اس طرح کہ خوش قسمتی سے نظام کو جو جوش کی تاک میں رہتے تھے جوش پر نزلہ گرانے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔

پہلی بات یعنی معظم جاہ کے دربار کی "بے ہودگیوں" کے بہتانِ عظیم کا جواب دیا جا چکا ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ چار مقتدر و معتبر گواہوں کے اسمائے گرامی بھی پیش کیے جا چکے ہیں، اس لیے اس مسئلے پر مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں۔

دوسری یعنی نظام کی "**شفقتِ پدری میں مرے جانے**" والی بات کا جواب یہ ہے کہ نظام کی سرشت میں ایک سرے سے شفقت یا شفقت سے ملتی جلتی ہوئی کسی شے کا بھی کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہ بات نظام کے ساتھ مختص نہیں، بے شفقتی دنیا کے ان تمام نفسیاتی بیماروں میں دیکھی گئی ہے جن کی سرشت کے مٹیالے پانی میں حبِ زر، حفظِ زر، اور اس کے نتیجے میں بخلِ شدید کا ایک طوفان چنگھاڑتا رہتا ہے۔

حیدرآباد کی چیونٹی چیونٹی اس کی گواہی دے سکتی ہے۔ اور اہلِ حیدرآباد کی وساطت سے پورا ہندوپاک اس بات سے آگاہ ہے کہ نظام ایک بزرگِ خاندان کی حیثیت سے اپنے بھائیوں، اپنے بچوں، اور اپنی بیویوں کے ساتھ ایسی عدیم النظیر سختی کے ساتھ پیش آیا کرتے تھے کہ اور تو اور وہ سب کے سب تن ڈھکنے اور پیٹ بھرنے کے لیے اعلیٰ کپڑے اور عمدہ روٹی تک کو ترسا کرتے تھے، اور ان شاہی محلوں میں رہ کر جھونپڑوں کے تمنائیوں کو ان کی زرا زرا سی لغزشوں اور معمولی سے معمولی سہو پر بری طرح ڈانٹا ڈپٹا اور پھٹکارا جاتا تھا۔ اور کبھی کبھی تو ان خدا کے بندوں کی کوڑوں تک سے تواضع کی جاتی تھی۔ اور "کنگ کوٹھی" کے در و بام مظلوموں کی چیخوں سے کانپتے نظر آتے تھے۔ ان شدائدِ مسلسل سے تنگ آ کر اگر اعظم جاہ و معظم جاہ حکومتِ برطانیہ سے فریاد نہ کرتے، اور وہ "بغلی گھونسے" کے مانند نظام پر سختی کے ساتھ زور ڈال کر ان شاہ زادوں کی تنخواہیں مقرر نہ کرا دیتی تو ان بے چاروں کو باپ کی سرد مہری و سخت گیری سے کبھی نجات ہی نہ ملتی۔

ایک نہایت معمولی عقل رکھنے والا انسان بھی ان باتوں سے آگاہ ہو جانے کے بعد اس امر کے قبول و تسلیم کرنے کی تاب نہیں لا سکتا کہ "دربارِ معظم جاہ کی ان بے ہودگیوں کی اطلاع عالی جاہ کو پہنچتی رہتی تھی، لیکن وہ **شفقتِ پدری میں مرے جاتے تھے۔ بیٹے** سے کچھ نہ کہتے۔"

جناب والا، اگر معظم جاہ کے دربار میں ایسی کوئی بے ہودگی کبھی ایک بار بھی ہو جاتی، تو عالی جاہ، معظم جاہ کے ساتھ وہ کرتے کہ ایک دنیا انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتی۔

لیکن شاہد احمد صاحب کو ان معروف حقائق سے کیا غرض، وہ تو معظم جاہ کی "بے ہودگی" اور عالی جاہ کی "**شفقت**" کا صغریٰ کبریٰ قائم کر کے اس کے نتیجے میں "طویلے کی بلا بندر کے سر" کا مزا لینا چاہتے ہیں، اور بس ؎

دیر و حرم میں روشنیِ جلوۂ حق سے ہے تو ہو
مجھ کو تو تُو پسند ہے، اپنی نظر کو کیا کروں!

(د) اب رہی یہ چوتھی بات کہ نظام درباری "طویلے" کے "بندر" پر "نزلہ گرانا چاہتے تھے، لیکن چونکہ "بندر" نہایت موٹا تازہ سخت پنجوں، نکیلے دانتوں، لانبے لانبے ہاتھ پاؤں کا، اور ایک دم چقندر کے مانند سرخ منہ رکھنے والا، شاہ خورد شیر افگن بندر تھا، اس لیے نظام اس پر کھلم کھلا ڈنڈا اٹھانے سے خائف و لرزاں رہتے تھے، اور دل ہی دل میں یہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ پروردگارا تیرے بڑے بڑے ہاتھ ہیں، غیب سے کوئی ایسا بنا بنایا حیلہ پیدا فرما دے کہ میں اس مہیب "بندر" کو اگر ہلاک نہ کر سکوں، پھر بھی ممالکِ محروسہ سے تو نکال کر اپنے بیٹے کو فرشتہ خصلت بنا دوں۔ اور اگر وہ فرشتہ خصلت نہ بن سکے تو کم سے کم وہ اتنا ہی حیادار ہو جائے کہ ننگے ناچنے والے مردوں کے پوشیدہ آلات دیکھنے سے اس کو شرم آنے لگے۔

اور چونکہ ؏

"اُسے فضل کرتے نہیں لگتی بار"

اللہ تعالیٰ نے کس نظام کی سُن لی اور اُن کے ہاتھ میں "بندر" کو مار ڈالنے کا نہ سہی، اس کو دکن سے ہکا دینے کا ایک "بہانہ" دے ہی دیا۔ لیکن چونکہ وہ "بہانہ" غیبی تھا، اس لئے نہ شاہد صاحب اور نہ دنیا کے کسی انسان ہی کو اب تک یہ معلوم ہو سکا ہے، کہ وہ "بہانہ" تھا کیا؟

ذرا سوچئے تو سہی کہ وہ نظام جو اپنی تنہا ذات کے علاوہ کسی شخص کو انسان ہی تسلیم نہیں کرتا تھا، جس کی فرماں روائی فرماں روائی نہیں، خدائی تھی۔ جو اپنے اعیان، واکابر، عمال و وزرا، متوسلین و متقربین، اور علماء و قضات تک کو کھلے بندوں ماں بہن کی گالیاں دینے میں ایک لمحے کے واسطے بھی جھجکتا نہیں تھا، اور دربار میں ذرا سی تاخیر کے ساتھ آنے والے بڑے بڑے جاگیرداروں کو برسر دربار فحش ترین الفاظ سے خطاب کرتا تھا، اور جس نے ان نواب شہاب جنگ بہادر کو جن کی خودداری کے ناز خود اُن کے باپ — میر محبوب علی خاں اٹھایا کرتے تھے، بھری محفل میں ٹھوکر مار کر گرا دیا تھا، وہ جوش کے سے ایک معمولی ملازم کو براہِ راست سزا دینے میں جھجکتا، اور اس کو سزا دینے کے "بہانے" تلاش کرتا پھرتا۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست!

دکن سے میرے اخراج کی علت معظم جاہ کے دربار کی "بے ہودگیاں" نہیں تھیں، بلکہ نظام کے خلاف میری وہ نظم "غلط بخشی" تھی جس کو میں نے جاگیرداروں اور وزیروں کے ایک بہت بڑے اجتماع میں سنا دیا تھا۔

لیکن وہ نظم ہر چند میرے اخراج کی آخری و فوری لیکن تنہا علت نہیں تھی، اس کے اسباب متعدد تھے جن پر میں اپنے خود نوشت حالات "یادوں کی برات" میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالوں گا۔

"عنایتُ اللّٰہی" ناخوشی

مجھے بُرا ٹھہرانے کے شوق میں شاہد صاحب اس قدر تفصیلیت پسند ہو گئے ہیں کہ وہ ان تاریک سے تاریک گوشوں کو بھی نظر انداز نہیں فرماتے جن کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

میرے زمانے میں ایک عنایت اللہ صاحب ناظم دار الترجمہ تھے جن کے نام سے بھی لوگ ناواقف ہیں — لیکن شاہد صاحب ان کو اس صورت سے پیش کر رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"دار الترجمہ کے ناظم مولوی عنایت اللہ صاحب بڑے مرنجاں مرنج آدمی تھے۔"

عنایت اللہ صاحب کو "مولوی" اور "مرنجاں مرنج آدمی" کا خطاب دینا اس مصلحت پر مبنی ہے کہ اس کے فوراً بعد انہیں یہ تحریر فرمانا تھا۔

"اُن کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ جوش صاحب سے خوش نہیں تھے":

اس سے وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ آدمی شاعر کیوں کر ہو سکتا ہے جس سے ایک "مولوی" اور ایک "مرنجاں مرنج" آدمی ناخوش رہتا ہو۔

بندہ نواز یہ "عنایت اللّٰہی" ناخوشی نہیں، "بغض للّٰہی" بول رہا ہے۔ ؏ "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!"

میرا تقرر

شاہد احمد صاحب گل افشانی فرماتے ہیں:

"اس وقت مہاراجہ کشن پرشاد جیسے (رکے سے) علم دوست برسرِ اقتدار رہے۔"

واضح ہو کہ میں سنہ ۱۹۲۴ء میں جب حیدر آباد گیا تھا، اُس وقت مہاراجہ برسرِ اقتدار نہیں تھے۔ معتوبِ نظام ہونے کے باعث کوئی ان سے ملتا جلتا بھی نہیں تھا۔ (دکن کی سرکاری فائلوں سے اس کی تصدیق کرلی جائے)

اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اپنے محترم بزرگ علامہ اقبال کا تعارفی خط لے کر جب میں مہاراجہ کے پاس گیا تھا تو انہوں نے خط پڑھ کر بڑی حسرت سے ارشاد فرمایا تھا کہ:

کاش میں اس وقت برسرِ اقتدار ہوتا!

لیکن شاہد صاحب کو ان باتوں سے کیا غرض کہ پہلے تحقیق کرلیں پھر بات کہیں۔ انہیں تو آگے چل کر یہ لکھنا تھا:

"جوش کو انہوں (مہاراجہ) نے دارالترجمہ کی پول میں دھانس دیا۔"

یہ بات جھوٹ ہو یا سچ، شاہد صاحب نے تو اس خاکسار کو "پول" میں دھنسوا کر اپنا جی خوش کرلیا۔

قارئین کرام کی آگاہی کے واسطے یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میرا تقرر براہِ راست نظام کے فرمان سے ہوا تھا۔ اور شاہی مہر و دستخط نے مجھ کو "پول میں دھانس دیا تھا"۔

(لیجئے خود اپنے قلم سے میں پول میں دھنس رہا ہوں۔ اب تو شاہد صاحب خوش ہو جائیں) حے۔

اب اور کیا چاہتا ہے شاہد ترے اشاروں پہ چل رہے ہیں!

ڈپٹی صاحب کی لسانی لغزشیں

ترقی اردو بورڈ کی طرف سے شاہد صاحب کے دادا ڈپٹی مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب "منتخب الحکایات" جس پر شاہد صاحب کا مقدمہ تھا نظرِ ثانی کے واسطے میرے حوالے کی گئی تھی۔

مقدمہ اور اصل کتاب میں جو بیانی و لسانی خامیاں مجھ کو نظر آئیں میں نے ادبی دیانت سے مجبور ہو کر ان پر خط کھینچ دیئے۔

اس کی خبر جب شاہد صاحب کے کانوں تک پہونچی تو ان کا خون کھول گیا، اور غیظ و غضب کی وہ شام کہ جس "جوش ملیح آبادی۔ دیدہ و شنیدہ" کے سانچے میں ڈھل کر ایک گرز گراں میں تبدیل ہو گئی، اور آخر کار وہ گرز گراں مجھ غریب کے سر پہ برسنے لگا۔

چنانچہ اس سلسلے میں شاہد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"خیر میری زبان تو وہ (جوش) ٹھیک کر سکتے ہیں، مگر جن کی کتابیں پڑھ کر ہم جیسے نے اردو زبان سیکھی ہے اُس کی زبان میں بھی جوش صاحب کو غلطیاں نظر آئیں!! العظمۃ للہ! یعنی"۔

بازی بازی با ریش بابا ہم بازی:

قارئین کرام، یہ تمام "جوش دیدہ و شنیدہ" اسی عظیم سانحے کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ اگر دادا کی شان میں گستاخی مجھ سے سرزد نہ ہو جاتی تو برادرستی کی بیخ کنی مجھ پر اس قدر برق افشانی و شعلہ باری نہ فرماتی۔

مجھ نامراد کو کیا معلوم تھا کہ سرکار شاہد سے ایک خالص ادبی خدمت کا مجھ کو یہ صلہ ملے گا۔ ع
میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا!

علی اختر اور یہ خادم!

میرے اور میرے محبوب و معصوم دوست حضرت سید علی اختر صاحب مرحوم کے مابین ایک وقتی شکر رنجی کی جو صورت ایک دوست کے مخلصانہ لیکن خطرناک مزاح نے پیدا کر دی تھی، اس کے بارے میں شاہد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"جوش صاحب اور علی اختر مرحوم کا کسی بات پر اختلاف ہوا..... کوئی بہت بڑی بے ہودہ بات ہوئی ہوگی جوش صاحب کی طرف سے 'جو علی اختر جیسے (کے سے) سادھو قسم کے آدمی کو ناگوار گذری۔"

(یہ اور بات ہے کہ اس 'سادھو قسم کے آدمی' کو جو دربارِ معظم جاہ کا "حاضر باش" تھا، وہ بر سرِ دربار ننگا ناچ بھی نچا چکے ہیں)

یہ بڑی حیرت ناک بات ہے کہ شاہد صاحب کو بیماری "علتِ اختلاف" کی نہ پہلے ہی خبر تھی نہ آج ہے۔ نہ انہیں اس اختلاف کی ابتدا ہی کا کوئی پتہ ہے نہ انتہا کا۔ اور نہ انہیں اس کا ہی کوئی علم ہے کہ وہ اختلاف شروع ہوا تھا کس جانب سے۔ لیکن چونکہ خدا کے فضل و کرم یا بزرگوں کی دعا سے، اُن کو "شہنشاہ کا ضمیر" حاصل ہے اور ظاہر ہے کہ ضمیرِ شہنشاہ "جامِ جہاں نما" ہوا کرتا ہے۔ اور چوں کہ "بصیرت مومنین" کے ساتھ ساتھ انہیں "بصیرت عارفین" کی دولت بھی عطا ہوئی ہے اس لئے انہوں نے جھٹ سے کہہ دیا کہ "کوئی بڑی بے ہودگی ہوئی ہوگی جوش صاحب کی طرف سے۔"

واقعی کشف ہو تو ایسا، کرامت ہو تو ایسی، اور علم غیب ہو تو اس قد و قامت کا ع

دیدہ ور آں کہ تا نہد دل بشمارِ دل بری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری

اور اگر یہ علم غیب والی بات نہیں ہے تو شاہد صاحب کے اس اظہارِ خیال کی شاید یہ علت ہو کہ انہیں ایک ایسی دور گیر و فاصلہ صید نظر حاصل ہے کہ جن لوگوں سے وہ ذہنی و مادی دونوں حیثیتوں سے ہمیشہ ایک طویل فاصلے پر رہا کرتے ہیں ان کی سیرت کا بھی حسن و قبح دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اور چونکہ شاہد صاحب کو میری زبوں کرداری کی پہلے ہی سے معرفت حاصل تھی، اس لئے جب میرے اور اختر کے اختلاف پر ان کی نظر پڑی تو انہوں نے بے تکلف یہ فرما دیا کہ،

"کوئی بڑی بے ہودگی ہوئی ہوگی جوش صاحب کی طرف سے۔"

بدور گردئی من از غرور می خندد
حریف سخت کمانے کہ در کمیں دارم!

یا ان کے اس اظہار خیال کی یہ علت ہو کہ چونکہ شاہد احمد اور مولوی نذیر احمد صاحب' اس کرۂ ارض پر ایسے دو تنہا استثنائی وجود ہیں کہ جہاں تک کہ زبان و ادب کا تعلق ہے ان سے کسی نوع کی، کسی ادبی یا لسانی غلطی کا امکان ہی نہیں ہے، اور جس طرح انبیا و ائمہ دائرۂ مذہب میں معصوم تھے' یہ دادا، اور پوتے بالکل اسی طرح حلقۂ ادب میں معصوم واقع ہوئے ہیں، اور چونکہ رو سیاہ جوش نے ان معصوموں کی جانب انگلی اٹھانے کا ارتکاب کیا ہے' اس لئے ضرور ——

"کوئی بڑی بے ہودگی ہوئی ہوگی جوش کی طرف سے۔"

جب کوئی فتنہ، زمانے میں، نیا اٹھتا ہے
وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

اور کیوں نہ بتائیں کہ شاہد پرستوں کے ساتھ، شاہدانِ بازاری اور شاہدانِ مقالہ نگاری کا ازل سے یہی سلوک رہا ہے ؂

بدم گفتی و خورسندم تعالی اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

میری علتِ مہاجرت

شاہد صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ :

"پاکستان بن جانے کے بعد جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے تھے اُن کی وفاداری کو ہمیشہ شبہے کی نظر سے حکومت ہند نے دیکھا، یہاں تک کہ ابوالکلام آزاد کے بعض بیانات پر پٹیل نے انہیں بھی مطعون کیا، مگر جوش صاحب کی وفاداری کسی کو مشتبہ نظر نہ آئی … حکومت ہند نے انہیں "پدم بھوشن" کے اعلیٰ خطاب سے بھی نواز دیا"

رَو یا غفلت میں شاہد صاحب یہ لکھنے کو تو لکھ گئے کہ ہندوستان میں جوش کو بڑا اعتماد حاصل تھا، لیکن بعد میں سوچا کہ اگر پاکستانیوں کے دلوں پر یہ نقش بیٹھ گیا کہ جوش یہ سب کچھ تج کر یہاں آئے ہیں تو ان کے دلوں پر ان کے ایثار کا سکہ بیٹھ جائے گا۔ اس لئے انہوں نے راست گفتاری سے روگردانی کر کے اپنے دماغ کو اس تنگ و تاریکی کی جانب موڑ دیا جہاں سے دروغ بیانی، یعنی "سنا ہے" کا جلوس نکالا جا سکتا ہے۔

دیکھئے شاہد صاحب رُخ بدل کر اب اُن سیاسی "حقائق" سے پردہ اٹھا رہے ہیں جو خود اُن کے "سنا" بردوش ذہنِ رسا کی ایجاد ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں کہ :

"لیکن ہندو ایک مسلمان کو اچھے حالات (اچھی حالت) میں دیکھنا کیسے پسند کر سکتا تھا"

اس موڑ پر شاہد صاحب کے ذہنی خال و خطبیہ ظاہر کر رہے ہیں کہ انہوں نے میرے خلاف ہندوؤں کی ایک ایسی فرضی سازش کا ڈھونگ رچانا شروع کر دیا ہے جس کے توسط سے وہ میری شخصیت کے درخت کو ہندوستان سے اکھڑوا کر پاکستان میں لگا دینا چاہ رہے ہیں۔ سنئے وہ دَم لے کر پھر ارشاد فرما رہے ہیں کہ :

"جوش صاحب ایک غیر محتاط آدمی، قدم قدم پر ان سے لغزش ہوتی، خفیف الحرکتی اور بعض غلطیاں بھی کرتے"

آپ سمجھے کہ یہ میری خطا کاری اور یہ میری خفیف الحرکتی کیوں بیان فرمائی گئی ہے ؟

بات یہ ہے کہ شاہد صاحب کو بخوبی معلوم تھا کہ ہندوستان میں میری شخصیت ایک ایسے بہت بڑے برگد کے درخت کی طرح سربلند و مستحکم تھی کہ ہندوؤں کی ہوائے "سازش" آندھیوں میں تبدیل ہو کر بھی اُس کو گرا نہیں سکتی تھی۔

اس لئے شاہد صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس فرضی سازش میں وہ خود مجھے بھی شریک کر لیں، اور میری "قدم قدم" [illegible] کی معرفت اس سازش کے شعلوں کو ہوا دے کر یہ ثابت کر دیں کہ دراصل یہ خود میں ہی تھا کہ میں نے غیر محتاط اور خفیف الحرکات آدمی کی حیثیت سے "بعض" ایسی غلطیاں کیں، اور تواتر کے ساتھ کیں کہ ہندوؤں کے دست و بازو قوی ہو گئے۔ اور اس طرح خود میں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار کر ہندوؤں کی "سازش" کو کامیاب بنا دیا۔

اگر اس غلط بیانی کے سلسلے میں شاہد صاحب سے جرح کی جائے تو وہ ہکا بکا ہو کر رہ جائیں گے ۔ یعنی اگر شاہد صاحب سے دریافت کیا جائے کہ حضرت آپ تو مستقلاً کراچی میں تشریف رکھتے ہیں، آپ کو دہلی کے کالے کوسوں رہنے والے جوش کی لغزشوں اور وہ بھی "قدم قدم پر" لغزشوں کا علم کیوں کر حاصل ہوا ؟ اور اگر یہ علم براہ راست نہیں، بالواسطہ ہے ، تو ان وسائل ، ان راویوں کے برائے خدا اسمائے مبارک ہی بتا دیجئے جن سے آپ نے جوش کی "قدم قدم پر" لغزشوں کو سنا تھا، یا اُن اخباروں اور رسالوں کے نام ہی ظاہر فرما دیجئے جن میں آپ نے جوش کی "قدم قدم پر" لغزشوں کی خبر پڑھی تھی ۔ تو قسم ہے شمس و قمر کی تابانیوں کی کہ خفیف ! وجہ شاہد صاحب کی پیشانی مُنقّر پر دروغ بافیوں کی تاریکیاں دوڑنے لگیں گی ۔

میری غلط کاریوں کا رونا تو ابھی باقی ہے، اب شاہد صاحب خوب چوڑے ہو کر ارشاد فرما رہے ہیں ۔ (سنئے اور راست گفتاری کی داد دیجئے) "یار لوگ بڑھا چڑھا کر جوش کے اعمالِ بد ادبی حلقوں میں پہونچتے اور وزیرِ اعظم کے کان بھرتے ۔ پنڈت جی طرح دے جاتے ، مگر چشم پوشی کی بھی ایک حد ہوتی ہے ۔ **سنا ہے** کہ جوش صاحب کے ساتھ اتنی بگڑ گئی کہ ہندوستان میں اُن کا مزید قیام خطرے میں پڑ گیا" ۔

مبارک باد کہ ایک عدد "**سنا ہے**" کا سہارا لے کر شاہد صاحب نے جس قصرِ عالی کا نقشہ ذہن میں تیار کیا تھا اس کی بحسن و خوبی تکمیل ہو گئی اور "نگاہ روبرو" کی بلند آوازوں کے سائے میں شاہد صاحب **تخت** راست گفتاری پر جلوہ افروز ہو گئے ، اور ع

برتو ایں محفل شاہنہ مبارک باشد !

کے ترانے ہر طرف گونجنے لگے ، اور جھوٹ کے مست ہاتھی سونڈیں اٹھا اٹھا کر شہنشاہ اقلیم راست گفتاری کو سلام کرنے لگے ۔

حیرت ہے کہ شاہد احمد صاحب "جوش نمبر" کے قارئین کو اس قدر عقل سے خالی سمجھتے ہیں کہ اُن کو میرے اور پنڈت جی کے مابین بگاڑ پیدا ہو جانے کا محض اس لئے یقین آ جائے گا کہ حضرت شاہد احمد صاحب کے سے حق پرست آدمی کا یہ ارشاد ہے کہ "**سنا ہے**" کہ جوش صاحب کے ساتھ اتنی بگڑ گئی کہ ہندوستان میں اُن کا قیام خطرے میں پڑ گیا ۔

شاہد صاحب فقط ایک "**سنا ہے**" کی وساطت سے میرے اور پنڈت جی کے دوستانہ تعلقات کو ختم کر کے جب اس کو "بگاڑ" کی صورت میں لے آئے تو پھر ان کے واسطے یہ لکھ دینا بے حد آسان ہو گیا کہ :

"جب دلّی کی فضا ضرورت سے زیادہ اُن (جوش) کے لئے گرم ہو گئی تو انہوں نے پاکستان کا رُخ کیا" (یعنی جھک مار کر وہ پاکستان آ گئے)

لیجئے شاہد صاحب نے جو ڈھولک بجائی تھی وہ بجنے بھی لگی ، اور اُن کے نزدیک تمام پاکستانیوں کو اس کا یقین آ گیا کہ جوش ہندوستان سے اپنی مادی فراغت اور اپنے ادبی وقار کو قربان کر کے نہیں ، بلکہ اپنی جان بچا کر یہاں بھاگ آیا تھا ، اور اس طرح کہ ع

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا !

یہ کیسی حیرت ناک بات ہے کہ میرے اور پنڈت جی کے تعلقات میں اتنا زبردست بگاڑ پیدا ہو گیا کہ مجھے ہندوستان چھوڑ دینا پڑا ، لیکن ہندوستان و پاکستان کے افراد و اخبارات میں سے کسی ایک کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہوئی اور اس پر طرہ یہ کہ اس پورے برصغیر میں کروڑوں لوگوں میں صرف ایک راوی کو اس "بگاڑ" کا پتا چل گیا ، اور وہ چپکے سے شاہد صاحب کے کان میں یہ بات کہہ کر ایسا مفقود الخبر ہو گیا کہ اب شاہد صاحب بھی اس طرفہ راوی کا نام و نشان نہیں بتا سکتے ۔

یا اللہ ! یہ کیا ماجرا ہے کہ تھالی پہاڑ پر سے گر کر ٹوٹی اور شہر بھر میں ایک فرد واحد کے علاوہ کسی کو خبر ہی نہیں ہوئی اور وہ ایک تنہا آدمی بھی جس نے تھالی ٹوٹنے کی جھنکار سُن لی تھی بس اتنا جیا کہ شاہد صاحب کے کان میں کچھ کہا اور کہتے ہی انتقال فرما گیا ۔

کچھ کہا شاہد سے ، اور پھر سر کو دُھن کر مر گیا
ہائے بر راوی کہ بس جھنکار سُن کر مر گیا!

اس کے بعد شاہد صاحب کا جب یہ جی چاہا کہ وہ میرے اور پنڈت جی کے "لیکارڈ" کو اور بھی اُبھاریں تو انہوں نے حسبِ عادت و مصلحت ایک مزید "منابِ" کی آڑ میں "چل رے خامے بسم اللہ!" کا نعرہ لگایا اور راست گفتاری کی انتہا کر کے یہاں تک لکھ ڈالا کہ

"یہاں (پاکستان) آ کر وہ (جوش) کراچی کے چیف کمشنر نقوی سے ملے اور اُن کے ذریعے سے صدر اسکندر مرزا سے ۔ لو صاحب کوئی چار ہزار ماہانہ کا اُن کے لئے انتظام ہو گیا۔ یہاں کا معاملہ پکا کر کے موصوف پھر دلّی گئے اور "سُنا ہے" کہ پاکستان کی پیشکش دکھا کر پنڈت جی سے پھر معاملت کرنی چاہی ۔ (گویا میں پہلے بھی کوئی معاملت کر چکا تھا) مگر وہاں سے جواب مل گیا کہ آپ کو پاکستان چلا جانا ہی بہتر ہے!

لو صاحبو، شاہد احمد صاحب نے پھر ایک عدد "سُنا ہے" کا نقارہ بجا کر مجھے پنڈت جی سے آخر کار ٹکا سا جواب بھی دلا دیا ۔

شکرا بزد کہ میان من و او جنگ فتاد
شاہداں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند

اس دیو ہیکل افترا اور اس جٹا دھاری جھوٹ پر لگام کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ پاکستان آنے سے پیشتر میرے اور پنڈت جی کے مابین جو دو ملاقاتیں ہوئی تھیں، اختصار کے ساتھ اُن کی روداد قلم بند کر دوں ۔

یہ معاملہ کسی ڈاکٹر اشرف الحق کا نہیں ہے کہ ان سے منسوب کر کے جو منہ میں آئے کہہ گزرا جائے ۔ اس لئے کہ وہ مرحوم کسی قول کی تصدیق یا تکذیب نہیں کر سکتے ۔ بلکہ یہ معاملہ تو میرے اور پنڈت جی کے درمیان کا معاملہ ہے ، اور ابھی تک خدا کے فضل سے پنڈت جی بھی زندہ ہیں اور بدبختی کے جود و کرم سے اب تک میں بھی زندہ ہوں ۔ ظاہر ہے کہ مجھے پنڈت جی کو منہ دکھانا ہے ۔ ان کے بارے میں اگر کوئی غلط بیانی کر جاؤں گا تو پھر جیتے جی اُن کو منہ نہیں دکھا سکوں گا ۔ اور ظاہر ہے کہ اگر میں کوئی غلط بات اُن سے منسوب کر دوں گا تو وہ اُس کے ابطال پر مجبور ہو جائیں گے ۔ اور جب اخبارات میں اس کا ابطال شائع ہو جائے گا تو صرف جواہر لال ہی کو نہیں، میں دنیا میں کسی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا ۔ اور میری پیشانی پر ایک ابدی کلنک کا ٹیکا لگ جائے گا ۔ اور جب میری پیشانی قبر میں پوشیدہ ہو جائے گی تو وہ کلنک کا ٹیکا میری پیشانی سے منتقل ہو کر تاریخ ادبیات کے اوراق پر آ جائے گا ۔ اور جب تک اردو زبان باقی رہے گی مجھ پر ملامت کے پتھر برستے رہیں گے ۔

اس لئے پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ میں یہ لکھتا ہوں کہ پنڈت جی میرے ترکِ وطن پر ہرگز آمادہ نہیں تھے ۔ لیکن جب میں نے ، اپنے بچوں کے معاشی ، لسانی اور ثقافتی مستقبل کے پیشِ نظر ، اُن سے یہ درخواست کی کہ وہ مجھے خوشی کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں ۔ ——————————— تو انہوں نے غمگین ہو کر ——————— مجھ سے کہا کہ "جوش صاحب آپ نے مجھ کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے ۔ مجھے دو روز کی مہلت دیجئے تاکہ میں ہر پہلو پر غور کر کے آپ کو جواب دے سکوں "

جب دو روز کے بعد میں اُن سے ملا تو انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ ،

"جوش صاحب میں نے آپ کے مسئلے کا حل نکال لیا ہے ۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے (جس سے میں متفق نہیں ہوں) کہ میرے اور آپ کے بعد ہندوستان میں آپ کے بچوں کا مستقبل تاریک ہو کر رہ جائے گا تو آپ اپنے بچوں کو ضرور پاکستانی بنا دیں ۔ لیکن جہاں تک کہ آپ کی

ذات کا تعلق ہے آپ تمام عمر ہندوستان ہی میں رہیں "۔

یہ سن کر جب میں نے اُن سے یہ کہا کہ اس حل میں دو قباحتیں ہیں۔ پہلی تو یہ کہ میں اپنے بچوں سے دور رہنے کی تاب نہیں لا سکتا اور دوسری یہ ہے کہ اب میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ اپنی اس آخری عمر میں اردو کی خدمت کے سوا اور کوئی دوسرا کام کروں گا ہی نہیں۔ تو پنڈت جی نے مسکرا کر جواب دیا کہ میں اس کا بھی حل نکال دیتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ میری حکومت آپ کو اپنے بچوں کے ساتھ رہنے اور اردو کی خدمت کرنے کے واسطے ہر سال پوری تنخواہ پر چار ماہ کی رخصت دیا کرے گی۔ اب اور آپ کیا چاہتے ہیں؟

میری اور پنڈت جی کی یہ آخری ملاقات سنہ ۱۹۵۵ء کے تمام اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات میں چھپ چکی ہے۔ جس کا جی چاہے اواخر سنہ ۱۹۵۵ء کے اخبارات دیکھ کر میرے بیان کی تصدیق اور شاہد صاحب کے "سنا ہے" کی تحقیق کر لے۔ ہمیں گو، یہ ہمیں میدان۔

اگر شاہد صاحب اپنے "سنا ہے" کو سرخ رُو کرنے کی خاطر اپنے کسی قابلِ اعتماد دوست کو پنڈت جی کا بیان لینے اور سنہ ۱۹۵۵ء کے اخبارات کا مطالعہ کرنے کی غرض سے دلی روانہ کرنے پر آمادہ ہوں تو یہ بندۂ عاجز ان صاحب کا کرایہ اور زادِ راہ دینے پر حاضر ہے۔ اب اس سے زیادہ میں کیا، دنیا میں کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔

کیا عرض کروں، عاجز کر دیا ہے شاہد صاحب کی اس "سُنا ہے، سُنا ہے، سُنا ہے" کی مسلسل تکرار نے۔ الامان والحفیظ!

اس "سنا ہے" کی پشت پر نہ تو کوئی گواہ ہے نہ کوئی قرینِ عقل بات ہے، نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی دستاویزی ثبوت، بس ایک اُونٹ ہے "سنا ہے" "سنا ہے" کا جو برابر منہ اُٹھائے دشتِ ملامت باری کی طرف بلبلاتا چلا جا رہا ہے

رو میں ہے اُونٹ[1] طعن کہاں دیکھیے رُکے

رائٹرز گلڈ[2]

شاہد احمد صاحب دہلوی نے بڑی مبارک بات کہی ہے کہ جہاں تک کہ گلڈ میں میری شرکت کا سوال ہے، انہوں نے اس اوپر کے لمبے چوڑے مضمون میں یہ تنہا سچ بولا ہے کہ جب مجھے گلڈ میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی تو میں نے اس کو فوراً قبول کر لیا، اور جب شرکت کا موقع آیا میں نے قطعی انکار کر دیا۔

لیکن جب وہ میری علتِ انکار بیان کرنے لگے تو اُن سے رہا نہیں گیا۔ جھٹ سے بدگمانی یا غلط بیانی کا عنصر شامل فرما کر یہ لکھ مارا کہ ——

"بعد میں معلوم ہوا (یعنی "سنا") کہ جو لوگ انہیں گھیرے رہتے ہیں انہوں نے جوش صاحب کو سُجھا دیا کہ گلڈ کی طرف سے آپ کو کوئی عہدہ تو پیش کیا ہی نہیں گیا۔ اس صورت میں آپ کا جانا مناسب نہیں"۔

---

[1] اضافت معاف کی جائے۔

[2] اردو ادیبوں اور شاعروں کی انجمن کا نام اور انگریزی میں۔ لیکن شکایت بے کار ہے۔ جہاں کے آدمی "ٹی پی مولائی" "ڈبلو ڈبلو زدخاں" اور "پی پی جعفری" ہوتے ہیں وہاں انجمنوں کی شکایت کیا۔ غلاموں کی دنیا میں سب کچھ چلتا ہے۔ ع

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں!

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ میری محفل میں عہدے کی کوئی بات چھڑی ہی نہیں تھی۔ اس لئے کہ الیکشن سے قبل کسی عہدے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ احباب نے تو مجھ سے فقط اتنا کہا تھا کہ اگر دیگر نامور ادبا، و شعراء کی طرح آپ کو بھی گلڈ کے کسی افتتاحی جلسے کی صدارت پیش کی جاتی تو آپ ضرور شریک ہوتے۔ یوں ہم آپ کو شریک نہیں ہونے دیں گے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ میرے احباب ہی نہیں میرے دشمن تک اس بات سے واقف ہیں کہ حکومت برطانیہ نے میری بغاوت کو خریدنے کی خاطر جب دو بار بڑے بڑے جگ مگ جگ مگ کرتے عہدوں کا تاج اور وہ بھی گورنر یو پی کے ہاتھ سے میری آتش فشاں جوانی کے سر پر رکھنا چاہا تھا۔ تو میری غیرت بغاوت نے اس کو دونوں بار ٹھکرا دیا تھا۔ اور اب جب کہ پیری کی سنجیدگی ظاہری اسباب کی چمک دمک کو میری نظروں سے گرا چکی ہے .... میرے سامنے دنیا کے تمام عظیم سیاسی، معاشرتی یا ادبی عہدے ایک ایسی حقیر سی چیز بن کر رہ گئے ہیں جن پر میں اپنی چٹکی سی مسکراہٹ کو بھی ضائع نہیں کر سکتا۔

گلڈ زیادہ تر ایسے نو عمروں اور نو مشقوں کی جماعت ہے جن کی شہرت ابھی تک اُن کی انگنائیوں کے اندر ہی ناچ رہی ہے میرا ما پیرانہ سر اور ان کالے بالوں والوں سے **عہدہ** مانگے

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

شاہد صاحب ہی کو یہ "داروغلیاں" مبارک ہوں۔

اُنچہ فخرِ تست آں ننگِ من است!

ہر چند گلڈ کے بچوں کے متعلق میری یہ دیرینہ آرزو ہے کہ یہ ادب کی چھاؤں میں کھیلیں، پھولیں، پروان چڑھیں اور اُن کے سروں پر سہرے بندھیں۔ اور ہر چند ایک کاہن یا نجومی کی طرح نہیں، بلکہ ایک ناظر ارتقائے ذہنِ انسانی کی حیثیت سے مجھ کو اپنے وجود کے مانند اس بات کا یقین کامل ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ آج کے ادبی دیوتا کل کے ادبی اوتاروں کے سامنے بالشتیے نظر آئیں گے اور جو نقطہ آج ہم سب کا نقطۂ انتہا ہے وہ کل ان بچوں کا نقطۂ آغاز بن جائے گا۔

اور ہر چند یہ بھی درست ہے کہ آج کے یہ بچے اپنے بوڑھوں سے کل بڑھ جائیں گے۔ لیکن وہ اس حکایت کو فراموش کرنے کی کبھی جسارت نہیں کر سکتے کہ جب ایک کمسن بیٹے نے باپ کے کاندھے پر کھڑے ہو کر یہ ڈینگ ماری تھی کہ بابا دیکھو ہم تم سے اُونچے ہو گئے ہیں تو باپ نے مسکرا کر کہا تھا۔ ہاں بیٹا، تم ضرور مجھ سے اونچے ہو گئے ہو۔ مگر تم کو یہ معلوم نہیں کہ تمہاری اس اُونچائی میں تمہارے باپ کی قامت کی درازی بھی شامل ہے۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے ان ادبی بچوں کے عروج کی اس بے پایاں تمنا اور ان کے ارتقا کے اس یقینِ محکم کے باوجود میں اُن کے مقابلے میں اپنے مرتبے کو جانتا ہوں۔ اس لئے میں اپنے کو اس چھچھورے پن پر کسی شرط کے ساتھ بھی آمادہ و مہیا نہیں کر سکتا کہ ان بچوں سے کسی "عہدے" یا کسی "**خطاب**" کی "خیرات" مانگنے کا خواب بھی دیکھ سکوں ؎

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از **کودکاں** خواستن مومیائی۔

شاہد صاحب کا دُہرا غصّہ

(الف) غضبِ اوّل۔

آج سے غالباً کوئی پچیس تیس برس کی بات ہے کہ شاہد صاحب ڈاکٹر اشرف الحق صاحب کے ساتھ میرے دورانِ قیام حیدرآباد میں جس کا اس کف دردہان مضمون میں انہوں نے ذکر بھی کیا ہے، مجھ سے ملنے آئے رہتے۔

ہر چند اپنی سنتِ جاریہ کے مطابق میں اُن سے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آیا تھا، لیکن اچھی طرح مجھ کو یاد ہے کہ تھوڑی ہی دیر کے اندر شاہد صاحب کی آنکھوں میں ایک گندلاہٹ اور اُن کے چہرے پر ایک بھربھراہٹ سی نمودار ہو گئی تھی۔

اور اس گندلاہٹ اور بھربھراہٹ کے اندر مجھ کو خوب اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے ایک ایسی کدورتِ غلیظ کو تیرتے دیکھا تھا کہ میں یہ سمجھ لینے پر مجبور ہو گیا تھا کہ میرے سامنے آتے ہی اُن کے نوعمر کبر کا شیشہ پاش پاش ہو کر رہ گیا ہے، اور ان کے اس یقین کا ساغر پتھر پر گر کر چور چور ہو گیا ہے کہ میں جیسے ہی اُن کو دیکھوں گا، لپک کر ان کا وہ استقبال کروں گا جو ایک ہیرو کے شایانِ شان ہوتا ہے۔ اور ؎

ہمائے اوجِ سعادت بدامِ ما افتد
اگر ترا گذرے بر مقامِ ما افتد!

کا نعرہ لگا کر غرقِ وجد و گرمِ رقص ہو جاؤں گا۔

اگر شاہد صاحب اس اولیں ملاقات کے بعد مجھ سے خندہ پیشانی سے پیش آتے رہتے۔ مجھے دیکھ کر ان کے ابروؤں میں گرہ نہ پڑنے لگتے، اور میں ہمیشہ ہر جلسے، ہر گلی اور ہر موڑ پر اگر یہ مشاہدہ نہ کرتا کہ مجھے دیکھتے ہی ان کا چہرہ جون کی دوپہر کے مانند بے مہر ہو جاتا ہے، اور وہ مجھے دور سے آتا دیکھ کر کترا کے کاٹتے اور بغلیں ڈورنے لگتے ہیں۔ تو اُن کی پہلی ملاقات کے موقع پر میں نے ان کی برہمی کا جو اندازہ لگایا تھا، اس کو ایک وہم یا سوءِ ظن خیال کر کے میں کب کا بھول چکا ہوتا، لیکن شاہد صاحب کی متواتر ترش روئی اور مسلسل بیزاری نے مجھے اس کا یقین دلا دیا کہ میرا وہ اندازہ واہمہ نہیں حقیقت تھا۔

(ب) غضبِ ثانی

شاہد صاحب کے اس غضبِ اول کی چنگاری ابھی گرم ہی تھی کہ خود اُن کی اور اُن کے دادا جان کی لسانی لغزشوں کی جانب اشارہ کر کے میں نے اُن کے دل و دماغ میں ایک نئے جہنم کا دروازہ کھول دیا۔ کریلا نیم چڑھ گیا، اور آستینیں چڑھا لی گئیں مجھ پر کہ جاتا کہاں ہے اب بچ کے۔

بلّی کے بھاگوں

عین اس انفجاری لمحے میں جب کہ شاہد صاحب میرے منہ کو کالا کر دینے کی راہیں ڈھونڈھ رہے تھے کہ اُن کی خوش قسمتی دیکھئے کہ صہبا صاحب مدیر "افکار" کے سر پر "جوش نمبر" کا بھوت سوار ہو گیا، اور انہوں نے ع

مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے!

کے تحت شاہد صاحب کی بارگاہ میں بھی ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کا ایک انار چھوڑ دیا۔

اور جیسے ہی اس انار کا ایک پھول اُن کے غیظ و غضب کے میگزین میں جا پڑا ———— دفعتہً ایک اس قدر زبردست دھماکا ہوا ———— ——— کہ راست گفتاری، وضع داری، متانت اور شرافت کے تمام محلے دفعتہً بھک سے اڑ گئے اور اُن کا پورا ملبہ اُڑ کر "جوش نمبر" کے میدان میں ایک گھورے کی طرح جمع ہو گیا۔

جس کو بڑی دشواری کے ساتھ اب صاف کیا جا رہا ہے۔

شاہد صاحب کا احساسِ کم تری

مجھ کو واقعی بڑی ہمدردی ہے شاہد صاحب سے ۔ اُن کے ساتھ یہ ایک عجیب المیہ ہوا کہ وہ بڑے ولولے کے ساتھ میدانِ ادب میں اُترے۔ لیکن اس کوچے میں کم و بیش ایک ربع صدی تک پاپڑ بیلتے رہنے کے باوجود وہ اپنے ادبی قامت میں اتنی بلندی بھی پیدا نہ کر سکے کہ ملک کے چوٹی کے ادیبوں کا تو کیا ذکر ہے یہ بھی ممکن نہیں ہو سکا کہ اگر وہ دو چار تھیٹ بھیّا ادیبوں کے حلقے میں بھی کھڑے ہو جائیں تو ان سے بس ایک انچ بلند تر نظر آئیں ۔

واللہ کہ میں اس پردے میں شاہد صاحب کی منقصت نہیں کر رہا ہوں، اس لئے کہ شہرت کا حاصل نہ ہونا ہمیشہ اس امر کی دلیل نہیں ہوتا کہ غیر مشہور آدمی میں لیاقت نہیں ہے ، اور اسی طرح شہرت کا حاصل ہونا بھی اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ مشہور آدمی لازماً لائق آدمی بھی ہے - ع

نیدل خاطر ز من مضمونِ خداداد است

اور "خداداد" اُس چیز کو کہتے ہیں جو ناقابلِ گرفت و بے شمار اسباب و علل کی سازگاری سے پیدا ہوا کرتی ہے ۔ میں ایسے بہت سے لوگوں سے واقف ہوں جو شاہد صاحب سے علم و ادب میں بہت کم ہیں ، لیکن اُن کو ایک دنیا جانتی ہے ، اور شاہد صاحب کے جاننے والے اتنے کم ہیں کہ اُن کو صرف انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے ۔

جبھی تو میں کہا کرتا ہوں کہ ایک غیر معروف عربی گھوڑے کی قیمت صرف دس روپے اور ایک معروف خچر کی قیمت کم سے کم تین سو روپے ہوتی ہے ۔ ع

طالعِ شہرتِ رسوائی مجنوں بیش است
ورنہ طشتِ من و او ہر دو ز یک بام افتاد

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ شاہد صاحب حلقۂ ادب میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں کر سکے ، اور جب اُن کی ذہانت نے اپنی اس ناکامی کو محسوس کر لیا ، تو چونکہ اُن کا میلان موسیقی کی طرف بھی تھا ۔ وہ اُدھر مڑ گئے ۔ فنِ موسیقی تو انہیں آ گیا ، اور مختلف ماہرانِ موسیقی کا بیان ہے کہ اس فن کو انہوں نے بدرجۂ اتم بھی حاصل کر لیا ۔ مگر یہاں بھی بدبختی نے ان کا راستہ روک دیا ۔ کیا کرتے گلے نے ان کا ساتھ نہیں دیا ۔ اور اس قدرتی نقص کی بنا پر وہ بے چارے اس کوچے میں بھی کوئی ناموری حاصل نہیں کر سکے ۔

یہ اور بات ہے کہ ڈوم ڈھاریوں کی صحبت نے اُن سے اُن کی شائستہ زبان چھین لی ، اور اُن کے منہ میں اپنی زبان رکھ دی ۔ ایک خیابانِ شہرت شریف زادے کا یہ حشر ایک عبرت ناک منظر ہے ۔

چنانچہ ان ناکامیوں نے ان کا دل توڑ دیا ، اور وہ احساسِ کم تری کے مرض میں گرفتار ہو گئے ۔ اور جیسا کہ اس مرض میں ہوا کرتا ہے اُن میں یہ میلان پیدا ہو گیا کہ وہ ادب و موسیقی کے کامیاب و معروف اساتذہ کا منہ چڑھائیں اور اُن پر کیچڑ اچھالیں کہ ان مریضوں کا انہیں باتوں سے کلیجہ ٹھنڈا ہوا کرتا ہے ۔

کاش میاں شاہد احمد مشہور ہوتے ۔ اے یا رب خدا وہ مشہور ہو جائیں ۔ کاش وہ تن درست ہوتے ۔ اے یا رب خدا وہ تن درست ہو جائیں ۔ ع

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد !

شاہد صاحب کا لہجہ

اس کُلیے کو ذہن میں اُجاگر کر کے کہ ذہنِ انسانی کی شرافت کا مدار لہجے پر ہوتا ہے۔ مندرجۂ ذیل لہجوں پر عبرت کے ساتھ نگاہ ڈالئے

(۱) "عمدہ اور مفت کی ملتی تھی، اس لئے گلاس پر گلاس چڑھاتے تھے" (یعنی یہ خاکسار، ردّی الطبع اور مفت خورا ہے اور شدتِ فلاکت کے باعث قطرے قطرے کو ترستا رہتا تھا)

(۲) "جوش صاحب نے کبھی کسی سے مقابلہ نہیں کیا۔ خبر نہیں یہ اُن کی بزدلی ہے یا شرافت" (جی نہیں، نری کھری بزدلی ہے۔ اس لئے کہ جوش آفریدی پٹھان ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ وہ سخت بزدل ہوتے ہیں۔ اب رہی شرافت، سو اس کا جوش کے سے آدمی سے تعلق ہی کیا ہو سکتا ہے۔ یہ طعنہ تو شاہد صاحب اور اُن کے دادا جان کی زبان پکڑتا ہے)

(۳) "طوطے کی بلا بندر کے سر" (دیکھئے اس خاکسار کو بندر بنا کر بھی خوش کیا گیا ہے۔ اگر شاہد صاحب کا "شیرِ ببر" ہونا میرے بندر ہو جانے ہی پر منحصر ہے تو بندر کیا، میں سُور بننے پر بھی بخوشی آمادہ ہوں)

(۴) "جوش صاحب چڑھ گئے سُولی پر" (لیجئے اب مجھے سولی پر بھی چڑھا دیا شاہد میاں نے۔ اگر میری موت پر اُن کی درازیٔ عمر مبنی ہے تو قسم ہے موت و حیات کی کہ میں واقعی سولی پر چڑھ جانے میں پس و پیش نہیں کروں گا۔ اب میری عمر ہی کتنی رہ گئی ہے کہ اس کو سینت سینت کر رکھوں)۔

(۵) "مفت خوروں کو چُسکی لگانے کا موقع ملا" (یہ میرے معزز دوستوں کی طرف اشارہ ہے جو سرشاری کے کاروبار میں میرا ہاتھ بٹا کر مجھ پر کرم کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر اشرف کے درکا میں مفت خورا اور میری محفل کے احباب میرے مفت خورے۔ جو لوگ شاہد صاحب کے وہاں کبھی بطور مہمان گئے ہیں، مجھے یقین ہے کہ ان سب کے نام "مفت خوروں" کی ہی فہرست میں درج کئے گئے ہوں گے۔ کاش شاہد صاحب میں اس قدر بخل اور اس حد کی تنگ دلی نہ ہوتی)

(۶) "ڈاکٹر اشرف الحق ..... اللہ اُن کی روح کو نہ شرمائے، ہر وقت پیتے تھے" (اپنے مرحوم بھائی کو "اللہ اُن کی روح کو نہ شرمائے" کے پردے میں رسوا کیا جا رہا ہے)

(۷) "جوش کو مہاراجہ نے دارالترجمے کی پول میں دھانس دیا" (دہائی پنچوں کی، شاہد صاحب نے مجھ غریب کو دارالترجمے کی اس چیز میں دھنسوا دیا، جس کو کرخندار وں کی زبان میں "پول" کہا جاتا ہے۔ شائستہ و شریفانہ زبان میں اس مفہوم کو یوں ادا کیا جا سکتا تھا کہ "مہاراجہ نے جوش کا دارالترجمے میں تقرر کر دیا۔" مگر اس طرح کہتے تو، پول میں دھنسوانے کی فحاشی کا مزا کیوں کر حاصل ہو سکتا تھا)

(۸) "اسماعیل احمد خاں، اینڈے بینڈے مضامین لکھا کرتا تھا" (ایک پڑھے لکھے اور صاحبِ فکر ادیب کو جو زندہ بھی ہے اس طرح ذلیل کرنا شاہد صاحب کی مروت و انسانیت نے کیوں کر گوارا کر لیا)

(۹) حکیم آزاد انصاری .... جوش کے ہاں (وہاں) مستقلاً آن پڑے تھے .... کبھی کسی کے ہاں (وہاں) اور کبھی کسی کے ہاں (وہاں) جا پڑتے تھے .... جب ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو ایک غریب شاگرد انہیں لے کر حیدرآباد پہنچا۔ آزاد کے بیٹے نے باپ کو وصول کیا۔ بڑھاپے میں ذرا ہی کیا تھا، دو چار دن بعد اللہ کو پیارا ہو گیا" (یہ ہماری زبان کے مستند و مقتدر شاعر حضرت آزاد انصاری کی، جو مولانا حالی کے شاگرد رشید اور نثری ترتیب میں بلند شعر کہنے کے موجد تھے مرجانے کے

بعد اس تو تکار کے ساتھ عزت افزائی فرمائی گئی۔ اور ان کو اس حد کا گھٹیا انسان ثابت کیا گیا ہے کہ جب مرض الموت میں اُن کو اُن کے مال دار بیٹے کے حوالے کیا گیا تو بیٹے نے اپنے ادنیٰ پائے کے باپ کو کراہت کے ساتھ "وصول" کیا۔ صرف یہ "وصول کیا" ہی ایک ایسا طرزِ بیان ہے جس کو انسانی شرافت برداشت نہیں کر سکتی۔ اور جب اس "وصول کیا" کے ساتھ ساتھ ان کی شان میں کوئی ادیب و شاعر "آن پڑے تھے" اور "جا پڑے تھے" کے سے رکیک الفاظ سنے گا تو وہ شاہد صاحب کو قیامت تک معاف نہیں کر سکے گا)

(۱۰) "تاثیر (مرحوم) کے چہرے پر جو حیاثت کی خوشی تھی وہ دیکھنے کی چیز تھی۔" (حضرت تاثیر مرحوم ایک عالم، مفکر اور خوش گو شاعر تھے۔ ان کے مر جانے کے بعد ان بے چارے کی یہ توہین اس لئے کی گئی ہے کہ وہ دہلوی نہیں پنجابی تھے۔ یا اللہ یہ صوبہ وارانہ تعصب کا گھٹیا پن کب ختم ہوگا۔ اور وہ کون ایسا مبارک دن آئے گا کہ ہم سب مل جل کر ایک قوم بن جائیں گے)

(۱۱) "پنڈت نہرو مروت کے آدمی ہیں۔ انہوں نے جوش کے حلوے مانڈے کا انتظام کیا (کر دیا)"۔ شاہد صاحب نے پھر میری تذلیل فرما کر پنڈت جی سے میرے "حلوے مانڈے کا انتظام" کرا دیا۔ خوش بخت تیری رہی ہے۔

(۱۲) "جوش خفیف الحرکتی کرتے تھے" (ابھی تک تو میں مفت خورا، بے حیا اور بزدل تھا۔ اب خفیف الحرکات بھی ٹھہرا دیا گیا۔ شاہد صاحب مجھ کو جو خطاب بھی مرحمت فرمائیں سر آنکھوں پر۔ وہ بہتر گالیاں دے کر دیکھ لیں۔ اگر میں گالی کا جواب گالی میں دوں تو لعنت مجھ پر)

(۱۳) "**ساہبے** (جوش کے) داماد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور شاعرِ انقلاب کی عزت و آبرو کی **حفاظت کر رہے ہیں**" لیجئے اب گالیوں پر بھی اتر آئے شاہد صاحب۔ بہت اچھا۔ یہ بھی قبول۔ مجھے اس سے بھی زیادہ کھل کر دیجئے اور میری "شرافت" یا "بزدلی" کو آزما کر دیکھ لیجئے۔ شاہد صاحب کو علم نہیں کہ میرے داماد کے اعصاب کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے وہ کئی برس سے فریش ہے اس مرض کے علاج میں جس کثیر دولت کی ضرورت ہے وہ میرے پاس نہیں ہے۔ کیا شاہد صاحب ترس کھانے کے موقع پر بھی تیر و نشتر ہی سے کام لینے کو ترجیح دیں گے؟ خدارا کچھ تو رحم کیجئے۔

(۱۴) "..... اسے آپ چاہیں تو اُن (جوش) کا بھولا پن کہہ لیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ بے پیندی کے بدھنے ہیں"۔ (جوش صاحب مبارک۔ آپ کو سرکارِ شاہد سے ایک خطاب اور بھی مل گیا، اور آپ آدمی کے بدلے "بدھنے" اور وہ بھی — "بے پیندی" کے بدھنے میں تبدیل ہوگئے)

(۱۵) "کمرے میں جوش صاحب براجمان تھے۔" (تشریف رکھتے تھے یا "بیٹھے ہوئے تھے" کے عوض "براجمان تھے" کہہ کر با آوازِ بلند یہ اعلان کر رہا ہے کہ ؏

غصہ میرے ناشتے کا اُترا ہی نہیں ہے

(۱۶) "گویا کلکتہ میں عہدوں کی خیرات بٹ رہی تھی جس کی تقسیم اب (جوش) کے گھر سے شروع ہونی چاہئے تھی" (صاحبو، ابھی تک تو یہ عبدِ روسیاہ درید، منصوبہ کا ننگا بھکاری، مفت خورا، بندر، بزدل، پالوں میں دھت ہو، حلوے مانڈے کا محتاج، خفیف الحرکات، اور بے پیندی کا بدھنا تھا ہی، اب خدا کے فضل و کرم سے خیرات خورا بھی ہو گیا ہے۔

این ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

(۱۷) "ماشاء اللہ (جوش) خوش خور ہیں۔ سچ ہے ایک داڑھ چلے ستر بلا ٹلے" (دیکھئے اب میں دو نمبر **ٹھہرا دیا گیا جس کو**

پیٹو کہا جاتا ہے۔ اللہ سلامت رکھے مجھ ثقیل غذا کے ہضم کرنے کا یا ساتھ بیند انسان کے نوالے گنتے والے کو،

ہر برس کے ہوں دان پچاس ہزار

(۱۸) "مولانا ماہر القادری کھانے کے ساتھ **پورا انصاف** کرتے ہیں۔ یعنی **اتنا** کہ اس کے **بعد** کسی **مزید انصاف** کی ضرورت نہیں رہتی۔۔۔ مولانا **شارٹ ہینڈ** میں کھاتے ہیں" (یہ عزت افزائی فرمائی گئی ہے حضرت مولانا ماہر القادری کی کہ وہ دعوتوں میں "مفت کا کھانا" ہیلپ ہیلپ کر کھاتے ہیں اور اس قدر ندیدے ہیں کہ کھاتے کھاتے ان کا معدہ پھٹنے لگتا ہے۔ خدا جانے **کیا معمہ** ہے کہ ہمارے شاہد صاحب دوسروں کو برا ٹھہرا کر کیوں مسرت محسوس فرماتے ہیں۔ اور یہ بات اُن کی عقل میں کیوں نہیں آتی کہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اگر اصطبل کا یہی لتیا دُھیاری رہے گا تو ہم ایک دوسرے کو ٹھونگیں مار مار کر اس **پوری برادری کو** ننگا کر دیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ دنیا کی نگاہوں میں آخر کار خود ہم بھی حقیر ہو کر رہ جائیں گے اور دوسروں کی **عزت** کا نہ سہی خود اپنی عزت کا تو پاس کریں شاہد احمد صاحب دہلوی)

چو در قومے یکے نادانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

(۱۹) "ایک پٹا ہوا مفلس شاعر پاکستان میں اُن (جوش) سے لپٹ گیا (یعنی وابستہ ہو گیا)۔۔۔ اچانک اس کا **انتقال** ہو گیا۔۔۔ مرحوم بڑا ہی بے غیرت انسان تھا"

(یہ قدر افزائی فرمائی گئی ہے حضرت ساحل بلگرامی کی جو عربی و فارسی اور اسلامی تاریخ پر حاوی، ایک اچھے شاعر اور ایک بے پایاں خلوص کے بھولے بھالے آدمی تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ فن موسیقی سے بھی ان کو خاص لگاؤ تھا۔ لیکن اُن کی یہ غلطی تھی کہ مرحوم اپنے زعم باطل میں یہ نہیں کہا کرتے تھے کہ شاہد احمد کیا جانیں موسیقی۔۔۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ساحل صاحب کو اس قسم کا فقرہ زبان پر نہ لانا چاہیے تھا۔ لیکن شاہد احمد صاحب نے اُن کے متعلق "بڑا ہی بے غیرت انسان تھا" کہہ کر اُن سے یہ جو غیرت ناک انتقام لیا ہے اور وہ بھی اس وقت جب کہ انتہائی بے کسی کے عالم میں وہ اس ناقدر دنیا سے سدھار چکے ہیں۔ تو اس انتقام پر نگاہ کر کے دل لرز لرز رہ جاتا ہے کہ اللہ اللہ ایسے نفوس بھی ہوتے ہیں جو مر جانے کے بعد بھی انتقام لیے بغیر نہیں چھوڑتے۔

ایک شخص کے متعلق ایک زمانے میں یہ غلغلہ سنا تھا کہ وہ رات کے بارہ بجے قبرستان جا کر اپنے دشمن کی کچی قبر میں سوراخ کر کے اور پیشاب کیا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کسی مر جانے والے کی "مرحوم بڑا ہی بے غیرت انسان تھا" سے تواضع کرنا، اسی شخص کے کردار کے زمرے میں سے ہے جو دشمن کی قبر میں سوراخ کر کے پیشاب کرنے پر مجبور کیا کرتا تھا۔

اسی کے ساتھ ساتھ "ایک پٹا ہوا مفلس شاعر" پر نگاہ پڑتی ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شاہد صاحب سرمایہ دار ہوں یا نہ ہوں، لیکن اُن کے نفس میں سرمایہ داروں کا اوچھا غرور درحقیقت کروٹیں لے رہا ہے۔ اور وہ "مفلس" کو "انسان" ہی تسلیم نہیں فرماتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ جب شاہد صاحب کے مزاج کی یہ اُفتاد ہے تو وہ میر، مصحفی، اور غالب کے سے تمام "مفلس" شاعروں کو بھی نہایت حقارت کے ساتھ دیکھتے ہوں گے۔ اور صرف اسی تنہا بنیاد پر کہ ان کے نزدیک جب تک کوئی صاحب ہنر صاحب زر نہ ہو جائے وہ ہمیشہ ناقابل اعتماد اور "پٹا ہوا مفلس شاعر" ہی رہتا ہے۔۔۔

کم کُن غرور و ناز کہ دیدا ست روزگار
چینِ قبائے قیصر و طرفِ کلاہِ کے!

شاہد صاحب سے خطاب

شاہد میاں، آپ نے ہر چند میرے خلاف مضمون لکھ کر تمام حدودِ اخلاق کو توڑ دیا ہے۔ دوسرا ہوتا تو جیتے جی آپ کو معاف نہ کرتا بلکہ اپنی ذہنی بیماری کے باعث آپ سے انتقام لے کر دم لیتا۔ لیکن یقین کرنے کو آپ کا جی چاہے یا نہ چاہے میں بے پایاں خلوص اور بے نہایت دیانتداری کے ساتھ اور راست گفتاری کو اپنے دل میں اچھی طرح سمجھ کر اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ میں نے کوثر اور تسنیم کی سی طاہر نیت کے ساتھ آپ کو آپ کا عذر سنے بغیر معاف اور دل سے معاف کر دیا ہے۔

آپ نے اسی مضمون میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ:

"جوش صاحب نے کبھی کسی سے مقابلہ نہیں کیا۔ خبر نہیں یہ اُن کی بزدلی ہے یا شرافت"

اس لئے مجھ کو لکھنا پڑ رہا ہے کہ میرا یہ اعلان معافی نہ تو میری شرافت ہی کا غماز ہے نہ میری بزدلی کا آئینہ دار بلکہ یہ صادر مبنی ہے اس چیز پر جس کو اصابتِ رائے اور قوتِ فیصلہ کہا جاتا ہے۔

شاہد صاحب اس اجمال کی تفصیل بھی سن لیجئے۔

بات یہ ہے کہ عقل کی صحت و سلامتی کبھی کسی عالم میں اور کسی شرط کے ساتھ بھی ان امور کی اجازت نہیں دیتی جن کو رذائلِ اخلاق کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ عقل کی صحت و سلامتی میں سرے سے وہ صلاحیت ہی مفقود ہوتی ہے جو انسانوں کو گمراہی کے ویرانوں کی جانب ہانک دیا کرتی ہے۔

جس کے یہ صریحی معنی ہیں کہ رذائلِ اخلاق کا ارتکاب صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ مرضِ جنون کے باعث انسانی عقل مستقلاً بیمار و معطل ہوتی ہے یا کسی جذبۂ شدید و قوی کے ہیجان و تشنج کی بنا پر عارضی و آنی طور پر بیمار و معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ پہلی حالت کو جنونِ مستقل اور دوسری کو جنونِ عارضی کہا جاتا ہے۔

پہلی صورت یعنی صحت و سلامتیٔ عقل کے عالم میں چونکہ تمام اقوال و اذکار و اعمال کو شعوری و ارادی مانا جاتا ہے۔ اس لئے ان پر سزا و جزا کا حکم لگاتے ہیں۔ اور دوسری صورت یعنی عقل کی بیماری و مغلوبیت کے عالم میں چونکہ تمام اقوال و اذکار و اعمال کو غیر شعوری و اضطراری خیال کیا جاتا ہے۔ اس لئے ان پر کسی سزا و جزا کا حکم نہیں لگایا جاتا۔

اس حقیقت کو انداز بیان بدل کر یوں کہہ سکتے ہیں کہ عقل کی شمع فروزاں کی "لو" کو "نیکی" اور عقل کی شمع کشتہ کے "دھوئیں" کو "بدی" کہا جاتا ہے۔

پہلی صورت کو شعوری و ارادی، اور اس لئے قابلِ سزا و جزا، اور دوسری صورت کو غیر شعوری و اضطراری اور اس وجہ سے ناقابلِ سزا و جزا تسلیم کیا جاتا ہے۔

اور چونکہ شاہد میاں آپ کا یہ مضمون ان اسباب کی بنا پر جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے شدید غیظ و غضب کی وجہ سے دوسری صورت کی پیداوار ہے اس لئے آپ کی غیر شعوری و اضطراری جنبشِ قلم کو میری مجال نہیں کہ میں معاف نہ کر دوں۔

شاہد میاں، اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا اعلانِ معافی نہ تو میری شرافت ہی کا شاہد ہے نہ میری بزدلی ہی کا گواہ ہے

ضرب شاہد بفرق شاہدباز

نقار — جوش نمبر

جوش ملیح آبادی

ملکیتہ طور سے اس چیز پر مبنی ہے جس کو اصابت رائے اور قوتِ فیصلہ کہا جاتا ہے۔

ہی کے ساتھ ساتھ میں آپ کو اس بات سے بھی آگاہ کرنا چاہتا ہوں خواہ آپ مانیں یا نہ مانیں کہ میرا دل آپ کی محبت سے

خالی نہیں ہے۔ میرا دل آپ کی محبت سے خالی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ آپ انسان ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ جو تنگ دل

وخفتہ انا شخص انسان سے محبت نہیں کرتا اور جو نام اک آدمی جیکی دوست ہی نہیں جانی دشمن سے بھی محبت نہیں کرتا، وہ

اپنے کو اس امر کا بجا طور پر امیدوار و مستحق ٹھہرا لیتا ہے کہ اسے نظام شمسی کے حدود سے خارج کر کے جہنم میں جھونک دیا جائے۔

آپ کو علم ہے، اور پورا ہندوستان و پاکستان آپ کے اس علم میں شریک ہے کہ میں معاشرے کی برہمی و آشفتگی اور خسروی کے غیظ و غضب

دونوں سے کبھی دبا نہیں ہوں۔ اگر ان دونوں سے دب جانے کی مجھ میں لچک ہوتی تو میری زندگی آج اس دردناکی میں بسر نہ ہو رہی ہوتی۔

میں نے عامۃ الناس کے محبوب عقائد و مسلمات کا مذاق اڑایا ہے۔ نظام کے جبروت پر مسکرایا ہوں، اور فرنگی کے تاج و علم پر تیر

برسائے ہیں۔ اور آج بھی ہر طاقتِ باطل سے خواہ وہ ذہنی ہو یا مادی، ٹکر لینے پر کمربستہ رہتا ہوں۔

یہ شیخی میں آکر ایک چھچھلے آدمی کی طرح میں اپنی بڑائی کا اظہار نہیں کر رہا ہوں، بلکہ میں نے یہ باتیں اس لئے ظاہر کی ہیں کہ آپ

پر میرا کردار ظاہر ہو جائے اور میں نے جو یہ معانی و محبت کا آپ کو یقین دلانا چاہا ہے اس کو آپ باور کر لیں، اور اس وہم میں نہ پڑ جائیں

کہ میں آپ سے ڈر کر ایک بزدل انسان کے مانند جھوٹ موٹ یہ باتیں کر رہا ہوں۔

اس پہ گذرے نہ گمان ریو و ریا کا زنہار

غالب خاک نشیں اہل خرابات سے ہے

اس سے دوش بدوش یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ مجھ میں یہ جذبۂ تند ایک مرض کی طرح پیوست ہو چکا ہے کہ جب کسی کی زبان سے

کوئی غلط لفظ سنتا ہوں، تو ٹوک دیتا ہوں۔ اور اس کی مطلق پروا نہیں کرتا کہ علمی یا سیاسی حیثیت سے وہ آدمی کس قدر عظیم ہے

اور بگڑ جائے تو مجھے کس قدر نقصان پہونچا سکتا ہے۔

اس سلسلے کے دو واقعات عرض کرتا ہوں جن سے میرے غلط الفاظ پر ٹوک دینے کے مرض کا آپ پر انکشاف ہو جائے گا۔

حضرت مانی جائسی کو ادبی وظیفہ دلانے کی نیت سے جب میں ایک روز مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس پہونچا تو انہوں نے یہ

جواب دیا کہ۔

"میں مانی کو سرے سے شاعر ہی نہیں تسلیم کرتا، وظیفہ کاہے کا؟"

اور جب میں نے اصرار کیا، تو مولانا نے فرمایا

"ارے میرے بھائی آپ جذبۂ رفاقت سے اتنے مجبور رہوگے میں کہ مانی کے سے غیر شاعر کو وظیفہ دلانے پر مصر ہیں۔"

یہ سنتے ہی میں نے مولانا سے کہا کہ "آپ نے پہلے تو یہ معنوی غلطی فرمائی کہ مانی کو شاعر تسلیم کرنے سے انکار فرما دیا، اور پھر لگا لگت ارشاد

فرما کر لفظی غلطی کا بھی ارتکاب کر بیٹھے۔"

اب دوسرا واقعہ سنیئے۔۔۔

جب مانی صاحب کو ساتھ لے کر میں اسی مقصد کے حصول کی خاطر پنڈت جواہر لال کے پاس پہونچا اور ان سے کہا کہ —

"مانی صاحب باہر بیٹھے ہوئے ہیں، اجازت ہو تو اندر بلا لوں؟"

تو انہوں نے کہا "جوش صاحب یہ مانی کون ہیں؟"

میں نے کہا "ارے آپ نہیں جانتے، مانی صاحب میرے اُستاد ہیں!"

پنڈت جی نے کہا "آپ کے استاد!"

میں نے کہا "جی ہاں میرے استاد"

پنڈت جی نے کہا "تو فوراً اندر بلا لیجیے"

مانی صاحب اندر آ گئے، اور اپنا دیوان پیش کیا، اور پنڈت جی نے اسی وقت اُن کا وظیفہ مقرر فرما دیا۔

اور جب میں اُن کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہونے لگا تو پنڈت جی نے کہا، کہ آپ میرا شکریہ کیا ادا کرتے ہیں۔ میں تو اُلٹا آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے استاد سے ملا دیا۔

یہ سنتے ہی میں نے پنڈت جی سے کہا کہ مانی صاحب کا وظیفہ مقرر فرما کر ایک طرف تو آپ نے میرا جی خوش کر دیا، اور دوسری طرف "مشکور" کا سا غلط لفظ استعمال کر کے آپ نے میرے دل کو بھون ڈالا۔

اب آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مجھ میں یہ بات مرض کی حد تک پیدا ہو چکی ہے کہ میں کسی کی بھی غلطی کو بخشتا نہیں ہوں۔ اور یقین کیجیے کہ اسی جذبے کے تحت میں نے آپ کے دادا جان اور آپ کی لسانی لغزشوں پر قلم پھیر دیا تھا۔

اس سے آپ یہ خیال ہرگز قائم نہ کریں کہ میرا یہ طرزِ عمل نعوذ باللہ کسی دہلوی لکھنوی جذبۂ رقابت پر مبنی تھا۔

کیسی دلی، کیسا لاہور، کیسا لکھنؤ، کیسا دکن اور کیسا ڈھاکا، اب یہ سب میرے وطن ہیں۔ اب تو پورا کرۂ ارض میرا وطن ہے۔ اور اب میں ان گھٹیا قسم کے امراضِ تعصب سے شفایاب ہو کر غسلِ صحت بھی کر چکا ہوں۔

شاہد صاحب، میں ہرچند آپ کے دادا جان کے مزاج اور فرنگی حکومت سے اُن کی نیازمندی کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا، لیکن اُن مرحوم کے علمی فضائل پر نگاہ کر کے میں ان کے آستانِ عالی پر سر جھکاتا اور اس سر جھکانے کو اپنی سرافرازی سمجھتا ہوں، اور اُس کے دوش بدوش آپ کو موسیقی و ادب پر جو قدرت حاصل ہے، اُسے تسلیم کرتا اور سراہتا ہوں۔

بس ایک بات اور سن لیجیے ——

اور وہ بات یہ ہے کہ اس "دیدہ و شنیدہ" میں جو امور آپ نے میری ذات سے منسوب فرمائے اور جن "واقعات" پر آپ نے "شاہد" کے ذریعے سے روشنی ڈالی ہے، اگر بفرضِ محال وہ تمام امور حرف بحرف باون تولے پاؤ رتی کی طرح صداقت و دیانت پر مبنی بھی ہوتے پھر بھی اس بنا پر کہ آپ میرے محبوب دوست اشرف کے بھائی، ملک کے مقتدر عالم مولوی نذیر احمد صاحب کے پوتے اور اس دلیٔ عظیم کے باشندے ہیں جس نے لکھنؤ سمیت تمام ہندوستان کو زبان، ادب، حلم، وضع داری، تہذیب اور شائستگی کا صدیوں درس دیا تھا —— —— ایک آپ کے سے ادیب انسان سے —— یہ توقع ہرگز وابستہ نہیں کی جا سکتی تھی کہ "جوش صاحب" میں میری شاعری پر نقد کرنے کے عوض آپ میرے عیوب کی ستاری سے دست بردار ہو کر میرے عیوب کی نقاب اٹھا ...... اور اُن کا پردہ چاک کر دیں گے۔

شاہد میاں آپ ایک خاندانی اور شریف انسان ہیں۔ آپ اس بات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک شریف انسان ہمیشہ عیب پوش ہوتا ہے نہ کہ عیب فروش!

پروفیسر سیّد وقار عظیم

جوش کی غزل

۱۰ راپریل   برادرم صہبا صاحب۔ سلام مسنون

آپ سے پکّا وعدہ تھا کہ جوش نمبر کے لئے مضمون لکھوں گا۔ نیت بھی یہی تھی لیکن طرح طرح کی مصروفیتیں اور صحت کی غیر یقینی سی حالت سدّ راہ بنتی رہیں۔ وعدہ پورا نہ ہوا۔ اس کا قلق بھی رہا اور شرمندگی بھی۔ آپ نے بقولِ خود "تبرکاً" چند سطریں کہیں سے لے کر چھاپ دیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ تبرک انتقام لینے کا بڑا اچھا طریقہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مقامی ہفتہ وار اخبار کے نمائندے میرے پاس تشریف لائے تھے اور انہوں نے منجملہ اور باتوں کے ایک سوال موجودہ دور کی غزل کے متعلق بھی کیا تھا۔ اس جواب میں میں نے چند جملے جوش صاحب کی غزل کے متعلق بھی کہے تھے۔ میری باتوں کو اُن صاحب نے اپنے لفظوں میں لکھا تو اُن کی صورت مسخ ہو گئی اور جو چند جملے آپ نے تبرک کے طور پر چھاپے وہ میری کہی ہوئی بات کی مسخ شدہ صورت تھی۔ مجھے وہ جملے پڑھ کر رنج ہوا۔ لیکن اس کی "تلافی" اُس وقت ممکن نہیں تھی۔ اب "جوش کی غزل" پر اپنے خیالات ایک مضمون کی شکل میں ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ انہیں آپ "جوش نمبر" کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کرسکیں گے۔

آپ کا: وقار عظیم

'لیکن' ہماری بول چال کا بالکل سیدھا سادہ سا لفظ ہے۔ لیکن اس سیدھے سادے لفظ کی تہ میں اتنی نفسیاتی گہرائیاں چھپی ہوئی ہیں کہ روزمرہ زندگی کی سطح پر عام ہونے کے باوجود یہ سیاسی زندگی کا آلۂ کار بن گیا ہے۔ 'سیاست' کی کوئی بات اس 'لیکن' سے خالی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ سیاست کا مزاج مصلحت کے جس راستے پر چلتا ہے اس میں قدم قدم پر اسے 'لیکن' کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ایک طرف تو سیاست ہے کہ اگر اس میں مصلحتیں ... نہ ہوں تو وہ کامیاب نہیں ہوتی۔ اور دوسری طرف ادب ہے کہ اگر وہ مصلحت بینی اور مصلحت اندیشی کو اپنا مسلک بنالے تو اس کے کام میں رخنے پڑنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کے اسلوب اور زبان میں یا یوں کہنا شاید صحیح ہو کہ تنقید کے اسلوب اور زبان میں 'لیکن' کا سہارا لینے کو عیب سمجھا جاتا ہے ——— لیکن میں آج اس مشکل میں گرفتار ہوں کہ مجھے جوش کی غزل کے متعلق جو کچھ کہنا ہے اس میں 'لیکن' کی اس تکرار کے بغیر کام ہی نہیں چلتا۔ اور یہ بات مصلحت نے نہیں مجبوری نے پیدا کی ہے۔ شاید یہی مجبوری ہے جس کے احساس نے کسی کو آج تک جوش کی غزل پر کچھ لکھنے پر آمادہ نہیں کیا۔ اور شاید یہی مجبوری اور بے بسی ہے جس میں خود جوش صاحب بھی گرفتار رہیں کہ ایک منفرد رنگ کی غزل کہنے پر قادر ہونے کے باوجود اس کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ اور غزل پر لعن طعن کرنے کو اپنا فرض منصبی جانتے اور اس فرض کی ادائیگی پر فخر محسوس کرتے اور خوش ہوتے ہیں ——— لیکن یہ سب کچھ کرنے پر بھی اپنے آپ کو اس عشوہ ساز کے دام بلا سے محفوظ نہیں رکھ سکتے ——— اور یہیں سے اس 'لیکن' کا طویل سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا اور جس کے جواز کو مسلم ٹھہرانے کی خاطر میں نے یہ تمہیدی سطریں لکھی ہیں۔

جوش صاحب نے بھی حالی کی طرح "قدیم" اور "جدید" دونوں طرح کی غزلیں لکھی ہیں۔ اور یوں اُن کے نزدیک غزل میں جو کچھ بُرا ہے اُسے ترک کر کے ایک نئی طرح کی غزل کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی ہے ؎

ذرات کو چھوڑ کر ... سے لے کر
خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے

گویا جوش نے غزل کے عام مضامین کو چھوڑ کر اس کے دامن کو نئی طرح کے پرشکوہ مضامین سے بھرنے کا دعویٰ کیا ہے اور نئی طرح کے پرشکوہ مضامین کو غزل میں داخل کرنے کا اثر یہ ہوا ہے کہ ان کے لہجے میں ایک ایسی بلند آہنگی پیدا ہو گئی ہے جو غزل کے مزاج سے زیادہ قصیدے کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہے۔ لیکن اس قصیدہ نما غزل میں جوش کی انفرادیت کا بڑا گہرا رنگ شامل ہے اس انفرادی مزاج کی سب سے اہم خصوصیت اور انفرادیت یہ ہے کہ ماضی کی یادیں اُسے تڑپاتی اور بے قرار رکھتی ہیں ——— جوش کی بزم غزل ماضی کی یادوں کے چراغوں سے روشن ہے اور یادوں کے ان چراغوں کو روشنی تین چیزوں سے ملی ہے —— اُن لذت آفریں لمحوں سے جو محبوب کے کاکلوں کے سائے میں بسر ہوئے، ان طرب انگیز لمحوں سے جن میں حسینۂ فطرت کی ہم آغوشی کی لذتیں حاصل ہوئیں اور تشنگی کی اُن گھڑیوں سے جن میں سرشوق کو آستانۂ ساقی پر جھکنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

جوش کی غزل انہیں تین چیزوں کے گرد گردش کرتی ہے ——— حسن محبوب، کشش فطرت اور لذت بادہ۔ لیکن ان تینوں چیزوں کے ساتھ ان کا رابطہ ذہنی ہے، قلبی نہیں۔ اور اسی لئے یہ غزل محبوب کے اوصاف کا، مظاہر فطرت کی کششوں کا اور بادہ و ساغر کی رنگینیوں کا قصیدہ ہے اور اس لئے لازمی طور پر اس غزل کی زبان اکثر جگہ قصیدے کی زبان ہے۔ لیکن اس قصیدہ نما غزل میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ جیسے کہ میں نے ابھی کہا۔ جوش نے جن چیزوں کو اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے، ان کے ساتھ ان کا رشتہ قلبی نہیں ذہنی ہے۔ لیکن جہاں کہیں یہ رشتہ قلبی بن گیا ہے اُن کی غزل میں وہ بات پیدا ہو گئی ہے جو انہیں کہنے

خام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جوش کی غزل دل کی واردات کی کسک ہونے کی بجائے ذہن کی قلشوں کی صدائے بازگشت ہے۔ لیکن اس میں کہیں کہیں دل کی آواز بھی شامل ہو جاتی ہے اور یوں بزم حسن، صحن چمن اور گوشۂ میکدہ کی ایسی ایسی تصویریں سامنے آتی ہیں کہ انہیں دیکھنے والا ان کے دیکھنے کی مسرت میں تڑپتا ہے۔

جوش کی غزل میں خصوصیت کے ساتھ یہی تین مضامین کیوں ہیں؟ یا ان کے علاوہ جو دوسرے مضمون ہیں اُن کا انداز محض رسمی کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مخصوص مضامین زندگی کے جن جن پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں ان کی حیثیت شاعر کی زندگی میں آپ بیتی کی ہے جنہیں جوش کی زندگی کی تفصیلات کا علم ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ زندگی "طرف چمن و صحن بیاباں" "رحمت کدۂ بادہ فروشاں" اور "بزم طرب و کوچۂ جاناں" میں بسر ہوئی ہے۔ اور انہیں "ناظر نظارۂ قدرت" اور "رند خرابات" ہونے کے علاوہ "خلوتی کاکل و رخسار" ہونے کی نعمت، سعادت اور مسرت حاصل رہی ہے۔ اور انہوں نے اپنی غزل میں زندگی کے ان تینوں رُخوں کے واردات و تجربات کو دل کی آواز بنانے کی جگہ ذہن کے محسوسات کا ترجمان بنایا ہے۔ ــــ میرے نزدیک یہی ان کی غزل کی خامی بھی ہے اور اس کا امتیاز بھی۔

غزل پر جوش کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں شاعر ہجر و وصل کے وہی پرانے فرسودہ مضامین نظم کرتے رہتے ہیں جن سے اُن سے پہلے کے شاعروں نے اپنی دکانِ غزل سجائی ہے ـــ

کچھ نہیں اس کے سوا جوش حریفوں کا کلام
وصل نے شاد کیا ہجر نے ناشاد کیا

دوسرا بڑا اعتراض جو جوش نے غزل پر کیا ہے یہ ہے کہ اس کے مختلف شعروں میں جو مختلف مضامین نظم کئے جاتے ہیں اُن میں آپس میں کوئی ذہنی یا جذباتی رشتہ نہیں ہوتا۔ وصل کے شعر کے بعد فوراً فراق کا شعر، اُس کے بعد کوئی لطافت کا نکتہ، پھر کوئی اخلاقی درس، ابھی غم، ابھی مسرت، ابھی ناکامی اور ابھی کامرانی، ابھی شیخ و واعظ سے چھیڑ چھاڑ اور ابھی پیر مغاں کے در پر سر نیاز، غرض غزل ایسے بے شمار مضامین کا مجموعہ ہوتی ہے جنہیں کسی طرح بھی باہم ایک رشتے میں نہیں پرویا جا سکتا۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ ان مختلف النوع مضامین کا اظہار کرنے والے شعروں میں کیفیت یا Mood کی یکسانی بھی نہیں ہوتی ـــ کیفیت کی وہ یکسانی اور رچاؤ جس کی بدولت میر، مصحفی، مومن، غالب، ظفر، حسرت، فانی، اقبال، اصغر، جگر اور فیض کو ان کا مخصوص مقام اور مرتبہ ملا ہے۔

جوش کی غزل بھی ان دو عیبوں سے خالی نہیں جو جوش کے نزدیک غزل کا اتنا بڑا عیب ہیں کہ اُسے شاعری کہنا بھی محض رسم کی پابندی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جوش کی غزل میں وہ ساری خرابیاں ہیں جن کی بنا پر مختلف زمانوں میں غزل کو برا کہا جاتا رہا ہے۔ یہاں بھی غم گیتی اور غم جاناں کو انسان کے دو بڑے غم کہا گیا ہے۔ یہاں بھی غزل میں عشق کی ایسی واردات بیان کی گئی ہیں جن کا ذکر شانِ عاشقی کے خلاف ہے۔ یہاں بھی ایک ہی غزل میں ایسے مضامین کی بھرمار ہے جنہیں آپس میں کسی طرح بھی نہیں جوڑا جا سکتا۔ یہاں بھی غزل میں ایسے درد کا بیان ہے جو نہ اپنا معلوم ہوتا ہے نہ پرایا۔ بس مانگے کا درد ہے جو غزل کی روایت سے مستعار لیا گیا ہے۔ بیان میں یہاں بھی بیان کا وہی تکلف، وہی تصنع اور لفظوں کی وہی رعایت اور وہی شعبدہ بازی ہے جسے لکھنوی غزل نے اپنا کر بے مزہ اور بے کیف بنا دیا۔ یہاں بھی غزل کے اسلوب میں تصنع کا بوجھل پن ہے یا اس سے دامن بچانے کی کوشش میں ایسی سادگی ہے جس پر بناوٹ کا رنگ چھایا ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ اُن کی غزل میں وہ تمام خامیاں اور کوتاہیاں ہیں جن کی وجہ سے غزل اپنے ارتقا کے مختلف دوروں میں رسوا رہی ہے مثال کے طور پر چند شعر دیکھئے ؎

مصحفِ انبساط نے آیۂ حُزن پیش کی
فتح سے دور کر دیا نصرتِ کردگار نے
مجھ کو درِ نشاط نے اشکِ الم عطا کئے
شامِ شکستِ نذر کی صبحِ ظفر شکار نے

قفلِ بابِ شوق قفسِ ماحول کی خاموشیاں
دفعتاً کافر پپیہا بول اٹھا اب کیا کروں ؟

تھا لطف پہلے تیر میں، اب صرف تیر ہے
ظلمت سے موجِ آبِ بقا کون لے گیا؟
اب جوش کے لئے ہیں نہ آنسو نہ آہِ سرد
اس کاستاں کی آب و ہوا کون لے گیا

آتی ہیں حسبِ قاعدہ راتیں اُسی طرح
لیکن نظر بچا کے اب آتے نہیں ہو تم !

ربابِ فصلِ بہاری خموش ہے کب سے
ہنوز مطربِ وحشت کی تان باقی ہے
وہ جوش چھوڑ چکے ناوک افگنی پھر بھی
چمکتا تیر، لچکتی کمان باقی ہے

مایوس ہو چکا ہوں غمِ روزگار سے
اب ساز و برگِ عیش مہیا نہ کیجئے
سینہ کمالِ ذوقِ طرب سے ہے چاک چاک
اب فتنۂ نشاط کا در وا نہ کیجئے !!

یہ تھوڑے سے شعر اس اندازے کے لئے کافی ہیں کہ جوش کی غزل میں کہیں اندازِ تخاطب عامیانہ ہے، کہیں ایک عام، روایتی اور فرسودہ مضمون نظم کیا گیا ہے کہیں شعروں میں لفظی رعایتوں کا ضرورت سے زیادہ اہتمام ہے کہیں لفظوں اور ترکیبوں میں ایسی ثقالت

ہے کہ شعر میں غزل کا رنگ باقی نہیں رہا، کہیں کوئی ایسا لفظ آ گیا ہے جو اپنی ذاتی حیثیت میں اچھا ہونے کے باوجود شاعرانہ لذت سے خالی ہے۔ کہیں بیان میں ایک ایسی خامی ہے جو تھوڑی توجہ سے دور ہو سکتی تھی۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو جوش کی غزل کے یہ سارے عیب اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ ان کی غزل واردات دل کی آواز ہونے کے بجائے ذہن کے محسوسات کی ترجمان ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اسی عیب نے اُن کی غزل کو اعلیٰ درجے کی غزل بھی بنایا ہے اور اسے ایک منفرد حیثیت بھی دی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جس سوز و گداز نے میر کو میر بنایا، فکر اور جذبے کے جس مکمل امتزاج اور ہم آہنگی سے غالب غالب بنے، وارداتِ محبت کے جس بے لوث بیان نے مومن کے تغزل کی روایت کو جنم دیا اور درد کی جو کسک ناسخ کے یہاں سرے سے ناپید ہونے کے باوجود کبھی کبھی دبی ہوئی چوٹ کی طرح اُبھرتی ہے، جوش کی غزل کا مزاج اس سے ناآشنا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس غزل میں وہ انفرادیت ہے جس کی بدولت ہماری غزل کی روایت کو بعض نئی چیزیں ملی ہیں۔ اگر کوئی ان نئی چیزوں کا احاطہ کر کے انہیں یکجا کرنا چاہے تو یہ کہے گا کہ ایک تجربے اور احساس کو مختلف طریقوں سے ادا کرنا، بیان میں خیال اور تصور کے نئے نئے گوشے نکالنا اور ہر نئے گوشے کے لئے مفعول، ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں کی مدد سے بیان کا کوئی نیا اور دل کش رخ تلاش کرنا۔ خیال اور بیان کی سطحوں میں یکسانی اور ہم آہنگی قائم رکھنا، تجربے کی تصویر کے نقوش کو برابر زیادہ گہرا کرتے جانا اور ہر نقش میں اس کی مناسبت سے نیا رنگ بھرنا، یہاں تک کہ یہ تجربہ اور اس تجربے کی مکمل تصویر ذہن کے لئے جمالیاتی حظ اور انبساط کا سرمایہ بن جائے۔ غزل کی اس روایت کی اہم خصوصیتیں ہیں۔

نقش و نگار میں ۱۶-۷ غزلیں ہیں جن پر نہ جانے کیوں کسی نہ کسی عنوان کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک کا عنوان ہے "عاشق نواز"۔ اس غزل میں شاعر محبوب سے مخاطب ہے۔ ابتدائی تین شعروں کے بعد، جن کی حیثیت تمہیدی کی ہے، اس مسلسل غزل کا اُٹھان شروع ہوتا ہے۔ اور شاعر کہتا ہے :-

تیری طبعِ ناز اور آشفتگی
تیرا پہلو اور خواہشِ جاں گداز
یہ ترا رُخ اور رنگِ خستگی
یہ ترے لب اور حدیثِ سوز و ساز
تیرا سینہ اور میری آرزو
میری محفل اور تیری شمعِ ناز
تیرا دل اور کاہشِ سوزِ نہاں
تیرا سر اور زانوئے سوز و گداز
آہِ سوزاں اور تیرے لعلِ لب
اشکِ خونیں اور تیری چشمِ ناز
خارِ حسرت اور ترا قلبِ رقیق
گردِ حرماں اور تری زلفِ دراز
تیرا دامن اور وقفِ اشکِ غم

تیرا سینہ اور بارِ حرفِ ناز !

جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے شاعر کے دل میں کسی مشاہدے سے ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس خیال کو نظم کرتا ہے لیکن بات کو ایک طرح کہہ کر اسے تشفی نہیں ہوتی۔ اس کے دل کی بے قراری اور بے تابی اور اس کے شاعرانہ مزاج کی جدت بھی اس سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ ایک بات کو صرف ایک طرح کہہ کر خاموش نہ ہو جائے۔ ایک سیدھا سادہ تجربہ شاعرانہ بیان کے جتنے ممکن پہلوؤں کی صورت اختیار کر سکتا ہے تخیل اور تصور ان سے ایک نئی تصویر بناتے۔ غور سے دیکھا جائے تو خیال اور تصور کی یہ جولانیاں جنہیں جدت اور زورِ بیان نے ہر شعر میں ایک نئے نقش اور نئی تصویر کی صورت دی ہے حقیقت میں ایک ہی احساس اور تجربے کی مختلف شکلیں ہیں، اور ایک حقیقی تجربہ شاعر کے تخیل کی وسعت و ثروت سے اور تخیل کی اس وسعت و ثروت کا پوری طرح ساتھ دینے والے زورِ بیان سے نئے رنگ اختیار کرتا ہے۔ اور پڑھنے اور سننے والے کے لئے شاعری کے تجربے کا ابتدائی نقش آہستہ آہستہ زیادہ گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب یہ نقش دل کی گہرائیوں میں جذب اور پیوست ہو جاتا ہے، تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی نظر کے سامنے ایک ایسا نگار خانہ ہے جس میں ایک ہی خیال ایک ہی تصور ایک ہی احساس یا ایک ہی تجربے کی مختلف تصویریں آویزاں ہیں۔ ایک سے ایک زیادہ رنگین، دل آویز اور موثر۔

جوش کی اکثر غزلوں کا انداز یہی ہے۔ یہاں بات غزل کی ہے لیکن اسلوب نظم کا۔ غزل شروع تو ایک حقیقی تجربے کی کسک سے ہوتی ہے لیکن تخیل یا جوش نئے نئے خیالی تجربوں کو جنم دیتا ہے۔ اور ایک خیال سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا اس طرح ابلتا ہے کہ شاعر جیسے بے قابو ہو کر خیال کے اس سیلِ رواں میں بہتا چلا جاتا ہے۔ ان موقعوں پر ذہنی تخلیق کا دوسرا پہلو جسے ہم اظہار و ابلاغ کہتے ہیں، شاعر کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اور اس کے بعد تخلیق کے اس حکمہ غزل کہئے) سیلِ رواں میں طغیانی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ نرمی کی جگہ گرمی کی حکمرانی ہوتی ہے۔ آنچ کے دھیمے پن کی جگہ شعلوں کی لپک ہوتی ہے، چراغِ محفل کی سوئی کی جگہ برق کوندتی نظر آتی ہے۔ اور نسرین و یاسمن کی ملاحت و صباحت کی جگہ ہر طرف لالہ و گل کی سرخی و شادابی چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

مثال کے لئے دو اور غزلوں پر نظر ڈالئے جو شروع تو بڑے دھیمے انداز میں ہوتی ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ اس دھیمے پن میں طوفانوں کا جوش و خروش پیدا ہونے لگتا ہے۔ پہلی غزل "التجائے کرم" کا آغاز محرومی کے ایک احساس سے ہوتا ہے، اور شاعر "پھر" زندگی کی انہیں لذتوں کو طلب کرتا ہے جو پہلے کبھی اس کی زندگی کا سرمایہ رہ چکی ہیں۔

غزل اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

آ، ناز سے پھر، اور انیسِ دل و جاں ہو
اے خونِ طرب عشق کی نبضوں میں رواں ہو

اور پھر ایک ایک کر کے ایک خیال سے دوسرا خیال، ایک آرزو سے دوسری آرزو، اور ایک التجا کے تصور سے دوسری التجا کا تصور پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اور ہر نئے خیال، نئی آرزو اور نئے تصور کے ساتھ بیان کا زور بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب غزل ختم ہو چکتی ہے تو آرزوؤں کے یہ بے شمار نقش پڑھنے والے کے ذہن پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گویا ان نقوش کو ابھارنے اور اُجاگر کرنے میں رنگوں کے اس تنوع نے زیادہ حصہ لیا ہے جنہیں تحریر میں اظہارِ خیال اور حسنِ بیان کے وسیلے کہا جاتا ہے۔

اب غزل کے باقی شعر سنئے: ؎

اللہ ری ظلمت کہ سجھائی نہیں دیتا
اے شمع! خدا کے لئے پھر شعلہ فشاں ہو
اے ماہِ شبِ چاردہم! پھول کھلا دے
اے موجِ نسیمِ سحری! عطر فشاں ہو
مرجھا کے نہ رہ جائے کہیں کشتِ تمنا
اے ابرِ عمل! اے رخِ خورشید نہاں ہو
باتیں تجھے کانٹوں پہ بھی زینت ہیں پہنو
اے صبح! علم کھول دے، اے نور! عیاں ہو
اے صبح! کبھی رات کے پہلو میں بھی آجا
اے شاہ! گدا کا بھی کبھی مونسِ جاں ہو
اے بادہ! کبھی جامِ سفالیں میں بھی لرزاں
اے عرش! کبھی فرش پہ بھی نور فشاں ہو
اے دیدۂ بے پردہ، و اے نرگسِ مخمور
دم بھر کے لئے میری طرف بھی نگراں ہو
اے غنچہ لبی! حرف و حکایت کے کھلا پھول
اے کم سخنی! چشمۂ تقریر و بیاں ہو
اک بار دِکھا جا، چراغ آکے مرے خانۂ دل کا
قبل اس کے کہ شعلے کی جگہ صرف دھواں ہو
تو جو آجائے تو پھر جوش کے نزدیک
اک جَو کے برابر بھی نہ جنسِ دو جہاں ہو

ایک آرزو کے بعد دوسری آرزو کا پیدا ہونا اور ہر نئی آرزو کے ساتھ بیان کے جوش اور زور کا بڑھتے جانا اور خیال اور بیان کا ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوجانا اس غزل کی خصوصیتیں ہیں اور یہ خصوصیتیں اپنے دوسرے ہم عصر غزل گویوں کے طرز سے الگ ہٹ کر جوش نے دورِ جدید کی غزل کو دی ہیں۔ اردو غزل کی روایت میں اس احساس کی جڑیں مضبوط کی ہیں کہ خیالات کے زور اور جوش، تصورات کے سیلِ رواں اور اس کے ساتھ ساتھ بیان کی رفعت اور شکوہ کے امتزاج سے بھی ایسی غزل کی تخلیق ہوسکتی ہے، جو پڑھنے والے کو اپنی فضا میں جذب کرلے۔

دوسری غزل کا عنوان ہے "یادکروہ دن"۔ یہاں گذرے ہوئے اچھے دنوں کی یاد اور تصور میں محبوب کو اس طرح شریک کیا جاتا ہے جیسے اس ذکر کو مایوسی اور محرومی کی داستان بنانے کے بجائے مسرتوں اور شادمانیوں کی تجدید کا وسیلہ بنانا مقصود ہے۔ مسرتوں اور شادمانیوں کے اس عہدِ گذشتہ کے بیان میں شاعر کے لئے وہ لذت اور وہ سرور ہے کہ اس احساسِ لذت کی جھنکار لفظوں میں بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ شاعر کے ذہن پر ان یادوں نے نغمے اور رقص کی جو کیفیت پیدا کی ہے وہ لفظوں سے، ترکیبوں سے، مصرعوں

سے، شعروں سے اور ان سب کے مجموعی آہنگ سے پھوٹی پڑتی ہے، اور پڑھنے والا ایک ایسے ماضی کی تصویر دیکھتا ہے جس میں ہر طرف نغمہ ہے، رقص ہے، سرخوشی ہے اور ایک ایسی مسرت کا پیام ہے جو حسن و عشق کی دنیا میں اس نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی ؎

یاد کر وہ دن کہ ہم تھے راز دانِ یک دگر
رازدانِ یک دگر، شرح و بیانِ یک دگر
یاد کر وہ دن کہ ہم تھے دورِ نوشا نوش میں
لحنِ شیریں و شرابِ ارغوانِ ہم دگر
یاد کر وہ دن کہ ہم تھے قربِ کامل کے طفیل
قالبِ یک دیگر و روحِ روانِ یک دگر
یاد کر وہ دن کہ ہم تھے بزمِ فکر و بحث میں
ہم خیال و ہم نوا و ہم زبانِ یک دگر
یاد کر وہ دن کہ ہم تھے عہدِ صلح و جنگ میں
مہربانِ یک دگر، نامہربانِ یک دگر
یاد کر وہ دن کہ ہم تھے شام سے تا صبح گاہ
قصۂ یک دیگر و افسانہ خوانِ یک دگر
یاد کر وہ دن کہ ہم تھے آرزو کی راہ میں
کارِ شوق و گردِ راہِ کاروانِ یک دگر
یاد کر وہ دن، بمرگِ جوش، جب ناز و نیاز
دورِ سوز و ساز میں تھے ترجمانِ یک دگر

یہ یادیں مسرت کے ان لمحوں کی یادیں ہیں جب عاشق نے زندگی کے شب و روز محبوب کی اُن صحبتوں میں گذارے جن میں حسن و عشق کو باہم ہم رازی و ہم زبانی کی لذتیں حاصل تھیں۔ جب دونوں ایک دوسرے کا قالب اور روحِ رواں ہو کر قربِ کامل کی قابلِ رشک زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب لحنِ شیریں اور شرابِ ارغواں سے زندگی ہمہ کیف و ہمہ سرمستی تھی۔ اور جب شوق و آرزو کی راہیں اسی طرح طے ہو رہی تھیں کہ دونوں کی منزل ایک تھی۔ وہ صحبتیں اب باقی نہیں ہیں۔ صرف اُن کی یاد باقی رہ گئی ہے۔ لیکن ان یادوں کے ذکر میں نہ غم کا شائبہ ہے نہ حسرت و مایوسی کا۔ اس بیان میں بھی ایک لطف ہے، ایک لذت ہے اور ایک گم گشتگی و سرشاری ہے۔ اس لئے قاری کا تصور بھی ان یادوں کی جو تصویریں بناتا ہے اُن میں افسردگی کا رنگ نام کو نہیں ہوتا۔ ہر شعر اسے شہرِ آرزو کے ایک نئے گوشے کی سیر کراتا ہے اور اس سیر میں وہ حسن و عشق کے رازوں کا شریک بن کر سرور و انبساط کا وہ سرمایہ حاصل کرتا ہے جو اردو غزل کے قاری کو صرف کبھی کبھی میسر آتا ہے۔

ماضی کی یادوں اور حال کی سرخوشیوں میں جوش نے جو رشتہ قائم کیا ہے اُس کی نوعیت اس رشتے سے بالکل مختلف ہے جو ہماری غزل کی روایت کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہاں ماضی کی یادیں، حسرت و غم کی نہیں، مسرت و شادمانی کی تصویریں ہیں۔ اور اُن کی ہر غزل ان پرکیف و پرنشاط تصویروں کا ایک ایسا نگارخانہ ہے، جہاں ایک تصویر دوسری تصویر کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ شاعر کی

خیال بندی اور تصویر کاری جب اپنا عمل شروع کرتی ہے تو ایک خیال دوسرے خیال کو جنم دیتا ہے۔ اور ایک تصویر سے خود بخود دوسری تصویر کا رنگ ابھرتا ہے۔ اور خیال بندی اور تصویر کاری کے اس متحدہ عمل میں جس طرح آگے آنے والا خیال پچھلے خیال سے موثر اور دل نشیں ہوتا ہے اسی طرح ہر اگلی تصویر پچھلی تصویروں سے زیادہ رنگین اور نظر فریب ہوتی ہے۔ غزل کس طرح تصورات کا یہ نگارخانہ بنتی ہے اور کس طرح اس نگارخانے میں ہر تصویر کا رنگ اور نقش دوسرے سے گہرا اور دوسرے پر فائق ہوتا ہے، اس کے اندازے کے لئے بھی جوش کی ایک مسلسل غزل کا مطالعہ کیجئے۔

پھر مہرباں وہ خسروِ خوباں ہے آج کل
پھر دست شوق و دامن جاناں ہے آج کل
پھر اعتقاد عالم بالا ہے ان دنوں
پھر اعتنائے گردش دوراں ہے آج کل
پھر زلف ناز و روئے درخشاں ہے دام میں
پھر جنس ابر و صاعقہ ارزاں ہے آج کل
ہر ذرہ حقیر ہے فردوس رنگ و بو
ہر دشت بے گیاہ گلستاں ہے آج کل
موج شمیم کاکل جاناں کے فیض سے
پھر بازوؤں پہ دولت پستاں ہے آج کل
ہر فکر پھر ہے فکر الٰہی سے ہم عناں
ہر عزم پھر ارادۂ یزداں ہے آج کل
کیا چیز مل گئی ہے کہ میری نگاہ میں
ہر تاجدار بے سر و ساماں ہے آج کل
پھر جوش بزم عیش میں ہر موجۂ نفس
عمر مسیح و خضر پہ خنداں ہے آج کل

غزل کا یہی مخصوص اسلوب اور انداز ہے جس نے جوش کی غزل کو ایک طرف تو مسرتوں اور شادمانیوں اور بعض اوقات اس سے بھی بڑھ کر سرخوشیوں اور سرمستیوں کا مبلغ بنایا ہے اور دوسری طرف نغمگی لے اور رقص کے آہنگ کو اس کا لازمی عنصر بنایا ہے جوش کی غزل جس پیغام کی علم بردار اور جس مسلک حیات کی مبلغ ہے اس میں نہ غم ماضی ہے نہ اندیشۂ فردا۔ یہاں ہر چیز حال کے لئے ہے، اس لئے کہ حال ہی زندگی کی وہ حقیقت ہے جس کی اصلیت اور صداقت کو کوئی چیز نہیں جھٹلا سکتی۔ افق پر چھا جانے والی گھٹائیں کہ وہ حسن فطرت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بزم طرب میں کھنکنے والے جام کہ ان کی صحبت میں غم بے معنی بن جاتا ہے، اس حیات آفریں پیغام کی محرک بنتی ہیں اور شاعر اونچی سے اونچی لے میں اپنا پیغام دوسروں تک پہونچاتا ہے۔

اٹھی وہ گھٹا، رنگ سامانیاں کر
گہرپاشیاں کر، زرافشانیاں کر

وہ چہکے عنادل، وہ سنکیں ہوائیں
گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر
صراحی جھکا اور دھومیں مچا دے
گلابی اٹھا اور گل افشانیاں کر
مٹا داغِ ہوش اور مدہوش بن جا
اٹھا جامِ زر اور سلطانیاں کر
نگاہوں سے برسا دے ابرِ جوانی
مئے لالہ گوں سے گلستانیاں کر
سمندر پہ چل اور الیاس بن جا
ہواؤں پہ اُڑ اور سلیمانیاں کر
صبا کی طرح کنج میں رقص فرما
بگولوں کے مانند جولانیاں کر
سکوں پاؤں چھونے وہ ہلچل مچا دے
خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر
علم کھول کر جوش یزدانیوں کے
جہاں داریاں کر جہاں بانیاں کر

"جہاں داریوں" اور "جہاں بانیوں" کا یہ پیغام محض خیالی نہیں۔ جوش کے تصور نے ذکرِ ماضی کے سائے میں پروان چڑھنے کے باوجود اسے زندگی کا غم نہیں بننے دیا۔ اور آنے والے زمانے کو "فکرِ فردا" کی خلشوں سے محفوظ و مامون رکھا ہے۔ اور انسان کو حال کی سرخوشیوں سے ہم کنار رکھ کر مستقبل کی راحتوں کی نویدِ جاں فزا سنائی ہے۔ اور اس طرح سنائی ہے کہ ہر شعر کے ساتھ نغمے کی لے، رقص کا آہنگ اور سرخوشی کی کیفیت تیز تر ہوتی جاتی ہے کہ یہی اس شاعرِ حیات کا مسلک۔ اور اس کے شاعرانہ منصب کی اساس ہے ؎

مبارک دیدۂ حیراں! مبارک
بہشتِ جلوۂ جاناں مبارک
شبِ تاریک کی خاموشیوں کو
خروشِ مرغِ خوش الحاں مبارک
وفورِ غم کو عشرت کی بشارت
ہجومِ درد کو درماں مبارک
خمِ محرابِ چشمِ آرزو کو
چراغِ چہرۂ خنداں مبارک
نگاہِ رہروِ راہِ طرب کو

سوادِ کوچۂ جاناں مبارک
ہوائے شامِ غم کی گرمیوں کو
نسیمِ صبحِ گل افشاں مبارک
لبِ امّید کو مَوجِ تبسّم
بہ یُمنِ دیدۂ گریاں مبارک
گدائے رہ نشینِ بے نوا کو
غرورِ صحبتِ سلطاں مبارک
ہوائے بخیۂ زخمِ جگر کو
ادائے جنبشِ مژگاں مبارک
جنابِ جوشؔ کو یہ کامرانی
بہ فیضِ قربِ درویشاں مبارک

بہ حیثیت مجموعی جوشؔ کی غزل کو دو چیزوں کی بدولت ایک منفرد اور امتیازی مقام حاصل ہوا ہے۔ پہلی تو یہ کہ ان کی غزل شروع ہوتی ہے ایک واحد جذبے، احساس یا تجربے کی یاد سے۔ اور یہ واحد جذبہ، احساس اور تجربہ اپنے تخیل کی رنگینی اور پھیلاؤ کے زور سے بے شمار تجربوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور یہ بے شمار تجربے مل کر تصورات کے اس نگار خانے کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں جو ان کی ہر مسلسل غزل کا دوسرا نام ہے۔ دوسری بنیادی خصوصیت جوشؔ کے بیان کا اسلوب ہے جس میں لفظوں اور ترکیبوں کے شکوہ سے تخیل کی بنائی ہوئی تصویر میں رنگ بھرا جاتا ہے۔ اس اسلوب کی بنیاد سر تا سر تکلف پر ہے، لیکن اس تکلف میں آورد کا شائبہ تک نہیں۔ اس تکلف اور تصنع کے باوجود نہ بیان کے زور میں کمی آتی ہے اور نہ اس کی روانی کا سیلاب تھمتا ہے۔ اس پر تکلف اسلوب کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ خیال کی ندرت اور وسعت سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اور دوسری یہ کہ اس سے ترنم، نغمگی اور نشاط کی ایک ایسی مجموعی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ پڑھنے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ غزل کا بہترین اسلوب یہی ہے جوشؔ کی غزل میں تخیل کا پیدا کیا ہوا شاعرانہ تجربہ شخصی تجربے پر اس طرح حاوی ہے کہ سادگی کے بجائے رنگینی، بے تکلفی کے بجائے تکلف اور تصنع اور نرمی اور دھیمے پن کے بجائے زور اور جوش اس کے شاعرانہ مزاج کی بنیادی خصوصیت بن گئی ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح خیال کی مسلسل رو اکثر شاعر کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اسی طرح بیان کا زور بھی اس طرح اس پر قابو پا لیتا ہے کہ وہ بے اختیار اور بے بس ہو کر اس وقت تک اس کے ساتھ چلتا رہتا ہے جب تک طبیعت میں پیدا ہونے والے جوش میں خود بخود ٹھیراؤ نہ آ جائے۔

جوشؔ نے غزل کو ایک نئی طرح کے تخیل سے جس پر مسرت و سرخوشی چھائی ہوئی ہے اور ایک نئی طرح کے پر شکوہ اسلوب سے جو اس ولولہ انگیز تخیل سے پوری ہم آہنگی رکھتا ہے، آشنا کیا ہے۔ انہوں نے ایسی غزل کہی ہے جو درد دل کی کسک کی مصور ہونے کے بجائے ذہنی نشاط کی علم بردار اور اس نشاط کی پیامبر اور مبلغ ہے۔ یہاں ایسا تکلف اور تصنع ہے جو اکثر جگہ ولولہ انگیز اور نشاط آفریں ہونے کے باوجود کہیں کہیں فطرت کے اس رنگ سادہ سے عاری ہے جسے غزل کی اور شاعری کی جان سمجھا جاتا ہے — لیکن ان بنیادی اور بعض حیثیتوں سے امتیازی خصوصیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی غزل میں وہ ساری کیفیتیں موجود ہیں جو ہماری غزل کی

روایت کا لازمی حصہ بن گئی ہیں۔

غزل خواہ میر کی ہو، خواہ درد، مصحفی، آتش، ناسخ، جرأت، مومن، غالب، حالی، داغ، حسرت، اقبال، فانی، اصغر، جگر، فراق اور فیض کی شاعروں کے انفرادی مزاج اور طرز کی نمائندگی کرنے کے علاوہ جس کیفیت میں مشترک ہے، اسے ہم نے تغزل کا نام دیا ہے اور خیال، جذبے اور بیان کی بعض جمالیاتی خصوصیتوں کو اس کی اساس کہا گیا ہے۔ کوئی غزل گو اپنے رنگ خاص کے اعتبار سے خواہ دوسرے شاعر سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو، اس کی غزل میں اگر تغزل کی یہ شان موجود نہ ہو تو ہم اسے غزل گو اور بعض صورتوں میں شاعر کہنے میں بھی تکلف محسوس کرتے ہیں۔ جوش کی غزل کا مزاج جیسا کہ ہم نے دیکھا نظم اور قصیدے کا مزاج ہے اور اس کا خیال اور بیان دونوں پوری طرح ایسے دلکش اور دل نشین تغزل کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں لیکن تغزل کا دام ایسا دام ہے کہ جوش بار بار جیسے بے اختیاری کے عالم میں اس کے اسیر بنتے ہیں۔ اور ان پر یہ بے اختیاری طاری ہوتی ہے تو ان کی پر تکلف غزل میں بھی وہی ساری کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو ہر زمانے میں اچھی غزل کا امتیاز سمجھی گئی ہیں۔ اور جس امتیاز کی بدولت کہنے والے کے دل کی خلش سننے اور پڑھنے والے کے دل کی خلش بنتی رہی ہے۔

جوش کے چند اس طرح کے شعر سنئے ؎

تھیں جس کی رو سے خون تمنا میں سرخیاں
رخسار سے وہ رنگ وفا کون لے گیا؟
راتوں کو مانگتا تھا دعا میری دید کی
وہ منتیں، وہ ذوق دعا کون لے گیا؟
پہلی سی وہ کلام میں نرمی نہیں رہی
گفتار سے مزاج صبا کون لے گیا؟

دل پہ گذر چکی ہیں ہزاروں قیامتیں
اب مسکرا کے وعدۂ فردا نہ کیجئے

وہ بات بات میں جھکانے کا سا نیا کمال تھا
نظر جھکا کے وہ تاخیر [illegible] ترا
وہ تیری زلف سے [illegible]
وہ اپنی سانس کی خوشبو سے پیچ و تاب ترا
مژہ کی طرح جھپکتا ہوا وہ میرا سوال
وہ دل کی طرح دھڑکتا ہوا جواب ترا

حال ابتر ہوا محبت کا
ہم سے آنے لگا ہے ان کو حجاب

کل جو آئے وہ عیادت کو مری
سوچ کر کچھ جی میں پچھتائے بہت

اُن کی صرف اک نگاہ کی خاطر
بیچ دی ہم نے عشرتِ اجداد
جی کڑا کر کے حالِ دل اُن سے
اب تو کہتے ہیں ہر چہ بادا باد
ہم بھی آخر خدا کے بندے ہیں
کوئی حد بھی ہے او ستم ایجاد؟

اُن کی رفتار نے زمانے میں
ایسے فتنے جگائے ہیں کہ نہ پوچھ
صرف اک حسرتِ تبسّم میں
اتنے آنسو بہائے ہیں کہ نہ پوچھ
حسن کافر نے اپنے قدموں پر
اتنے مومن جھکائے ہیں کہ نہ پوچھ

نقاب اٹھتی نہیں چہرے سے اُن کی
مجھے اٹھنا پڑے گا درمیاں سے
وہ اک پل جو ترے پہلو میں گذرے
گراں قیمت ہے عمرِ جاوداں سے

خلافِ مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں مگر ناصح
وہ آتے ہیں تو چہرے پر تغیر آ ہی جاتا ہے

قدرت کو خود ہے حُسن کے الفاظ کا لحاظ
ایفا بھی ہو ہی جائے گا پیماں تو کیجیے
تا چند رسمِ جامہ دری کی حکایتیں
تکلیفِ یک تبسّمِ پنہاں تو کیجیے

کتنی حقیقتوں سے فزوں تر ہے وہ فریب
دل کی زباں میں وعدۂ فردا کہیں جسے

ممکن نہیں کہ مل کر رسماً ہی مسکرا دو
تم کو تو جیسے ہم سے نفرت سی ہو گئی ہے
وہ اب کہاں ہیں لیکن، اے ہمنشیں! یہاں تو
مڑ مڑ کے دیکھنے کی عادت سی ہو گئی ہے

بارے اب ظلم پر تو مائل ہو
ورنہ تم سے امید ہی کیا تھی
رحم، اُس عہد کے تصدق میں
جب تمہیں خود مری تمنا تھی

غزل کے ان شعروں میں سے بعض کے مضامین غزل کے عام فرسودہ مضامین ہیں لیکن متغزلانہ بیان نے اُن میں ایک نئی کیفیت پیدا کر دی ہے، بعض ایسے ہیں جن میں شخصی تجربے کی ایک ہلکی جھلک نمایاں ہے اور بعض ایسے ہیں جن میں خیال کا میلان ایسے حسرت و غم کی طرف ہے جس میں سوز اور تڑپ تو نہیں لیکن دبی دبی سی ایک کسک ضرور ہے۔ البتہ یہ کسک ان شعروں میں زیادہ ابھری ہوئی دکھائی دیتی ہے جہاں شاعر نے خیال کی دنیا سے نکل کر جذبے کی دنیا میں قدم رکھا ہے اور شعر کا موضوع کسی ایسی بات کو بنایا ہے جس میں اپنے مشاہدے یا تجربے کی سچائی اور اپنے احساس کی تڑپ شامل کی ہے۔ یہ مشاہدات و تجربات دنیائے حسن و عشق کے بھی ہیں اور اس کاروباری دنیا کے بھی جس میں خود غرضی، خود پسندی اور خود ستائی کی قدریں ایثار، محبت اور خدمت گذاری کی قدروں پر غالب ہیں۔

جوش نے اپنی غزل میں جب اس طرح کے مضامین نظم کئے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد اپنے جذبۂ غم کا اظہار ہے انہوں نے بات اپنے مخاطب کو سنانے کے لئے نہیں، بلکہ اپنے دل افسردہ کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کہی ہے۔ اس اظہار کا انداز ارادی نہیں اضطراری ہے۔ اس لئے اس میں اس تکلف کا شائبہ تک نہیں جو اس کے باوجود کہ جوش کی ثروت خیال اور قدرت بیان سے ذہنی انبساط کا سرمایہ بن گیا ہے، بہر حال تکلف ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ دل میں اپنی جگہ بناتے ہیں۔ اور انہیں پڑھ کر پہلی مرتبہ جوش کی غزل کا قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے محبوب شاعر نے بات اس کی سطح پر آ کر کہی ہے۔ اب اس طرح کے چند شعر سن لیجئے ؂

وہ غریب دل کو سبق ملے کہ خوشی کے نام سے ڈر گیا
کبھی ہنس کے تم نے جو بات کی تو ہمارا چہرہ اُتر گیا

سب سے پہلے اُس جفا پرور کا آتا ہے خیال
دفعتاً وقتِ سحر اے جوش بیداری کے بعد

آڑے آیا نہ کوئی مشکل میں
مشورے دے کے ہٹ گئے احباب
کیا قیامت تھی صبر کی تلقین
اور بھی روح ہو گئی بے تاب

ہم سے آرام کی تمنا ہیں
اتنے صدمے اٹھائے ہیں کہ نہ پوچھو

قدم انساں کا راہ دہر میں تھرا ہی جاتا ہے
چلے کتنا ہی کوئی بچ کے ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے
نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا پھر بھی
ہجوم کشمکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے
شکایت کیوں اسے کہتے ہو یہ فطرت ہے انساں کی
مصیبت میں خیال عیش رفتہ آ ہی جاتا ہے
شگوفوں پر بھی آتی ہیں بلائیں یوں تو کہنے کو
مگر جو پھول بن جاتا ہے وہ کمھلا ہی جاتا ہے
سمجھتی ہیں مآل گل مگر کیا زور فطرت ہے
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

شخصی تجربے اور ذاتی احساس کی ان کیفیتوں میں یہ ٹیکہ دردی جو کسک ہے وہ بعض موقعوں پر ایک مستقل خلش اور چبھن کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور شعر خیال اور بیان دونوں کے نقطۂ نظر سے درد کی ایک ایسی تصویر بن جاتا ہے جس کے نظارے سے آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ جوش نے جہاں کہیں عہد رفتہ کی ان راحتوں اور لذتوں کو یاد کیا ہے جو کبھی اُن کا مقسوم تھیں، وہاں سچ مچ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل رو رہا ہے، اور ایسے موقعوں پر ان کا شعر درد کے سانچے میں ڈھل کر پڑھنے والوں کے سامنے آتا ہے۔ یہاں خیال اور بیان دونوں کا تکلف اور شکوہ رخصت ہو جاتا ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ درد و غم سے بھری ہوئی یہ یادیں شاعر کی زندگی کا حاصل ہیں، اور شعر چونکہ ان یادوں کا پیکر ہے اس لئے اسے بھی ایک نہ مٹنے والے نقش کا رتبہ ملا ہے۔ اب اس طرح کے چند شعر سنئے ؎

مطرب! بربط ہاتھ سے رکھ دے، ماضی نے در کھول دیا
نشتر یاد کہ چبھ کر ٹوٹ گیا، پھر کانٹا سا ارمانوں کا

اے چڑیو! صبح کی بے دردو! رحم رحم
یاد دلواتی ہو یہ کس کی خوش الحانی مجھے

نہ جانے کتنی رنگیں صحبتیں ہیں میری نظروں میں
بس اے مطرب! مری آنکھوں میں آنسو آئے جاتے ہیں

بزمِ عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں
کوئی بھولی ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے

نغموں کو تیز کردے ہاں اے جواں مغنی
وہ آ رہا ہے واپس گذرا ہوا زمانہ

جوش کی غزل میں یہ شخصی رنگ اور بھی طرح طرح سے اپنے جلوے دکھاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے مضمون کے شروع میں عرض کیا تھا نغمۂ تغزل سے "رسم و رہِ آرزو کو تازہ کرنا" جوش کے شاعرانہ مسلک کی بنیادوں میں سے ایک ہے۔ اس رسم و رہِ آرزو کو جوش نے رُخِ محبوب، رنگینیٔ فطرت اور مستیٔ بادہ کے ذکر سے زندہ کیا ہے۔ اور ان کی غزل کے مضامین انہیں تینوں چیزوں کے محور پر گردش کرتے ہیں — کہیں ذکر ایک چیز کا ہے اور کہیں دو چیزوں یا تینوں کا تذکرہ ایک ساتھ آتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی اگر ان کے ذکر یا ان کی ہم نشینی میں بسر نہیں ہوتی تو ادھوری اور بے کیف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوش جب ان چیزوں کو اپنے شعر کا موضوع بناتے ہیں تو ان پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ ساری دنیا کو اپنے اس کیف آور اور وجد آفریں تجربے میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کی غزل کی اس خصوصیت کے اندازے کے لئے اُن بے شمار شعروں کو چھوڑ کر جو اُن کی ہر غزل میں موجود ہیں اُن کی ایک غزل پر نظر ڈالئے جس کا پورا آہنگ یہی کیف، یہی وجد، یہی مستی اور یہی سرشاری ہے ؎

وقتِ سحر ہے آؤ حریفو! وضو کریں
مینا اُٹھائیں خدمتِ جام و سبو کریں
لو کھل گیا وہ پرچمِ خورشیدِ زرنگار
اٹھو کہ وا دریچۂ بہار رنگ و بو کریں
طائر خروش میں ہیں، صبا گرمِ اختلاط
آؤ حریمِ کیف میں پھر ہاؤ ہو کریں
مستانہ وار جیبِ جوانی کے چاک میں
پھر رشتۂ شرابِ کہن سے رفو کریں
پھر روئے خوش نگار کی دہرائیں داستاں
حسن و جمالِ یار کی پھر گفتگو کریں
ملبوسِ زندگانی و رختِ حیات کو
صہبا کی نرم آنچ سے پھر شست و شو کریں
آؤ بنائیں یار کو پھر صدرِ انجمن

آئینہ آفتاب کے پھر روبرو کریں
ہلائے کیف دوش کا مرجھا چلا ہے ہالہ
پھر تازہ پھول گوندھ کے زیبِ گلو کریں
پھر دعا زمانہ اٹھائے ہوئے ہے ہاتھ
یارو اٹھو کہ بیعتِ دستِ سبو کریں
پھر آؤ، دل کا جوش کے نغموں سے درس لیں
پھر آؤ تازہ رسمِ درہِ آرزو کریں

جوش کی غزل میں جوش و سرمستی اور وجد و کیف کا سرچشمہ بھی یہی تین چیزیں اور ان کے متعلقات ہیں۔ اور درد و غم کی کسک بھی انہیں کے ذرے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور غم جاناں سے ہٹ کر غم دوراں کا ذکر اگر کبھی اُن کی غزل میں جگہ پاتا ہے تو اُن کا دل یہی چاہتا ہے کہ یہ ذکر بھی حلقۂ گیسو میں اسیر، بادۂ گلو ان میں غرق اور خورشید جہاں تاب کی آویزش میں مصروف ہو کر سامنے آئے۔ یہ بات بھی اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ جوش نے حسن و عشق، مظاہر فطرت اور بادہ و جام سے ایک شخصی اور ذاتی رشتہ قائم کیا ہے۔ ان تینوں رشتوں میں وہ خلوص اور وفاداری کی ہر لازمی شرط کے پورا کرنے کو اپنا دین و ایمان سمجھتے ہیں۔ اور اس خلوص اور وفاداری کی پیدا کی ہوئی دینداری کا تقاضا یہی ہے کہ جب کبھی فکر دنیا اور غم عقبیٰ انہیں آ کر گھیرے تو وہ زندگی کے انہیں تین گوشوں میں پناہ لیں جن سے ان کے نزدیک زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔ جوش کی غزل کی اس خصوصیت کا اندازہ بھی ان کے متفرق اور منتشر شعروں کے بجائے اُن کی ایک ایسی غزل سے کیجئے جو بہ حیثیت مجموعی اُن کے اسلوب کے اس رنگِ خاص کی مظہر اور ترجمان ہے:

فکر ہی ٹھہری تو دل کو فکرِ خوباں کیوں نہ ہو؟
خاک ہونا ہے تو خاکِ کوئے جاناں کیوں نہ ہو؟
دہر میں اے خواجہ! ٹھہری جب اسیری ناگزیر
دل اسیرِ حلقۂ گیسوئے پیچاں کیوں نہ ہو؟
زیست ہے جب مستقل آوارہ گردی ہی کا نام
عقل والو! پھر طوافِ کوئے جاناں کیوں نہ ہو؟
اک نہ اک ہنگامے پر موقوف ہے جب زندگی
مے کدے میں رند رقصاں و غزل خواں کیوں نہ ہو؟
جب خوش و ناخوش کسی کے ہاتھ میں دینا ہے ہاتھ
ہم نشیں! پھر بیعتِ جامِ زر افشاں کیوں نہ ہو؟
اک نہ اک رفعت کے آگے سجدہ لازم ہے تو پھر
آدمی محوِ سجودِ سرو خوباں کیوں نہ ہو؟
اک نہ اک پھندے ہی میں پھنسنا ہے جب انسان کو
دوش پر دامِ سیاہ سنبلستاں کیوں نہ ہو؟

جب فریبوں ہی میں رہنا ہے تو اے اہلِ خرد!
لذتِ پیمانِ یارِ شکستِ پیماں کیوں نہ ہو؟
یاں جب آویزش ہی ٹھہری ہے تو ذرّے چھوڑ کر
آدمی خورشید سے دست و گریباں کیوں نہ ہو؟
اک نہ اک ظلمت سے جب وابستہ رہنا ہے تو جوش
زندگی پر سایۂ زلفِ پریشاں کیوں نہ ہو؟

غزل کا ایک عام مضمون عبد اور معبود کا رشتہ ہے۔ لیکن اس رشتے کی نوعیت سب شاعروں کے کلام میں ایک سی نہیں۔ شاعر کے مزاج کی مخصوص انفرادی کیفیتیں اس رشتے کے ذکر اور بیان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ جوش نے بھی غزل کے اسی عام مضمون کو اپنایا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ بعض جگہ اس رشتے سے تعلق رکھنے والے مضامین پر اسی تکلف اور آورد کا عکس ہے جس نے اُن کی غزل میں غزل کا رچا ہوا رنگ پیدا نہیں ہونے دیا، لیکن جہاں کہیں اس مضمون کے اظہار میں شاعر کی شخصیت کا وہ انفرادی رنگ، جسے ہم اس کی انا کہہ سکتے ہیں، شامل ہو گیا ہے شعر غزل کا مکمل شعر بن گیا ہے۔

پہلے چند ایسے شعر سنئے جو غزل کے رچاؤ سے یکسر خالی ہیں ؎

مرے خدا نے مرے سب گناہ بخش دیے
کسی کا رات کو یوں میں نے انتظار کیا

یہ میرا ذوقِ بادہ کشی اور یہ تشنگی
معبود! تیری شانِ کریمی کو کیا ہوا؟

کشتیِ مے کو اے خدائے صبوح
بخش دے قسمتِ سفینۂ نوح
آج آئے نہ مے پر اے معبود
تیرے بندے ہیں خستہ و مجروح

مجھے حقیقت سے آشنا کر دلوں کو تسکین دینے والے
ہر ایک کانٹے کو زندگی کے مری نظر میں گلاب کر دے
کھلے ہوئے ہیں فلک پہ تارے، بجھے ہیں تم اُن کی سادگی کی
مری شبِ تار کو بھی یا رب! کبھی شبِ ماہتاب کر دے

معبود! طلب کر لے قدرت کے مناظر کو
کافر ہوں اگر خود سے کی ہو کبھی مے خواری

آواز دو کہ جوشؔ بہ فیضِ شرابِ ناب
ساقی کی مرحمت کا سزاوار ہو گیا

اب وہ شعر سنئے جنہیں احساس کے خلوص اور بیان کی بے تکلفی نے اُن شعروں کا رتبہ دیا ہے جنہیں پڑھنے والا بار بار پڑھتا اور وجد کرتا ہے۔ اور جنہیں زمانہ مٹانا بھی چاہے تو نہیں مٹا سکتا۔ ایسے شعر جوشؔ کی غزلوں میں پر تکلف شعروں کے مقابلے میں نسبتاً کم ہیں لیکن وہ اپنی تاثیر کے اعتبار سے ایسے ہیں کہ ان پر سیکڑوں شعر قربان کئے جا سکتے ہیں ؎

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

نظمِ عبودیت پڑھی ہیں نے کچھ ایسے لحن سے
ہنس کے رباب اٹھا لیا نغمہ زنِ الست نے

فن کے جس خلوص کے مظہر یہ تین شعر ہیں اُن کی تعداد جوشؔ کی غزل میں ان شعروں کے مقابلے میں جن پر خیال اور بیان دونوں کا تکلف چھایا ہوا ہے، نسبتاً کم ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوشؔ کی غزل گوئی کا صحیح رنگ انہیں کم تر شعروں میں نکھر کر ہمارے سامنے آتا ہے اور انہیں کی بدولت جوشؔ کی غزل تخیل و تفکر کے تکلف اور تصنع اور خیال کے اس تکلف و تصنع کے پیدا کئے ہوئے بھاری بھرکم اور پرشکوہ بیان کے بجائے جذبے کی صداقت اور بیان کی بے تکلفی کے وہ نمونے پیش کرتی ہے کہ ہم انہیں اعلیٰ درجے کا غزل گو تسلیم کرتے ہیں۔ جوشؔ کی اکثر غزلوں میں یہ دونوں کیفیتیں ملی جلی ملتی ہیں، اور بعض اوقات یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جس شاعر کے تخیل میں اتنا زور، مضامین میں جدت کی اتنی کثرت اور فراوانی اور بیان کی اتنی قدرت ہے اس نے کبھی کبھی ایسے شعر کیوں کہے ہیں جن میں مضامین کی عام فرسودگی کے علاوہ اظہار و بیان کی ثقالت بھی ہے، اور لفظوں اور ترکیبوں کے استعمال میں حد درجے کی بے احتیاطی بھی۔ اور سب سے عجیب بات یہ کہ خیال اور بیان دونوں کے لحاظ سے لذت اور تغزل کے رچاؤ کی کمی بھی۔ لیکن اس کی تلافی ان شعروں سے ہو جاتی ہے جو سادگیٔ بیان کی مروجہ اور پسندیدہ روایت سے خالی ہونے کے باوجود بلاشبہ شاعرانہ حسن اور تاثیر کے ایسے نمونے ہیں جنہیں منتخب اشعار کی کسی بیاض میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات مختلف طرح کے اشعار میں پڑھنے والے کو کس کس حسن کے ساتھ ملتی ہے اس کی مثالیں مختلف موقعوں پر دی گئیں۔ اب اس ذکر کو جوشؔ کی دو غزلوں پر ختم کرتا ہوں جو میرے نزدیک جوشؔ کے طرزِ غزل کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔ اور جنہیں جوشؔ کے شاعرانہ خلوص نے زبان زدِ خاص و عام بنایا ہے۔ پہلی غزل سنہ ۱۹۲۱ء کی کہی ہوئی ہے اور دوسری سنہ ۱۹۲۶ء کی۔

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا　　جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا
وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ　　جن کو تیری نگہِ لطف نے برباد کیا
دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا　　جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا

اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد　　اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا

اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی　　جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا

میری ہر سانس ہے اس بات کی شاہد اے موت　　میں نے ہر لطف کے موقع پہ تجھے یاد کیا

مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید　　لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

کچھ نہیں اس کے سوا جوش حریفوں کا کلام
وصل نے شاد کیا، ہجر نے ناشاد کیا

اب دوسری غزل ـــ

جہنم سر د ہے، جنّت کے در کھلوائے جاتے ہیں
سر محشر پیاری حسن کے بلوائے جاتے ہیں

غضب ہے یہ ادا اُن کی دم آرائش گیسو
جھکی جاتی ہیں آنکھیں خود بخود شرمائے جاتے ہیں

سحر کی ضو، شفق کی سرخیاں، برسات کے بادل
مجھے ہمراز پا کر یہ مناظر کھائے جاتے ہیں

نہ جانے کتنی رنگیں تعبیتیں ہیں میری نظروں میں
بس اے مطرب! مری آنکھوں میں آنسو آئے جاتے ہیں

شب وعدہ یہ کیسی تیرگی ہے؟ دقت کیا ہوگا؟
تمناؤں کے غنچے ہم نفس! کمہلائے جاتے ہیں

کوئی حد ہی نہیں اس احترام آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں!

بہت ہی خوش ہوا اے ہم نشیں! کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

ان دو غزلوں میں تغزل کا جو رچا ہوا لہجہ ہے وہ جوش نے اردو غزل کو دیا ہے۔ یہاں حقیقی اور خیالی تجربوں کی جو آمیزش اور بعض صورتوں میں خیالی تجربات کا حقیقی تجربات پر جو غلبہ ہے وہ بھی موجودہ دور کی غزل میں جوش کا داخل کیا ہوا ہے۔ غزل میں نظم کا آغاز، ارتقا، اُبھار اور مجموعی آہنگ اور اس آہنگ سے مطابقت رکھنے والا ایک خاص طرح کا اسلوب جوش ہی کی غزل کی خصوصیت اور انفرادیت ہے۔ آورد اور تکلف میں آمد کی شان بھی غزل کے مزاج کی ایک اور خصوصیت ہے۔ یہاں محبوب فطرت اور ساقی، اور ان تینوں کے متعلقات غزل کا خاص موضوع ہیں اور ان موضوعات سے شاعر کو قلبی اور قلبی سے زیادہ ذہنی لگاؤ ہے۔ اور اسی ذہنی لگاؤ کا نتیجہ ہے کہ اس غزل پر بہ حیثیت مجموعی نشاط کا رنگ چھایا ہوا ہے اور غزل کے ایک خاص طرح کے مذاق کی عادت رکھنے والا قاری پہلی مرتبہ اس بات کا قائل ہوتا ہے کہ غم کے ذکر اور درد کی کسک کے بغیر بھی غزل غزل بن سکتی ہے ـــ یہ جوش کی غزل کا ایک اور امتیاز ہے۔

معاصرین اور مبصرین کی نظر میں!

ریڈیو پاکستان راولپنڈی

(علی سجاد مہر اکبر آبادی)

جوش نمبر کے اشاریہ میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ یہ صرف جناب جوش کی تعریف و توصیف پر مشتمل نہیں بلکہ اس میں اُن پر کڑی تنقید بھی ہے۔ کیوں کہ اس نمبر میں جہاں جوش کے مداحوں نے اُن کے اوصاف اُجاگر کئے ہیں، وہاں اُن سے اختلاف رکھنے والے حضرات نے ان کے قول اور فعل دونوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ یہ بات بجائے خود قابل قدر ہے، اس لئے کہ صحیح تصویر پیش کرنے کے لئے خدو خال کی تمام جزئیات پیش نظر رہنا بہت ضروری ہیں، اور سیرت نگاری یا خاکہ نگاری اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ تصویر کے دونوں رُخ پیش نہ کئے جائیں۔

جناب جوش نے "جوش نمبر" کی اشاعت کو "خطرناک اقدام" قرار دیا ہے۔ اس موقع پر اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا ہے کہ اُن کے خیال میں جوش نمبر نکال کر صہبا صاحب ان کی بھولی بھالی قوم میں محبت کا بیج تو نہ بو سکیں گے البتہ بیٹھے بٹھائے ہزاروں آدمیوں کو اپنا دشمن بنا لیں گے، اور اس کے ساتھ اپنے چند دوستوں کی رفاقت سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ "جوش صاحب کی اس تحریر سے ظاہر ہے کہ وہ خود کو متنازعہ شخصیت سمجھتے ہیں اور شخصیت کے متنازعہ ہونے میں جو تنوع اور ہمہ گیری ہے اس کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جو دوستوں اور دشمنوں دونوں کو عزیز رکھتا ہو، مگر خود قوم اجتناب سے ساقط۔

جوش نمبر میں جوش کی تاریخ پیدائش، ان کی مختصر سوانح حیات، ان کے اب و جد کا ذکر اور تعاون اور خود ان کی اور ان کے خاندان و احباب کی مختلف تصویریں ہیں۔ اس کے بعد "تذکیات" کے عنوان سے ایک طویل فہرست ان مضامین کی دی گئی ہے جو اب تک جوش پر مختلف حضرات نے لکھے اور شائع ہوئے۔ یہ فہرست جوش پر کام کرنے والوں کے لئے ہمیشہ ممد و معاون ثابت ہوگی۔

جوش نمبر کا ابتدائی حصہ جوش کے خطوں پر مشتمل ہے۔ ان خطوں سے نہ صرف جوش صاحب کے طرز تحریر کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کی سیرت کے خدو خال بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ بقول احتشام صاحب جوش کی شخصیت ان کے شاعرانہ انداز نظر کی طرح پیچ و خم رکھتی ہے۔۔۔۔ اُن کے اشعار کے نقاب میں چھپ جاتی ہے تو گفتگو میں ظاہر ہوتی ہے۔

جوش کے ۱۱۰ مکتوبات کے بعد ان کی شخصیت پر پروفیسر احتشام، ڈاکٹر عبادت بریلوی، تمکین کاظمی، شاہد احمد دہلوی، محمود علی خاں جامعی، ماہر القادری، سلام مچھلی شہری، اور جمیل جالبی وغیرہ کے مضامین ہیں۔ ان مضامین میں اُن کی دنیا داری، اعالی ظرفی، اصول پسندی، انسان دوستی اور دوسرے شعرائے تعلقات اور لطیفے شامل ہیں۔ ان مضامین میں پروفیسر احتشام کا مضمون "جوش، ایک تعارفی مطالعہ" جس قدر وقیع و جامع ہے سلام مچھلی شہری کا مضمون اسی قدر مختصر اور تشنہ ہے۔ احتشام صاحب نے جوش کی شخصیت کے ارتقا پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور ضمناً اُن کی شاعری پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ ان کے بقول: جوش کی شاعری اُن کے ذہنی ارتقاء کا آئینہ ہے۔ ان کی ذہنی کشمکش فکری واماندگی، تصور پرستی، سماجی عقائد، ہر ایک کی جھلک اُن کی ہزار ہا نظموں میں بکھری پڑی ہے۔ اُن کی شخصیت میں جو مزاجی بانکپن ہے وہ روایت اور بغاوت کی کشمکش سے پیدا ہوا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے مضمون میں جوش کی شخصیت کے چند اہم پہلوؤں کی طرف بڑے لطیف اشارے کئے ہیں اور جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ یہ کہ جوش صاحب کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ وہ کسی بات کو چھپاتے نہیں۔ جوش صاحب کو منافقت سے نفرت ہے، اور وہ ریاکاری سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔

تمکین کاظمی نے جوش صاحب کے حیدرآباد کی زندگی کے واقعات و حالات، اور جمیل جالبی نے جوش کے لطیفے بیان کئے ہیں ہر دو مضامین جوش صاحب کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کو ابھارنے میں مدد دیتے ہیں —— ان مضامین کے بعد جوش کے پہلے مجموعۂ کلام "روحِ ادب" پر حضرت اکبر الہ آبادی کی رائے، اور سشتر لکھنوی کا تبصرہ شامل ہے، جسے روحِ ادب کے سنہ ۱۹۲۰ء کے ایڈیشن سے نقل کیا گیا ہے۔

مضامین کے بعد تقریباً دو سو صفحات، جوش کے کلام کے انتخاب کے لئے وقف ہیں جس میں اُن کی تین نئی نظمیں "کُل یدنی" "آگ" اور "لافانی حروف" شامل ہیں۔ اس کے بعد تیس بتیس صفحات پر ان کے نثری نمونے ہیں جس میں ان کے اپنے کلام پر دیباچے اور ادبی و شخصی موضوعات پر مضامین وغیرہ ہیں۔

انتخاب کے بعد متعدد اہل قلم نے جوش کے فکر و فن پر مضامین سپرد قلم کئے ہیں جن میں مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر محمد حسن، نریش کمار شاد، اثر لکھنوی، اور ل احمد اکبر آبادی کے مضامین دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔ ان مضامین میں تعریف کا عنصر یقیناً غالب ہے مگر یہ ضرور ہے کہ جوابات بھی لکھی گئی ہے سلیقے اور قرینے سے برجستہ جستہ چبھتے ہوئے فقرے کہی ہیں۔

نثری مضامین کے بعد جمیل مظہری، رئیس امروہوی، اور قمر ہاشمی وغیرہ نے اپنی منظومات میں جوش کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے —— خراجِ تحسین کے بعد ملک کے مقتدر حضرات کے پیغامات و تاثرات ہیں جن میں سید ہاشم رضا، ممتاز حسن، مولانا عبدالماجد دریا بادی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور مولانا رازق الخیری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

پیغامات کے بعد سب سے آخر میں ان حضرات کے تاثرات بھی شامل ہیں جنہوں نے مضامین نہ لکھ کر مختصر ... جوش پر مختصراً اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ان میں فراق گورکھپوری، سجاد ظہیر، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، نجم آفندی، شوکت تھانوی ... اور پروفیسر وقار عظیم شامل ہیں۔ (۱۳ دسمبر ۱۹۶۱ء کو نشر ہوا)

نیرنگِ خیال۔ لاہور

ہمارے ہاں مُردہ پرستی کی روایات تو خاصی شاندار ہیں۔ مگر زندوں کی ہم لوگ کم ہی قدر کیا کرتے ہیں۔ ... ورغالب ہوں ...

یا میراجی، یہاں فن کار کو فن کی داد لینے کے لئے جان دینا پڑتی ہے۔ آج سے ربع صدی پیشتر "نیرنگِ خیال" نے علامہ اقبال کی زندگی میں "اقبال نمبر" شائع کر کے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی تھی۔ مگر یہ روایت پنپ نہ سکی۔ منٹو بیچارے خود "منٹو نمبر" ترتیب دیتے مختلف جریدوں کے دروازے کھٹکھٹاتے رہے۔ مگر "منٹو نمبر" نکلوانے کے لئے انہیں بھی مرنا پڑا۔ اُن کی موت کے بعد ایک چھوڑ کئی منٹو نمبر نکلے۔ جناب صہبا لکھنوی لائقِ صد مبارک باد ہیں کہ انہوں نے زندوں کی قدر کرنے کی روایت کا احیاء کیا ہے۔ لعد جوش ملیح آبادی کے فن اور شخصیت پر لے بہا مواد اکٹھا کر کے اسے ایک ضخیم اور حسین نمبر کی صورت میں پیش کیا ہے۔

جوش صاحب متنازعہ فیہ شخصیت ہیں۔ بعض لوگ انہیں اس صدی کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں اور بعض کے نزدیک اُن کے کلام میں الفاظ ہی الفاظ ہیں مغز نہیں۔ میرے خیال میں جوش صاحب سے ناپسندیدگی کی وجوہ فن سے زیادہ شخصی ہیں۔ جوش صاحب کی خود پسندی اور اپنے معتقدات کا علانیہ اظہار ان وجوہ میں سے نمایاں ہیں۔ (جوش نمبر کے دیباچے میں بھی جوش صاحب خود کو کانا تسلیم کرتے ہیں مگر باقی سب کو اندھا کہنے کے بعد) ان تمام باتوں کے باوجود اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ جوش موجودہ دور کے بڑے شعراء میں سے ہیں اور انہوں نے شعر و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔

جوش نمبر میں جوش کے فن اور شخصیت کے ہر گوشے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور کسی لحاظ سے تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ جوش کی شخصیت کے بارے میں سید اختشام حسین، عبادت بریلوی، تمکین کاظمی، اور شاہد احمد دہلوی جیسے مشاہیر کے مشاہدے اور مطالعے شامل ہیں اور جوش کے فن کے بارے میں مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر محمد حسن، اثر لکھنوی، اور مصطفیٰ زیدی نے لکھا ہے۔ نمبر میں جوش صاحب کے کلام کے انتخاب کے علاوہ اُن کی چند نئی اور غیر مطبوعہ تخلیقات بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ جوش صاحب کی اور اُن کے خاندان کی چند نادر تصاویر بھی پیش کی گئی ہیں۔ یہ نمبر جوش صاحب کے مداحوں کے لئے تو ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے مگر جوش صاحب کے مخالفین کے لئے بھی اس کا مطالعہ باعثِ دلچسپی ہوگا۔

ساقی کراچی

حضرت صہبا لکھنوی سترہ اٹھارہ سال سے ادبی ماہنامہ "افکار" شائع کر رہے ہیں۔ نامساعد حالات میں پرچے کا جاری رکھنا اور وقت پر شائع کرنا بڑے حوصلے کی بات ہے۔ صہبا صاحب "افکار" کے متعدد و متنوع خاص نمبر وقتاً فوقتاً شائع کر چکے ہیں۔ اب انہوں نے حضرت جوش ملیح آبادی کی ۶۵ ویں سالگرہ کے موقع پر تقریباً سات سو صفحے کا ضخیم "جوش نمبر" شائع کر کے نہ صرف اپنی عالی حوصلگی کا ثبوت دیا ہے بلکہ ایک نئی مثال بھی قائم کی ہے۔ شخصی خاص نمبر عموماً کسی مشہور شخص کے مر جانے کے بعد شائع ہوتے ہیں، صہبا صاحب نے حضرت جوش کی زندگی ہی میں ایک یادگار نمبر شائع کر کے مردہ پرستی کے کلنک کے ٹیکے کو ہماری پیشانی پر سے مٹا دیا۔

جوش صاحب کے نام سے ہر اردو داں واقف ہے مگر اُن کے کام سے اور اُن کی شخصیت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ تفصیلی تعارف کی اس خدمت کو "افکار" نے بڑے سلیقے سے انجام دیا ہے۔

مندرجات میں تازہ و غیر مطبوعہ نادر و نایاب نئی نظمیں اور منتخب کلام شامل ہے۔ اس کے علاوہ عکسی تحریر، مکتوباتِ جوش، آٹوگراف، اور جوش صاحب کی شخصیت پر دلچسپ مضامین لکھوائے گئے ہیں۔ جوش کے فکر و فن پر اردو کے مشہور نقادوں نے بصیرت افروز مضامین لکھے ہیں۔ بعض معتقد حضرات مضامین نہیں لکھ سکے۔ انہوں نے پیغامات، تاثرات، نذرانے، اور عذر اسنے پیش کئے ہیں۔

اٹھارہ صفحے کی نایاب تصاویر شامل کر کے صہبا صاحب نے "جوش نمبر" کو ہر لحاظ سے مکمل کر دیا جس محنت و جگر کاوی سے یہ خاص نمبر مرتب و شائع کیا گیا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ بے ساختہ کہنا پڑتا ہے۔ ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

گلڈ نے اس ادبی کارنامے پر ایک ہزار روپے کا انعام دیا ہے۔ "مدیر" رومان نے بزرگانِ ادب کو ایک شاندار عصرانہ دے کر ایک معزز ہم عصر کی کاوش کو سراہا۔ ادبی حلقوں میں بھی "جوش نمبر" کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کاش ہماری حکومت بھی قدر دانی کی طرف متوجہ ہوتی!

نگار۔ لکھنؤ

یہ خصوصی نمبر (جوش نمبر) تقریباً ۷۰۰ صفحات پر اتنے متنوع رنگ کے مضامین اور تصاویر و نقوش پر مشتمل ہے کہ اس کو دیکھ کر ہر شخص کے دل میں اردو صحافت کی عزت بڑھ جانا چاہئے۔

یہ خصوصی نمبر جوش کی زندگی، جوش کے اخلاق اور جوش کی شاعرانہ خصوصیات کا ایسا بے مثل مرقع ہے کہ اس سے زیادہ بہتر پیش کش کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا!

عصمت۔ کراچی

مُردہ پرست قوم میں کسی بلند مرتبہ زندہ ادیب کے متعلق ایک ماہوار رسالے کا خاص نمبر شائع کرنا کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن جناب صہبا لکھنوی نے یہ جرأت مندانہ قدم اُٹھایا کہ شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں ساڑھے چھ سو صفحوں سے اوپر خاص نمبر نہایت محنت و کاوش اور سلیقے سے مرتب کر کے ۵ نومبر کو حضرت جوش کی ۶۵ ویں سالگرہ کے موقع پر جب کراچی کی انجمن دانشورانِ ادب "جشنِ جوش" منا رہی تھی شائع کر دیا۔

اس ضخیم خاص نمبر میں ۲۰۔ ۲۵ صفحوں پر حضرت جوش کی مختلف تصاویر ہیں، اور ان میں سے اکثر بیشتر وہ ہیں جو اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوئیں۔ تقریباً تین سو صفحات میں شاعرِ انقلاب کے کلام کا نہایت دل آویز انتخاب ہے۔ اور اتنے ہی صفحوں میں اردو کے عظیم المرتبت شاعر کے متعلق مضامین اور نظمیں ہیں۔ ان میں تحقیقی، تنقیدی مضامین بھی ہیں جو ان حضرات نے تحریر فرمائے ہیں جو اردو کے بہتر نقادوں میں شمار کئے جاتے ہیں، اور جنہوں نے کلامِ جوش کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے، اور ایسے مضامین بھی متعدد ہیں جو شاعر کی نجی زندگی اور کردار سے تعلق رکھتے ہیں۔ آخر میں ادیبوں کے پیغامات ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ "افکار" کا یہ خاص نمبر نہایت محنت اور قابلیت سے مرتب کیا گیا ہے، اور "جوش نمبر" شائع کر کے "افکار" نے اردو ادب میں ایک دلچسپ قیمتی اضافہ کیا ہے۔

شاعر۔ بمبئی

کسی ادبی شخصیت پر ایسی ضخیم اور بھرپور اشاعت ابھی تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ ماہنامہ افکار کراچی نے شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کی عظیم شخصیت پر واقعی ایک عظیم نمبر نکالا ہے جو ہر حیثیت یادگار اور تاریخی ہے۔

جامعہ - دہلی

اب زندہ شخصیتوں کے بارے میں رسالوں کے خاص نمبر نکالنے کا رواج بڑھ رہا ہے۔ اس میں خطرے بھی ہیں اور فائدے بھی۔ فائدہ یہ کہ متعلقہ شخصیت کے بارے میں اس کی زندگی میں زیادہ آسانی اور سہولت سے مواد جمع کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی خدمات کا اعتراف کر کے ملک و قوم کسی حد تک اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ خطرہ اس کا ہے کہ اگر متعلقہ شخصیت متفقہ طور پر بزرگ اور محترم نہ ہوئی۔ تو بحث ومباحثے کا ایک ناخوش گوار سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ جوش نمبر کے بارے میں پاکستان کے بعض گوشوں سے کچھ نامناسب آوازیں اٹھی بھی ہیں۔

علاوہ ازیں جب تک ایک شخص زندہ ہے اس کی شخصیت پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچتی۔ اس لئے اس کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کہ خود جوش نے بھی کہا ہے کہ

"جب تک اس جوہر گراں مایہ کو تنگی وبستگی کے
فشار سے رہائی نہیں دی جاتی اس جوہر میں اس قدر
طاقت پیدا نہیں ہوتی کہ وہ کسی شخص کی ذات کو تکمیل
و اتمام کی دولت سے مالا مال کر دے"

بہر نوع یہ نمبر اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہے۔ جوش کی شخصیت اور اُن کی شاعری کا بہت تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے، اور اُن کے کلام کا انتخاب شائع کیا گیا ہے جس میں بہت سا غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مضمون نگاروں کو پوری آزادی کے ساتھ اظہار خیال کا موقع دیا گیا ہے۔ چنانچہ بعض مضامین میں جوش کی شخصیت اور کردار پر سخت تنقید بھی کی گئی ہے۔

بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ اس نمبر میں حضرت جوش صاحب کے بارے میں بہت کافی مواد جمع کیا گیا ہے اور جوش کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لئے اس وقت اس سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہے۔

اشارہ - پٹنہ

عصر نو میں کسی فن کار کے جیتے جی اس کے نام سے رسالوں کے خاص نمبر نکالنا ایک ادبی جرأت ہے۔ اور یہ جرأت غالباً "نیرنگ خیال" کے "اقبال نمبر" سے شروع ہوئی ہے۔ اس کی صحت مند توانائی اور افادیت نے آج اس کا چلن عام کر دیا ہے دوسرے پرچوں نے بھی وقتاً فوقتاً اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔ مگر ماہنامہ "افکار" کا یہ "جوش نمبر" اپنی نوعیت کا واحد خاص نمبر ہے جس میں مدیر نے شب و روز کی محنت اور عرق ریزی سے بیک وقت اتنے گراں قدر مقالے، مکتوبات جوش کی نادر و نایاب نظمیں، ان کے پرانے آٹوگراف، شعراء کے خراج تحسین اور پیغامات و تاثرات کے ساتھ مشہور ادیبوں کے نذرانے اور منظومات بڑے حسن ترتیب سے اکٹھا کر دئے ہیں۔ اور اسے ایک یادگار ادبی صحیفے کی صورت دے دی ہے۔ نیز جوش کی بیالیس مختلف تصویریں بھی خاندان اور دیگر افراد کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ اور ایک نگار خانہ سجا دیا ہے۔

"افکار" کے "جوش نمبر" کی بڑی بات یہ ہے کہ اس میں شاعر اعظم جوش" کو فکر و فن کی کسوٹی پر بڑے کھرے طور سے پرکھا

کیا ہے ۔ جہاں مدحیہ اشعار اور تعریفی و ستائشی مضامین کی کمی نہیں ، وہیں سخت ، بے لاگ اور بے باک تنقیدی مضامین کا بھی ایک معتدبہ حصہ ہے ۔۔ کیا "شخصیات کے آئینے میں" ، کیا "فکر و فن کی کسوٹی پر" اور کیا "پیغامات و تاثرات" کے تحت ہر جگہ جوش کی شخصیت و فن کے دونوں رخوں پر گہری نظر ڈالی گئی ہے ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے تو جوش کی طبعی شرافت کے ساتھ ساتھ ان کی نامعقولیتوں کا بھی ذکر کیا ہے ۔ اور توبہ و اصلاح کے لئے مخلصانہ دعا کی ہے ۔ شاہد احمد دہلوی کا مضمون "جوش ملیح آبادی ، دیدہ و شنیدہ" اپنی دو رخی شان میں واحد ہے ۔

یہ صحیح ہے کہ جوش پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا ۔ پھر بھی "جوش نمبر" کی انفرادی حیثیت ہمیشہ نمایاں رہے گی ۔ صہبا صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اس عظیم فن کار کو ایسے ایسے رنگا رنگ گلہائے عقیدت کا ہار پہنایا ہے جوش کے فن پر لودس بلند پایہ تنقیدی مضامین ملک کے مشہور و معروف ادیبوں سے لکھوائے ہیں ۔ اور تقریباً ہر مضمون میں جوش کو ایک مختلف اور مخصوص زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش ملتی ہے ۔

(۱) مجتبیٰ حسین نے اپنے مضمون "جوش عظیم" میں جوش کو ایک فطری شاعر ثابت کیا ہے ، چاہے جوش کے یہاں فکر کی نوعیت کیسی ہی رہی ہو ۔

(۲) ڈاکٹر محمد حسن "جوش کی شاعری" میں ان کی ہمہ جہت شاعری کا جائزہ لے کر صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جوش ایک اعلیٰ پائے کے قادر الکلام شاعر ہیں ۔

(۳) ایک مقالہ "نصف صدی اور جوش" میں پروفیسر انجم اعظمی نے اقبال اور جوش کی شاعرانہ حیثیتوں سے بحث کی ہے مصلحتاً اگرچہ وہ کھل کر یہ کہنا نہیں چاہتے کہ جوش اقبال سے بڑے شاعر ہیں ، مگر غیر شعوری طور پر جابجا اس کا اظہار ہو جاتا ہے ۔

(۴) "جوش کا آہنگ شاعری" پروفیسر حنیف فوق کا بڑا جچا تلا مضمون ہے ۔ فوق کے تنقیدی توازن اور توانائی کا اندازہ اُن کے ان جملوں سے کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً :

- نئی نسل اگر جوش کی بڑائی کو تسلیم کرتی ہے تو اُن کی شاعرانہ محرومیوں پر بھی کڑی نظر ڈالتی ہے ۔
- اردو شاعری کو جوش نے جو سرمایہ عطا کیا ہے وہ زرِ خالص تو نہیں لیکن اس میں سونے کے ذرات کی تابانی جگہ جگہ ملتی ہے ۔
- کل جب عالم گیر انسانی تہذیب کی بنیاد دیں استوار ہوں گی تو جوش کی شاعری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ کیوں کہ اس نے اردو شاعری کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا ہے ۔
- وہ (جوش) آئینے کے مانند اپنے دور کے جلووں کا عکس پیش کرتے ہیں ، لیکن ان جلووں کو کوندہ کر ذہنی افق پر ست رنگی دھنک نہیں بناتے اور نہ خیال کی جلوہ گاہوں میں تصورات کی شمعیں جلاتے ہیں ۔
- جوش کی شاعری میں حسن کے احساس کے کوندے سے لپکتے ہیں ۔ لیکن

محبوب کی شخصیت کا روایتی احترام نہیں ملتا۔

(۵) مصطفیٰ زیدی نے اپنے مضمون "شبیر حسن خاں" میں ان کی انقلابی ذہنیت اور سیاسی نظریات کی نشان دہی کی ہے۔

(۶) فضیل جعفری نے اپنے مقالے میں یہ دکھانا چاہا ہے کہ جوش میدانِ نثر میں بھی ایک مخصوص فلسفیانہ اور منفرد طرزِ تحریر کے مالک ہیں۔

(۷) اثر لکھنوی "شاعرِ فطرت، جوش" میں لکھتے ہیں کہ:

"افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جوش کی شاعری جو کبھی تمام رامش و رنگ، تمام نکہت و نغمہ تھی اب انحطاط پذیر ہے۔ وہ فضا رندگی رندھی ہے، جہاں قوسِ قزح انگڑائیاں لیتی تھی۔ اور رنگینیوں کی بارش ہوتی تھی۔"

اثر نے اس مضمون میں "شاعری رانتیں ست دو تین بدلے کہ ان کی صوری و معنوی وضاحت کر دی ہے اور بس۔

(۸) لطیف الدین احمد اکبر آبادی نے "سخن ہائے گفتنی" کے زیرِ عنوان جوش کی شاعری کا جائزہ صرف "روحِ ادب" اور "آتش کدہ" کی روشنی میں کیا ہے۔ اس مضمون کی ہمہ جہتی نے اس میں توازن کا عنصر کم کر دیا ہے۔

مجموعی طور پر "افکار" کا "جوش نمبر" فن اور نقدِ فن، فن کار، شخصیت فن کار، اور مرتبہ فن کار کی قدر شناسی اور تعین کی عمدہ و متوازن کوشش ہے۔ اور اردو کے صحافتی ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پگڈنڈی - امرتسر

"زندہ بدست زندہ" کی روایت کو اس خصوصی شمارے (جوش نمبر) کے ذریعے صہبا لکھنوی صاحب نے آگے بڑھایا ہے اس روایت سے جہاں یہ فائدہ ہے کہ زندہ ادیب و شاعر متعلقہ کے لئے یہ احساس اطمینان انگیز ہوتا ہے کہ میں نے بھی ادب اور انسانیت کی کچھ "بڑی بھلی" خدمت کی ہے! وہاں نقاد و مقالہ نگار بھی کھل کر اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہے۔ ورنہ مر جانے کے بعد تو سب کو رسمی طور پر تعریف کرنی پڑتی ہے۔ بمثل ع

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

اتنے ضخیم اور عظیم شمارے کے لئے دو تبصرے میں جس کے سب پہلوؤں پر شاید پوری طرح احاطے کی بھی گنجائش نہیں، صہبا صاحب پوری ادبی دنیا کے شکریے اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس خصوصی شمارے کے منسوبیہ (حضرتِ جوش) جس قدر "گراں ڈیل" اور بین الاقوامی شہرت کے مالک شاعر ہیں، یہ شمارہ بھی اسی قدر عظیم الجثہ اور لہٰذا یہ مقالات و نگارشات کا حامل ہے۔ جوش صاحب کی نسبت اتنا جامع و مانع شمارہ ایک ادبی کارنامہ ہے۔ جو نہ صرف عصرِ حاضر کی ایک گراں قدر ادبی دستاویز ہے بلکہ مستقبل کے ادبی تاریخ نگار کے لئے بھی ایک نہایت اہم ادبی صحیفے کا کام دے گا!

اس شمارے کو ہر لحاظ سے مکمل بنانے کے لئے شبانہ روز محنت اور تگ و دو سے کام لیا گیا ہے، وہ اس کی ضخامت اور مندرجات سے بخوبی ظاہر ہے....

جوش کی نجی اور ادبی زندگی سے متعلق بہت سی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ جن سے شمارے کی افادیت بڑھ جانے کے علاوہ اس کی خوب صورتی اور دل کشی میں بھی چار چاند لگ گئے ہیں۔

مہر نیم روز۔ کراچی

کم ہی شاعر ایسے نظر آتے ہیں جن کو نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل ہو، جوش انہی میں سے ایک ہیں۔ چنانچہ (جوش نمبر میں) اُن کی نظم و نثر دونوں کے انتخابات بھی جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اور اس طرح جوش کے فکر و فن کے تقریباً تمام قابلِ ذکر پہلو سمٹ آئے ہیں۔ ۵۔ نومبر کو کراچی میں جوش کی ۷۵ ویں سالگرہ پر "جشنِ جوش" منایا گیا تھا۔ اور مدیر افکار نے اسی موقع پر یہ نمبر بطور نذرانۂ عقیدت جوش کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ بحیثیت مجموعی یہ نمبر بہت اچھا اور مفید معلومات کا حامل ہے۔

کتابی دُنیا۔ کراچی

"جوش نمبر" جوش کی شاعری اور کردار پر ایسی دستاویز ہے جو اردو کے طالب علم کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ یہ نمبر متعدد فوٹوؤں سے مزین ہے۔ سرورق پر جو کارٹون ہے وہ عزیز کارٹونسٹ کی تخلیق ہے اور اس میں جوش کو پوری رعنائیوں کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔

لیل و نہار۔ لاہور

فن کاروں کو زمانے کی ناقدری کا گلہ بالعموم رہا ہے۔ لوگ انہیں پہچانتے نہیں، اور جو اہلِ نظر جانتے پہچانتے ہیں وہ اعتراف کمال میں عجلت سے کام لینا نہیں چاہتے، بلکہ انتظار کرتے ہیں، تاکہ فن کار کا اسلوب خاص اپنی انتہائی بلندیوں کو چھونے کے بعد ترقی کے امکانات ختم کر دے، اور محتاط مبصر کو اس کے متعلق حتمی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ یوں فن کار کی موت ہی نہیں زندگی بھی ایک حادثہ ہوا کرتی ہے۔

جوش صاحب ان معدودے چند خوش نصیبوں میں ہیں جن کی شخصیت، کردار اور فن کی عظمتوں کا اعتراف ان کی زندگی میں ہی کیا گیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ان کی خوش نصیبی یہ ہے کہ ان کے رفیقوں، قدر شناسوں اور فن کے ناقدوں نے اظہار رائے میں عام طور پر بے لاگ راست گوئی سے کام لیا ہے۔ اگرچہ تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس کی مثالیں بھی افکار کے زیرِ نظر شمارے میں مل ہی جاتی ہیں۔ آخر الذکر کے سلسلے میں ایک نام فراق صاحب کا لیا جا سکتا ہے جنہوں نے اپنے خط میں کچھ یہ کہہ کر لکھنے سے احتراز کیا ہے کہ ع

ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں!

"اردو شعر و ادب کو جوش نے فکر اور طرز ادا کا جو سرمایہ دیا ہے اس کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کی یہ رائے بہت درست ہے "ممکن ہے اردو کے جدید تر شعراء بھی ضیقوں کے مطابق جوش کو یونہی سا شاعر قرار دے کر اپنی انانیت کو تھپک لیتے ہوں۔ لیکن اگر وہ تنہائی میں دیانت داری کے ساتھ، انانیت کے شکنجے کو طاق پر رکھ کر اپنے ہی کلام پر غور کریں۔ اور اپنی ہی آواز کو کان لگا کر سنیں، تو انہیں محسوس ہوگا کہ اُن کے کم سے کم آدھے کلام میں جوش بول رہا ہے۔ اور جوش کا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے!"

ممتاز حسین لکھتے ہیں "جوش صاحب قادر الکلام شاعر ہی نہیں، بلکہ ایک عہد آفریں شاعر بھی ہیں۔ دورِ حاضر کی ہر وہ آواز جو جگانے اور بیدار کرنے کی ہے، جو آزادی، مساوات، انسان دوستی اور عقل پسندی کی ہے وہ جوش صاحب کی آواز سے ایک نسبت رکھتی ہے تا در سردار جعفری کے الفاظ میں" وہ جہالت، وہم پرستی، مذہبی جنون اور روایتی اخلاق کی زنجیروں کو توڑنے کی ترغیب دیتے ہیں۔"

مدیر افکار نے جوش نمبر کی ترتیب میں بڑی کاوش اور سلیقے سے کام لیا ہے۔ جوش صاحب کی زندگی کے مختلف ادوار کی تصویریں، اُن

کی بعض کمیاب تصاویر، ان کی نظموں کا انتخاب، اور چند غیر مطبوعہ نظمیں، تبصرے، تنقیدیں، مراسلے، احوال و آرا غرض کہ جس قدر مواد میسر آ سکا ہے یہاں پیش کر دیا ہے۔ سرورق کے لئے عزیز دکا رٹونسٹ نے جوش صاحب کا قلمی خاکہ بنایا اور اچھا بنایا ہے۔

مکتبۂ افکار نے یہ شمارہ جوش صاحب کی زندگی میں ہی مرتب کر کے ایک اچھی روایت ڈالی ہے اگرچہ ممکن ہے ان اداروں کو مایوسی ہو جو ضخیم نمبر والی اشاعت کے لئے فن کاروں کی موت کے منتظر رہتے ہیں۔

امروز۔ لاہور

جوش ایک عہد آفریں شاعر ہیں۔ ممتاز حسین نے صحیح لکھا ہے کہ "دورِ حاضر کی ہر وہ آواز جو جگانے اور بیدار کرنے کی ہے جو آزادی، مساوات، انسان دوستی اور عقل پسندی کی ہے وہ جوش صاحب کی آواز سے ایک نسبت رکھتی ہے۔" جوش نے اردو شاعری کو ایک نیا آہنگ اور ایک نیا طنطنہ دیا ہے۔ اور اس دور کے شعراء کی اکثریت نے بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سے اثر قبول کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس حقیقت کے اعتراف میں بخل برتا جائے۔

بہرطور جوش کی عہد آفرینی شک و شبہ سے بالا ہے۔ انہوں نے جو فنی عظمت حاصل کی ہے اور اس کے نتیجے میں انہیں جو شہرت ملی ہے اس نے ان کی شاعری کے علاوہ ان کی ذات کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، اور ادب کے قاری ان کی تخلیقات کے ساتھ ان کی شخصیت میں بھی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ ممکن ہے ان کے شخصی کردار اور اس کے بعض پہلوؤں سے کسی کو اتفاق نہ ہو تاہم اُن کی فنی عظمت نے اُن کی بعض خامیوں کو یوں ڈھانپ لیا ہے۔ (اور کون شخص کامل ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ یا دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہے کہ وہ منزہ عن الخطا ہے) اسے جوش کی فنی عظمت ہی کی دلیل سمجھنا چاہئے کہ اس کا اعتراف اُن کی زندگی ہی میں کر لیا گیا ہے۔ پھر اُن کے ناقدوں، قدرشناسوں، اور مبصروں نے ان کے اور ان کی شاعری کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے اس کا برملا اظہار بھی کر دیا ہے۔

افکار کا جوش نمبر ایک جامع اور منفرد شمارہ ہے۔ اس میں جوش صاحب کی مختلف تصاویر، مضامین، منظومات، تبصرے، تنقیدیں، اور وہ تمام مواد جو میسر آ سکتا تھا، بڑی خوبی اور کاوش سے جمع کر دیا گیا ہے۔ سرورق پر جوش کا قلمی خاکہ ہے جو عزیز کارٹونسٹ نے بنایا ہے۔

جنگ۔ کراچی

زندہ قومیں اپنے فن کاروں کی خدمات کا اعتراف اُن کی زندگی میں کیا کرتی ہیں۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں جب تک کوئی مر نہ جائے اس کی فن کارانہ عظمت کا احساس نہیں کیا جاتا۔ مردہ پرستی کی اس روایت کی موجودگی میں ماہنامہ "افکار" نے "جوش نمبر" نکال کر نہ صرف جرأت کا ثبوت دیا ہے بلکہ ایک ایسی روایت کو آگے بڑھایا ہے جسے مزید تقویت دینے کی ضرورت ہے۔ "افکار" نے حضرت جوش کی زندگی میں "جوش نمبر" شائع کر کے اور اُن کی ادبی و علمی خدمات کا اعتراف کر کے ایک صحت مند رجحان کو سہارا دیا ہے، ورنہ اب تک ہمارے ہاں عام طور پر مرنے کے بعد ہی خاص نمبر شائع کئے جاتے ہیں۔

"جوش نمبر" میں مختلف عنوانات کے تحت جوش کی زندگی اور ادب کا احاطہ کیا گیا ہے، اور اُن کی بعض غیر مطبوعہ تصویریں بھی چھاپی گئی ہیں ان کی زندگی کے مختلف دور اور گوشے تصویروں کی کہانی میں بھی بیان کئے گئے ہیں۔ یہ پرچہ ہر لحاظ سے بھرپور اور جامع ہے۔ اس کے مرتب کو جتنی داد دی جائے کم ہے۔ کیونکہ تقریباً سات سو صفحات کا یہ پرچہ بڑی محنت اور جگرکاوی کا نتیجہ ہے۔

"جوش نمبر" کے مرتب کو اس کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے۔ جس سلیقے اور قرینے سے انہوں نے "مردہ پرستی" کے اس دور میں "زندہ پرستی" کا ثبوت دیا ہے وہ قابلِ تعریف بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔

ڈان ۔ کراچی

عام طور پر بڑے ادیبوں کی موت ہی ادبی جرائد کے لئے ان کی زندگی اور فن پر خاص نمبر شائع کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے لیکن یہ جوش صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنے فن اور شخصیت کے بارے میں ایک ضخیم اور بیش قیمت نمبر دیکھ لیا۔ اس نمبر میں جو مضامین شامل ہیں ان میں جوش کو ایک انسان اور شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نمبر میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ لیکن مدیر افکار کی محنت طلب مساعی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس ضخیم نمبر میں جوش کو بالکل اسی انداز میں پیش کیا گیا ہے جس طرح مدیر افکار اور دیگر اہلِ قلم حضرات نے انہیں دیکھا ہے اور ان کی زندگی، شخصیت اور فن پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس نمبر کا مطالعہ جوش صاحب کے مداحوں، نقادوں اور طلباء کے لئے ناگزیر ہے۔

مارننگ نیوز ۔ کراچی

افکار نے جوش جیسے خلاق شاعر پر ضخیم و عظیم جوش نمبر چھاپ کر ادبی تنقید کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ اس نمبر میں شاعر کی متنازعہ فیہ شخصیت اور فن کو کسی مخصوص نقطۂ نظر کا پابند رہ کر نہیں پرکھا گیا ہے۔ اور اس متنوع شخصیت کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہا ہے۔ جہاں توصیفی مضامین ہیں وہاں سخت بلکہ بے باک تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں۔ مارکسی اور کلاسیکی مدرسۂ فکر کے انتقاد کی اچھی نمائندگی ملتی ہے۔ جوش کی شاعرانہ حیثیت کے بے لاگ تعین کے لئے فنی تنقید میں از بس ضروری ہے۔

ایک معتد بہ حصہ شاعر کے پرانے، نئے اور غیر مطبوعہ مضامین، خطوط اور کلام کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ مختلف النوع نظریات کے ناقدین کے قلم سے شخصی خاکے بھی پیش کئے گئے ہیں، جو تاریخِ ادب کے طالب علم کے لئے بہت وقیع اور مفید ہیں۔ جوش نمبر بڑی حد تک مصور بھی ہے۔ مختصراً جوش نمبر روایتی اور جدید بالغ تنقید کا ایک خوشگوار امتزاج پیش کرتا ہے۔

انٹرپرائز ۔ کراچی

صہبا لکھنوی مدیر افکار نے ان حضرات کے لئے جنہیں جوش ملیح آبادی کی شاعری سے عقیدت اور محبت ہے جوش نمبر کی صورت میں ایک یادگار تحفہ پیش کیا ہے۔ ۷۴۰ صفحات کے عظیم و ضخیم نمبر میں اس عہد کے بلند مرتبت شاعر کی زندگی، شخصیت اور فن کے ہر گوشے کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ "پاکستان رائٹرز گلڈ" نے جوش نمبر کو "ادبی کارنامہ" قرار دے کر ایک ہزار روپے کی رقم بطور انعام مدیر افکار کو پیش کی۔

جی۔ اے مدنی کمشنر کراچی

افکار کا جوش نمبر موصول ہوا۔

اس خصوصی نمبر کے مندرجات اور صوری حسن سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔

جمیل الدین عالی

"افکار" کا "جوش نمبر" موصول ہوا۔ آپ کی یہ کوشش ایک ادبی کارنامے کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ ہماری رائے میں "افکار" نے "جوش نمبر" کے ذریعے اس ملک کے اکابر ادب کو ان کی زندگی میں قرار واقعی خراج عقیدت پیش کرنے کی ایک عظیم الشان روایت قائم کی ہے۔ "افکار" کا یہ اقدام لائق تقلید ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ خود آپ اور دوسرے ادبی رسائل اپنے پروگرام میں دیگر اکابر ادب کے لئے اس اہم مثال کو سامنے رکھیں گے۔

کلڈ آپ کو اس مستحسن اقدام پر تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہے، اور مخلصانہ اظہار خیر سگالی کے طور پر ادارۂ افکار کو ایک ہزار روپے کی حقیر رقم پیش کرتا ہے۔

عبدالرحمٰن چغتائی

جوش نمبر کا شکریہ۔ عزیز الرحمٰن صاحب (محمد عبدالعزیز۔ عزیز کارٹونسٹ) نے جوش صاحب کا کارٹون جس جذبے سے تخلیق کیا ہے، اپنے فن کے کمال کا نمونہ اپنا شاہکار پیش کیا ہے۔ بدقسمتی سے ایسے باکمالوں سے تعارف نہیں۔ ورنہ یہ لوگ معاشرت کی جان ہیں۔ "جوش نمبر" ہو یا "نیرنگ خیال" کا "اقبال نمبر" یہ نمبر وقت کے کرشمے ہیں اور اسی سے زندگی رواں دواں ہے۔

رئیس احمد جعفری

جوش نمبر کا ایک ایک حرف میں نے پڑھا۔ جوش صاحب اور ان کی شاعری کا میں کچھ زیادہ مداح نہیں ہوں، بلکہ نکتہ چیں رہا ہوں لیکن آپ نے جس عالی ہمتی سے کام لے کر یہ نمبر مرتب کیا ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ آپ کا یہ کارنامہ ہر اعتبار سے حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔ آپ نے ایک نیا راستہ کھول دیا ہے ادبی رسائل کے لئے بہت سی باتوں میں افکار کو اولیت حاصل ہے۔ یہ اولیت بھی اسی کے حصے میں آئی۔

سلام مچھلی شہری

"جوش نمبر" ملا۔ دیکھا، پڑھا۔ سوچتا رہا — یہ سوچتا رہا کہ جوش ابھی بہت دنوں تک (خدا کرے) جئیں گے۔ بہت کچھ لکھیں گے، مگر ان کی زندگی اور خاص طور پر ان کے فن کو اتنا عظیم خراج عقیدت اب نہ پیش کیا جا سکے گا۔ اور اسی لئے تمہارا یہ کارنامہ ایک تاریخی حیثیت کا مالک ہے۔

مجاز کی روح تمہیں دعائیں دے رہی ہے اور جوش بھی یقیناً تمہارے لئے دعائے عمر درجات میں کھوئے ہوں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے ایک ادبی فرض ادا کیا ہے، جوش پر احسان نہیں کیا ہے۔ مگر آج اپنا فرض پہچاننے والا ہے کون؟ "افکار" کا یہ "جوش نمبر" ایک ایسا آئینہ ہے جس میں جوش کو ہم سب ہر پہلو دیکھ سکتے ہیں۔ اور اگر جوش بھی خود کو اچھی طرح دیکھ لیں تو اردو ہی نہیں دنیا کی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کر سکتے ہیں۔

سلیمان اریب

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے جوش صاحب پر اتنا بڑا نمبر نکال کر ایک تو یہ ثابت کر دیا کہ تم دھان پان ہونے کے باوجود بڑے صاحب عزم و ہمت ہو۔ اور دوسرے ضخیم اور اچھے نمبر نکالنا کسی ایک شخص کی اجارہ داری نہیں۔ اتنا کامیاب نمبر نکالنے پر میری طرف سے مبارک باد قبول کرو۔

پروفیسر ضیاء (علیگ)

"جوش نمبر" تمہارا ایک ایسا یادگار کارنامہ ہے جس کے لئے تمہیں جس قدر بھی مبارک باد دی جائے اور تمہاری مساعی جمیلہ کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ تمہیں اس کی کامیابی کے سلسلے میں اتنی گراں قدر مبارک بادیں موصول ہوئی ہوں گی کہ میری کم مایہ اور بے حیثیت مبارک باد کیا وقعت رکھتی ہے پھر بھی صدق دل اور خلوص قلب سے یہ ہدیہ پیش کر رہا ہوں

گر قبول افتد زہے ...

یہ حقیقت ہے کہ اس ضخیم نمبر کی ضخامت نے مجھے اتنا متاثر نہیں کیا جتنا کہ مضامین کے تنوع اور ترتیب نے۔ بہت سے نمبر اس سے زیادہ موٹے تازے دیکھے ہیں۔ مگر ان میں وہ خوش سلیقگی، حسن ترتیب اور رچاؤ نہیں تھا جو اس میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اودھ کی سرزمین کا فیضان ہے جہاں تم پیدا ہوئے۔ پلے اور بڑھے۔ اور جہاں کے چپے چپے میں قرینہ، سلیقہ، آرائش اور حسن پایا جاتا ہے اور اس کی ساری فضا میں یہ چیزیں رچی ہوئی ہیں۔

آئندہ جب کبھی طالب علم یا علم دوست حضرات جوش پر ریسرچ کرنا چاہیں گے اُن کے لئے یہ پرچہ انتہائی مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔ اتنا سارا مواد اور ایک جگہ اکٹھا کر دیا۔ اتنے بہت سے مضامین اور اچھے قسم کے، ایک جگہ جمع کر دیئے۔ جوش کی زندگی اور ان کی شاعری کے سارے ڈھکے چھپے پہلو اُجاگر کر کے رکھ دیئے۔ جو کام بھی کرتے ہو خوب کرتے ہو۔ اس نمبر کی بدولت تم نے بڑی حد تک اپنے آپ کو اردو ادب میں امر کر لیا۔ واقعی ایسا کچھ کر کے چلے ہو کہ ہمیشہ یاد رہو گے۔ (واشنگٹن سے)

جلیل قدوائی

لاریب جوش صاحب نے اردو شاعری کو اپنی خداداد استعداد و ذہانت سے جس طرح مالا مال کیا ہے۔ اور اسے جو شاندار نیا آہنگ بخشا ہے اس کا تقاضا تھا کہ ان کے احسان کا اعتراف کیا جاتا۔ آپ نے اور آپ کے احباب نے ان کے شایان شان اعتراف کیا، اور ان کی زندگی ہی میں کیا۔ یہ بڑی بات ہے۔ خدا جزائے خیر دے۔ اس نمبر کی حیثیت تاریخی ہے اور جوش صاحب پر کام کرنے والے عرصے تک اس سے استفادہ کریں گے۔

شیخ ایاز

"جوش نمبر" کے مطالعے سے جہاں ایک طرف آپ کی ان تھک کوششوں، پر استقلال محنت، اور سنجیدہ بار کاوی نے متاثر کیا،

یہاں دوسری طرف جوش جیسے عہد آفریں شاعر کے کلام اور شخصیت کے رنگا رنگ نقوش کچھ اس طرح اجاگر ہوئے کہ یہ سوچ کر مجھے بے حد دکھ ہوا کہ ایسا زندۂ جاوید جینے جی اپنے آپ کو "مرحوم" کہے۔ رہا نا قدر شناسی کا معاملہ تو اس معاملے میں صرف اردو ادب کے نام لیوا ہی پیش پیش نہیں ہیں۔ بلکہ مجھے سندھی ادب سے دلچسپی لینے والوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں سندھ کا باشندہ ہوتے ہوئے اور گذشتہ بیس سال سے سندھی شعر و ادب کو نئی زندگی دیتے ہوئے بھی عام ذہنوں یا نام نہاد ادب دوستوں کے لئے اجنبی ہوں۔ محض اس لئے کہ ہر ایسی روایت سے بغاوت کرنا میرا مسلک ہے جس کو افادیت کی بنا پر نہیں صرف کورانہ تقلید اور سطحی مفاد پرستی کی خاطر اپنایا جاتا ہو۔ گذشتہ پچاس سال کی شاعرانہ زندگی میں حضرت جوش کا مسلک بھی کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ پھر نا قدری کی شکایت کیوں؟ اور کس سے؟ بہر صورت آپ نے "جوش نمبر" جوش کی زندگی ہی میں شائع کر کے قابل تقلید مثال قائم کی ہے۔

اب مؤدبانہ طور پر میں آپ کے توسل سے جوش صاحب پر یہ زور دیتا ہوں کہ وہ خود کو "مرحوم" نہ لکھا کریں، اس سے ہمیں بے حد ذہنی تکلیف ہوتی ہے۔

راز سنتو کھ سری

واللہ بڑے معرکے کا نمبر نکالا ہے آپ نے۔ اس نمبر کی ترتیب و تدوین میں آپ نے جس عرق ریزی، روز و شب کی تگ و دو اور لگن سے کام لیا ہے قابل داد ہے۔ آپ کا یہ ادبی کارنامہ اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ساڑھے چھ سو صفحات پر محیط اس عظیم نمبر کی اشاعت پر حضرت جوش کے دیگر ان گنت دیدہ و نادیدہ عقیدتمندوں کے مانند میری طرف سے بھی مبارک باد قبول کیجئے۔ اور یوں تو اس شمارے کی کون سی تخلیق ہے جو اپنے معیار اور افادیت کے لحاظ سے قابل ستائش نہیں؟ المختصر اس خصوصی نمبر میں شاعر انقلاب کی نسبت اس قدر مواد جمع کر دیا گیا ہے جو ان کی نسبت ادبی اور فنی ریسرچ کر کے خصوصی مقالہ (Thesis) تحریر کرنے کے لئے کافی و وافی ہے۔

حسن حمیدی

"جوش نمبر" اتنا وقیع، پُر از معلومات اور مفید ہے کہ اس نمبر کو تاریخی حیثیت حاصل ہوگی۔ میری نظر سے اب تک کوئی ایسا جریدہ نہیں گذرا جس نے اس سلیقے سے کسی شخصیت کے متعلق نمبر شائع کیا ہو۔ یہ بات بھی قابل صد ستائش ہے کہ تم نے مردہ پرستی کی روایت سے بغاوت کی ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ تم سلامت رہو۔ آنے والا دور تمہیں یاد کرے گا۔ اس جہل زدہ ماحول میں کس میں اتنا خلوص ہے کہ اتنی جاں فشانی کرے۔

سیّد مجبوب علی

"جوش نمبر" کے بارے میں یہی کہنا ہے کہ
جس نے بھی دیکھا، ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نمبر اپنی جگہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

وحید قیصر ندوی

"جوش نمبر" نکال کر آپ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر انسان ہمت اور عزم سے کام لے تو کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نمبر کا ہر مضمون اپنی جگہ پڑھنے کی چیز ہے۔ ہر ہر قدم پر

"کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست"

اس تاریخی نمبر پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ گلڈ کی افکار نوازی بلکہ صہبا نوازی پر بھی دل مسرور ہے۔

شبیر

ایک جیتے جاگتے شاعر کا اتنا بھاری بھرکم نمبر چھاپنے کا آپ کا بلند عزم اور اس کی ایسی کامیاب تکمیل رسمی تحسین و ستائش سے بہت ارفع ہے۔ جوش صاحب کے سے عظیم شاعر کا اتنا کامل، اتنا واضح اور اس قدر دل آویز نقش پیش کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ سنہ ۴۳ء میں دہلی میونسپلٹی کے ٹیگور آنجہانی کو ایڈریس نہ پیش کرنے پر جوش نے قوم پر طنز کا جو بھرپور وار کیا تھا، آپ نے اتنی مدت کے بعد اس کا مکمل کفارہ ادا کر دیا ہے۔

یہ نمبر جوش کے فن کی بے پناہ عظمت اور آپ کی بے پناہ پرستاری فن کی روشن دلیل ہے۔ قارئین اذکار آپ کے تہہ دل سے ممنون ہیں کہ آپ نے سنہ ۴۷ء کے بعد کی پر شکوہ شاعری —— (جس میں جوش "ریل جا چکی ہے پٹڑی چمک رہی ہے" کے مصداق بن کر رہ گئے ہیں) —— کے خالق اور حجم حجیم کی مدت کے بعد سنبل و سلاسل، رامش و رنگ، آیات و نغمات، نقش و نگار، فکر و نشاط اور عرش و فرش والے ہمارے اس جانے پہچانے محبوب شاعر سے ہمیں ملا دیا ہے جس کی ہیجان خیز شاعری کے تند نشے سے ایک زمانے میں پورے اردو داں طبقے کے اذہان سرشار تھے۔

محسن بھوپالی

آج کے "جنگ" میں خبر پڑھی کہ رائٹرز گلڈ نے آپ کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے "جوش نمبر" پر ایک ہزار روپے کے نقد انعام کا اعلان کیا ہے، خبر پڑھ کر از حد خوشی ہوئی۔ اس لئے اور بھی کہ ادبی کارنامہ سر انجام دینے پر زبانی یا تحریری طور پر تعریفوں کے پل باندھ دینے والے افراد اور اداروں کی ہمارے ملک میں کمی نہیں۔ لیکن صحیح سمت میں کی گئی کاوشوں کو سراہنے والے معدودے چند ہیں!

ایک بار پھر دلی مبارک باد قبول فرمائیے!

عبد الاحد عثمانی

یہ آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ "جوش نمبر" اس شان کا نکالا جس کی کسی دوسرے رسالے والے سے امید بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ جوش نمبر مجھے اور سب کو بہت پسند آیا۔

آفاق صدّیقی

آج دوپہر کو "جوش نمبر" ملا۔ نہ پوچھیے کس ادب و احترام سے اسے پڑھ رہا ہوں۔ واقعی آپ نے بڑی محنت اور جگر کاوی سے اس کٹھن کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا ہوگا۔ دلی مبارک باد قبول فرمایئے۔ بہر صورت قدر دانِ شعر و ادب کے لئے یہ پیش کش ہر لحاظ سے باعثِ افتخار ہے۔

ارشد کاکوی

میں کیا بتاؤں کہ "جوش نمبر" نکال کر آپ نے کتنا بڑا کام کیا ہے۔ شان دار نمبر تو بہت دیکھے تھے، ایسا جان دار نمبر نہیں دیکھا تھا۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں اردو ادب و صحافت کی لاج ہے ان میں آپ بھی ہیں۔

امریک آنند

نمبر تو اکثر نکلتے رہتے ہیں۔ لیکن آپ نے جو نمبر نکالا ہے وہ اپنا جواب ہے اور میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ آپ نے اس نمبر سے اردو ادب کی تاریخ کی ترتیب میں ایک نئی بنا ڈالی ہے۔

غنی دہلوی

میرا خیال ہے کہ جوش صاحب جیسی عظیم شخصیت پر اتنے مکمل تحقیقی اور شان دار نمبر کے پس منظر میں اگر آپ کی قد آور شخصیت نہ ہوتی تو اس کی تکمیل ممکن نہیں تھی۔ یقیناً آپ کی یہ کوشش رسمی ستائش سے بہت بلند ہے۔

جوگندر پال

"جوش نمبر" — تمہاری پیہم کاوشوں کا یہ حسین پیکر — ابھی کل ہی ملا — یہ امر نہایت حوصلہ کن اور مسرت بخش ہے کہ اردو ادب میں مردہ پرستی کی روایت کے خلاف بغاوت کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں — تاریخ ادب میں یہ نئے موڑ یقیناً نئی منزلوں کی نشان دہی کریں گے۔

(نیروبی سے)

کرشن چندر

"جوش نمبر" کی اشاعت سے تم نے ایک نئی روایت کا آغاز کیا ہے۔ اتنے مشاہیر اہل قلم کے مضامین اتنی محنت اور سنجیدگی سے لکھے گئے۔ مضامین کی فراہمی تمہاری جگر کاوی کی دلیل ہے

انلجین
آپ کی پسندیدہ
درد کو دور کرنے والی
ANALGIN
نئی
باحتیاط پیکنگ
Opal
Spotlit
A-1/51

ٹریٹ
بلیڈ
اپنے داموں
سب سے اعلیٰ

تحفہ ہو تو ایسا ہو..
کہ ہر تقریب اور موقع کو زیب دے اور جسے دیکھتے ہی طبیعت کھل اٹھے
ایسے تحفہ کیلئے ویسٹ اینڈ واچ
کا انتخاب عین موزوں ہے
ویسٹ اینڈ واچ سوئٹزرلینڈ کے ماہر گھڑی سازوں کی
کاریگری کا اعلیٰ شاہکار ہے۔ دلکشی اور نفاست
کے علاوہ صحیح وقت دینے میں بھی لاجواب ہے
جی ہاں! آپ بھی دل موہ لینے والی
ویسٹ اینڈ واچ ہی کا تحفہ پیش کیجئے۔

فلٹ
آپ کے گھر کو ہر قسم کے
کیڑوں سے صاف رکھتی ہے
باسانی دستیاب ہے
FLIT
KILLS
J.W.T

EXACTLY-OK IS THE WONDER WOOL
BUT CHECK THE BRASS SEAL AND LABEL ON
EVERY OUNCE OF GENUINE OK WOOL
OK
OK
WOOL
MUMTAZ
OK
HAND KNITTING
WOOL
OK
WOOL
OK

NONE
CAN
BEAT!
HM
FABRICS
IN
QUALITY
COLOURS
AND
DESIGNS
HAMID
KHWAJA
HM
MAKERS OF QUALITY FABRICS
SILK MILLS LTD
KARACHI.

یہ دلپسند نعمتیں بانو ہی میں
پکانے کے لائق ہیں!
قدرت نے انسان کو اپنی نعمتوں کے ساتھ کھانا پکانے کا
ہنر بھی بخشا ہے۔ گوشت ہو یا ترکاریاں اچھے روغن میں
پکائے جائیں تو بات ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔
غذائیت سے بھرپور بانو بناسپتی میں
پکے ہوئے کھانے زیادہ لذیذ اور صحت بخش ہوتے ہیں
BANO
BANASPATI
A AND D
10 Lbs Net
BURMA OIL MILLS LTD.
بانو بناسپتی
وٹامن اے اور ڈی شامل ہیں
ہاتھوں سے مس کئے بغیر تیار اور پیک کیا جاتا ہے۔ ۲ پاؤنڈ، ۵ پاؤنڈ، ۱۰ پاؤنڈ
اور ۳۵ پاؤنڈ کے ڈبوں میں ملتا ہے
برما آئل ملز لمیٹڈ — کراچی
united

ایک آہنگ
مجاز
ایک آہنگ
مجاز

خوش ذوق تعلیم یافتہ اور باشعور حضرات کا پسندیدہ

ماھنامہ

افکار

منٹو نمبر۔ مجاز نمبر۔ اور جوش نمبر کی سی مثالی دستاویزی

اور صدیوں یاد رہنے والی اشاعتوں کے بعد

باشتراک پاکستان رائٹرز گلڈ

حفیظ نمبر

پیش کر رہا ہے

حفیظ نمبر، بھی گذشتہ نصف صدی کی

ایک جامع اور مستند ادبی دستاویز ہوگا

سالانہ ممبر بن کر آپ افکار کی منفرد اشاعتیں

رعایتی قیمت پر حاصل کر سکتے ہیں

زرِ سالانہ ، بارہ روپے

ناظم نشرواشاعت مکتبۂ افکار و ماہنامہ افکار، رابسن روڈ کراچی نے شائع کیا

افکار اور مکتبۂ افکار
آپ کے اپنے ادارے ہیں!
ان کی سرپرستی اور اعانت، زبان و ادب کی
سرپرستی اور اعانت کے مترادف ہے!!
افکار
گذشتہ ۱۸ سال سے منفرد معیار اور پابندئ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔
آپ کی تھوڑی سی توجہ اور کوشش سے اس کا حلقۂ اشاعت وسیع ہو سکتا ہے
مکتبۂ افکار
نے ہمیشہ معیاری کتابیں شائع کی ہیں۔ آپ اور آپ کے احباب اپنی لائبریری
کے لئے یہ کتابیں خرید کر۔ اِن اداروں کو۔ تقویت دے سکتے ہیں
فہرس مطبوعات طلب فرمائیے
مکتبۂ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی
فون ۳۸۹۹۳

ملیریا
سے
نجات
اگر آپ ہر ہفتہ
"ڈاراپرم" برانڈ
کی ایک خوراک استعمال کریں تو پھر آپ کو
کبھی ملیریا میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔
آپ ہر ہفتہ ۹ پیسے سے کم خرچ کر کے ملیریا کے
بخار سے بچ سکتے ہیں۔
۶ گولیوں کی پتیاں ۵۰ پیسے میں ہر جگہ
ہر دوا فروش سے مل سکتی ہیں۔
بروز ویلکم اینڈ کمپنی (پاکستان) لمیٹڈ
میکلوڈ روڈ - کراچی
B W P—57